تاریخِ اسلام کی عظیم شخصیات

www.KitaboSunnat.com

علامہ اقبالؒ

محمد بن عبدالوہابؒ

مولانا اشرف علی تھانویؒ

امام بخاریؒ

امام غزالیؒ

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ

حضرت عائشہؓ

امام احمد بن حنبلؒ

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ

صلاح الدین ایوبیؒ

امام شافعیؒ

حضرت مجدد الف ثانیؒ

امام ابوحنیفہؒ

امام مالکؒ

ڈاکٹر حمید اللہؒ

حسن البنا شہیدؒ

حضرت خالدؓ بن ولید

امام ابن تیمیہؒ

سلطان محمد فاتحؒ

ابوالاعلیٰ مودودیؒ

نائمہ صہیب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ

مجلس التحقیق الاسلامی کے زیر اہتمام

محدث لائبریری

کتاب وسنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

معزز قارئین توجہ فرمائیں

- کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب... عام قاری کے مطالعے کیلئے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کیلئے ان کتب کو ڈاؤن لوڈ (Download) کرنے کی اجازت ہے۔

تنبیہ

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی ممانعت ہے
کیونکہ یہ شرعی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

PDF کتب کی ڈاؤن لوڈنگ، آن لائن مطالعہ اور دیگر شکایات کے لیے درج ذیل ای میل ایڈریس پر رابطہ فرمائیں۔

KitaboSunnat@gmail.com

www.KitaboSunnat.com

www.KitaboSunnat.com

24206

DATA ENTERED

۲۱۴۸
3320

تاریخِ اسلام کی عظیم شخصیات

اسلامی تاریخ کی عظیم شخصیات کی زندگیوں کے حالات اور واقعات کا احاطہ کرنے والی کتاب جس میں بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کے اصل ہیرو کون تھے، انہوں نے اپنے زمانے کے چیلنجز کا مقابلہ کس طرح کیا اور اس کی روشنی میں آج کل ہمارے لئے کیا راہِ عمل ہے۔

نائمہ صہیب

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جملہ حقوق بحق مصنفہ محفوظ ہیں

نام کتاب: تاریخ اسلام کی عظیم شخصیات

مصنفہ: نائمہ صہیب (ایم اے۔اسلامک اسٹڈیز۔کراچی یونیورسٹی)

تعداد: گیارہ سو

قیمت: 350/=

اشاعت اول: مئی 2005

ISBN 969-8930-00-0

تقسیم کار

فضلی بک سپر مارکیٹ،

نزد ریڈیو پاکستان، اردو بازار، کراچی

فون: 2212992-2629724 (92-21)

E-mail: sajidfazlee@yahoo.com

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

خودی کا سرِّ نہاں لا الہ الا اللہ
خودی ہے تیغ، فساں لا الہ الا اللہ

یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں، لا الہ الا اللہ

کیا ہے تو نے متاعِ غرور کا سودا
فریبِ سودوزیاں ! لا الہ الا اللہ

یہ مال و دولتِ دنیا، یہ رشتہ وپیوند
بتانِ وہم و گماں لا الہ الا اللہ

خرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زنّاری
نہ ہے زماں ، نہ مکاں ! لا الہ الا اللہ

یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں، لا الہ الا اللہ

اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکمِ اذاں ، لا الہ الا اللہ

علامہ اقبال

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

24206

پیش لفظ

سب تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں، جس نے ہمیں پیدا کیا اور ہماری دیگر ضرورتوں کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ ہماری ہدایت کا سامان بھی کیا۔ لاکھوں درود وسلام اس ہستی پر جس نے اس ہدایت کو ہم تک پہنچانے کا پورا پورا حق ادا کیا۔

آج سے تقریباً ڈیڑھ برس قبل مجھے اپنی استاد ہما نجم الحسن کے کہنے پر ان کے ڈیڑھ سالہ کورس کے سلسلے میں ''مسلم ہیروز'' پر لیکچرز دینے کا اتفاق ہوا۔ اس ضمن میں جب مختلف کتابوں سے رجوع کیا تو یہ حقیقت سامنے آئی کہ اہم شخصیات سے متعلق بازار میں دستیاب کتابیں دو طرح کی ہیں۔ ایک وہ جو صحیح معنوں میں تحقیق کے مرحلے سے گذرنے کے بعد بہت ضخیم ہو چکی ہیں اور ان میں موجود اصطلاحات عام آدمی کی فہم سے مطابقت نہیں رکھتیں۔ دوسری وہ جو محض کتاب لکھنے کے شوق میں چند تذکروں سے بعینہٖ مستعار لے لی گئی ہیں اور ایک ہی کتاب میں شامل سو سو شخصیات کے تذکرے نے کسی ایک کا حق بھی ادا نہیں ہونے دیا۔

لیکچرز کے اس سلسلے کے اختتام پذیر ہونے کے بعد بھی میری توجہ بار بار اس طرف جاتی تھی کہ اسلام کی سیاسی، علمی اور فکری تاریخ، مختلف ادوار میں عالم اسلام کو درپیش خطرات اور چیلنجز، ان چیلنجز کا مقابلہ کرنے والی شخصیات، ان کی راہ میں حائل مشکلات، ان کے کام کی نوعیت اور کارناموں کے بیان کے علاوہ ان شخصیات کی ذاتی زندگی اور کردار کی خصوصیات سے متعلق ایسی کتاب موجود ہونی چاہئے جو اسلامی فکر اور نظریات کی ترویج و تبلیغ کرنے والوں کی اجتماعی زندگی میں اور ہر مسلمان کی ذاتی زندگی میں اصلاح کے حوالے سے قابلِ عمل نتائج تک پہنچنے میں مددگار ہو۔ اپنی استعداد، قابلیت اور علمیت میں کمی کے باوجود اس کام کی ضرورت اور اہمیت کے پیش نظر میں نے اس کو کرنے کا بیڑا خود ہی اٹھایا۔

اس سلسلے میں مجھے مختلف مراحل سے گذرنا پڑا۔ پہلا مرحلہ یہ تھا کہ اس کام کو کس طرح اور کس انداز میں کیا جائے۔ یہاں انسانی نفسیات کو مدنظر رکھتے ہوئے مجھے شخصیت نگاری کا طریقہ مناسب معلوم ہوا تاکہ جب قاری

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

زیرِ تذکرہ شخصیت کی زندگی کے واقعات کو کہانی کی صورت میں پڑھے تو اس کی دلچسپی بھی برقرار رہے اور اس کے ساتھ ساتھ اسے تاریخی واقعات سے آگاہی اور اصلاح کے لئے نکات بھی مل سکیں۔ ایک اور خیال یہ بھی پیشِ نظر تھا کہ گزشتہ کچھ عرصے سے الیکٹرانک میڈیا، اخبارات و رسائل جن لوگوں اور جن کرداروں کو بار بار قوم کے ہیرو کے طور پر پیش کرنے لگے ہیں ان کے مقابل ان عظیم شخصیات کا تذکرہ قاری کو بتا سکے کہ دراصل ہیرو کون ہوتے ہیں اور یہ کہ عظمت کا اصل معیار کردار کی مضبوطی، اخلاقِ عالیہ، بے لوثی اور حق کی راہ میں ثابت قدمی دکھانے میں ہے نہ کہ ذاتی شہرت کے حصول کے لئے فنونِ لطیفہ میں چیمپیئن بننے اور زمانے سے منفرد ہونے اور اس پر اپنی دھاک بٹھانے کے لئے کسی بھی حد سے گذرنے میں۔

کتاب کی تیاری میں درپیش دوسرا اور اہم مرحلہ شخصیات کے چناؤ کا تھا۔ اسلامی تاریخ اس معاملے میں اتنی زرخیز ہے کہ ابتدأ کسی کا انتخاب کرنا اور کسی کو چھوڑ دینا میرے لئے واقعی مشکل تھا۔ چنانچہ میں نے پہلی ترجیح ان لوگوں کو دی جن کی مسلمہ حیثیت میں کسی کو کلام نہیں اور جن کا تذکرہ دن رات سننے کے باوجود ان کے کارناموں کی حقیقی حیثیت سے ہم بے خبر ہیں۔ اس کے بعد دوسرے درجے میں کسی مخصوص طبقہ فکر کے اصحابِ قدر کے بجائے مختلف النوع نظریات، خیالات اور مکتبہ ہائے فکر کے لوگوں کو اس لئے شامل کیا تا کہ یہ بات واضح ہوسکے کہ دین پر کسی ایک طبقے کی اجارہ داری نہیں ہے، نہ کسی ملاّ کی، نہ صوفی کی، نہ کسی مخصوص طبقہ فکر اور جماعت کی اور نہ کسی خاص تحریک کی، بلکہ جو شخص بھی اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے، شریعت کا پابند ہو، عملِ صالح سے اپنے ایمان کو زینت دے، انسانیت کی فلاح کا حریص ہو، مسلمانانِ عالم کے مسائل کا حقیقی درک رکھتے ہوئے ان کے حل کے لئے کوشاں ہو اور اللہ کے دین کے راستے میں خلوص اور ثابت قدمی سے کوشش کرے، تو چاہے وہ سید زادہ، گدی نشین پیر یا مدرسے کا سند یافتہ نہ بھی ہو، اس لائق ہے کہ یہ امت اس کی احسان مند ہو اور اس کے تذکرے کو کتابوں میں جگہ دی جائے۔ اس ضمن میں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ ہر آدمی کے زمانے کے حالات اور درپیش چیلنجز مختلف ہوتے ہیں۔ ان سے نمٹنے کے لئے وہ خلوصِ نیت سے اپنی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے دائرہ شریعت کے اندر اندر جو بھی حکمتِ عملی اختیار کرے اور جس چیز کو بھی ذریعہ بنائے چاہے وہ زبان ہو یا قلم، تلوار ہو یا سیاست، وہی لائقِ تحسین ہے۔ اس معاملے میں کچھ مخصوص پیمانے بنا کر ہر ایک کو ایک ہی سانچے میں فٹ کرنا صریحاً ناانصافی ہے۔

میں نے ابتداء صحابہ کرامؓ میں سے دو شخصیات کے بابرکت تذکرے سے کی۔ حالانکہ صحابہؓ میں سے ہر ایک

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس لائق تھا کہ اس کے حوالے سے کچھ نہ کچھ ضرور تحریر کیا جاتا۔ بالخصوص خلفائے راشدین کی زندگیوں اور کارناموں سے تو امت کے ہر فرد کو مکمل آگاہی ہونی چاہئے۔ لیکن اس موضوع میں اتنی وسعت ہے کہ یہ بذاتِ خود ایک مستقل کتاب کا مطالبہ کرتا ہے اور بیس پچیس صفحات میں اس کو سمیٹنے کی کوشش کامیاب ہوتی نظر نہ آتی تھی لہٰذا اس خیال کو ترک کر دیا۔ خصوصیت سے حضرت عائشہؓ اور حضرت خالدؓ کا تذکرہ شامل کرنے کی وجہ یہ تھی کہ یہ دو ہستیاں ایسی ہیں جن کا اپنے دائرہ عمل میں دور دور تک کوئی مدمقابل نہیں ہے۔ بلکہ حضرت عائشہؓ کے بارے میں تو یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اسلامی تاریخ نے ان کے بعد کوئی عورت بھی ایسی پیدا نہیں کی جو علمی مرتبے اور خدمتِ دین میں ان کی پاسنگ ہو۔ ان کے علاوہ فقہائے اربعہ کو شامل کیا جو زہد اور پاکیزگی کردار میں بھی یکتا تھے اور علمی شان میں بھی ممتاز تھے۔ ان کے چاہنے والے کروڑوں کی تعداد میں پورے بلادِ اسلامیہ میں پھیلے ہوئے ہیں اور کروڑوں لوگوں نے ان کی فقہی کوششوں سے فیض اٹھایا ہے۔ حدیث کی خدمت کے لئے جہاں ہزاروں نفوس کی قربانیاں اور کوششیں ہیں، وہیں سب سے معتبر اور مستند نام امام بخاریؒ کا ہے جن کی کتاب صحیح بخاری کے پڑھنے والے دنیا کے ہر خطے میں موجود ہیں۔ انہی کے تذکرے کے پس منظر میں تاریخِ تدوینِ حدیث انتہائی مختصر انداز میں بیان کی گئی تاکہ حدیث کے بارے میں جو شکوک اٹھائے جاتے رہے ہیں ان کا ازالہ ہو اور قاری کا ذہن صاف ہو سکے۔ بادشاہوں اور سلاطین میں سے تین کا انتخاب کیا گیا۔ ان میں عمر بن عبدالعزیزؒ کو مثالی خلافت، سلطانؒ صلاح الدین ایوبی کو خارجی حملوں کے محاذ پر شاندار مزاحمت اور سلطان محمد فاتح کو یونانیوں کے ناقابلِ تسخیر مرکز قسطنطنیہ کی فتح اور عثمانی خلافت کے پس منظر میں اس کامیابی کی اہمیت کی وجہ سے چنا گیا۔

ان شخصیات کے علاوہ دیگر تمام حضرات وہ ہیں جنہوں نے مجدّدِین اور مصلحینِ امت کی حیثیت سے اپنے اپنے وقتوں میں دین کو ملاوٹوں اور آمیزشوں سے پاک کر کے قرآن وحدیث کے اصل سرچشمے سے امت کو سیراب کیا۔ ان میں امام غزالیؒ، امام ابن تیمیہؒ، مجدد الف ثانیؒ، شاہ ولی اللہؒ، شیخ محمد بن عبدالوہابؒ، مولانا ابو الاعلیٰ مودودیؒ، شیخ حسن البناؒ اور مولانا اشرف علی تھانویؒ شامل ہیں۔ آخری تذکرہ زمانہ قریب کے ڈاکٹر حمید اللہؒ کا شامل کیا گیا جو علمی محاذ پر مغرب کے مستشرقین سے تن تنہا مقابلہ کرتے رہے۔

شخصیات کے چناؤ کے حوالے سے جب بات علامہ اقبالؒ کو شامل کرنے سے متعلق آئی تو بار ہا یہ خیال آیا کہ شریعت کے معیارِ تقویٰ اور اسلامی عقیدہ وفلسفہ کے لحاظ سے خود ان میں اور ان کے کلام میں شاعرانہ شوخی کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

علاوہ بھی چند باتیں ایسی ہیں جن سے اتفاق کرنا مشکل ہے۔ لہٰذا ان کے تذکرے کو شامل کیا جائے یا نہیں۔ ابھی اسی سوچ میں تھی کہ سید ابوالحسن علی ندوی کی کتاب ''نقوشِ اقبال'' نظر سے گذری جس کے دیباچے میں انہوں نے ایک ایسی بات تحریر کی ہے جس سے میں یکسو ہوگئی۔ فرماتے ہیں:

''ان کی نادر شخصیت میں بعض ایسے کمزور پہلو بھی ہیں جو ان کے علم وفن اور پیغام کی عظمت سے میل نہیں کھاتے اور جنہیں دور کرنے کا موقع انہیں نہیں ملا۔ البتہ میں سمجھتا ہوں کہ اقبال وہ شاعر ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے اس زمانے کے مطابق بعض حکم وحقائق کہلوائے ہیں جو کسی دوسرے معاصر شاعر ومفکر کی زبان سے ادا نہیں ہوئے۔ میرا خیال ہے کہ پیغامِ محمدی کے بقائے دوام، امتِ مسلمہ کے استحکام اور اس کی قائدانہ صلاحیت، عصری نظریات وفلسفہ کی بے مائیگی پر ان کے پختہ عقیدہ سے ان کی فکر میں فصاحت اور پختگی آئی ہے اور ان کی خودی کی تعمیر ہوئی ہے۔ اس معاملے میں وہ خاص کر دینی علوم کے ان فضلاء سے بھی آگے ہیں جو مغربیت کی حقیقت سے واقف نہیں اور نہ انہیں اس کے حقیقی اغراض ومقاصد اور تاریخ سے گہری واقفیت ہے۔ آخر میں پھر کہتا ہوں کہ میں نے انہیں اولوالعزمی، محبت اور ایمان کا نواخواں شاعر پایا اور اپنے بارے میں میری گواہی یہ ہے کہ جب جب بھی ان کا کلام پڑھا تو دل جوش سے امنڈنے لگا اور لطیف جذبات نے انگڑائیاں لینا شروع کر دیں۔ احساسات اور کیفیات کی لہریں بیدار ہونے لگیں اور رگوں میں شجاعت اسلامی کی رو دوڑنے لگی۔ میری نظر میں یہی ان کے شعر کی اصل قدر وقیمت ہے۔''

انہی کیفیات کے تحت میں نے بھی اقبال پر قلم اٹھانے کا فیصلہ کیا اور ان کی شخصیت سے زیادہ ان کی فکر، اس کے تدریجی ارتقاء اور اسلامیانِ ہند کے نام ان کے پیغام کو موضوع بنایا گیا۔ گو اختصار کی وجہ سے اس کا پورا پورا حق ادا نہ ہو سکا اور یہی اختصار اس بات کا باعث بھی بنا کہ میں اور بہت سے لوگوں کا تذکرہ شامل نہ کر سکی جو یقیناً اس لائق تھے کہ ان کو پڑھا جائے اور ان کے کارنامہ زندگی سے آگاہی حاصل کی جائے۔ ان میں شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، سید علی ہجویریؒ، یوسف بن تاشفینؒ، مغل شہنشاہ اورنگزیب عالمگیرؒ، سید احمد شہیدؒ، جمال الدین افغانیؒ، مولانا الیاسؒ، مولانا قاسم نانوتویؒ، سید قطب شہیدؒ، زینب الغزالیؒ، شیخ احمد یٰسینؒ اور سید ابوالحسن علی ندویؒ وغیرہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شامل ہیں۔

تیسرا اور سب سے مشکل مرحلہ کتاب کی تحریر کے لئے مناسب مواد کی دستیابی کا تھا۔صورتحال یہ تھی کہ شخصیات کے حوالے سے زیادہ تر جس نے بھی قلم اٹھایا، وہ اپنے آپ کو شخصیت پرستی کے چنگل سے نہ نکال سکا۔ ادھر خود میری طبیعت مروجہ شخصیت نگاری کے طریقے سے سخت بیزار تھی جس میں شخصیت کی تعریف میں غلو کی حد تک بڑھ جانا کہ اس شخص کا اصل کارنامہ تو دھندلا کے رہ جائے اور کرامات اور عجائبات کے افسانوں سے تذکرہ بھرا ہوا ہو، نیز کسی کمی یا خامی کی صورت میں پورا زور اس پر پردہ ڈالنے میں لگایا جائے اور اس کے لئے صفحات کے صفحات رنگین کئے جائیں، نہ تو صاحبِ تذکرہ سے انصاف ہے اور نہ ہی قاری کے لئے فائدہ مند ہے۔ اس لئے کہ عظیم شخصیات کو بھی باوجود اپنی عظمت کے بہر حال شیطان، نفس اور معاشرے کے شریر عناصر کا سامنا تھا اور انبیاء کی طرح انہیں وحی ربانی سے براہ راست ہدایت نہیں ملتی تھی۔ اس لئے عین ممکن ہے کہ بعض مواقع پر ان سے بے جانے بوجھے کوئی غلطی یا کوتاہی سرزد ہوگئی ہو یا وقتی طور پر نفس کا کوئی تقاضا زور پکڑ گیا ہو۔لہٰذا ان کے ہر فعل کو زبردستی درست ثابت کرنے کی سعی لا حاصل انہیں اس مقام پر پہنچا دیتی ہے جہاں عام انسان انہیں اپنی پہنچ سے بہت دور تصور کرتا ہے۔ وہ انہیں اپنی خیالی وتصوراتی زندگی کا حصہ بنانے پر تو تیار ہوتا ہے، لیکن عملی زندگی میں ان سے کچھ سیکھنے اور اصول اخذ کرنے میں ناکام رہتا ہے۔البتہ یہ ضرور ہے کہ وہ بزرگ شخصیات جن کی زندگی کا غالب حصہ اور کردار کی بیشتر خصوصیات لائقِ تقلید ہوں ان کے ہر ہر فعل کا محاسبہ کرنا اور پورے کارنامہ زندگی کو چھوڑ کر کسی ایک بات کے پیچھے پڑ جانے کا کام عموماً وہ لوگ کرتے ہیں جو اپنی اصلاح سے زیادہ دوسروں پر تنقید میں دلچسپی رکھتے ہیں۔

جب ان تمام نکات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کام کا آغاز کیا تو اندازہ ہوا کہ اختصار اور جامعیت کے ساتھ شخصیت نگاری کا کام جس میں زیرِ تذکرہ شخصیت کی زندگی، کردار اور اس کو درپیش چیلنج اور کارناموں کا بیان اس طریقے پر ہو کہ قاری ان سے ایک قسم کا تعلق محسوس کر سکے، اس کی دلچسپی بھی برقرار رہے اور غیر ضروری طوالت سے بچ کر واقعات کا حسن بھی برقرار رکھا جائے، کچھ ایسا آسان نہیں ہے۔ بہر حال اللہ کا نام لے کر ہر شخصیت پر دستیاب بہترین اور مستند ترین کتاب پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے اس سلسلے کی دیگر کتابوں سے بھی مدد لی اور تقریباً ایک سال کی مدت میں توفیقِ الٰہی سے یہ کام مکمل کرلیا۔ اس طرح یہ کتاب حقیقت میں تصنیف سے زیادہ تالیف ہے، اگرچہ زیادہ تر مواقع پر کسی کے خیالات کو بھی بعینہٖ مستعار نہیں لیا گیا اور ضروری وضاحتوں کے ساتھ اسے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سپردقلم کیا گیا ہے۔

مجھے اس بات کا پورا اندازہ ہے کہ ان شخصیات کی زندگیوں اور کارناموں کے بیان کا کافی وشافی حق ادا نہیں ہوا اور جگہ جگہ مزید کہنے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔مگر ایک کتاب میں بیس قد آور شخصیات کے محاسن کا مکمل احاطہ نہیں کیا جاسکتا۔ان تمام مراحل سے گذرتے ہوئے ایک بات جو بار بار مجھے محسوس ہوئی وہ یہ تھی کہ گو انسانی مزاج اور طبیعت، حالات، زمانے اور درپیش چیلینجز اور ان سے نمٹنے کی حکمت عملی میں کتنا ہی فرق کیوں نہ ہو بندۂ مومن کی بنیادی صفات اور شخصیت کے خدوخال اور اس کی تعمیر میں مطلوب لوازمات میں نمایاں فرق نہیں ہوسکتا۔جیسے کہ گروہِ عاشقاں کا اندازِ عشق بدل سکتا ہے لیکن کیفیتِ عشق نہیں بدل سکتی:

عشق فقیہِ حرم عشق امیرِ جنود
عشق ہے ابن السبیل اس کے ہزاروں مقام

سپہ سالار ہوں یا سلاطین، مفتی وفقیہ ہوں یا مجدد ومصلح، کچھ اقدار سب میں مشترک نظر آتی ہیں۔ذیل میں انہی خصوصیات کا تذکرہ کیا گیا ہے:

(۱) والدین کی بہترین تربیت جس نے ان کی خداداد صلاحیتوں کو جلا بخشی۔

(۲) معرفتِ حق کے شوق کی وجہ سے حصولِ علم پر توجہ اور اس راہ میں خلوصِ نیت۔

(۳) ذاتی اصلاح اور درست ترجیحات کا تعین۔

(۴) اجتماعی اصلاح کی تڑپ اور اس کے لئے کوشش۔

(۵) اللہ پر پختہ ایمان اور تعلق مع اللہ کو مسلسل مضبوط رکھنے کے لئے عبادات کا اہتمام، سنتوں کی پابندی، ذاتی احتساب، استغفار، رجوع اور توفیقِ الٰہی کی طلب۔

(۶) طبیعت میں سوز وگداز اور تحریر وتقریر میں اثر جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے والہانہ عشق کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے۔

بہت سے نیک طبیعت لوگ اپنی اصلاح بھی کر لیتے ہیں اور ان کی ترجیحات بھی درست ہوتی ہیں لیکن مصلحین اور مجددین کا رتبۂ بلند انہی کو ملتا ہے جو اس سے آگے بڑھ کر معاشرے، قوم بلکہ پوری نوع انسانی کی اصلاح کے لئے فکر کرتے ہیں۔اس کوشش میں وہ حالات کے سازگار ہونے کا انتظار نہیں کرتے بلکہ دین سے متعلق اپنی آگہی اور شعور کے مطابق لمحۂ موجود میں درست راہ کی طرف رہنمائی کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔اس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

راہ میں وہ ہر قسم کی قربانی کے لئے تیار رہتے ہیں اور کڑے سے کڑے حالات میں بھی رخصت کے بجائے عزیمت کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ آزمائشوں اور مشکلات کے طوفان میں استقامت اور اپنے اخلاق و اقدار کی حفاظت ان کے درجات بڑھا دیتی ہے اور عوام و خواص میں ان کی مقبولیت اور اثر پزیری کو دو چند کر دیتی ہے۔

اب میں مختصراً ان چیلنجز کا تذکرہ کروں گی جو میرے اپنے خیال کے مطابق مسلمانوں کو آغاز سے لے کر اب تک مستقل درپیش رہے اور جن میں سے اکثر سے ہم بحیثیت امت نمٹنے میں کوئی خاص کامیاب دکھائی نہیں دیتے۔

نوعِ انسانی کے آغاز سے لے کر اب تک جتنی تہذیبیں بھی نمودار ہوئیں انہیں دو طرح کے چیلنجز کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک داخلی، دوسرے خارجی۔ اس موقع پر قوم کا اصل امتحان یہ ہوتا ہے کہ وہ ان کا کس طرح سامنا کرتی ہے اور حکمرانوں، intelligentsia، مصلحین اور عوام کا اس پورے عرصے کے دوران کیا رویہ ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے مسلمانوں کی تاریخ کو اٹھا کر دیکھا جائے تو داخلی محاذ پر انہیں چار قسم کے چیلنج تقریباً ہر دور میں درپیش رہے:

(i) غیر مستحکم اور غیر متفقہ سیاسی نظام جس میں قوم کے اجتماعی فائدے کے بجائے سیاست مستقل شخصی فائدوں کے گرد گھومتی رہی اور بالکل ابتدائی دور کی شورائی خلافت کے بجائے ملوکیت اور شہنشاہیت کے گرداب میں پھنسی رہی۔

(ii) اتحاد و اتفاق کا فقدان، تعصب اور فرقہ بندیوں کی وجہ سے عدم برداشت اور تحمل کی کمی۔

(iii) مادیت پرستی اور مال و دولت کی حرص کا اسلامی اخوت اور اجتماعی مفادات پر غالب آنا اور اس بناء پر اپنی ہی قوم کے خلاف منصوبوں اور سازشوں کا حصہ بننا۔

(iv) اسلام کی سادہ اور واضح تعلیمات سے جڑنے کے بجائے مختلف فکری اور نظری مغالطوں میں الجھ کر دنیا و آخرت برباد کرنا۔

اسی طرح خارجی محاذ پر تہذیبی، فکری اور حربی یلغار چاہے وہ کسی ایک قوم یا مذہب کے ساتھ ہو یا بہت ساری اقوام کے گٹھ جوڑ کا نتیجہ ہو، مسلمانوں کو ان کا ہمیشہ اور ہر دور میں سامنا رہا ہے۔ یہاں ہم اپنی توجہ صرف داخلی محاذ پر مرکوز رکھیں گے۔ جہاں اصلاحی تحریکوں اور اشخاص کے کردار کا روشن تذکرہ کتاب کا اصل موضوع ہے، وہیں اپنی کمزوریوں کا مختصر جائزہ لینا مناسب ہوگا۔ اس ضمن میں داخلی محاذ پر سیاسی نظام ہمارا پہلا نکتہ بحث

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے۔

اسلام نے معروف معنوں میں کوئی نپا تلا سیاسی نظام مسلمانوں کو نہیں دیا۔ چند بنیادی احکامات کی پیروی کے حکم کے ساتھ ساتھ خود نبی اکرم ﷺ نے اپنے دور میں مدینہ میں آئیڈیل اسلامی حکومت قائم کر کے آئندہ کے لئے راہِ عمل تجویز کر دی تھی۔ اور یوں اپنے حالات اور زمانے کے اعتبار سے جو بھی نظام اپنایا جائے اس میں ان بنیادی خصوصیات کا پایا جانا اس کے اسلامی نظام ہونے کی دلیل بن سکتا ہے۔ اس طرز کی نمایاں ترین خصوصیات جو قرآن وسنت اور تعاملِ صحابہ سے سمجھ میں آتی ہیں، یہ ہیں:

(i) اپنے لئے خود عہدے کا طلبگار نہ ہونا اور منتخب ہونے کی صورت میں کسی قسم کے شخصی اور ذاتی فائدے کے حصول سے اجتناب برتنا۔

(ii) حکمرانوں کا ڈکٹیٹرشپ کے بجائے معاشرے اور ملک میں موجود صالح اور باصلاحیت افراد کی شوریٰ کی مدد سے فیصلے کرنا۔

(iii) عدل وانصاف کی بے لاگ فراہمی۔

(iv) ریاست کا فلاحی ہونا جہاں ہر ایک کو جان، مال، عزت کے تحفظ کے علاوہ اپنے حقوق کے حصول میں اسٹیٹ کی پوری مدد اور اعانت حاصل ہو۔

(v) اقامتِ صلوٰۃ اور اسلامی قوانین کے نفاذ کے ساتھ ساتھ معاشرے میں نیکی کے رجحان کی حوصلہ افزائی اور منکرات کی حوصلہ شکنی۔

نبی اکرم ﷺ نے ان اصولوں پر اسلامی ریاست کی بنیاد رکھی۔ بعد میں خلافت راشدہ کے دور کو اسی نظام کا تسلسل کہا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد دورِ بنوامیہ سے لے کر آج تک چاہے شہنشاہیت ہو یا نام نہاد جمہوریت ان بنیادی اسلامی سیاسی اصولوں کی پوری پوری پیروی شاید ہی کسی مسلم اسٹیٹ میں کی گئی ہو۔ صرف یہی نہیں کہ ان راہنما اصولوں سے صرفِ نظر کیا گیا بلکہ مسلمہ اور رائج دنیاوی نظاموں کے نقطہ نظر سے بھی حکمرانوں کی اکثریت نے اس عظیم ذمہ داری کو شرعی تقاضوں کے مطابق ادا کرنے کے بجائے محض شہرت، دولت اور جھوٹی شان کے حصول کا ذریعہ بنایا۔ جب نقطہ نظر یہ ہو تو اس دوڑ میں کون کس سے پیچھے رہنا چاہتا ہے۔ اس ہوس پرستی اور خودغرضی میں کہیں بیٹے نے باپ کو مارا تو کہیں بھائی نے بھائی کو قتل کرایا۔ ذاتی نقصان کی تو کیا اہمیت ہے، پورے کے پورے ملک انہی آپس کی لڑائیوں اور شخصی فائدوں کی جنگ میں غیر مستحکم ہوتے رہے۔ انار کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور انتشار نے مسلم معاشروں کو نگل لیا۔ جہاں کوئی اچھی قیادت یا اچھا حکمران سامنے آیا، وہیں شر کی طاقتوں نے اسے اپنے مذموم مقاصد کی بھینٹ چڑھا دیا اور ملت نقصان پر نقصان اٹھاتی رہی۔ لیکن اس کے بعد بھی یہ موٹی بات کسی کی سمجھ میں نہ آئی کہ افراد پر بھروسہ کرنے کا انجام خواری ہوتی ہے۔ اگر معقول نظام موجود ہو اور اس کے تحت مضبوط ادارے کام کر رہے ہوں تو کسی ایک فرد کے چلے جانے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ بلکہ اگر ایک خاص آدمی کسی وقتی حادثے یا سازش کا شکار ہو جائے تو ایک کھیپ کی کھیپ اپنے وقت اور مقررہ طریقہ کار کے مطابق اس کی جگہ لینے کو موجود ہوتی ہے۔ یہ غلطی صرف سیاسی محاذ پر نہیں بلکہ ہر جگہ اور ہر میدان میں مسلمانوں سے سرزد ہوئی۔

اس تناظر میں اگر مصلحین کے کردار کو سامنے رکھا جائے تو جہاں یہ ایک حقیقت ہے کہ جابر حکمرانوں کے سامنے کلمہ حق ادا کرنے میں مسلمان علماء کا کردار شاندار رہا ہے وہاں یہ بھی درست ہے کہ چند ایک کو چھوڑ کر اکثر نے معاشرے کے دیگر طبقوں کی طرح حکمرانوں کی خیر خواہی، اصلاح اور ان کے بیمار قلوب کی مسیحیت کا جیسا حق تھا ویسا ادا نہ کیا۔ حکمرانوں کی ناپسندیدہ حرکات و عادات، ان کی صحبت کے برے اثرات اور ان کی ناراضگی کی صورت میں ان کے ظلم وستم سے بچنے کے لئے علماء کے ایک بڑے طبقے نے ان سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور اپنے دین و ایمان کی سلامتی اسی میں سمجھی کہ صاحبانِ اقتدار کو ان کے حال پر چھوڑ کر اپنی توجہ معاشرے کے دوسرے طبقوں کی طرف پھیر دی جائے۔

میری ناقص رائے میں اگر اپنے اصولوں پر سمجھوتہ کئے بغیر پوری خلوص اور خیر خواہی سے حکمرانوں کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا جاتا اور حکمت عملی اور عمدہ نصیحت کے ذریعے انہیں دنیا کی ناپائیداری اور آخرت کا خوف دلایا جاتا اور ساتھ ساتھ انہیں یہ یقین دلایا جاتا کہ ہمیں تمہاری حکمرانی اور سلطنت سے کوئی سروکار نہیں تو شاید امت کی سیاسی تاریخ میں حکمرانوں کا کردار اسلامی طرز اور اجتماعی فائدوں دونوں کے حوالے سے زیادہ بہتر ہوتا۔ نبی اکرم ﷺ نے بھی اپنی دعوت کا ابتدائی محور (اثر و نفوذ کی اہمیت کے حوالے سے) قریش کے سرداروں کو بنایا تھا۔ تاہم مشیتِ الٰہی سے اس موقع پر آپ ﷺ کو کامیابی حاصل نہ ہوئی اور ان سرداروں کی شدید دشمنی کی وجہ سے مسلمانوں کو تیرہ سال تک سخت تکالیف کا سامنا کرنا پڑا، جبکہ مدینہ میں صورتحال یکسر مختلف ثابت ہوئی اور اوس و خزرج کے سرداروں کے اسلام قبول کرتے ہی پورے کے پورے قبائل آغوشِ اسلام میں آ گئے۔ اسلامی تاریخ میں اسی طرز کو امام ابن تیمیہؒ اور شیخ محمد بن عبدالوہابؒ نے بھی اختیار کیا۔ یہاں میں یہ واضح کرنا چاہتی ہوں کہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قرآن کریم کی دعوت جہاں معاشرے کے پسے ہوئے اور متوسط طبقات کے لئے ہے وہیں اشرافیہ، حکمرانوں، امراء اور وزراء کے لئے بھی ہے۔ جہاں غریب بچوں کو قرآن مجید پڑھانا ثواب کا کام ہے، وہیں اس کی اہمیت بھی کچھ کم نہیں کہ صاحبانِ اقتدار، صاحبِ ثروت اور معاشرے کے ذہین طبقوں کو جو ملک کے اقتدار، معیشت اور اداروں کو چلانے والے ہوں، پیغامِ الٰہی سے روشناس کرایا جائے۔ یہ بات یاد رکھنے کے لائق ہے کہ اگر خیر آگے بڑھ کر ہر میدان میں اپنا کردار ادا نہیں کرے گا تو اس خلا کو بہت جلد شر کی قوتیں پر کر دیں گی۔ پھر چاہے لاکھ کوئی اسلامی انقلاب کی دہائیاں دیتا رہے یا سڑکوں پر آ کے نامنظور نامنظور کے نعرے لگاتا رہے، بیشتر اوقات غالب اکثریت کی سمت کا تعین حکمران اور معاشرے کی Elite کلاس ہی کرتی ہے۔ لہٰذا مذہبی طبقوں کو آگے بڑھ کر پوری دلسوزی سے ان پر بھی اپنی توجہ مرکوز کرنی چاہئے۔

ہمارا دوسرا چیلنج امت میں باہم اتفاق و اتحاد کے فقدان سے متعلق ہے۔ امت مسلمہ کی چودہ سو سالہ تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ اسلام کی اخوت، بھائی چارے اور باہمی یگانگت کی پرزور تعلیمات کے باوجود مسلمان معاشرے اتفاق، محبت، رواداری اور برداشت جیسی صفات کا مظاہرہ کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ اوروں کو تو رہنے دیجئے، خود مذہبی حلقے اور دوسروں کی اصلاح کے علمبردار سب سے بڑھ کر عدم برداشت کے مرض میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ ان کی اکثریت اپنے آپ کو دوسروں سے بہتر سمجھتی ہے اور اس پر پورا یقین رکھتی ہے کہ حق پر صرف اسی کی اجارہ داری ہے۔ معمولی معمولی تاویلات کے فرق سے اختلافات جنم لیتے ہیں اور بات اختلاف سے شروع ہو کر نفرت اور بالآخر ایک دوسرے کی تکفیر تک جا پہنچتی ہے۔ اختلاف فی نفسہ کوئی بری چیز نہیں ہے بلکہ جدتِ خیال اور کام میں تنوع اسی سے پیدا ہوتے ہیں۔ البتہ جب تنقید برائے اصلاح کے بجائے تنقید برائے تنقید کی جاتی ہے اور معمولی اختلافات کو غیر ضروری طور پر Magnify کیا جاتا ہے تو ایسے میں ان بنیادی مقاصد سے نظر ہٹ جاتی ہے، جن میں کوئی اختلاف نہیں ہوتا۔ صحابہ کرامؓ میں بھی رائے کا اختلاف ہوتا تھا۔ مگر اس بناء پر نہ تو باہم حسن ظن میں کمی آتی تھی، نہ ایک دوسرے کی جڑیں کاٹنے میں وقت ضائع کیا جاتا تھا۔ بلکہ وہ سب تو نیکی اور بھلائی کے کاموں میں ایک دوسرے کے مددگار ہوتے تھے۔ ایک طرف جب دیندار طبقے کی غالب اکثریت کا یہ حال ہوا کہ وہ باہم اتفاق و رواداری کا مظاہرہ کرنے میں اس درجہ ناکام رہے تو مسلمان عوام نے دو ہاتھ آگے بڑھ کر علاقے، وطن، نسل، ذات پات اور برادریوں کی جاہلی بنیادوں پر ایک دوسرے کی تحقیر شروع کر دی۔ جب نوبت یہ آ جائے کہ سینے نفرت اور بغض سے بھرے ہوں اور دل آپس میں پھٹے ہوئے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہوں تو رحمت کے بجائے لعنت اور برکت کے بجائے ذلت و مسکنت ہی دے ماری جاتی ہے۔ اگر تحریکیں اور ان کے قائدین اپنے اپنے زیرِ اثر حلقوں میں کام کرنے کے ساتھ ساتھ باہم تعاون، خیر سگالی اور ایک دوسرے کو پروموٹ کرنے کا کام نہیں کریں گے تو قیامت تک اسلامی نظام اور احیائے خلافت کا خواب، خواب ہی رہ جائے گا۔ دینی حلقوں سے دردمندانہ گزارش ہے کہ جب قرآن اہلِ کتاب کو دعوت دیتا ہے کہ آؤ اس بات کی طرف جو ہم میں اور تم میں مشترک ہے تو کیا ایک خدا، رسول، کتاب اور قبلہ رکھنے والے اس کو نکتہ آغاز نہیں بنا سکتے؟ اس راستے میں اگر نیت درست ہو اور اپنے سے زیادہ دین کی فکر ہو تو دین کے کام میں مشغول دیگر اصحاب سے رابطہ رکھنا اور ان کے پروگراموں میں شرکت، نیز ان کے ہاں رائج لٹریچر کا مطالعہ کرنا اور کروانا بھی دل اور دماغ کھولنے اور دوسروں کے نقطۂ نظر کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔

عالمِ اسلام کو تیسرا بڑا چیلنج اس مادہ پرستی اور مال و دولت کی حرص سے درپیش رہا ہے جس نے دیگر ہر جذبے اور خیال پر غالب آ کر مسلم معاشروں کا ستیاناس مار دیا۔ اس سے قبل نبی کریم ﷺ اس کی پیشگوئی کر چکے تھے۔ لالچ، حرص و ہوس اور ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کی دوڑ نے دکھاوے، ظاہرداری اور نمود و نمائش کو جنم دیا۔ یہاں تک کہ زندگی کا کوئی گوشہ بھی اس کی زد میں آئے بغیر نہیں رہا اور مخلص لوگ اور سچے جذبے مسلم معاشروں میں کمیاب ہو گئے۔ دیکھا جائے تو یہ رویے اسلام کے فلسفے سے ذرہ برابر میل نہیں کھاتے۔ دنیا کے محدود فائدوں اور ظاہری چمک دمک پر تو ان کو ریجھنا چاہیے جو آخرت کی حیاتِ ابدی کا یقین نہ رکھتے ہوں۔ مگر افسوس ناک حقیقت یہ ہے کہ آج کل کے مسلمانوں کے مقابلے میں غیر مسلم اقوام اس معاملے میں بہتر ہیں۔ اس صورتِ حال کو تبدیل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ جہاں ایک طرف لوگوں کو جائز حد میں ان کے شوق اور جذبات کے اظہار کی آزادی دی جائے اور انہیں شریعت کی حدود میں رہتے ہوئے زندگی سے لطف اندوز ہونے کے طریقے بتائے جائیں وہیں گاہے بگاہے دنیا کی زندگی کی اخروی زندگی کے مقابلے میں بے ثباتی بھی یاد دلائی جائے اور اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے حرام کے قریب پھٹکنے سے گریز کی تعلیم دی جائے۔ رسول اللہ ﷺ کا طرز اس سلسلے میں یہ تھا کہ آپ نے اپنے لئے دنیا سے اجتناب اور فقر کی زندگی کو پسند کیا۔ مگر صحابہ کرامؓ اور امت پر اس معاملے میں کوئی ایسا بوجھ نہیں ڈالا جو ہر فرد کے لئے اٹھانا آسان نہ ہو، بلکہ انسانی مزاجوں کو مدنظر رکھتے ہوئے جائز اور حلال حدوں میں آپ ﷺ ہمیشہ اپنی امت کے لئے گنجائش ڈھونڈتے رہے۔ آپ ﷺ کا طریقہ ہی ہمارے لئے مشعلِ راہ ہے کہ خود علمائے امت اپنے تزکیے اور نفس پرستی سے بچنے کے لئے جو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

معیار بنائیں اس کا اطلاق ہر ایک پر نہ کریں۔ ورنہ معاشرہ جو ہر قسم کے افراد سے مل کر بنتا ہے، گھٹن کا شکار ہو جائے گا اور زندگی کی یکسانیت (جس کی حقیقت بہت تلخ اور بے رنگ ہے مگر ہر ایک پر واضح نہیں ہے) سے تنگ آ کر کچھ لوگ بالآخر ہر بندش توڑ کر بالکل ہی آزاد ہو جائیں گے۔ چند افراد کی اس قسم کی کوشش دوسروں کی حوصلہ افزائی کرے گی اور مادہ پرستی اور دنیاوی زندگی میں ہر خوشی اور کامیابی کا حصول مقصدِ زندگی قرار پائے گا۔ اس کے تدارک کے لئے دین میں گنجائش پیدا کرنے کے ساتھ مثبت اور متبادل حل دینا اور اس کے مواقع فراہم کرنا بہت مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔ علماء کو اس طرف توجہ کرنی چاہئے اور اس کو اپنی شان کے منافی خیال نہیں کرنا چاہئے۔

امت کو درپیش چوتھا اور سب سے مشکل چیلنج ان فکری اور نظری مغالطوں کی یلغار تھی، جن سے پوری طرح نمٹنے کی کوئی کوشش بھی سو فیصد کامیاب ثابت نہ ہو سکی۔ میرے نزدیک اس کی بنیادی وجہ سطحی نہیں بلکہ ٹھوس فلسفیانہ ہے۔ جس طرح انسان کی اپنی شخصیت اس کی ظاہری حالت، قلبی و جذباتی کیفیت اور اس کی عقل و سوچ کے امتزاج سے بنتی ہے، اسی طرح اس کی زندگی بھی دنیا میں اس کے مختلف کردار اور مختلف میدانوں میں اس کے اعمال و افعال سے بنتی ہے۔ قرآن کا آفاقی پیغام جو قیامت تک کے لئے پوری بنی نوع انسان کے لئے ہے اس بنیادی حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے عظیم الشان طریقے سے اپنے مخاطب کے ظاہر و باطن، عقل و حواس اور جذبات و محسوسات نیز زندگی میں اس کے مختلف کردار کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کی ہدایت کا سامان کرتا ہے۔ یوں ہر مزاج، ہر طبیعت اور ہر سوچ کا آدمی اپنی اصلاح کے لئے قرآن کو براہ راست اپنے سے مخاطب پاتا ہے۔ ایک طرف جہاں عقلاء اور دانشوروں کی عقل، حساس لوگوں کے جذبات اور احساسات اور عام انسانوں کی عملیت پسندی کو مدنظر رکھا گیا ہے وہیں بحیثیتِ مجموعی اس پورے فلسفے میں ایک خوشنما توازن بھی موجود ہے۔ کہیں دلیل اور منطق سے بات سمجھائی گئی ہے تو کہیں جذبات کو ابھارا گیا ہے اور کہیں احکامات کے ذریعے عملی زندگی میں جزئیات تک کی تفصیل بتائی گئی ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ قرآن بیک وقت انسانی طبیعتوں اور زندگی کی مختلف ضرورتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان میں باہم توازن پیدا کرنا چاہتا ہے اور اس توازن کی عمدہ ترین عملی مثال خود نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی تھی۔ ابتدائی ایام میں اسی توازن نے اسلامی معاشرے کو حسن دیا تھا۔ اللہ نے بندہ مومن کے لئے اس کی زندگی کے اعمال و افعال میں توازن اور اعتدال کی جو راہ پسند کی ہے اس کو نبی اکرم ﷺ نے صحابہ کرامؓ کی تربیت میں شامل کر دیا تھا۔ صحابہ کی زندگیاں اس بات کی گواہ ہیں کہ وہ زندگی کے کُل کو دین کے کُل

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے ساتھ مربوط سمجھتے تھے اور زندگی کے ہر پہلو میں دین کے احکامات کو ان کی فضیلت اور اہمیت کے اعتبار سے اپناتے تھے۔ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ گو کسی صحابی نے شجاع طبیعت پائی اور حربی مہارت اور صلاحیت کی وجہ سے جہاد میں خوب حصہ لیا تو کوئی عبادات کا ذوق رکھتا تھا، کوئی انفاق میں ممتاز تھا اور کوئی تبلیغِ دین میں، مگر ان میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جس نے مثلاً صرف جہاد کیا اور جہاد ہی کی فضیلت بیان کی اور باقی اعمال کی حیثیت اور اہمیت گویا اس کے نزدیک اب کچھ نہ رہی، چاہے دین میں اس کا کچھ بھی مقام ہو۔ یا اگر تبلیغِ دین کا کام شروع کیا تو اب ہر ایک سے ہمہ وقت بیان دلوانے اور سنوانے بیٹھ گئے۔ یا اگر خود عبادات کا شوق ہوا تو پورے معاشرے کو چلوں اور مراقبوں کی دعوت دینے لگے اور معاشرت و معیشت اور جہاد اور دیگر دینی فرائض و احکام یا تو سرے سے غائب ہو گئے یا بالکل ثانوی حیثیت اختیار کر گئے۔ آگے چل کر اس قسم کی انتہاء پسندی فہمِ دین کی کمی سے واقع ہوئی، چاہے خلوصِ نیت موجود بھی رہا ہو۔

ابتداء میں جب مسلم معاشروں کے مصلحین نے عوام الناس میں کسی اجتماعی کمی یا خامی کا رجحان دیکھا تو اس طرف زور دینا شروع کیا۔ یہی اس وقت کی ضرورت اور اس کا تقاضا بھی تھا (جیسے حسن بصری نے اپنے زمانے کے حساب سے روحانیت کی کمی کو محسوس کیا تو انہیں اس کو جگانے کی ضرورت محسوس ہوئی)۔ بعد میں چند کم فہم پیروؤں نے ان کے طرزِ عمل کی مصلحت کو سمجھنے کے بجائے اسے دین کی اصل قرار دے کر باقی کی طرف سے توجہ ہٹالی اور اس معاملے میں اس انتہاء تک پہنچے جہاں دین کی ساری خوبصورتی اور اس کا حسن جو توازن میں تھا، جاتا رہا۔ کوئی عقل وخرد کی نذر ہو گیا تو کوئی روحانیت اور تصوف کی، کوئی فقہی باریکیوں میں جا پھنسا تو کوئی زندگی میں انسان کے مختلف کرداروں میں سے کسی ایک کو اس طرح اختیار کر بیٹھا کہ دیگر کو بالکل بھول گیا۔ اس صورتحال سے اسی صورت میں بچا جا سکتا ہے اگر خود مصلحین اور دینی رہنما زندگی میں اعتدال کو قائم رکھنے کی بار بار نصیحت و وصیت کے ساتھ ساتھ دین کے تمام پہلوؤں کی اہمیت اور ضرورت کی طرف توجہ مبذول کرواتے رہیں۔ واضح رہے کہ یہ میرا ذاتی تجزیہ ہے، جس میں غلطی کا پورا احتمال اور اصلاح کی گنجائش موجود ہے۔

اس کتاب کی تیاری میں خصوصی طور سے مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحبؒ کی کتاب ''تاریخِ دعوت وعزیمت'' کا تذکرہ ضروری ہے جس سے بھرپور استفادہ کیا گیا ہے۔ سینکڑوں کتابوں اور تصنیفات میں سے ان کی تحریر کو زبان و بیان پر قدرت، عالمانہ تحقیق اور نتائج کے اخذ کے اعتبار سے فوقیت حاصل ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اسلامی تاریخ کی چیدہ چیدہ ہستیوں کی زندگی سے آگاہی کے لئے مولانا کے علاوہ بھی دیگر ندوی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

علماء کی کوششیں ہر طرف چھائی ہوئی نظر آتی ہیں تو غلط نہ ہوگا۔

اپنی اس کوشش کے لئے میں سب سے بڑھ کر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی شکر گزار ہوں، جس کی توفیق اور مدد شامل حال نہ ہو تو آدمی کچھ بھی نہیں کرسکتا۔ اس کے بعد اپنی والدہ کی دعاؤں اور خصوصاً اپنے شوہر صہیب عمر کی ممنون احسان ہوں جن کی حوصلہ افزائی، تعاون اور انتہائی محنت سے کی گئی ایڈیٹنگ کے بغیر کتاب کا تکمیل پانا ممکن نہ تھا۔ اس کتاب میں جو غلطی یا خامی رہ گئی ہو اسے اپنے سے منسوب کرنے کے ساتھ ساتھ اللہ سے معافی کی طلب گار ہوں اور اگر اس میں کوئی خوبی ہے تو محض توفیقِ الٰہی سے ہے۔ آخر میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی بارگاہ میں عاجزانہ درخواست ہے کہ ہم سے اپنی انفرادی زندگیوں میں اصلاح کے ساتھ ساتھ دین کا کام بھی لے لے، اس کو اپنی جناب میں قبول فرمائے اور دنیا میں بھی اس کے بہترین ثمرات سے امت کو نوازے۔ (آمین)

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم وتب علینا انک انت التواب الرحیم

ناعمہ صہیب
16 اپریل 2005
٦ ربیع الاول ١٤٢٦ھ
کراچی

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فہرست مضامین

صفحہ نمبر	عنوانات	نمبر شمار
1	حضرت عائشہ صدیقہؓ	۱-
33	حضرت خالدؓ بن ولید	۲-
57	حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز	۳-
81	امام ابوحنیفہؒ	۴-
99	امام مالکؒ	۵-
115	امام شافعیؒ	۶-
133	امام احمد بن حنبلؒ	۷-
151	امام بخاریؒ	۸-
173	امام غزالیؒ	۹-
197	سلطان صلاح الدین ایوبیؒ	۱۰-
217	امام ابن تیمیہؒ	۱۱-
237	سلطان محمد فاتحؒ	۱۲-
255	شیخ احمد سرہندیؒ (مجدد الف ثانی)	۱۳-
273	شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ	۱۴-
293	شیخ محمدؒ بن عبدالوہاب	۱۵-
317	فکرِ اقبالؒ اور شخصیت کی چند جھلکیاں	۱۶-
353	مولانا اشرف علی تھانویؒ	۱۷-
389	شیخ حسن البنا شہیدؒ	۱۸-
409	مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ	۱۹-
437	ڈاکٹر حمید اللہؒ	۲۰-
457	مسلمانوں کی مختصر سیاسی تاریخ	*
477	مسلمانوں کی مختصر علمی و فکری تاریخ	*
496	فہرست حوالہ جات	*

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اسلامی تاریخ کے چیدہ چیدہ واقعات

واقعہ	حوالہ	صفحہ نمبر
۱- جنگِ جمل اور اس کا پس منظر	حضرت عائشہ صدیقہؓ	23 تا 24
۲- فتنۂ خلقِ قرآن	امام احمد بن حنبلؒ	137 تا 143
۳- تاریخِ تدوینِ حدیث اور فتنۂ وضعِ حدیث	امام بخاریؒ	155 تا 164
۴- پانچویں صدی ہجری میں مسلمانوں کے حالات	امام غزالیؒ	179 تا 182
۵- صلیبی جنگوں کا پس منظر	صلاح الدین ایوبیؒ	199 تا 204
۶- فتنۂ تاتار	امام ابن تیمیہؒ	221 تا 227
۷- خلافتِ عثمانیہ کے قیام کا پس منظر	سلطان محمد فاتحؒ	240 تا 242
۸- فتحِ قسطنطنیہ	سلطان محمد فاتحؒ	242 تا 252
۹- گیارہویں صدی ہجری میں ملّتِ اسلامیہ خصوصاً برصغیر کے حالات	شیخ احمد سرہندیؒ	258 تا 262
۱۰- بارہویں صدی ہجری میں برصغیر کے مسلمانوں کے علمی، تہذیبی و مذہبی حالات	شاہ ولی اللہؒ	276 تا 279
۱۱- بارہویں صدی ہجری میں نجد اور حجاز کے مسلمانوں کے مذہبی، تمدّنی اور سیاسی حالات	محمد بن عبدالوہابؒ	296 تا 298
۱۲- چودہویں صدی ہجری میں مسلمانانِ عالم خصوصاً برصغیر کے حالات	علامہ محمد اقبالؒ	323 تا 325
۱۳- دارالعلوم دیوبند کے قیام کی تاریخ	مولانا اشرف علی تھانویؒ	355 تا 357
۱۴- ہندوستان کی مسلمان خواتین کی سماجی و معاشرتی حالت	مولانا اشرف علی تھانویؒ	371 تا 375
۱۵- چودہویں صدی ہجری میں مصر کے مسلمانوں کے سیاسی و مذہبی حالات	حسن البنا شہیدؒ	395 تا 398

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فہرست نقشہ جات

نقشہ	حوالہ	صفحہ نمبر
۱-احد میں خالدؓ بن ولید کا حملہ	حضرت خالدؓ بن ولید	37/36
۲-وہ علاقے جہاں خالدؓ نے معرکے سر کئے	حضرت خالدؓ بن ولید	45/44
۳-امام احمد بن حنبلؒ کے علمی سفر	امام احمد بن حنبلؒ	135/134
۴-امام بخاریؒ کے علمی سفر	امام بخاریؒ	155/154
۵-نقشہ محاصرۂ قسطنطنیہ	سلطان محمد فاتحؒ	249/248
۶-محمدؒ بن عبدالوہاب کی جدوجہد کے مرکز علاقے	محمدؒ بن عبدالوہاب	301/300
۷-خلافتِ راشدہ	اسلام کی مختصر سیاسی تاریخ	459/458
۸-خلافت بنوامیہ	اسلام کی مختصر سیاسی تاریخ	459/458
۹-اسلامی دنیا منگول حملے کے وقت	اسلام کی مختصر سیاسی تاریخ	467/466
۱۰-سلطنتِ مغلیہ بعہدِ اورنگزیب	اسلام کی مختصر سیاسی تاریخ	475/474
۱۱-اسلامی دنیا ۱۷۰۰ء میں	اسلام کی مختصر سیاسی تاریخ	475/474

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حضرت عائشہ صدیقہؓ

امتِ محمدیہ کی خواتین میں سب سے بڑی عالمہ اور فقیہہ اور مسلمان عورتوں کے لئے لائقِ تقلید

تعارف

عائشہ نام، صدیقہ اور حمیرا لقب، ام عبداللہ کنیت اور ام المومنین خطاب تھا۔ والد کا نام عبداللہ اور کنیت ابوبکر تھی۔ والدہ کا نام ام رومانؓ تھا۔ آپ کا سلسلہ نسب یہ ہے:

عائشہؓ بنت ابی بکر بن ابی قحافہ بن عامر بن عمر بن کعب بن سعد بن تیم بن مرہ۔ آپ کا نسب آٹھویں پشت پر نبی اکرم ﷺ سے جا ملتا ہے۔

ام المومنین کا خطاب اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ سمیت سب ازواج المطہرات کو ملا۔ جب تک اللہ کی طرف سے مسلمانوں کو یہ حکم نہیں دیا گیا تھا کہ نبی کی بیویاں امت کی ماؤں کا درجہ رکھتی ہیں، تب تک لوگ آپ کو امِ عبداللہ کہہ کر پکارتے تھے۔ آپ کی اپنی کوئی اولاد نہ تھی، چنانچہ ایک بار حضور ﷺ سے عرض کیا کہ آپ کی تمام بیویوں نے اپنی سابقہ اولادوں کے نام پر کنیت رکھ لی ہے، میں اپنی کنیت کس کے نام پہ رکھوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا ''اپنے بھانجے عبداللہ کے نام پر۔''[1] چنانچہ اسی دن سے امِ عبداللہ حضرت عائشہؓ کی کنیت قرار پائی۔

آپؓ کا تعلق جس گھرانے سے تھا وہ کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ آپ کے والد حضرت ابوبکرؓ نبی اکرم ﷺ کے سب سے قریبی ساتھی اور مردوں میں سب سے پہلے اسلام لانے والے تھے۔ اسلام کے لئے ان کی خدمات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہیں۔ نبی اکرم ﷺ کے وصال کے بعد پہلے خلیفہ راشد بننے کی سعادت بھی انہی کو حاصل ہے۔

---

(۱) سنن ابوداؤد۔ مسند ابن حنبل۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ولادت

حضرت عائشہؓ کی ولادت کے بارے میں مختلف آراء کی بناء پر کوئی بات حرفِ آخر کے طور پر نہیں کہی جاسکتی۔ البتہ دو قول زیادہ مشہور ہیں۔ پہلے قول کے مطابق آپ کی ولادت نبوت کے پانچویں سال کے آخری حصے میں ہوئی، جبکہ دوسرے قول کے مطابق نبوت سے پانچ سال قبل پیدا ہوئیں۔ دیکھا جائے تو دونوں اقوال میں بہت فرق ہے۔ ہم متعدد وجوہات کی بناء پر جو آئندہ بیان کی جائیں گی پہلے قول کو ترجیح دیں گے۔

بچپن اور ابتدائی حالات

حضرت عائشہؓ سرخ وسفید رنگ اور ہشاش بشاش چہرے والی خوش شکل لڑکی تھیں۔ بلا کی پھرتیلی تھیں اور کھیل کود کی بہت شوقین تھیں۔ ہم عمر لڑکیاں آپ کے گرد جمع رہتیں۔ سب مل کر گڑیوں کے ساتھ کھیلتیں۔ کبھی اتفاق سے نبی اکرم ﷺ تشریف لے آتے تو بچیاں بھاگ کر چھپ جاتیں اور آپ گڑیوں کو چھپا لیتیں۔ حضور ﷺ بچیوں کو بلاتے اور کھیلنے کو کہتے۔ ایک بار حضرت عائشہؓ گڑیوں سے کھیل رہی تھیں کہ رسول اللہ ﷺ پہنچ گئے۔ گڑیوں میں ایک گھوڑا بھی تھا جس کے دائیں بائیں دو پر لگے ہوئے تھے۔ آپ ﷺ نے پوچھا ''عائشہ یہ کیا ہے؟'' جواب دیا کہ: ''گھوڑا ہے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''گھوڑے کے پر تو نہیں ہوتے''۔ کہنے لگیں۔ ''کیوں؟ حضرت سلیمانؑ کے گھوڑوں کے تو پر تھے۔'' آپ ﷺ اس جواب پر مسکرادیے۔ (۱)

گڑیوں سے کھیلنے کے علاوہ آپؓ کو جھولا جھولنا بھی بہت پسند تھا۔ آپ کا بچپن محض کھیل کود کی نذر نہ ہوا بلکہ صدیق اکبرؓ کا گھر اسلام پر آنے والی ہر آزمائش سے متاثر ہوتا تھا۔ حالات کی سختی نے سیدنا ابوبکرؓ کو بھی حبشہ ہجرت کرنے پر مجبور کردیا تھا۔ اگرچہ وہ راستے ہی سے واپس آگئے تھے، مگر عائشہؓ کو یہ واقعہ اپنی پوری تفصیلات کے ساتھ یاد رہا۔

حضرت عائشہؓ کی تربیت کس ماحول میں ہوئی اس کا اندازہ آپؓ کے قول سے لگایا جاسکتا ہے: ''جب سے میں نے ہوش سنبھالا اپنے والدین کو دین سے مزین پایا اور کوئی دن ایسا نہ ہوتا تھا کہ جس میں رسول اللہ ﷺ صبح و شام دونوں وقت ہمارے ہاں تشریف نہ لاتے ہوں۔''

شادی

حضرت خدیجہؓ نبی اکرم ﷺ کی پہلی بیوی تھیں۔ وہ آپ ﷺ کی بہترین ساتھی، غمخوار اور ہمدرد تھیں سنہ۱

(۱) مشکوٰۃ المصابیح۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نبوی میں ان کے انتقال کے بعد نبی اکرم ﷺ اکثر ملول رہا کرتے۔ ایک روز حضرت خولہ بنت حکیمؓ جو حضرت عثمان بن مظعونؓ کی بیوی تھیں نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور دوسری شادی کی تجویز دی۔ ساتھ ہی حضرت سودہؓ اور حضرت عائشہؓ کا نام پیش کیا۔ آپ ﷺ نے اپنی مرضی ظاہر کی اور بات کرنے کی اجازت دے دی۔ حضرت خولہؓ نے آپ ﷺ کی اجازت پاکر حضرت ابوبکرؓ اور ام رومانؓ سے بات کی۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا کہ نبی اکرم ﷺ تو میرے منہ بولے بھائی ہیں۔ اس نسبت سے عائشہ آپ ﷺ کی بھتیجی ہوئیں، آخر یہ نکاح کس طرح ہوسکتا ہے؟ آپ ﷺ تک یہ بات پہنچی تو فرمایا[1]: ''ابوبکرؓ میرے دینی بھائی ہیں اور اس قسم کے بھائیوں کی اولاد سے نکاح جائز ہے۔''

حضرت ابوبکرؓ اس طرف سے مطمئن ہوئے تو دوسری طرف یہ خیال بھی دامن گیر ہوا کہ حضرت عائشہؓ کی بات جبیر بن مطعمؓ کے لڑکے سے طے ہو چکی ہے۔ لہٰذا اس سے بات کرنا ضروری ہے۔ جبیر کا خاندان چونکہ ابھی مسلمان نہ ہوا تھا لہٰذا اس نے خود ہی بات ختم کرنے کا عندیہ دیا۔ اب کوئی رکاوٹ سامنے نہ تھی۔

شوال ۱۰ نبوی ہجرت سے تین سال قبل چھ برس کی عمر میں حضرت عائشہؓ کا نکاح نبی اکرم ﷺ سے پانچ سو درہم حق مہر پر ہوا۔ نکاح اس سادگی سے ہوا کہ حضرت عطیہ بیان کرتی ہیں کہ ''حضرت عائشہؓ لڑکیوں کے ساتھ کھیل رہی تھیں، ان کی انا آئی اور ان کو لے گئی۔ حضرت ابوبکرؓ نے آکر ان کا نکاح پڑھا دیا۔''

خود آپؓ کہتی ہیں: ''جب میرا نکاح ہوا تو مجھ کو خبر تک نہ ہوئی کہ میرا نکاح ہوگیا۔ جب میری والدہ نے باہر نکلنے میں روک ٹوک شروع کی تب میں سمجھی کہ میرا نکاح ہوگیا ہے۔ اس کے بعد میری والدہ نے مجھے سمجھا بھی دیا۔''

اس واقعے کو پڑھنے کے بعد اس بات میں شک کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ حضرت عائشہؓ نکاح کے وقت چھ برس کی تھیں۔ ورنہ جو حضرات اس وقت آپ کی عمر پندرہ سال بتاتے ہیں وہ اس بات کی توجیہ کیسے کریں گے کہ ایک پندرہ سالہ لڑکی ان تمام معاملات سے اس قدر بے خبر تھی اور کھیل کود میں اس طرح مصروف تھی کہ اس کا نکاح کر دیا گیا اور اس کو معلوم بھی نہ ہوا۔ ایک عام لڑکی جو عمر کے پندرہویں سال میں قدم رکھ چکی ہو اس سے بھی یہ توقع نہیں رکھی جاسکتی، کجا یہ کہ حضرت عائشہ جیسی ذہین وفطین اور معاملہ فہمی میں کمال رکھنے والی شخصیت سے جن کو قدرت نے خاص اپنے کام کے لئے چنا تھا۔ اس کی تصدیق صحیح مسلم کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس میں حضرت عائشہؓ نے نکاح کے وقت اپنی عمر چھ برس اور رخصتی کے وقت نو برس بتائی۔ ساتھ میں یہ بھی بتایا کہ اس

(۱) مشکوۃ المصابیح۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

موقع پر گڑیاں آپ کے ساتھ تھیں۔

حضرت عائشہؓ نکاح کے بعد تقریباً تین برس تک میکے میں رہیں، دو برس تین ماہ مکے میں اور سات آٹھ مہینے ہجرت کے بعد مدینہ میں۔ آپؓ نے نبی اکرم ﷺ اور ابوبکر صدیقؓ کی ہجرت کے بعد اپنی والدہ اور بہن بھائی کے ساتھ مدینہ کے لئے رختِ سفر باندھا۔

رخصتی

مدینہ منورہ پہنچ کر حضرت عائشہؓ اپنے رشتہ داروں کے ساتھ بنو حارث بن خزرج کے محلے میں اتریں اور سات آٹھ ماہ تک اپنی والدہ کے ساتھ یہیں مقیم رہیں۔ مدینے کی آب و ہوا مکے والوں کو موافق نہ آئی اور بہت سے مہاجرین بیمار پڑ گئے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور پھر اس کے بعد حضرت عائشہؓ خود ایسی بیمار ہوئیں کہ سر کے بال تک جھڑ گئے۔ صحت یابی کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے رخصتی سے متعلق آنحضرت ﷺ سے تذکرہ کیا تو آپ ﷺ نے مہر کی رقم موجود نہ ہونے کا عذر کیا۔ ہر موقعے کی طرح اس موقع پر بھی ابوبکر صدیقؓ خود آگے بڑھے اور رقم نبی اکرم ﷺ کو پیش کر دی۔

آپ ﷺ نے یہ رقم حضرت عائشہؓ کو بھجوا دی۔ انصار کی عورتیں دلہن کو رخصت کرانے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے گھر پہنچیں۔ ام رومان نے بیٹی کو آواز دی۔ حضرت عائشہؓ اس وقت سہیلیوں کے ساتھ جھولا جھول رہی تھیں۔ بھاگی بھاگی آئیں۔ والدہ نے منہ دھلا کر بال سنوارے، پھر آپ کو دلہن بنایا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد خود آنحضرت ﷺ بھی تشریف لے آئے۔

اس طرح حضرت عائشہؓ شوال سنہ ۱ ہجری میں انتہائی سادگی سے رخصت ہو کر نبی اکرم ﷺ کے گھر آ گئیں۔ رخصتی کی تقریب میں زمانہ جاہلیت کی رسموں کی کوئی پرواہ نہ کی گئی۔ اہلِ عرب شوال میں شادی نہ کرتے تھے اور اس مہینے کو منحوس سمجھتے تھے۔ حضرت عائشہؓ کی شادی اور رخصتی دونوں اسی ماہ میں ہوئیں۔ دستور کے مطابق دلہن کے آگے آگ جلائی گئی نہ شوہر کا اپنی بیوی سے محمل کے اندر ملاقات کو ضروری سمجھا گیا، بلکہ مہر کی رقم کی ادائیگی کے ساتھ ہی اس فرض کو ادا کر دیا گیا۔

گھر کے معاملات اور امورِ خانہ داری

حضرت ابوبکر صدیقؓ کی مالی حیثیت مستحکم تھی۔ یوں حضرت عائشہؓ کا بچپن خوشحالی میں گذرا۔ آپؓ رخصت ہو کر جس گھر میں آئیں وہ کوئی محل نہ تھا، بلکہ ایک نبی کا گھر تھا۔ مسجدِ نبوی سے ملا ہوا ایک حجرہ جس کا دروازہ مسجد

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نبوی کے صحن کی طرف کھلتا تھا۔ یہ حجرہ سات آٹھ ہاتھ لمبا چوڑا تھا۔ اس کی دیواریں مٹی کی تھیں۔ کھجور کی ٹہنیوں اور پتوں کی چھت تھی۔ اس چھت پر ایک کمبل پڑا رہتا تاکہ کمرہ بارش کے پانی سے بچا رہے۔ چھت کی اونچائی اتنی تھی کہ ایک آدمی کھڑا ہو کر ہاتھ اٹھائے تو چھت کو چھو سکتا تھا۔ گھر کی کل کائنات ایک چارپائی، ایک چٹائی، ایک بستر، ایک تکیہ، آٹا اور کھجور رکھنے کے ایک دو مٹکوں، پانی کے ایک برتن اور ایک پیالے پر مشتمل تھی۔

آپ ﷺ چاہتے تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ اپنے حبیب کے لئے سونے چاندی کے خزانوں کا منہ کھول دیتا۔ مگر آپ ﷺ نے حالتِ فقر کو اپنے اور اپنے گھر والوں کے لئے پسند کیا۔ چالیس چالیس راتیں بیت جاتیں اور گھر میں چراغ نہ جلتا تھا۔ گھر میں کھانا پکانے کی نوبت بہت کم آتی تھی۔ خود حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ کبھی تین دن متصل ایسے نہیں گزرے کہ خاندانِ نبوت نے سیر ہو کر کھایا ہو، چھوارے اور پانی پر گذارا ہوتا تھا۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اکثر آپ ﷺ کے ہاں تحفے اور ہدیے بھیجا کرتے، مگر وہ استعمال سے پہلے ہی ضرورت مندوں کو دے دیئے جاتے۔ اکثر ایسا ہوا کہ حضور ﷺ گھر تشریف لائے اور پوچھا کہ کچھ کھانے کو ہے؟ عرض کیا گیا یا رسول اللہ! اللہ کے نام کے سوا کچھ نہیں۔ فرمایا اچھا تو آج میرا روزہ ہے۔ اور پھر حضرت عائشہؓ کا بھی روزہ ہو جاتا۔

یہ صرف ابتدائی دنوں کا نقشہ نہیں بلکہ سادگی کی یہ کیفیت ہمیشہ برقرار رہی۔ خیبر کی فتح کے بعد آپ ﷺ نے ازواج کے لئے سالانہ خرچ مقرر کر دیا تھا۔ مگر کاشانۂ نبوت میں فیاضی کا یہ عالم تھا کہ سامان کچھ ہی دنوں میں ختم ہو جاتا۔ گلے شکوے یا ناشکری تو دور کی بات ہے، صدیق اکبرؓ کی بیٹی تو اب خود اسی رنگ میں رنگ گئی تھیں۔

حضرت عائشہؓ چونکہ کم سن تھیں، لہٰذا گھر کے انتظام میں کبھی کبھار بھول چوک ہو جاتی۔ آٹا گوندھ کر رکھتیں اور بے خبر سو جاتیں۔ بکری آتی اور کھا جاتی۔ ایک دن آپؓ نے آٹا پیسا اور اس کی ٹکیاں پکائیں۔ آنحضرت ﷺ کا انتظار تھا کہ آنکھ لگ گئی۔ پڑوسی کی بکری آئی اور سب کھا گئی۔ کھانا پکانے میں بھی ایسی خاص ماہر نہ تھیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ آپ گھر کے کاموں میں دلچسپی نہ لیتی تھیں بلکہ خود ہی گھر کی صفائی کرتیں، آٹا پیستیں، گوندھتیں اور روٹی پکاتی تھیں۔ حضور ﷺ کے آرام کا خاص خیال رکھتیں۔ آپ ﷺ کے لئے بستر بچھاتیں، آپ ﷺ کے وضو کا پانی تیار رکھتیں۔ آپ ﷺ کے کپڑے اپنے ہاتھ سے دھوتیں۔ حضور ﷺ کے سر کو دھو کر بالوں میں کنگھا کر دیتیں، آپ ﷺ کو عطر لگا دیتیں۔ آپ ﷺ مسواک کا استعمال بہت اہتمام سے کرتے تھے، چنانچہ آپ ﷺ کی مسواک کا خاص خیال رکھتیں۔

مہمانوں کی آمد پر ان کی خاطر مدارات کرتیں۔ بعض اوقات آنحضرت ﷺ مہمانوں کو لے کر آجاتے تو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میزبانی میں کوئی کسر نہ چھوڑتیں۔ حضرت قیس غفاریؓ کہتے ہیں کہ ایک بار حضور ﷺ نے کہا چلو عائشہ کے گھر چلیں۔ ہم آپ ﷺ کے ساتھ حجرے میں پہنچے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: عائشہ ہم لوگوں کو کھانا کھلاؤ۔ وہ چونی کا پکا ہوا لائیں۔ آپ ﷺ نے کھانے کو کچھ اور مانگا تو حریرہ پیش کیا۔ آپ ﷺ نے پھر کچھ مانگا تو دودھ حاضر کیا۔ اس کے بعد ایک پیالے میں پانی لائیں۔ (۱)

حضرت عائشہؓ صرف گھریلو انتظام کی ذمہ داری کو ادا کرنے کی کوشش نہ کرتیں بلکہ نبی اکرم ﷺ کے تعلقات کو بھی نبھانے کی پوری کوشش کرتیں۔ آپ ﷺ کی چار بیٹیاں جو حضرت خدیجہؓ سے تھیں ان میں سے حضرت فاطمہؓ کے ساتھ رہنے کا زیادہ موقع ملا۔ وہ آپ کی سوتیلی اولاد تھیں، لیکن عمر بھر ان کے ساتھ بہترین سلوک کیا۔ ان کی شادی کے انتظام میں بھرپور حصہ لیا۔ ہمیشہ ان کی تعریف میں رطب اللسان رہیں اور ان کے آپس کے تعلقات ہمیشہ بہت خوشگوار رہے۔

شوہر کی محبت اور اطاعت

حضرت عائشہؓ کا حضور اکرم ﷺ سے جو تعلق تھا وہ محتاج بیان نہیں۔ آپ ﷺ کے کسی حکم سے سرمو اختلاف نہ کرتیں، آپ ﷺ کی خدمت میں کوئی کسر نہ چھوڑتیں اور آپ ﷺ کی ضرورتوں کا بھرپور خیال رکھتیں۔ اس پر آٹھ سوکنوں کی موجودگی میں محبت میں بٹوارا بھی برداشت کرنا پڑتا۔ ایسے وقت دل کی کیفیات کو خود بیان فرماتی ہیں کہ:

میں نے ایک رات رسول ﷺ کو نہیں دیکھا تو میں سمجھی آپ کسی اور بیوی کے پاس گئے ہیں۔ میں نے ڈھونڈا تو آپ ﷺ رکوع میں تھے یا سجدے میں۔ فرماتے تھے: پاک ہے تو، تیری تعریف کرتا ہوں۔ تیرے سواء کوئی معبود نہیں۔ میں نے کہا قربان ہوں آپ پر میرے والدین، آپ اور کام میں ہیں اور میں اور ہی خیال میں ہوں (۲)۔''

ایک دفعہ سفر میں حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ نے اپنے اونٹ بدل لئے۔ حضور ﷺ حضرت عائشہؓ کے اونٹ کے پاس آئے تو حفصہؓ کو پایا اور انہی سے باتیں کرنے لگے۔ اب حضرت عائشہؓ کی بے چینی دیدنی تھی۔ ایک جگہ پڑاؤ ہوا تو اتر کر گھاس پر پاؤں رکھ دیئے کہ بچھو ڈس لے تو محبوب کی جدائی سے یہ اچھا ہے (۳)۔

دیگر ازواج مطہرات سے آپ کے تعلقات بجز چند واقعات کے ہمیشہ اچھے رہے۔ آپ ہمیشہ اپنی سوکنوں

---

(۱) سنن ابوداؤد۔ (۲) سنن نسائی (۳) صحیح بخاری

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی خوبیوں کا تذکرہ کرتیں۔ چند مواقع پر اگر معمولی بحث ہوتی بھی تو معاملات حد میں رہتے اور جلد ہی تلخی دور ہو جاتی۔

حضرت عائشہؓ کو نبی اکرم ﷺ کی کی راحت و تکلیف اور پسند و ناپسند کا بہت خیال رہتا۔ جو بات آپ ﷺ کو ناگوار گزرتی وہ حضرت عائشہؓ کے لئے بھی باعث تکلیف ہوتی۔ ایک بار ایک عورت نے آ کر اطلاع دی کہ حضرت جعفرؓ کے ہاں عورتیں نوحہ کر رہی ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ منع کر دو۔ وہ گئے اور واپس آ گئے کہ نہیں مانتیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا ان کے منہ میں خاک ڈال دو۔ وہ پھر گئے اور واپس آ کر کچھ کہنے لگے۔ حضرت عائشہؓ دروازے کی درز سے دیکھ رہی تھیں، بے قرار ہو گئیں کہ ناحق آپ ﷺ کو تکلیف دے رہے ہیں، نہ جو آپ ﷺ کہتے ہیں وہ کرتے ہیں نہ آپ ﷺ کی جان چھوڑتے ہیں (۱)۔

ایک بار آپ ﷺ حضرت عائشہؓ کے زانو پر سر رکھ کر سو رہے تھے کہ حضرت ابوبکرؓ نے کسی بات پر غصے میں آ کر بیٹی کے پہلو میں کونچا دیا۔ آپؓ فرماتی ہیں کہ میں صرف اس خیال سے نہیں ہلی کہ آپ ﷺ کی نیند میں خلل واقع نہ ہو۔ (۲)

نبی کریم ﷺ کی اطاعت دل و جان سے کیا کرتیں۔ کہتی ہیں کہ ایک بار رسول اکرم ﷺ میرے پاس آئے اور میں ایک تصویر والا پردہ ڈالے تھی۔ آپ ﷺ کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور آپ ﷺ نے اس پردے کو لے کر پھاڑ ڈالا۔ پھر فرمایا: ''سب سے زیادہ سخت عذاب قیامت میں ان لوگوں کو ہوگا جو اللہ تعالیٰ کی مخلوق کی صورت بناتے ہیں۔'' ایک اور روایت میں ہے کہ اس کے بعد حضرت عائشہؓ نے اس کو کاٹ کر اس کے تکیے بنا لئے۔ (۳)

محبت کا تعلق یکطرفہ نہ تھا بلکہ نبی کریم ﷺ بھی آپ کی بہت قدر کیا کرتے تھے۔ آپ ﷺ حضرت عائشہؓ کے ساتھ ایک دسترخوان پر بلکہ ایک ہی برتن میں کھانا کھاتے تھے۔ باہمی محبت کا یہ عالم تھا کہ آپ ﷺ وہی ہڈی چوستے جس کو حضرت عائشہؓ چوستی تھیں۔ پیالے میں وہیں پر منہ رکھ کر پیتے تھے جہاں حضرت عائشہؓ منہ لگاتی تھیں۔ ایک بار ایک پڑوسی نے آپ ﷺ کی دعوت کی۔ آپ ﷺ نے پوچھا: ''عائشہ بھی ہوں گی؟'' اس نے کہا ''نہیں۔'' ارشاد فرمایا ''تو میں بھی قبول نہیں کرتا۔'' وہ دوبارہ درخواست لے کر آیا اور آپ ﷺ نے دوبارہ یہی پوچھا۔ آخر تیسری بار وہ حضرت عائشہؓ کے لئے بھی دعوت کا پیغام لایا تو آپ ﷺ نے آنا قبول کر لیا (۴)۔

---

(۱) صحیح بخاری (۲) صحیح بخاری (۳) سنن نسائی (۴) صحیح مسلم

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نبی اکرم ﷺ حضرت عائشہؓ کی دلجوئی بھی کیا کرتے۔ ہنسی خوشی کی باتوں اور ہلکے پھلکے مزاح سے گھر کا ماحول بوجھل نہیں ہونے دیتے تھے۔ حضرت عائشہؓ نسوانی ناز کے ساتھ کبھی گفتگو کرتیں تو رسالت مآب ﷺ ایک شوہر کی حیثیت سے خوش دلی سے اس کا جواب دیتے۔ آپ ﷺ نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کہ ''عائشہؓ جب تم مجھ سے خوش رہتی ہو یا ناراض ہوتی ہو تو مجھ کو پتہ لگ جاتا ہے۔ ناراض ہوتی ہو تو ''ابراہیمؑ کے خدا کی قسم'' اور خوش رہتی ہو تو ''محمد ﷺ کے خدا کی قسم'' کھاتی ہو۔'' حضرت عائشہؓ نے کہا: ''یا رسول اللہ! صرف زبان سے نام چھوڑ دیتی ہوں(۱) (یعنی دل سے آپ ﷺ کی محبت نہیں چھوڑتی)''۔

اس طرح کے متعدد واقعات احادیث اور تاریخ کی کتابوں میں ملتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ نبی کریم ﷺ اصحاب کی تربیت، حالات کی سختی، مختلف سیاسی وجنگی امور کی مصروفیت اور عبادت کی کثرت کے باوجود اپنی ازواج کو نہ صرف وقت دیا کرتے، بلکہ ان کی خوشی کا خاص خیال رکھتے تھے۔ حضرت عائشہؓ کے ساتھ آپ ﷺ کی دوڑ کا مقابلہ ہو یا چادر کی آڑ میں حبشیوں کا تماشہ دکھانے کا موقع ہو، آپ ﷺ اپنی بیوی کی عمر، طبیعت اور مزاج کا پورا لحاظ رکھتے تھے۔

سیرت کی اس جھلک کو یہاں دکھانے کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان مرد اسوۂ رسول ﷺ کے آئینے میں بیویوں سے اپنے تعلق کو پرکھیں۔ نبی اکرم ﷺ امام الانبیاء تھے۔ جو مقام آپ ﷺ کو حاصل تھا اس کے باوجود بیویوں کے جذبات کو اہمیت دینا، ان کو خوش رکھنے کی کوشش کرنا اور ان سے دوستی اور محبت کا تعلق استوار رکھنا آپ ﷺ کے اعلیٰ اخلاق کی علامت ہے اور مسلمان مردوں کے لئے قابلِ تقلید ہے۔ افسوس کہ عام لوگ تو کجا، مذہبی ذہن رکھنے والے اور علماء تک اس معاملے میں اسوۂ رسول ﷺ کی کھلم کھلا خلاف ورزی کرتے نظر آتے ہیں اور نہ اپنے طرزِ عمل پر نادم ہوتے ہیں نہ اس کی اصلاح کی انہیں کوئی فکر ہے۔ مسلمان مرد عمومی طور پر اپنے حقوق کا نہ صرف پورا پورا فہم رکھتے ہیں بلکہ اپنی بیویوں کو وقتاً فوقتاً اس کی یاددہانی بھی کراتے رہتے ہیں۔ لیکن معاملہ جب حق کی ادائیگی کا ہو تو روٹی کے چند ٹکڑے ان کے سامنے رکھ کر اپنے آپ کو بری الذمہ سمجھتے ہیں، اور جس محبت، توجہ اور تحمل کی عورت طلب گار ہوتی ہے اس سے اسے محروم رکھتے ہیں۔

نبی اکرم ﷺ کا اپنی تمام ازواج کے ساتھ بہترین معاملہ تھا۔ البتہ حضرت عائشہؓ کی طرف قلبی رجحان زیادہ تھا۔ چنانچہ آپ ﷺ فرماتے، الٰہی جو چیز میرے امکان میں ہے (یعنی بیویوں میں معاشرت اور لین دین کی برابری) میں اس عدل سے باز نہیں آتا، لیکن جو میرے امکان سے باہر ہے (یعنی عائشہ کی محبت) اس کو معاف کرنا۔(۲)

(۱) صحیح بخاری (۲) سنن ابوداؤد۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ازواج مطہرات نے جب خرچ میں اضافے کے لئے نبی ﷺ پر زور دینا شروع کیا تو قرآن مجید میں آیات تخییر نازل ہوئی کہ جو چاہے آپ ﷺ کے ساتھ رہے اور جو چاہے وہ علیحدہ ہو جائے۔ اس موقع پر بھی آپ ﷺ نے سب سے پہلے حضرت عائشہؓ سے پوچھا اور ساتھ میں ہدایت کی کہ جواب دینے میں جلدی نہ کرنا اور والدین سے پوچھ کر جواب دینا۔ حضرت عائشہؓ نے بغیر کسی توقف کے نبی اکرم ﷺ کو اختیار کیا اور کہنے لگیں کہ اس میں مشورہ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس کے بعد دیگر ازواج نے بھی یہی جواب دیا۔

تعلیم

حضرت عائشہؓ نے صدیق اکبرؓ جیسے باپ کی آغوش میں ابتدائی تعلیم پائی۔ دین کے علم کے حصول کے ساتھ ساتھ تاریخ، علم الانساب اور شاعری کا شوق خاندان سے ورثے میں ملا تھا۔ کم عمری میں ہی آپؓ رخصت ہوکر نبی اکرم ﷺ کے پاس آ گئیں۔ لہٰذا باقاعدہ تعلیم کا زمانہ اس کے بعد ہی شروع ہوتا ہے۔ قوتِ حافظہ اتنی زبردست تھی کہ بچپن کی باتیں اور واقعات عمر بھر یاد رہے۔ اپنے والدین سے قرآن مجید کی کوئی آیت سنتیں تو یاد رکھتیں۔ خود فرماتی ہیں کہ جب یہ آیت "**بل الساعة موعدهم والساعة ادهى وامر**" نازل ہوئی تو اس وقت میں کھیل رہی تھی۔

عرب میں پڑھنے لکھنے کا رواج کم تھا اور عورتوں میں سے تو بہت کم خواندہ تھیں۔ حضرت عائشہؓ نے پڑھنا سیکھ لیا تھا۔ قرآن مجید دیکھ کر پڑھا کرتی تھیں۔ ایک روایت کے مطابق آپ لکھنا بھی جانتی تھیں۔ خطوط کے جواب خود دیا کرتی تھیں۔ طب کے فن سے بھی دلچسپی تھی۔ اس کی باقاعدہ تعلیم تو حاصل نہ کی البتہ مختلف بیماریوں کے لئے اطباء جو دوائیاں تجویز کیا کرتے آپؓ انہیں یاد کر لیتیں۔

دنیاوی علوم کے علاوہ دینی علوم کے حصول کا سلسلہ تو ہر وقت ہی جاری رہتا۔ ایک طرف تو آپ کا حجرہ مسجد نبوی ﷺ میں کھلتا تھا۔ وہاں ہونے والی مجلسوں کی پل پل کی خبر رہتی۔ دوسری طرف خود حضرت عائشہؓ کے مزاج میں یہ بات شامل تھی کہ جب تک اچھی طرح تسلی نہ ہو جاتی آپؓ نبی اکرم ﷺ سے بلا جھجک سوالات کرتیں۔ آپ ﷺ بھی برا نہ مناتے اور حق کو جاننے اور سمجھنے کی اس کوشش کی حوصلہ شکنی نہ فرماتے۔ احادیث کی کتب اس طرح کی مثالوں سے بھری ہوئی ہیں جن میں حضرت عائشہؓ نے آپ ﷺ سے مختلف استفسار کئے اور آپ ﷺ نے ان کے جوابات دیئے۔ ان سب کا تذکرہ تو یہاں ممکن نہیں، البتہ دو تین واقعات نقل کرتے ہیں جن سے تعلیم کے لئے آپؓ کے شوق کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایک دفعہ ایک یہودی عورت آپ کے یہاں آئی۔ اس نے عذاب قبر کا ذکر چھیڑ دیا اور کہا کہ اللہ آپ کو عذابِ قبر سے محفوظ رکھے۔ اس پر آپؓ نے رسول ﷺ سے اس کے متعلق دریافت کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہاں عذابِ قبر حق ہے۔ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ پھر میں نے کبھی ایسا نہیں دیکھا کہ آپ ﷺ نے کوئی نماز پڑھی اور اس میں عذاب قبر سے خدا کی پناہ نہ چاہی ہو۔ (۱)

ایک بار نبی اکرم ﷺ سے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ! بعض باتیں کاہن کہتے ہیں اور وہ سچ نکلتی ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ سچ بات جن اچک لیتا ہے اور اپنے دوست کے کان میں ڈال دیتا ہے اور سو جھوٹ اس میں بڑھا دیتا ہے(۲)۔

ایک مرتبہ ایک شخص نے خدمت نبوی ﷺ میں حاضر ہونا چاہا۔ آپ ﷺ نے فرمایا ''آنے دو، وہ اپنے خاندان میں برا ہے۔'' جب وہ آ کر بیٹھا تو آپ ﷺ نے نہایت توجہ سے باتیں کیں۔ حضرت عائشہؓ کو تعجب ہوا۔ جب وہ اٹھ کر چلا گیا تو عرض کیا کہ: ''یارسول اللہ ﷺ! آپ تو اس کو اچھا نہیں جانتے تھے۔ لیکن جب وہ آیا تو آپ نے اس سے لطف و محبت سے گفتگو فرمائی۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''بدترین آدمی وہ ہے جس کی بداخلاقی سے ڈر کر لوگ اس سے ملنا چھوڑ دیں۔''(۳)

روزمرہ کے واقعات کے علاوہ ماضی کے واقعات اور اشخاص کے بارے میں بھی پوچھا کرتیں۔ ایک دن عبداللہ بن جدعان کے بارے میں سوال کیا جو قریش کا نیک مزاج اور رحم دل مشرک تھا۔ حضرت عائشہؓ نے پوچھا، یارسول اللہ ﷺ! عبداللہ بن جدعان جاہلیت میں لوگوں سے مہربانی سے پیش آتا تھا، غریبوں کو کھانا کھلاتا تھا۔ کیا یہ عمل اس کو کچھ فائدہ دے گا۔ آپ ﷺ نے جواب دیا نہیں عائشہ! اس نے کسی دن یہ نہیں کہا کہ خدایا قیامت میں میری خطا معاف کرنا۔(۴)

غزوہ احد کے بعد رسول اللہ ﷺ سے ایک روز پوچھا کہ ''یارسول اللہ ﷺ! آپ پر احد کے دن سے بھی زیادہ کوئی دن سخت گزرا ہے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں نے بہت آفت اٹھائی تیری قوم سے اور سب سے زیادہ سخت مجھے عقبہ کے دن رنج ہوا۔'' اس کے بعد نبی اکرم ﷺ نے طائف کے واقعے کی تفصیل بیان کی۔

واقعہ طائف کے علاوہ آنحضرت ﷺ کی ہجرت کا واقعہ بھی ہم تک حضرت عائشہؓ کی زبانی پہنچا جو آپؓ نے یقیناً اپنے والد سے سنا تھا۔ اسی طرح ابوبکر صدیقؓ کے ہجرتِ حبشہ کے واقعے کو بھی آپ نے یاد رکھا اور بیان کیا۔ حضرت عائشہؓ سوال و جواب کے علاوہ بھی نبی اکرم ﷺ کی ایک ایک حرکت، منہ سے نکلنے والے الفاظ، آپ ﷺ

(۱) صحیح بخاری (۲) بخاری و مسلم (۳) صحیح بخاری۔ (۴) مسند احمد بن حنبل

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے معمولات اور عبادات پر گہری نظر رکھتیں۔

علم کی جستجو، طبیعت کی حساسیت، بہترین حافظے اور خود اعتمادی نے اس کم عمری میں حضرت عائشہؓ کی تعلیم کا مکمل سامان کر دیا۔ اس پر نبی اکرم ﷺ کی صحبت اور نظرِ خاص نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔

تربیت

نبی اکرم ﷺ نے حضرت عائشہؓ کو تعلیم ہی نہ دی بلکہ آپؓ کی تربیت پر بھی بھرپور نظر رکھی۔ عموی طور پر دیکھا جاتا ہے کہ بڑے اور نامور لوگ جو اپنی پوری زندگی دوسروں کی تعلیم و تربیت میں گذار دیتے ہیں اور بڑے بڑے انقلاب لانے کا باعث بنتے ہیں، ان کے اپنے گھر والے اس سے محروم رہ جاتے ہیں اور چراغ تلے اندھیرا ہی رہ جاتا ہے۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ: آپ ﷺ کا معمول تھا کہ جب گھر تشریف لاتے تو بلند آواز سے یہ الفاظ دہراتے: ''آدم کے بیٹے کی ملکیت میں اگر دولت و مال سے بھرے ہوئے دو میدان ہوں، وہ تیسرے کی حرص کرے گا۔ اس کی حرص کے منہ کو صرف مٹی بھر سکتی ہے۔ (خدا فرماتا ہے کہ) ہم نے دولت اپنی یاد دلانے اور مسکینوں کی مدد کرنے کے لئے پیدا کی ہے۔ جو خدا کی طرف لوٹے تو خدا بھی اس کی طرف لوٹے گا(۱)۔''

نبی کریم ﷺ مختصر مگر جامع نصیحتیں فرمایا کرتے جو موقع کی مناسبت سے ہوتیں۔ حضرت عائشہؓ خود بھی دین سیکھنے کی شوقین تھیں اور یہ بات آپ ﷺ نے اچھی طرح واضح کر دی تھی کہ چاہے آپ ﷺ کے قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں، ہر ایک کو اپنے عمل کے لئے خود ہی کوشش کرنا چاہئے اور محض آپ ﷺ کی نسبت کو روزِ قیامت اپنے لئے کافی نہیں سمجھنا چاہئے۔

ایک روز حضرت عائشہؓ جہنم کو یاد کر کے رونے لگیں تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم کیوں روتی ہو؟'' آپؓ نے کہا ''مجھ کو جہنم یاد آیا، میں رونے لگی۔ آپ ﷺ اپنے گھر کے لوگوں کو یاد کریں گے قیامت کے دن؟'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تین مقاموں میں کوئی کسی کو یاد نہ کرے گا۔ ایک تو ترازو کے پاس جب تک یہ معلوم نہ ہو کہ اس کی ترازو ہلکی اتری یا بھاری۔ دوسرے جس وقت کہا جائے گا آؤ پڑھو اپنی اپنی کتاب، جب تک یہ معلوم نہ ہو کہ اس کی کتاب کدھر سے ملے گی، دائیں ہاتھ سے یا بائیں ہاتھ سے یا پیٹھ کے پیچھے سے۔ اور

(۱) مسند جلد:٦

24206

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تیسرے پل صراط پر جب وہ جہنم پر رکھا جائے گا۔''(۱)

حضرت عائشہؓ نبی اکرم ﷺ کی چہیتی تھیں۔لیکن جہاں آپ ﷺ کو محسوس ہوتا کہ آپ غلطی کر رہی ہیں تو آپ ﷺ ٹوک دیتے۔ایک بار حضرت عائشہؓ کی کوئی چیز چوری ہوگئی تو آپؓ نے چور کو بددعا کرنی شروع کی۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا(۲) ''مت کم کر عذاب چور پر سے۔''یعنی چور کو برا بھلا کہہ کر اپنا غصہ نکالنے سے اس کا عذاب اور تمہارا اجر کم ہوگا۔لہٰذا صبر کرنا بہتر ہے۔

ایک بار رسول اکرم ﷺ کے پاس چند یہودی آئے۔انہوں نے کہا''السام علیک'' یعنی بظاہر سلام کیا لیکن درحقیقت السام علیک کہا جس کا مطلب ہے تم پر موت ہو۔آپ ﷺ نے فرمایا''وعلیکم''۔(یعنی تم پر ہی ہو)۔حضرت عائشہؓ نے کہا:''تمہارے ہی اوپر موت ہو اور برائی ہو۔''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا''اے عائشہ بے شک اللہ تعالیٰ نرمی کو سب کاموں میں دوست رکھتا ہے۔''آپؓ نے کہا''آپ نے سنا نہیں یہود نے جو کہا۔''آپ ﷺ نے فرمایا:''میں نے بھی ان کا جواب دے دیا تھا کہ تم ہی پر ہے''(یعنی جو انہوں نے کہا تھا وہ انہی پر پھیر دیا۔''(۳)

حضرت عائشہؓ کی سوکن اور حضور ﷺ کی زوجہ حضرت صفیہؓ کا قد نسبتاً چھوٹا تھا۔ایک دن آپؓ نے کہا ''یا رسول اللہ ﷺ! بس کیجئے،صفیہ تو اتنی (چھوٹی) ہیں۔''آپ ﷺ نے فرمایا''تم نے ایسی بات کہی کہ اگر سمندر کے پانی میں بھی ملاؤ تو ملا سکتی ہو۔''حضرت عائشہؓ بولیں''یا رسول اللہ ﷺ! میں نے تو ایک شخص کی نسبت واقعہ بیان کیا۔''آپ ﷺ نے فرمایا''اگر مجھ کو اتنا اور اتنا بھی دیا جائے تو بھی بیان نہ کروں۔''(۴) یعنی یہی تو غیبت ہے جو بڑا گناہ ہے۔

اسی طرح اخلاقی ہدایات اور مختلف چھوٹی موٹی تنبیہات کے ذریعے حضرت عائشہؓ کی تربیت ہوتی رہی۔آپؓ اکثر رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نفلی عبادات میں بھی شریک ہو جاتیں اور عملی تربیت سے بھی مستفید ہوتیں۔

واقعۂ افک

مدینہ میں موجود منافقین کا ٹولہ ہمہ وقت اس کوشش میں رہتا کہ کسی طرح مسلمانوں کو کوئی زک پہنچا سکے۔ فوجی اور بیرونی محاذ پر ان کی کوششیں ہمیشہ ہی اکارت گئیں۔چنانچہ داخلی محاذ پر اپنی توجہ مبذول کرتے ہوئے وہ

(۱) سنن ابی داؤد (۲) سنن ابی داؤد (۳) جامع ترمذی (۴) صحیح بخاری

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نئے نئے شوشے چھوڑتے رہتے۔ کبھی انصار و مہاجرین کے درمیان اور کبھی انصار کے اپنے قبائل کے درمیان لڑائی کرانے کی کوشش کرتے۔ اب تک ان کی کوئی کوشش کامیابی سے ہمکنار نہ ہوسکی تھی۔ اس دوران ایک انتہائی معمولی اور غیر اہم واقعہ پیش آیا، لیکن کاشانۂ نبوت کو بدنام کرنے کا اس سے بہتر موقع ہاتھ نہ آسکتا تھا۔ چنانچہ منافقین نے پروپیگنڈے کا طوفان کھڑا کر دیا جس کی زد میں حضرت عائشہؓ آ گئیں۔

تفصیل کچھ یوں ہے کہ غزوہ بنی مصطلق میں حضرت عائشہؓ حضور ﷺ کے ساتھ تھیں۔ آپؓ نے اپنی بہن کا ہار پہنا ہوا تھا۔ ایک مقام پر جب قافلہ رکا تو حضرت عائشہؓ قضائے حاجت کے لئے باہر نکلیں۔ جب واپس لوٹیں تو دیکھا کہ گلے میں ہار نہ تھا۔ واپس پلٹیں اور ہار تلاش کرنے لگیں۔ اتنے میں قافلہ چل دیا اور کسی کو اندازہ بھی نہ ہوا کہ حضرت عائشہؓ ساتھ نہیں ہیں۔ ہار مل جانے کے بعد واپس آئیں تو دیکھا کہ سب چلے گئے ہیں۔ چنانچہ وہیں چادر اوڑھ کر پڑی رہیں کہ جب لوگ محمل میں نہ پائیں گے تو خود ہی ڈھونڈتے ڈھونڈتے یہاں پہنچ جائیں گے۔ اسی اثناء میں نیند آ گئی۔ صفوان بن معطلؓ جو صحابیٔ رسول تھے، ان کا کام قافلے کے پیچھے رہ کر سفر کرنا تھا تاکہ کوئی چیز یا سامان رہ جائے تو اسے اٹھالیں۔ صبح کے قریب جب وہ گذرے تو دیکھا کہ حضرت عائشہؓ موجود ہیں۔ وہ حضرت عائشہؓ کو احکامِ حجاب سے پہلے دیکھ چکے تھے، اس لئے پہچان گئے اور اناللہ پڑھنا شروع کیا تو آپؓ چونک کر اٹھ گئیں۔ صفوانؓ سمجھ گئے کہ آپؓ کسی وجہ سے قافلے سے جدا ہوگئی ہیں۔ چنانچہ اونٹ بٹھایا اور آپؓ اس پر سوار ہوگئیں۔

ادھر جب دوپہر کو قافلے نے پڑاؤ کیا تو دیکھا کہ سامنے سے صفوانؓ آرہے ہیں اور پیچھے اونٹ پر حضرت عائشہؓ بیٹھی ہیں۔ بات معمولی تھی مگر صورتحال صحیح طور پر واضح ہونے سے پہلے ہی منافقین کے سردار عبداللہ بن ابی نے زہر اگلنا شروع کر دیا۔ ہر جگہ جا کر وہ یہ دہرانے لگا کہ نعوذ باللہ اب عائشہؓ پاکدامن نہیں رہیں۔ منافقین کے ہاتھ تو گویا ایسا موضوع لگ گیا جو ان کے مقاصد کو پورا کرنے میں بڑا مددگار تھا۔ نبی اکرم ﷺ کی بیوی کی بدنامی خود آپ ﷺ کے لئے باعثِ عار ہوتی۔ مسلمانوں کی اکثریت نے ان کی باتوں پر یقین نہ کیا سوائے چند مسلمانوں کے جو ان افواہوں کی زد میں آ گئے۔ لیکن معاملہ ایسا نازک تھا کہ کوئی شخص بولنے کی ہمت نہ کر رہا تھا۔ ادھر حضرت عائشہؓ اس سب واقعے سے بے خبر تھیں۔ ایک دن اتفاقی طور پر آپؓ کو اس بات کی خبر ہوگئی۔

یہ سنتے ہی حالت غیر ہوگئی۔ ماں باپ سے واقعے کی تصدیق چاہی۔ انہوں نے دلاسا دیا، مگر آپ کو قرار نہ آیا۔ شدید بخار آ گیا اور آپؓ کو محسوس ہوا کہ نبی اکرم ﷺ کا پہلا سا التفات بھی نہیں رہا۔ چنانچہ آپ ﷺ سے اجازت لے کر والدین کے گھر آ گئیں۔ یہاں بھی شدید بے چینی اور بے قراری کے عالم میں وقت گذرتا، یہاں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تک کہ راتوں کی نیند اڑ گئی۔

معاملہ چونکہ خود نبی اکرم ﷺ کے گھر کا تھا اس لئے آپ ﷺ لوگوں کی گواہی اور ایسا ثبوت چاہتے تھے کہ منافقین کے لئے کوئی موقع نہ رہ جائے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے حضرت اسامہؓ اور حضرت علیؓ سے اس معاملے میں مشورہ کیا۔ حضرت اسامہؓ نے تو حضرت عائشہؓ کی حمایت کی اور حضرت علیؓ نے آنحضرتؐ کی پریشانی کو مدنظر رکھتے ہوئے مشورہ دیا کہ ''دنیا میں عورتوں کی کمی نہیں (یعنی اگر چاہیں تو طلاق دے کر کسی اور کو بیاہ لیں) اور یہ کہ خادمہ سے پوچھ لیجئے۔''

خادمہ سے پوچھا گیا تو وہ معاملہ سمجھ نہ سکی، بولی ''اور تو کوئی برائی نہیں، ہاں بچپن ہے، سوتی ہیں تو بکری آٹا کھا جاتی ہے۔'' آخر صاف لفظوں میں سوال کیا گیا تو بولی ''سبحان اللہ! خدا کی قسم جس طرح سنار کھرے سونے کو جانتا ہے اسی طرح میں ان کو جانتی ہوں۔''

ایک مہینہ کا عرصہ گذر چکا تھا کہ اسی دوران نبی کریم ﷺ سیدنا ابوبکرؓ کے گھر تشریف لے گئے اور حضرت عائشہؓ سے فرمایا: ''اے عائشہ! مجھ کو تمہاری طرف سے ایسی ایسی خبر پہنچی ہے۔ پھر اگر تم پاکدامن ہو تو عنقریب اللہ تعالیٰ تمہاری پاکدامنی بیان کر دے گا اور اگر تم نے گناہ کیا ہے تو توبہ کرو اور بخشش مانگو اللہ تعالیٰ سے، اس لئے کہ بندہ جب گناہ کا اقرار کرتا ہے اور توبہ کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو بخش دیتا ہے۔''(۱)

حضرت عائشہؓ خاموشی سے سنتی رہیں۔ پھر اپنے ماں باپ کی طرف متوجہ ہوئیں اور ان سے جواب دینے کو کہا۔ لیکن ان دونوں کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہیں۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ نے خود ہی جواب دینے کے لئے زبان کھولی اور بولیں ''اللہ کی قسم ہے اگر میں کہوں کہ میں نے نہیں کیا اور اللہ گواہ ہے کہ میں سچی ہوں جب بھی یہ بات مجھے فائدہ نہ دے گی آپ لوگوں کے آگے، اس لئے کہ آپ لوگ بول چکے ہیں اور آپ کے دل اس سے رنگے گئے اور اگر میں یہ کہوں کہ میں نے کیا ہے اور اللہ خوب جانتا ہے کہ میں نے نہیں کیا تو آپ سب کہیں گے کہ اقرار کر لیا اس نے اپنے قصور کا اور اللہ کی قسم ہے میں نہیں جانتی تمہارے اور اپنے لئے کوئی کہاوت مگر یوسفؑ کے باپ کی (اس موقع پر آپؓ کو یعقوبؑ کا نام یاد نہ آیا) جب کہا انہوں نے'' **فصبر جمیل واللہ المستعان علی ماتصفون**'' (یعنی میں بہترین صبر اختیار کرتا ہوں اور جو کچھ تم کہہ رہے ہو اس پر اللہ تعالیٰ مددگار رہے)۔''

جب آپؓ نے اپنی بات ختم کر لی تو اسی وقت وحی کا نزول ہونے لگا۔ سات آسمانوں کے اوپر سے خداوند تعالیٰ نے آپ کی برأت میں آیات نازل کیں اور قیامت تک آپ کی پاکیزگی کا تذکرہ برقرار رکھا۔

(۱) صحیح مسلم شریف۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بیوگی

ابھی ازدواجی زندگی کے محض نو سال ہی پورے ہوئے تھے اور حضرت عائشہؓ اٹھارہ برس کی تھیں کہ حضور ﷺ مرض الموت میں مبتلا ہو گئے۔ حسب دستور ایک ایک روز ہر بیوی کے حجرے میں قیام فرماتے۔ لیکن برابر پوچھتے کہ کل میں کہاں رہوں گا؟ ازواج نے سمجھ لیا کہ آپ ﷺ کا دل یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ کے ہاں قیام کیا جاسکے۔ چنانچہ سب نے اجازت دے دی۔

یوں آپ ﷺ حضرت عائشہؓ کے حجرے میں منتقل ہو گئے۔ مرض کی شدت بڑھ گئی۔ آپؓ پوری تندہی سے تیمارداری میں مصروف ہو گئیں۔ وہی دعائیں جو نبی اکرم ﷺ بیمار پر پڑھ کر دم کیا کرتے تھے آپؓ بھی پڑھ پڑھ کر آنحضرت ﷺ پر دم کرتیں۔ اب آخری وقت آ پہنچا تھا۔ نبی اکرم ﷺ حضرت عائشہؓ کے سینے سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے کہ اتنے میں حضرت عائشہؓ کے بھائی عبدالرحمٰن مسواک لئے اندر آئے۔ آپ ﷺ نے مسواک کی طرف دیکھا تو سمجھ گئیں کہ مسواک کرنا چاہتے ہیں۔ بھائی سے مسواک لے کر دانت سے نرم کر کے آپ ﷺ کو دی۔ اسی اثناء میں آپ ﷺ نے اپنا ہاتھ جو حضرت عائشہؓ کے ہاتھ میں تھا کھینچ لیا اور فرمایا "**اللّٰھم الرفیق الاعلی**"[1] تھوڑی دیر میں آپ ﷺ کے جسم کا بوجھ معلوم ہوا، آنکھوں کی طرف دیکھا تو پھٹ گئی تھیں۔ آہستہ سے آپ ﷺ کا سر تکیہ پر رکھ دیا اور رونے لگیں۔

نبی اکرم ﷺ حضرت عائشہؓ کے حجرے میں ہی دفن ہوئے۔

حضرت عائشہؓ......امت کی معلّمہ

جوانی میں بیوگی کی آزمائش سے دوچار ہونے کے بعد حضرت عائشہؓ اپنے حالات پر ماتم کناں نہ ہوئیں، نہ ہر وقت اس غم کے تذکرے میں لگی رہیں بلکہ دین کے فہم اور طریق نبوی کی تعلیم میں اپنے آپ کو مصروف کر لیا۔ وہ سرمایہ جو نبی کریم ﷺ کی زندگی کے شب و روز کی صورت میں آپ کے ذہن میں نقش ہو چکا تھا اس سے امت کو فیضیاب کرنے کے کام کی ابتداء کی۔ اس طرح آپ کا حجرہ دنیا میں حدیث شریف کی تعلیم کا پہلا مدرسہ شمار کیا جاسکتا ہے۔

احادیث نبوی کی اشاعت اب آپ کی زندگی کا مقصد بن چکی تھی۔ زندگی کا ابتدائی حصہ جس چیز کو سیکھنے میں گذرا اب اسے پہنچانے اور منتقل کرنے کا وقت آ گیا تھا۔ آپ نے اس کام کا ایسا حق ادا کیا کہ آپ کا شمار پہلے

(۱) صحیح مسلم شریف۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

طبقے کے محدثین میں کیا جاتا ہے۔صرف پانچ صحابہ کثرتِ روایت میں آپ سے آگے ہیں۔احادیث کی کتب میں ۲۲۱۰ روایات آپ سے منسوب ہیں۔ان میں سے بخاری و مسلم میں دوسو چھیاسی روایات شامل ہیں جبکہ باقی احادیث کی دیگر کتابوں میں موجود ہیں۔امام احمد بن حنبلؒ نے اپنی مسند میں حضرت عائشہؓ کی روایت کی ہوئی جن احادیث کو شامل کیا ہے ان کو الگ کر کے حدیث کی ایک مستقل اور ضخیم کتاب تیار کی جاسکتی ہے۔

حضرت عائشہؓ کو حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کے زمانے میں ہی دینی علوم پر دسترس کی بنیاد پر قبول عام حاصل ہو گیا تھا۔حضرت ابوبکرؓ کے بعد حضرت عمرؓ جو خود دین کی گہری بصیرت اور سنت کی واقفیت میں کسی سے کم نہ تھے اور حدیث کے نشر کرنے اور قبول کرنے میں سخت شرائط عائد کیا کرتے تھے، مختلف امور جاننے کے لئے حضرت عائشہؓ سے رجوع کیا کرتے تھے۔حضرت امیر معاویہؓ جو دورانِ خلافت دمشق میں رہتے تھے، قاصد بھیج کر مسئلے معلوم کرواتے۔مشہور تابعی مسروق قسم کھا کر کہا کرتے تھے''ہم نے شیوخ صحابہ کو ان سے مسائل پوچھتے ہوئے دیکھا''۔دیکھتے ہی دیکھتے آپ کو حدیث و افتاء کے لئے رجوع کرنے والوں میں ایسی مقبولیت ہوئی کہ لڑکے، عورتیں اور مرد سب ہی اپنے اپنے سوالات لے کر آپؓ کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ صرف محدثہ ہی نہ تھیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ چند امتیازی خصوصیات نے سب کو آپ کی طرف متوجہ کر دیا تھا۔

وسعتِ معلومات اور دقتِ نظر

قدرت کو حضرت عائشہؓ سے کام لینا مقصود تھا۔بہترین حافظے کے ساتھ ساتھ آپ کو حالات و واقعات کو گہرائی سے جانچنے کی ایسی صلاحیت دی گئی تھی کہ معاملے کی تہہ تک پہنچ جاتی تھیں اور ہر پہلو پر نظر رکھتی تھیں۔ذیل میں ہم ایسے چند واقعات کا تذکرہ کرتے ہیں۔

آپؓ تک جب حضرت عبداللہؓ بن عمر اور حضرت ابوسعید خدریؓ کی یہ روایت پہنچی کہ نبی کریم ﷺ نے قربانی کے گوشت کے تین دن کے اندر اندر کھا لینے کی ہدایت کی تھی تو صورتِ واقعہ کو ان الفاظ میں بیان کیا: ''قربانی کے گوشت کو نمک لگا کر ہم چھوڑ دیتے تھے۔مدینہ میں اس کو آپ ﷺ کے سامنے پیش کرتے تھے۔آپ ﷺ نے فرمایا''تین دن کے بعد نہ کھایا کریں۔'' یہ حکم قطعی نہ تھا، بلکہ آپ ﷺ یہ چاہتے تھے کہ لوگ دوسروں کو کچھ اس میں سے کھلا دیا کریں''۔

حضرت عائشہؓ کو اس کا بہت اہتمام رہتا کہ آپ صرف قرآن مجید اور حدیث کے الفاظ ہی نہ پہنچائیں بلکہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس پورے موقعے اور صورتحال کو بھی پیش کر دیں جس کے متعلق بیان کر رہی ہوں تا کہ لوگ اس کی مصلحت اور حکمت سے بھی واقف ہوسکیں۔ چنانچہ جب کبھی آپؓ کے سامنے ایسی روایات آتیں جن میں کسی واقعہ کا سیاق وسباق کے بغیر ذکر کیا گیا ہوتا جس کی وجہ سے غلط فہمی کا خدشہ ہوتا تو آپؓ فوراً تصحیح کر دیتیں۔

حضرت عائشہؓ تک یہ خبر پہنچی کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''مردے پر اس کے گھر والوں کے رونے سے عذاب ہوتا ہے۔'' تو آپؓ نے اس روایت کو اس طرح قبول کرنے سے انکار کیا اور کہا کہ آنحضرت ﷺ نے یہ کبھی نہیں فرمایا۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک دن آپ ایک یہودیہ کے جنازے پر سے گذرے۔ اس کے رشتہ دار اس پر واویلا کر رہے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا ''یہ روتے ہیں اور اس پر عذاب ہو رہا ہے'' پھر اپنی بات کے حق میں دلیل بھی دی اور کہا ''قرآن تم کو کافی ہے، خدا فرماتا ہے ''ولا تزر وازرة وزر اخرىٰ'' (اور کوئی دوسرے کے گناہ کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔''

یہاں آپؓ نے جہاں ایک غلط فہمی کی اصلاح کی وہیں یہ اصول بھی سمجھا دیا کہ قرآن کی مخالف کوئی روایت قابلِ قبول نہیں ہوسکتی۔ آپؓ نے ایک دو نہیں متعدد مواقع پر ان غلط فہمیوں کی اصلاح کی جو صورتِ واقعہ نہ جاننے کے سبب ظاہری معنوں پر غور کرنے سے پیدا ہوتی تھیں۔ اس بناء پر بڑے بڑے صحابہؓ سے اختلاف کرتے ہوئے نہ جھجکتی تھیں۔ اپنی بات کے حق میں ایسے ٹھوس اور مضبوط دلائل لاتیں کہ سب کو قائل ہونا پڑتا۔

سنت کی واقفیت اور نبی کریم ﷺ کی مزاج شناسی

حضرت عائشہؓ کا نبی کریم ﷺ سے ہمہ وقتی ساتھ تھا۔ آپ ﷺ کے مزاج کو بہت اچھی طرح سمجھتی تھیں۔ پھر چونکہ دینی احکامات کی مصلحت اور حکمت پر بھی ہمیشہ نظر رہتی تھی اس لئے اس بات سے واقف تھیں کہ نبی کریم ﷺ نے کن باتوں کا حکم کن وجوہات کی بناء پر دیا، اور آپ ﷺ کی کونسی سنتوں کی مذہبی حیثیت ہے اور کون سے وہ روز مرہ کے افعال تھے جن کو کسی ذاتی یا وقتی ضرورت کے تحت کیا گیا۔

بعض صحابہ مثلاً حضرت عبداللہ بن عمرؓ آپ ﷺ کے ہر فعل کو چاہے وہ کسی بھی وجہ سے کیا گیا ہو سنت قرار دیتے تھے اور خود بھی اس کی ایسی پابندی کرتے کہ سفر کی منازل تک میں آپ ﷺ کی پیروی کرتے۔ اگر کسی منزل میں اتفاق سے آپ ﷺ نے طہارت فرمائی تو وہ بھی بلا ضرورت ایسا کرتے۔ ان کے برخلاف حضرت عائشہؓ سنت ان افعال کو سمجھتی تھیں جنہیں آپ ﷺ نے ثواب کی نیت سے عبادت کے طور پر انجام دیا ہو۔ چنانچہ جب اس بات کا تذکرہ ہوا کہ حج کے موقع پر ابطح میں منزل کرنا آنحضرت ﷺ کی سنت ہے تو فرمایا ''ابطح میں منزل کرنا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سنت نہیں۔ وہاں آپ ﷺ اس لئے اتر پڑے تھے کہ وہاں سے نکلنا آپ ﷺ کے لئے آسان تھا۔‘‘

حضرت عائشہؓ مزاج شناسِ رسول ﷺ ہونے کی بناء پر عقلی قیاس کرتیں۔ آپؓ اندازہ لگا لیتی تھیں کہ کونسی بات دیکھ یا سن کر آپ ﷺ کا کیا ردعمل ہوتا۔ آپ ﷺ نے عورتوں کو نماز کے لئے مسجد میں آنے کی اجازت دے رکھی تھی۔ بعد میں جب وقت اور حالات کی تبدیلی کے ساتھ عورتوں نے اپنے انداز بدل لئے تو حضرت عائشہؓ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتیں ’’عورتوں نے اب جونئی باتیں پیدا کی ہیں، اگر آنحضرت ﷺ اس زمانے میں ہوتے اور دیکھتے تو جس طرح یہود کی عورتیں مسجدوں میں آنے سے روکی گئی ہیں یہ بھی روک دی جاتیں۔‘‘

قرآن مجید کی تفسیر اور عربی زبان پر عبور

قران مجید کی زبان عربی تھی اور صحابہ کرامؓ عرب ہونے کی وجہ سے اس کو بخوبی سمجھتے تھے۔ تاہم لسانی مہارت میں چند صحابہ دوسروں سے ممتاز تھے جن میں حضرت عائشہؓ بھی تھیں۔ آپ نہ صرف خود قادر الکلام تھیں، انتہائی فصیح عربی بولا کرتی تھیں بلکہ اس زبان کے محاورات، روزمرہ اور شاعری سے بھی خوب واقف تھیں۔ نیز قرآنی اسلوب سے واقفیت کی بناء پر آیات کی بہترین تفسیر کیا کرتی تھیں۔

ایک بار آپؓ کے بھانجے عروہ نے قرآن مجید کی آیت:

”ان الصفا والمروة من شعائر الله فمن حج البيت او اعتمر فلا جناح عليه ان يطوف بهما“

’’صفا اور مروہ کی پہاڑیاں شعائر الٰہی میں سے ہیں، پس جو خانہ کعبہ کا حج یا عمرہ کرے کچھ مضائقہ نہیں اگر ان کا بھی وہ طواف کرے‘‘ کے بارے میں پوچھا کہ اس کے معنی تو یہ ہیں کہ اگر کوئی طواف نہ کرے تو بھی کچھ حرج نہیں، فرمایا بھانجے تم نے ٹھیک نہیں کہا۔ اگر آیت کا وہ مطلب ہوتا جو تم سمجھے ہو تو خدا یوں فرماتا:

(**لاجناح ان لايطوف بهما**) یعنی اگر ان کا طواف نہ کرو تو کچھ حرج نہیں۔ پھر فرمایا۔ اصل میں یہ آیت انصار کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ اوس وخزرج اسلام سے پہلے ’’منات کی جے‘‘ پکارا کرتے تھے اور صفا اور مروہ کا طواف برا جانتے تھے۔ اسلام لائے تو آنحضرت ﷺ سے دریافت کیا کہ ہم لوگ پہلے ایسا کرتے تھے، اب کیا حکم ہے۔ اس پر اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ صفا اور مروہ کا طواف کرو، اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ ابوبکر بن عبدالرحمٰن (جو ایک محدث تھے) تک حضرت عائشہؓ کی یہ بات پہنچی تو کہا ’’علم اس کو کہتے ہیں۔‘‘

قبولِ روایت میں تحقیق واحتیاط

ام المومنین حضرت عائشہؓ جہاں خود روایت بیان کرتے ہوئے احتیاط سے کام لیتیں اور جزئیات بتانے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کا بھی اہتمام کرتیں تا کہ کسی کو غلط فہمی نہ ہو وہیں قبولِ روایت میں بھی پوری تحقیق سے کام لیتیں۔ وہ روایات جو دیگر صحابہ کرامؓ سے آپؓ تک پہنچتیں ان کی پہلے ان ہی حضرات سے تحقیق کرتیں۔ اگر کسی اور کی روایت کو اختیار کرتیں اور کوئی شخص آپ سے دریافت کرنے آتا تو اس کو اصل راوی کے پاس بھیجتیں۔ اس سے مقصد یہ تھا کہ بیچ کے واسطے جس قدر کم ہو سکیں اتنا ہی راویت کے صحیح پہنچنے کا یقین ہوتا ہے۔

آپؓ لوگوں کی صحیح بات تک رہنمائی کرنے کی خواہاں رہتیں۔ اپنے تمام کمالات اور معلومات کے باوجود اگر یہ سمجھتیں کہ سوال کردہ معاملے پر کسی کی معلومات آپ سے بڑھ کر ہیں تو سائل کو اسی کے پاس بھیجتیں۔ ایک شخص نے موزوں پر مسح کرنے کا مسئلہ پوچھا تو فرمایا کہ ''علیؓ کے پاس جاؤ، وہ آنحضرت ﷺ کے سفروں میں ساتھ رہتے تھے۔''

عام استفادہ

نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرامؓ کی ایسی تربیت فرمائی تھی کہ سب کے سب علم حاصل کرنے کے بھی شوقین تھے اور اس کی نشر و اشاعت کے بھی۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ کچھ صحابہ جلد ہی دنیا سے اٹھ گئے۔ کچھ جہاد میں اور کچھ ریاستی امور چلانے میں مصروف ہو گئے جبکہ کچھ دوسرے علاقوں میں بس گئے۔ مدینہ میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت عائشہؓ ہی وہ نمایاں شخصیات رہ گئیں جنہوں نے علمِ دین کی خدمت کے لئے اپنے آپ کو وقف کر رکھا تھا۔

حضرت عائشہؓ کو پہلے بیان کردہ خصوصیات کی بناء پر ایسی امتیازی فوقیت حاصل تھی کہ خاص شائقینِ علم کے علاوہ عام مسلمان بھی اپنے اپنے سوالات لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔ محرم مرد، عورتیں اور کم عمر لڑکے تو حجرے کے اندر آ کر مجلس میں بیٹھ جاتے، جبکہ دیگر لوگ حجرے کے سامنے مسجد نبوی میں بیٹھتے۔ دروازے پر پردہ پڑا رہتا۔ یہیں سے تعلیم و تلقین اور افتاء کا سلسلہ جاری رہتا۔

آپ کی درسگاہ سے خود آپ کے بھتیجوں (قاسم بن عبداللہ، عبداللہ بن محمد اور ابوسلمہ) بھتیجیوں (حفصہ بنت عبدالرحمٰن اور اسماء بنت عبدالرحمٰن) بھانجوں (عروہ بن زبیرؓ اور قاسم بن زبیرؓ) اور بھانجی عائشہ بنت طلحہؓ اور شاگردوں میں عمرہ بنت عبدالرحمٰن، صفیہ بنت شیبہ اور معاذہ بنت عبداللہ نے خوب استفادہ حاصل کیا اور دین کی خدمت میں محنت اور کوشش کی وجہ سے بہت شہرت پائی۔

گھر کی درسگاہ کے علاوہ حج کا موقع ایسا ہوتا جب حضرت عائشہؓ کا خیمہ طالب علموں اور مسائل پوچھنے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

والوں کی توجہ کا مرکز رہتا۔ پورے عالمِ اسلام سے آنے والے حاجی آپؓ تک رسائی حاصل کرتے۔ خصوصاً عورتیں تو آپؓ کو گھیر لیتیں۔ وہ اپنے شبہات دور کرنے کے لئے آپ کے پاس آتیں اور آپؓ انہیں تسلی بخش جواب دیتیں۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ

حضرت عائشہؓ وعظ و دعوت کے لئے موقع کی مناسبت اور حکمت کو ہمیشہ ملحوظ رکھتیں۔ آپؓ اس بات کو سختی سے ناپسند فرماتیں کہ ہر وقت درس و وعظ کر کے لوگوں کو دین سے متنفر کر دیا جائے اور اپنے شاگردوں کو بھی اسی کی ہدایت کرتیں۔ البتہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ برابر انجام دیتیں۔ خصوصاً وہ لوگ جن کا گھر میں مستقل آنا جانا تھا ان کے اخلاق و کردار پر پوری نظر رکھتیں۔

ایک بار آپ کی بھتیجی حفصہ بنت عبدالرحمٰن آپ کے پاس اس حال میں آئیں کہ ان کا دوپٹہ نہایت باریک تھا۔ دیکھتے ساتھ ہی ان کے دوپٹے کو غصے سے چاک کر ڈالا۔ پھر فرمایا ''تم نہیں جانتیں کہ سورہ نور میں خدا نے کیا احکام نازل کئے ہیں۔''

اسی طرح ایک بار اپنے بھائی عبدالرحمٰن بن ابی بکر کو جلدی جلدی وضو کرتے دیکھا تو کہا ''عبدالرحمٰن وضو اچھی طرح کیا کرو۔ آنحضرت ﷺ کو میں نے کہتے ہوئے سنا ہے کہ وضو میں جو عضو نہ بھیگیں گے، ان پر جہنم کی پھٹکار ہو۔''(۱)

حضرت عائشہؓ میدانِ جنگ میں

حضرت عائشہؓ کو مسلمانوں کا سچا درد تھا۔ وہ معاشرے کے اندر وقوع پذیر ہونے والی تبدیلیوں پر گہری نظر رکھتیں اور ذاتی طور پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیتی رہتی تھیں۔ حضور ﷺ کے وصال کے بعد سیدنا ابوبکرؓ کی خلافت میں مرتدین کا قلع قمع ہونے کے بعد سیاسی حالات انتہائی پرسکون ہو گئے تھے۔ آئے دن کی فتوحات نے جہاں مسلمانوں کا بیرونی دنیا میں مورال بلند کیا تھا، وہیں معاشرتی سطح پر حضرت ابوبکرؓ اور پھر حضرت عمرؓ کا ہاتھ باگِ خلافت پر نہ صرف بہت مضبوط تھا بلکہ وہ ہر برائی کا تدارک وقت سے پہلے اپنی بصیرت کے مطابق کر لیا کرتے تھے۔ ان کی دوررس نگاہیں معاشرے کے کمزور پہلوؤں کا اندازہ کر لیتیں اور وہ مرض کے بڑھنے سے پہلے اس کا علاج کر لیا کرتے۔ حضرت عثمانؓ کی خلافت کے ابتدائی سال بھی اسی طرز کا تسلسل تھے۔

(۱) مسند

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

البتہ آخر زمانے میں اکابر صحابہؓ ایک کے بعد ایک کر کے دنیا سے رخصت ہونے لگے۔ سرحدیں وسیع ہوگئیں اور عربی و عجمی اختلاط نے تمدن میں نئی نئی تبدیلیاں پیدا کیں تو کچھ ایسے عناصر بھی سامنے آئے جو مسلم معاشرے میں فساد پھیلا کر اسلامی جمعیت اور طاقت کو پارہ پارہ کرنا چاہتے تھے۔ سبائی فرقے کا بانی ابن سبا جو اصلاً ایک یہودی تھا اپنے گرد ایسے لوگوں کو جمع کرنے میں کامیاب ہوگیا جو اپنی ذاتی وجوہات یا قبائلی تعصب کی بناء پر حکومتی پالیسیوں خصوصاً حضرت عثمانؓ پر اقربا پروری اور ان کے گورنروں پر دیگر جھوٹے سچے الزام لگا کر شورش بپا کرنا چاہتے تھے۔

حضرت عثمانؓ نے مصالحت کی کوششیں کیں اور ان کے الزامات کے جوابات بھی دیئے۔ مگر باغی فرقے کی سرگرمیاں دن بدن بڑھتی رہیں۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ حضرت عثمانؓ کی نرمی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ مدینہ پر چڑھ آئے۔ صحابہ کرامؓ رفعِ فساد کی کوششیں کرتے رہے۔ مگر باغی عناصر حضرت عثمانؓ کو معزول کرنا چاہتے تھے جس کے لئے وہ تیار نہ تھے۔ بالآخر حضرت عثمانؓ کے گھر کا محاصرہ ہوا اور وہ مظلومانہ طور پر شہید کر دیئے گئے۔ انتہائی تشویشناک حالات میں حضرت علیؓ کے دستِ مبارک پر مسلمانوں کے چوتھے خلیفہ کے طور پر بیعت ہوئی۔ کچھ اکابر صحابہؓ نے اس میں شرکت نہ کی۔ لیکن مدینہ کی اکثر آبادی یہاں تک کہ فسادی عناصر بھی اس بیعت میں پیش پیش رہے۔

حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیر بن عوامؓ جو دونوں کبارِ صحابہؓ اور عشرہ مبشرہ میں شامل تھے اگرچہ بیعت کر چکے تھے، مگر باغیوں کو کھلے عام پھرتا دیکھ کر حالات سے پریشان تھے۔ یہ حضرات ان سازشیوں کی فوری گرفتاری چاہتے تھے جو ممکن نظر نہ آ رہی تھی۔ چنانچہ مدینہ سے نکل کر مکہ کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں ان کی ملاقات حضرت عائشہؓ سے ہوئی جو حج سے ادائیگی کے بعد واپس مدینہ آ رہی تھیں۔ آپ کو بھی یہ اندوہناک خبر مل چکی تھی۔ ان حضرات نے حضرت عائشہؓ کو مدینے کے حالات کی خبر اس طرح دی ''ہم لوگ مدینے سے لدے پھندے بدؤوں اور عوام الناس کے ہاتھوں سے بھاگے چلے آتے ہیں اور لوگوں کو اس حال میں چھوڑا ہے کہ وہ حیران و سرگرداں ہیں، نہ حق کو پہچان سکتے ہیں، نہ باطل سے انکار کر سکتے ہیں اور نہ اپنی حفاظت پر قادر ہیں۔''

ہر طرف سے آنے والے لوگ بری بری خبریں سنا رہے تھے۔ پورا ملک پروپیگنڈہ اور چہ میگوئیوں کی زد میں تھا۔ کل تک جو لوگ بغاوت کے سرغنے اور خلیفہ کے قتل میں پیش پیش تھے، آج غیض و غضب سے بچنے کے لئے حضرت علیؓ کے پرجوش حامی بن گئے تھے اور انہیں پہچاننا کوئی آسان کام نہ تھا۔ اس موقع پر حضرت عائشہؓ اور حضرت زبیرؓ و طلحہؓ کے درمیان جو مشورہ ہوا اس میں یہی طے پایا کہ عثمانؓ کے قاتلوں سے فوری طور پر قصاص

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لیا جانا چاہئے، ورنہ اگر جلیل القدر خلیفہ کا خون رائیگاں جانے دیا گیا تو خلافت شرپسندوں اور باغیوں کے ہاتھوں بازیچۂ اطفال بن جائے گی۔ اگرچہ حضرت عائشہؓ کے بھائی محمد بن ابی بکر بھی باغیوں کے گروہ میں شامل تھے اور حضرت عثمانؓ کے گھر میں داخل ہونے والوں میں سے ایک تھے اور مقدمہ قائم ہونے کی صورت میں سزا سے بچ نہ سکتے تھے، لیکن ام المومنین حضرت عائشہؓ نے ان رشتوں ناتوں کے بجائے مسند خلافت کی لاج بچانے کو ترجیح دی اور خود خلیفۂ مظلوم کے قصاص کا مطالبہ کیا۔

آپؓ کی دعوت کا زبردست اثر ہوا اور ہزاروں لوگ آپ کی معیت میں روانہ ہوئے۔ اگرچہ آپ کا ارادہ مدینہ جانے کا تھا لیکن اکثریت کی رائے سے بصرہ کا رخ کیا تاکہ بصرہ، کوفہ اور عراق وغیرہ کی نوآبادیوں میں اس تحریک کی اشاعت کر کے ان کی حمایت حاصل کی جائے۔ راستے میں حواب کا تالاب آیا۔ کتوں نے اس بھیڑ بھاڑ کو دیکھ کر بھونکنا شروع کیا۔ حضرت عائشہؓ کو آنحضرت ﷺ کی ایک پیشین گوئی یاد آئی کہ آپ ﷺ نے ایک بار اپنی بیویوں سے خطاب کر کے فرمایا تھا ''خدا جانے تم میں سے کس پر حواب کے کتے بھونکیں گے[1]۔'' اس کے یاد آتے ہی واپسی کا عزم کیا اور قافلہ رکا رہا۔ یہاں تک کہ لوگوں نے شہادت دی کہ یہ جگہ حواب نہیں ہے اور حضرت زبیرؓ نے کہا ''تم واپس جاؤ گی؟ شاید خدا تعالیٰ تمہارے سبب سے لوگوں میں صلح کرا دے۔''

بصرہ پہنچ کر حضرت عائشہؓ نے مختلف رئیسوں سے گفت وشنید کی، کچھ نے ساتھ دیا اور کچھ نے الگ رہنے میں عافیت سمجھی۔ والیٔ بصرہ عثمان بن حنیف کے طرفداروں اور حضرت عائشہؓ کے حامیوں میں بحث ومباحثہ ہوتا رہا۔ حضرت عائشہؓ بار بار سکون اور تحمل کی تاکید کر رہی تھیں اور یہی واضح کر رہی تھیں کہ آپ کے آنے کا مقصد سوائے اصلاح کے اور کچھ نہیں۔ اسی اثناء میں مخالفین کے کیمپ کے چند شریر لوگوں نے حملہ کر دیا۔ حضرت عائشہؓ کی طرف سے منادی قسمیں دے دے کر روک رہا تھا لیکن وہ کسی طرح نہیں مانتے تھے۔ آخر اپنے بچاؤ کی خاطر وہ بھی میدان میں نکل آئے اور لڑائی شروع ہو گئی۔ جنگ کا خاتمہ اصلاح پسندوں کی کامیابی پر ہوا۔ حضرت عائشہؓ کا بصرہ پر قبضہ مکمل ہو گیا۔

جنگِ جمل

حضرت علیؓ کو اس فوجی مہم کی خبریں مل رہی تھیں۔ وہ مدینہ منورہ سے سات سو آدمی لے کر چلے اور کوفہ سے مزید سات ہزار آدمی ان کے ساتھ شامل ہو گئے۔ بصرہ پہنچتے پہنچتے بیس ہزار کی فوج ان کے ساتھ تھی۔ حضرت

---

(۱) مسند ابن حنبل

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عائشہؓ بھی تیس ہزار کی فوج کے ساتھ بصرہ میں موجود تھیں۔ خانہ جنگی کے آثار دیکھ کر غیر جانبدار مسلمانوں نے مصالحت کی کوشش کی تو فریقین اس کے لئے راضی ہو گئے۔ کوئی بھی مسلمانوں کی آپس میں لڑائی کا خواہشمند نہ تھا۔ معاملات تقریباً طے پا چکے تھے اور لوگوں کو حالات کی بہتری کی امید بندھ گئی تھی۔

دونوں جانب کے لشکروں میں موجود فتنہ پردازوں کے لئے یہ پریشان کن صورتحال تھی۔ صلح کی صورت میں ان کی شامت ضرور آتی۔ چنانچہ انہوں نے خفیہ سازش کر کے رات کے سناٹے میں جبکہ سب آرام کی نیند سو رہے تھے حضرت عائشہؓ کی فوج پر شب خون مار دیا۔ گھبراہٹ میں کسی کو سمجھ نہ آ رہا تھا کہ حملہ آور کون ہیں۔ ہر کوئی یہ سمجھا کہ اس کے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ حضرت عائشہ آہنی ہودہ میں اونٹ پر سوار ہوئیں اور حضرت علیؓ گھوڑے پر سوار اپنے حامیوں کو خونریزی سے روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر معاملہ ہاتھ سے نکل چکا تھا اور عام جنگ شروع ہو چکی تھی۔

حضرت عائشہؓ کا ہودج قلب فوج میں تھا اور پوری فوج کی قیادت حضرت طلحہؓ و زبیرؓ کے ہاتھوں میں تھی۔ عین اس وقت جب لڑائی زوروں پر تھی حضرت علیؓ زبیرؓ کے پاس آئے اور کہا ابو عبداللہ! تمہیں وہ دن یاد ہے جب رسول اللہ ﷺ نے تم سے پوچھا تھا کہ کیا تم علی کو دوست رکھتے ہو؟ تو تم نے عرض کی تھی ہاں یا رسول اللہ ﷺ۔ اس وقت تم سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "ایک دن تم اس سے ناحق لڑو گے۔" حضرت زبیر کو یہ بات یاد آ گئی اور وہ یہ کہتے ہوئے لڑائی سے الگ ہو گئے کہ تم نے مجھے پہلے کیوں نہ یاد دلایا۔ بیٹے (عبداللہ بن زبیرؓ) سے بھی ایسا کرنے کو کہا۔ مگر انہوں نے ساتھ نہ دیا تو وہ تن تنہا ہی روانہ ہو گئے اور راستے میں ایک بدبخت کے ہاتھوں شہید کر دیئے گئے۔

حضرت طلحہؓ نے بھی اس موقع پر اپنی اجتہادی غلطی محسوس کرتے ہوئے الگ ہونا چاہا تو سازشی ان کا ارادہ بھانپ گئے۔ انہیں بھی زہر میں بجھا تیر مار کر شہید کر دیا گیا۔ اب میدان میں صرف حضرت عائشہؓ رہ گئی تھیں اور جان نثار ان کے اونٹ کے چاروں طرف جمع ہو کر جان کے نذرانے پیش کر رہے تھے۔ حضرت علیؓ نے محسوس کیا کہ جب تک اونٹ کو بٹھا نہ دیا جائے لڑائی نہیں رک سکتی۔ چنانچہ آپؓ کے حکم سے اونٹ کے پاؤں پر زور کی تلوار ماری گئی۔ اونٹ کے بیٹھتے ہی فوج کی ہمت جو حضرت طلحہؓ کی شہادت اور حضرت زبیرؓ کے جانے سے پہلے ہی کم ہو گئی تھی، بالکل جواب دے گئی اور جنگ کا فیصلہ حضرت علیؓ کے حق میں ہو گیا۔

جنگ کے اختتام کے ساتھ ہی حضرت علیؓ نے حضرت عائشہؓ کے بھائی محمد بن ابی بکر کو اپنی ہمشیرہ کی خبر گیری کے لئے بھیجا اور عام معافی کا اعلان کر دیا۔ پھر خود آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور خیریت دریافت کی۔ آپؓ نے جواب دیا کہ اچھی ہوں۔ چند دن آپ کی خدمت گزاری کے بعد آپ کو اپنے بھائی اور دیگر معزز

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خواتین کے ساتھ مدینہ بھیج دیا اور خود دور تک آپ کو چھوڑنے آئے۔ جاتے وقت حضرت عائشہؓ نے اس دردناک واقعے پر سخت افسوس کا اظہار کیا اور کہا کہ مجھے علی سے کسی قسم کی کدورت نہ تھی اور نہ اب ہے، ہاں ساس داماد میں کبھی کبھی جو بات ہو جایا کرتی ہے اس کی میں نفی نہیں کرتی۔ حضرت علیؓ نے بھی آپ کے لئے عزت و تعظیم کے الفاظ فرمائے اور یہ مختصر قافلہ حجاز کی طرف روانہ ہوا۔

حضرت عائشہؓ کو اپنی اجتہادی غلطی کا احساس ہو چکا تھا۔ اصلاحِ احوال اور رفعِ فساد کے لئے جو طریقہ اختیار کیا گیا تھا آپؓ عمر بھر کبھی اس پر مطمئن نہ ہو سکیں اور افسوس کرتی رہیں۔ آپؓ اس واقعے کو یاد کر کے کہا کرتی تھیں "اے کاش میں پتھر ہوتی، اے کاش میں درخت ہوتی۔" اور جب یہ آیت پڑھتیں

وَ قَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ

"(اے پیغمبر کی بیویو) اپنے گھروں میں ٹکی رہو"۔ تو اس قدر روتی تھیں کہ روتے روتے دوپٹہ بھیگ جاتا تھا۔ اس واقعے کے بعد ایک بار پھر درس و تدریس میں مصروف ہو گئیں اور آخر وقت تک اسے جاری رکھا۔

وفات

حضرت عائشہؓ کی عمر مبارکہ کا سڑسٹھواں برس تھا جب رمضان المبارک کے مہینے میں بیماری کا آغاز ہوا۔ لوگ عیادت کو آنے لگے۔ طبیعت پوچھتے تو فرماتیں "اچھی ہوں۔" لیکن اندازہ کر چکی تھیں کہ اب آخری وقت آ پہنچا ہے۔ صدیق اکبر کی بیٹی، محبوبۂ رسول اور دین اسلام کی سب سے بڑی عالمہ اور فقیہہ اپنے انجام سے متعلق اتنی فکر مند تھیں کہ بے چینی اور بے قراری سے بار بار فرماتیں "اے کاش میں پتھر ہوتی، اے کاش میں کسی جنگل کی جڑی بوٹی ہوتی۔"

حضرت ابن عباسؓ آپ کی عیادت کو آئے اور آپ کی فضیلتوں کا تذکرہ کیا تو فرمایا "ابن عباسؓ مجھے اپنی اس تعریف سے معاف رکھو، مجھے یہ پسند تھا کہ میں معدوم محض ہوتی"۔ وہ آپ کو تسلی دیتے کہ "ام المومنین! آپ تو سچے جانے والے کے پاس جا رہی ہیں۔ (یعنی رسول اکرم ﷺ اور ابوبکرؓ کے پاس)۔"

آخری ایام میں وصیت کی کہ دیگر ازواج کے ساتھ جنت البقیع میں دفن کیا جائے۔ کسی نے عرض کیا کہ آپؓ نبی اکرم ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ دفن ہوتیں تو بہتر تھا۔ فرمایا "اگر ایسا ہو تو پچھلا عمل جاتا رہے اور نیا شروع کروں۔"

رمضان المبارک کی سترہ تاریخ ۵۸ ہجری کو حضرت امیر معاویہؓ کی خلافت کے آخر زمانہ میں نماز وتر کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بعد رات میں اپنے رب سے جاملیں۔ وصیت کے مطابق صبح کا انتظار نہ کیا گیا اور رات ہی میں تدفین کا انتظام کیا گیا۔ وفات کی خبر سن کر مدینے کی عورتیں جمع ہو گئیں۔ جنازے میں اتنا ہجوم تھا کہ لوگوں کا بیان ہے کہ رات کے وقت اتنا مجمع کبھی نہیں دیکھا گیا۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے نماز جنازہ پڑھائی اور بھانجوں، بھتیجوں نے قبر میں اتارا۔ حسبِ وصیت جنت البقیع میں دفن ہوئیں۔

مدینہ میں حضرت عائشہؓ کی وفات کی خبر سے سوگواری پھیل گئی اور لوگوں نے آپ کی وفات کے غم کو ایسا منایا کہ جب مدینہ کے ایک شہری سے پوچھا گیا کہ حضرت عائشہؓ کی وفات کا غم اہلِ مدینہ نے کتنا کیا تو اس نے جواب دیا ''جس جس کی وہ ماں تھیں (یعنی تمام مسلمانوں کی) اسی کو ان کا غم تھا۔''

مناقب

سیدہ عائشہؓ اپنے فضائل و مناقب کی بناء پر صحابہ وصحابیات اور پوری امت میں امتیازی حیثیت کی مالکہ ہیں۔ آپؓ پیدائشی طور پر مسلمان تھیں۔ روزِ اول سے ہی کفر و شرک کا سایہ نہ پڑا۔ والد صدیق اکبر دوسری نمایاں خصوصیات کے علاوہ مردوں میں ایمان لانے والے پہلے شخص اور نبی کریم ﷺ کے سب سے قریبی ساتھی تھے۔ یہ رشتہ اس وقت اور مضبوط ہو گیا جب حضرت عائشہؓ نبی اکرم ﷺ کے نکاح میں آ گئیں۔ اس سے قبل آنحضرت ﷺ نے خواب میں دیکھا کہ فرشتہ ریشم کے کپڑے میں لپیٹ کر آپ ﷺ کے سامنے کوئی چیز پیش کر رہا ہے۔ پوچھا کیا ہے؟ جواب دیا کہ آپ ﷺ کی بیوی ہیں۔ آپ ﷺ نے کھول کر دیکھا تو حضرت عائشہؓ (۱) تھیں۔ آپ کو یہ سعادت بھی حاصل ہے کہ آپؓ نبی کریم ﷺ کی واحد کنواری بیوی تھیں۔

ان سب باتوں کے ساتھ آپ کو یہ شرف بھی حاصل تھا کہ آپؓ حبیبِ خدا کو سب سے زیادہ پیاری تھیں۔ غزوہ سلاسل سے واپسی پر جب حضرت عمر بن العاصؓ واپس آئے تو دریافت کیا کہ یارسول اللہ! آپ دنیا میں سب سے زیادہ کس کو محبوب رکھتے ہیں۔ ارشاد ہوا کہ عائشہ کو۔ عرض کیا کہ یارسول اللہ! مردوں کی نسبت سوال ہے؟ فرمایا ''عائشہ کے باپ کو۔''(۲)

آپ ﷺ کے حضرت عائشہؓ سے تعلق کا تذکرہ اس سے قبل بھی آ چکا ہے اور یہ بات اتنی ظاہر اور عام تھی کہ صحابہ اپنے ہدیے بھیجنے کے لئے حضرت عائشہؓ کی باری کا انتظار کرتے۔ دیگر ازواج نے مشورہ کر کے حضرت امّ

(۱) صحیح بخاری (۲) صحیح بخاری

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سلمہ کو نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں بھیجا کہ لوگوں سے کہہ دیں کہ ہدیہ بھیجنے میں کسی خاص باری کے منتظر نہ رہا کریں۔ ام سلمہؓ نے یہ درخواست حضورؐ کو پیش کر دی۔ فرماتی ہیں ''اس پر آنحضور ﷺ نے مجھ سے اعراض فرمایا۔ پھر جب آپ ﷺ نے دوبارہ توجہ فرمائی تو میں نے آپ ﷺ سے اس کا تذکرہ کیا۔ آپ ﷺ نے اس مرتبہ بھی اعراض کیا۔ تیسری بار جب میں نے ذکر کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا ''اے ام سلمہ! عائشہ کے معاملے میں مجھے اذیت نہ دو۔ اللہ گواہ ہے کہ تم میں سے کسی کے بستر پر مجھ پر وحی نازل نہیں ہوتی سوائے عائشہ کے بستر کے۔''(۱)

اس بارے میں خود حضرت عائشہؓ فرماتیں کہ ملائکہ (فرشتے) میرے گھر میں آتے جاتے اور میں آنحضرت ﷺ کے لحاف میں ہوتی اور وحی نازل ہو جاتی۔ حضرت عائشہؓ یہ بھی بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک روز فرمایا ''یا عائش! یہ جبریلؑ تشریف رکھتے ہیں اور تمہیں سلام کہتے ہیں۔'' میں نے اس پر جواب دیا۔ وعلیکم السلام و برکتہ۔ آپ ﷺ وہ کچھ ملاحظہ فرماتے ہیں جو ہمیں نظر نہیں آتا۔(۲)

سیدہ عائشہؓ کو یہ فضیلت بھی حاصل ہے کہ امت کو بہت سے احکامات کا پتہ وحی ربانی کے ذریعے اس وقت چلا جب ذریعہ اور وجہ آپ بنیں۔ ایک غزوہ میں جاتے وقت حضرت عائشہؓ نے اپنی بہن اسماءؓ سے عاریتاً ایک ہار لے لیا تھا۔ اتفاق سے وہ کہیں راستے میں گم ہو گیا۔ آنحضرت ﷺ نے چند صحابہ کو اسے ڈھونڈنے بھیجا۔ اس دوران نماز کا وقت ہو گیا تو ان حضرات نے بغیر وضو کے نماز پڑھ لی۔ پھر جب آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ ﷺ سے صورتحال کے متعلق عرض کیا۔ اس کے بعد تیمّم کی آیت نازل ہوئی۔ اسید بن حضیر نے کہا: تمہیں اللہ خیر کا بدلہ دے، خدا گواہ ہے کہ تم پر جب بھی کوئی مرحلہ آیا تو اللہ تعالیٰ نے اس سے نکلنے کی سبیل تمہارے لئے پیدا کر دی اور تمام مسلمانوں کے لئے بھی اس میں برکت پیدا فرمائی۔(۳)

اس سے قبل واقعہ افک میں جب حضرت عائشہؓ پر بہتان باندھا گیا تو نہ صرف اللہ رب العزت نے آپ کی برأت خود قرآن میں نازل فرمائی، جس کو تا قیامت مسلمان پڑھتے رہیں گے، بلکہ بھولی بھالی پاکدامن عورتوں کے لئے بھی اس میں تسلی ہے۔

اسی طرح حجۃ الوداع کے موقع پر جب حضرت عائشہؓ مکہ پہنچیں تو آپ کو ایام آ گئے اور آپؓ رونے لگیں۔ نبی کریم ﷺ نے آپ کو عمرے کے بجائے حج کا احرام باندھنے کا حکم دیا اور بعد حج کی فراغت کے آپ کے بھائی

---

(۱) صحیح بخاری۔ (۲) صحیح بخاری۔ (۳) صحیح بخاری۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عبدالرحمٰن کے ساتھ آپ کو تنعیم کے مقام پر احرام باندھنے کے لئے بھیجا تا کہ جو عمرہ ادائیگی سے رہ گیا تھا اس کو ادا کر سکیں۔ (۱)

اسی طرح خواتین کے ایک ایسے مسئلے کی وضاحت ہو گئی جس سے ہر ایک کو سابقہ پڑ سکتا ہے۔ مقامِ تنعیم پر مسجدِ عائشہ سے آج بھی لوگ احرام باندھتے اور عمرہ ادا کرتے ہیں۔

نبی اکرم ﷺ کا مرضِ وفات شروع ہوا تب بھی آپ ﷺ ازواجِ مطہرات کی باری کی پابندی فرماتے رہے۔ البتہ یہ دریافت فرماتے رہے کہ کل کس کے یہاں ٹھہرنا ہے؟ کیونکہ آپ ﷺ حضرت عائشہؓ کے یہاں کی باری کے خواہشمند تھے۔ حضرت عائشہؓ نے بیان کیا کہ جب میرے ہاں قیام کا دن آیا تو آپ ﷺ کو سکون ہوا۔ (۲)

حضرت عائشہؓ فخریہ کہا کرتی تھیں کہ تمام بیویوں میں مجھ ہی کو یہ شرف حاصل ہوا کہ آخر وقت میں بھی میرا جھوٹا آپ ﷺ نے منہ میں لگایا۔ اس کے بعد حضرت عائشہؓ کی گود میں سر تھا کہ نبی کریم ﷺ کا انتقال ہوا اور آپ کے حجرے کو ہی مدفنِ نبوی بننا نصیب ہوا۔

اس سے قبل حضرت عائشہؓ یہ خواب دیکھ چکی تھیں کہ ان کے حجرے میں تین چاند ٹوٹ کر گرے ہیں۔ آپؓ نے اس کا ذکر حضرت ابوبکرؓ سے کیا تھا۔ جب آنحضرت ﷺ اس حجرے میں دفن ہوئے تو حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا: ''ان تین چاندوں میں سے ایک یہ ہے اور یہ ان میں سب سے بہتر ہے''۔ اس کے بعد اسی حجرے میں ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ بھی دفن ہوئے۔ یہ ایسی فضیلت ہے جس پر حضرت عائشہؓ بجا طور پر فخر کی مستحق ہیں۔ دنیا کا ہر مسلمان روضۂ رسول پر حاضری دینے کا خواہشمند ہوتا ہے اور یہ روضہ حضرت عائشہؓ کا حجرۂ مبارک ہی ہے۔

اس سے قبل یہ گذر چکا ہے کہ حضرت عائشہؓ کی شبیہ دکھا کر جبریل امین نے نبی کریم ﷺ کو بتایا تھا کہ یہ آپ کی دنیا و آخرت میں زوجہ ہوں گی۔ حضرت عائشہؓ تو اس سے زیادہ اطمینان چاہتی تھیں۔ خود ہی ایک بار عرض کیا۔ یا رسول اللہ ﷺ آپ کی جنت میں بیویاں کون ہوں گی؟ آپ ﷺ مطلب سمجھ گئے۔ فرمایا ''تم ان میں سے ایک ہو۔'' (۳)

حضرت عائشہؓ کو دنیاوی و اخروی جو فضیلتیں حاصل ہوئیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آپ کے ذریعے

---

(۱) صحیح مسلم۔ (۲) صحیح بخاری۔ (۳) سنن ترمذی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تقریباً ایک چوتھائی دین ہم تک پہنچا اور یوں آپ تا قیامت عورتوں میں سب سے بڑی عالمہ اور فقیہ کہلانے کی بجا طور پر مستحق ہیں۔ ان سب فضائل و مناقب کے بعد رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث بہت اچھی طرح سمجھ آتی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ ''مردوں میں سے تو بہت سے کامل اٹھے، لیکن عورتوں میں مریم بنت عمران اور فرعون کی بیوی آسیہ کے سوا اور کوئی کامل پیدا نہیں ہوئی اور عائشہ کی فضیلت عورتوں پر ایسی ہے جیسے ثرید کی فضیلت بقیہ تمام کھانوں پر۔''(۱)

مسلمان عورتوں کے لئے عملی مثال

اُم المومنین حضرت عائشہؓ کی زندگی میں ایک مومنہ عورت کے لئے بہترین نمونے کے ساتھ یہ یقین دہانی بھی ہے کہ نسوانیت کے سارے لوازمات اور تقاضوں کو پورا کرنے کے بعد بھی وہ کسی اعتبار سے معاشرے کا عضوِ معطل نہیں، بلکہ ایک فعال اور کارآمد حصہ بن سکتی ہے۔ یہاں ہم ابوالحسن علی ندوی کی کتاب ''خواتین اور دین اسلام کی خدمت'' کے ایک اقتباس کا خلاصہ پیش کرتے ہیں:

''قرآن مجید کی ایسی بہت سی آیات ہیں جن میں وہ عورتوں کو دین و علم، خدمتِ اسلام، خیر و تقویٰ میں تعاون اور صالح معاشرے کی تعمیر میں حصہ لینے والا بتا کر یہ واضح کرتا ہے کہ اعمالِ صالحہ اور صفاتِ کریمہ میں عورت اور مرد کا کوئی فرق نہیں بلکہ اس کے برعکس وہ ایک ایک صفت کو الگ بیان کرتا ہے اور جب مردوں کی کسی صفت کا ذکر کرتا ہے تو عورتوں کو بھی موصوف کرتا ہے اور ان کا مستقل ذکر کرتا ہے اگرچہ اس کے لئے طویل پیرایہ بیان ہی کیوں نہ اختیار کرنا پڑے۔ اور صفات میں بھی صرف طاعات و عبادات ہی نہیں بلکہ باصلاحیت مردوں، علماء اور اولوالعزم افراد، دینی و اخلاقی احتساب اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی راہ میں مشکلات برداشت کرنے والوں کے ساتھ ان کا ذکر کرتا ہے۔ اس کی حکمت یہ ہے کہ ان صفات میں قوت و صلاحیت رکھنے والے مردوں کو عورتوں پر قیاس کرنے پر وہ انسانی ذہن آمادہ نہیں ہوتے جنھوں نے غیر اسلامی مذاہب و فلسفہ اور قدیم معاشرت و آداب کے سائے میں تربیت پائی ہے۔ ایسے ذہنوں نے ہمیشہ مردوں اور عورتوں میں تفریق کی ہے اور انہیں بہت سے فضائل میں مردوں کے ساتھ شرکت سے بھی

(۱) صحیح بخاری۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مستثنیٰ کر رکھا ہے۔ چہ جائیکہ ان کی مزاحمت وسبقت کو گوارا کریں۔''

ہم مولانا کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ بے شک عورت کو خدا نے مرد کی نسبت کسی قدر کمزور پیدا کیا ہے لیکن ہاتھ پاؤں، کان، آنکھ، یادداشت، سوچ سمجھ سب چیزیں مردوں کے برابر ہی عورتوں کو دی گئی ہیں۔ آدمی ان ہی چیزوں سے کام لے کر ہر فن میں طاقت اور ہر ہنر میں مشاق ہو جاتے ہیں اور اپنا وقت مختلف لیاقتیں پیدا کرنے میں لگاتے ہیں۔ پھر جیسی ان کی لیاقت ہوتی ہے ویسی ان کی قدر۔ اکثر عورتیں یہ گلہ کرتی نظر آتی ہیں کہ شوہران کو شریکِ مشورہ نہیں کرتے، یا اہم امور میں صلاح نہیں لیتے۔ ان کو خود ہی سوچنا چاہئے کہ اللہ نے ان کو بے شمار صلاحیتیں محض اردگرد کے لوگوں اور سسرال پر دھاک بٹھانے، بہت سا وقت بازاروں میں مارے مارے پھرنے اور بہت سی عقل نکمی زندگی گذارنے کے لئے تو نہیں دی۔ پھر اگر وہ خود ہی اپنی قدر نہ کروانا چاہیں تو کسی پر کیا الزام۔

آج کی عورت نے اگرچہ مساواتِ مردوزن کے درآمد شدہ نعرے کے تحت تعلیم کا حق تو حاصل کر لیا ہے اور مردوں نے بھی روشن خیالی کی نام پر اس کی اجازت دے دی ہے لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس کا مقصد حصولِ علم کے ذریعے زندگی کو بہتر طور پر گذارنے سے کہیں زیادہ تہذیبِ نو میں اپنے آپ کو فٹ کرنا اور مردوں پر اپنی برتری ثابت کرنا ہے۔ اسلام مرد و عورت کو مسابقت کی اس دوڑ میں جھونکنے کے بجائے ان کے باہمی تعاون واشتراک سے ایک صالح معاشرے کی تعمیر چاہتا ہے۔ عورت کا دائرہ مرد کے دائرے سے نسبتاً محدود ضرور ہے، لیکن غیر اہم ہرگز نہیں ہے۔ ایک عورت گھر کی بنیادی ذمہ داری ادا کر کے بھی اپنی نجی زندگی کے علاوہ معاشرے کی ترقی اور تعمیر میں فعال کردار ادا کر سکتی ہے۔

سیدہ عائشہؓ کی زندگی سے زیادہ اس کی بہترین اور بھرپور مثال کہاں ملے گی۔ آپ کی زندگی کے کسی گوشے پر بھی اعتراض کی انگلی نہیں رکھی جا سکتی۔ ایک عورت کی حیثیت سے دیکھیں تو کم عمری میں شادی کے ساتھ ہی خانہ داری کا تمام بوجھ آپ کے کاندھوں پر آ پڑا۔ گو آپؓ گھرداری میں بہت ماہر تو نہ تھیں لیکن گھر کے انتظام وانصرام اور ضروریات کو پورا کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتی تھیں۔ شوہر کی خدمت اور اطاعت کے علاوہ محبت اور باہمی تعلق کا ایسا خوبصورت رشتہ تھا جس نے آپ کی گھریلو زندگی کو قابل رشک بنا دیا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ عورت میں سب سے بڑا ہنر یہ ہونا چاہئے کہ جس کے پلے بندھے آپ اس سے راضی رہے اور اس کو اپنے سے راضی اور خوش رکھے۔ حضرت عائشہؓ اس تعریف پر بھی پوری اترتی ہیں۔

گھر کی ذمہ داریاں نبھانے کے ساتھ ساتھ عبادات میں فرائض کی ادائیگی کے علاوہ نبی اکرم ﷺ کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ساتھ نفلی عبادات کا بھی پورا اہتمام کرتیں۔ آپ ﷺ کے بعد بھی یہی معمول رہا۔ تہجد کی نماز ہو یا چاشت کی، رمضان کی تراویح ہو یا مسنون روزے، اعتکاف ہو یا نفلی حج، حضرت عائشہؓ کسی موقع پر غیر حاضر نہ ہوتیں۔ گناہوں سے معافی اور نیکیوں میں سبقت کی ایسی طلبگار تھیں کہ ایک بار جب عرفہ کے دن روزے سے تھیں اور گرمی کی شدت سے سر پر پانی کے چھینٹے دیئے جاتے تھے تو آپ کے بھائی عبدالرحمٰن بن ابی بکر نے روزہ افطار کرنے کا مشورہ دیا۔ کہنے لگیں۔ ''جب میں آنحضرت ﷺ کی زبانی یہ سن چکی ہوں کہ عرفہ کے دن کا روزہ رکھنا سال بھر کے گناہ معاف کر دیتا ہے تو میں روزہ توڑ دوں گی؟''

فطرتاً شجاع تھیں۔ میدانِ جنگ میں جہاد کرنے والوں کا اجر دیکھتیں تو رشک آتا۔ جہاد کی اجازت چاہی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ عورتوں کا جہاد حج ہے۔ (۱) اس حکم کے سننے کے بعد آپ اس کی پابندی اس شدت سے کرتی تھیں کہ کم ہی کوئی سال ایسا گذرا ہوگا جس میں آپؓ نے حج نہ کیا ہو۔

ان سب تفصیلات کو پڑھتے ہوئے یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ یہ کسی ایسی خاتون کا تذکرہ نہیں ہے جو روزمرہ کی سادہ سی زندگی گزار رہی ہو، بلکہ آپ کی زندگی تو بچپن ہی سے آزمائش اور بحرانوں میں گذری۔ بچپن میں کفارِ مکہ کے مسلمانوں سے اذیت ناک سلوک کی زد میں آپ کا کنبہ نبی اکرم ﷺ سے تعلق کی بناء پر خاص طور پر آتا تھا۔ مدینہ ہجرت کرنے کے بعد رخصتی ہوئی تو کفار سے جہاد و قتال کا سلسلہ چل نکلا۔ آپ ان سب سے الگ تھلگ نہیں تھیں۔ کہیں زخمیوں کو پانی پلا رہی ہیں تو کہیں مرہم پٹی کر رہی ہیں۔ منافقین کی سازشیں الگ تھیں۔ واقعہ افک میں آپؓ زندگی کی اس آزمائش سے گذریں جس کا تصور ہی کسی عورت کے رونگٹے کھڑے کرنے کے لئے کافی ہے۔ کم عمر ضرور تھیں، لاپرواہ نہ تھیں۔ ایک سنجیدہ اور سمجھدار عورت کی طرح واقعے کی سنگینی اور شدت کو بھرپور طریقے سے محسوس کیا۔ آنسو تھے کہ تھمتے نہیں تھے۔ مگر زبان کو روکے رکھا۔ اپنی صفائی میں کہا تو یہی کہا ''میں بہترین صبر اختیار کرتی ہوں۔''

جذباتی و نفسیاتی پہلو سے دیکھا جائے تو عورت سنگین سے سنگین حالات برداشت کر لیتی ہے لیکن محبت میں بٹوارا اس کو توڑ پھوڑ دیتا ہے۔ سیدہ عائشہؓ گو کہ رسول اللہ ﷺ کی عاشق تھیں، لیکن نبی اکرم ﷺ جیسے عادل و منصف مزاج شوہر کی بیویوں کا ساتھ بھی نبھانا تھا۔ دل پر کیا گذرتی ہوگی۔ کبھی وقتی طور پر نسوانی ناز آڑے آ جاتا تو بھی دل سے اپنی سوکنوں کے حق میں برا نہ چاہتیں۔ اپنی سوکنوں کی تعریف دل کھول کر کیا کرتی تھیں

---

(۱) صحیح بخاری۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور اس معاملے میں بے انصافی یا کم ظرفی پر آمادہ نہ ہوتیں۔ ایک بار حضرت زینبؓ سے رسول اللہ ﷺ کسی بات پر ناراض ہو گئے تو وہ حضرت عائشہؓ کے پاس آئیں کہ میرا قصور معاف کرادو۔ آپؓ نے خاص اہتمام سے بناؤ سنگھار کیا، آپ ﷺ آئے تو اس سلیقے سے گفتگو کی کہ معاملہ ختم ہو گیا۔

قدرت کے فیصلے دیکھئے۔ اٹھارہ برس کی عمر میں نبی کریم ﷺ کے انتقال کے ساتھ بیوگی کا غم سہنا پڑا۔ جذباتی اور ذہنی صدمے کے ساتھ ساتھ نہ پیچھے سے مال و دولت کے انبار تھے اور نہ سہارا دینے والی اولاد۔ دو ڈھائی سال میں شفیق والد بھی داغ مفارقت دے گئے اور شفقتِ پدری سے محروم ہو گئیں۔ عمر بھر کا روگ لگانے کو یہ سب باتیں کافی تھیں۔ لیکن آپ پر آفرین ہے کہ جو نعمتیں اور فضیلتیں حاصل تھیں ان پر شاکر و مسرور رہیں۔

اگر بات یہاں ختم ہو جاتی تب بھی یہ تذکرہ آئندہ آپ کے ذکر خیر کے لئے کافی تھا۔ لیکن آپ نے حالات کی رو میں بہنے کے بجائے اپنی بقیہ زندگی کو دینِ اسلام کی خدمت کے لئے وقف کر دیا۔ ''گھروں میں ٹکی رہو'' کے قرآنی حکم اور حجاب کی پابندیوں کو بے عملی کی دلیل بنانے کے بجائے ان کی پوری پابندی کے ساتھ اپنے گھر ہی سے قرآن و حدیث کی تعلیم کا سلسلہ شروع کر دیا اور نبی اکرم ﷺ کے بعد حضرت ابوبکرؓ کے دورِ خلافت میں ہی افتاء کا منصب حاصل کر لیا۔ علم کو پھیلانے کا ذمہ لیا تو اس کا حق ادا کیا۔ آپ کا علم بھی کوئی سطحی قسم کا نہ تھا۔ ترمذی میں ہے ''ہم اصحاب محمد ﷺ کو کبھی کوئی مشکل مسئلہ پیش نہ آیا لیکن عائشہؓ کے پاس اس کا علم موجود پایا۔'' پھر اس کے اظہار میں نہ جھجکیں، نہ شرمائیں، نہ مصلحت آڑے آئی، بلکہ جو بات حق تھی وہ بیان کی چاہے وہ اپنے خلاف ہی کیوں نہ جاتی ہو۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ علم یکسوئی اور تسلی کے ساتھ کسی مدرسے سے حاصل نہ کیا گیا تھا بلکہ چلتے پھرتے ہی دینی علوم کے علاوہ آپ کو شاعری، تاریخ اور طب پر بھی عبور حاصل ہو گیا تھا۔

یہاں یہ بات بجا طور پر ذہن میں آ سکتی ہے کہ آپؓ کی اولاد نہ تھی۔ ان ذمہ داریوں سے فارغ تھیں جو ایک ماں کو ساری زندگی مصروف رکھتی ہیں۔ بے شک آپ کی حقیقی اولاد کوئی نہ تھی مگر قرآن مجید کی طرف سے تمام مومنین کی ماں کا جو خطاب ملا تھا آپؓ نے اس کا مان رکھا۔ امت کا جیسا درد آپ کے دل میں تھا، اسی کے تقاضے سے مجبور ہو کر آپؓ نے حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد رفعِ فساد کے لئے گھر سے قدم نکالا۔ گو بعد میں آپؓ اپنی اجتہادی غلطی پر سخت پشیمان ہوئیں۔ مگر اس پورے معاملے میں کسی نے بھی آپ کے خلوص پر شبہ نہ کیا۔ سیاست کے میدان میں آپ کا یہ واحد عملی قدم تھا۔ اس سے پہلے اور بعد میں کبھی پوچھنے پر اپنی رائے سے آگاہ کرنے کے علاوہ بلا ضرورت آگے آگے ہونے سے گریز کیا۔ بلکہ اپنے آپ کو سماجی خدمات میں مصروف کر لیا۔ یتیم بچیوں کو لے کر ان کی تربیت کرتیں اور ان کی شادیاں کرتیں۔ ضرورتمندوں پر بے دریغ خرچ کرتیں۔ اپنی ضرورتوں پر دوسروں کی ضرورت کو مقدم رکھتیں۔ اپنی ضرورت کے لئے تو ایک جوڑا ہی کافی تھا،

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جسے دھو دھو کر پہنتی تھیں۔

اسلام کے ابتدائی دور کی تنگی کے بعد فتوحات کے ساتھ ہی خوشحالی کا دور آیا تو خلفائے راشدین نے دیگر لوگوں کے ساتھ ازواج کے وظائف مقرر کئے اور مالِ غنیمت میں سے بھی حصہ دینا شروع کیا۔ عام عورت ہوتی تو عمر بھر کی کسر نکالنے کا سوچتی۔ لیکن نبی اکرم ﷺ کی تربیتِ خاص نے مال کی محبت سے آپ کے دل کو بے نیاز کر دیا تھا۔ ایک ایک لاکھ درہم کی رقم آئی اور دیکھا گیا کہ سیدہ بلا تاخیر سب بانٹ کر دوپٹہ جھاڑ کر اٹھ گئیں۔ ملازمہ نے یاد دلایا کہ آپ کا روزہ تھا، افطار کے لئے سامان نہیں۔ اپنے لئے تو کچھ رکھ لیا ہوتا۔ فرمایا: ''تم یاد دلا دیتیں۔''

روز روز کی ایسی فیاضی دیکھ کر چہیتے بھانجے کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا کہ خالہ کا ہاتھ روکنا پڑے گا۔ اس پر ناراض ہوگئیں۔ گو بعد میں مان گئیں۔ کھلے دل سے معاف کر دیتیں اور اپنی غلطی کی صورت میں اقرار بھی کر لیتیں۔ اپنے اعلیٰ اخلاق کی وجہ سے خواتین میں مقبول تھیں۔ مزاج کی نرم تھیں۔ خوددار تھیں، لیکن انا پرست نہ تھیں۔ اپنے علمی پائے کے لحاظ سے مردوں کی برابری کرتی تھیں بلکہ اکثر سے برتر تھیں۔ ایسی بلند مرتبہ خاتون اگر اپنی صنف کی دیگر عورتوں کو کمتر سمجھنے لگے تو کچھ تعجب نہیں، لیکن حضرت عائشہؓ کبھی عورت ہونے پر نہ شرمائیں بلکہ ہمیشہ ہر موقع پر اپنی جنس کی بھرپور نمائندگی کی۔

نبی اکرم ﷺ کی زندگی میں عورتیں اپنے مسئلے لے لے کر آتیں۔ بعض ایسی حجاب والی باتیں ہوتیں کہ وہ آپ ﷺ سے بیان نہ کرسکتیں تو حضرت عائشہؓ کی مدد چاہتیں۔ آپؓ اپنی بہنوں کی مدد کرتیں اور ان کی درخواستیں اور حالات نبی کریم ﷺ کی خدمت میں پیش کرتیں۔ آپ ﷺ کے انتقال کے بعد بھی عورتوں کے حقوق کی پوری نگہبانی کی۔ بطور ثبوت یہ ایک واقعہ کافی ہے۔ جب آپؓ تک کچھ صحابہ کی یہ روایت پہنچی کہ ''عورت، کتا اور گدھا اگر نماز میں نمازی کے سامنے سے گذر جائیں تو نماز ٹوٹ جاتی ہے'' تو بہت ناراض ہوئیں اور کہا ''تو عورت بھی ایک بد جانور ہے؟ تم نے کیسا برا کہا کہ ہم کو گدھے اور کتے کے برابر کر دیا۔ آپ ﷺ نماز پڑھا کرتے تھے اور میں آگے لیٹی رہتی تھی۔ آپ ﷺ سجدہ کرنا چاہتے تو میرے پاؤں دبا دیتے تو میں سمیٹ لیتی۔''

سید سلیمان ندویؒ کے الفاظ میں:

''جنسِ نسوانی پر ان کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ انہوں نے دنیا کو یہ بتا دیا کہ ایک مسلمان عورت پردہ میں رہ کر بھی علمی، مذہبی، اجتماعی اور سیاسی اور پند و موعظت اور اصلاح و ارشاد اور امت کی بھلائی کے کام بجا لا سکتی ہے۔ غرض اسلام نے عورتوں کو جو رتبہ بخشا ہے اور ان کی گزشتہ گری ہوئی حالت کو جتنا اونچا کیا ہے ام المومنین کی زندگی کی تاریخ اس کی عملی تفسیر ہے۔''

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حضرت خالدؓ بن ولید

اسلامی تاریخ کے عظیم ترین اور ناقابلِ شکست جرنیل

تعارف

آپ کا نام خالدؓ، کنیت ابوسلیمان اور خطاب سیف اللہ تھا۔ آپ کا سلسلہ نسب یہ ہے:

خالد بن ولید بن مغیرہ بن عبداللہ بن عمر بن مخزوم بن یقظہ بن مرۃ۔

آپ کا نسب ساتویں پشت میں مرۃ پر جا کر نبی اکرم ﷺ سے جاملتا ہے۔ آپ کی خالہ ام المومنین حضرت میمونہؓ نبی کریم ﷺ کی زوجہ مطہرہ تھیں۔ اس طرح حضور ﷺ آپ کے حقیقی خالو بھی تھے۔ آپ کا تعلق قریش کے مشہور خاندان بنومخزوم سے تھا۔ یہ قبیلہ جنگجویانہ اوصاف، علم و فضل اور اصابتِ رائے کی وجہ سے بنوہاشم کے بعد سب سے نمایاں تھا۔

ولادت

خالدؓ کے سنِ پیدائش کے بارے میں مختلف روایات ملتی ہیں جن میں کوئی بھی مستند نہیں ہے۔ مختلف حوالوں سے مدد لینے کے بعد اتنا کہا جاسکتا ہے کہ آپ ۵۹۲ء میں پیدا ہوئے، کیونکہ ظہورِ اسلام کے وقت آپ کی عمر اندازاً چوبیس برس تھی۔

بچپن اور خاندانی حالات

خالدؓ کا باپ ولید بن مغیرہ مکہ کا نہایت ذی اثر اور دولت مند آدمی تھا۔ مکے سے طائف تک اس کے باغات تھے۔ وہ تاجر ہونے کے ساتھ ساتھ فرصت کے اوقات میں لوہار کا کام بھی کرتا تھا۔ اس کی دولتمندی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایک سال تنہا وہ خانہ کعبہ کا غلاف بنواتا اور دوسرے سال تمام قریش مل کر یہ خدمت سرانجام دیتے تھے۔ ولید کے چھ بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں اور یہ بات اس کا فخر بڑھانے کے لئے کافی تھی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کیونکہ عرب میں زیادہ بیٹوں کا باپ ہونا باعث عزت سمجھا جاتا تھا۔ ان تمام خصوصیات کی وجہ سے ولید کو الوحید (یکتا) بھی کہا جاتا تھا۔

خالدؓ کا بچپن عام عرب دستور کے مطابق دیہات کی کھلی فضاؤں میں گذرا۔ لڑکپن میں اس احساس کے ساتھ قدم رکھا کہ آپ قریش کے مشہور خاندان بنومخزوم کے سردار کے بیٹے ہیں۔ گھر میں دولت کی ریل پیل تھی، لیکن اس کے باوجود ولید نے اپنے بیٹوں کی تربیت میں جرأت، جنگی مہارت، جفاکشی اور سخاوت جیسی صفات پیدا کرنے کا خصوصی اہتمام کیا۔ خالدؓ نے بچپن ہی سے شہسواری، نیزہ بازی، شمشیرزنی اور جنگی داؤ پیچ میں دلچسپی لینا شروع کر دی۔ آپ فطرتاً پھرتیلے اور نڈر تھے۔ چھ فٹ سے اونچا قد، کشادہ سینہ اور مضبوط بدن، پھر جسمانی طاقت اور فنون حرب میں کمال، ان سب خصوصیات نے خالدؓ کو مکے میں مقبول بنا دیا اور قریش کے منتخب نوجوانوں میں آپ کا شمار ہونے لگا۔ آپ کی جسمانی طاقت کا اندازہ اس واقعے سے بھی ہوتا ہے کہ عمرؓ اپنے لڑکپن میں کشتی کے ایک مقابلے میں خالدؓ سے ہڈی تڑوا بیٹھے تھے جو کافی عرصہ کے علاج کے بعد ٹھیک ہوئی۔

ظہورِ اسلام - خالدؓ اور آپ کے خاندان کا ردعمل

نبی اکرم ﷺ کے اعلان نبوت نے قریش کے خاندانوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ ہر گھر کے کسی نہ کسی فرد نے پکارِ حق پر لبیک کہا تھا۔ قریش کے سردار ابتداء میں اس دعوت کا مذاق اڑاتے تھے، لیکن وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ جوں جوں دعوت پھیلنے لگی، ان کی مخالفت سنجیدہ اور شدید ہوگئی۔ حضور ﷺ کی مخالفت میں جو لوگ پیش پیش تھے ان میں خالدؓ کا باپ ولید، ابوالحکم (ابوجہل) ابوسفیان اور ابولہب سرفہرست تھے۔ نبوت کے اعلان سے ولید کے وقار کو سخت ٹھیس لگی تھی۔ اس کے نزدیک فضیلت اور سرداری کا معیار نسل، طبقہ، اولاد اور مال تھا۔ وہ کہنے لگا ''یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ نبوت محمد (ﷺ) کو سونپی جائے، اور مجھے قریش کے سب سے بڑے سردار کو کچھ بھی نہ ملے۔ اور پھر قبیلہ ثقیف کا سردار ابومسعود ہے۔ یقیناً ہم دونوں اپنے اپنے علاقے کے سب سے بڑے سردار ہیں۔''

اس کے جواب میں قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی ''اور کہنے لگے کہ یہ قرآن دو (مشہور) بستیوں کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نازل نہیں ہوا۔'' (۴۳۔۳۱)

ولید اور دیگر سرداران قریش ابوطالب کے پاس حاضر ہوئے تاکہ وہ کسی طور نبی اکرم ﷺ کو اپنے کام سے روک سکیں۔ چنانچہ ایک وفد ابوطالب کے پاس یہ درخواست لے کر پہنچا کہ وہ محمد (ﷺ) کو قریش کے حوالے کر دیں تو اس کے بدلے ولید کے بیٹے اور خالد کے بھائی عمارہ کو قبول کر لیں جو کہ ایک خوبرو اور سجیلا جوان تھا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ابو طالب نے اس پیشکش کا بہت برا منایا اور کہا کہ ''آپ مجھے اپنا بیٹا پرورش اور تربیت کے لئے دیتے ہیں جبکہ میرا بیٹا قتل کے لئے مانگتے ہیں۔ اللہ کی قسم ایسا کبھی نہ ہوگا۔''

جب سردارانِ قریش مال اور طاقت سے اسلام کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کو روکنے میں ناکام ہوگئے تو انہوں نے کمزور مسلمانوں پر اذیتوں کے پہاڑ توڑنے شروع کئے۔ حق کی پکار کی کشش اور مظلوم مسلمانوں کی دین کی راہ میں استقامت کے باوجود ان کے پتھر دل موم نہ ہوسکے بلکہ ان کے غرور اور تکبر میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔

ولید بھی اسلام دشمنی میں حد سے بڑھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ قرآن مجید کی ایک آیت کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے خاص طور سے ولید کی طرف اشارہ کرکے فرمایا ''چھوڑ دو مجھے اور اس کو، جسے میں نے اکیلا (یکتا) پیدا کیا اور اس کو کثرت سے مال دیا اور پاس رہنے والے بیٹے عطا کئے اور اس کے لئے (ہر طرح) خوب سامان مہیا کیا۔ پھر بھی وہ اس کی طمع رکھتا ہے کہ میں اسے اور زیادہ دوں۔ ہرگز نہیں، وہ ہماری آیتوں کا مخالف ہے۔ میں عنقریب اسے دوزخ کے ایک (کٹھن چڑھائی) پہاڑ پر چڑھاؤں گا۔ اس نے سوچا اور کچھ بات بنانے کی کوشش کی۔ تو خدا کی مار اس پر، کیسی بات بنانے کی کوشش کی۔ ہاں خدا کی مار اس پر، کیسی بات بنانے کی کوشش کی۔ پھر (لوگوں کی طرف) دیکھا۔ پھر ہونٹ سکیڑے اور منہ بنایا۔ پھر پلٹا اور تکبر میں پڑ گیا۔ آخرکار بولا کہ یہ کچھ نہیں ہے مگر ایک جادو جو پہلے سے چلا آرہا ہے۔ یہ تو ایک انسانی کلام ہے۔ عنقریب میں اسے دوزخ میں جھونک دوں گا''۔ [۷۴:۱۱۔۱۷]

یہ وہ اسلام دشمن ماحول تھا جس میں خالدؓ کے شب و روز گزرتے تھے۔ دولت کی ریل پیل اور زندگی کے دیگر مشاغل نے کائنات اور انسان کے متعلق ابتدائی سوالات پر کبھی سوچنے کا موقع ہی نہ دیا اور باپ کی تقلید میں خالدؓ اور آپ کا خاندان اپنی اسلام دشمنی میں بڑھتا چلا گیا۔ اس زمانے میں خالدؓ نے تجارتی قافلوں کے ساتھ شام اور بصرہ کا سفر بھی کیا۔ نبی اکرم ﷺ کے مدینہ ہجرت کرنے کے صرف تین ماہ بعد خالدؓ کے باپ ولید کا ۹۵ برس کی عمر میں انتقال ہوگیا۔

باپ کے انتقال کے بعد جب مسلمانانِ مدینہ سے بدر کے مقام پر کفارِ مکہ کا معرکہ ہوا تو خالدؓ حجاز میں موجود نہ ہونے کے باعث شریک نہ ہوسکے۔ البتہ آپ کے بھائی ولید گرفتار ہوئے اور آپ کے خاندان بنومخزوم کے سترہ افراد مارے گئے جن میں سے بیشتر خالدؓ کے چچیرے بھائی یا بھتیجے تھے۔ خالدؓ نے واپس آنے کے بعد اپنے بھائی ہشام کے ساتھ مل کر گرفتار شدہ بھائی ولید کو رہا کروانے کا فیصلہ کیا۔ ولید کی رہائی کا فدیہ ۴۰۰ درہم ادا کرنے کے بعد تینوں بھائی مدینہ سے روانہ ہوئے اور رات کو ذی الحلیفہ کے مقام پر پڑاؤ کیا۔ خالدؓ کے بھائی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے دل میں اسلام گھر کر چکا تھا۔ چنانچہ رات کے کسی پہر ولید خیمے سے نکل کر واپس مدینہ پہنچے اور اسلام قبول کر لیا۔

مکہ میں جنگِ بدر کے مقتولین کا بدلہ لینے کے لئے انتقام انتقام کی صدائیں گونجنے لگیں اور اہلِ مکہ ایک اور جنگ کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔ غزوہ بدر کے ٹھیک ایک سال اور ایک ہفتے کے بعد دونوں افواج پھر آمنے سامنے تھیں۔ سات سو مسلمان تین ہزار کفار کا مقابلہ کرنے میدان میں اترے تھے۔ اہلِ مکہ کے لشکر میں میمنہ پر خالد اور میسرہ پر عکرمہ تھے۔ دونوں کے پاس سو سو سواروں کا ایک دستہ تھا اور عمرو بن عاص کو پورے رسالے کا سالار مقرر کیا گیا تھا۔

لڑائی شروع ہوئی اور کچھ ہی دیر بعد لشکر قریش کے قدم اکھڑنے لگے۔ وہ شکست کھا کر پیچھے بھاگنے لگے اور مسلمانوں کو اپنی فتح کا یقین ہو گیا۔ ایسے میں عینین کے مقام پر متعین وہ پچاس تیر انداز بھی جنہیں نبی اکرم ﷺ کی خصوصی ہدایت تھی کہ خواہ کچھ بھی ہو وہ اپنی جگہ نہ چھوڑیں (پیچھے سے دشمن کے حملے کا خطرہ تھا) یہ سمجھ کر کہ اب جنگ کا فیصلہ ہو چکا، اپنے سالار عبداللہ بن جبیرؓ کی مرضی کے خلاف مالِ غنیمت جمع کرنے دوڑے۔ خالدؓ اور عکرمہؓ دونوں اپنی پوزیشن سے ہٹنے پر تیار نہ تھے۔ جب اپنی فوج میں ابتری کے آثار دیکھے تو بجائے گھبرا کر پسپا ہونے کے ٹھنڈے دل سے صورتحال کا جائزہ لیا۔ انہیں عینین کے مقام پر مسلمانوں کی کمزوری کا علم ہو گیا۔ درّہ تیر اندازوں سے خالی ہو چکا تھا۔ عبداللہ بن جبیرؓ کے ساتھ صرف نو تیر انداز پہاڑی پر رہ گئے تھے۔ خالدؓ نے حملہ کر کے اس درے پر قبضہ کر لیا۔ پہاڑی پر رہ جانے والے مسلمان تیر اندازوں نے بے جگری سے مقابلہ کیا۔ کچھ شہید ہو گئے اور باقی زخمی حالت میں پہاڑی سے نیچے دھکیل دیئے گئے۔ مسلمان فوج میں پشت سے خالدؓ کے اس اچانک حملے نے کھلبلی مچا دی۔ ابوسفیان نے صورتحال کو اپنے حق میں دیکھا تو اپنی بھاگتی ہوئی فوج کو جمع کر کے سامنے سے بھی حملہ کر دیا۔ مسلمان دونوں طرف سے گھر گئے۔ خود نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس خطرات سے دوچار ہو گئی تھی۔ صحابہؓ کی ایک ٹولی آپ کی حفاظت کرتے ہوئے اپنی جان نچھاور کر چکی تھی۔ محض چند صحابہ حفاظت کے لئے آپ ﷺ کے گرد حلقہ بنائے ہوئے تھے۔ وہ آپؐ کو لئے آہستہ آہستہ وادی کی تنگ گھاٹی کی جانب کھسک گئے۔

احد میں اگرچہ کفار مکہ کوئی واضح فتح تو حاصل نہ کر سکے، لیکن جہاں تک خالدؓ کی دور اندیشی، فوجی تدبر اور دلیری کا تعلق ہے، ہر دوست دشمن کو یہ اعتراف کرنا پڑا کہ شکست خوردہ فوج کے سپاہیوں کو اکٹھا کر کے عقب سے حملہ کر دینا آپ کا فوجی کارنامہ تھا اور آنے والے دنوں میں آپ کی فوجی بصیرت کی پیش گوئی کی جا سکتی تھی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

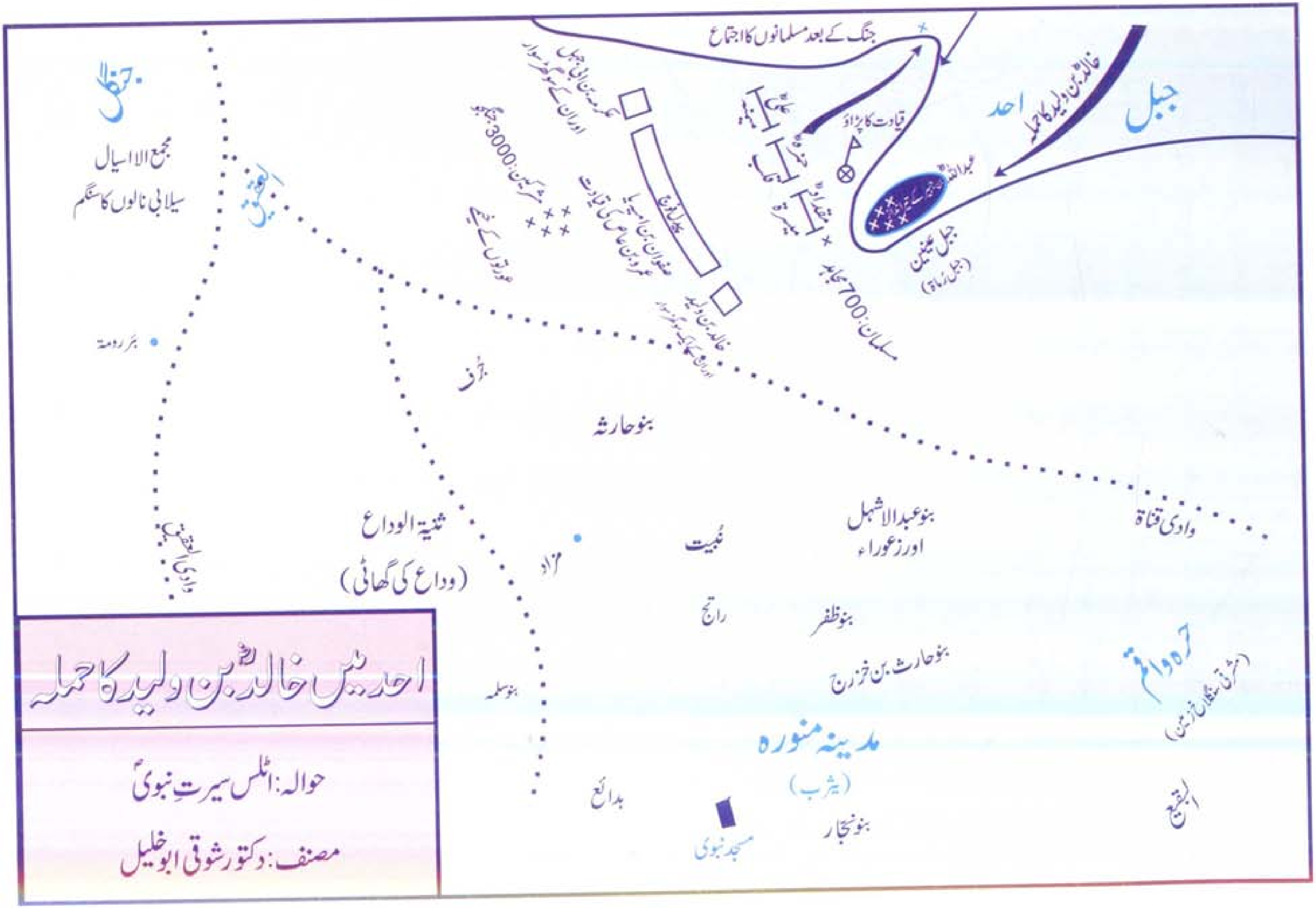

احد میں خالدؓ بن ولید کا حملہ

حوالہ: اٹلس سیرتِ نبویؐ

مصنف: دکتور شوقی ابو خلیل

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

احد کے دو سال بعد خندق کی لڑائی بغیر کسی معرکے کے ختم ہوگئی اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مسلمانوں کو محفوظ رکھا۔ ٦ ہجری میں رسول اللہ ﷺ عمرے کے لئے روانہ ہوئے تو کفار نے خالد بن ولید کو دو سو سواروں کے ساتھ مسلمانوں کی نقل وحرکت دیکھنے کے لئے روانہ کیا۔ خالدؓ اور آپ کے ساتھیوں نے ہر چند کوشش کی کہ مسلمانوں کے ساتھ الجھ کر انہیں واپس جانے پر مجبور کر دیا جائے۔ مگر حضور ﷺ کا تدبر اور امن پسندی اس ارادے پر غالب آئی اور کفار کے ساتھ مسلمانوں کی صلح طے پائی۔

خالدؓ آغوشِ اسلام میں

جنگِ احد کے بعد سے خالدؓ مسلسل یہ محسوس کر رہے تھے کہ باوجود جنگی سامان کی کثرت، فوج کی زیادتی اور تدبیر اور سازش کے مسلمانوں کا کوئی کچھ بھی نہ بگاڑ سکا۔ بلکہ ہر گذرتا ہوا دن ان کی فتوحات میں اضافہ ہی کر رہا ہے۔ مسلمان بجائے کمزور ہونے کے طاقتور ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی آپ نے ٹھنڈے دل سے اسلام کی حقانیت اور اس کی تعلیمات پر غور کرنا شروع کیا۔ احد، خندق اور پھر حدیبیہ کے جتنے بھی مواقع پیش آئے ان میں نبی اکرم ﷺ اور ان کے اصحاب کا اخلاق اور بے نفسی کھل کر سامنے آ گئی۔ اس کے ساتھ ہی یہ یقین بھی ہونے لگا کہ خدائی طاقت مسلمانوں کے ساتھ ہے۔ خالدؓ خود فرماتے ہیں:

> ''جب رسول اللہ ﷺ حدیبیہ میں قیام فرما تھے تو میں نے دیکھا کہ آنحضرت ﷺ نماز ادا کر رہے ہیں۔ میں نے ہر چند کوشش کی کہ رسول کریم ﷺ اور آپ کے اصحاب کو نقصان پہنچاؤں، لیکن میری کوئی پیش نہ گئی۔ اس وقت میرے دل پر القاء ہوا کہ خدا ان کا حافظ و ناصر ہے اور ہم چاہے کتنی بھی کوشش کریں، ان پر غالب نہیں آ سکتے''۔

''عمرۃ القضاء'' کے بعد خالدؓ اسی سوچ میں رہنے لگے۔ یہاں تک کہ آپ کو یقین ہو گیا کہ اسلام دینِ حق ہے۔ اس بات کا تذکرہ آپ نے عکرمہ سے کیا۔ آپ کی اس تبدیلیٔ رجحان کا سن کر وہ سناٹے میں آ گیا۔ اس نے آپ کو سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن اب معاملہ سمجھنے سمجھانے سے بہت دور نکل چکا تھا۔ ابوسفیان کو علم ہوا تو آگ بگولا ہوگیا اور خالد کو سنگین نتائج کی دھمکیاں دینے لگا۔ اس موقع پر عکرمہ بن ابی جہل نے (جو رشتے میں خالدؓ کا بھتیجا ہونے کے ساتھ ساتھ جگری دوست بھی تھا) خالدؓ کا بھرپور دفاع کیا اور کہا کہ خالدؓ کو اپنی مرضی کا عقیدہ اختیار کرنے کا پورا حق حاصل ہے۔

نبی اکرم ﷺ کو خالدؓ کے دل کی کیفیات بذریعہ الہام معلوم ہوگئیں۔ آپ ﷺ نے خالدؓ کے بھائی ولیدؓ کو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(جو بدر کے معرکے کے بعد مسلمان ہو چکے تھے) بلا کر خالدؓ کے دل کا حال بیان کیا اور فرمایا ''خالد پر اسلام کی سچائی ظاہر ہو چکی ہے۔ پھر وہ اسلام کیوں نہیں لے آتا۔''

حضور ﷺ کا ارشاد سن کر ولیدؓ نے خالدؓ کو اسلام کی طرف رغبت دلانے کے لئے خط لکھا اور نبی اکرم ﷺ کے استفسار کا بھی بیان کیا۔ خالدؓ کے مطابق بھائی کا خط دیکھ کر آپ کی یہ حالت ہوگئی جیسے پھونس کو آگ لگا دیتے ہیں۔ جی چاہا کہ نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کر لیں۔ فوراً مدینے کا رخ کیا۔ راستے میں عثمان بن طلحہ اور عمر بن عاص سے ملاقات ہوئی۔ یہ سب ایک ہی مقصد کے لئے مدینہ کی جانب جا رہے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے پہلے ہی اپنے اصحاب کو ان کی آمد کے بارے میں یہ فرما کر مطلع کر دیا تھا کہ مکہ نے اپنے جگر گوشوں کو ہماری طرف پھینک دیا ہے۔ مدینہ پہنچ کر خالدؓ نے سفر کے کپڑے اتار کر عمدہ پوشاک زیب تن کی۔ اپنے ساتھیوں میں سب سے پہلے حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گئے۔ اس کے بعد خالدؓ نے اپنی گزشتہ زندگی کے گناہوں کے بارے میں پریشانی کا اظہار کیا۔ نبی کریم ﷺ نے آپ کو خوشخبری سنائی کہ اسلام لانا ہی پچھلے گناہوں سے توبہ کرنا ہے۔ پھر حضور ﷺ نے خالدؓ کے حق میں دعائے خیر کی۔ خالدؓ نے آٹھویں ہجری کے اوائل میں اسلام قبول کیا۔

اللہ کی تلوار میدانِ جہاد میں

حضرت خالدؓ نے قبولِ اسلام کے بعد سب سے پہلے جس معرکے میں شرکت کی وہ موتہ کے مقام پر پیش آیا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ نبی اکرم ﷺ کے قاصد کو والیٔ بصرہ نے بیدردی کے ساتھ قتل کر دیا تھا۔ جب اس واقعے کی اطلاع آپ ﷺ کو ملی تو آپ ﷺ نے زیدؓ بن حارثہؓ کی سپہ سالاری میں تین ہزار کا لشکر فوج کشی کے لئے تیار کیا اور فرمایا کہ اگر زیدؓ مارے جائیں تو جعفرؓ اور اگر جعفرؓ مارے جائیں تو عبداللہؓ بن رواحہ کو سپہ سالار بنایا جائے۔ جب اسلامی لشکر پیش قدمی کرتا ہوا معان کے مقام پر پہنچا تو اطلاع ملی کہ والیٔ بصرہ نے اپنی مدد کے لئے قیصر سے ایک بڑی فوج کی کمک مانگی تھی جس کے جواب میں اس نے (بعض روایات کے مطابق) ایک لاکھ کا لشکر روانہ کر دیا ہے۔ یہ ایک خوفناک صورتحال تھی۔ مسلمان اتنی بڑی فوج سے لڑنے کے لئے ضروری تیاری کر کے نہیں آئے تھے۔ ان کے پاس دو ہی راستے تھے۔ یا تو نبی اکرم ﷺ کو نئی صورتحال سے آگاہ کر کے آپ ﷺ کے حکم کا انتظار کریں یا پھر اللہ کا نام لے کر میدانِ جنگ میں کود پڑیں۔ عبداللہؓ بن رواحہ نے اس موقع پر ایسی پرسوز تقریر کی کہ پورے لشکر میں جوش و خروش پیدا ہو گیا اور جنگ کرنے کے حق میں فیصلہ ہوا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس لشکر میں حضرت خالدؓ بھی ایک عام سپاہی کی حیثیت سے شریک تھے۔ موتہ کے مقام پر فوجیں آمنے سامنے ہوئیں اور معرکہ گرم ہوا۔ کچھ ہی دیر میں مسلمان افواج کے سپہ سالار زیدؓ بن حارثہ شہید کر دیئے گئے۔ اس کے بعد جعفرؓ طیار انتہائی بہادری سے لڑتے ہوئے زخمی ہو گئے۔ ان کا دایاں ہاتھ کٹ گیا تو علَم بائیں ہاتھ میں لے لیا اور جب بایاں ہاتھ کٹا تو کٹے ہوئے بازوؤں اور ٹانگوں کی مدد سے علَم بلند رکھا۔ یہاں تک کہ شہید کر دیئے گئے۔ اب عبداللہؓ بن رواحہ نے آگے بڑھ کر پرچم کو تھام لیا۔ مگر کچھ ہی دیر میں وہ بھی شہید کر دیئے گئے۔ مسلمانوں کی صفوں میں پژمردگی پھیل گئی۔ اسی وقت ثابتؓ بن ارقم نے لپک کر جھنڈا اٹھا لیا اور خالدؓ بن ولید کو امیر لشکر اور سپہ سالار کے طور پر نامزد کیا۔ اس رائے سے سب نے اتفاق کیا۔ آپؓ کے علَم سنبھالتے ہی لڑائی میں ایک بار پھر تیزی آ گئی۔ خود خالدؓ کے ہاتھوں نو تلواریں ٹوٹیں اور صرف ایک یمنی بانا (چھوٹی سی تلوار) باقی بچا۔ لڑائی زوروں پر تھی کہ شام ہو گئی اور دونوں لشکر اپنے پڑاؤ پر واپس آ گئے۔

حضرت خالدؓ کے سامنے تین راستے تھے۔ واپس لوٹ جائیں، اتنی کم افواج کے ساتھ معرکے کو آخری انجام تک لے جائیں یا کوئی ایسی حکمت عملی اختیار کریں کہ مسلمانوں کی شکست کا تاثر بھی نہ ابھرے اور مسلمانوں کا جانی نقصان بھی نہ ہو۔ خالدؓ نے یہی راستہ اختیار کیا۔ اگلی صبح خالدؓ نے لشکرِ اسلام کی ترتیب اس طرح بدل ڈالی کہ دشمن کو ایک نظر میں یہ اندازہ ہوا کہ راتوں رات مسلمانوں کو کمک مل گئی ہے۔ وہ ہراساں ہو گئے اور لڑتے لڑتے پیچھے ہٹنا شروع ہو گئے۔ خالدؓ اسی موقع کے انتظار میں تھے۔ آپؓ نے بھی اپنی افواج کو پیچھے ہٹا لیا اور انتہائی مہارت سے لشکر کو موتہ سے نکال کر مدینہ کی طرف روانہ کر دیا تاکہ مسلمانوں کو جانی نقصان سے بچایا جا سکے۔ نبی اکرم ﷺ کو ان تمام واقعات کی خبر وحی کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے پہنچا دی۔ چنانچہ مدینہ میں جب ابھی کوئی اطلاع بھی نہیں پہنچی تھی آپ ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو بتا دیا کہ ''میدانِ جنگ میں جھنڈا زید نے لے لیا اور وہ شہید کر دیئے گئے پھر جعفر نے لے لیا اور وہ بھی شہید کر دیئے گئے۔ پھر ابن رواحہ نے لیا اور وہ بھی شہید کر دیئے گئے (اس دوران آپ ﷺ کی آنکھیں اشکبار تھیں) یہاں تک کہ جھنڈا اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار نے لے لیا۔ اللہ نے ان پر فتح عطا کی۔'' اس کے بعد سے آپ کو سیف اللہ (اللہ کی تلوار) کہا جانے لگا۔ ایک روایت کے مطابق آپ ﷺ نے دعا کی۔ ''یا الٰہی! خالد تیری تلوار ہے۔ تو ہمیشہ اس کو فتح مند رکھنا''۔

فتحِ مکہ کے موقع پر مسلمان نبی کریم ﷺ کے ساتھ پرامن طور پر شہر میں داخل ہوئے اور خون خرابے کی نوبت نہ آئی۔ خود نبی اکرم ﷺ کی بھی یہی خواہش تھی کہ مکہ بغیر خونریزی کے فتح ہو۔ آپ ﷺ کے ترتیب دیئے گئے چار لشکروں میں سے ایک دستہ حضرت خالدؓ کے تحت کر دیا گیا۔ ان چاروں دستوں کو چار مختلف راستوں سے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مکہ میں داخل ہونا تھا تا کہ اہلِ مکہ کسی ایک جگہ اجتماع کر کے لشکر تیار نہ کرلیں۔ اس کے ساتھ ہی فرار کے سب راستے بھی مسدود کر دیئے گئے۔ آپ ﷺ نے تاکید کی کہ اگر قریش کی طرف سے مسلح مزاحمت نہ ہو تو جنگ ہرگز نہ کی جائے۔ باقی تین دستے تو بغیر کسی مزاحمت کے مکہ پہنچ گئے، جبکہ حضرت خالدؓ کے سامنے مکہ کے وہ مسلح افراد گروہ بند ہو کر آئے جو بغیر لڑائی کے مکہ کھونا نہیں چاہتے تھے۔ ان کے سردار عکرمہ بن ابی جہل اور صفوان تھے۔ عکرمہ آپؓ کا جگری دوست اور صفوان آپ کا بہنوئی تھا۔ مگر اسلام سے تعلق اتنا مضبوط ہو چکا تھا کہ نہ تو خونی تعلق اور نہ ہی دوستی کے جذبات نے آپ کا راستہ روکا۔ قریشی لشکر کی طرف سے لڑائی کا آغاز ہوا تو خالدؓ نے بھی جوابی حملہ کیا اور تیز مگر مختصر جھڑپ کے بعد ان کو پسپا کر دیا۔ قریش کے بارہ افراد مارے گئے اور دو مسلمان شہید ہوئے۔ عکرمہ اور صفوان میدانِ جنگ سے جان بچا کر بھاگے۔

نبی کریم ﷺ کو جب اس کاروائی کا علم ہوا اور کفار کے مقتولین کا پتہ چلا تو آپ ﷺ ناراض ہوئے اور خالدؓ سے اس کا جواب طلب کیا۔ تاہم یہ جان کر کہ لڑائی کی ابتداء کفار کی طرف سے ہوئی تھی آپ ﷺ مطمئن ہو گئے۔

مکہ پر قبضہ مکمل ہونے اور خانہ کعبہ کو بتوں سے پاک کرنے کے بعد آپ ﷺ نے خالدؓ کو قریش کے مشہور بت عزیٰ کو مسمار کرنے کی غرض سے بھیجا۔ اس بت کی حفاظت کنانہ اور مضر جیسے جنگجو قبائل کے سپرد تھی۔ حضرت خالدؓ تمیں سواروں کے دستے کے ساتھ روانہ ہوئے اور بغیر کسی مزاحمت کے مقصد میں کامیابی حاصل کر کے لوٹے۔

تسخیرِ مکہ کے بعد نبی اکرم ﷺ نے مختلف علاقوں میں چھوٹے چھوٹے لشکر بھیجے تا کہ وہ نومسلموں میں تبلیغ کا کام انجام دے سکیں اور امن و امان کی صورتحال پر بھی نظر رکھ سکیں۔ حضرت خالدؓ کی قیادت میں بنی جذیمہ کی طرف ایک لشکر بھیجا گیا۔ اس سریہ میں تین سو مہاجر، انصار اور بنو سلیم کے لوگ شامل تھے۔ بنو جذیمہ کے لوگ اسلام قبول کر چکے تھے۔ مگر جب انہوں نے خالدؓ کو لشکر کے ساتھ آتے دیکھا تو فوراً ہتھیار باندھ لئے (وہ سمجھے کہ خالدؓ ان سے اپنے چچا کا انتقام لینے آئے ہیں جنہیں جاہلیت کے زمانے میں بنی جذیمہ نے مار ڈالا تھا)۔ خالدؓ نے انہیں مسلح دیکھا تو حیران ہو کر پوچھا کہ جب آپ لوگ مسلمان ہیں اور میں رسول اللہ ﷺ کی طرف سے بھیجا گیا ہوں تو ان ہتھیاروں کا کیا مقصد؟ بنو جذیمہ کے لوگوں نے واضح طور پر اسلام کا اعلان کرنے کے بجائے ''صبانا، صبانا'' کہنا شروع کر دیا۔ صبانا (صابی مذہب بدلنے والے) کا لفظ طنزاً قریشِ مکہ مسلمانوں کے لئے استعمال کرتے تھے۔ خالدؓ ان کے پراسرار انداز سے غلط اندازہ قائم کر بیٹھے اور ان کو گرفتار کر کے قتل کرنے کا حکم دیا۔ مہاجرین اور انصار تو اس پر فوری طور پر تیار نہ تھے لیکن بنو سلیم نے اپنے اسیروں کو فوراً قتل کر دیا۔ یہ خبر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جب حضور ﷺ تک پہنچی تو آپ ﷺ کو بہت افسوس ہوا۔ آپ ﷺ نے خالدؓ کے اس فعل سے اپنی برأت ظاہر کی۔ اس کے بعد حضرت علیؓ کو ایک بھاری رقم دے کر بنو جذیمہ کی طرف بھیجا گیا تا کہ وہ قصاص بھی ادا کریں اور ان لوگوں کی دلجوئی بھی کر سکیں، یہاں تک کہ وہ مطمئن ہو جائیں۔ بعد میں رسول اللہ ﷺ نے خالدؓ کو طلب کر کے معاملہ دریافت کیا تو آپ نے صورتحال سے آگاہ کیا اور بتایا کہ آپ واقعتاً یہ سمجھ رہے تھے کہ یہ لوگ مسلمانوں کو دھوکا دے رہے ہیں۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے جو اس وقت موجود تھے خالدؓ کو تنبیہ کی اور کہا کہ ''تم نے عہدِ اسلام میں ایک جاہلانہ حرکت کی ہے۔'' اس پر خالدؓ نے بھی ان کو سخت جواب دیا۔ اس سے قبل کہ بات بڑھتی نبی اکرم ﷺ نے خالدؓ کو یہ کہہ کر چپ کرا دیا ''خالد! میرے صحابہ کو رہنے دو۔ اگر تمہارے پاس سونے کا پہاڑ ہوتا اور تم اسے اللہ کی راہ میں خرچ کرتے تب بھی میرے صحابہ کے رتبے کو نہیں پہنچ سکتے تھے۔'' خالدؓ نے نبی اکرم ﷺ کی اس بات کو پلے سے باندھ لیا اور آئندہ آپ کے عمل میں اس کا اظہار متعدد بار ہوا، جس کا بیان آگے آئے گا۔

غزوہ حنین میں مسلمانوں کی تعداد بہت زیادہ تھی اور وہ کثرتِ تعداد کی وجہ سے زیادہ ہی پرامید تھے۔ حضرت خالدؓ کو سات سو سواروں کا کمانڈر مقرر کیا گیا۔ مالک بن عوف جو دشمن سپاہ کا سالارِ اعلیٰ تھا اس نے مسلمانوں کے خلاف جنگ کی انتہائی عمدہ حکمت عملی ترتیب دی۔ اس نے پہلے اپنی افواج کو اوطاس کے مقام پر تعینات کیا۔ جب مسلمان اس خبر سے آگاہ ہوگئے تو وہاں سے ہٹا کر حنین کی تنگ وادی میں چھپا دیا۔ اگلے مورچوں میں تیر اندازوں کو بٹھا دیا اور پچھلے مورچوں میں امدادی دستے تعینات کر دیئے۔ مسلمان اس غلط فہمی میں مبتلا رہے کہ دشمن اوطاس کے مقام پر ہے۔ دشمن پر بے خبری میں ٹوٹ پڑنے کے خیال نے خالدؓ کو آمادہ کیا کہ آپ سب سے پہلے تیز رفتاری سے سفر کرتے ہوئے دشمن کو جالیں۔ گھات میں بیٹھے دشمنوں کی زد میں سب سے پہلے خالدؓ آئے۔ سینکڑوں تیروں نے آپ اور آپ کی سپاہ کا استقبال کیا۔ اس اچانک حملے نے کھلبلی مچا دی۔ خالدؓ نے اپنے سپاہیوں کو بار بار پکار کر کہا کہ وہ جم کر مقابلہ کریں۔ لیکن شور اور ہنگامے میں آپ کی آواز دب کر رہ گئی۔ خالدؓ خود زخمی ہو کر اپنے گھوڑے سے گر پڑے اور زخموں کی وجہ سے بے حس و حرکت پڑے رہے۔

نبی اکرم ﷺ نے بھاگتے ہوئے مسلمانوں کو پکارا، لیکن شور میں آپ ﷺ کی آواز بھی دب گئی اور صرف نو صحابہؓ رسول اللہؐ کے ساتھ رہ گئے۔ حضور ﷺ نے عباسؓ کو حکم دیا کہ وہ مسلمان دستوں کو پکار کر جمع کریں۔ عباسؓ کی آواز بہت بلند تھی۔ ان کے آواز دینے پر مسلمان لوٹنا شروع ہوگئے۔ اتنے میں دشمن نبی اکرم ﷺ کے قریب آ چکے تھے مگر مالک بن عوف کی سپاہ اپنے عمدہ منصوبے کے باوجود سپاہیانہ جرأت کا مظاہرہ نہ کر سکیں اور دست بدست جنگ میں مسلمانوں نے انہیں پیچھے دھکیل دیا۔ اس کے ساتھ ہی گھمسان کی جنگ ہوئی۔ حضور ﷺ نے اس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

موقع پر کہا "أنا النبي لا كذب أنا ابن عبد المطّلب"، یعنی " میں نبی ہوں، جھوٹا نہیں ہوں، میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں۔" یہ کہہ کر اونٹنی سے اتر پڑے اور ایک مٹھی ریت دشمنوں کی طرف پھینکی۔ مخالف افواج کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔ خالدؓ ابتداء ہی میں زخمی ہونے والوں میں شامل تھے۔ نبی اکرم ﷺ خود آپ کے پاس آئے اور زخموں پر پھونکا، جس کی برکت سے خالدؓ شفایاب ہو گئے۔

یہ پہلا موقع تھا کہ حضرت خالدؓ اچانک حملے کی زد میں آ گئے۔ لہٰذا آپ نے آئندہ بے خبری کی حالت میں حملے کا شکار نہ ہونے کا ایسا سبق لیا کہ آپ کی جنگی تاریخ میں پھر اس کی مثال نہیں ملتی۔

۹ ہجری میں مسلمانوں کو یہ پریشان کن اطلاعات ملیں کہ ہرقل رومی فوجوں کے ساتھ حملہ کرنے آ رہا ہے۔ نبی اکرم ﷺ تیس ہزار افواج کے ساتھ مقام تبوک پر جا ٹھہرے۔ لشکر کے مقدمے پر حضرت خالدؓ کو مقرر کیا گیا۔ لیکن جلد ہی خبر ملی کہ رومی افواج واپس ہو گئی ہیں۔ اس عرصے میں خالدؓ نبی اکرم ﷺ کے حکم پر دیگر چھوٹی مہمات کامیابی سے نمٹاتے رہے۔

۱۰ ہجری میں آنحضرت ﷺ نے حضرت خالدؓ کی سرکردگی میں نجران میں بنو حارثہ کے پاس فوجی مہم بھیجی۔ حضرت خالدؓ کو خاص ہدایت تھی کہ لوگوں کو پہلے اسلام کی تبلیغ کی جائے۔ اگر وہ رضامند ہو جائیں تو ان سے ہرگز جنگ نہ کی جائے۔ خالدؓ ۴۰۰ سواروں کے ہمراہ نجران پہنچے اور دعوتی مہم کا آغاز کیا۔ ان لوگوں نے بغیر تردّد کے اسلام قبول کر لیا اور کوئی خونریزی نہ ہوئی۔ یہ نبی اکرم ﷺ کی زندگی میں خالدؓ کی آخری مہم تھی۔

خالدؓ مرتدین سے نبرد آزما

نبی اکرم ﷺ کی وفات کے ساتھ ہی پورا عرب ارتداد اور جھوٹے نبیوں کے دعوؤں کی وجہ سے شورش زدہ ہو گیا۔ مکہ، مدینہ اور طائف کے قبیلہ ثقیف کے سوا عرب کے بیشتر قبائل نے مدینے کے سیاسی و مذہبی اقتدار کے خلاف بغاوت کر دی اور وفاداری کے معاہدے توڑ دیئے۔ جھوٹے مدعیانِ نبوت اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کا ساتھ دینے کے لئے بہت سے قبائلی سردار بھی آمادہ ہو گئے جن کی اکثریت نے سیاسی وجوہ کی بناء پر اسلام قبول کیا تھا۔ اب حضور ﷺ کے وصال کے بعد ان قبیلوں نے اطاعت کا طوق اتار کر سرکشی اختیار کر لی تھی۔ انحراف کے ان شعلوں کو دو جھوٹے نبیوں طلیحہ بن خویلد اور مسیلمہ بن حبیب اور ایک جھوٹی نبیہ سجاح بنت حارث نے ہوا دی تھی۔

سیدنا ابوبکرؓ کو خلافت سنبھالتے ہی بہت سے محاذوں پر لڑنا اور مخالفین سے نمٹنا تھا۔ بزاخہ میں طلیحہ سے،

www.KitaboSunnat.com

بطاح میں مالک بن نویرہ سے، یمامہ میں مسیلمہ کذاب سے، اس کے علاوہ عرب کے مشرقی اور جنوبی ساحلوں پر، بحرین، عمان، مہرہ، حضرموت اور یمن میں پھیلتے ہوئے ارتداد سے نمٹنا تھا۔ مکہ کے جنوبی اور شمالی علاقے بھی اسی وباء کی لپیٹ میں تھے۔ غرض مکہ اور مدینہ کی حالت اس طرح بیان کی جاسکتی ہے جیسے کفر کے سمندر میں ایک جزیرۂ ایمان۔ ان ہوش ربا حالات میں حضرت ابوبکرؓ نے بھرپور جرأت اور بہادری کا مظاہرہ کیا۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں ''رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوئی اور میرے باپ پر ایسے حوادث و مصائب ٹوٹ پڑے کہ اگر بڑے بڑے مضبوط پہاڑوں پر بھی نازل ہوتے تو ان کو ریزہ ریزہ کر دیتے۔'' تعداد کے حساب سے مسلمانوں پر مرتدین کو نمایاں برتری حاصل تھی۔ ابوبکرؓ نے اپنی حکمت عملی اس طرح بنائی کہ اسلامی لشکر کو گیارہ حصوں میں تقسیم کیا اور سب سے کاری ضرب لگانے کے لئے حضرت خالدؓ کے لشکر کو چنا۔ آپ کو باغی افواج کے خطرناک ترین حصے پر حملہ کرنا تھا۔ باقی سب لشکروں کی پیش قدمی اس سے مشروط تھی۔

مدینے کے قریب مرتدین کے اجتماع کو پہلی شکست خود خلیفۂ رسول ابوبکرؓ نے دی۔ پھر جھوٹے نبی طلیحہ سے نمٹنے کے لئے حضرت خالدؓ نے بزاخہ کی طرف کوچ کیا اور راستے میں دیگر قبائل کو اسلام کی طرف راغب کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ طلیحہ کو آسانی سے زیر کرتے ہوئے آپؓ سلمٰی بنت مالک کی طرف بڑھے جو قائدین ارتداد کے ساتھ اسلام مخالف سرگرمیوں میں پیش پیش تھی اور اس کے گرد شکست خوردہ قبائل بھی جمع ہو گئے تھے۔ ظفر کے مقام پر مقابلے میں وہ ماری گئی اور خالدؓ مرتدین کی سرکوبی کرتے ہوئے جھوٹی نبیہ سجاح کی طرف بڑھے جو مالک بن نویرہ کے ساتھ مل کر شورش برپا کر رہی تھی۔ لیکن اس دوران اس نے مسیلمہ کذاب سے شادی کر لی اور اس کی جمعیت خود بخود منتشر ہوگئی۔ مالک نے کسی قسم کی مزاحمت نہ کی۔ وہ قتل ہوا۔ اب خالدؓ اپنے آخری دشمن مسیلمہ کی طرف بڑھے جو چالیس ہزار کی فوج کے ساتھ خالدؓ سے یمامہ کے مقام پر آمادۂ جنگ ہوا۔

یہ وہ معرکہ تھا جس میں اسلام کی زندگی اور موت کا فیصلہ ہونا تھا۔ نامور صحابہ کرامؓ مہاجرین و انصار، حفاظ اور قراء خالدؓ بن ولید کی قیادت میں موجود تھے۔ باغیوں کو تعداد میں ایک کی نسبت تین کی برتری حاصل تھی۔ بنو حنیفہ کے جھنڈے تلے وہ تعصب کی آگ میں بھڑک رہے تھے۔ حجاز کی بالادستی قبول کرنا ان کی سیاسی موت تھی۔ مسیلمہ کی نبوت کے وہ قائل تھے یا نہ تھے، البتہ حجاز کے نبی کے مقابلے میں اپنے قبیلے کے نبی کی بڑائی چاہتے تھے۔

جنگ شروع ہوئی تو گھمسان کا رن پڑا۔ مسلمانوں کو ایسی ہولناک جنگ لڑنے کا پہلا اتفاق تھا۔ ابتداء میں مسلمانوں کے اندر پسپائی کا رنگ نظر آیا۔ مسیلمہ کی فوج کے سپاہی حضرت خالدؓ کے خیمے تک جا پہنچے۔ یہ حالات دیکھ کر مسلمان سردار بے چین ہو گئے اور سپاہیوں کو جنگ میں ہمت دکھانے پر آمادہ کرنے لگے۔ ثابت بن قیس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نے کہا: ''اے اللہ ان مسلمانوں نے جو پسپائی دکھائی ہے میں اس سے بری ہوں۔'' ابو حذیفہؓ نے للکار کر کہا ''اے اہلِ قرآن! تم اپنے افعال سے قرآن کو زینت دو۔''

اب حضرت خالدؓ نے میدان کا جائزہ لیا اور پلٹ کر اس زور سے حملہ کیا کہ دشمن پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی آپؓ نے حکم دیا کہ ہر دستہ الگ الگ ہو جائے اور بجائے مل کر لڑنے کے مسلمان قبائل اپنے اپنے لشکر کے ساتھ دشمن پر حملہ کریں۔ اس کے پیچھے یہ حکمت کارفرما تھی کہ کچھ مسلمان دورانِ جنگ اس بحث میں الجھ گئے تھے کہ کونسا قبیلہ زیادہ شجاع ہے۔ اس موقع پر اس طرح کی باتیں فتنے کا موجب ہو سکتی تھیں، جسے حضرت خالدؓ نے محسوس کرتے ہی اس کا حل نکال لیا۔ لوگوں کو جلد ہی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور وہ دشمن پر جھپٹے، مگر صورتحال یہ تھی کہ دشمن کی فوج کا ایک ایک سپاہی جی جان سے لڑ رہا تھا۔

حضرت خالدؓ نے محسوس کیا کہ جب تک مسیلمہ کے دستۂ خاص کو شکست نہیں دی جائے گی دشمن کی جمعیت منتشر نہ ہوگی۔ چنانچہ زوردار حملہ کیا گیا۔ مسیلمہ کا چوٹی کا سردار رجال مارا گیا اور اس کی فوج میں ابتری پھیل گئی۔ مسیلمہ بھاگنے لگا تو اس کے جاں نثاروں نے پوچھا۔ ''تو نے جس فتح کا وعدہ کیا تھا وہ کہاں ہے؟'' کہنے لگا ''اپنے حسب ونسب کی خاطر مدافعت کرو۔'' جبکہ اس سے قبل وہ خیمے میں بیٹھا یہ ظاہر کر رہا تھا گویا وہ وحی الٰہی کا منتظر ہے۔ اس کی فوج بھی اس کے پیچھے شکست کھا کر بھاگی اور پلٹ کر اس باغ میں پناہ لی جو دراصل مسیلمہ کا قلعہ تھا۔ باغ کا نام حدیقۃ الرحمٰن تھا۔ یہ دراصل مسیلمہ کی طرف منسوب تھا جو اپنے آپ کو رحمٰن الیمامۃ کہتا تھا۔

اسلامی لشکر نے اس باغ کا محاصرہ کر لیا۔ اندر جانے کی کوئی صورت نہ تھی۔ اس لئے حضرت براء بن مالک نے مسلمانوں سے درخواست کی کہ وہ ان کو اٹھا کر باغ کے اندر پھینک دیں۔ بظاہر یہ خودکشی نظر آتی تھی اور مسلمان اس کے لئے تیار نہ تھے۔ لیکن ان کے اصرار پر مسلمانوں نے ان کو دیوار سے اندر اچھال دیا۔ براءتنِ تنہا تلوار چلاتے اپنا راستہ بناتے رہے۔ یہاں تک کہ دروازہ کھول دیا۔ اس کے ساتھ ہی مسلمان باغ کے اندر گھس آئے اور خونریز معرکہ برپا ہوا۔ مسیلمہ حضرت وحشیؓ کے ہاتھوں قتل ہوا۔ اس کی افواج کے لئے اب مقابلہ ممکن نہ تھا۔ چنانچہ جنگ اپنے اختتام کو پہنچی۔

دشمن بیس ہزار لاشیں چھوڑ کر بھاگا اور مسلمانوں کا جانی نقصان بھی بہت زیادہ ہوا۔ بارہ سو مسلمان جن میں سے تین سو حافظِ قرآن تھے، شہید ہو گئے۔ زیدؓ بن خطاب، ابو حذیفہؓ اور سالم مولیٰ حذیفہؓ جیسے اکابر صحابہ ان میں شامل تھے۔ یہ جنگ ایسی خونریز تھی کہ جس باغ میں یہ منطقی انجام کو پہنچی اس کا نام حدیقۃ الموت پڑ گیا۔

اس طرح بالآخر حضرت خالدؓ اللہ کی مدد سے سرزمینِ عرب کو ارتداد اور جھوٹے نبیوں کی شورشوں سے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

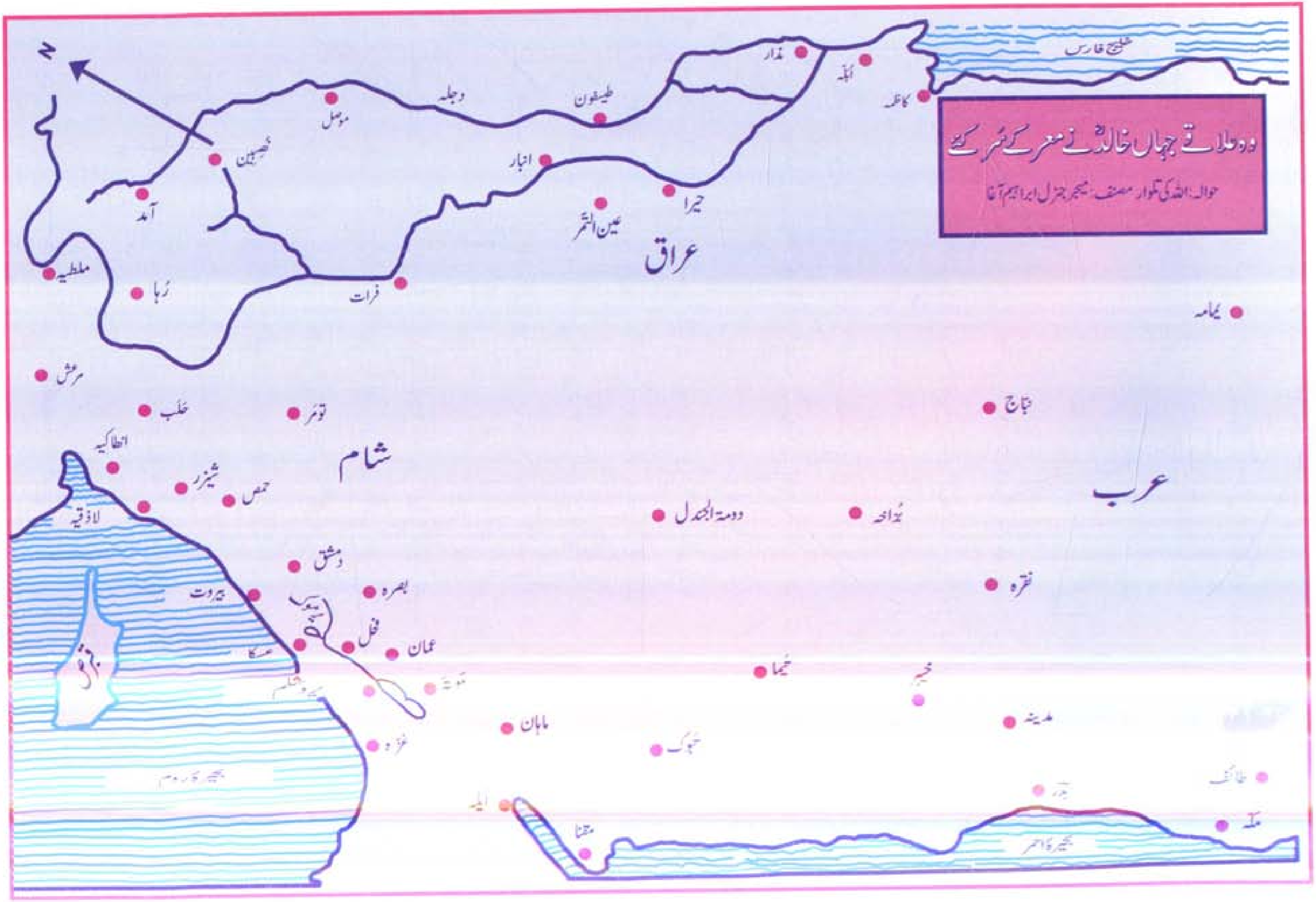

وہ علاقے جہاں خالدؓ نے معرکے سر کیے

حوالہ: اللہ کی تلوار مصنف۔ میجر جنرل ابراہیم آغا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پاک نے میں کامیاب ہو گئے۔ خالدؓ نے اس تمام عرصے میں خود کو بہترین سپہ سالار کے طور پر منوالیا۔ پورا عرب آپ کی قائدانہ صلاحیتوں اور حربی فنون میں کمال کا قائل ہو چکا تھا اور آپ مسلمانوں کے ہیرو بن کر ابھر چکے تھے۔

حضرت خالدؓ فتحِ عراق

تدادئی مہم سے فارغ ہونے کے بعد حضرت خالدؓ کو حضرت ابوبکرؓ کی طرف سے حکم ملا کہ وہ عراق کوچ کریں۔ عراق اس زمانے میں ایک ملک نہ تھا بلکہ سلطنتِ ایران کا حصہ تھا (جو اپنے وقت کی سپر پاور تھی) اور اپنی خوشحالی کی وجہ سے مشہور تھا۔ ایران کے شاہی خاندان کے انتشار اور سیاسی حالت کے ابتر ہونے کی وجہ سے سرحدی قبیلے بنو بکر کے سردار مثنیٰ بن حارثہ نے ابوبکرؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر جہاد کرنے کی اجازت مانگی۔ حضرت ابوبکرؓ نے انہیں اجازت دے دی اور خالدؓ کو اپنی فوج کے ساتھ عراق کا محاذ سنبھالنے کی ہدایت کی اور آپ کو اس پورے آپریشن کا کمانڈر انچیف مقرر کیا۔

حضرت خالدؓ اپنی اٹھارہ ہزار فوج کے ساتھ عراق پہنچے تو سب سے پہلے سرحدی علاقے کے فارسی حاکم ہرمز سے کاظمہ کے مقام پر ٹکراؤ ہوا۔ ابتداء ہی میں خالدؓ نے ہرمز کو (جو شہنشاہ کے بعد سب سے بلند مرتبہ اور لاکھ درہم کی ٹوپی والا آدمی تھا) دو بدو لڑائی میں قتل کر دیا۔ اس موقع پر خالدؓ پر بے خبری میں سازش کے تحت حملہ بھی ہوا۔ تعقاعؓ نے بروقت اقدام کر کے صورتحال سنبھال لی۔ فارسی افواج جو بھاری سامانِ حرب سے لیس تھیں میدان چھوڑ کر بھاگ گئیں۔

شہنشاہ فارس کو حضرت خالدؓ کے حملے کی خبر ملی تو اس نے قارن بن قریانس کی قیادت میں لشکر ہرمز کی مدد کے لئے بھیجا۔ مگر خالدؓ اس سے قبل ہی اس کو شرمناک شکست سے دوچار کر چکے تھے۔ دریائے معقل کے قریب قارن اپنے دو چوٹی کے سالاروں سمیت مارا گیا اور اس کا لشکر بدحواسی میں غرق ہو گیا۔

اس ہزیمت کے بعد شہنشاہ فارس اردشیر بھنا گیا۔ اس نے اپنے دو بہترین آدمیوں اندرزغر اور بہمن جادویہ کو الگ الگ مقامات سے عظیم الشان لشکر دے کر خالدؓ سے مقابلے کے لئے بھیجا۔ خالدؓ نے دونوں لشکروں کے اتصال سے پہلے ہی اندرزغر کو ولجہ میں جالیا۔ حضرت خالدؓ کی سپاہ کے آگے وہ بھی نہ ٹک سکا اور بدترین شکست سے دوچار ہوا۔

اب مقامِ الیس پر مشہور جرنیل بہمن جادویہ عظیم لشکر کے ساتھ حضرت خالدؓ کا مقابل ہوا۔ شدید معرکے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے بعد وہ نوّے ہزار لاشیں چھوڑ کر بھاگا۔ اس مقام پر دشمن نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ خود خالد نے ایک بار ''موتہ کے مقام پر میرے ہاتھ سے نو تلواریں ٹوٹی تھیں۔ لیکن مجھے فارسیوں جیسا کوئی اور دشمن نہیں ملا فارسیوں میں بھی لشکرِ الیس جیسے دشمن سے میرا کبھی پالا نہ پڑا۔'' مسلمانوں کی اگلی منزل حیرا تھی جو بغیر لڑے کے قبضے میں آ گئی۔ اس کے بعد خالدؓ بن ولید فتح کے جھنڈے گاڑتے ہوئے انبار، عین التمر، دومۃ الجندل اور کو تسخیر کر کے آخری منزل فراض پہنچے۔ وہاں معمولی مزاحمت کے بعد آپ فارسی سپاہ کو عراق میں بدترین شکست دینے میں کامیاب ہو گئے۔

حضرت خالدؓ نے ایک سال سے بھی کم مدت میں عراق کے وسیع علاقے پر قبضہ کر لیا تھا اور آپ نے وقت کی سپر پاور کو زبردست مات دے دی تھی۔ اس کامیابی میں آپ کی ذہانت، تیز رفتاری اور جنگی چالوں کے علاوہ سب سے بڑھ کر اللہ کی مدد کا ہاتھ تھا۔ لہٰذا شکر گزاری کے لئے سقوطِ فراض کے فوراً بعد خالدؓ حج کی سعادت سے سرفراز ہوئے۔

فتحِ شام

ابھی حضرت خالدؓ عراق کی مہم سے فارغ ہو کر پلٹے بھی نہ تھے کہ خلیفہ کی طرف سے حکم ملا کہ آدھے لشکر کو عراق میں چھوڑ کر باقی ماندہ افواج کے ساتھ شام پہنچیں۔ شام میں مسلمان رومیوں کے ساتھ نبرد آزما تھے۔ ہرقل والیٔ روم نے اتنی عظیم فوج جمع کی تھی کہ مسلمانوں نے کمک کے لئے حضرت ابوبکرؓ کو خط لکھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے خالدؓ کو تمام افواج کا سالارِ اعظم مقرر کیا اور انہیں شام کی طرف فوری کوچ کا حکم دیا۔ خالدؓ نے شام کا رخ کیا اور راستے میں قبائل کو زیر کرتے اور بستیوں کو تسخیر کرتے ہوئے مسلمان لشکر سے مل گئے۔ اجنادین کے مقام پر رومی سپاہ کا مسلمانوں سے ٹکراؤ ہوا۔ نوّے ہزار رومی فوجیوں میں سے پچاس ہزار قتل ہوئے۔ ان کا سالار بھی اور چوٹی کے سردار مارے گئے۔ مسلمانوں میں سے ضرارؓ بن ازور نے بہادری کے وہ جوہر دکھائے کہ رومیوں کے لئے دہشت کی علامت بن گئے۔ یہ معرکہ سر کرنے کے بعد خالدؓ دمشق کی جانب بڑھے اور شہر کا محاصرہ کر لیا۔ ہرقل نے گھبرا کر مزید فوج بھیجی جس سے نمٹنے کے لئے ضرارؓ اور ان کے چند ساتھیوں کا انتخاب کیا گیا لیکن وہ رومیوں کے ہاتھوں گرفتار ہوئے۔ حضرت خالدؓ دمشق کی سالاری پر ابوعبیدہؓ کو چھوڑ کر ضرارؓ کو چھڑانے گئے اور رومیوں کو شکست دینے کے بعد انہیں چھڑانے میں کامیاب ہو گئے۔ دمشق لوٹنے کے بعد چند روز معمولی جھڑپیں ہوئیں لیکن کوئی بھی فیصلہ کن نہ تھی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

...ضرت خالدؓ کے ایک طرف جبکہ ابو عبیدہؓ شہر کے دوسری جانب اپنی افواج کے ساتھ موجود تھے۔ ایک روز ... یونانی لڑکا ... لدؓ کے پاس پہنچا اور درخواست کی کہ اگر اس کی محبوبہ کو جو اب اس کی دلہن بن چکی ہے، اس کو د... نے کا وعدہ کر... ں تو وہ ایک ایسی بات بتا سکتا ہے جس سے مسلمانوں کے لئے دمشق حاصل کرنا آسان ہو جا... گا۔ ...دراصل ...س یونانی لڑکے کے سسرال والے اس کی بیوی اس کے پاس بھیجنے کے لئے تیار نہ تھے۔ خالدؓ ... نے آمادگی ظاہر ...ی تو اس نے بتایا کہ آنے والی رات اہلِ دمشق کے لئے جشن کی رات ہے۔ اس میں وہ رنگ ... ...ں میں مدہو... ہوتے ہیں اور شہر کے دروازوں پر پہرے دار بھی کم ہوشیار ہوتے ہیں۔ اس وقت خالدؓ اور آ...پ کے چند ساتھی کمند کے ذریعے قلعے کی فصیل پھاند کر فوج کے لئے دروازہ کھول سکتے ہیں۔ خالدؓ نے تین ساتھی... کے ساتھ مل ...فصیل کو پھاند لیا اور شہر کا دروازہ مسلمان سپاہ کے لئے کھول دیا۔ یہ کارروائی چونکہ انتہائی سرعت ... سے کی ... ئی لہٰذ... ...صرف خالدؓ اور آپ کے لشکر نے اس میں حصہ لیا اور ابو عبیدہؓ کو اس کی خبر نہ ہو سکی۔ جب مسلما... ...ں نے پور... ...شہر پر قبضہ کر لیا تو رومیوں کے سردار نے اندازہ لگا لیا کہ شاید ابو عبیدہؓ کا لشکر ابھی تک بے خبر ہے۔ ... اس نے انتہ...ئی ہوشیاری سے ابو عبیدہؓ سے صلح کی شرائط طے کر لیں۔ خالدؓ کو جب معلوم ہوا کہ جو شہر آپ ... نے فوج کے ذر...یعے تسخیر کیا ہے، اس کے مالِ غنیمت سے ہاتھ دھونا پڑے گا تو آپ کو اس کا ملال ہوا، لیکن اسلامی ...خلاقیات ک... ...ت معاہدے کی پاسداری کی گئی اور آپؓ نے رومیوں کو جانے دیا۔

معزو...لی

...دی ۱۱ آخر ۱۳ ...جری میں سیدنا ابو بکر صدیقؓ نے وفات پائی اور اپنی وفات سے قبل حضرت عمرؓ کو خلیفہ نامزد ... نے۔ عمرؓ نے ...پنے پہلے ہی خطبے میں خالدؓ کو معزول کر کے حضرت ابو عبیدہؓ کو سالار نامزد کرنے کا حکم جاری ...۔ یہ وہ وقت تھا جب دمشق میں حالات اپنے منطقی انجام کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ایسے میں قیادت کی تبدیلی ...سلمانوں کے ...ن پر برا اثر مرتب کر سکتی تھی جو اپنے سپہ سالار کے بہت گرویدہ تھے۔ نامہ بر بہت ذہین آدمی ...۔ اس نے صو...رتحال بھانپ کر کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دی اور خط ابو عبیدہؓ کے حوالے کر دیا۔ ابو عبیدہؓ نے خ... ...ے مندرجات سے خالدؓ کو اس وقت تک لاعلم رکھا جب تک دمشق فتح نہ ہو گیا۔ فتحِ دمشق کے بعد ابو عبیدہؓ نے خا... ...و الگ بلا کر ...لیفہ کے اس فیصلے سے آگاہ کیا تو خالدؓ نے اس فیصلے کو قبول کیا اور ابو عبیدہؓ کی فوج میں ایک عا... ...پاہی کی حیثیت سے خدمت انجام دینے پر راضی ہو گئے۔

...عبیدہؓ نے خا... کو جیشِ عراق کا سالار مقرر کیا۔ وہ کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے آپ کو ضرور شریک

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مشورہ رکھتے۔ ان کو خالدؓ کی جنگی بصیرت پر اتنا اعتماد تھا کہ جنگِ یرموک جیسی اہم ترین جنگ خالدؓ کی حکمتِ عملی کے تحت لڑی گئی۔

حضرت ابوعبیدہؓ کی سالاری میں مہمات سر کرتے حضرت خالدؓ نے مرعش کو بھی بغیر لڑائی کے حاصل کیا۔ ڈھیروں مالِ غنیمت ہاتھ لگا۔ وہاں سے واپسی پر اشعث نے (جو ایک مانا ہوا شاعر تھا) خالدؓ کی شان میں قصیدہ پڑھا۔ آپ نے اسے دس ہزار درہم تحفتاً دیئے۔ حضرت عمرؓ کو اس کی خبر ہوگئی۔ ابوعبیدہؓ کو خط لکھا کہ خالد کو برسرِ جماعت لاؤ، اس کی دستار سے اس کے ہاتھ باندھو اور اس کے سر سے ٹوپی اتارو، اس سے پوچھو کہ اس نے اشعث کو پیسے کہاں سے دیئے؟ اگر اقرار کرے کہ مالِ غنیمت سے دیا ہے تو اس نے خیانت کی ہے اور اگر دعویٰ کرے کہ اپنی جیب سے دیئے ہیں تو یہ اسراف ہے۔ دونوں صورتوں میں اسے معزول کر دو اور اس کے فرائض سنبھال لو۔''

خلیفہ کے حکم کے مطابق حضرت بلالؓ نے ابوعبیدہؓ کی موجودگی میں مجمع کے سامنے خالدؓ سے پوچھا۔ خالدؓ نے اپنی جیب سے پیسے دینے کا اعتراف کیا تو بلالؓ نے آپ کی دستار سے بندھے ہوئے ہاتھ کھول دیئے اور ٹوپی آپ کے سر پر رکھ کر کہا ''ہم اپنے حکمرانوں کی بات سنتے اور مانتے ہیں۔''

حضرت خالدؓ نے اپنے متحرک رسالے اور اپنی وفادار اور بہادر افواج کو الوداع کہا اور مدینہ روانہ ہوگئے۔ مدینہ پہنچے تو عمرؓ آپ کو راستے میں مل گئے۔ انہوں نے خالدؓ کی جائیداد کا پورا حساب لیا اور جو رقم زائد لگی وہ ضبط کر لی گئی۔

وفات

چند روز بعد حضرت خالدؓ مدینے سے قنسرین (شام) روانہ ہوگئے اور پھر کبھی عرب نہ آئے۔ اپنی معزولی کے بعد آپ کی مالی حالت بھی خاص اچھی نہ رہی۔ قدرت کی طرف سے مزید آزمائش بھی آپ کی منتظر تھی۔ ۱۸ ہجری میں طاعون کی وباء نے شام اور فلسطین کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس وباء میں خالدؓ کے قریب ترین دوست اور ساتھی ابوعبیدہؓ، شرجیلؓ، یزیدؓ، ضرارؓ، سب وفات پا گئے۔ اس کے علاوہ ایک روایت کے مطابق آپ کے چالیس فرزند بھی فوت ہوگئے۔

۵۸ سال کی عمر میں سنہ ۲۰ ہجری میں حضرت خالدؓ بیمار پڑے۔ آپ کی علالت طویل تھی جس نے آپ کے جسم کو کمزور کر دیا تھا۔ وفات سے کچھ دن پہلے آپ کا ایک دوست ملنے آیا تو آپ نے اسے اپنے جسم کے نشان

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جسم دکھا۔ پورے جسم میں ایک بالشت سے زیادہ جگہ ایسی نہ تھی جہاں زخم کا کوئی نشان موجود نہ ہو۔ پھر فرمانے لگے "میں نے سینکڑوں جنگوں میں شہادت کو تلاش کیا، پھر میں کیوں جنگ میں نہ مرسکا۔" آپؓ کو آخر دم تک اس بات کا بہت قلق رہا۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ اللہ کی تلوار کا کفار کے ہاتھوں نیام میں آنا خود اللہ کو منظور نہ تھا۔ آخر وقت میں بس ایک وفادار غلام کے سوا کوئی پاس نہ تھا۔ بوقتِ وفات آپ کی ملکیت میں سوائے چند ہتھیاروں، ایک گھوڑے اور ایک غلام کے کچھ نہ تھا۔

حضرت خالد کی موت کی خبر نے مدینے میں کہرام مچا دیا۔ بنو مخزوم کی عورتیں ماتم کرنے لگیں تو اور عورتیں بھی ان کے غم میں شریک ہو گئیں۔ عمرؓ نے مسلمانوں کے مرنے پر ماتم کرنے کی سخت ممانعت کی ہوئی تھی۔ جب انہوں نے یہ شور سنا تو باہر آئے تا کہ لوگوں کو منع کریں۔ پھر اپنی بیٹی حفصہؓ کے گھر سے گریے کی آواز سنی جو عظیم الشان سالار کے جانے پر افسوس کا اظہار کر رہی تھیں تو رک گئے اور کہنے لگے "بنو مخزوم کی عورتوں کو ابو سلیمان کا افسوس کرنے دو، اس لئے کہ وہ جھوٹ نہیں کہہ رہی ہیں۔ رونے والے ابو سلیمان جیسے شخص پر روتے ہیں۔"

حضرت عمرؓ اور حضرت خالدؓ کا معاملہ

خلیفہ راشد ابو بکرؓ نے آپ کی جنگی صلاحیتوں سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور ہمیشہ آپ کی قدر شناسی کی۔ آپؓ کو سالار کے طور پر چننا اور مرتدین کے مقابلے کے لئے بھیجنا آپ کے اوپر ابو بکرؓ کے اعتماد کا بھرپور اظہار تھا۔ ایک موقع پر جب عراقی محاذ سے فتح کی خوشخبری کے ساتھ ڈھیروں مال غنیمت بھی مدینہ پہنچا تو حضرت ابو بکرؓ نے مسلمانوں کو مسجد میں بلا بھیجا اور ان الفاظ میں خطاب کیا۔ "اے قریش! تمہارے شیر نے ایک اور شیر پر حملہ کیا اور اس پر غالب آیا۔ عورتیں خالدؓ جیسا بیٹا جننے سے اب عاجز ہیں۔"

جب روم کے محاذ پر مسلمانوں کا سامنا اپنے سے کئی گنا بڑی اور سامانِ حرب سے لیس افواج سے ہوا تو حضرت ابو بکرؓ کی نگاہ ایک بار حضرت خالدؓ پر ٹھہری۔ فرمایا "واللہ! میں خالدؓ بن ولید کے ذریعے رومیوں اور شیطان کے ساتھیوں کو نیست و نابود کر دوں گا۔" ایک اور موقع پر جب عمرؓ نے ابو بکرؓ کو با اصرار کہا کہ خالدؓ کو ان کے عہدے سے ہٹا دیں تو فرمایا "میں اس تلوار کو نیام میں نہیں ڈالوں گا جسے اللہ نے کفار کے خلاف بے نیام کیا ہے۔"

حضرت عمرؓ اور حضرت خالدؓ میں کس قسم کا معاملہ تھا۔ اس پر داستان طرازوں نے بہت کچھ کہا ہے۔ یہ بات تو واضح ہے کہ ان دونوں عظیم شخصیات کے درمیان اعتماد کا وہ رشتہ ہرگز نہ تھا جو کہ ابو بکرؓ اور خالدؓ کے درمیان تھا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لیکن اس کے باوجود عمرؓ خالدؓ کی شجاعت، بہادری اور جنگی مہارت کے ہمیشہ قائل رہے۔ اس طرح خالدؓ بھی یہ جان چکے تھے کہ خلیفہ کا یہ طرزِ عمل ذاتی وجہ سے نہیں بلکہ عمرؓ کا معیار خود اپنے متعلق اور تمام مسلمانوں کے لئے انتہائی بلند تھا اور اللہ کی حدود اور دین کے معاملے میں وہ اپنے سمیت کسی شخص کو بھی رعایت دینے کے لئے تیار نہیں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ خالدؓ کا جب انتقال ہوا تو آپ نے عمرؓ کو اپنا وارث قرار دے کر اپنا چھوڑا ہوا مال ان کے سپرد کر دیا۔ حضرت عمرؓ بھی آپ کی حیات میں اور وفات کے بعد بھی آپ کے لئے تعریفی کلمات ادا کرتے رہے۔

حاضر کی جنگ میں جب خالدؓ کی کامیابی کی اطلاع ملی تو فرمایا ''خالدؓ کو سپہ سالاری قدرت کی جانب سے ورثے میں ملی ہے۔ اللہ ابوبکرؓ پر اپنی رحمت نازل کرے، وہ مجھ سے بہتر آدم شناس تھے۔'' پھر وہ کیا وجوہات تھیں جن کی بناء پر خالدؓ کو معزول کیا گیا۔ ان میں سے ایک وجہ کا ذکر تو ہم اس سے قبل بھی کر چکے ہیں کہ عمرؓ دین کے معاملے میں سخت احتیاط پسندی کے قائل تھے۔ جبکہ ایک دو مواقع پر خالدؓ سے غلط فہمی میں مسلمانوں کے قتل جیسا واقعہ بھی رونما ہو چکا تھا۔ دوسری وجہ لکھتے ہوئے ہم طبری کی روایت بیان کرتے ہیں کہ جب خلیفہ کے حکم پر خالدؓ کو جواب طلبی کے لئے مدینہ بلایا گیا تو عمرؓ نے آپ کو دیکھتے ہی کہا ''تم نے وہ کام کیا ہے جو کوئی اور آدمی نہ کر سکا (یعنی محیر العقول جنگی فتوحات) مگر یہ کام انسان نہیں کرتے بلکہ اللہ کرتا ہے۔''

پھر اس کے بعد خلیفہ کی طرف سے ایک خط اپنے سالاروں کو بھیجا گیا۔ اس میں تحریر تھا کہ ''میں نے خالدؓ کو نہ اپنی ذاتی ناراضگی کی وجہ سے علیحدہ کیا ہے نہ ان کی کسی بے ایمانی کی وجہ سے، بلکہ صرف اس وجہ سے کہ لوگ بہت زیادہ ان کے مداح تھے اور گمراہ ہو رہے تھے۔ مجھے خوف تھا کہ لوگ ان پر تکیہ کرنے لگیں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ سمجھ لیں کہ اللہ ہی سب کچھ کرتا ہے۔ اور ملک میں کوئی فتنہ نہ ہونا چاہئے۔''

عمرؓ کو خالدؓ کی وفات کی اطلاع ملی تو غمگین ہو گئے اور فرمایا ''مسلمانوں کو ایسا نقصان پہنچا ہے جس کی تلافی ناممکن ہے۔ خالدؓ جیسا جرنیل، شاید ہی کوئی ان کی جگہ لے سکے، وہ دشمن کے لئے مصیبت تھے۔''

ایک بار عرب کے ایک شاعر نے آ کر خالدؓ بن ولید سے متعلق اپنے اشعار سنائے تو عمرؓ پکار اٹھے۔ ''تم خالدؓ کا حق ادا نہیں کر سکے۔'' یہ تھا وہ جرنیل جس کے چاہنے والے اور اسے برطرف کرنے والے اس کے یکساں مداح تھے۔ گبن نے اپنی کتاب Decline And Fall Of The Roman Empire میں حضرت خالدؓ کو ''عرب جنگجوؤں میں سب سے غضبناک اور کامیاب'' کے الفاظ سے یاد کیا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حضرت خالدؓ کی غیر معمولی حربی مہارت

حضرت خالدؓ کی فتوحات کا جائزہ لیا جائے تو بعض اوقات شدید حیرت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ گیارہ برس کے قلیل عرصے میں آپ نے چھوٹی جنگوں کے علاوہ ۴۱ بڑی جنگیں لڑیں اور ایک معرکے میں بھی نہیں ہارے۔ اس کے پیچھے جہاں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی مدد کارفرما تھی وہاں خالدؓ کی لاجواب جنگی چالوں اور ذاتی شجاعت کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ آپؓ نے جنگ کے پرانے اور فرسودہ طریقوں سے ہٹ کر نئے قاعدے، نئے اسلوب اور نئی تدابیر متعارف کروائیں۔ ذیل میں چند ایک کا مختصر تذکرہ ہے۔

نفسیاتی جنگ

حضرت خالدؓ نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ دشمن کو نفسیاتی طور پر الجھا کر جنگ سے پہلے ہی اس کا حوصلہ کمزور کر دیا جائے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جنگِ سلاسل کے موقع پر خالدؓ یمامہ سے مسیلمہ کذاب کا خاتمہ کر کے خلیفہ کا حکم پاتے ہی عراق کی جانب روانہ ہوئے۔ اصولی طور پر یمامہ سے ابلہ کے لئے کاظمہ سے پیش قدمی ہونا تھی۔ خالدؓ نے ہرمز اور اس کی فوج کو الجھانے کے لئے ایک دوسرا راستہ حفیر کی طرف سے اختیار کیا۔ ہرمز جب کاظمہ پہنچا تو خبر ملی کہ خالدؓ تو حفیر کی جانب بڑھ رہے ہیں۔ وہ اپنی بھاری بھرکم فوج کے ساتھ جب حفیر پہنچا تو معلوم ہوا کہ خالدؓ دوبارہ کاظمہ پہنچ چکے ہیں۔ مرتا کیا نہ کرتا اپنی افواج کے ساتھ دوبارہ کاظمہ پہنچا۔ نتیجتاً جنگ شروع ہونے سے پہلے ہی اس کی افواج اتنی تھک چکی تھیں کہ مسلمان حملہ آوروں کے آگے ٹک نہ سکیں اور شکست کھا کر بھاگ گئیں۔

حیرت کا عنصر

حیرت یا Surprise کو جنگی ہتھیار کے طور پر استعمال کرنا حضرت خالدؓ کا فن تھا۔ یہ تدبیر آج کل کی جدید جنگوں میں بھی اسی طرح کارآمد ہے جیسے پہلے تھی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جنگِ ولجہ کے موقع پر میدان میں فارسی اور مسلمان افواج کا پلہ برابر تھا۔ لیکن قلتِ سپاہ کی وجہ سے ایک ایک مسلمان کو بہت سارے دشمنوں سے نمٹنا پڑ رہا تھا اور ان میں تھکن کے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔ اس موقع پر یوں محسوس ہونے لگا کہ فارسی افواج کو غلبہ حاصل ہو جائے گا کہ اچانک فارسی پڑاؤ کے عقب میں پھیلی ہوئی پہاڑیوں سے چار ہزار تازہ دم سپاہ نے خالدؓ کا اشارہ ملتے ہی دشمن پر پیچھے سے حملہ کر دیا۔ فارسی افواج آگے اور پیچھے دونوں اطراف سے گھر گئیں اور بہت بری طرح

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شکست سے دوچار ہوئیں۔ یہ وہ سوار تھے جنہیں خالدؓ نے رات کی تاریکی میں دشمن کے پڑاؤ کے پیچھے چھپا رکھا تھا۔ ان کے اچانک حملے نے دشمن کو حیرت اور گھبراہٹ میں مبتلا کر دیا۔

''عین التمر'' کی جنگ سے فارغ ہونے کے بعد حضرت خالدؓ کو اطلاع ملی کہ دشمن مصیخ میں جمع ہو رہا ہے۔ دشمن کو بے خبری میں پکڑنے کے لئے آپ نے اپنی افواج کو تین حصوں میں بانٹ کر رات کی تاریکی میں ایک وقت تین اطراف سے حملہ کر دیا۔ فارسی افواج اس وقت بیدار ہوئیں جب مسلمان ان کے سروں پر پہنچ چکے تھے۔ آن کی آن میں ہزاروں سپاہی مارے گئے اور بقیہ فوج بھاگ نکلی۔

جنگی مشکلات کے حل میں جدّت پسندی

حضرت خالدؓ کی لغت میں ناممکن کا لفظ نہیں تھا۔ آپ ہر مسئلے کا حل اپنی مرضی کے مطابق نکال لیتے۔ انبار پر حملے کے موقع پر مسلمانوں نے جب شہر کا محاصرہ کیا تو پتہ چلا کہ شہر کے گرد صرف قلعے کی فصیل ہی نہیں بلکہ پانی سے لبریز ایک گہری خندق بھی ہے۔ یہ خندق فصیل کے اتنے قریب تھی کہ جو بھی اسے عبور کرتا وہ تیر اندازوں کا نشانہ بن جاتا۔ خالدؓ نے حملے کے لئے ایسی جگہ منتخب کی جہاں خندق کی چوڑائی کم تھی۔ پھر آپ نے ایسے مقام پر تیر اندازوں کو کھڑا کیا جہاں سے وہ دشمن کے تیر اندازوں کو جوابی مقابلے میں الجھا سکتے تھے۔ یہ سب کچھ کر چکنے کے بعد اپنے لشکر کے نحیف جانوروں اور کمزور اونٹوں کو ذبح کر کے خندق میں ڈال دیا۔ تھوڑی دیر میں ان جانوروں کے ڈھانچوں کا ڈھیر بلند ہوتے ہوتے پانی کے اوپر ابھر آیا۔ اس طرح خندق پر ایک ناہموار مگر مضبوط پل بن گیا جس سے گذر کر سپاہیوں کا ایک دستہ خندق کے پار اتر کر دشمن کے قلعے تک جا پہنچا۔ دشمن سراسیمہ ہو کر چند شرائط پر قلعہ خالی کر گیا۔

ایک محیر العقل واقعہ اس وقت پیش آیا جب عراق کی مہم سے فارغ ہونے کے بعد خالدؓ کو ابوبکرؓ کا حکم ملا کہ سرعت کے ساتھ شام پہنچ کر مسلمان سپاہ کو نازک حالت میں کمک پہنچائیں۔ خالدؓ کے سامنے میدانِ جنگ تک پہنچنے کے دو راستے تھے لیکن دونوں طویل تھے۔ دونوں پر رومی افواج سے مڈبھیڑ کا خدشہ بھی تھا۔

مشہور جنگجو رافع بن عمیرہ نے بتایا کہ وہ ایسا مختصر راستہ (Shortcut) جانتے ہیں جو صحرا سے گذر کر آتا ہے۔ لیکن فوج کے ساتھ یہ راستہ طے نہیں کیا جا سکتا کیونکہ دورانِ سفر پانچ دن تک پانی کی ایک بوند بھی میسر نہ ہوگی اور ہر وقت راستہ بھٹکنے کا خدشہ موجود رہے گا۔ جون کی سخت ترین گرمی میں اس راستے کو عبور کرنے کا عزم لئے خالدؓ چل پڑے اور ترکیب یہ کی کہ چالیس اونٹوں کو اچھی طرح پانی پلا کر ان کے منہ باندھ دیئے۔ راستے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں جہاں پانی کی ضرورت پیش آتی تو وہاں دس اونٹ ذبح کر کے ان سے پیٹ سے پانی نکال کر استعمال کیا جاتا۔ ایک روایت کے مطابق تیسرے دن کے اختتام پر پانی ختم ہوگیا۔ اس پر مستزاد یہ کہ رافع جو کہ واحد رہبر تھے ان کی آنکھوں کی بینائی تقریباً جاتی رہی۔ چند مخصوص نشانیوں کی بناء پر مسلمان اس جگہ پہنچنے میں کامیاب ہوگئے جس کے قریب پانی تھا اور یوں یہ مشکل ترین سفر تاریخ میں حیرت انگیز یادگار چھوڑ کر ختم ہوا۔

سریع الحرکت فوج

حضرت خالدؓ کی کامیابی کا ایک راز آپ کی پھرتی میں بھی پوشیدہ تھا۔ آپ اس تیزی سے اپنی فوج کو حرکت میں لاتے کہ دشمن کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوتا اور مسلمان سر پر پہنچ جاتے۔ تعداد اور ہتھیاروں میں کم ہونے کے باوجود مسلمانوں کو اپنے دشمنوں پر واضح برتری حاصل ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔ خالدؓ کی سیماب صفتی اور سریع الحرکتی نے دشمن افواج کو ایک جگہ جمع ہونے سے پہلے ایک ایک کر کے ٹھکانے لگا دیا۔

دمشق کی تسخیر مسلمانوں نے تلواروں کے ذریعے کی۔ بعد میں جب حضرت ابوعبیدہؓ نے بے خبری میں صلح کا معاہدہ کر لیا تو حضرت خالدؓ کو امان کے قاعدے کے تحت دشمن کی تمام شرائط ماننا پڑیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ وہ اپنا جتنا سامان لے جانا چاہیں لے جا سکتے ہیں۔ مسلمان تین دن تک انہیں کچھ نہ کہیں گے۔ خالدؓ نے تین دن تک عہد پورا کیا اور افواج کو متحرک نہ کیا۔ چوتھے دن آپؓ نے اپنی افواج کو اس سرعت سے روانہ کیا کہ انہوں نے دشمن کے قافلوں کو جا لیا اور مالِ غنیمت جو کہ مسلمانوں کا حق تھا لے کر دم لیا۔ ایسے میں ہرقل کی بیٹی بھی مسلمانوں کے ہاتھ لگی۔ لیکن جب ہرقل نے استدعا کی کہ اس کی بیٹی کو رہا کر دیا جائے تو خالدؓ نے شریف دشمن کی طرح اس کی بیٹی کی حفاظت واپسی کا بندوبست کر دیا۔

مرضی کے میدان کا انتخاب

جنگ میں دشمن کو اپنی مرضی کے میدان (Battle ground) میں لڑنے پر مجبور کر دینا فتح میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ عراق کی مہمات میں خالدؓ نے خاص طور سے اس بات کا اہتمام کیا کہ تمام جنگیں صحرا کے قریب رہ کر لڑی جائیں۔ اگر پیچھے ہٹنا پڑے تو صحرا کی سمت ان کے راستے کھلے رہیں۔ صحرا میں فارسی افواج داخل ہونے کا تصور بھی نہ کر سکتی تھیں۔ لہٰذا مسلمانوں نے اپنی مرضی سے صحرا اور آبادی کی سرحدوں پر جنگیں لڑیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دشمن کی کمزوریوں کا استعمال

حضرت خالدؓ کی ایک اور حکمت عملی یہ تھی کہ دشمن کے کمزور پہلوؤں اور اپنی ہر اس فوقیت کا جو آپ کو دشمن پر حاصل تھی بھرپور فائدہ اٹھاتے تھے۔ جب کسی جنگی چال سے کام نہ چلتا تو دشمن کے سالارِ اعلیٰ یا اہم سرداروں سے دو بدو لڑائی کر کے انہیں قتل کر ڈالتے۔ اس کے نفسیاتی اثر سے جو دشمن پر ہوتا آپ بھرپور فائدہ اٹھاتے۔

جنگِ ''مرج الصفرا'' کے موقع پر حضرت خالدؓ تھوڑی سی فوج کے ساتھ موجود تھے کہ دشمن نے صف آرائی شروع کر دی۔ مسلمانوں کی باقی فوج کی آمد میں کچھ دیر کی تاخیر تھی۔ خالدؓ نے اس موقع پر سپہ گری کی نمائش شروع کر دی۔ مسلمان اور رومی جنگجو سردار ایک دوسرے کے مقابل اپنی جرأت اور مہارت کا مظاہرہ کرتے رہے۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ رومی سورما بھی مارے گئے اور مسلمانوں کو جس کمک کا انتظار تھا وہ بھی آ پہنچی۔

معرکۂ یرموک میں حضرت خالدؓ نے اپنی عادت کے برخلاف مسلمانوں کو مدافعانہ لڑائی لڑنے کی تلقین کی اور جب رومی تھک گئے تو مسلمانوں نے جارحانہ لڑائی لڑ کر ان کو ایسی وادی میں دھکیل دیا جو مسلمان تیراندازوں سے پٹی پڑی تھی۔ اس طرح آگے اور پیچھے دونوں اطراف سے رومی پس گئے۔

حضرت خالدؓ اس طرح منصوبے ترتیب دیتے کہ مسلمانوں کا کم سے کم نقصان ہو اور دشمن ایسا سبق سیکھیں کہ آئندہ کے لئے ان کے حوصلے پست ہو جائیں۔ خالدؓ کی جنگی چالوں نے آپ کو کامیاب سالار بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ میجر جنرل ابراہیم آغا نے اپنی کتاب ''سیف اللہ'' میں حضرت خالدؓ پر یوں تبصرہ کیا ہے:

> ''حضرت خالدؓ تاریخ کے سب سے ہمہ دان قسم کے سپاہی تھے۔ ایک سچے فوق البشری سپاہی۔ ان کی حکمتِ حرب چنگیز خان اور نپولین جیسی تھی۔ ان کی تدبیرِ حرب تیمور لنگ اور فریڈرک اعظم جیسی تھی۔ ان کی ذاتی طاقت اور سپاہ گری فارس کے مثالی پہلوان رستم جیسی تھی۔ ہم کو کوئی ایسی دوسری شخصیت نہیں ملتی جس میں اتنی مختلف قوتیں بیک وقت موجود ہوں۔ خالدؓ دنیا کے ان دو عظیم سپہ سالاروں میں سے تھے جن کو کبھی شکست کا سامنا نہ ہوا۔ ایک خالدؓ اور دوسرا چنگیز خان''

حضرت خالدؓ کی اخلاقی برتری

دنیا کے بڑے بڑے فاتحین پر نظر ڈالی جائے تو عظیم الشان فوجوں کے ہمراہ طاقتوروں نے کمزوروں کو کچلا۔ خالدؓ کا معاملہ بالکل برعکس تھا۔ بے سروسامان فوج کو لے کر اپنے سے کئی گنا بڑی فوج سے اسی کے علاقے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں بھڑ جانا اور پھر شاندار فتح سے ہمکنار کروانا بے شک اللہ نے خالدؓ کے مقدر میں لکھا تھا۔ تین ہزار مسلمانوں کی میدانِ موتہ میں ایک لاکھ دشمنوں سے ٹکر ہو یا مٹھی بھر افواج کا فارسیوں کی عظیم الشان افواج سے مقابلہ، حضرت خالدؓ کے عزم میں کہیں معمولی سی بھی کمی نہ آئی۔ اپنی زبردست صلاحیتوں اور کامیابیوں کے باوجود آپؓ فتح کو اللہ کی دین سمجھتے تھے۔ اس لئے کبھی بھی دشمن افواج کی کثرت سے مرعوب نہ ہوئے۔ ایک موقع پر معرکۂ یرموک میں ایک مسلمان سپاہی کے منہ سے بے ساختہ نکلا ''رومی کتنے زیادہ ہیں اور ہم کتنے کم ہیں'' خالدؓ نے فرمایا ''رومی کتنے کم ہیں اور ہم کتنے زیادہ ہیں۔ فوج کی قوت کا انحصار اس کی تعداد پر نہیں بلکہ اللہ کی مدد پر ہے اور اس کی کمزوری اس میں ہے کہ اللہ اس کا ساتھ چھوڑ دے۔''

ذاتی شجاعت اور دلیری

عموماً جرنیل پیچھے رہ کر اپنی فوج کو لڑاتے ہیں اور اپنی جان کی حفاظت کا خصوصی اہتمام کرتے ہیں۔ حضرت خالدؓ کی عادت اس کے برعکس تھی۔ محفوظ مقام پر رہ کر احکامات صادر کرنے کے بجائے پہلی صف میں دادِ شجاعت دیتے۔ ہرمز ہو یا عظیم الجثہ ہزار مرد (جس کو قتل کرنے کے بعد اس کے سینے پر بیٹھ کر آپ نے کھانا کھایا) یا پھر رومی سالار عزازیر (جس کی پھرتی حیرت انگیز تھی) آپؓ کبھی بھی زیر نہ ہوئے۔ حمص کی فتح کے موقع پر آپ نے اپنے مدمقابل رومی افسر کو اپنے بازو میں بھیں کر رکھ دیا تھا۔ آپ نے اسے سینے سے لگا کر ایسا شکنجہ کسا کہ اس کی پسلیاں ٹوٹ گئیں۔

اطاعتِ امیر کا کمال

آپ کے کردار کا سب سے روشن پہلو یہ ہے کہ باوجود مستقل فتوحات اور سالارِ اعلیٰ کی حیثیت سے خدمات انجام دینے کے آپ نے خلیفہ راشد عمرؓ کے سخت فیصلوں (جن میں سپہ سالاری سے معزولی اور فوج سے اخراج کا حکم شامل تھا) کو قبول کرنے میں ذرہ بھر بھی ردّ وکد نہ دکھائی اور اپنے احباب سے بلا تردد کہا ''اگر ابوبکرؓ وفات پاگئے ہیں اور عمرؓ خلیفہ ہیں تو اب ہم ان کے فرمانبردار ہیں۔'' آپؓ کے لشکر کے لوگ آپؓ کے گرویدہ تھے۔ ایسے موقع پر آپ کا انکار اسلامی فوج کو انتشار میں دھکیل سکتا تھا۔ مگر خالدؓ جیسا مخلص اور وفادارِ اسلام سپاہی ایسا کام کیونکر کرسکتا تھا۔ عمومی طور پر اگر کسی سپہ سالار کی تبدیلی عمل میں آتی ہے تو یا تو وہ سبکدوش ہو جاتا ہے یا پھر اس کے جذبات کا خیال کر کے اسے کسی اور مقام پر فائز کر دیا جاتا ہے۔ مگر خالدؓ کو ایسا کوئی موقع فراہم نہ کیا گیا۔ دنیا نے یہ حیرت انگیز منظر دیکھا کہ جس سپہ سالار کا نام پوری دنیا میں دہشت کی علامت بن چکا تھا اس نے اپنے خلیفہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے ایک حکم پر اپنی فوج کے معمولی سپاہی کے طور پر جنگ لڑی اور جب بھی نئے سپہ سالار ابوعبیدہؓ کو ضرورت پڑی آپؓ نے اپنی خدمات فوراً پیش کر دیں۔ کسی موقع پر پس و پیش نہ کیا۔

آپؓ نے ہمیشہ اصحاب رسول ﷺ کی عزت ہر چیز سے بڑھ کر کی۔ آپؓ نے نبی کریم ﷺ کا فرمان جو اپنے اصحاب کے بارے میں تھا یاد رکھا (پچھلے صفحات میں تذکرہ آ چکا ہے)۔ آپؓ نے بلند پایہ صحابہؓ کو وہ مقام دیا جس کے وہ مستحق تھے۔ اگر اس معاملے میں آپ کی طرف سے کمی ہوتی تو شاید تاریخ آپ کی تمام تر کامیابیوں کے باوجود آپ کو وہ مقام نہ دے سکتی جس پر آپ آج فائز نظر آتے ہیں۔

ایک موقع پر جب حضرت خالدؓ کو سپہ سالاری سے معزول ہوئے تھوڑا وقت گذرا تھا مسلمان افواج ایسے حالات میں پھنس گئیں کہ ابوعبیدہؓ کو خالدؓ کی مدد لینے کے سوا کوئی راستہ نظر نہ آیا۔ انہوں نے خالدؓ کو نئی افتاد کے بارے میں بتایا اور ساتھ ہی اپنی جھجک کا بھی تذکرہ کیا جو قیادت کی تبدیلی کی وجہ سے وہ خالدؓ سے مدد لینے میں محسوس کر رہے تھے۔ حضرت خالدؓ نے فرمایا ''واللہ! اگر آپ کسی کم سن بچے کو بھی میرا امیر مقرر کر دیتے تو میں اس کی اطاعت کرتا۔ میں آپ کی حکم عدولی کیسے کر سکتا ہوں۔ جبکہ اسلام میں آپ کا مرتبہ مجھ سے کہیں بلند ہے اور رسول ﷺ نے آپ کو امین الامت قرار دیا ہے۔ میں آپ کی حیثیت کو کبھی نہیں پہنچ سکتا۔''

اعلیٰ ترین حربی صلاحیتیں، فرض شناسی، اللہ کی ذات پر بھرپور اعتماد، اپنے مشن سے محبت، پاسِ عہد، مستقل مزاجی اور اس پر بے نظیر بہادری اور شجاعت، ان تمام خوبیوں نے خالدؓ کو انسانی تاریخ کے سب سے بڑے جرنیل کے مقام پر فائز کر دیا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز

اموی شہنشاہیت میں خلافتِ راشدہ کی روایات کو زندہ کرنے والے خدا ترس حکمران اور دوسری صدی ھجری کے مجدّد

تعارف

آپ کا نام عمر اور کنیت ابوحفص تھی۔

سلسلہ نسب یہ ہے: عمر بن عبدالعزیز بن مروان بن حکم بن عاص بن امیہ بن شمس۔

عمر بن عبدالعزیز کا تعلق بنوامیہ کے شاہی خاندان سے تھا۔آپ کے والد عبدالعزیز مروان کے بیٹے اور خاندانِ بنوامیہ کے خوش قسمت شہزادے تھے۔۶۵ ہجری میں وہ مصر کے گورنر مقرر ہوئے اور اپنے زمانۂ گورنری میں یادگار کاموں کی وجہ سے شہرت پائی۔آپ کی والدہ ام عاصم حضرت عاصم بن عمرؓ بن خطاب کی بیٹی تھیں۔ یہ رشتہ کیسے طے پایا اس کی تفصیل بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ ہوا یوں کہ ایک رات حضرت عمرؓ مدینہ کا گشت لگا رہے تھے۔ایک دیوار کے کنارے جب تھک کر بیٹھ گئے تو گھر کے اندر سے ایک عورت کی آواز آئی جو اپنی بیٹی سے دودھ میں پانی ملانے کا کہہ رہی تھی۔لڑکی نے جواب دیا ''امیرالمومنین نے دودھ میں پانی ملانے سے منع کیا ہے۔'' ماں نے کہا ''مگر اس وقت عمر نہیں دیکھ رہے۔'' لڑکی کہنے لگی: ''خدا کی قسم ایسا نہیں ہوسکتا کہ میں اکیلے میں امیرالمومنین کی نافرمانی کروں کیونکہ اگر وہ نہیں دیکھ رہے تو اللہ تو دیکھ رہا ہے۔''

حضرت عمرؓ نے یہ ساری باتیں سن لیں اور اپنے خادم اسلم سے کہا کہ اس دروازے اور اس جگہ کو یاد رکھو۔ صبح ہوئی تو معلومات کرنے پر پتہ چلا کہ لڑکی کنواری اور ماں بیوہ ہے۔اب حضرت عمرؓ نے اپنے تمام لڑکوں کو جمع کر کے کہا ''اگر مجھ کو حاجت ہوتی تو میں خود اس لڑکی سے نکاح کرتا، لیکن تم میں سے جو پسند کرے میں اس سے اس کا نکاح کرسکتا ہوں۔'' ان کے بیٹے عاصم نے اس کی حامی بھرلی اور عاصم اور اس لڑکی لیلیٰ (دوسری روایت میں قریبہ) کی شادی ہوگئی۔عمر بن عبدالعزیز کی والدہ ام عاصم انہی دونوں کی اولاد تھیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ولادت

صحیح تر روایت کے مطابق آپ ۶۳ ہجری میں مدینہ میں پیدا ہوئے۔

بچپن کے حالات

امّ عاصم کے والد عاصم کا انتقال ہو چکا تھا۔ لہٰذا ان کے تایا اور بلند پایہ صحابی عبداللہؓ بن عمر اپنی بھتیجی اور اس کے بیٹے کا خاص خیال رکھتے۔ عمر کا بھی اپنے ننھیال سے قلبی تعلق بہت مضبوط تھا۔ آپ اکثر اپنی والدہ کے تایا عبداللہ بن عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ وہاں سے واپس آتے تو ان کی شخصیت کا ایسا اثر ہوتا کہ ان جیسا بننے کی خواہش کرتے۔ آپ کی والدہ آپ کی ہمت بڑھاتیں۔ مگر اس مرتبے تک پہنچنے کو مشکل کام سمجھتی تھیں۔

آپ کے والد جب مصر کے گورنر مقرر ہوئے تو بیوی اور بچے کو مصر بلایا۔ عمر کی والدہ نے اپنے تایا عبداللہؓ بن عمر کی تجویز پر تعلیم و تربیت کی غرض سے عمر کو مدینہ چھوڑ دیا اور خود مصر چلی گئیں۔ عبداللہؓ بن عمرؓ سمجھتے تھے کہ عمر کو ان کے خاندان سے خاص مشابہت ہے۔ چنانچہ آپ کو اپنے پاس ٹھہرا لیا۔ جب عمر کے والد عبدالعزیز کو اس کی خبر ہوئی تو وہ بہت خوش ہوئے۔ عمر کے اندر بچپن ہی سے نیکی کے آثار نمایاں تھے۔ اس ضمن میں ایک واقعہ ملتا ہے کہ ایک بار عمر اپنے والد کے پاس مصر ملاقات کی غرض سے آئے تو ایک روز گدھے کی ٹانگ لگنے سے زخمی ہوگئے۔ ان کے بھائی اصبغ کو خبر پہنچی تو ہنسنے لگے۔ آپ کے والد اس پر ناراض ہوئے تو وہ کہنے لگے، مجھے ان کے گرنے سے خوشی نہیں ہوئی بلکہ میں تو اس لئے خوش ہوا ہوں کہ ان میں سعادتمندی کی تمام نشانیاں تھیں مگر ان کی پیشانی پر داغ نہ تھا۔ بنوامیہ میں یہ بات مشہور تھی کہ ان کی اولاد میں ایک ایسا شخص ہوگا جس کی پیشانی پر داغ ہوگا اور وہ زمین کو عدل سے بھر دے گا۔ غالباً اس بات کی اصل کسی بزرگ کا خواب تھا۔

تعلیم و تربیت

عمر بن عبدالعزیز نے بچپن ہی میں قرآن کریم حفظ کر لیا تھا۔ آپ کا زمانہ وہ تھا جب زیادہ تر صحابہ اپنا علم تابعین کرام کو منتقل کر کے وفات پا چکے تھے۔ لیکن عمر کو تو ایسی ننھیال میسر تھی جس پر وہ جتنا بھی فخر کرتے کم تھا۔ خود عبداللہ بن عمرؓ ان کے استاد تھے، ان کے علاوہ صالح بن کیسان بھی آپ کے اساتذہ میں تھے۔ یہ آپ کی تعلیم کے علاوہ تربیت کا بھی بھرپور خیال رکھتے۔ عمر کو ہمیشہ سے بننے سنورنے کا شوق تھا۔ چنانچہ ایک بار جب آپ نے نماز کے لئے تاخیر کی تو استاد نے وجہ پوچھی، آپ نے بتایا کہ بال سنوارنے میں دیر ہوگئی۔ استاد بولے کہ اب بالوں کو سنوارنے میں نماز کا خیال بھی نہ کرو گے۔ پھر آپ کے والد کو اس کی خبر دی۔ والد بھی عمر کی شوقین طبیعت سے واقف تھے۔ انہوں نے آپ کے بالوں کو اتروا دیا تاکہ طبیعت کی اصلاح ہو۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عبیداللہ بن عتبہ اور سعید بن مسیّب جیسے تابعین کرام بھی آپ کے اساتذہ میں شامل ہیں۔اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ عمر کی تعلیم وتربیت کس نہج پر ہوئی ہوگی۔تعلیم مکمل کرنے کے بعد جب آپ مدینہ سے نکل کر مصر اور شام آئے تو بہت بڑے عالم بن چکے تھے۔علامہ ذہبی لکھتے ہیں: ''وہ بڑے امام، بڑے فقیہ، بڑے مجتہد اور حدیث کے بڑے ماہر اور معتبر حافظ تھے۔''

بعد میں سلطنت کے مختلف عہدوں پر فائز ہونے کی وجہ سے ایسی مصروفیت ہوئی کہ اپنے علمی شوق کو برقرار نہ رکھ سکے۔

شادی اور دیگر حالات

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد والد کے پاس مصر آئے۔اس زمانے میں آپ کے والد عبدالعزیز اور چچا عبدالملک میں ولی عہدی پر تنازعہ چل رہا تھا۔تاہم جب آپ کے والد کا انتقال جلد ہی ہوگیا تو عبدالملک کو بہت افسوس ہوا۔وہ بہت رویا اور آپ کو دارالخلافہ دمشق بلا کر اپنے بیٹوں کے ساتھ رکھا۔ساتھ ہی آپ کی شادی اپنی سب سے چہیتی بیٹی فاطمہ سے کر دی۔

فاطمہ شہزادی تھیں اور ان کے مزاج میں نزاکت بھی بہت تھی۔عمر کے والد نے بھی اپنی اولاد کے لئے بڑی دولت چھوڑی تھی۔دونوں کا طرزِ زندگی انتہائی شاہانہ تھا۔عمر تو حد درجہ شوقین تھے۔نفیس لباس پہنتے، لذیذ غذا کھاتے اور عمدہ سواریوں پر چڑھتے۔ایک لباس بار بار نہیں پہنتے تھے۔وہ ریشمی چادریں جو آپ زیب تن کیا کرتے ان کی قیمت آٹھ سو درہم تک ہوا کرتی تھی۔رجاء بن حیوٰۃ کا بیان ہے''عمر بن عبدالعزیز اپنے زمانے کے سب سے زیادہ خوش لباس، معطر اور فخر کی چال چلنے والے تھے۔''

مدینہ کی گورنری

آپ کے چچا عبدالملک کے انتقال کے بعد ۸۷ ہجری میں اس کا بیٹا ولید خلیفہ بنا تو اس نے آپ کو مدینہ کا گورنر بنا دیا۔اس وقت آپ کی عمر محض ۲۵ سال تھی۔آپ اپنی بیوی اور خدام کے ساتھ اس شان وشوکت سے مدینہ پہنچے کہ آپ کا سامان تیس اونٹوں پر لدا ہوا تھا۔

گو کہ آپ کا طرزِ زندگی اموی شہزادوں کا سا تھا، تاہم عمر رعایا پر ظلم وزیادتی روا رکھ کر خزانہ بھرنے کے بالکل قائل نہ تھے۔ولید نے جب آپ کو مدینہ کا والی بنایا تو آپ نے مدینہ جانے میں تاخیر کی۔وجہ معلوم کی گئی تو ولید کو کہلا بھیجا کہ میں ظلم وتعدی سے آمدنی بڑھانے کی روایت پر عمل نہیں کرسکتا۔اس پر ولید نے لکھ بھیجا کہ آپ حق کے ساتھ معاملات چلائیں، خواہ آپ ہمیں ایک درہم بھی نہ بھیجیں۔عمر نے عہدہ سنبھالتے ہی محاصل کی وصولی میں ہر قسم کی سختی ممنوع قرار دی اور اکابرین شہر سے درخواست کی کہ اگر وہ ظلم ہوتا دیکھیں تو آپ کو خبردار

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کریں۔ ابن الحکم نے لکھا ہے کہ باوجود امیرانہ طور طریقوں کے آپ نہ حرام مال کھاتے اور نہ شریعت کے خلاف حکم کرتے۔ رفاہِ عامہ کے کام

عمر اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ حکمرانوں کو رعایا کی فلاح و بہبود کا بھرپور خیال رکھنا چاہئے۔ چنانچہ آپ نے بڑے پیمانے پر رفاہِ عامہ کے کام شروع کروائے۔ مدینہ اور مکہ کے نواح میں کنوئیں کھدوائے۔ مکہ، مدینہ اور طائف کو ملانے والے راستوں کو دوبارہ تعمیر کروایا تاکہ مسافروں کو دقت نہ ہو۔ آپ کا ایک بڑا کارنامہ مسجد نبوی ﷺ کی از سرِ نو تعمیر ہے۔ عمر نے محسوس کیا کہ مسلمانوں کی تعداد کے لحاظ سے مسجد میں گنجائش بہت کم ہے۔ اگرچہ عمرؓ اور عثمانؓ اپنے اپنے ادوار میں اس کی توسیع کر چکے تھے۔ پھر بھی عمر نے نمازیوں کی پریشانی دیکھ کر خلیفہ ولید سے مسجد کی وسعت میں اضافہ کے لئے درخواست کی۔ درخواست منظور ہوئی اور تین سال کے اندر مسجد کی گنجائش میں اضافے کے ساتھ اس کو مضبوطی سے تعمیر کر دیا گیا۔ خود عمر نے بھی مسجد کی تعمیر میں مزدوروں کی طرح حصہ لیا۔ مسجد میں کنگرے اور محراب کا اضافہ کیا، پرنالے بنوائے اور مسجد نبوی کے ملحقہ علاقے میں فوارے اور حوض تعمیر کروائے۔ علماء اور فقہاء کی عزت

عمر کے طرزِ حکومت کی خاص بات یہ تھی کہ وہ علماء اور فقہاء کو حکومت کے فیصلوں میں شریک مشورہ رکھتے تھے۔ جب آپ والی بنائے گئے تو مدینہ کے دس بڑے فقہاء کو جمع کر کے اپنے کام میں مدد کے لئے خصوصی درخواست کی۔ یہ محض دکھاوے کی غرض سے نہ تھا بلکہ آپ ان کے علم اور مشوروں کی صحیح قدر کیا کرتے تھے۔ انہی مقدس ہستیوں سے آپ نے مسجد کی تعمیرِ نو کے وقت پہلا پتھر بھی رکھوایا تھا۔ ایک بار آپ نے ایک آدمی کو مشہور تابعی اور آپ کے استاد سعید بن میبّب سے مسئلہ پوچھنے کی غرض سے بھیجا۔ اس نے بجائے مسئلہ پوچھنے کے خود انہی کو آپ کے پاس بھیج دیا۔ آپ کو بہت افسوس ہوا اور اپنے استاد سے عرض کیا: ''آپ جائیے، میں خود آپ کے پاس آ کر معلوم کر لوں گا۔''

علماء بھی دین کی قدر کی وجہ سے آپ سے تعلق رکھتے تھے۔ چنانچہ جب عمر نے مدینہ چھوڑا تو سعید بن میبّب نے دونوں ہاتھ اٹھا کر آپ کے لئے دعا کی۔

معزولی یا دستبرداری

جیسا کہ اس سے قبل بیان کیا جا چکا ہے کہ عمر ظلم و تعدی کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ اسی وجہ سے والیٔ عراق حجاج بن یوسف کے لئے آپ کے دل میں کوئی جگہ نہ تھی جو اپنے ظلم کی وجہ سے مشہور تھا۔ جب حجاج حج کے بعد مدینہ سے گذرنے لگا تو آپ نے ولید کو لکھ بھیجا کہ ہمیں یہ پسند نہیں کہ حجاج یہاں سے گذرے۔ ولید نے یہ خط پڑھ کر حجاج کو آپ کی پسند کا خیال رکھنے کو کہا۔ اس طرح حجاج کے دل میں عمر کے خلاف سخت گرہ پڑ گئی۔ ایک روایت

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے مطابق جب عمر نے ولید کو حجاج کے مظالم کے خلاف خط لکھا تو جواباً حجاج نے بھی شکایت کی کہ عمر میرے پاس سے بھاگے ہوئے فتنہ پرور لوگوں کو پناہ دیتے ہیں۔ ولید نے حجاج کی بات کو قبول کرتے ہوئے عمر کو معزول کر دیا۔

دوسری روایت کے مطابق عبداللہ بن زبیرؓ کے بیٹے خبیب سے ولید ایک بار ناراض ہو گیا اور عمر کو حکم دیا کہ انہیں سو کوڑے لگائے جائیں۔ عمر نے اپنے چھ سالہ دور میں اب تک عمومی طور پر ولید کو اپنے علاقے میں کوئی ظالمانہ حکم جاری کرنے کی اجازت نہ دی تھی۔ بہرصورت کسی بھی وجہ سے اس حکم پر عمل درآمد ہوا۔ خبیب کمزور بھی تھے اور سزا دینے والے نے بھی سختی دکھائی۔ گھر پہنچنے کے بعد زخموں کی تاب نہ لا کر وہ انتقال کر گئے۔ عمر کو جب ان کی موت کا علم ہوا تو زمین پر گر پڑے، سخت صدمے میں چلے گئے، عیش و آرام کی فکر نہ رہی اور اپنے عہدے سے دستبردار ہو گئے۔

اس روایت کے برخلاف ابن کثیر نے بڑے وثوق سے یہ بات لکھی ہے کہ عمر اپنے عہدے سے معزول کیے گئے۔ بہرکیف عمر نے اپنے چھ سالہ دور میں نیک نامی کمائی اور معزول ہونے کے بعد دارالخلافہ دمشق چلے گئے۔ اگلے چھ سال اپنے چچا کے بیٹوں کے پاس رہے۔ دربار خلافت سے آپ کا تعلق قطع نہ ہوا۔ ولید اور بعد میں سلیمان بن عبدالملک کبھی آپ کی بات مان لیتے اور کبھی آپ کے مشوروں پر عمل نہ کرتے۔ ایک بار عمر اور خلیفہ سلیمان آپس میں الجھ پڑے۔ بات اتنی بڑھی کہ عمر نے مصر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن سلیمان نے معافی مانگ لی اور کہا کہ آپ نے مصر جانے کا ارادہ کر کے مجھے جتنا پریشان کیا ہے بخدا میں اتنا پریشان کبھی نہ ہوا۔

خلافت

صفر ۹۹ ہجری میں خلیفہ سلیمان سخت بیمار پڑا۔ یہاں تک کہ وہ اپنی زندگی سے مایوس ہو گیا تو اس نے حکم دیا کہ شہزادوں کو شاہی لباس پہنا کر اور تلواریں لگا کر حاضر کیا جائے۔ بچے کم سن تھے۔ وہ آئے تو اس حال میں کہ نہ اپنے کپڑوں کو سنبھال سکتے تھے اور نہ تلواریں ان سے اٹھائی جاتی تھیں۔ اس حالت پر سلیمان نے افسوس کیا۔ پھر مشہور عالم رجاء بن حیوۃ سے مشورہ کیا۔ رجاء نے عمر کا نام تجویز کیا تو سلیمان نے کہا۔ ''بخدا میں ایسی نامزدگی کروں گا جس میں شیطان کا کوئی حصہ نہ ہو''۔ پھر پہلے عمر کو اور اس کے بعد یزید بن عبدالملک کو نامزد کیا۔ یزید کی نامزدگی کی وجہ یہ تھی کہ وہ آل عبدالملک کو یکسر نظرانداز کرنے کی سیاسی غلطی نہیں کر سکتا تھا۔

دوسری روایت کے مطابق جب سلیمان کو اپنی موت کا یقین ہو گیا تو اپنے بیٹے ایوب اور اس کے بعد داؤد کو نامزد کرنے کے لئے رجاء سے مشورہ کیا۔ رجاء بولے ''خلیفہ ایسے صالح شخص کو بنانا چاہئے کہ قبر میں امن حاصل رہے۔'' رجاء دراصل اس کی توجہ اس کے چچا زاد بھائی عمر بن عبدالعزیز کی طرف مبذول کروانا چاہتے تھے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خلیفہ اب بھی تذبذب میں تھا۔ کہنے لگا کہ ''میرے بیٹے داؤد کے بارے میں کیا رائے ہے؟'' رجاء بولے ''وہ تو اس وقت قسطنطنیہ میں ہیں۔ معلوم نہیں کہ زندہ بھی ہیں یا نہیں۔'' (قسطنطنیہ کی فوج کا بڑا حصہ تباہ ہو چکا تھا) اس پر سلیمان بولا ''اچھا عمر کے بارے میں کیا رائے ہے؟'' رجاء نے جھٹ کہا ''وہ نہایت برگزیدہ ہیں۔'' بالآخر سلیمان نے عمر بن عبدالعزیز اور اس کے بعد یزید بن عبدالملک کو نامزد کرنے کا فیصلہ کیا۔ خود اپنے ہاتھ سے عہد خلافت لکھا۔ سب خاندان کو جمع کر کے رجاء کے حوالے کیا اور اس کی حمایت پر سب سے اقرار لیا۔

سلیمان کے انتقال کے بعد رجاء نے اس کی موت کو فوری طور پر سب سے چھپا لیا اور ایک بار پھر لوگوں کو جمع کر کے خلیفہ کی وصیت پر بیعت کرنے کو کہا۔ جب سب نے بیعت کر لی تو انہوں نے سلیمان کی موت کا اعلان کیا اور وصیت نامے کا مضمون پڑھ کر سنایا۔

جب عمر کا نام خلیفہ طور پر پڑھ کر سنایا گیا تو مجمع میں عمر بھی موجود تھے۔ یہ سن کر بہت گھبرائے، کیونکہ آپ رجاء سے پہلے ہی یہ کہہ چکے تھے کہ اگر خلیفہ میرا نام تجویز کریں تو ہرگز حمایت نہ کرنا۔ اب عمر رجاء کے پاس آئے اور انہیں اپنی دوستی اور خدا کا واسطہ دے کر نامزدگی واپس لینے پر آمادہ کرنا چاہا کہ وہ اس منصب سے مستعفی ہو جائیں۔ مگر رجاء کسی صورت نہ مانے۔ آخر کار آپ بڑی کراہیت کے ساتھ منبر پر بیٹھے۔ حال یہ تھا کہ انا للہ وانا الیہ راجعون زبان پر تھا۔ پھر کہا ''خدا کی قسم میں نے کبھی خفیہ یا اعلانیہ اس بات کی خواہش نہ کی تھی۔'' پھر ایک خطبہ دیا جس میں علی الاعلان کہا: ''اے لوگو! میں اس کام میں اپنی رائے اور مرضی کے بغیر مبتلا کیا گیا ہوں۔ اس امر میں مسلمانوں سے مشورہ نہیں مانگا گیا۔ میں نے تمہیں اپنی بیعت سے آزاد کیا۔ اپنے لئے جس کو چاہو منتخب کر لو۔'' لوگ ایک آواز ہو کر بولے۔ ''ہم نے آپ کو پسند کیا اور آپ پر راضی ہو گئے۔''

سوائے ہشام بن عبدالملک کے کسی نے آپ کے خلیفہ بننے کی مخالفت نہ کی اور اسے رجاء نے سختی سے خاموش کروا دیا۔

خلافت و ملوکیت کا فرق

عمر بن عبدالعزیزؒ کا دور اور آپ کو درپیش چیلنجوں کا تذکرہ کرنے سے پیشتر مناسب ہوگا کہ یہاں ہم خلافتِ راشدہ اور ملوکیت میں فرق واضح کرتے چلیں۔ خلافتِ راشدہ کے طرزِ حکمرانی کی بنیاد شورائیت، عوامی رائے اور مرضی پر تھی۔ خلفائے راشدین تمام کے تمام پہنچے ہوئے صحابہ تھے۔ خوفِ خدا سے ان کے دل ہر وقت لرزتے رہتے تھے۔ عدل و انصاف کی حکمرانی کے لئے وہ اپنے پرائے کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ بیت المال کے پیسے کو وہ انتہائی احتیاط سے استعمال کرتے۔ ایک درہم بھی کسی غلط مصرف میں نہ لاتے۔ ان کی ذاتی زندگیاں انتہائی سادہ تھیں۔ خدا کے سامنے رعایا سے متعلق جوابدہی کا خیال انہیں کسی پل چین نہ لینے دیتا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حضرت علیؓ کے بعد مسلمانوں کے خلیفہ امیر معاویہؓ بنے۔ ان کا تعلق قبیلہ بنوامیہ سے تھا۔ انہوں نے اپنے بعد اپنے بیٹے یزید کو نامزد کیا۔ یہ طریقہ مسلمانوں کے لئے نامانوس تھا۔ معاویہؓ خود تو صحابئ رسول ﷺ تھے اور عہدِ نبوی اور پھر خلافتِ راشدہ کا زمانہ دیکھ چکے تھے۔ اس لئے خلافت ملنے کے بعد انہوں نے اسلامی روایات کو برقرار رکھنے کی کوشش کی۔ لیکن یزید کی بطور ولی عہد نامزدگی نے خلافت کو ملوکیت میں بدل دیا اور شخصی حکمرانی کی بیشتر خصوصیات اسلامی سلطنت میں بھی داخل ہوگئیں۔ وہ سب خصوصیات جو خلافتِ راشدہ کا طرّہ امتیاز تھیں اور اسلامی طرزِ حکومت کا لازمہ تھیں ایک ایک کر کے ضائع ہوگئیں۔ سب سے پہلے تو عوام پر ظلم وستم روا رکھا جانے لگا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ خلافت بنوامیہ میں عوام کی مرضی کو ہرگز دخل نہ تھا۔ جب ان کی رائے اور مرضی کے خلاف حکومت قائم کی گئی تو اہلِ حق حضرات جو اسلامی خلافت کا نظام چاہتے تھے، ان کے خلاف ہوگئے۔ چنانچہ یزید کے دور میں امام حسینؓ کی شہادت کا خونی واقعہ پیش آیا جس نے تمام دنیائے اسلام کو ہلا دیا۔ ہر طرف غم وغصے کی لہر دوڑ گئی۔ لوگوں میں بنوامیہ کے خلاف نفرت اور اہلِ بیت سے ہمدردی کا رجحان پیدا ہوگیا۔ حکومت کی جانب سے حضرت علیؓ پر خطبے میں لعن طعن کی رسم شروع ہوگئی جس نے عوام کے جذبات کو اور بھی بھڑکایا۔ خصوصاً شیعانِ علی (جو خلافت کو صرف اہلِ بیت کا حق سمجھتے تھے) جواباً اموی خلفاء کو برا بھلا کہتے تو انہیں سخت سزائیں دی جاتیں۔ سیاسی بدظنی یا قبائلی تعصب کی بناء پر مخالف کو شدید عتاب کا نشانہ بنایا جاتا۔ خلیفہ سلیمان نے ذاتی انتقام کی وجہ سے اسلام کے کئی نامور جرنیلوں اور رئیسوں کے ساتھ بدترین سلوک کیا۔ محمد بن قاسم فاتح سندھ کو مروادیا، فاتح اسپین موسیٰ بن نصیر کو معتوب کر کے ذلیل وخوار کیا گیا۔

پھر ان سب سے بڑھ کر حجاج بن یوسف نے بنوامیہ کی شہنشاہیت میں خوب رسوخ حاصل کیا۔ وہ ایسا ظالم شخص تھا کہ خانۂ کعبہ پر سنگ باری، مدینہ کا محاصرہ اور عبداللہ بن زبیرؓ، سعید بن جبیرؒ اور کتنے ہی متقی مسلمانوں کے خون سے ہاتھ رنگنے جیسے ناقابل رشک واقعات میں ملوث تھا۔

اسلام کے عظیم الشان اقتصادی ومعاشرتی انصاف کے اصولوں کے باوجود بنوامیہ کا سلوک نومسلم عجمیوں کے ساتھ سخت ناروا تھا۔ برابری کا رتبہ دینا تو درکنار ان پر ہر قسم کے مظالم روا رکھے جاتے تھے۔ ہر نیا گورنر نئے ٹیکس کے بوجھ سے انہیں لاد دیتا۔ حجاج کے زمانے میں ان سے جزیہ بھی وصول کیا جاتا (جبکہ اسلام کی رو سے یہ صرف غیر مسلموں پر لاگو ہوتا ہے)۔ نوبت یہ آگئی کہ تنگ آ کر کچھ نومسلم اسلام چھوڑ کر بغاوت پر اتر آئے۔

ان ناجائز ٹیکسوں کا مقصد اس کے سواء کیا تھا کہ بیت المال کا پیٹ بھرا جاسکے جو خلیفہ کی ذاتی ملکیت بن چکا تھا۔ بیت المال کی آمدنی کو خلیفہ اپنی ذاتی راحت وآرام اور تعیش کے لئے استعمال کرتے تھے۔ شاہی خاندان کے لئے محلات بننے لگے۔ شاہانہ لباس زیب تن کیا جانے لگا۔ خلفاء نے اپنی حفاظت کے لئے مسلح سپاہی ساتھ رکھنے شروع کر دیئے۔ اموی شہنشاہ اپنی حفاظت کا اتنا اہتمام کرتے کہ جب خلیفہ ولید مسجد نبوی کا معائنہ کرنے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مدینہ گیا تو مسجد سے تمام آدمیوں کو باہر نکال دیا گیا۔

یہ طرزِ حکمرانی اسلام کے مزاج سے یکسر متصادم اور شہنشاہیت کی تمام تر برائیاں اپنے اندر لئے ہوئے تھا۔ نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرامؓ کا دور گزرے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ لوگ عموماً اور بزرگانِ دین، تابعین اور تبع تابعین خصوصاً غیر اسلامی حرکات کو سختی سے ناپسند کرتے تھے۔ لیکن ان شریف النفس لوگوں کے مقابلے میں ایسے لوگ تھے جو اپنی مخالفت کرنے والوں کے ساتھ ہر قسم کے ہتھکنڈوں کا استعمال کرتے۔ امام حسینؓ اور پھر عبداللہ بن زبیرؓ کی شہادت کو اسی تناظر میں دیکھنا چاہیے۔ چنانچہ مسلمانوں میں خانہ جنگی اور فساد سے بچنے کے لئے انہوں نے بظاہر خاموشی اختیار کر لی تھی۔

عمر بن عبدالعزیزؒ...... پانچویں خلیفہ راشد

یہ سب باتیں عمر سے پوشیدہ نہ تھیں جو وقتاً فوقتاً اپنے چچازاد بھائیوں کو اصلاحات کے لئے مشورے دیتے رہتے۔ مگر آپ ان کے طرزِ حکمرانی میں کسی قسم کی تبدیلی نہ لا سکے۔ اب خلافت کا بوجھ آپ کے کاندھوں پر آ پڑا تو یہ ایسا بار محسوس ہوا کہ آپ نے اس سے جان چھڑانا چاہی۔ لوگوں کے حقِ چناؤ کو تسلیم کیا اور اس عہدے سے دستبرداری کی پیشکش کی۔ لوگ آپ کو بخوبی جانتے تھے۔ وہ تو بنو امیہ کے ظالم بادشاہوں کو بھی بہ امرِ مجبوری برداشت کئے ہوئے تھے۔ آپ تو پھر ان سب میں پسندیدہ تھے۔ چنانچہ تمام مجمع نے آپ کی خلافت کے حق میں رائے دی۔

اس مجلس کے فوراً بعد نئے خلیفہ کے طور پر آپ کے پاس سواری کے لئے شاہی گھوڑے لائے گئے اور خیمے اور شامیانوں کے ساتھ خصوصی فرش کا اہتمام کیا گیا۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے ان کی ضرورت نہیں۔ پھر اپنے غلام مزاحم سے فرمایا کہ انہیں بیت المال میں جمع کرادو۔ دستور کے مطابق آپ کے آگے محافظ دستے کے پہرے دار چلنے لگے۔ آپ کو یہ بہت برا معلوم ہوا۔ ان سے کہا "مجھے تمہاری ضرورت نہیں۔ میں بھی دوسرے مسلمانوں کی طرح ایک مسلمان ہوں۔" اس کے بعد اپنے گھر تشریف لے گئے۔ اپنی بیوی فاطمہ کو خلافت کی ذمہ داری کی خبر دی۔ اس کے ساتھ ہی آپ نے فاطمہ سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنا تمام زیور اور قیمتی مال بیت المال میں جمع کرادیں ورنہ ان کو اختیار ہے کہ چاہیں تو وہ آپ کے ساتھ رہیں اور چاہیں تو علیحدہ ہو جائیں۔ فاطمہ شہزادی تھیں۔ مگر فطرتاً نیک طبیعت تھیں۔ پھر عمر بن عبدالعزیز کی صحبت نے ان کے مزاج میں تبدیلی پیدا کر دی تھی۔ وہ اس پر راضی ہو گئیں۔

اگلے دن خلیفہ سلیمان کے گھر والوں نے روایت کے مطابق تمام قیمتی سامان نئے خلیفہ کے گھر بھجوا دیا۔ عمر کو اس کی خبر ہوئی تو اسے بیت المال میں جمع کرا دیا۔ آپ کی خدمت میں باندیاں پیش کی گئیں جو اپنے حسن میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یکتا تھیں۔ آپ کے حکم سے انہیں ان کے گھروں اور خاندانوں کو واپس بھجوا دیا گیا۔

خلافت ایک امانت

عمر خلیفہ کیا مقرر ہوئے بارِ خلافت نے ان کا دن کا چین اور رات کا آرام چھین لیا۔ وہ اپنے مال، جائیداد اور خواہشات کی فکر کرنا بھول گئے۔ اس بارے میں ایسے لاپرواہ ہوئے کہ ان کی بیوی فاطمہ کہتی ہیں ''عمر نے اپنی ذات کو مسلمانوں کے لئے مخصوص کرلیا تھا۔ وہ ہر لمحہ انہی کے بارے میں سوچتے رہتے۔ اگر کبھی دن کے وقت مسلمانوں کے کام ختم نہ ہوتے اور شام ہو جاتی تو وہ رات گئے تک ان ہی کا کام کرتے۔ جب وہ کام سے فارغ ہو جاتے تو اپنا چراغ منگواتے، دو رکعت نماز پڑھتے، پھر اپنا سر ہاتھوں پر رکھ کر بیٹھ جاتے اور آنسو ان کے گالوں پر بہنے لگتے اور ان پر اس قدر گریہ طاری ہو جاتا کہ ایسا لگتا کہ ان کا دل روتے روتے پھٹ جائے گا اور وہ جان دے دیں گے۔ پھر صبح ہو جاتی اور وہ روزہ رکھ لیتے۔

میں کبھی ان کے قریب آتی اور ان سے کہتی اے امیر المومنین! کیا آپ پر میرا حق نہیں ہے جو پہلے تھا۔ وہ فرماتے مجھے میرے حال پر چھوڑ دو اور تم اپنے حال پر رہو۔ میں ان سے عرض کرتی مجھ سے کچھ تو کہئے۔ تو وہ مجھ سے کہتے کہ میں اس امت کے سیاہ و سفید کا والی بنایا گیا ہوں۔ مجھے ان کے بھوکے، فقیر اور ایسے مسافر جن کا کوئی نہیں ہے اور مجبور قیدی اور تھوڑے سرمائے والے اور بہت عیال والے اور ان جیسے دوسرے لوگ جو زمین میں مختلف گوشوں اور مختلف شہروں میں آباد ہیں یاد آتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ اللہ مجھ سے ان کے بارے میں پوچھے گا۔ اور محمد ﷺ ان کے بارے میں باز پرس کریں گے۔ میں ڈرتا ہوں اللہ میرا عذر قبول نہ کرے گا اور رسول ﷺ میری کوئی دلیل نہ مانیں گے''۔

عمر کو یہ احساس تھا کہ خلافت ان کا حق نہیں بلکہ خدا کی طرف سے امانت ہے اور یہ کہ ان کے خاندان نے اس تمام عرصے میں جو مال و دولت جمع کیا ہے وہ دراصل امت کے مظلوموں کا حق غصب کر کے ان کے ہاتھ آیا ہے۔ آپ سمجھتے تھے کہ خلیفہ کو عوام کی تکالیف کا صحیح اندازہ ہونا چاہئے اور یہ صرف اسی وقت ہو سکتا ہے جب وہ ان کی سطح پر آ کر معاملات کو جانچے۔ چنانچہ اس احساس نے آپ کے طرزِ زندگی میں انقلاب پیدا کر دیا۔ وہی عمر جن کی چادر کی قیمت آٹھ سو درہم تک ہوتی تھی اب معمولی درجے کا کرتا پاجامہ پہنتے۔ اپنے ساتھ خصوصی معاملے کو سخت ناپسند کرتے۔ چنانچہ خلفاء پر نماز کے بعد جو درود و سلام بھیجا جاتا اس کی ممانعت کر دی اور کہا کہ ''درود نبی اکرم ﷺ کے لئے مخصوص ہے اور دعا تمام مسلمانوں کے لئے ہونی چاہئے۔ اگر میں ان میں کا ہوں تو میں بھی ان میں شامل رہوں گا۔'' آپ نے جو طریقہ شروع کیا وہ ابھی تک بنوامیہ کے خدام کے لئے نامانوس تھا۔ چنانچہ ایک جنازے کے موقع پر دوسروں سے فرق کرنے کے لئے آپ کے لئے خاص چادر بچھوائی گئی تو آپ نے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چھڑی کی نوک سے چادر کو کھسکا دیا اور عوام کے ساتھ شامل ہو گئے۔

اصلاحات کا آغاز اور جائیدادوں کی واپسی

عمر بن عبدالعزیز اپنی ذات سے اصلاحات کا آغاز کر چکے تھے۔ مگر انہیں مستقل یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ گزشتہ ادوار میں ان کے خاندان کے ہاتھوں ظلم و زیادتی کے ساتھ جو رعایا کے مال کو غصب کیا گیا ہے، ان مظالم کی تلافی کیسے کی جائے۔ غصب شدہ مال اور جائیدادوں کی واپسی کا معاملہ بڑا نازک تھا۔ اپنے غلام مزاحم سے تذکرہ کرتے ہوئے کہنے لگے ''ہمارے قبضے میں چند ایسی جاگیریں ہیں جن کے ہم مستحق نہ تھے، ہم پر لازم تھا کہ یہ عطیات قبول نہ کرتے۔ اب جبکہ خلافت مجھ تک آ گئی ہے مجھ پر واجب ہے کہ میں ان کا محاسبہ کروں۔'' اس نے کہا ''آپ کی اولاد کا کیا ہوگا؟'' فرمایا ''اللہ انہیں رزق دے گا۔'' مزاحم نے یہ بات آپ کے بیٹے عبدالملک کو بتا دی جو زہد میں آپ سے بھی بڑھ کر تھے۔ وہ دوڑتے ہوئے آئے اور آپ سے کہا ''جو ارادہ کیا ہے اس پر عمل کیجئے، اور ہماری فکر نہ کیجئے۔'' عمر بولے ''آئندہ جمعے کو مسجد میں اس کی منادی کرا دی جائے گی۔'' اس پر نیک دل بیٹا بولا۔ ''کیا آپ کو یقین ہے کہ آپ جمعہ تک زندہ رہیں گے؟ اس عارضی زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ اس لئے نیک کام کرنے میں تاخیر نہ کیجئے۔''

عمر بن عبدالعزیز بیٹے کی اس بات سے بہت خوش ہوئے۔ اسی وقت مسجد میں اعلان کرا دیا کہ جس کا مال میرے باپ دادا نے ضبط کر لیا تھا، وہ مجھ سے آ کر واپس لے لے۔ پھر اپنا سارا مال و متاع حقداروں کو لوٹا دیا۔ یہاں تک کہ ہاتھ کی انگوٹھی جس کا نگینہ ولید نے دیا تھا، بیت المال میں جمع کرا دی۔ اس کے بعد اہلِ خاندان کو جمع کر کے فرمایا ''بنی مروان تم کو دولت اور شرف کا بڑا حصہ ملا ہے۔ میرا خیال ہے کہ امت کا نصف یا دو تہائی مال تمہارے قبضے میں ہے۔''

جب آپ کے خاندان والوں کو آپ کے اس ارادے کی خبر ہوئی تو وہ ایک دم قابو سے باہر ہو گئے اور کہنے لگے ''خدا کی قسم جب تک ہمارے سر تن سے جدا نہ ہو جائیں اس وقت تک یہ جائیدادیں واپس نہیں ہو سکتیں۔'' عمر بن عبدالعزیز نے بھی اسی زور سے جواب دیا ''خدا کی قسم! اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو میں تمہیں ذلیل و خوار کر کے چھوڑوں گا۔'' اس کے بعد مسجد میں تقریر کر کے یقین دلایا کہ تمام حقداروں کو ان کا حق لوٹایا جائے گا۔

پھر جاگیروں کی اسناد کا صندوق منگوایا۔ مزاحم ان اسناد کو نکال نکال کر سناتے جاتے اور عمر بن عبدالعزیز انہیں قینچی سے کاٹ کاٹ کر پھینکتے جاتے۔ سب سے اہم معاملہ علاقہ فدک کا تھا جو اس وقت آپ کے اپنے تصرف میں تھا اور آپ کے اہل و عیال کی زیادہ تر آمدنی کا دارومدار اس پر تھا۔ یہ علاقہ دراصل خاص رسول اللہ ﷺ کی ملکیت تھا اور اس کی آمدنی آپ ﷺ اپنی اور بنو ہاشم کے دیگر حاجت مندوں کی ضروریات پر صرف کرتے تھے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خلفائے راشدین نے بھی یہی انتظام برقرار رکھا۔ بعد کے اموی دور میں اسے مروان بن حکم کی ذاتی جاگیر بنا دیا گیا۔ عمر کو ایک حصہ تو اپنے باپ سے وراثت میں ملا اور دوسرا حصہ ولید اور سلیمان والا بھی اب آپ کے تصرف میں آ گیا۔ آپ نے اعلان کر دیا۔ ''رسول اللہ ﷺ فدک کی زمین کو اللہ کی راہ میں استعمال کرتے تھے۔ پھر ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہم نے بھی یہی کیا۔ جب مروان کے ناجائز قبضے میں آئی تو وراثت کی وجہ سے مجھے بھی اس میں سے حصہ ملا۔ میں اس ناجائز مال کو بیت المال میں جمع کراتا ہوں تاکہ جیسے آپ ﷺ کے دور میں اس کی آمدنی استعمال ہوتی تھی اب بھی ہو۔''

اس کے علاوہ یمامہ کی زمین کا قبضہ چھوڑ کر اسے بیت المال کی ملکیت بنا دیا۔ چالیس ہزار دینار کی ذاتی رقم کے علاوہ اپنی بیوی کے کپڑے اور وہ موتی بھی جو ان کو اپنے والد کی طرف سے ملا تھا، سب بیت المال میں جمع کروا دیا۔ آپ کی بیوی فاطمہ کے پاس ایک لونڈی تھی جو آپ کو بہت پسند تھی۔ خلیفہ بننے کے بعد ایک روز اس سے پوچھا کہ ''تم فاطمہ کی ملکیت میں کیسے آئیں؟'' کہنے لگی۔ ''حجاج نے کوفہ کے عامل پر تاوان لگایا تھا۔ میں اس کی مِلک تھی۔ حجاج نے مجھے عبدالملک اور پھر اس نے اپنی لڑکی فاطمہ کو دے دیا۔''

آپ نے پوچھا ''اس عامل کا کیا حال ہے؟'' کہا: ''وہ تو مر گیا ہے۔ البتہ اس کی اولاد برے حال میں موجود ہے۔'' عمر نے ان کو طلب کیا اور ان کا مال اور لونڈی ان کو واپس کر دی۔ چلتے ہوئے لونڈی نے عمر سے پوچھا ''اور آپ کا عشق کیا ہوا؟'' بولے۔ ''وہ تو ہے، بلکہ اور بڑھ گیا ہے۔''

تمام سلطنت میں امراء کو ہدایت کر دی گئی کہ اہلِ حق کے حق واپس کر دیئے جائیں۔ چنانچہ جب اس کام کا آغاز ہوا تو عراق کا بیت المال حقوق کی ادائیگی کی وجہ سے خالی ہو گیا۔ بنو امیہ کی تنخواہیں بند کر دی گئیں۔ اس کے ساتھ ہی خلفاء کے پسندیدہ لوگوں کو تنخواہ اور وظائف و تحائف دینے کا سلسلہ بھی بند ہو گیا۔

خاندان کی مخالفت

بنو امیہ کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ انہی کے خاندان کا ایک فرد ان کی جائیدادیں ناجائز قرار دے کر واپس کر دے گا اور شاہی خاندان وظائف اور تنخواہوں سے محروم ہو جائے گا۔ چنانچہ ایک بار تمام خاندان نے مل کر آپ کی پھوپھی کو آپ سے بات کرنے بھیجا۔ پھوپھی کی اپنی بھی حاصل شدہ مراعات کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ چنانچہ وہ عمر بن عبدالعزیز کی خدمت میں خاندان کی وکالت کرنے اور اپنی تنخواہ کی بندش کا ذکر کرنے آئیں۔ عمر نے جواب دیا۔ ''پھوپھی جان! میرے چچا عبدالملک اور میرے چچیرے بھائی ولید اور سلیمان آپ کو مسلمانوں کے بیت المال سے تنخواہ ادا کیا کرتے تھے۔ یہ مال میرا نہیں ہے۔ میں آپ کو اپنے مال میں سے دے سکتا ہوں۔'' پھوپھی نے پوچھا۔ ''تمہارا مال کتنا ہے؟'' آپ نے جواب دیا ''دو سو درہم سالانہ۔'' پھوپھی مایوس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہو کر بولیں۔ ’’یہ میرے کس کام آ سکتا ہے۔‘‘

ایک اور روایت میں ہے کہ عمر نے ایک دینار منگوا کر اس کو آگ میں تپایا، پھر ایک گوشت کا ٹکڑا اس دینار پر ڈال دیا جو بھن گیا۔ عمر نے کہا: ’’اے پھوپھی! تم اپنے بھتیجے کے حق میں ایسے انجام سے ڈرو۔‘‘ پھوپھی اپنا سا منہ لے کر بنو امیہ کے پاس گئیں اور کہا ’’تم عمرؓ کے خاندان میں نکاح بھی کرتے ہو اور اب اولا دنھیالی ڈھب کی ہوئی ہے تو شور بھی مچاتے ہو، اب صبر کرو۔‘‘ (یاد رہے کہ عمر بن عبدالعزیز کی والدہ عمرؓ بن خطاب کی پوتی تھیں)۔

اس کے بعد ہشام بن عبدالملک آپ کے پاس یہ تجویز لایا کہ آپ اپنے دور کے بارے میں جو چاہے فیصلہ کریں مگر آپ سے پہلے جو ہو چکا ہے اس کو جوں کا توں رہنے دیں۔ عمر نے کہا ’’میں ہر مسئلے کو جو مجھ تک لایا جائے گا خواہ وہ میرے دور کا ہو یا مجھ سے پہلے کا، کتاب اللہ کے مطابق حل کروں گا۔‘‘

آپ کے ایک بھتیجے نے آپ کو بہت سخت الفاظ میں خط لکھا اور آپ پر قطع رحمی کا الزام لگایا۔ آپ نے اسے جو جواب دیا وہ یہ تھا ’’اگر میرے پاس کافی وقت ہو تو میں خدا کا مال تم لوگوں سے لے کر پوری طرح مسلمانوں کے حوالے کر دوں اور تم اور تمہارے خاندان کے سارے کس بل نکال دوں۔ بڑی مدت تک تم لوگ زیادتی کے خوگر رہے۔ بخدا تم اس قابل ہو کہ تم لوگوں کو غلام بنا کر فروخت کر دیا جائے اور جو قیمت وصول ہو وہ بیواؤں اور یتیموں میں بانٹ دی جائے۔ اگر ایسا بھی ہو تو تم نے مسلمانوں پر جو ظلم کیے ہیں ان کی تلافی نہ ہو سکے گی۔‘‘

ناجائز ٹیکسوں کا خاتمہ

بنو امیہ سے مال واپس لینے کے بعد اب آپ بیت المال کی طرف متوجہ ہوئے۔ بیت المال میں جمع ہونے والی آمدنی کا بڑا حصہ ناجائز طریقوں سے حاصل ہوتا تھا۔ پھر اس کا استعمال بھی شریعت کے مطابق نہ ہوتا تھا۔ معاشرے کے غریب اور مسکین عموماً اس سے محروم رہ جاتے تھے۔

عمر بن عبدالعزیزؒ نے پہلا کام تو یہ کیا کہ بیت المال کی ناجائز آمدنی کا سلسلہ بند کرنے کی کوشش کی۔ آپ نے دیکھا کہ عوام پر ٹیکسوں کی بھرمار ہے۔ روپیہ بڑھانے، چاندی پگھلانے، عرائض نویسی، دوکانوں، گھروں، پن چکیوں اور نکاح تک پر ٹیکس تھا۔ آپ نے اس قسم کے تمام ٹیکس ختم کر دیئے جس سے رعایا نے سکون کا سانس لیا۔ حجاج کے زمانے میں نومسلموں سے جزیہ لینے کی بدعت رائج ہوگئی تھی۔ اس کو ختم کر دیا گیا۔ چنانچہ اس وجہ سے مصر میں بے تحاشہ لوگ مسلمان ہوئے، آمدنی گھٹ گئی اور ادھار لے کر وظائف دیئے گئے۔ عامل کی شکایت پر اس کو لکھ بھیجا کہ ’’نبی اکرم ﷺ ہادی بنا کر بھیجے گئے تھے، محصل (ٹیکس آفیسر) بنا کر نہیں۔‘‘

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہ عجیب بات ہے کہ ٹیکس ختم کرنے اور ان کی وصولی میں نرمی برتنے کے باوجود عمر بن عبدالعزیزؒ کے دور میں ٹیکسوں کی وصولی میں اضافہ ہوا۔ آپ خود فخریہ فرماتے تھے کہ: ''خدا حجاج پر لعنت کرے، اس کو نہ دین کی لیاقت تھی نہ دنیا کی۔ عمرؓ بن خطاب نے عراق سے ۱۰ کروڑ ۲۸ لاکھ درہم، زیاد نے ۱۰ کروڑ ۲۵ لاکھ درہم اور حجاج نے باوجود ظلم کے ۲ کروڑ ۸۰ لاکھ درہم وصول کیے۔ باوجود اس ویرانی کے عراق میرے قبضے میں آیا تو میں نے ۱۰ کروڑ ۲۴ لاکھ درہم وصول کیے اور اگر زندہ رہا تو عمرؓ بن خطاب کے زمانے سے بھی زیادہ وصول کروں گا''۔

عمر بن عبدالعزیزؒ کے نزدیک بیت المال کا پیسہ چونکہ امانت تھا، اس کی حفاظت کا پورا پورا انتظام کیا جانا ضروری تھا۔ آپ اس کی مکمل جانچ پڑتال کرتے۔ اگر ایک اشرفی بھی گم ہوجاتی تو اس کی بازپرس کی جاتی۔ دفتری اخراجات میں تخفیف کی گئی۔ جب آپ سے کاغذ، قلم اور روشنائی کے مصارف میں اضافے کی درخواست کی گئی تو آپ نے کہا ''قلم باریک کرلو اور سطر میں قریب قریب لکھا کرو۔ ضروریات میں کفایت شعاری سے کام لو۔ میں مسلمانوں کے خزانے سے کوئی ایسی رقم نہیں صرف کرنا چاہتا جس سے ان کو کوئی فائدہ نہ پہنچے۔'' خود آپ کے فرامین ایک بالشت سے زیادہ نہ ہوتے۔ تمام عمال کو ہدایت بھجوادی کہ کوئی عامل بڑے کاغذ پر جلی حروف سے نہ لکھے تاکہ کاغذ ضائع نہ ہوں۔

اس معاملے میں خود بھی غایت درجے کی احتیاط کا مظاہرہ کرتے۔ جب اپنا ذاتی کام ہوتا تو سرکاری شمع اٹھوا کر ذاتی چراغ جلواتے۔ سرکاری کوئلے سے گرم کیے ہوئے پانی کو وضو کرنے کے لئے جب آپ کی خدمت میں پیش کیا گیا تو آپ نے اسے واپس بھجوادیا۔ آپ کے ملازم بعض اوقات اتنی احتیاط نہ برتتے، چنانچہ ایک بار آپ کا ملازم ڈاک کے گھوڑوں پر بیٹھ کر آپ کے لئے شہد لے آیا۔ آپ نے اس کو فروخت کرکے قیمت بیت المال میں جمع کروادی۔

یہ احتیاط اپنے علاوہ اپنے گھروالوں کے لئے بھی تھی۔ ایک بار آپ کی لڑکی نے ایک موتی بھیجا کہ اس کا جوڑا بیت المال سے منگوا کر بھیج دیں تاکہ میں کانوں میں ڈالوں۔ آپ نے اس کے جواب میں آگ کی دو چنگاریاں اسے بھجوادیں۔

دوسری طرف غرباء کی فہرستیں بنیں۔ قرضداروں کے لئے ادائیگی قرض میں آسانی کے لئے خصوصی مد بنائی گئی۔ شیرخوار بچوں کے وظائف مقرر کیے گئے اور جگہ جگہ لنگر خانے کھل گئے جہاں سے فقراء اور مساکین کو کھانا ملتا تھا۔ جب مال ناجائز طریقے کے بجائے اللہ کی کتاب کے احکام کو سامنے رکھ کر معذوروں، مجبوروں اور ناداروں پر خرچ ہونے لگا تو ایک ہی سال میں صدقہ لینے والے صدقہ دینے والے بن گئے اور رعایا کی حالت سدھر گئی۔ چنانچہ اکثر روایات میں آتا ہے کہ لوگ زکوٰۃ کا مال تقسیم کرنے نکلتے تھے لیکن انہیں کوئی مستحق نہ ملتا تھا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عمال کے چناؤ میں احتیاط اور ان کا احتساب

بنوامیہ عمال کے چناؤ میں نہ صرف یہ کہ احتیاط نہ برتتے تھے بلکہ ان کو ہر قسم کی چھوٹ دے رکھی تھی۔ جب تک عمال ان کے جائز و ناجائز احکامات پر عمل کرتے رہتے وہ ان سے خوش رہتے۔ چاہے علاقے کے لوگ ان کے ظلم و جبر سے کتنے ہی تنگ کیوں نہ ہوں۔ خلیفہ بننے کے فوراً بعد آپ نے تین ایسے عمال کو معزول کر دیا جو سختی، ظلم اور رعایا کو بات بے بات سزائیں دینے میں مشہور تھے۔ حجاج کے پورے خاندان کو یمن سے جلاوطن کر دیا اور اس سے قریبی تعلق رکھنے والے عاملین کو ان کے عہدوں سے برخاست کر دیا۔ ظلم کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ عمال چیزوں کا نرخ گھٹا کر کم قیمت پر خرید لیا کرتے۔ فارس کے عہدیداروں کے بارے میں اس قسم کی شکایات عام تھیں۔ آپ نے وہاں کے عاملوں کو لکھا ''مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہارے ماتحت عہدیدار پھلوں کا تخمینہ کر کے کم قیمت پر ان کو خریدتے ہیں اور مسافروں سے عشر وصول کرتے ہیں۔ اگر مجھے یہ معلوم ہو گیا کہ یہ سب تمہاری مرضی سے ہوتا ہے یا تم اس چیز کو پسند کرتے ہو تو میں تم کو چھوڑوں گا نہیں۔''

خود آپ عاملین مقرر کرتے وقت چند باتوں کا خیال رکھتے کہ آپ کے رشتہ دار نہ ہوں، عہدے کی درخواست نہ کریں، ظالم لوگ نہ ہوں، بلکہ قرآن جاننے والے اور اس پر عمل کرنے والے ہوں۔ اپنی مشاورت کے لئے بھی آپ نے رجاء بن حیوۃ، میمون بن مہران اور اپنے لائق فائق اور زاہد بیٹے عبدالملک جیسے سمجھدار اور برگزیدہ لوگوں کو پسند کیا تھا۔

عمال کے چناؤ کے بعد مستقل ان سے رابطے میں رہتے۔ ان کو راہنمائی کے لئے خطوط لکھا کرتے اور رعایا کی طرف سے شکایات ملنے پر تحقیقات بھی کرواتے۔ جو عاملین اچھی کارکردگی نہ دکھاتے انہیں معزول کر دیا جاتا۔ آپ انہیں بھی سخت سزا دینے کے قائل نہ تھے۔ آپ کے خیال میں وہ اپنی کوتاہیوں کے بارے میں خود خدا کو جواب دیں گے۔

ذمیوں کے حقوق کی حفاظت

عمر بن عبدالعزیز نے ذمیوں کے حقوق کی طرف خاص توجہ کی۔ ان کی جان اور مال کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ جزیئے کی وصولی کے لئے ان کے ساتھ سختی برتی جاتی۔ آپ نے ذمی کے خون کی قیمت مسلمان کے خون کے برابر کر دی اور جو مسلمان کسی ذمی کے مال پر دست درازی کرتا اسے پوری سزا دی جاتی۔ عمال کو ہدایت کی گئی کہ جزیہ وصول کرتے وقت وہ کسی قسم کی سختی روا نہ رکھیں۔ محتاج ذمیوں کے بیت المال سے روزینے اور وظائف جاری کئے۔ دوسرے مسلمانوں کی طرح ذمیوں کی غصب شدہ جائیدادیں بھی واپس کر دی گئیں۔ غرض ذمیوں کا معاشرتی رتبہ بلند کر کے دیگر طبقات کے برابر کر دیا گیا جس کا ایک مظہر یہ تھا کہ مقدمات کی سماعت کے دوران

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شاہی خاندان کے افراد کو ذمیوں کے ساتھ کھڑا کیا گیا۔ ایک بار ہشام بن عبدالملک اور دوسری بار مسلمہ بن عبدالملک کو ذمی کے ساتھ کھڑا کر کے مقدمے کی سماعت کی گئی تو انہوں نے شور مچایا۔ اس پر عمر نے فرمایا کہ اگر ساتھ کھڑا ہونا اتنا ہی برا معلوم ہو رہا ہے تو اپنا وکیل کر لو۔

۳۔ اقامتِ عدل

کسی مہذب معاشرے کی جانچ کے لئے عمومی طور پر جو معیار قائم کیا جاتا ہے اس میں اقامتِ عدل کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اقامتِ عدل شریعت کا ایک ایسا مطالبہ ہے جس کو پورا کئے بغیر کوئی حکومت اسلامی حکومت کہلانے کی مستحق نہیں ہے۔ اموی دور میں اقامتِ عدل کا جو حال تھا اس کا کچھ اندازہ تو غصب شدہ جائیدادوں کے تذکرے سے ہو جاتا ہے۔ شہنشاہِ وقت کسی کو بھی ذرا سے شبہے میں بغیر مقدمہ چلائے قید کر دیتے۔ سلیمان اور اس کے عمال حریفوں کی آنکھوں میں سلائی پھیر کر ان کے ہاتھ پاؤں توڑ کر قید کر دیتے اور پھر کھانے کو بھی نہ دیتے۔ حجاج معمولی جرائم پر بے دریغ خون بہاتا۔ عمر کے لئے یہ سب کچھ ناقابل برداشت تھا۔ آپ نے گمان کی بنیاد پر بغیر ثبوت کے سزاؤں کا سلسلہ ختم کیا۔ عورتوں کو مردوں کے بدلے خون بہا میں دینے پر پابندی لگا دی۔ کچھ علاقوں میں بیگار پر کام لیا جاتا تھا۔ یہ سلسلہ یکسر بند کرا دیا۔

بنو ہاشم کے حقوق کی بحالی

بنو ہاشم کے حقوق بنو امیہ نے خوب پامال کئے تھے۔ آپ نے ان کو پورا پورا حق دلوایا۔ یہاں تک کہ امام حسینؓ کی بیٹی فاطمہ بنت حسین نے اچھا سلوک برتنے پر آپ کو شکریہ کا خط تحریر کیا۔ جیسا کہ تذکرہ کیا جا چکا ہے کہ بنو امیہ کے دور آغاز سے ہی خطبۂ جمعہ میں حضرت علیؓ کی شان میں برے الفاظ کا استعمال کیا جاتا تھا۔ عمر بن عبدالعزیز نے خلافت سنبھالتے ہی تمام عمال کے نام فرمان جاری کر دیا کہ حضرت علیؓ کے متعلق جن الفاظ کا استعمال ہو رہا ہے وہ یکسر بند کر دیئے جائیں اور اس کی جگہ کلام اللہ کی یہ آیت شامل کی:

> ''اللہ تعالیٰ عدل، احسان اور قرابت داروں کو دینے کا حکم دیتا ہے اور فحش، برائی اور ظلم سے منع کرتا ہے۔ شاید کہ تم سمجھو۔''

(یہ آیت آج تک ساری دنیا میں مسلمان اپنے جمعے کے خطبے میں پڑھتے ہیں)

جیل خانوں کی اصلاح

عمومی طور پر دیکھا گیا ہے کہ جن حکومتوں کو شہریوں کے حقوق کی بھی فکر نہ ہو ان کے ہاں کے جیل خانوں کے مکین تو بدترین سلوک کے مستحق قرار پاتے ہیں۔ عمر سے پہلے اموی دور میں جیل خانوں کا حال بہت خراب

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تھا۔ قیدی کسی اور دنیا کی مخلوق سمجھے جاتے تھے۔ ان کی صحت، کھانے پینے، صفائی اور زندگی کی بنیادی ضرورتوں کی طرف سے سنگین غفلت برتی جاتی۔ یہاں تک کہ اگر وہ مرجاتے تو ان کے کفن دفن تک کا انتظام بھی نہ کیا جاتا۔ مجبوراً قیدی خود ہی چندہ جمع کر کے یہ کام کرتے۔ عمر نے اس پورے ادارے کا احتساب کیا اور اصلاح احوال کے لئے بار بار اپنے گورنروں کو تاکید کی۔ آپ نے حکم جاری کیا کہ صاف ستھرے اور کھلے جیل خانے بنائے جائیں۔ قیدیوں کی شکایات گورنر خود سنیں۔ ان کی ضروریات پوری کرنے کے لئے رقم مختص کی جائے۔ ان کو سردیوں میں کمبل اور گرمیوں میں کرتا مہیا کیا جائے۔ ان کے بیماروں کا سرکاری خرچ پر علاج کروایا جائے۔ عورتوں کا جیل خانہ مردوں سے الگ تعمیر کیا جائے۔ کوئی قیدی مرجائے تو اسے سرکاری خرچ پر دفنایا جائے۔ رات کو اور نماز کے اوقات میں ان کو بیڑیاں نہ پہنائی جائیں۔ غرض خدا کی دیگر مخلوق کی طرح قیدیوں نے بھی عمر بن عبدالعزیز جیسے خلیفہ کے برسراقتدار آنے پر سکھ کا سانس لیا۔

احیائے شریعت

رعایا عمومی طور پر اپنے حکمرانوں کے طریقے پر چلتی ہے۔ بنوامیہ کا دور شہنشاہی رنگ لینے کے سبب مادہ پرستی کا شکار ہو چکا تھا۔ لوگوں نے عمارتوں، عورتوں اور مال و زر پر گفتگو کرنی شروع کر دی تھی۔ شریعت پر عملدرآمد اور اس کی اہمیت دن بدن کم ہوتی جا رہی تھی۔ پہلی زد عقائد پر پڑی۔ لوگوں نے عمل پر زور دینے کے بجائے بحث مباحثے میں مزا لینا شروع کر دیا تھا۔ جب قضاء وقدر کے مسئلے پر لوگ الجھنے لگے تو عمر نے ہر تدبیر سے اس کا اثر مٹانا چاہا۔ غیلان دمشقی کو جو اس فتنے کو ہوا دے رہا تھا بلا کر اس سے توبہ کروائی۔ ایک بار ایک شخص نے کوئی دقیق سا مسئلہ پوچھا۔ آپ نے اس کا جواب دینے کے بجائے اسے نصیحت کی کہ ''مکتب کے بچوں اور صحراؤں کے بدوؤں کا دین اختیار کرو۔''

عقائد کی طرح فرائض میں بھی کوتاہی برتی جانے لگی تھی۔ نماز کے اوقات کی پابندی کو نظر انداز کیا جا رہا تھا۔ آپ نے اپنے عمال کو لکھا کہ نماز کے وقت تمام کاموں کو چھوڑ دو، جو شخص نماز ضائع کرتا ہے وہ فرائض اسلام کا سب سے زیادہ ضائع کرنے والا ہے۔

ایک بار آپ کے علم میں یہ بات آئی کہ مسلمان خواتین جاہلیت کے زمانے کی طرح جنازے کے ساتھ بال بکھیرے نوحہ کرتی ہوئی نکلتی ہیں۔ آپ نے تمام عمال کو فرمان بھیجا۔ ''مجھے معلوم ہوا ہے کہ سفہاء کی عورتیں زمانۂ جاہلیت کی طرح موت کے وقت بال کھولے نوحہ کرتی ہوئی نکلتی ہیں۔ اس نوحہ اور ماتم پر قدغن لگا دو۔'' گانے بجانے کے رواج کے عام ہونے پر لکھا۔ ''اہل عجم چند چیزوں سے جنہیں شیطان نے ان کی نگاہ میں محبوب کر دیا دل بہلاتے تھے۔ مسلمانوں کو اس لہو ولعب اور راگ باجے سے روکو اور جو نہ مانے اسے اعتدال کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ساتھ سزا دو۔''

اسی طرح اہلِ عجم کے اثر سے حماموں (پبلک باتھ رومز) کا عام رواج ہو گیا تھا جن میں عورتیں اور مرد بے باکانہ غسل کرتے تھے اور پردہ اور شرم وحیا کا کوئی لحاظ نہ رکھا جاتا تھا۔ عمر نے عورتوں کو حمام جانے سے بالکل روک دیا اور مردوں کو حکم دیا کہ وہ بغیر تہبند کے حمام میں غسل نہ کریں۔ حمام کی دیواروں پر خلافِ شریعت تصویروں کا رواج ہو گیا تھا۔ آپ نے ان کو مٹانے کا حکم دیا۔ ایک بار اس طرح کی چند تصویروں کو خود اپنے ہاتھ سے مٹا دیا اور فرمایا کہ اگر مصور کا نام معلوم ہوتا تو اس کو سزا دیتا۔

دوسرے تعیشات کے ساتھ ساتھ شراب نوشی کا رواج بھی ہو چلا تھا۔ بعض حیلہ باز نبیذ کے بہانے سے شراب پیتے تھے۔ پھر بدمست ہو کر منکرات کا ارتکاب کرتے تھے۔ اگر انہیں منع کیا جاتا تو کہتے اس میں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ آپ نے اس کے انسداد کا پورا انتظام کیا اور عمال کو فرمان جاری کیا کہ کوئی ذمی مسلمانوں کے شہروں میں شراب نہ لانے پائے۔ شراب کی دکانوں کو حکماً بند کر دیا۔

تدوینِ حدیث

عمر بن عبدالعزیزؒ خود بھی عالم تھے اور علم کی قدر و قیمت سے واقف تھے۔ آپ کو خدشہ ہوا کہ کہیں علماء کے دنیا سے اٹھ جانے کے سبب احادیث کا علم مٹ نہ جائے۔ چنانچہ مدینہ کے گورنر قاضی ابوبکر کو احادیث کے جمع کرنے کا حکم دیا اور جمع شدہ احادیث کو تمام سلطنت اسلامی میں بھجوا دیا گیا۔ ایک روایت کے مطابق احادیث کے دفتر کے دفتر لکھے گئے۔ یہ تدوینِ حدیث کی پہلی سرکاری کوشش تھی۔

رعایا کی فلاح و بہبود

عمر کے دور میں عوام کی فلاح و بہبود کے لئے کثرت سے منصوبے تیار کئے گئے۔ سرائیں تعمیر کی گئیں۔ خصوصی ہدایت کی گئی کہ جو مسلمان ادھر سے گذرے ایک روز اس کی میزبانی کی جائے اور اس کی سواری کی حفاظت کی جائے۔ لنگر خانوں سے فقیروں اور مساکین کے لئے کھانے کا بندوبست کیا گیا۔ سرکاری چراگاہوں کو عام استعمال کے لئے کھول دیا گیا۔

فتوحات

عمر بن عبدالعزیزؒ کے دور میں کوئی یادگار فتوحات نہ ہوئیں۔ آپ ان حکمرانوں میں سے تھے جنہیں ہمہ وقت اپنی سلطنت بڑھانے کی فکر کے بجائے داخلی اصلاح کی پڑی رہتی۔ البتہ جو مہمات پہلے سے درپیش تھیں وہ پایۂ تکمیل تک پہنچیں۔ اسی زمانے میں مسلمانوں نے جنوبی فرانس کا بہت سا حصہ فتح کیا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عمر بن عبدالعزیزؒ کی خوش قسمتی تھی کہ آپ خون بہانے سے جتنا ڈرتے تھے اتنا ہی آپ کا دور اندرونی خلفشار اور خانہ جنگیوں سے خالی نظر آتا ہے۔ یہاں تک کہ خارجی فرقہ جو ہر حکومت کے خلاف تھا اور اس کا وجود امنِ عامہ کے لئے ہمیشہ ہی خطرے کا باعث رہتا، آپ نے ان سے بھی صلح کی گفتگو کی اور ان کے مقابلے پر تلوار روک لی۔ والیٔ کوفہ کو لکھا کہ جب تک یہ لوگ خود شورش نہ کریں ان سے کوئی تعرض نہ کیا جائے اور ان سے بات چیت کے لئے کسی دانشمند آدمی کو مقرر کیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی آپ نے ان کے سردار کو اس شرط پر دعوتِ مناظرہ دی کہ جو فریق بھی حق پر ہوگا اس کی بات مان لی جائے گی۔ ان تمام کوششوں کے باوجود آپ کے آخری ایام میں خارجی اپنی پرانی روش پر آ گئے تو آپ نے والیٔ کوفہ کو ان شرائط کے ساتھ ان سے مقابلے کی اجازت دی کہ عورتیں، بچے اور قیدی قتل نہ کئے جائیں۔ زخمیوں کا تعاقب نہ کیا جائے۔ فتح کے بعد جو مالِ غنیمت ہاتھ آئے وہ خوارج کے اہل وعیال کو واپس کر دیا جائے اور قیدی صرف اس وقت تک قید میں رہیں جب تک وہ راہ راست پر نہ آ جائیں۔

وفات

ابھی آپ کی اصلاحات کا عمل جاری تھا کہ رجب ۱۰۱ ہجری میں آپ بیمار پڑے۔ ایک روایت کے مطابق آپ کی علالت طبعی تھی، جبکہ دوسری روایت کے مطابق بنو امیہ نے اس خوف سے کہ آپ کے اقدامات اور اصلاحات کے نتیجے میں ان کا اقتدار ہمیشہ کے لئے چھن جائے گا، آپ کے ایک خادم کو ایک ہزار اشرفی دے کر زہر دلوا دیا۔ آپ کو دورانِ علالت اس کا علم ہو گیا۔ لیکن آپ نے کسی قسم کا انتقام نہ لیا، بلکہ اشرفیاں بیت المال میں جمع کرا کے غلام کو آزاد کر دیا۔

چند روز بیمار رہے۔ جب زندگی کی کوئی امید نہ رہی تو آپ کے سالے مسلمہ بن عبدالملک آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا ''امیرالمومنین آپ نے مال ودولت سے ہمیشہ اپنی اولاد کا منہ خشک رکھا اور انہیں بالکل خالی ہاتھ چھوڑے جاتے ہیں۔ ان کے متعلق مجھے یا خاندان کے کسی فرد کو کچھ وصیت کرتے جائیے۔''

فرمایا ''تم کہتے ہو ان کے متعلق کسی کو وصیت کرتا جاؤں تو اس معاملے میں میرا وصی اور ولی میرا خدا ہے جو صلحاء کا وصی ہوتا ہے۔ میرے لڑکے اگر خدا سے ڈریں گے تو خدا ان کے لئے کوئی سبیل نکال دے گا اور اگر وہ گناہ میں مبتلا ہوں گے تو مال دے کر ان کو گناہ کے لئے اور قوی نہ بناؤں گا۔'' پھر اپنے بیٹوں کو بلایا اور پرنم آنکھوں سے انہیں خطاب کرتے ہوئے کہا:

> ''میری جان ان نوجوانوں پر قربان جن کو میں نے مفلس اور محتاج چھوڑا، لیکن خدا کا شکر ہے میں نے انہیں اچھی حالت میں چھوڑا ہے۔ تم کسی عرب یا ذمی سے نہ ملو گے جس کا تم پر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حق ہو۔ بچو! دو باتوں میں سے ایک بات تمہارے باپ کے اختیار میں تھی۔ ایک یہ کہ تم دولت مند بن جاؤ اور تمہارا باپ دوزخ میں چلا جائے۔ دوسری یہ کہ تم تہی دست رہو اور وہ جنت میں جائے۔ یہ آخری بات اس نے اختیار کی۔ خدا تم کو محفوظ رکھے۔ وہی تمہیں روزی پہنچائے گا۔''

وفات سے قبل بار بار یہ آیات تلاوت کرتے رہے۔ ''یہ آخرت کا گھر ہم ان لوگوں کے لئے بناتے ہیں جو زمین میں نہ تفوق چاہتے ہیں نہ فساد کرتے ہیں اور عاقبت صرف پرہیزگاروں کے لئے ہے۔'' جب نزع کا عالم طاری ہوا تو سب کو کمرے سے باہر کر دیا۔ دروازے پر آپ کی بیوی اور مسلمہ بیٹھے تھے۔ ان کے کان میں یہ آواز آئی۔ ''کیا مبارک چہرے ہیں، جو نہ آدمیوں کے ہیں نہ جنوں کے۔'' مسلمہ نے اپنی بہن سے کہا کہ انتقال ہو گیا۔ جا کے دیکھا تو روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔ جمعے کے روز رجب ۱۰۱ ہجری کو انتقال ہوا۔ اس وقت آپ کی عمر ۳۹/۴۰ سال کی تھی۔ دیر سمعان کے علاقے میں دفن کیے گئے۔ مدت خلافت دو سال پانچ مہینے تھی۔

وفات کے وقت آپ کے گیارہ بیٹے تھے جن کے لئے آپ نے سترہ دینار چھوڑے جن میں سے پانچ دینار کفن پر اور دو دینار قبر پر خرچ آیا۔ ہر بچے کے حصے میں ایک دینار بھی نہ آیا۔ ہشام بن عبدالملک جو آپ کا چچا تھا، آپ کے بعد خلیفہ ہوا۔ اس کے بھی گیارہ لڑکے تھے۔ جن کو دس دس لاکھ کا ترکہ ملا۔ لیکن آپ کے ایک بیٹے کو بعد میں دیکھا گیا کہ اس نے اللہ کی راہ میں ایک دن میں سو گھوڑے دیئے اور ہشام کی اولاد میں ایک کو اس حالت میں دیکھا گیا کہ وہ صدقہ مانگا کرتا تھا۔ اس طرح عمر بن عبدالعزیز کی وہ بات پوری ہوئی کہ اللہ آپ کی اولاد کا وصی ہو گا۔

اوصافِ حمیدہ

۱۔ خشیتِ الٰہی

عمر بن عبدالعزیز کی زندگی میں جو چیز سب سے زیادہ غالب نظر آتی ہے وہ خوف خدا ہے۔ خدا کی ناراضگی، اس کے عذاب اور اس کی دی ہوئی مہلت ختم ہونے سے ڈرتے رہتے۔ آپ کی بیوی کا بیان ہے ''وہ نہ نماز میں اور نہ روزے میں اور لوگوں سے بڑھ کر تھے، البتہ ان سے زیادہ کوئی شخص خدا سے نہ ڈرتا تھا۔ وہ اپنے بستر پر بھی جب خدا کو یاد کرتے تو کانپنے لگتے۔'' اس خوف سے آپ کو رات بھر نیند نہ آتی۔ ایک بار اپنے ساتھی سے تذکرۂ رات بھر جاگنے کا ذکر کیا۔ اس نے وجہ پوچھی تو فرمایا ''میں قبر اور اہلِ قبر کے احوال پر غور کرتا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رہا کہ اگر مردے کو تین دن بعد قبر میں دیکھا جائے تو وحشت ہو، کیڑے رینگ رہے ہوں اور پیپ بہہ رہی ہو۔'' یہ کہا اور پھر شدّتِ خوف سے بے ہوش ہو گئے۔

عمر موت کو اتنا یاد کرتے کہ آپ کے ہم عصر یزید بن خوشب کہتے ہیں ''میں نے عمر اور حسن بصری سے زیادہ موت سے ڈرنے والا کوئی نہ دیکھا۔ انہیں موت سے ڈرتے دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ جیسے آگ انہی دونوں کے لئے پیدا کی گئی ہے۔''

۲- خاکساری و عاجزی

آپ کی ایک خصوصیت آپ کی طبیعت کی خاکساری تھی۔ یہ عاجزی و انکساری خلافت کے بعد نمایاں ہوئی۔ اس کی بہت سی مثالیں ہمیں آپ کی زندگی میں نظر آتی ہیں۔ ایک بار لوگ آپ کے سامنے کھڑے ہوئے تو فرمایا ''لوگو! اگر تم کھڑے رہو گے تو ہم بھی کھڑے ہو جائیں گے اور اگر بیٹھو گے تو ہم بھی بیٹھیں گے۔ لوگوں کو صرف خدا کے سامنے کھڑا ہونا چاہئے۔''

اسی طرح ایک بار رات کو رجاء بن حیوٰۃ ملنے آئے تو چراغ بجھ گیا۔ قریب ہی ملازم سو رہا تھا۔ رجاء نے کہا کہ اس کو جگا نہ دوں۔ بولے سونے دو۔ انہوں نے کہا۔ میں خود اٹھ کر چراغ ٹھیک کروں۔ فرمایا مہمان سے کام لینا مروت کے خلاف ہے۔ بالآخر چادر رکھ کر خود ہی اٹھے۔ برتن سے زیتون کا تیل لیا اور چراغ کو ٹھیک کر کے پلٹے۔ پھر کہا ''جب میں اٹھا تھا تب بھی عمر بن عبدالعزیز تھا اور جب لوٹا تب بھی عمر بن عبدالعزیز ہوں۔''

ایک بار آپ کی لونڈی پنکھا جھلتے جھلتے سو گئی تو آپ اس کو پنکھا جھلنے لگے۔ وہ اٹھی تو بہت شرمندہ ہوئی۔ آپ نے کہا: ''تو بھی میری طرح انسان ہے۔ میں نے چاہا کہ جس طرح تو نے مجھے پنکھا جھلا میں بھی تجھے جھل دوں''۔

۳- عفو و درگزر

عمرؒ کی طبیعت میں حلم وعفو و درگزر کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ ایک بار رات کو مسجد میں گئے۔ ایک شخص سو رہا تھا۔ اندھیرے میں آپ کے پاؤں کی ٹھوکر اسے لگ گئی۔ اس نے جھلا کر کہا ''کیا تم پاگل ہو؟'' بولے ''نہیں۔'' ملازم نے اس گستاخی پر اس کو سزا دینی چاہی لیکن آپ نے اسے روک دیا اور کہا: ''اس نے مجھ سے صرف یہ پوچھا تھا کہ تم پاگل ہو، میں نے جواب دیا کہ نہیں۔'' اسی طرح کا ایک اور واقعہ ملتا ہے کہ ایک بار کئی گھنٹے کام

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کرنے کے بعد آپ قیلولہ کرنے کے لئے اٹھے تو ایک آدمی کاغذات لئے ہوئے آپ کی طرف بڑھا۔ بداحتیاطی کی وجہ سے کاغذات کا پلندہ آپ کے منہ پر جا گرا۔ رخساروں پر چوٹ لگی اور خون جاری ہوگیا۔ لیکن آپ نے نہایت خاموشی کے ساتھ اس کی عرضی پڑھی اور اس کی حاجت کو پورا کیا۔

۴-صبر و برداشت

عمر بن عبدالعزیزؒ کے اندر حد درجہ صبر تھا۔ آپ پر ایک زمانہ ایسا سخت آیا کہ سب سے لائق بیٹے عبدالملک، سب سے عزیز بھائی سہل بن عبدالعزیز اور سب سے وفادار خادم مزاحم نے چند ہی دنوں کے وقفے سے انتقال کیا۔ لوگ تعزیت کے لئے آتے تو آپ کو ہمیشہ صابر و شاکر ہی پاتے۔ ایک بار ربیع آپ کے پاس آئے اور اظہار افسوس کرنے لگے۔ یہ سن کر عمر بن عبدالعزیز نے گردن جھکا لی۔ ربیع کے پاس ایک شخص بیٹھا تھا۔ اس نے کہا تم نے امیر المومنین کو بے قرار کردیا۔ اس پر عمر کہنے لگے۔ ''اس ذات کی قسم جس نے ان کی موت کا فیصلہ کیا۔ میں یہ نہیں پسند کرتا کہ یہ واقعات نہ ہوتے۔'' آپ نے تمام سلطنت میں یہ حکم بھیج دیا کہ اس سلسلے میں کسی قسم کا ماتم نہ کیا جائے۔

۵-سادگی

خلافت کے بعد عمر بن عبدالعزیزؒ کی زندگی میں جو انقلاب رونما ہوا، اس کا تذکرہ پہلے گذر چکا ہے۔ آپ نے سادہ طرز زندگی کو اختیار کیا۔ آپ کا لباس انتہائی معمولی درجے کا ہوتا۔ قمیض کے گریبان کے آگے اور پیچھے دونوں طرف پیوند لگے ہوتے۔ ایک چادر چھ چھ ماہ تک چلاتے۔ وہی ہر جمعے کو دھو کر پہن لیتے۔ ایک روز جمعے کے دن مسجد جانے میں دیر ہوئی۔ کسی نے وجہ پوچھی تو بولے کہ غلام کپڑے دھونے کو لے گیا تھا اور اس کے سوا کوئی دوسرا کپڑا نہ تھا۔ مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو آپ کے سالے مسلمہ آپ کی عیادت کو آئے۔ دیکھا تو ایک میلی پھٹی ہوئی قمیض پہنی ہوئی تھی۔ انہوں نے آپ کی بیوی فاطمہ سے کہا کہ آپ کی قمیض کو دھو ڈالا جائے۔ دوسرے روز جب وہ پہنچے تو دیکھا کہ آپ نے پھر وہی قمیض پہنی ہے۔ بولے میں نے تم کو قمیض اس لئے دھونے کو کہا تھا کہ لوگ عیادت کو آتے ہیں۔ بولیں اس کے سوا ان کے پاس کوئی قمیض ہی نہیں۔

کھانے میں بھی اسی طرح سادگی برتتے۔ ایک بار آپ کا ملازم کھانے کو دیکھ کر بڑبڑانے لگا کہ روز روز کی دال سے طبیعت بھر گئی ہے۔ آپ کی بیوی فاطمہ بولیں۔ تمہارے آقا بھی تو یہی کھاتے ہیں۔ بلکہ انہوں نے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خلافت کے بعد تو اکثر یہ بھی پیٹ بھر کر نہ کھائی۔ غذا اور رزقِ حلال کے بارے میں آپ کے نقطۂ نظر کا اندازہ اس واقعے سے ہوتا ہے کہ جب خاندان کے چند لوگ آپ کے پاس آئے تو آپ نے باورچی سے کہا کہ کھانے میں جلدی نہ کرنا۔ جب دن چڑھ گیا اور لوگ بھوک سے بے تاب ہونے لگے تو اس نے ستو اور کھجوریں ان کے سامنے رکھ دیں۔ یہ کھا کر ان کا پیٹ بھر گیا تو ملازم کھانا لے آیا۔ انہوں نے انکار کیا کہ اب گنجائش نہیں ہے۔ اس پر عمر بولے۔ ''تو پھر آگ کیوں کھاتے ہو'' یعنی جب سادہ غذا انسان کے پیٹ بھرنے کو کافی ہے تو وہ ناجائز معاش کیوں اختیار کرے۔

آپ کے گھر میں ساز و سامان کی اتنی کمی تھی کہ ایک عراقی عورت نے جو اپنی بیٹیوں کے لئے وظائف کی خواہاں تھی، آپ کے خالی گھر کو دیکھ کر تعجب کا اظہار کیا۔ اس پر آپ کی بیوی نے کہا ''تم ہی جیسے لوگوں کے گھروں کی آبادی نے ہمارے گھر کو ویران کر دیا ہے۔''

عمرؒ رات گئے تک خلافت کے کاموں میں مصروف رہتے۔ پھر کچھ گھڑی بستر پر لیٹتے تو قرآن کی آیات دہراتے رہتے اور بے قراری بڑھتی جاتی۔ آپ کی بیوی کا بیان ہے کہ ایک بار جب آپ نماز کی حالت میں یہ آیت پڑھ رہے تھے ''جس دن لوگ مثل پھیلے ہوئے پروانوں کے اور پہاڑ دھنکی ہوئی اون کے ہوں گے'' تو مارے خوف اور دہشت کے بار بار گرتے۔ ایک بار تو انہیں خدشہ ہوا کہ آپ دم توڑ چکے ہیں۔ آپ نے گھر کا ایک حصہ عبادت کے لئے مخصوص کر رکھا تھا۔ رات بھر وہیں بیٹھے دعائیں اور آہ و زاری کرتے رہتے۔ نماز کے لئے اتنے مستعد رہتے کہ اگر موذن کو اذان دینے میں ذرا بھی تاخیر ہو جاتی تو اس کو پیغام بھجواتے کہ نماز کا وقت ہو گیا ہے۔ انس کہتے ہیں ''میں نے ان سے زیادہ کسی کو رسول اللہ ﷺ کے مشابہ نماز پڑھتے نہ دیکھا'' سنتِ رسول کی اتباع میں آپ ہمیشہ پیر اور جمعرات کا روزہ رکھتے۔

۶- حبِ رسول ﷺ وحبِ اہلِ بیت

نبی کریم ﷺ سے بے اندازہ محبت تھی۔ اگر آپ ﷺ کی کوئی یادگار مل جاتی تو اسے سر آنکھوں پر رکھتے۔ رسول اکرم ﷺ نے ایک صحابی کو جاگیریں دی تھیں اور ان کے متعلق ایک سند لکھ دی تھی۔ اس خاندان کے ایک شخص نے آپ کو لا کر دکھائی تو اسے چوم کر آنکھوں سے لگانے لگے۔ نبی اکرم ﷺ کے خاندان سے لگاؤ اور ان سے خصوصی سلوک اسی تعلق کی بناء پر تھا۔ آپ سے پہلے بنو امیہ نے سادات کے ساتھ کیا کیا ظالمانہ سلوک نہ کیا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لیکن عمر کا حال یہ تھا کہ ایک بار ایک غلام جو بنی ہاشم کے غلاموں سے تھا وظیفے کی غرض سے حاضر ہوا۔ جب اس نے علیؓ بن ابی طالب کا نام لیا تو آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور کہا میں خود علیؓ کا غلام ہوں۔ خود رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ میں جس کا مولیٰ ہوں علی بھی اس کے مولیٰ ہیں۔ پھر اس کو ولایتِ علیؓ کی بناء پر خوب نوازا۔

اسی طرح ایک بار خاندان بنوامیہ کی بہت سے لوگ دروازے پر منتظر تھے۔ لیکن آپ نے سب سے پہلے عبداللہ بن عباس کے غلام کو بلایا تو آپ کے چچا کے بیٹے ہشام نے کہا ''عمر کو سب کچھ کر کے اب بھی تسکین نہیں ہوئی کہ ابن عباس کے ایک غلام کو موقع دیتے ہیں کہ ہماری گردن پھاند کر چلا جائے۔''

نبی اکرم ﷺ سے تعلق کی بنیاد پر مدینہ سے زبردست لگاؤ تھا۔ جب وہاں سے شام کو چلے تو اس کی طرف باچشم تر مڑ کے دیکھا اور اپنے غلام مزاحم سے کہا ''کہیں ہم ان لوگوں میں سے تو نہیں ہیں جن کو مدینے نے پھینک دیا ہے۔'' اس میں اس حدیث رسول کی طرف اشارہ ہے جس میں رسول اکرم ﷺ نے فرمایا ''مدینہ ایک بھٹی ہے جو میل کچیل کو پھینک دیتی ہے اور خالص چیز کو پاکیزہ بنا دیتی ہے۔''

الغرض عمر بن عبدالعزیزؒ کی زندگی زہد و تقویٰ سے عبارت تھی۔ آپ کو دینداروں کے طبقے میں برتری اس وجہ سے حاصل ہے کہ دنیاداری (بادشاہت) نبھاتے ہوئے جو چیز اکثریت کو خدا سے دور کر دیتی ہے (یعنی اقتدار) وہ آپ کو خدا سے قریب کرنے کا باعث بنی۔ قیامت کے دن امید ہے کہ آپ کو عادل بادشاہ کی حیثیت سے خدائے رحمٰن کے عرش کے سائے تلے اونچا مقام حاصل ہوگا۔ اس دن جب اس کے سوا کوئی سایہ نہ ہوگا۔

محمد بن معبد کا بیان ہے کہ میں شاہِ روم کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس کو زمین پر نہایت رنج و غم کی حالت میں بیٹھا ہوا پایا۔ میں نے پوچھا کیا حال ہے؟ بولا مردِ صالح کا انتقال ہو گیا۔ میں نے کہا وہ کون؟ بولا عمر بن عبد العزیز۔ پھر کہا:

> ''اگر عیسیٰؑ کے بعد کوئی مُردوں کو زندہ کر سکتا تو عمر بن عبدالعزیز ہی کر سکتے تھے۔ مجھے اس راہب کی حالت پر کوئی تعجب نہیں جس نے اپنے دروازے کو بند کر کے دنیا کو چھوڑ دیا اور عبادت میں مشغول ہو گیا۔ مجھے اس شخص کی حالت پر تعجب ہے جس کے پاس دنیا ذلیل ہو کر آئی اور اس نے اسے پائے حقارت سے ٹھکرا دیا''۔

عمر بن عبدالعزیز کی وفات کے بعد جب عبدالملک بن مروان کا بیٹا یزید تخت نشین ہوا تو اس نے تمام

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اصلاحات کو منسوخ کر کے پرانا نظام جاری کر دیا۔ اس طرح ملوکیت کو خلافت میں بدلنے کی آپ کی کوشش صرف آپ کے دور تک محدود رہی۔ کہا جاتا ہے کہ ابتداء میں یزید نے عمر بن عبدالعزیز کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی، مگر چالیس روز سے زیادہ اس کی ہمت نہ کر سکا۔ اس کے لئے جس درجے کی ریاضت مطلوب تھی وہ اس کے بس کی بات نہ تھی۔

ہوئی نہ عام جہاں میں کبھی حکومتِ عشق
سبب یہ ہے کہ محبت زمانہ ساز نہیں

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اتفاقی واقعہ ایسا پیش آیا جس نے آپ کے ارادے کو اور مضبوط کر دیا۔

ابوحنیفہؒ ایک دن بازار جا رہے تھے۔ امام شعبیؒ جو کوفہ کے مشہور امام تھے ان کا گھر راستے میں تھا۔ انہوں نے نوجوان طالب علم سمجھ کر پوچھا: ''کہاں جا رہے ہو''؟ آپ نے ایک سوداگر کا نام لیا۔ امام شعبیؒ نے کہا: ''مجھ کو تم میں قابلیت کے جوہر نظر آتے ہیں۔ تم علماء کی صحبت میں بیٹھا کرو''۔ یہ بات آپ کے دل میں بیٹھ گئی اور حصول علم کے لئے سنجیدہ ہو گئے۔

علمی مجالس اور تعلیم

ابتداء میں طبیعت علم الکلام کی طرف راغب ہوئی۔ خود فرماتے ہیں:

> ''آغازِ عمر میں اس علم کو سب سے افضل جانتا تھا کیونکہ مجھ کو یقین تھا کہ عقیدہ و مذہب کی بنیاد انہی باتوں پر ہے لیکن پھر خیال آیا کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ان بحثوں سے ہمیشہ الگ رہے''۔

اندازاً چھ سال تک علماء کی تقاریر، بحث اور مناظروں میں شرکت کی۔ پھر خود بھی اس فن کے ماہر ہو گئے لیکن جیسا کہ خود آپ کے قول سے ظاہر ہے کہ طبیعت میں بتدریج اس علم کی طرف سے رغبت کم ہو گئی تھی۔ پھر ایک اتفاقی واقعے نے آپ کو ایک مختلف راہ پر ڈال دیا۔

ایک دن ایک عورت نے آکر پوچھا کہ شریعت کے مطابق طلاق دینے کا کیا طریقہ ہے؟ ابوحنیفہ کہتے ہیں: مجھے جواب تو معلوم نہ تھا، اس عورت کو امام حماد کے حلقۂ درس کے بارے میں بتایا جو وہاں سے قریب ہی تھا اور ساتھ میں ہدایت کی کہ واپسی پر مجھے بھی بتانا کہ حماد نے کیا جواب دیا۔ اس عورت کے جانے کے بعد سخت افسوس ہوا کہ بال سے زیادہ باریک مسائل پر تو نظر ہے اور ایک معمولی دینی مسئلے کا علم نہیں۔ چنانچہ اسی وقت کھڑے ہوئے اور حماد کے حلقۂ درس میں جا بیٹھے۔

سنہ ۱۰۲ ہجری میں جب آپ کی عمر بائیس سال تھی آپ حماد کی مجلس فقہ میں حاضر ہونے لگے۔ ابتداء میں جب حلقۂ درس میں شامل ہوئے تو بائیں صف میں جا بیٹھے جو نئے آنے والوں کے لئے مخصوص تھی، مگر چند ہی روز میں امام حماد کو اندازہ ہوا کہ آپ قوی الحافظہ بھی ہیں اور ذہانت اور سمجھداری کا جوہر بھی موجود ہے چنانچہ استاذ نے آپ کو سب سے آگے بیٹھنے کی ہدایت کی۔

اساتذہ

آپ کے اولین استاذ حماد کوفہ کے مشہور امام اور علم فقہ کے ماہر تھے۔ انہوں نے حضرت انسؓ سے احادیث

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اتفاقی واقعہ ایسا پیش آیا جس نے آپ کے ارادے کو اور مضبوط کر دیا۔

ابوحنیفہؒ ایک دن بازار جارہے تھے۔ امام شعبی جو کوفہ کے مشہور امام تھے ان کا گھر راستے میں تھا۔ انہوں نے نوجوان طالب علم سمجھ کر پوچھا: ''کہاں جارہے ہو''؟ آپ نے ایک سوداگر کا نام لیا۔ امام شعبیؒ نے کہا: ''مجھ کو تم میں قابلیت کے جوہر نظر آتے ہیں۔ تم علماء کی صحبت میں بیٹھا کرو''۔ یہ بات آپ کے دل میں بیٹھ گئی اور حصول علم کے لئے سنجیدہ ہو گئے۔

علمی مجالس اور تعلیم

ابتداء میں طبیعت علم الکلام کی طرف راغب ہوئی۔ خود فرماتے ہیں:

''آغاز عمر میں اس علم کو سب سے افضل جانتا تھا کیونکہ مجھ کو یقین تھا کہ عقیدہ و مذہب کی بنیاد انہی باتوں پر ہے لیکن پھر خیال آیا کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ان بحثوں سے ہمیشہ الگ رہے''۔

اندازاً چھ سال تک علماء کی تقاریر، بحث اور مناظروں میں شرکت کی۔ پھر خود بھی اس فن کے ماہر ہو گئے لیکن جیسا کہ خود آپ کے قول سے ظاہر ہے کہ طبیعت میں بتدریج اس علم کی طرف سے رغبت کم ہو گئی تھی۔ پھر ایک اتفاقی واقعے نے آپ کو ایک مختلف راہ پر ڈال دیا۔

ایک دن ایک عورت نے آ کر پوچھا کہ شریعت کے مطابق طلاق دینے کا کیا طریقہ ہے؟ ابوحنیفہ کہتے ہیں: مجھے جواب تو معلوم نہ تھا، اس عورت کو امام حماد کے حلقۂ درس کے بارے میں بتایا جو وہاں سے قریب ہی تھا اور ساتھ میں ہدایت کی کہ واپسی پر مجھے بھی بتانا کہ حماد نے کیا جواب دیا۔ اس عورت کے جانے کے بعد سخت افسوس ہوا کہ بال سے زیادہ باریک مسائل پر تو نظر ہے اور ایک معمولی دینی مسئلے کا علم نہیں۔ چنانچہ اسی وقت کھڑے ہوئے اور حماد کے حلقۂ درس میں جا بیٹھے۔

سنہ ۱۰۲ ہجری میں جب آپ کی عمر بائیس سال تھی آپ حماد کی مجلس فقہ میں حاضر ہونے لگے۔ ابتداء میں جب حلقۂ درس میں شامل ہوئے تو بائیں صف میں جا بیٹھے جو نئے آنے والوں کے لئے مخصوص تھی، مگر چند ہی روز میں امام حماد کو اندازہ ہوا کہ آپ قوی الحافظہ بھی ہیں اور ذہانت اور سمجھداری کا جوہر بھی موجود ہے چنانچہ استاذ نے آپ کو سب سے آگے بیٹھنے کی ہدایت کی۔

اساتذہ

آپ کے اولین استاذ حماد کوفہ کے مشہور امام اور علم فقہ کے ماہر تھے۔ انہوں نے حضرت انسؓ سے احادیث

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سنی تھیں۔ اس کے علاوہ بڑے رتبے کے تابعین سے بھی استفادہ کیا تھا۔ حماد علم فقہ میں ابراہیم نخعی کے شاگرد تھے جو علقمہ کے بعد مسند درس پر بیٹھے۔ علقمہ حضرت عبداللہؓ بن مسعود کے خاص شاگرد تھے اور حضرت عبداللہؓ بن مسعود کو فقہ کے میدان میں صحابہ میں ممتاز حیثیت حاصل تھی۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں انہوں نے کوفہ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔

امام ابوحنیفہ کے بارے میں ایک رائے یہ ہے کہ آپ حدیث کے علم میں مہارت نہ رکھتے تھے۔ ہمارے نزدیک یہ رائے محل نظر ہے کیونکہ قرآن و حدیث فقہ کے بنیادی مآخذ ہیں۔ اگر ایک فقیہہ ان علوم پر دسترس نہیں رکھتا تو وہ فقہ و فتاوی کا کام کس طرح انجام دے سکتا ہے؟ امام صاحب کے اساتذہ کی فہرست کو اگر دیکھا جائے تو اندازہ ہوگا کہ یہ سب بڑے پائے کے محدث تھے۔ خود کوفہ میں علم حدیث کا چرچا بہت تھا۔ لہٰذا یہ بات یقینی ہے کہ امام ابوحنیفہ نے شیوخ کی کثیر تعداد سے علم حدیث حاصل کیا۔ امام شافعیؒ نے تو اس فن میں ترانوے اشخاص کے نام گنوائے ہیں۔ ایک نظر امام صاحب کے اساتذہ کو دیکھ لیتے ہیں جن میں سے اکثر حدیث کے ماہر تھے۔

امام شعبیؒ: یہ وہی بزرگ ہیں جن کی تحریک پر امام صاحب حصولِ علم کی طرف متوجہ ہوئے۔ شعبی نے متعدد صحابہ کو دیکھا اور بہت سے صحابہ سے احادیث روایت بھی کیں۔

سلمہ بن کہیلؒ: سلمہ مشہور محدث تھے۔ آپ کو تابعی ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔ ابن سعد نے آپ کو کثیر الحدیث لکھا ہے۔ آپ کوفہ میں صحیح الروایۃ سمجھے جاتے تھے۔

ابو اسحٰق سبعیؒ: یہ بھی بلند پایہ تابعی تھے۔ حضرات عبداللہ بن عباسؓ، ابن عمرؓ، ابن زبیرؓ اور زید بن ارقمؓ کے علاوہ ۲۸ صحابہ سے حدیث سنی تھی۔

سماک بن حربؒ: آپ حدیث کے بہت بڑے عالم تھے۔ حدیث کی صحیح روایت کے لئے مشہور تھے۔ اسّی صحابہ کرام سے اپنی ملاقات کا حال بیان کرتے تھے۔

ہشام بن عروہؒ: مشہور تابعی اور اونچے درجے کے محدث تھے۔ بڑے بڑے محدثین آپ کے شاگرد تھے۔ امام مالک، سفیان ثوری اور سفیان بن عیینہ آپ کے تلامذہ میں سے ہیں۔

قتادہؒ: قتادہ حضرت انسؓ بن مالک کے مشہور شاگرد تھے۔ اللہ نے انہیں زبردست قوتِ حفظ عنایت کی تھی۔ اس لئے احفظ الناس کہلاتے تھے۔ ان کے اساتذہ بھی ان کی اس صلاحیت سے بہت متاثر تھے۔

شعبہؒ: شعبہ دو ہزار حدیثوں کے حافظ تھے اور فنِ حدیث کے ماہر جانے جاتے تھے۔ عراق میں یہ پہلے شخص تھے جنہوں نے جرح و تعدیل کے مراتب مقرر کئے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آخر الذکر دونوں اساتذہ بصرہ میں مقیم تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام ابوحنیفہ نے علم حدیث کے لئے کوفہ کے علاوہ بصرہ کا بھی رخ کیا۔ علاوہ ازیں یہ بھی ثابت ہے کہ آپ نے مکہ اور مدینہ کے علماء سے بھی فیض اٹھایا۔ مکے میں عطاء بن ابی رباح آپ کے استاد تھے (جنہیں دو سو صحابہ کرام سے ملاقات کا شرف حاصل تھا) جن کے حلقۂ درس سے بڑے بڑے محدثین مستفید ہوئے۔ ان کے علاوہ عکرمہ (حضرت عبداللہ بن عباس کے غلام اور شاگرد) سے حدیث کی سند لی۔ مدینہ میں امام باقر اور ان کے بیٹے امام جعفر صادق سے فقہ و حدیث کے متعلق بہت سی مفید باتیں سیکھیں۔

امام ابوحنیفہ کے بارے میں مشہور ہے کہ آپ نے ۵۵ حج ادا کئے۔ اس زمانے میں حج کا موقع طالبانِ علم کے لئے بہت خاص حیثیت رکھتا تھا۔ دنیائے اسلام سے بڑے بڑے علماء تشریف لاتے، ان کی علمی صحبتیں حج کے بعد مہینوں تک جاری رہتیں۔ امام صاحب نے اپنے زمانے کے جید علماء سے ان مواقع پر ملاقات کی اور فائدہ اٹھایا یہاں تک کہ امام مالکؒ جو عمر میں آپ سے چھوٹے تھے ان کے درس میں بھی شریک ہوئے۔ امام اوزاعی اور مکحول شامی جو کہ شام کے امام المذاہب تھے ان سے بھی مکہ میں ہی حدیث کی سند حاصل کی۔

اس سب تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ کو جن اہل کمال کی صحبتیں نصیب ہوئیں وہ اپنے اپنے علاقوں اور حلقہ ہائے اثر کے بہترین لوگ تھے۔ اس کے علاوہ تقریباً تمام ہی تابعی اور بلند پایہ محدث تھے۔ اب یہ کیونکر ممکن ہے کہ آپ نے اپنے زمانے کے ماہرینِ علمِ حدیث سے فیض حاصل کیا ہو اور اس کے باوجود آپ کا علم معمولی یا ادنیٰ درجے کا ہو۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ آپ کا اصل میدان اور تخصص فقہ تھا۔

درس و افتاء

امام صاحب جب حماد کے حلقۂ درس میں پابندی سے شریک ہونے لگے تو تھوڑے ہی عرصے میں قابلیت کا جوہر ظاہر ہونے لگا۔ آپ کو محض دو برس بعد ہی خیال ہوا کہ اب اپنا حلقۂ درس قائم کرنا چاہئے لیکن استاد کا ادب مانع ہوتا تھا۔ اتفاق سے انہی دنوں حماد کے کسی رشتہ دار کا بصرہ میں انتقال ہوا۔ اس سبب سے ان کو بصرہ جانا پڑا تو پیچھے سے وہ امام ابوحنیفہ کو اپنا جانشین بنا گئے۔ امام صاحب خود فرماتے ہیں کہ بہت سارے مسائل ایسے سامنے آئے جنکی کوئی مثال استاد سے نہ سنی تھی۔ چنانچہ اپنے اجتہاد سے جواب دیئے اور ان سب کے جوابات ایک الگ جگہ لکھ لئے۔ دو ماہ بعد جب استاد واپس آئے تو ان کو دکھایا۔ استاد نے ساٹھ میں سے بیس مسئلوں میں غلطیاں نکالیں اور باقی کو صحیح کہا۔ فرماتے ہیں: ''اس دن میں نے عہد کیا کہ حماد جب تک زندہ ہیں ان سے شاگردی کا تعلق کبھی نہ توڑوں گا''۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۱۲۰ھ ہجری میں حماد نے وفات پائی۔ ان کے بیٹے کو ان کی جگہ مسند درس پر بٹھایا گیا مگر ان کا دھیان ادب اور لغت کی طرف زیادہ تھا۔ پھر موسیٰ بن کثیر کو جو حمادؒ کے شاگرد اور تجربے میں سب سے زیادہ تھے مسند درس پر بٹھا دیا گیا۔ جب وہ حج کو چلے گئے تو امام ابوحنیفہ سے درخواست کی گئی مگر آپ مطمئن نہ تھے۔ لوگوں کے اصرار پر درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا تو اول اول حماد کے پرانے شاگرد ہی شریک ہوتے تھے لیکن تھوڑے ہی عرصے میں آپ کی شہرت اس قدر ہوئی کہ کوفہ کے علماء بھی آپ سے استفادہ کرنے لگے۔ آپ کا طریقہ خود آپ ہی کے اقوال کی روشنی میں دیکھ لیتے ہیں۔ کہتے ہیں:

> ''میں استخراجِ احکام کے لئے سب سے پہلے کتاب اللہ سے حکم اخذ کرتا ہوں۔ تاہم جب اس مین حکم نہ پاؤں تو پھر میں سنتِ رسول سے حکم اخذ کرتا ہوں۔ اس میں مجھے حکم نہ ملے تو پھر صحابہ کے قول سے حکم اخذ کرتا ہوں۔ ان میں سے جس کا چاہوں قول لیتا ہوں اور ان کے قول کو چھوڑ کر کسی دوسرے کے قول کی طرف نہیں نکلتا۔ تاہم جب یہ معاملہ ابراہیم، شعبی، ابن سیرین اور عطاء تک جا پہنچے تو یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اجتہاد کیا۔ پھر میں بھی اجتہاد کرتا ہوں جس طرح انہوں نے اجتہاد کیا۔''

فہم و فراست

امام ابوحنیفہ عقل و تدبر اور فہم و فراست میں غیر معمولی فوقیت رکھتے تھے۔ خواہ کتنا ہی پیچیدہ اور مشکل مسئلہ کیوں نہ ہوتا آپ بہت جلد اسے حل کر لیتے۔ آپ کا ذہن اس تیزی سے کام کرتا کہ آپ کے ہم عصر بھی حیران رہ جاتے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا کہ کوئی مسئلہ درپیش ہونے پر لوگ ابھی صورتِ معاملہ پر غور ہی کر رہے ہوتے اور امام ابوحنیفہ اس کا حل بھی بیان کر دیتے۔ آپ کے شاگردوں کا بیان ہے کہ آپ خاموش طبع تھے لیکن جب کوئی مسئلہ آپ کے سامنے رکھ کر رائے معلوم کی جاتی تو آپ پرنالے کی طرح بہنے لگتے۔ بہت جلد سارے عالمِ اسلام سے لوگ آ آ کر آپ سے فتویٰ لینے لگے۔ آپ نے اس کام کے لئے نمازِ فجر کے بعد اور بعض روایات کے مطابق عصر کے بعد کا وقت مخصوص کیا۔

امام صاحب کا طریقہ عام فہم ہوتا۔ وہ مخاطب کو اس انداز سے بات سمجھاتے کہ اسے ذہن نشین ہو جاتی۔ آپ مذہبی امور کے ساتھ ساتھ دنیوی ضرورتوں اور مسائل کا بھرپور اندازہ رکھتے تھے۔ زندگی کے معمولی کاروبار سے متعلق بھی ہدایتیں دیتے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی شخص فقیہ کہلانے کا مستحق نہیں ہے جب تک وہ علومِ دینی اور معاملاتِ دنیاوی دونوں پر گہری نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ قانون کے بنانے اور اس کے نافذ کرنے سے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

متعلق صحیح سوجھ بوجھ نہ رکھتا ہو۔ امام صاحب چونکہ اس تعریف پر بدرجہ اتم پورے اترتے تھے اس لئے امام اعظم کے لقب سے شہرت حاصل کی۔ ذیل میں چند ایک مثالیں دی جاتی ہیں جو امام صاحب کی غیر معمولی ذہانت پر دلالت کرتی ہیں۔

ربیع جو خلیفہ منصور کا درباری تھا امام صاحب سے بطور خاص بغض رکھتا تھا۔ ایک موقع پر جب امام صاحب دربار میں موجود تھے اس نے منصور سے کہا: ''یہ (امام ابوحنیفہ) آپ کے بزرگ عبداللہ بن عباسؓ کے قول کے برعکس کہتے ہیں کہ اگر ''انشاء اللہ'' کا لفظ کسی قسم کے ساتھ بولا جائے تو جزوِ قسم سمجھا جائے گا اور اگر ایک دو روز بعد بولا جائے تو لغو اور بے اثر ہوگا''۔

جواباً امام صاحب بولے: ''امیر المؤمنین ربیع آپ کی طرف سے لی گئی بیعت کو بے اثر سمجھتے ہیں''۔ منصور نے وجہ پوچھی تو فرمایا کہ: ''ان کا گمان ہے کہ جو لوگ دربار میں آپ کے ہاتھ پر بیعتِ خلافت کرتے ہیں اور گھر جا کر انشاء اللہ کہہ لیا کرتے ہیں اس سے ان کی قسم بے اثر ہو جاتی ہے اور ان پر شرعاً کوئی مواخذہ نہیں''۔ منصور ہنس پڑا اور ربیع سے کہا: ''امام ابوحنیفہ کو نہ چھیڑو۔ ان پر تمہارا داؤ نہیں چل سکتا''۔

ایک دن بہت سے لوگ جمع ہو کر یہ پوچھنے آئے کہ باجماعت نماز میں امام کے پیچھے مقتدی کو قرأت کرنی چاہئے کہ نہیں؟ امام صاحب نے کہا: ''اتنے آدمیوں سے میں تنہا کیونکر بحث کر سکتا ہوں۔ البتہ مجمع میں سے کسی ایک کا انتخاب کرلیں جو سب کی طرف سے اس کام کو انجام دے اور اس کی تقریر پورے مجمع کی تقریر سمجھی جائے''۔ لوگوں نے منظور کرلیا تو امام صاحب نے کہا: ''آپ نے یہ تسلیم کیا تو بحث کا خاتمہ ہوگیا۔ آپ نے جس طرح ایک شخص کو سب کی طرف سے بحث کا اختیار دیا ہے اسی طرح امام نماز میں تمام مقتدیوں کی طرف سے قرأت کا کفیل ہے''۔ یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ یہ طریقۂ استدلال آپ نے لوگوں کو سمجھانے کے لئے اختیار کیا ورنہ امام صاحب کے مسلک کی بنیاد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیث تھی جسمیں آپ ﷺ نے امام کی قرأت کو مقتدی کی قرأت قرار دیا ہے۔

کوفہ کے لوگ مزاجاً سادہ نہ تھے۔ نت نئے مسائل امام صاحب کے سامنے پیش کرتے۔ ایک دن یہ مسئلہ آیا کہ ایک شخص نے قسم کھائی ہے کہ آج اگر میں غسلِ جنابت کروں تو میری بیوی کو تین طلاق ہے۔ تھوڑی دیر میں کہا کہ میری آج کی کوئی نماز قضا ہو تو میری بیوی مطلقہ ہے۔ پھر کہا کہ اگر آج میں اپنی بیوی کے ساتھ صحبت نہ کروں تو اس کو طلاق ہے۔ اب وہ شخص پریشان ہے۔ امام صاحب نے کہا کہ نمازِ عصر پڑھ کر بیوی سے ہم صحبت ہو اور غروب کے بعد غسل کر کے فوراً مغرب کی نماز پڑھ لے۔ اس صورت میں سب شرائط بھی پوری ہوگئیں اور بیوی کو طلاق بھی نہ ہوئی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہ تو پھر فقہی معاملہ تھا۔ لوگ امام صاحب کے پاس اپنے ایسے ذاتی معاملات لاتے جن کا فقہ سے دور دور کا تعلق نہ ہوتا۔ امام صاحب کی بصیرت پر مکمل اعتماد ہی اس کی وجہ تھی۔ آپ عام علماء کی طرح ڈانٹ ڈپٹ کرنے کے بجائے ان کے مسائل حل کر دیا کرتے تھے۔

ایک بار ایک شخص حاضر خدمت ہوا اور کہنے لگا کہ کچھ پیسے ایک جگہ احتیاط سے رکھ دیئے تھے۔ اب یاد نہیں آتا۔ کیا کروں؟ امام صاحب نے فرمایا: ''بھئی میں اس سلسلے میں کیا کہہ سکتا ہوں''؟ اس نے زیادہ اصرار کیا تو آپ نے اسے رات بھر نماز پڑھنے کی تاکید کی۔ اس نے اس رات نماز پڑھنی شروع کی ہی تھی کہ اس کو یاد آ گیا کہ روپے کہاں رکھے تھے۔ دوڑا ہوا امام صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے فرمایا: ''شیطان کب گوارا کرتا کہ تم رات بھر نماز میں گذارو۔ اس نے جلد یاد دلا دیا تاہم تم کو چاہیئے تھا کہ تم خدا کے شکر میں شب بیداری کرتے اور بقیہ رات بھی نماز پڑھتے رہتے''۔

اسی سے ملتا جلتا ایک واقعہ اور بھی ملتا ہے جب ایک شخص امام صاحب کے پاس حاضر ہوا کہ کچھ سامان حفاظت کی غرض سے گاڑ دیا تھا۔ اب یاد نہیں آتا۔ امام صاحب اپنے شاگردوں کے ساتھ اس کے گھر گئے اور اپنے شاگردوں سے پوچھا کہ اگر یہ تمہارا گھر ہوتا تو تم حفاظت کے لئے کونسی جگہ کا انتخاب کرتے؟ سب نے مختلف جگہیں بتائیں۔ ان کو کھودا گیا تو ایک جگہ سے مال مل گیا۔

تدوینِ فقہ

امام ابوحنیفہؒ اس زمانے میں پیدا ہوئے جب اسلام عرب سے نکل کر دنیا کے ایک بڑے حصے میں اپنی جڑیں پھیلا رہا تھا۔ بہت سے انقلابی حالات رونما ہو چکے تھے۔ علم دین کی اشاعت تمام مفتوحہ علاقوں میں زور وشور سے ہو رہی تھی اور تمدنی حالات میں روز بروز تبدیلیاں آ رہی تھیں۔ عرب وعجم کے اختلاط سے نت نئے مسائل سامنے آ رہے تھے۔ پھر منافقین، اسلام دشمن عناصر اور بدنیت لوگ طرح طرح کے فتنہ انگیز خیالات کا پرچار کر کے مسلمانوں کے عقائد خراب کرنا چاہتے تھے۔ اس کے لئے حدیثیں گھڑنے سے بھی گریز نہ کیا جاتا۔ ان تمام حالات نے امام صاحب کو سوچنے پر مجبور کیا کہ انسانی ضرورتوں پر مشتمل ایک اسلامی فقہی قانون کو قرآن وسنت اور آثارِ صحابہ سے استنباط کر کے تدوین کیا جانا چاہیئے۔ اس کے علاوہ ایک اور وجہ جس نے آپ کو تدوینِ فقہ کی طرف متوجہ کیا وہ یہ تھی کہ آپ اپنے زمانۂ طالب علمی سے ہی یہ رجحان رکھتے تھے کہ فقہاء کو پیش آنے والے مسائل کے لئے پہلے سے تحقیق کر لینی چاہیئے۔ آپ کے خیال میں جب واقعہ پیش آ جائے اور فوری طور پر حل بتانا ہو تو عین ممکن ہے کہ مسئلے کے تمام پہلوؤں اور اس سے متعلق نصوص وروایات کی تحقیق نہ ہو سکے اور غلطی کا ارتکاب

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہو جائے۔اس لئے فقہ تقدیری (فرضی فقہ) کا خیال آپ کے ذہن میں پہلے سے تھا۔

امام صاحب کے زمانے تک فقہ کے مسائل صرف زبانی روایات کی حد تک مدون ہوئے تھے اور وہ بھی اس طرح کہ اس کے لئے کوئی مقررہ طریقہ کار نہ تھا۔یعنی دلائل،احکامات میں فرق،احادیث میں امتیاز اور قیاس کے مواقع اور قاعدے،غرض فقہی قوانین کی تشریح اور تعریف لوگوں کے ذہنوں میں واضح نہ تھی۔

۱۲۰ ہجری میں جب آپ نے درس کی مسند سنبھالی تو ان فقہی جزئیات کو اصول کے ساتھ ترتیب دے کر ایک فن کی شکل دینے کی ٹھانی۔یہ کام آسان نہ تھا اور اس کا اندازہ امام صاحب کو بھی تھا۔اپنی زبردست مجتہدانہ صلاحیتوں اور دینی علوم سے آگاہی کے باوجود آپ نے اپنی ذاتی رائے اور معلومات کو دوسروں پر مسلط کرنے کے بجائے ایک اکیڈمی قائم کی جس میں اپنے نامور شاگردوں کو منتخب کیا۔نہ صرف قرآن،حدیث اور فقہ کے ماہرین کو اس مجلس میں شریک کیا بلکہ زندگی کے ہر شعبے سے متعلق ماہرین کو بھی مدعو کیا۔مثلاً رمضان کے لئے رؤیتِ ہلال کی اہمیت ہے اور بادل وغیرہ کی وجہ سے ایک جگہ چاند نظر نہ آئے تو کتنے فاصلے کی رؤیت اطراف پر مؤثر ہوگی یہ بات موسمیات اور فلکیات کا ماہر ہی بتا سکتا ہے۔لہٰذا لغت دان،تاجر،علم ہیئت کے ماہر اور کتنے ہی علوم کے ماہرین کی ضرورت آپ کو پڑی ہوگی۔

آپ کی اکیڈمی کے مستقل ارکان کی تعداد کم وبیش ۴۰ ملتی ہے جس میں آپ کے معروف شاگرد امام زفرؒ، امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

مجلس کس طرح کام کرتی تھی یہ بھی ایک اہم اور دلچسپ امر ہے۔ایک ایک مسئلہ پیش کیا جاتا،مجلس کے اراکین کے خیالات،آراء اور دلائل کو سنا جاتا،پھر امام صاحب اپنی رائے اور دلائل سے لوگوں کو آگاہ کرتے اور مناظرہ کرتے۔کبھی ایک ایک مسئلے پر بحث ومناظرے کا سلسلہ ایک ماہ سے بھی زیادہ چلتا یہاں تک کہ مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل سامنے آجاتا۔بحث اور مناظرے میں اس قدر آزادی ہوتی کہ لوگ بلا جھجک امام صاحب کو ٹوک دیتے اور ایسا انداز اختیار کرتے کہ نئے آنے والے کو تعجب ہوتا۔

علامہ جرجانیؒ کہتے ہیں کہ ایک بار ایک نوجوان نے امام صاحب کو اعلانیہ ٹوکا اور کہا کہ آپ نے مسئلہ بتانے میں غلطی کی ہے۔جرجانی کہتے ہیں کہ میں نے لوگوں کو مخاطب ہو کر کہا ''حیرت کی بات ہے تم اپنے شیخ کا قطعاً دفاع نہیں کرتے۔'' جرجانی نے ابھی بات مکمل نہ کی تھی کہ امام صاحب بولے: ''انہیں رہنے دو۔میں نے خود ان کو اس طرزِ تکلم کا عادی بنایا ہے''۔

حقیقت یہ ہے کہ مشاورت کو بامقصد ہی اس وقت بنایا جاسکتا ہے جب کہ ہر شخص آزادانہ طور سے ہر دباؤ سے نجات پاکر اور ادب آداب،عقیدت ولحاظ کو اپنے اوپر مسلط کئے بغیر اپنی رائے پیش کرے تاکہ قانون

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سازی میں کسی قسم کا کوئی سقم نہ رہ جائے۔

اس ضمن میں شاگردوں اور ماہرینِ علم کی آراء ہی کو مدنظر نہ رکھا جاتا بلکہ زیرِتحقیق مسئلے کو کوفہ کی دوسری علمی مجالس کے پاس بھی لے جا کر پیش کیا جاتا تا کہ اس سلسلے میں ان کے پاس کوئی صحیح حدیث موجود ہو تو وہ بھی اس موقع پر سامنے آجائے۔

امام صاحب نے تراسی ہزار سے پانچ لاکھ تک (مختلف روایات کے حوالے سے) مسائل کا مجموعہ تیار کروایا اور اس کام میں آپ کو تیس سال لگے۔ یہ ایک ایسا پرخطر، وسیع اور مشکل کام تھا جس کی کوئی مثال یا نمونہ اس سے قبل امام صاحب کے سامنے نہ تھا۔ اللہ کی خصوصی توفیق سے آپ نے اس کام کو انجام دیا۔ فقہ کے اسلوب کی بنیاد رکھنے کا سہرا بھی آپ کے سر جاتا ہے۔ مجموعۂ مسائل اور ان کے فقہی جوابات کو آپ نے اس خوبصورتی سے مدوّن کیا کہ آپ کی زندگی ہی میں آپ کی اکیڈمی کے مرتب شدہ مجموعۂ قوانین کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔

حنفی فقہ

دیگر مذاہبِ فقہ کی طرح حنفی فقہ کا بنیادی مآخذ بھی قرآن وسنت ہے۔ باقی ائمہ کی طرح امام ابوحنیفہ بھی صحیح حدیث کے مقابلے میں نہ اپنی رائے کو ترجیح دیتے تھے اور نہ کسی کی رائے پر توجہ دیتے تھے۔ آپ کے اقوال میں کہیں یہ شرط نہیں ملتی کہ حدیث متواتر (۱) یا مشہور (۲) ہو یا خبر واحد کا راوی فقیہ ہو اور خبر قیاس کے مطابق بھی ہو بلکہ واضح طور پر بلا شرط یہ بات کہی گئی ہے کہ جو بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہی ہے وہ آپ کو بسر وچشم قبول ہے اور یہ کہ آپ اپنی رائے پر فتویٰ نہیں دیتے بلکہ حدیث پر فتویٰ دیتے ہیں۔ البتہ جب احادیث میں اختلاف ہو تو ایک حدیث کو دوسری حدیث پر ترجیح دینے کے لئے راوی کی ثقاہت، حفظ اور عدالت کو وجہ ترجیح تسلیم کیا گیا ہے۔ لیکن قیاس کو حدیث پر کسی صورت ترجیح نہیں ہے۔ آپ خود کہتے ہیں: ''اللہ کی قسم وہ شخص جھوٹ بولتا ہے اور ہم پر الزام لگاتا ہے جو کہتا ہے کہ ہم قیاس کو نص (۱) پر مقدم سمجھتے ہیں۔ کیا نص کی موجودگی میں قیاس کی ضرورت پڑسکتی ہے؟ ہم تو شدید ضرورت کے بغیر قیاس نہیں کرتے''۔ چند مواقع پر یوں محسوس ہوتا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ نے حدیث کے مقابلے پر کسی اور قول کو اختیار کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ چونکہ آپ کے زمانے تک حدیث کی تدوین کا کام اتنے منظم انداز میں نہ ہوا تھا جتنا آنے والی صدیوں میں ہوا، اس لئے ہوسکتا ہے کہ آپ تک کوئی حدیث نہ پہنچی ہو اس لئے آپ نے ایک قول کو اختیار کیا۔ بعد میں جب احادیث کے ذخیرے میں سے صحاحِ ستہ کی احادیث کو صحیح ہونے کی بناء پر امت نے راہ ہدایت کے طور پر چن لیا تو بعد میں آنے والوں کو گمان

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہوا کہ حنفی فقہ میں چند مواقع پر حدیث موجود ہونے کے باوجود دوسری راہ اختیار کی گئی ہے۔

حنفی فقہ کی ایک بڑی خصوصیت اس کی وسعت ہے۔ یہ باقی مذاہبِ فقہ کے برعکس ظاہری افعال اور احکام کے علاوہ انسانی نفسیات کا بھی احاطہ کرتی ہے۔ تعریفِ فقہ میں اعتقادی امور کو بھی شامل کیا جاتا ہے اور دائرہ عبادات اور معاملات سے بڑھ کر سیاست اور بین الاقوامی معاملات تک پھیل جاتا ہے۔

حنفی فقہاء احکامِ شرعیہ کو مصالح پر مبنی قرار دیتے ہیں۔ یعنی شریعت کا کوئی حکم مصلحت سے خالی نہیں۔ اسی کا اثر ہے کہ حنفی فقہ جس قدر اصولِ عقلی کے مطابق ہے اور کوئی فقہ نہیں۔

حنفی اصولوں کی بنیاد ہی اس امر پر ہے کہ عوام کو تنگی اور شدت سے بچایا جا سکے۔ شرعی احکام میں فرض اور حرام یہ دو ایسے حکم ہیں جن میں شدت اور پابندی ضروری ہے۔ امام صاحب نے فرض اور حرام کی تعریفات میں سخت قیود لگا دیں جس سے ان کا دائرہ اور تعداد کم ہوگئی۔

فقہ حنفی میں حقوق کے تحفظ کی یقین دہانی ملتی ہے یہاں تک کہ ذمیوں کے خون کو مسلمانوں کے خون کے برابر قرار دیا گیا ہے۔ تجارت، مقدمات کی گواہی، دینی رسومات کی ادائیگی میں ان کے ساتھ فیاضانہ سلوک کیا گیا ہے۔

حنفی فقہ میں شخصی آزادی اور حریتِ فکر کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک عاقل بالغ مرد اور عورت کو ولی کی مداخلت کے بغیر نکاح کا حق حاصل ہے۔ اسی طرح حریتِ فکر اور آزادی اظہار کو علماء کیلئے ضروری قرار دیا گیا ہے۔ اسی لئے خلیفۂ وقت سے تحفہ اور ہدیہ لینا ناپسندیدہ سمجھا گیا ہے۔

امام ابو حنیفہؒ نے انسان کے قول وفعل کو قانونی تحفظ دیتے ہوئے عرف (Common Social Practices) کو بھی احکام کی بنیاد قرار دیا اور اس معاملے میں امام مالکؒ کے برخلاف صرف مدینہ کے عرف ہی کو قابل قبول نہیں سمجھا۔

آپ نے احترامِ انسانیت کو دستور قرار دیتے ہوئے اہم فیصلے فرمائے مثلاً آزاد عورت کے مہر کو بغیر استثنائی وجہ کے کم یا ختم نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح معمولی چیز کی چوری پر ہاتھ کاٹنے کو انسانی احترام کے منافی قرار دیا گیا۔

فقہ حنفی کی شہرت

حنفی فقہ نے بہت جلد شہرت اور قبولِ عام حاصل کر لیا۔ خود ہارون الرشید نے اپنے صاحبزادے مامون کو فقہ حنفی کی اعلیٰ پیمانے پر تعلیم دلوائی۔ اس کے بعد عباسی خلفاء نے محکمہ عدل وقضاء کے لئے یہی مذہب منتخب کیا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

امام ابوحنیفہ کے شاگردوں امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ نے اس فقہ کی تدوین و اشاعت میں خوب حصہ لیا۔ آگے چل کر سلطنتِ عثمانیہ کا سرکاری فقہی مسلک بھی یہی قرار پایا۔

سلطنتِ عثمانیہ کے زیر اثر ممالک یعنی ترکی، مصر، شام، لبنان، تیونس، البانیہ، بلقان، افغانستان، پاکستان، ہندوستان اور چین میں یہی فقہ آج تک غالب رہی ہے۔ اندازاً دنیا بھر کے دو تہائی مسلمانوں کا فقہ حنفی پر ہی عمل ہے۔

تصانیف و تلامذہ

امام صاحب نے اپنے پیچھے قابل قدر تالیفات چھوڑیں، مگر دو تین کے سواء باقی سب نایاب ہیں۔

آپ کے شاگرد خود بڑے بڑے ائمہ حدیث اور مجتہدین تھے۔ امام صاحب کے انتقال کے بعد حنفی فقہ کی تدوین و ترویج میں ان کا بڑا ہاتھ ہے۔ امام ابو یوسفؒ، امام محمدؒ، امام زفرؒ کے نام تو کسی تعریف کے محتاج نہیں ہیں۔ ان کے علاوہ یحییٰ بن سعید، عبداللہ بن مبارک، داؤد الطائی اور قاسم بن معن کے علاوہ ایک طویل فہرست ان شاگردوں کی ہے جن کی خدمات سے آج تک امت فائدہ اٹھا رہی ہے۔

صاحبِ عزیمت

امام ابوحنیفہؒ صرف علم کے میدان میں اور فقہ کے مسائل حل کرنے ہی کے لئے مشہور نہ تھے بلکہ عام زندگی اور اس سے بڑھ کر ملکی سیاست میں آپ کی حق گوئی کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھی۔

بنو امیہ کے آخری دور میں جب حکومت کی گرفت معاملات پر ڈھیلی پڑنے لگی تو خلیفۂ وقت مروان الحمار نے یزید بن عمر بن ہبیرہ کو عراق کا گورنر مقرر کیا۔ ابن ہبیرہ ایک ذہین آدمی تھا۔ اس نے معاملاتِ حکومت چلانے کے لئے علماء و فقہاء کا تعاون حاصل کرنا چاہا۔ اسی سلسلے میں امام صاحب کو خزانے کی وزارت کی پیشکش کی۔ آپ نے صاف انکار کر دیا تو علماء کا ایک گروپ آپ کو سمجھانے کی غرض سے آیا اور کہنے لگا: ''ہم لوگ تمہیں خدا کی قسم دیتے ہیں۔ اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ ہم تمہارے بھائی ہیں۔ حکومت نے ہم پر جو ذمہ داری ڈالی ہے ہم بھی اسے پسند نہیں کرتے لیکن اس وقت اسے قبول کرنے کے سواء کوئی چارہ نہیں ہے''۔

امام صاحب نے جواب دیا: ''یہ ملازمت تو بڑی بات ہے۔ اگر یہ شخص مجھ سے چاہے کہ وسط شہر کی مسجد کے دروازے گن دوں تو میں یہ بھی نہ کروں۔ میں اس کی یہ خواہش کیسے پوری کر سکتا ہوں کہ وہ کسی کی گردن مارنے کا حکم دے اور میں اس پر مہر لگا دوں۔ بخدا میں اس میں اپنے آپ کو شریک نہیں کر سکتا''۔ اس انکار کے نتیجہ میں آپ کو درّے لگانے کا سرکاری فرمان جاری ہوا۔ دس روز تک روزانہ دس درے لگائے جاتے۔ مگر امام

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

صاحب اپنے مؤقف پر قائم رہے یہاں تک کہ مجبور ہو کر آپ کو چھوڑ دیا گیا۔

امویوں کے بعد عباسی برسراقتدار آئے تو لوگوں کو ان سے بہت توقعات تھیں لیکن کچھ ہی عرصے میں اندازہ ہو گیا کہ یہ ظلم و ستم میں کسی صورت اموی بادشاہوں سے پیچھے نہ تھے۔ خلیفہ منصور نے سادات کی خانہ خرابی کا جو سلسلہ شروع کیا تو مظالم کی ایسی داستانیں رقم کیں جن کو سننے کے لئے بڑا دل گردہ چاہئے۔ یہاں تک کہ تنگ آ کر محمد نفس زکیہ نے جو سادات میں سے تھے مدینہ میں حکومت کے خلاف بغاوت کی۔ پہلے وہ اور پھر ان کے بھائی ابراہیم انتہائی دلیری سے لڑتے ہوئے مارے گئے۔ مذہبی گروہ ان کے ساتھ تھا۔ امام صاحب تو اعلانیہ طرفدار تھے اور چند روایات کے مطابق آپ نے مالی طور پر ان بھائیوں کی امداد کی تھی۔ ابراہیم کے مارے جانے کے بعد خلیفہ ان لوگوں کی طرف متوجہ ہوا جنہوں نے اس سارے معاملے میں حکومت کی مخالفت کی تھی۔ امام صاحب کو بغداد طلب کیا گیا تا کہ کسی صورت ان کو گھیر کر آزمائش میں ڈالا جائے۔

ابتدائی بات چیت کے بعد خلیفہ منصور نے امام صاحب کو چیف جسٹس کا منصب سونپنے کا اعلان کیا۔ امام صاحب نے صاف انکار کر دیا اور اس موقع پر یہ تاریخی خطبہ ارشاد فرمایا:

''عدالت اور انصاف خدا کی امانت ہے جو بادشاہوں کے سپرد کی جاتی ہے۔ اس امانت کی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے کی صرف یہی صورت ہے کہ ایسے آدمی کو قضاء کے لئے مقرر کیا جائے جس کے دل میں خوف نہ ہو۔ آپ کو مجھ پر بھروسہ نہ کرنا چاہئے۔ اگر خوشی سے بھی اس عہدے کی ذمہ داری قبول کروں جب بھی آپ کو آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کے خلاف فیصلہ دینے کا موقع آئے اور مجھے یہ دھمکی دی جائے کہ اس فیصلے سے ہٹ جاؤ ورنہ دریائے فرات میں غرق کر دیئے جاؤ گے تو میں فرات میں ڈوبنے کو ترجیح دوں گا لیکن فیصلہ بدلنے پر راضی نہیں ہو سکتا۔ اور جب رضامندی سے اس عہدے کو قبول کرنے میں میرا یہ حال ہے تو اس سے اندازہ کیجیے کہ اگر مجھے میری مرضی کے خلاف زبردستی قاضی بنا دیا گیا تو اس وقت غصے کی حالت میں میں جو کروں گا ظاہر ہے''۔

بات زیادہ بڑھی اور منصور اصرار کرنے لگا تو امام صاحب نے کہا: ''میں اس قابل نہیں ہوں''۔ منصور نے غصے میں آ کر کہا: ''تم جھوٹے ہو''۔ امام ابوحنیفہ نے برجستہ کہا: ''اگر میں جھوٹا ہوں تو یہ دعویٰ ضرور سچا ہے کہ میں عہدۂ قضاء کے قابل نہیں ہوں کیونکہ جھوٹا شخص قاضی مقرر نہیں ہو سکتا''۔ تنگ آ کر منصور نے قسم کھا کر کہا: ''تم کو قبول کرنا ہوگا''۔ امام صاحب نے بھی جواباً قسم کھا کر کہا: ''ہرگز قبول نہ کروں گا''۔ اس جرأت پر سارا دربار حیرت زدہ رہ گیا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اسیری اور وفات

منصور نے امام صاحب کو قید کر دیا۔ ۱۴۶ ہجری میں امام صاحب حوالۂ زنداں کیے گئے۔ ایامِ اسیری میں بھی سلسلۂ تعلیم منقطع نہ کیا۔ قید کے اس چار سالہ دور نے آپ کے بے غرض، بے لوث اور حق گو ہونے پر مہر ثبت کر دی۔

رجب ۱۵۰ ہجری میں بے خبری میں آپ کو کھانے میں زہر دے دیا گیا جس کا اثر آپ نے محسوس کیا۔ سجدے میں گر گئے اور اسی حالت میں ستر سال کی عمر میں وفات پائی۔ خلیفہ منصور پر یہ الزام لگایا گیا کہ اس نے آپ کی شہرت اور اثرات سے چھٹکارا پانے کے لئے یہ ترکیب کی، تاہم یہ بات کبھی پایۂ ثبوت کو نہ پہنچ سکی۔

آپ کی وفات کی خبر انتہائی تیزی سے تمام اطراف میں پھیل گئی۔ سارا شہر امنڈ آیا۔ قاضیٔ شہر نے غسل دیا، پہلی نمازِ جنازہ میں اندازاً پچاس ہزار افراد کا مجمع تھا۔ اس کے بعد چھ بار نمازِ جنازہ ادا کی گئی اور عصر کے قریب تدفین عمل میں آئی۔

شخصیت اور عادات

امام صاحب صرف فتوٰی جاری کرنے والے فقیہ ہی نہ تھے بلکہ بڑے عبادت گذار اور پرہیز گار تھے۔ آپ بہترین انسانی و اخلاقی خوبیوں سے متصف تھے۔ آپ کی طبیعت میں کمال درجے کا حلم و درگذر تھا۔ بعض اوقات لوگ آ کر بڑی بری طرح سے گفتگو کرتے۔ آپ اپنے علمی مرتبے اور وجاہت کے باوجود نہ صرف یہ کہ برا نہ مانتے تھے بلکہ معاف بھی کر دیا کرتے تھے۔

ایک بار مسجدِ خیف میں ایک شخص نے مسئلہ پوچھا۔ امام صاحب نے جو جواب دیا اس سے وہ مطمئن نہ ہوا اور کہا کہ حسن بصریؒ نے اس کے برعکس بتایا ہے۔ امام صاحب نے فرمایا: ''حسن نے غلطی کی''۔ وہ شخص حسن بصری کا معتقد تھا۔ غصے میں آ کر کہنے لگا ''او ابن الفاحشہ تو حسن کو خاطی کہتا ہے''؟ اس بات پر لوگ برہم ہو کر اس کو سزا دینے دوڑے۔ امام صاحب نے روک دیا اور مجلس میں سناٹا چھا گیا۔ لوگوں کے جذبات جب ذرا ٹھنڈے ہو گئے تو امام صاحب اس شخص سے بولے ''ہاں حسن نے غلطی کی ہے۔ عبداللہؓ بن مسعود نے اس باب میں جو روایت کی ہے وہ درست ہے''۔

اسی طرح ایک بار ایک شخص امام صاحب کے ساتھ گفتگو میں گستاخی کرنے لگا، یہاں تک کہ اس نے آپ کو زندیق کہہ دیا۔ اس پر امام صاحب نے فرمایا: ''خدا تم کو بخشے۔ وہ خوب جانتا ہے کہ میری نسبت جو لفظ تم نے کہا ہے وہ درست نہیں ہے''۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایک دن امام صاحب مسجد میں درس دے رہے تھے۔ایک شخص نے جس کو ان سے کچھ عداوت تھی، مجلس میں ان کی نسبت برے الفاظ استعمال کئے۔آپ خود بھی درس میں مشغول رہے اور شاگردوں کو بھی جواب دینے سے منع کیا، مگر وہ شخص سر ہی ہوگیا۔درس کے اختتام پر بھی وہ آپ کے ساتھ چلتا رہا اور آپ کو برا بھلا کہتا رہا۔امام صاحب جب گھر پہنچے تو فرمایا: ''بھائی یہ میرا گھر ہے، کچھ باقی رہ گیا ہے تو اٹھا نہ رکھو کہ اب میں اندر جاتا ہوں اور تم کو موقع نہ ملے گا''۔

اسی طرح کے متعدد واقعات کتابوں میں ملتے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ طبیعت میں نرمی اور حلم کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔

خود آپ فرماتے ہیں کہ میں نے کسی پر لعنت نہیں کی، کسی سے انتقام نہیں لیا، کسی مسلمان یا ذمی کو نہیں ستایا، کسی سے فریب اور بدعہدی نہیں کی۔اپنی اہمیت جتانے اور اپنے آپ کو منوانے کا آپ کو کوئی شوق نہ تھا۔

آپ کی والدہ ایک عالم عمرو بن زرقہ کے ساتھ عقیدت رکھتی تھیں۔جب کوئی مسئلہ پوچھنا ہوتا تو امام صاحب سے کہتیں کہ جا کر مسئلہ پوچھ کر بتائیے۔عمرو بن زرقہ امام صاحب کے آگے زبان کھولنے کی جرأت نہ کرتے تاہم آپ فرماتے کہ والدہ کا یہی حکم ہے۔اگر کبھی انہیں جواب نہ آتا تو آپ ہی سے جواب معلوم کر کے دہرا دیتے۔ آپ کی والدہ کبھی کبھار خود خچر پر سوار ہو کر اس حال میں عمرو کے پاس آتیں کہ امام صاحب خچر کے ساتھ پاپیادہ چل رہے ہوتے۔وہ خود مسئلہ بیان کر کے جواب سن لیتیں تو ان کو تسلی ہوتی۔

امام صاحب زبان کا استعمال بہت سوچ کر کیا کرتے۔زیادہ تر خاموش رہتے اور سوچ بچار میں وقت گذارتے۔غیر ضروری طور پر دخل اندازی نہ کرتے۔غیبت سے بہت بچتے تھے اور لوگوں کا تذکرہ بھلائی سے کیا کرتے تھے۔سفیان ثوری سے کسی نے کہا کہ ابوحنیفہ کو کسی کی غیبت کرتے نہیں سنا۔انہوں نے کہا کہ ابوحنیفہ ایسے بے وقوف نہیں کہ اپنے اعمالِ صالحہ کو آپ برباد کرلیں۔قسم کھانے سے پرہیز کرتے۔آپ نے عہد کر لیا تھا کہ اگر غلطی سے بھی ایسا کیا تو ایک درہم کفارہ دوں گا۔

درس کے بعد معمول تھا کہ شاگرد آپس میں نہایت آزادی سے بحثیں کرتے اور آپ چپ چاپ بیٹھ کر سنا کرتے۔جب بحث زیادہ بڑھ جاتی اور کسی بات پر تصفیہ نہ ہوتا تو قولِ فیصل بیان کر دیتے کہ سب کو تشفی ہو جائے۔

امام صاحب کی تجارت بہت نفع بخش تھی۔اس پر طبیعت میں فیاضی اور سخاوت بھی موجود تھی۔جب اپنے بال بچوں کے لئے کپڑا بنواتے تو ان کی قیمت کے برابر صدقہ کرتے اور جو خود کپڑا پہنتے اس کی قیمت کے برابر علماء کے لئے بھی لباس تیار کرواتے۔وہ نادار طلبہ جو آپ کی مجلس اور درس میں شریک ہوتے ان کو خاص طور سے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وظائف سے نوازتے۔ محدثین اور شیوخ کے لئے تجارت کا ایک حصہ مخصوص کر رکھا تھا، جس کا منافع ہر سال ان کو پہنچا دیا جاتا۔ آپ یہ چاہتے تھے کہ علم کی خدمت کرنے والوں کو روزی کی فکر سے آزاد کیا جائے تا کہ وہ پوری توجہ اور انہماک سے اس کام کو انجام دے سکیں۔ ایک بار راہ میں ایک ایسا شخص ملا جو آپ کا قرض دار تھا اور مارے شرم کے آپ سے کترا کر گذرنا چاہتا تھا۔ آپ نے اس کو روک کر اس طرح راستہ بدلنے کی وجہ پوچھی۔ صورتِ واقعہ معلوم ہونے پر آپ نے اس کی غیرت پر تعجب کیا اور اس کے قرض کی رقم معاف کر دی۔

اسی طرح ایک بار سفرِ حج میں دو اشخاص جھگڑ رہے تھے۔ امام صاحب نے وجہ معلوم کی تو پتہ چلا کہ چالیس درہموں پر جھگڑا ہے۔ ایک شخص ان کا مطالبہ کرتا ہے جبکہ دوسرا ان کے دینے سے انکاری ہے۔ اس پر حیران ہو کر فرمایا: ''زمانے سے حمیت اٹھ گئی کہ اتنے سے معاملے پر جھگڑا ہو رہا ہے''۔ پھر سب درہم اپنے پاس سے ادا کر دیئے۔

کاروباری معاملات میں بھی آپ کی امانت و دیانت اور خدا خوفی لائقِ تذکرہ ہے۔ وسیع کاروبار کے حوالے سے بڑے بڑے تاجروں سے لین دین اور معاملہ رہتا، مگر احتیاط کا یہ عالم تھا کہ ناجائز ذریعے اور طریقے نہ خود استعمال کرتے اور نہ ملازمین کو اس کی اجازت دیتے۔ ایک بار کچھ تھان اپنے ایجنٹ کو بھیجے اور بتا دیا کہ فلاں فلاں تھان میں کچھ عیب ہے، خریدار کو بتا دینا۔ وہ امام صاحب کی اس ہدایت کو بھول گیا اور تھان بک گئے۔ آپ کو جب معلوم ہوا کہ تھان عیب بتائے بغیر فروخت کئے گئے ہیں تو تمام تھانوں کی کل قیمت جو تیس ہزار درہم تھی، خیرات کر دی۔

اپنے معاملے میں جہاں آپ ایک پائی بھی زیادہ نہ لینے کی احتیاط برتتے وہاں دوسروں کے حق کی بھرپور فکر کرتے۔ ایک بار کسی دوکاندار کے پاس گئے تو اس نے امام صاحب کا لحاظ کرتے ہوئے کپڑے کی قیمت کم کر کے ایک ہزار درہم بتلائی۔ امام صاحب نے فرمایا یہ کپڑا ایک ہزار درہم کا نہیں بلکہ زیادہ کا ہے۔ پھر خود کپڑے کی قیمت کا اندازہ کر کے آٹھ ہزار درہم میں خریدا۔

یہ دیانت محض روپے پیسے کے معاملات میں ہی نہ تھی بلکہ حاکمِ وقت کے حکم کی پابندی میں بھی اس رویئے کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔ ایک بار گورنر نے امام صاحب پر فتویٰ دینے کی پابندی لگا دی۔ اتفاقاً اسی دوران آپ کی صاحبزادی نے مسئلہ پوچھا کہ میں روزے سے ہوں، دانتوں سے خون نکلا اور تھوک کے ساتھ گلے سے اتر گیا۔ روزہ جاتا رہا یا باقی ہے؟ امام صاحب نے فرمایا: ''اپنے بھائی حماد سے پوچھ، میں تو فتویٰ دینے سے منع کر دیا گیا ہوں''۔ چند روز بعد جب گورنر کو خود فقہی مسائل میں مشکلات پیش آئیں اور امام ابوحنیفہ کی طرف رجوع کرنا پڑا تو امام صاحب کو پھر فتویٰ دینے کی عام اجازت حاصل ہوگئی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

امام صاحب اپنے علمی انہاک اور تاجرانہ مصروفیت کے باوجود عبادت کا بھی خوب اہتمام کرتے۔ رات رات بھر جاگتے رہتے اور قرآن کی آیات پڑھ کر روتے رہتے۔ بعض اوقات عذاب کی آیات آجاتیں تو بدن کانپنے لگتا۔ بار بار دہراتے یہاں تک کہ صبح ہو جاتی۔ یزید بن کیت جو امام صاحب کے ہمعصر تھے، ان کا بیان ہے کہ ''میں ایک دفعہ عشاء کی نماز میں امام صاحب کے ساتھ حاضر تھا۔ دورانِ نماز سورۃ زِلزال کی تلاوت کی گئی۔ نماز پڑھ کر سب لوگ اپنے گھر چلے گئے۔ میں نے دیکھا کہ امام ابوحنیفہ ٹھنڈی آہیں بھر رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر میں اٹھ آیا کہ ان کے اوقات میں خلل نہ ہو۔ صبح جب دوبارہ مسجد میں گیا تو دیکھا کہ غمزدہ بیٹھے ہیں۔ داڑھی ہاتھ میں ہے اور بڑی رقت سے کہہ رہے ہیں: ''اے وہ جو ذرہ بھر نیکی اور ذرہ بھر برائی دونوں کا بدلہ دے گا، اپنے غلام نعمان کو آگ سے بچانا۔''

خشیتِ الٰہی، عبادت و ریاضت، خلقِ خدا سے معاملات میں احتیاط، ان کی ہمدردی اور بھرپور مدد اور اس پر پوری زندگی کو دین کی خدمت کے لئے وقف کردینا، کچھ بھی تو ایسا نہ تھا کہ امام صاحب اس پر مطمئن ہو کر بیٹھ جاتے، اور اس کو کافی سمجھتے۔ بلکہ دل بدستور خوف خدا سے لرزتا رہتا تھا۔

بازار میں چلتے ہوئے جب ایک لڑکے کے پاؤں پر پاؤں پڑ گیا تو وہ چیخ اٹھا اور کہنے لگا ''تو خدا سے نہیں ڈرتا؟'' امام صاحب کو یہ سن کر غش آ گیا۔ ہوش میں آنے پر پوچھا گیا کہ ایک لڑکے کی اتنی سی بات پر بے قرار ہو جانا کیا تھا؟ فرمایا ''کیا عجب کہ اس کی آواز غیبی ہدایت ہو۔''

بلاشبہ امام صاحب کی زندگی کے اس پہلو میں عام لوگوں کے علاوہ صاحبانِ علم کے لئے بڑا سبق ہے۔ علماء کا کام لوگوں کو ہدایت کا راستہ دکھانا ہے۔ وہ جنت اور دوزخ کے ٹھیکیدار نہیں ہیں۔ ان کو اپنے معاملے میں بھی خدا سے اسی طرح ڈرتے رہنا چاہئے جس طرح وہ دوسروں کو اس کی تلقین کرتے ہیں۔ (أتأمرون الناس بالبرّ وتنسون انفسكم وانتم تتلون الكتب [الاية]

امام ابوحنیفہ کا کام اور موجودہ دور میں اسلامی قانون سازی

آخر میں امام ابوحنیفہ کے اس یادگار کردار کو ایک بار دہرانا ضروری ہے جو اسلامی قانون سازی کے حوالے سے انہوں نے ادا کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ تمدن کا مسلسل ارتقاء اس امر کا متقاضی ہے کہ قانون سازی کے عمل میں بھی تسلسل رہے۔ نبی اکرم ﷺ کے بعد خلفائے راشدین نے بالعموم اور حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے بالخصوص قانون سازی اور فقہی معاملات کے لئے شوریٰ کے ادارے کو خاصا منظم کیا۔ حضرت عمرؓ، سیاسی، عمرانی، معاشرتی، معاشی بلکہ فقہی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور قانونی مسائل میں بھی بکثرت مشاورت کرتے، لوگوں اور خصوصاً دانشمند اور متقی حضرات کے مشوروں کو اکثر قبول کرلیا کرتے اور بعض اوقات اپنی رائے سے رجوع بھی کرلیتے۔

اسی دور کے فیض یافتہ تابعین میں سے فقہائے سبعہ نے جلد ہی یہ امتیاز حاصل کرلیا کہ ایک طرح سے قانون سازی اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔ خود قاضی بھی مدینہ منورہ میں اس مجلس سے مشورہ لیتے تھے اور اس کے فتوے کی پابندی کرتے تھے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے جو خود والیٔ مدینہ تھے، فقہائے سبعہ (ابوبکر بن حارث، حارث بن زید، قاسم بن محمد، سعید بن میںب، عبداللہ بن عتبہ، سالم بن عبداللہ اور سلیمان بن یسار رحمہم اللہ) سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ ابتدائی چند صدیوں کے بعد ایک طویل عرصے تک علماء کی جانب سے اجتہاد کو محدود بلکہ تقریباً ترک کردیا گیا۔ یوں پوری امت چاروں اماموں کے سینکڑوں سال قبل دیئے گئے فتوؤں تک محدود ہوکر رہ گئی۔ انفرادی طور پر اجتہادی کوششیں بہت چھوٹے پیمانے پر ہوئیں، مگر نئے ادوار کے تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر اجتماعی طور پر جن ہمہ گیر کوششوں کی ضرورت تھی وہ نہ ہوسکیں۔ چند ایک بار ایسی کوششیں کی بھی گئیں۔ مثلاً گیارہویں صدی ہجری میں اورنگ زیب عالمگیر نے شیخ نظام کی سربراہی میں اکابر علماء کی ایک کمیٹی تشکیل دی تاکہ وہ ایک ایسی جامع کتاب مدون کرے جس میں فقہ کے مسائل مفصل درج ہوں اور جسے علماء بھی قبول کریں۔ فتاویٰ عالمگیری کو نیم سرکاری حیثیت بھی حاصل تھی لیکن یہ سرکاری قوانین کا مجموعہ نہ تھی۔ البتہ ہر مسئلے سے متعلق فقہاء کی آراء درج کی گئی ہیں۔

سرکاری سطح پر اس کے علاوہ ایک مثال ہمیں ۱۲۹۳ھ ہجری میں خلافتِ عثمانیہ میں ملتی ہے، جب عدلیہ کی زیر نگرانی ایک سات رکنی مجلس نے نو سال کی محنت کے بعد مختلف قوانین پر مبنی مجلّہ تیار کیا تھا۔

اسلامی قانون سازی کی تاریخ اس لحاظ سے کوئی شاندار پس منظر نہیں رکھتی کہ اس پر جس محنت اور توجہ کی ضرورت تھی وہ اسے بوجوہ نہ دی گئی۔ ہمارے نزدیک اس کی بنیادی وجہ حکومتوں اور علماء کے درمیان ضروری روابط اور خیر سگالی کے جذبات کی کمی تھی۔ بادشاہ اور حکومتیں ہمیشہ علماء کو اپنا ہمنوا بنانے کے لئے کبھی غیر ضروری دباؤ اور کبھی لالچ کا طریقہ اختیار کرتی رہیں۔ اپنے مفادات کو پورا کرنے کے لئے دین کو ڈھال بنانے کی کوشش کی گئی۔ اس طرح علمائے حق تو فوراً پیچھے ہٹ گئے اور علمائے سوء کو عوام نے قبول کرنے سے انکار کردیا۔ یوں دینی اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے قانون سازی کا ٹھوس اور جامع کام سرکاری سطح پر سنجیدگی سے نہ ہوسکا۔

ہمارے خیال میں اس وقت ضرورت اس امر کی ہے کہ علماء پر مشتمل ایک ایسے آزاد ادارے کا قیام عمل میں لایا جائے جس کو مختلف مکاتب فکر کے لوگوں کی بھرپور حمایت حاصل ہو۔ وہ ادارہ پارلیمنٹ کو صرف سفارشات بھجوانے پر مامور نہ ہو بلکہ پارلیمنٹ اسکی سفارشات ماننے کی پابند ہو۔ اس کے علاوہ موجودہ دور کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ضرورتوں اور اصطلاحوں کی تشریح اور مختلف مسائل پر اپنی آراء سے امت کی راہنمائی بھی کرے۔ مثلاً آج کے دور میں میڈیا اور خصوصاً ٹی وی، تصاویر کی بہتات، خواتین کی ہر میدان میں موجودگی نے لوگوں کے ذہنوں میں بہت سے سوالات کو جنم دیا ہے۔ دوسری طرف جہاد، دہشت گردی کی اسلامی تعریف، خودکش حملوں کی شرعی حیثیت پر گو انفرادی طور پر علماء نے اپنی آراء کا اظہار کیا ہے مگر ثقہ علماء کی جانب سے سنجیدہ اجتماعی کوشش کا امت کو اب تک انتظار ہے۔

امام ابوحنیفہؒ پر اللہ کی رحمت ہو کہ انہوں نے انسانی ضرورتوں اور تمدن کے پھیلاؤ کے باعث پیش آنے والے مسائل کے حل کی فکر کی اور اس معاملے میں مشاورتی طرز کو اختیار کیا۔ حکومتی منصب کو اس لئے ٹھکرا دیا کہ سرکاری عہدہ پر رہتے ہوئے غیر جانبداری برقرار رکھنا انہیں اس زمانے میں ممکن نظر نہ آتا تھا۔ البتہ اپنے شاگردوں کو اس کی اجازت دی کہ اگر وہ چاہیں تو سرکاری مناصب اس شرط پر قبول کر سکتے ہیں کہ وہ اپنے فیصلوں میں بالکل آزاد ہوں گے۔ حکومتی دباؤ میں آ کر اپنی رائے سے ہٹنے کی ممانعت کی۔ قاضی ابو یوسف کو جو آپ کے شاگرد رشید تھے، آپ نے ہدایت کرتے ہوئے لکھا ہے:

''بادشاہ اگر تم کو عہدۂ قضاء پر مقرر کرنا چاہے تو پہلے دریافت کر لینا کہ وہ تمہارے طریقۂ اجتہاد سے موافق ہے یا نہیں؟ ایسا نہ ہو کہ سلطنت کے دباؤ سے تم کو اپنی رائے کے خلاف عمل کرنا پڑے۔ جس عہدہ اور خدمت کی تم میں قابلیت نہ ہو اس کو ہرگز قبول نہ کرنا''

آخر میں لکھتے ہیں:

''خود بادشاہ سے اگر کوئی نامناسب حرکت سرزد ہو تو صاف کہہ دینا کہ گو میں عہدۂ قضاء کے لحاظ سے آپ کا مطیع ہوں تاہم آپ کی غلطی پر مطلع کر دینا میرا فرض ہے۔ پھر بھی نہ مانے تو تنہائی میں سمجھانا کہ آپ کا یہ فعل قرآن مجید اور احادیث نبوی ﷺ کے خلاف ہے۔ اگر سمجھ گیا تو خیر ورنہ خدا سے دعا کرنا کہ اس کے شر سے تم کو محفوظ رکھے۔''

آج امام ابوحنیفہؒ کے چاہنے والے اور ان کی برتری کو دوسرے اماموں پر ثابت کرنے والے بہت موجود ہیں۔ مگر افسوس امت کے مسائل کو حل کرنے کی اجتماعی خدمت کو ان کے طریقے پر انجام دینے والے ناپید ہیں۔ امید کرنی چاہئے کہ علمائے امت بالعموم اور علمائے احناف بالخصوص اسلامی قانون سازی کی اجتماعی کوشش کی طرف توجہ دیں گے جو موجودہ دور کی اہم ضرورت ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

امام مالکؒ

فقہ مالکی کے بانی اور دوسری صدی ھجری میں مدینہ منورہ میں حدیث اور فقہ کے سب سے بڑے عالم

تعارف

آپ کا نام مالک، کنیت ابوعبداللہ اور لقب امام دارالہجرہ تھا۔ آپ کا سلسلہ نسب یہ ہے:

مالک بن انس بن مالک بن ابی عامرؒ۔

ولادت

صحیح تر روایات کے مطابق آپ ۹۳ ہجری میں مدینہ میں پیدا ہوئے۔

پس منظر

امام مالک کا تعلق ایک علمی خانوادے سے تھا۔ آپ کے پردادا ابو عامر عہد نبوی میں مسلمان ہوئے۔ کچھ روایات سے ان کے صحابی رسول ﷺ ہونے کی دلیل بھی ملتی ہے۔ آپ کے خاندان میں سب سے پہلے ابو عامر نے مدینہ منورہ تشریف لاکر سکونت اختیار فرمائی تھی۔ آپ کے دادا مالک بلند پایہ تابعی تھے۔ حضرت عثمانؓ کے ساتھ ان کو خاص تعلق تھا۔ یہاں تک کہ ان کی شہادت کے بعد ان کے دفنانے کے خطرناک کام میں بھی شریک ہوئے۔ اس کے علاوہ طلحہؓ، عقیلؓ بن ابی طالب، ابو ہریرہؓ اور عائشہؓ کی شاگردی اختیار کی۔ سلیمان بن یسار نے جو مدینے کے فقہائے سبعہ میں سے تھے ان سے حدیث کی تعلیم حاصل کی۔

آپ کے چچا ابو سہیل نافع بھی بلند پایہ کے محدث تھے۔ ان کے شاگردوں میں امام زہریؒ اور امام اسماعیل بن جعفر بہت مشہور ہوئے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مدینۃ الرسول کی علمی سرگرمیاں

قبل اس کے کہ امام مالک کے تعلیمی مراحل کا تذکرہ کیا جائے، مناسب ہوگا کہ مختصراً مدینہ کی علمی سرگرمیوں پر ایک نظر ڈال لی جائے۔ آنحضرت ﷺ کے انتقال کے بعد اگرچہ بہت سے صحابہ مدینہ چھوڑ کر دور دراز مقامات پر چلے گئے مگر مدینہ پھر بھی دینی علوم کا مرکز رہا۔ عائشہؓ، عبداللہؓ بن عمرؓ، ابو ہریرہؓ، عبداللہؓ بن عباسؓ اور زیدؓ بن ثابت کی درسگاہیں علوم اسلامی کی ترقی اور ترویج میں مصروف رہیں۔ بعد میں ان کے شاگردوں کی کوششوں اور کاوشوں نے اس سلسلے کو جاری رکھا اور پورے بلادِ اسلامیہ میں مدینہ دینی علوم کے حصول کے لئے نمایاں مرکز کی حیثیت اختیار کر گیا۔

حضرت عائشہؓ سے ان کے بھتیجے قاسم بن محمد بن ابی بکر اور ان کے بھانجے عروہ بن زبیر نے، عبداللہؓ بن عمرؓ سے نافع اور عبداللہ بن دینار نے، زیدؓ بن ثابت سے ان کے بیٹے خارجہ بن زید اور عبداللہ بن عباسؓ اور ابو ہریرہؓ سے سعید بن مسیب نے علم حاصل کر کے اس سلسلے کو جاری رکھا۔ اس کے علاوہ امام زہری، امام جعفر صادق اور ربیعہ رائی نے مدینہ کے علماء میں بہت شہرت پائی۔

عمر بن عبدالعزیزؒ کے عہد میں فقہائے سبعہ کی اجتماعی مجلس کو اپنے عہد کی سب سے بڑی قانون ساز مجلس کہا جا سکتا ہے۔ یہاں تک کہ عدالت عالیہ بھی ان سے فائدہ اٹھاتی۔ اس مجلس میں صحابہ کے فتاوی زیر بحث آتے اور مختلف مسائل پر گفتگو کی جاتی۔ بعض دفعہ مقدمات کے فیصلے بھی طے پاتے۔

تعلیم و تربیت

خیال کیا جا سکتا ہے کہ اس خاندانی پس منظر کے ساتھ مدینہ کے علمی ماحول اور پاکیزہ فضا نے امام مالکؒ کی کیسی زبردست تربیت کی ہوگی۔ اس وقت تعلیم کا نصاب نہایت سادہ اور مختصر تھا۔ یعنی قرآن مجید، حدیث اور فقہ، امام صاحب نے بھی ان کے حصول کے لئے کوشش کی۔ چنانچہ قرآن مجید کی قرأت وسند، امام القراء ابو رویم نافع بن عبدالرحمٰنؒ سے حاصل کی جن کی قرأت پر آج تمام دنیائے اسلام کی قرأت کی بنیاد ہے۔ علم الحدیث کی تعلیم بھی بچپن سے شروع ہوئی۔ آپ کے سب سے پہلے شیخ الحدیث نافع ہیں جنہوں نے ۳۰ برس عبداللہ بن عمرؓ کی خدمت کی، علم کا خزانہ سمیٹا اور پھر زندگی بھر اس کو پھیلاتے رہے۔ بڑے بڑے آئمہ حدیث ان کے شاگرد تھے۔ امام مالکؒ نے بھی اپنے ابتدائی زمانہ میں ان سے تعلیم حاصل کی۔ خود آپ کا بیان ہے:

''میں نافع کے پاس آتا تھا تو ایک کمسن لڑکا تھا۔ میرے ساتھ ایک غلام ہوتا تھا۔ نافع اتر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کر آتے تھے تو مجھ سے حدیث بیان کرتے تھے۔''

امام مالکؒ کو اپنے استاد کے علم پر اتنا بھروسہ تھا کہ فرماتے ہیں:

''جب میں ابن عمرؓ کی حدیث نافع کی زبان سے سن لیتا ہوں تو پھر اسکی پرواہ نہیں کرتا کہ کسی اور سے بھی اس کی تائید سنوں۔''

بعد میں وہ روایات جو امام مالکؒ نے نافع سے اور نافع نے ابن عمرؓ سے روایت کیں انہیں ''طلائی زنجیر'' کہا جانے لگا۔

اس کے علاوہ محمد بن شہاب الزہری کی شاگردی اختیار کی۔ ان کا رتبہ روایتِ حدیث میں بہت بلند ہے۔ صحاحِ ستہ کی احادیث میں ان سے روایت شدہ احادیث کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ابوبکر بن حزم کے بعد علم حدیث کے یہ دوسرے مدون ہیں۔ ناقدینِ حدیث امام زہری سے بڑھ کر متن وسند کا حافظ کسی کو نہ سمجھتے تھے۔ ان سے یہ علم امام مالکؒ کو منتقل ہوا۔ زہری کے بے شمار شاگردوں میں امام مالکؒ سب سے بلند مرتبہ سمجھے جاتے ہیں۔

علم حدیث کے حصول کے لئے نافع اور زہری کے علاوہ امام جعفر صادق، محمد بن المنکدر، محمد بن یحییٰ، ابوحازم اور ابوسعید یحییٰ کی شاگردی اختیار کی۔ امام مالک کے اساتذہ کی فہرست کو دیکھا جائے تو تقریباً ۹۳ شیوخ سے آپ کے استفادے کی تفصیل ملتی ہے۔

علم الفقہ کی تعلیم خاص طور سے الربیعہ سے حاصل کی۔ اجتہاد میں ان کا درجہ اتنا بلند تھا کہ ''رائی'' ان کا لقب ہوگیا۔ ربیعہ خاص مسجد نبوی ﷺ میں درس دیتے تھے۔ یوں تو ان کے لائق فائق شاگردوں کی فہرست بہت طویل ہے لیکن امام مالک کے ساتھ ربیعہ کو ایسا تعلق تھا کہ اسماء الرجال میں ''شیخ مالک'' ان کے نام کا جزو بن گیا۔

یہ وہی ربیعہ ہیں جن کی تعلیم و تربیت میں ان کی والدہ کا بے مثال تذکرہ کتابوں میں یوں آتا ہے کہ ربیعہ ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے تھے کہ ان کے والد جنگ خراسان میں شرکت کی غرض سے چلے گئے اور بیوی کو ۳۰ ہزار دینار دے گئے۔ ۲۷ سال بعد واپس آئے تو ان کے بیٹے ربیعہ جوان ہوکر صاحب کمال ہو چکے تھے اور مسجد نبوی ﷺ میں درس دیا کرتے تھے۔ ان کے والد نے ان کی یہ شان دیکھی تو بہت مسرور ہوئے۔ کچھ رک کر بیوی سے روپیہ کا حساب پوچھا تو بیوی نے پوچھا کہ بیٹے کی یہ شان عزیز ہے یا وہ روپیہ۔ کہنے لگے بیٹے کا یہ مرتبہ عزیز ہے۔ بیوی کہنے لگی، بس وہ سب اس کی تعلیم و تربیت میں خرچ ہو گیا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

امام مالکؒ نے صرف انہی اساتذہ سے علم سیکھا جو صدق وسچائی اور حفظ وفقہ میں ممتاز تھے۔ خود فرماتے ہیں کہ "مدینہ میں بیسیوں اشخاص تھے، جن سے لوگ حدیث سیکھتے تھے۔ لیکن میں نے کبھی ان سے اخذِ علم نہیں کیا۔ ان میں سے بعض مغزِ سخن سے ناواقف اور بعض جاہل تھے"۔ امام مالکؒ کی اسی احتیاط کو مدنظر رکھتے ہوئے آپ کے شاگرد کسی بھی شیخ کی روایت کو قبول کرتے ہوئے دیکھتے کہ امام صاحب نے بھی ان کا نام لیا ہے یا نہیں۔ اگر امام صاحب کے تذکروں میں ان کا نام پاتے تو قبول کرتے، ورنہ چھوڑ دیتے۔ طلب علم کے لئے آپ سے سفر ثابت نہیں ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک تو خود مدینہ ہی دینی علوم کا مرجع بنا ہوا تھا۔ پھر تمام دنیائے اسلام کے طالبینِ علم خود ہی مدینہ حاضر ہوتے تھے اور بڑے بڑے شیوخ بھی زمانہ حج میں خود یہاں تشریف لا کر علم کے موتی بکھیرتے۔ امام صاحب کے شیوخ میں ان حضرات کے نام بھی ملتے ہیں جو مدینہ میں سکونت نہیں رکھتے تھے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ آپ نے ان سے اخذ واستفادہ مدینہ ہی میں کیا ہوگا۔

امام مالک قوی الحافظہ تھے۔ فرمایا کرتے تھے "کوئی چیز میرے خزانۂ دماغ میں آکر پھر نہیں نکلتی"۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ حصولِ علم امام مالک کے لئے کوئی سہل چیز تھی۔ آپ کا بیان ہے کہ "نافع سے حدیث سیکھنے کا وقت ٹھیک دوپہر تھا۔ دوپہر کی دھوپ میں بلا سایہ شہر سے باہر بقیع میں جاتا تھا جہاں ان کا مسکن تھا"۔

ایک اور شیخ ابن ہرمز کا ذکر کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ "ان کے گھر صبح کو جاتا تو رات کو ہی آتا تھا"۔ اس خلوص اور محنت شاقہ نے جلد ہی آپ کو صاحب علم وفضل بنا دیا اور آپ کے ہم عصر آپ پر رشک کرنے لگے۔

مجلسِ درس

امام مالک کم عمری میں ہی درسِ حدیث وفقہ کی مسند پر جا بیٹھے۔ چنانچہ شعبہ جو کوفہ کے سب سے بلند پایہ محدث سمجھے جاتے تھے بیان کرتے ہیں "نافع کی وفات کے ایک سال بعد مدینہ آیا تو دیکھا کہ مالک ایک حلقہ کے صدر نشین ہیں"۔ اس وقت آپ کی عمر اندازاً ۲۴ برس تھی۔ مستقلاً درس کا حلقہ قائم کرنے سے پہلے خود فرماتے ہیں کہ: "جب تک ۷۰ مشاہیر علماء نے اس بات کی گواہی نہ دی کہ میں فتویٰ کا اہل ہوں، اس وقت تک اس منصب کو اختیار نہ کیا"۔ ابھی آپ کے استاد ربیعہ رائی زندہ تھے کہ آپ حدیث وفقہ میں ماہر سمجھے جانے لگے اور ربیعہ کی وفات (۱۳۶ ہجری) کے بعد فقہ واجتہاد کے امام تسلیم کر لئے گئے۔

امام مالک کی مجلسِ درس ہمیشہ پرتکلف اور شاندار ہوتی تھی۔ بیش قیمت قالین بچھائے جاتے، خوشبو مہکائی جاتی، صفائی کا یہ عالم تھا کہ فرش پر ایک تنکا بھی پڑا دکھائی نہ دیتا۔ امام مالک مجلس کے وسط میں اس جگہ اونچی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نشست پر بیٹھتے جہاں امیر المومنین عمر فاروقؓ بیٹھا کرتے تھے۔ پھر حدیث کی سماعت فرماتے تھے۔

مجلس میں ایسی خاموشی ہوتی کہ امام شافعی فرماتے ہیں کہ ''ہم لوگ کتاب کے ورق بھی اس ڈر سے نہیں الٹتے تھے کہ کھڑکھڑاہٹ کی آواز نہ ہو۔'' اتنی خاموشی اور اتنا سکوت اس پر تھا کہ آپ کی مجلس میں سینکڑوں طلباء، علماء، امراء اور سیاح حاضر ہوا کرتے تھے۔ شور و شغب تو دور کی بات، آپ کی مجلس میں تو کسی شخص کو بلند آواز سے بولنے کی مجال نہ تھی۔

امام صاحب کا دورانِ درس ایسا رعب طاری ہوتا کہ ایک شاعر نے اس کو اشعار کی صورت میں یوں قلمبند کیا۔ ''اگر امام صاحب جواب دینا چھوڑ دیں تو سب سر نیچا کئے بیٹھے رہیں اور آپ کی ہیبت سے دوبارہ پوچھنے کی جرأت نہ کر سکیں۔ وقار آپ کا ادب کرتا تھا اور آپ پرہیز گاری کی بادشاہت پر عزت کے ساتھ متمکن تھے۔ عجیب بات یہ تھی کہ آپ کی ہیبت لوگوں پر پڑتی، حالانکہ آپ بادشاہ نہ تھے۔''

مجلس میں امیر و غریب اور خاص و عام کی کوئی تمیز نہ تھی۔ البتہ اپنے قریب سمجھدار اور لائق طلبہ کو جگہ دیتے۔ درس شروع کرنے سے قبل فرماتے ''صاحبِ فہم لوگ قریب آ کر بیٹھیں۔''

آپ کا طریقۂ تدریس یہ تھا کہ شاگرد پڑھتا اور آپ سنتے اور بوقتِ ضرورت اصلاح کر دیتے۔ محدثین کی اصطلاح میں اسے ''قرأۃ التلمیذ علی الشیخ'' کہا جاتا ہے۔ ایک اور طریقہ جو رائج تھا اس میں استاد پڑھتا اور شاگرد سنتے تھے۔ اس طریقے کو ''قرأۃ الشیخ علی التلمیذ'' کہا جاتا تھا۔ امام مالک کا طریقہ ہر لحاظ سے بہتر اور محفوظ تھا۔ محدث خود قرأت نہ کرتا تھا۔ اس لئے دوبارہ سننے میں اپنے مسودے کی غلطی کی اصلاح کر لیتا۔ پھر شاگردوں کو بھی پتہ چل جاتا کہ حدیث کا اصل متن کیا ہے اور شیخ نے اس بارے میں کیا فرمایا ہے۔ ورنہ دوسری صورت میں اصل متنِ حدیث اور شیخ کا کلام خلط ملط ہونے کا خدشہ رہتا۔ آپ کے درس میں حدیث کی املاء آہستہ اور سکون سے کی جاتی۔ ایک حدیث ختم ہو جاتی تو پھر دوسری حدیث شروع کرتے۔

احترامِ حدیث اور حبِّ رسول ﷺ

عموماً دیکھا گیا ہے کہ جن علماء کا اوڑھنا بچھونا درس و تدریس ہو وہ قرآن اور حدیث کے بیان میں ضروری احتیاط اور خصوصی اہتمام نہیں کر پاتے۔ امام صاحب کا معاملہ مختلف تھا۔ آپ کے ہاں نبی اکرم ﷺ کی ذات اور آپ ﷺ کے اقوال کا اتنا ادب کیا جاتا کہ مناسب ہوگا کہ اس موضوع پر ایک الگ عنوان کے تحت روشنی ڈالی جائے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

امام صاحب درسِ حدیث سے قبل غسل کرتے، خوشبو لگاتے، صاف ستھرے اور عمدہ کپڑے زیب تن کرتے۔ پھر حدیث بیان کرتے تو کمالِ ادب کی وجہ سے کبھی پہلو نہ بدلتے۔ مصعب بن عبداللہ کہتے ہیں ''جب آپ نبی اکرم ﷺ کا تذکرہ فرماتے تو آپ کے چہرے کا رنگ متغیر ہو جاتا اور سرحدِ ادب سے جھک جاتا''۔ اس ضمن میں ایک مشہور واقعہ آپ کے شاگرد عبداللہ بن مبارک نے روایت کیا ہے۔ فرماتے ہیں: ''ایک روز جب مالکؒ حدیث روایت فرما رہے تھے ایک بچھو نے کاٹا اور غالباً دس بار ڈنک مارا ہوگا۔ اس تکلیف کی وجہ سے امام صاحب کا چہرہ زردی مائل ہو گیا۔ مگر انہوں نے سلسلۂ حدیث کو منقطع نہ ہونے دیا۔ جب مجلسِ حدیث ختم ہوگئی اور سب لوگ چلے گئے تو میں نے آپ سے عرض کیا کہ آج آپ کے چہرے پر کچھ تغیر محسوس ہو رہا تھا۔ اس پر آپ نے صورتِ واقعہ بیان کی اور کہا کہ اس قدر صبر کرنا قدرتِ برداشت کی بناء پر نہ تھا بلکہ نبی اکرم ﷺ کی حدیث کی تعظیم کی وجہ سے تھا۔''

یہ خصوصی اہتمام درسِ حدیث کے لئے ہی کرتے اور جب فقہ کے لئے تشریف لاتے تو جس حال میں ہوتے بیٹھ جاتے۔

آپ کی تمام عمر مدینہ منورہ میں گذری، لیکن حرم نبوی کا احترام اس قدر تھا کہ قضائے حاجت کے لئے حدودِ حرم سے باہر تشریف لے جاتے۔ عمر بھر مدینہ منورہ میں سوار ہو کر نہیں پھرے، حتیٰ کہ ضعف اور کمزوری کی حالت میں بھی فرماتے کہ مجھ کو شرم آتی ہے کہ میں اپنی سواری کے کھروں سے اس جگہ کو روندوں جس مبارک سرزمین پر حضور اکرم ﷺ آرام فرما رہے ہوں۔

اگر کوئی شخص اپنی آواز مسجد نبوی ﷺ میں بوقتِ درسِ حدیث بلند کرتا تو اس کو آواز پست کرنے کو کہتے۔ اس لئے کہ اللہ کا حکم ہے کہ ''اے ایمان والو! اپنی آواز کو نبی کی آواز سے بلند نہ کرو۔'' امام مالکؒ کا خیال تھا کہ حدیث بیان کرتے وقت زور سے بولنا ایسا ہی ہے جیسا حضور ﷺ کی آواز پر اپنی آواز بلند کرنا۔ ایک بار خلیفہ منصور کو مسجد نبوی ﷺ میں زور سے بولنے پر تنبیہ کی۔

مسجد نبوی ﷺ سے آپ کو ایک گونہ محبت تھی۔ ایک بار خلیفہ ہارون نے چاہا کہ منبر نبوی ﷺ کو جس پر صرف تین زینے تھے اور بعد میں اس پر اضافہ کر دیا گیا، واپس اس حالت میں لوٹا دیا جائے جیسا وہ نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں تھا۔ امام صاحب کو معلوم ہوا تو اس کو منع کیا کہ منبر کی لکڑی پرانی اور کمزور ہے۔ ایسا نہ ہو کہ تختوں کے ادھر ادھر کرنے سے ٹوٹ جائے اور یہ یادگارِ نبی ﷺ ضائع ہو جائے۔ آپ کی یہ بات سن کر ہارون باز آ گیا۔

عمر کے آخری حصے میں آپ مدینہ سے باہر کا سفر اختیار نہ کرتے۔ اس کے پیچھے یہ تمنا تھی کہ ''میں یہیں پر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مروں اور یہیں پر دفن ہوں۔'' زندگی میں بھی جب کبھی مدینہ سے باہر جانے کی بات سامنے آتی تو انکار کر دیتے۔ایک بار خلیفہ مہدی نے دو ہزار اشرفیاں روانہ کیں اور اپنے ساتھ بغداد لے جانے کے لئے اصرار کرنے لگا۔آپ نے انکار کر دیا تو کسی کے ہاتھ دوبارہ کہلا بھیجا۔آپ نے ''**المدینة خیر لھم**''(مدینہ ان کے حق میں بہتر ہے) والی حدیث نقل فرمائی اور قاصد کو کہا کہ مال کی تھیلی موجود ہے، چاہو تو اٹھا کر لے جاؤ، مگر مدینہ سے دور جانا گوارا نہیں ہے۔

اللہ کے نبی کی ذات، آپ ﷺ کے ارشادات اور آپ ﷺ سے نسبت رکھنے والی ہر چیز سے شدید محبت تھی۔مختلف روایات میں آتا ہے کہ خواب میں کئی بار آپ کو نبی اکرم ﷺ کا دیدار مبارک بھی نصیب ہوا۔

سیاسی حالات

امام مالک صاحبِ علم تو تھے ہی، صاحبِ بصیرت اور صاحبِ حق بھی تھے۔اللہ نے آپؒ کی زبان پر حق کو جاری کر دیا تھا اور آپ کے دل کو حق بات کا محافظ بنایا تھا۔ایسے مواقع آئے کہ آپ نے اپنی جان اور آبرو کی پرواہ کئے بغیر کلمہ حق بلند کیا۔قبل اس کے کہ امام صاحب کے اس تاریخی کردار پر روشنی ڈالی جائے اس زمانے کے سیاسی حالات مختصراً بیان کرنا مناسب ہوگا۔

چوتھے خلیفہ راشد حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد خلافت بنوامیہ کے خاندان کے پاس چلی گئی۔لیکن ہاشمیوں نے، جن میں فاطمہؓ کی اولاد، عباسؓ کی اولاد اور عام علوی شامل تھے، دل سے ان کی حکومت کو قبول نہ کیا اور خلافتِ ہاشمیہ کے قیام کی خفیہ کوششیں جاری رہیں۔یہ لوگ اپنے سیاسی و دینی مقاصد کے حصول کے لئے امام نامزد کرتے۔ابتداء میں امام علوی خاندان سے چنے جاتے جو تاحیات اس منصب پر فائز رہتے اور مرنے سے قبل کسی اور علوی کو امام نامزد کر دیتے۔بعد ازاں ابوہشام کا جب شام میں انتقال ہوا تو وہاں سوائے عباسؓ کے پڑپوتے محمد کے اور کوئی ہاشمی موجود نہ تھا۔چنانچہ ابوہشام نے موت سے قبل اپنی جانشینی کی وصیت محمد کے حق میں کی۔یہ پہلا دن تھا جب علوی خاندان سے خلافت کا دعویٰ خاندانِ عباس میں منتقل ہوگیا۔محمد کے بعد ان کے بیٹے ابراہیم امام بنے اور ان کے بعد ابوالعباس سفاح بنوہاشم کا سرخیل ہوا۔۱۳۲ ہجری میں سفاح حکومت بنوامیہ سے چھیننے میں کامیاب ہوگیا۔مروان جو بنوامیہ کا حاکم تھا، بنوعباس سے شکست کھا کر بھاگا اور بالآخر مارا گیا۔مروان کے قتل اور اموی حکومت کے خاتمے کے بعد بھی بنوعباس کے جذبۂ انتقام کو تسکین نہ ملی اور انہوں نے عوام کے دلوں پر اپنا رعب بٹھانے کے لئے نہایت بیدردی سے اموی خاندان کا نام و نشان مٹانے کی کوشش

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی۔ یہاں تک کہ اموی خلفاء کی قبریں کھدوا کر ان کی خاک برباد کی۔ حکومت ملنے کے بعد ابوالعباس سفاح نے حقِ خلافت کو بنو ہاشم میں سے صرف بنو عباس کے لئے مخصوص کر دیا۔

ایک طرف بنو امیہ کی بیخ کنی میں ظلم وستم کی تمام حدیں توڑ دی گئیں تو دوسری طرف فاطمی اور علوی بھی خلافت کو بنو عباس تک محدود کرنے پر سخت ناراض تھے۔ سفاح کی خلافت کا ساڑھے چار سالہ دور خانہ جنگیوں کی نذر ہو گیا۔ ابو مسلم خراسانی جو عباسی تحریک کا روح رواں تھا، دراصل پارسی نژاد نومسلم تھا اور انتہائی تیز طرار اور زبردست ذہن کا مالک تھا۔ اس نے اپنی کارگزاریوں اور حسنِ خدمت سے ایک طرف تو عباسیوں میں رسوخ حاصل کر لیا تھا تو دوسری طرف عربوں سے شدید نفرت کے باعث ان کو لڑانے کے درپے رہتا۔ اس کو اپنی کوششوں میں کامیابی حاصل ہوئی اور عرب قبیلے آپس میں الجھ پڑے جس سے ان کی طاقت پارہ پارہ ہو گئی۔

امام مالکؒ کی بے نفسی اور علمی انکساری

ابوالعباس سفاح کی موت کے بعد اس کا بھائی ابو جعفر منصور خلیفہ ہوا تو وہ ۱۴۰ ہجری میں حج وزیارت کے لئے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ آیا۔ منصور امام مالک کا زبردست معتقد تھا۔ وہ اس انقلاب سے پہلے مدینہ کی درسگاہ کا ایک طالب علم اور امام مالک کے حلقے کا ایک شریکِ صحبت تھا۔ آپ کی قدر سے واقف تھا۔ اس نے علماء کی محفل میں خاص طور سے آپ کو مخاطب کر کے کہا ''اے ابو عبداللہ! میں اختلافاتِ فقہی سے گھبرا گیا ہوں۔ عراق میں تو کچھ نہیں ہے۔ شام میں صرف شوقِ جہاد ہے، وہاں کوئی بڑا علم نہیں ہے۔ جو کچھ ہے وہ حجاز میں ہے اور حجاز کے علماء کے سرخیل آپ ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کی تصنیف موطا کو خانہ کعبہ میں آویزاں کر دوں تاکہ لوگ اسی کی طرف رجوع کریں اور تمام اطرافِ مملکت میں اس کی نقلیں بھیجوں تاکہ اسی کے مطابق لوگ فتویٰ دیں۔''

اس پر امام صاحب نے فرمایا ''صحابہ تمام اطرافِ مملکت میں پھیل گئے تھے۔ ان کے فتاویٰ اور احکام اپنے مقام میں وراثتاً ان کے فقہاء اور علماء تک پہنچے ہیں اور ہر جگہ وہی مقبول ہیں۔ ایسی حالت میں ایک شخص کی رائے وعقل پر جو صحت اور غلطی دونوں کر سکتا ہے تمام ملک کو مجبور کرنا مناسب نہیں۔'' منصور نے کہا ''اگر آپ مجھ سے متفق ہوتے تو میں یہی کرتا۔'' امام مالکؒ کے اس علمی انکسار کا موازنہ ہمارے یہاں کے طرزِ عمل سے کرنا چاہئے جہاں کیا علماء اور کیا عوام سبھی اپنی فقہ کے بزور نفاذ کے لئے حکامِ وقت کو دہائیاں دیتے رہتے ہیں بلکہ اس کے لئے تحریک چلانے سے بھی گریز نہیں کرتے۔

منصور امام مالک کی کس قدر عزت کرتا تھا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک بار سفیان

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ثوری منصور سے ملاقات کو گئے اور دیر تک اسے سخت الفاظ میں نصیحت کرتے رہے۔ ایک درباری نے کہا ''آپ ایسے زبان دراز شخص کے قتل کا حکم کیوں نہیں دیتے؟'' منصور نے کہا ''خاموش! سفیان ثوری اور مالک بن انس کے سوا کوئی نہیں جس کا ادب کیا جائے۔''

صاحبِ عزیمت

خلیفۂ وقت کی یہ قدر شناسی آپ کو اپنی طرف مائل کر سکتی تھی۔ مگر حق شناسی اور حق گوئی کی راہ میں نہ ظالم کا ظلم حائل ہوا اور نہ قدر شناس حاکم کی نظرِ کرم۔ خلیفہ منصور نے جب دیکھا کہ فاطمی وعلوی خلافت کو بنو عباس کے لئے مخصوص کرنے پر خوش نہیں ہیں تو ان کے ساتھ انتہائی ناروا سلوک اختیار کیا گیا۔ یہاں تک کہ جب ظلم وتعدی حد سے بڑھ گیا تو سادات میں سے نفس زکیہ نے مدینہ سے خروج کیا۔ امام صاحب نے فتویٰ دیا کہ خلافت نفس زکیہ کا حق ہے۔ لوگوں نے پوچھا ہم منصور کی بیعت پر حلف اٹھا چکے ہیں۔ امام صاحب نے فرمایا ''منصور نے جبراً بیعت لی ہے اور جو کام جبراً کرایا جائے شرع میں اس کا اعتبار نہیں۔ حدیث ہے کہ اگر جبراً کسی سے طلاق دلائی جائے تو واقع نہ ہوگی۔''

مدینہ کے اکثر لوگوں نے نفس زکیہ کا ساتھ دیا۔ مگر ان کو کامیابی حاصل نہ ہوئی اور وہ بڑی بہادری سے میدانِ جنگ میں لڑتے ہوئے مارے گئے۔ ان کے بھائی ابراہیم بھی میدان میں آئے مگر وہ بھی مارے گئے۔ منصور نے اپنے چچا زاد بھائی جعفر کو مدینہ کا والی مقرر کیا۔ جعفر نے مدینہ پہنچ کر نئے سرے سے لوگوں سے بیعت لی اور امام مالک کو کہلا بھیجا کہ آئندہ طلاق جبری کے خلاف فتویٰ نہ دیں ورنہ لوگ جبری بیعت کو بھی بے اعتبار ٹھہرائیں گے۔ امام صاحب بھلا حق بات کہنے سے کب رکنے والے تھے۔ چنانچہ آپ کے لئے ستر کوڑوں کی سزا کا فیصلہ سنایا گیا۔

امام صاحب مجرموں کی طرح لائے گئے۔ قمیض اتار کر ستر کوڑے برسائے گئے۔ کمر خون آلود ہوگئی۔ کاندھے کے جوڑ تک ہل گئے۔ پھر اونٹ پر بٹھا کر سارے شہر میں اس حال میں پھرایا گیا کہ امام صاحب رستی ہوئی پیٹھ کے ساتھ نڈھال اونٹ پر بیٹھے تھے اور زبان نعرۂ حق بلند کرنے میں مصروف تھی۔ مدینہ کی گلیوں سے گذرتے ہوئے کہتے جاتے تھے:

> ''جو مجھ کو جانتا ہے وہ جانتا ہے، جو نہیں جانتا وہ جان لے کہ میں مالک بن انس ہوں اور فتویٰ دیتا ہوں کہ طلاقِ جبری درست نہیں۔''

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پھر مسجدِ نبوی ﷺ تشریف لائے، خون صاف کیا اور دوگانہ نماز پڑھ کر فرمایا ''سعید بن مسیب کو کوڑے مارے گئے تھے تو انہوں نے بھی مسجد میں آ کر نماز پڑھی تھی۔''

بعد میں منصور کو جب اس واقعے کا علم ہوا تو اسے بہت افسوس ہوا۔ آپ کی خدمت میں معذرت کی اور اپنے چچازاد بھائی کے خلاف کارروائی کی۔ یہ واقعہ آپ کے خلاف حجت بننے کے بجائے آپ کے حق میں حجت بن گیا اور رہتی دنیا تک کلمۂ حق بلند کرنے والوں میں آپ کا نام شامل ہو گیا۔

منصور کو ایک بار معلوم ہوا کہ علماء اس کی حکومت سے ناراض ہیں۔ اس کے جی میں آیا تو رات کے وقت آپ کو اور چند دیگر علماء کو بلا بھیجا۔ امام صاحب غسل کر کے اور حنوط مل کر حاضر ہوئے۔ منصور نے کہا۔ ''اے گروہ فقہاء تم کو فرض تھا کہ میری اطاعت کرتے، مگر تم مجھ کو برا بھلا کہتے ہو۔ اگر مجھ میں کچھ برا ہی ہے تو تم نصیحت کرتے۔'' پھر امام صاحب سے پوچھا کہ ''میں تمہارے نزدیک کیسا ہوں؟''

امام صاحب نے کہا ''اللہ کے لئے مجھے اس کے جواب سے معاف رکھئے۔'' آپ کی یہ خاموشی خود آپ کی رائے کی مظہر تھی۔ پھر دوسرے علماء سے بھی یہ سوال کرتا رہا۔ جب سب اٹھ کر چلے گئے تو امام صاحب سے پوچھنے لگا کہ ''کیا وجہ ہے کہ آپ کے کپڑوں سے حنوط کی بو آتی ہے۔''

امام مالک نے فرمایا ''میں اس وقت بے وقت حاضری کا سن کر اپنی زندگی سے مایوس ہو کر آیا تھا۔''

منصور نے کہا۔ ''سبحان اللہ ابوعبداللہ! کیا میں خود اپنے ہاتھ سے اسلام کا ستون گراؤں گا۔''

خلفائے وقت میں منصور کے بعد مہدی، ہادی اور پھر خود ہارون رشید آپ کی مجلس میں شریک ہوئے۔ مگر رواج کے برخلاف امام مالک نے نہ کسی کے ہاتھ چومے اور نہ ہی آپ کی جلالت اور رعب کے سامنے کسی کو ہمت ہوئی کہ اس پر اصرار کر سکے۔

فتاویٰ میں احتیاط اور تحقیق

ایک فقیہ کا رتبہ یقیناً ایک محدث سے زیادہ ہوتا ہے۔ محدث علم حدیث پر عبور رکھتا ہے جبکہ ایک فقیہ علم حدیث پر قدرت رکھنے کے ساتھ اجتہاد اور قوانین کی تشریح و تدوین میں بھی کمال رکھتا ہے۔ اس کے لئے فقیہ میں اصابتِ رائے اور بصیرت کا ہونا بہت ضروری ہے۔ ہر شخص اس رتبے پر فائز ہونے کا اہل نہیں۔

امام مالکؒ کی نزدیک یہ ایک ایسا اہم منصب تھا کہ خود بتاتے ہیں کہ جب تک ستر فقہاء نے اس بات کی گواہی نہ دے دی کہ میں فتویٰ دینے کے لائق ہوں اس وقت تک اس کام کو شروع نہ کیا۔ پھر بھی احتیاط کا یہ عالم

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تھا کہ محض ظن و گمان پر کبھی فیصلہ نہ دیتے۔ آپ کے ایک شاگرد نے کہا کہ اگر میں امام صاحب کے ''نہیں معلوم'' کو لکھا کرتا تو تختیاں بھر جاتیں۔

ابن عبداللہ کی روایت ہے کہ ایک شخص نہایت دور دراز کی مسافت طے کر کے امام صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس نے ایک مسئلہ پوچھا۔ امام صاحب نے کہا ''میں اس کو اچھی طرح نہیں جانتا۔'' سائل نے کہا ''میں چھ ماہ کی مسافت طے کر کے اس مسئلے کی خاطر حاضر ہوا ہوں۔ آخر میں واپس جا کر کیا جواب دوں گا''۔

امام صاحب نے اطمینان سے جواب دیا ''کہہ دینا مالک نے کہا ہے، میں اچھی طرح نہیں بتا سکتا۔''

لوگوں کا آپ کی طرف رجوع عام تھا۔ خود حکومت وقت کی طرف سے خاص اعلان کیا گیا تھا کہ ابن ابی ذئب اور مالک بن انس کے سواء کوئی حج کے موقع پر فتویٰ نہ دے۔ تاہم اس قبولِ عام کے باوجود آپ تلاش حق کے لئے علمی جستجو اور محنت میں کوئی کمی کرنے کے روادار نہ تھے۔

ایک بار کسی نے آپ سے کہا کہ فتویٰ دینے کے لئے آپ بہت مشقت برداشت کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ خود بتاتے ہیں کہ آپ کی نیند بعض اوقات مارے پریشانی کے غائب ہو جاتی ہے۔ حالانکہ لوگ تو آپ کی بات کو پتھر پر لکیر سمجھتے ہیں۔ خدا ترس امام نے جواب میں دلسوزی سے کہا۔ ''اس صورت میں تو مجھے اور بھی محنت کرنی چاہئے''۔

امام صاحب اپنی غلطی معلوم ہونے کی صورت میں اس کی اصلاح کرنے میں اپنی علمی وجاہت کا کوئی خیال نہ کرتے۔ ایک بار آپ کے شاگرد ابن وہب نے آپ کی تصحیح کی اور آپ کو صحیح حدیث پیش کی تو آپ نے اس کو تسلیم کیا اور پھر آئندہ اس کے مطابق فتویٰ دیا۔

آپ اپنی رائے لوگوں پر زبردستی ٹھونسنے کے حق میں نہ تھے۔ ہارون رشید نے بھی خلیفہ منصور کی طرح چاہا تھا کہ تمام مسلمانوں کو فقہی احکام میں آپ کی آراء کا پابند کیا جائے، مگر آپ نے انکار کر دیا۔

فقہ مالکی کی بنیادی خصوصیات

امام صاحب ۶۲ برس تک دین کی خدمت، حدیث نبوی کے درس اور فقہ و فتاویٰ میں مصروف رہے۔ آپ کی زندگی میں ہی آپ کی فقہ کو قبول عام حاصل ہو رہا تھا۔ اب ہم مالکی فقہ کی بنیادی خصوصیات کا تذکرہ کریں گے۔

۱۔ مالکی فقہ میں اجتہاد کی نوبت کم آتی ہے۔ زیادہ تر مواد کتاب و سنت اور آثار صحابہ و تابعین پر رکھا جاتا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے۔ایسے واقعات جو وقوع پذیر ہی نہ ہوئے ہوں امام صاحب ان کا جواب دینے سے احتراز کرتے۔فرماتے:

''جو ہوتا ہے وہ پوچھو جو نہیں ہوتا اسے چھوڑ دو۔''

۲-کتاب وسنت اور اجماع و قیاس کے علاوہ اس فقہ میں اہل مدینہ کے عمل کو بھی ایک دلیل کا درجہ دیا جاتا ہے۔کیونکہ مدینہ دارالاسلام اور شریعت اور قانون کا منبع تھا۔اس لئے مالکی فقہ میں مدنی فتاوی کو غیر معمولی اہمیت دی جاتی ہے۔

۳-اس فقہ میں مصالحِ مرسلہ(مصلحتِ عامہ یا Public good) کو بھی اصول فقہ میں داخل کیا گیا۔ امام مالک کو جب کوئی نص نہیں ملتی تو مصلحتِ عامہ کے پیش نظر اجتہاد کرتے۔یہ ایسے اصول ہوتے جن کے ذریعے ان مقاصد کی تکمیل ہوتی جن کے لئے شریعتِ اسلامی وجود میں لائی گئی ہے۔اس کے دلیلِ شرعی ہونے کے لئے کم از کم دو شرائط ہیں:

(۱) مسئلے کا تعلق عبادت سے نہ ہو بلکہ امورِ دنیا سے ہو۔

(۲) مصلحتِ عامہ کا تعلق ضروریاتِ زندگی سے ہو نہ کہ تعیشات سے۔اور ضروریات میں مذہب، جان، مال، نسل اور عقل شامل ہیں۔

اس کی مثالوں میں فوجی اخراجات اور ملک کے تحفظ کے لئے مالداروں پر ٹیکس لگانا، چور سے چوری کے مال کی برآمدگی نہ ہو تو اس کے بدلے دوسرا مال لینا وغیرہ شامل ہیں۔

مالکی فقہ کے پیرو بعد میں اہلِ حدیث کہلائے۔اس مذہب میں تصنیف و تالیف کا وہ چرچا نہیں رہا جو حنفی اور شافعی مکاتب میں رہا ہے۔

مالکی فقہ حجاز، بصرہ، اندلس، سوڈان، طرابلس، مصر، بحرین اور کویت میں زیادہ پھیلا۔افریقہ میں اب تک مالکی مذہب غالب ہے۔اندلس میں اموی خلافت کا سرکاری مذہب بھی مالکی تھا۔اہلِ مغرب جو کہ حجاز والوں کی سادگی سے متاثر تھے ان کا رجحان بھی فقہ مالکی طرف زیادہ رہا۔

موطا امام مالک

موطا امام مالک کی سب سے مشہور تصنیف ہے۔ایک روایت کے مطابق امام مالک نے منصور ہی کی تجویز پر موطا کی تالیف کا کام شروع کیا۔اس نے فرمائش کی تھی کہ ایک ایسا مجموعۂ احکام سامنے آنا چاہئے جس میں ابن عمرؓ کی سختی، ابن عباسؓ کی رخصت اور ابن مسعودؓ کے شواذ کے بیچ کی کوئی راہ ہو۔موطا کی تالیف ۱۳۰ ہجری سے ۱۴۰

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہجری کے درمیان ہوئی۔ موطا کے اندر احادیث کے علاوہ آثارِ صحابہ و تابعین، اقوالِ فقہاء، فتاویٰ اور امام مالک کے اجتہادات شامل ہیں۔ ابتداء میں اس میں کم وبیش دس ہزار احادیث شامل کی گئیں۔ تنقید و بحث کے بعد آٹھ ہزار خارج کر دی گئیں اور سترہ سو بیس روایات کو برقرار رکھا گیا۔

''موطا'' کے معنی روندنے کے ہیں۔ موطا اس راستے کو کہتے ہیں جس پر بکثرت لوگ گذرتے ہیں۔ سنت کے معنی بھی راستے کے ہیں۔ یہ وہ راستہ ہے جس پر آنحضرت ﷺ گزرے اور موطا وہ پامال راستہ ہے جس پر آنحضرت ﷺ کے بعد صحابہ گزرے۔ غرض موطا کا لفظ اپنی حقیقت کا آپ مفسر ہے۔ موطا کا موضوع احکامِ فقہ ہیں اس لئے اس کو کتاب السنن کہا جاتا ہے۔ موطا کو یہ شرف حاصل ہے کہ یہ کلام اللہ کے بعد مسلمانوں کے لئے دوسری صحیح کتاب تھی جو احادیث رسول ﷺ پر مشتمل تھی۔ اس کو ایک فضیلت یہ بھی حاصل ہے کہ بخاری کی بیشتر روایات پانچ یا چھ واسطوں کی ہیں، جبکہ موطا میں نہ صرف ثلاثیات ہیں بلکہ ثنائیات بھی موجود ہیں۔ ثلاثیات وہ روایات ہیں جن میں آنحضرت ﷺ تک صرف تین واسطے ہوں اور ثنائیات وہ روایات ہیں جن میں آنحضرت ﷺ تک صرف دو واسطے ہوں۔ اس کے بارے میں امام شافعی کی یہ گواہی کافی ہے ''روئے زمین پر کتاب اللہ کے بعد کوئی کتاب موطا امام مالک سے زیادہ صحیح نہیں ہے۔''

اس موقع پر مناسب ہوگا اگر وہ واقعہ بھی بیان کر دیا جائے جو کتاب کی تالیف میں امام صاحب کے خلوص کو ظاہر کرتا ہے۔ امام صاحب جب موطا کی تالیف میں مشغول تھے تو مدینہ کے دیگر علماء نے بھی اپنے اپنے احادیث کے مجموعے تیار کرنا شروع کر دیئے۔ لوگوں نے امام صاحب کو اطلاع دی۔ آپ نے فرمایا ''صرف حسنِ نیت کو بقا ہے'' آپ کے اس تاریخی جملے کی سچائی کو وقت نے ثابت کر دیا اور امام صاحب کی پیش گوئی درست ثابت ہوئی۔ امام صاحب کی موطا آج تک موجود ہے جبکہ دیگر لوگوں کی کوششوں کا نام ونشان بھی مٹ گیا۔ موطا کو ایک امتیاز یہ بھی حاصل ہے کہ مہدی، ہادی، رشید، مامون اور امین نے اس کو سننے کی خواہش ظاہر کی اور اس کے لئے سفر کیا۔ یہاں تک کہ چھٹی صدی ہجری میں سلطان صلاح الدین ایوبی نے قاہرہ سے اسکندریہ تک صرف اسی کی خاطر سفر گوارا کیا۔

موطا کے علاوہ کافی ساری کتابیں امام صاحب سے منسوب کی جاتی ہیں۔ لیکن علماء کا خیال ہے کہ ان میں سے زیادہ تر کتب آپ کے شاگردوں کی تالیف کردہ ہیں۔

آپ کے شاگردوں میں امام شافعی اور محمد بن الحسن کے علاوہ یحییٰ بن یحییٰ لیثی، سلیمان بن داؤد طیالسی، محمد بن مبارک اور لیث بن سعد بہت مشہور ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وفات

۱۷۹ ہجری میں ۸۶ برس کی عمر میں آپ بیمار ہوئے اور تقریباً تین ہفتے بیمار رہے۔ لوگوں کو اندازہ ہوا کہ اب آپ کا آخری وقت آ گیا ہے تو مدینہ کے علماء اور فقہاء آپ کے گرد جمع ہوئے۔ آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ لوگوں نے رونے کا سبب دریافت کیا تو فرمایا کہ ''میں نہ روؤں تو کون روئے، اے کاش مجھ کو میرے ہر فتویٰ کے بدلے ایک کوڑا مارا جاتا اور میں فتویٰ نہ دیتا۔'' یہاں امام صاحب کی مراد شاید قیاسی فتوے سے تھی۔

تھوڑی دیر بعد آپ کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ جنازے میں خلقت کا ہجوم تھا۔ والیٔ مدینہ خود پا پیادہ شریک تھا، بلکہ جنازے کو کاندھا دینے والوں میں شامل تھا۔ امام صاحب کی آخری آرام گاہ جنت البقیع میں تیار کی گئی۔ پورے عالمِ اسلام میں آپ کی وفات کی خبر کے ساتھ ہی صفِ ماتم بچھ گئی۔ سفیان بن عیینہ نے سنا تو سکتے میں آ گئے، پھر کہا ''مالک نے اپنی کوئی مثال روئے زمین پر نہیں چھوڑی۔''

سیرتِ مالک

امام مالک کا تذکرہ ادھورا رہ جائے گا اگر آپ کے ذاتی حالات اور سیرت کو بیان نہ کیا جائے۔ یہاں مختصراً آپ کے اخلاق و عادات اور طرزِ زندگی پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

امام صاحب دراز قد، موٹے بدن، کشادہ پیشانی والے خوش رنگ آدمی تھے۔ آپ بیش قیمت پوشاک استعمال کرتے اور عدن کے بنے ہوئے کپڑے زیب تن کرتے (عدن جو یمن کا شہر تھا عمدہ اور بیش قیمت لباس کے لئے مشہور تھا)۔ عطر کا استعمال کرتے۔ آپ اس بات کے قائل تھے کہ اللہ کی نعمتوں کا اظہار انسان کے ظاہری حلیے سے ہونا چاہئے۔ آپ جس مکان میں رہتے وہ کرائے کا تھا۔ یہ وہ بابرکت گھر تھا جس میں صحابی رسول عبداللہ بن مسعودؓ رہا کرتے تھے۔

آپ خاموش طبع تھے۔ سوالوں کا مختصر اور جامع جواب دیا کرتے۔ ایک بار کسی نے سوال کیا: ''جناب نے صبح کس حال میں کی''؟ آپ نے فرمایا ''عمر میں کمی ہو گئی اور گناہوں میں زیادتی۔''

عبادت کی کیفیت یہ تھی کہ درس و تدریس سے فراغت کے بعد جو وقت ہاتھ آتا اس میں تلاوتِ قرآن میں مشغول رہتے۔ شبِ جمعہ اور ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو تمام رات عبادت میں مصروف رہتے۔

طبیعت میں رعب کا غلبہ تھا لیکن فخر و کبر کا نام و نشان نہ تھا۔ امام شافعی جو طلبِ علم کے لئے امام صاحب کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

گھر اترے تھے، بتاتے ہیں کہ ''کھانے کے بعد امام مالک مکہ والوں کے حالات پوچھتے رہے۔ جب رات زیادہ ہوگئی تو مجھے آرام کرنے کا کہہ کر چلے گئے۔ میں تھکا ہوا تھا، لیٹتے ہی بے خبر سوگیا۔ رات کے آخری حصے میں کوٹھری پر دستک ہوئی اور آواز آئی کہ خدا کی رحمت ہو تم پر، نماز کے لئے اٹھ جاؤ۔ میں اٹھ بیٹھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ خود امام صاحب لوٹا لئے کھڑے ہیں۔ مجھے بڑی شرمندگی ہوئی، مگر وہ کہنے لگے: کچھ خیال نہ کرو، مہمان کی خدمت فرض ہے۔''

آپ کے مزاج میں انتقام اور نفرت کے بجائے رحم اور درگزر موجود تھا۔ منصور کے گورنر نے آپ کو کوڑے مارے اور پورے شہر کے سامنے بے آبرو کیا۔ منصور کو جب اس واقعے کی اطلاع ہوئی تو معافی کا خواستگار رہا اور اپنے گورنر کی نسبت حکم دیا کہ اس کو ذلت و ایذا کے ساتھ گدھے پر بٹھا کر بغداد لے جایا جائے۔ امام صاحب نے جواباً صرف اتنا کہا ''اس انتقام کی حاجت نہیں، پیغمبرِ خدا ﷺ کی قرابت کی خاطر میں اس کو معاف کرتا ہوں۔''

اپنی رائے منوانے کا آپ کو کوئی شوق نہ تھا۔ مختلف روایات کے مطابق دو خلفائے وقت منصور اور ہارون الرشید نے آپ کی تالیف موطا کو حرفِ آخر قرار دینے کی تجویز دی تھی۔ آپ نے جواباً کہا ''ایسا نہ کرو، خود صحابہ کرام فروع میں مختلف ہیں۔ وہ مختلف ممالک میں پھیل چکے۔ ان میں ہر شخص راہِ صواب پر تھا۔'' اپنی اقتداء نہ کرانے کا شوق جماعتِ علماء میں آج مفقود ہے۔ ان کے لئے امام صاحب کے طرزِ عمل میں بڑا سبق ہے۔

امام مالک علم کے سچے قدردان تھے۔ علمِ حدیث کی شان کو بلند کرنے کے لئے جو خصوصی اہتمام آپ کی مجلس میں ہوتا اس کا تذکرہ گذر چکا ہے۔ خلیفہ مہدی حج سے واپسی پر مدینہ آیا تو اپنے دونوں بیٹوں موسیٰ اور ہارون کو حکم دیا کہ امام سے موطا سنیں۔ شہزادوں نے امام صاحب کو بلا بھیجا۔ آپ نے فرمایا ''علم بیش قیمت شے ہے، اس کے پاس خود شائقین آتے ہیں۔'' آخرکار دونوں شہزادے خود حاضر ہوئے۔ شہزادوں کے اتالیق نے کہا، پڑھ کر سنایئے۔ امام صاحب نے فرمایا ''ہمارے علماء کا دستور یہ ہے کہ طلباء پڑھیں اور شیوخ سنیں۔'' مہدی کو خبر کی گئی تو اس نے کہا علماء کی اقتداء کرو۔ آخرکار شہزادوں نے پڑھا اور امام صاحب نے سماعت کی۔

مہدی کے بعد ہارون الرشید بھی حج سے واپسی پر مدینہ پہنچا تو امام صاحب کو موطا کی املا کے لئے طلب کیا۔ آپ نے انکار کیا اور خود بغیر موطا کے تشریف لائے۔ خلیفہ نے آپ سے شکایت کی تو کہنے لگے ''ہارون! علم تیرے گھر سے نکلا ہے خواہ اس کو ذلیل کر، خواہ اس کو عزت دے۔'' ہارون لاجواب ہوگیا۔ پھر اپنے دونوں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بیٹوں کے ساتھ مجلسِ درس میں حاضر ہوا۔ طلباء کی بھیڑ دیکھ کر کہنے لگا ان کو الگ کر دیجئے۔ آپ نے فرمایا "شخصی فائدے کے لئے عوام کے فائدے کو قربان نہیں کیا جا سکتا۔" ہارون اس کے بعد مسند پر جا بیٹھا۔ اب پھر امام صاحب سے رہا نہ گیا۔ فرمایا "امیر المومنین تواضع پسندیدہ ہے۔" آخرکار ہارون نے عام لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر حدیث کی سماعت کی۔

ایک طرف تو بادشاہِ وقت کے لئے آپ نے کوئی تخصیص نہ کی تو دوسری طرف جب امام ابوحنیفہؒ آپ سے ملنے کے لئے تشریف لائے تو آپ نے ان کے لئے اپنی چادر بچھا دی۔ اسی طرح اپنے شاگردوں کے استقبال کے لئے آپ شہر سے باہر تشریف لے جاتے۔

عباسی خلفاء کی کمزوریاں اپنی جگہ، لیکن اس بات سے کسی کو انکار نہیں کہ وہ انتہائی علم دوست اور علماء و فضلاء کی قدر کرنے والے تھے۔ چنانچہ امام صاحب نے اس بات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بارہا خلفاء سے مدینہ کے ناداروں کا حال بیان کیا۔ خلیفہ امام صاحب کی بات کو رد نہ کرتے اور فقرائے مدینہ کے لئے اپنے خزانوں کے منہ کھول دیتے۔

یوں آپ نے اپنی ذات کے لئے فائدہ سمیٹنے کے بجائے امت کے ان خستہ حال لوگوں کے بارے میں فکر کی جو نہ ذاتی حیثیت میں ممتاز تھے نہ ہی ان کی علمی حیثیت کی بناء پر کوئی ان کی حاجت پوری کرنے والا تھا۔ آج ہم میں سے ہر صاحبِ حیثیت اور صاحبِ رسوخ شخص کے لئے امام صاحب کے اس طرزِ عمل میں بڑا سبق ہے۔ جو دولت، عزت یا شہرت اللہ کے فضل اور اس کی توفیق سے کسی کو نصیب ہوئی ہو اسے مخلوق کی بھلائی اور فائدے کے لئے استعمال کرنا چاہئے۔ اجتماعی فائدے کے کام دیرپا اور آخرت میں اجر کے باعث ہیں۔ جبکہ شخصی فائدے کے کام وقتی اور ختم ہو جانے والے ہیں۔

امام مالک کی زندگی کو چند لفظوں میں سمیٹنا چاہیں تو ذہانت، اخلاص، علم، حق شناسی و حق گوئی اور نبی کریم ﷺ سے محبت، یہ چند خصوصیات آپ کا طرۂ امتیاز نظر آتی ہیں۔ امام مالک ان لوگوں میں سے تھے جنہیں زندگی ہی میں قبولِ عام نصیب ہوا اور آپ امام الکبیر، امام دار الہجرہ اور امام مدینہ کے القابات سے مخاطب کئے جانے لگے۔ آپ کی فقہ تیرہ سو سال سے کروڑوں مسلمانوں کی رہنمائی کر رہی ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

امام شافعیؒ

فقہ شافعی کے بانی اور فقہی قواعدِ استنباط کے مدوّن

تعارف

آپ کا نام محمد بن ادریس، کنیت ابوعبداللہ اور لقب ناصر السنہ تھا۔ سلسلہ نسب یہ ہے:

محمد بن ادریس بن عباس بن عثمان بن شافعی بن سائب بن عبید بن عبد بن ہاشم بن عبدالمطلب بن عبد مناف القریشی الہاشمی۔ ساتویں پشت پر جا کر آپ کا سلسلہ نسب آنحضرت ﷺ سے جا ملتا ہے۔ قریشی مطلبی ہونا آپ کے لئے ہمیشہ ایک اعزاز کی بات رہی۔ جبکہ آپ کی والدہ قبیلہ ازد سے تھیں جو یمن کا ایک مشہور و ممتاز قبیلہ ہے۔

روایات کے مطابق آپ کے جدِ امجد شافع اور آپ کے دادا سائب بن عبید صحابیٔ رسول تھے اور غزوۂ بدر کے بعد ایمان لائے۔ آپ کے والد ادریس بن عباس مدینہ منورہ کے قریب ایک قصبہ ''تبالہ'' کے رہنے والے تھے۔ پھر مدینہ منورہ چلے گئے۔ بعد ازاں تلاشِ معاش کے لئے شام پہنچے اور عسقلان میں سکونت پذیر ہوئے۔

ولادت

آپ کی ولادت رجب ۱۵۰ ہجری میں بمقام عسقلان (غزہ، شام و فلسطین کی سرحد) میں ہوئی۔ یہی مہینہ اور سال امامِ اعظم ابوحنیفہ کی وفات کا بھی ہے۔

بچپن کے حالات

آپ کا خاندان اگرچہ نسب کے لحاظ سے مضبوط تھا۔ لیکن عمومی طور پر فلسطین کے جوار میں رہنے والے یمنی قبائل غربت و افلاس کا شکار تھے۔ آپ کا خاندان بھی انہی حالات سے دوچار تھا۔ اس پر والد کا سایہ بھی سر پر نہ تھا۔ ایک روایت کے مطابق آپ کے والد کا انتقال آپ کے پیدا ہونے سے کچھ دن قبل ہو چکا تھا۔ تربیت کی ساری ذمہ داری والدہ پر آ پڑی۔ وہ ایک سمجھدار خاتون تھیں۔ انہیں اندیشہ ہوا کہ بچہ اگر اسی حال میں پروان

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چڑھا تو اس کی نسبی شرافت خاک میں مل جائے گی۔ چنانچہ وہ آپ کو لے کر اپنے بھائی اور آپ کے ماموں کے پاس یمن پہنچیں۔ وہاں کے آٹھ سالہ قیام کے دوران آپ نے قرآن شریف حفظ کیا اور موطا امام مالک یاد کرنی شروع کی۔

اس موقع پر ایک روایت کا مختصر تذکرہ بھی مناسب ہوگا جس کے مطابق آپ نے بچپن میں خواب کی حالت میں آنحضرت ﷺ کا دیدار مبارک کیا تھا اور آپ ﷺ کی طرف سے آپ کو بشارت بھی ملی تھی۔

تعلیم و تربیت

جیسا کہ تذکرہ گذر چکا ہے کہ آپ کی والدہ کی خاص توجہ آپ کی تربیت پر تھی۔ چنانچہ دس سال کی عمر میں وہ آپ کو لے کر مکہ پہنچیں۔ یہیں آپ نے سکونت اختیار کی اور تحصیل علم میں لگ گئے۔ قدرت نے آپ کو بہترین حافظے اور ذہانت سے نوازا تھا۔ علم حدیث کی طرف طبیعت بہت مائل تھی۔ جو حدیث سنتے اسے یاد کر لیتے، کپڑے یا کھال پر لکھ لیتے یا پھر کوئی بیاض تیار کر لیتے اور اس کے اوراق پر جو کچھ یاد کرتے قلمبند کر لیتے۔ آپ کا قیام اپنے چچا کے گھر تھا جن کی مالی حالت کمزور تھی لہٰذا ناداری کی وجہ سے کاغذ نہ میسر ہوتا تو اس کو ہڈیوں پر تحریر کر لیتے۔ یہاں تک کہ ان تحریر شدہ ہڈیوں اور اشیاء سے آپ کا گھر بھر گیا۔

کتاب اللہ کے حفظ اور احادیث نبوی ﷺ کی جمع و تحفیظ کے علاوہ عربی زبان سے آپ کو غیر معمولی لگاؤ تھا۔ چنانچہ مکہ سے نکل کر قبیلہ ہذیل سے وابستہ ہو گئے۔ یہ خانہ بدوش قبیلہ اپنی زبان دانی کے اعتبار سے افصح العرب (عرب میں سب سے فصیح) سمجھا جاتا تھا۔ آپ اس قبیلے کے ساتھ ساتھ سفر کرتے اور ان کے آداب و طرز بیان سے واقفیت حاصل کرتے۔ یہاں تک کہ جب آپ مکہ واپس لوٹے تو زبان دانی کے فن میں کمال حاصل کر لیا تھا اور اس کی گواہی اصمعی جیسا شخص جو ادب و لغت میں یگانہ تھا خود دیتا ہے:

> ''ہذیل کے اشعار کی تصحیح اور ان کے اخبار کی تشریح میں قریش کے نوجوان سے کرایا کرتا ہوں جس کا نام محمد بن ادریس ہے۔''

لغت کا کمال اس حد کو پہنچا کہ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے امام رازی لکھتے ہیں:

> ''امام شافعی اس فن میں سرتاج آئمہ لغت ہیں اور یہ اس طرح تواتر سے ثابت ہے جس طرح حاتم کی سخاوت اور حضرت علیؓ کی شجاعت مسلمہ ہے۔ اسی طرح امام شافعی علم و ادب، لغت و نحو میں ممتاز ترین فرد ہیں۔''

مکہ مکرمہ میں مسلم بن خالد جو فقہ اور حدیث کے امام اور مفتی مکہ تھے، ان کی خدمت میں پورے تین برس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حاضر رہے۔ آپ کے استاد آپ میں پوشیدہ صلاحیتوں کو پہچان چکے تھے، انہوں نے آپ کو فتویٰ دینے کی اجازت دی۔ انہی کی مجلس میں اکثر و بیشتر امام مالک کا تذکرہ رہتا۔ امام شافعیؒ کو امام مالکؒ سے ملاقات کا ایسا شوق دامن گیر ہوا کہ موطا حفظ کر کے والیٔ مکہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس سے والیٔ مدینہ اور خود امام مالک کے نام ایک تعارفی اور سفارشی خط لے لیا۔

امام مالکؒ کی خدمت میں

والیٔ مدینہ یہ دیکھ کر کہ آپ امام مالک سے ملاقات اور تحصیل علم کے خواہشمند ہیں گھبرا سا گیا اور کہنے لگا: ''صاحبزادے، میرے لئے مدینے سے مکے تک پا پیادہ گھسٹتے ہوئے جانا کہیں آسان ہے بہ نسبت مالک بن انس کے دروازے پر حاضر ہونے کے، جب تک میں ان کے دروازے پر موجود رہتا ہوں نوازش و کرم سے محروم ہی رہتا ہوں۔'' بالآخر آپ کے اصرار پر آپ اور وہ دونوں امام مالک کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ امام مالک جب خط پڑھتے پڑھتے اس مقام پر پہنچے ''اس شائقِ علم سے گفتگو کر لیجئے۔ اس سے حسنِ سلوک کا برتاؤ کیجئے اور اس کی آرزو پوری کیجئے'' تو وہ خط ہاتھ سے پھینک دیا اور فرمایا ''سبحان اللہ! کیا اب رسول اللہ ﷺ کا علم وسائل سے حاصل کیا جائے گا؟'' والیٔ مدینہ کے منہ سے دہشت کے باعث آواز نہیں نکل رہی تھی۔ آخر آپ آگے بڑھے اور عرض کیا ''میں ایک مطلبی ہاشمی شخص ہوں، میرا یہ حال اور یہ کیفیت ہے......''

امام مالکؒ نے گفتگو سن کر ایک نظر آپ پر ڈالی اور نام دریافت کیا۔ آپ نے عرض کیا ''میرا نام محمد ہے۔'' یہ سن کر امام صاحب نے فرمایا: ''اے محمد! خدا سے ڈرتے رہنا، گناہوں سے بچنا، تم کسی دن مرتبۂ بلند پر پہنچو گے۔ اللہ نے تمہارے قلب پر نور القاء کیا ہے۔ ایسا نہ ہو یہ نور ارتکابِ معصیت سے بجھ جائے۔'' پھر فرمایا۔ ''کل آنا اور اپنے ساتھ ایک شخص کو بھی لے آنا جو تمہارے لئے قرأت کرے۔'' دوسرے دن آپ پہنچے تو مؤطا آپ کے ہاتھ میں تھی۔ آپ نے خود ہی قرأت شروع کر دی۔ امام صاحب کی ہیبت سے مرعوب ہو کر جب ارادہ کرتے کہ اب قرأت کا سلسلہ منقطع کر دیں تو آپ کی حسنِ قرأت و اعراب پر پسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے امام مالک فرماتے ''صاحبزادے! اور......اور......'' یہاں تک کہ چند ہی دن میں مؤطا ختم کر ڈالی۔ پھر مختلف مسائلِ فقہ کا علم حاصل کیا اور امام مالکؒ کی خدمت میں حاضر رہے۔

امام مالکؒ کے علاوہ مدینہ میں حضرت ابراہیم بن معہ انصاری، محمد بن اسمٰعیل فدیک اور عبداللہ بن نافع سے بھی بکثرت علم حاصل کیا اور روایتِ حدیث کی جرح و تعدیل کے اصول و قواعد سیکھے۔

مدینہ سے واپس مکہ پہنچے۔ اس تمام عرصے میں جبکہ آپ ابھی نوجوان تھے، آپ کو حدیث، فقہ، لغت،

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تاریخ، طب، یہاں تک کہ علم فراست میں بھی عبور حاصل ہو چکا تھا۔ فراست کے معنی تاڑ جانے کے ہیں۔ امام صاحب کی یہ خداداد صلاحیت بے شمار موقعوں پر لوگوں کو حیران کر دیتی تھی۔ امام بیہقی نے مزنی کے ذریعے روایت کیا ہے کہ میں جامع مسجد میں امام شافعی کے ہمراہ تھا۔ اتفاقاً ایک آدمی آیا اور سوتے ہوئے آدمیوں میں سے کسی کو تلاش کرنے لگا۔ امام شافعیؒ نے ربیع سے کہا ''ربیع جاؤ تو سہی اور تلاش کرنے والے سے پوچھو کہ تمہارا حبشی غلام جس کی آنکھ میں نقص ہے کیا گم ہو گیا ہے''؟ ربیع نے اس شخص سے کہا تو وہ آپ کے پاس آیا اور کہنے لگا ''بتلایئے میرا غلام کہاں ہے؟'' فرمایا ''وہ تو شاید قید خانے میں ملے۔'' وہ قید خانے پہنچا تو واقعی وہ مل گیا۔

مزنی نے امام صاحب سے عرض کیا ''آپ نے ہم کو حیرت میں ڈال دیا۔ فرمایئے تو سہی یہ کیا ماجرا تھا''؟

فرمایا: ''یہ ڈھونڈنے والا جب مسجد میں آیا تو میں سمجھ گیا کہ کسی بھاگے ہوئے کو ڈھونڈ رہا ہے۔ پھر یہ مسجد کے اس حصے میں گیا جہاں سیاہ فام سو رہے تھے۔ میں نے بغور دیکھا تو یہ بائیں آنکھ پر گہری نظر ڈال رہا ہے۔ اس لئے میں نے سمجھ لیا کہ اس کا کوئی آنکھ کا عیب والا سیاہ فام غلام بھاگا ہے''۔ میں نے ان باتوں کو سن کر آپ سے پوچھا کہ یہ آپ نے کیسے سمجھ لیا کہ وہ قید خانے میں ہے؟ فرمایا: ''یہ میرا تجربہ ہے کہ جب غلام بھوکا ہوتا ہے تو چوری کرتا ہے اور اگر پیٹ بھرا ہوتا ہے تو زنا کرتا ہے۔ اسی لئے میں نے جان لیا کہ ان دونوں باتوں میں سے ایک ضروری ہے۔ چنانچہ یہی واقعہ نکلا''۔

دورِ ابتلاء

والدہ سے ملاقات کی غرض سے مکہ آئے تو روزگار کی فکر ہوئی۔ گو حصولِ علم کا شوق اب بھی زوروں پر تھا، لیکن معاش کی تنگی اس قدر لاحق تھی کہ اس طرف توجہ دینی پڑی۔ اس زمانے میں والیٔ یمن حجاز آیا تھا۔ بعض قریشیوں نے اس سے آپ کا تذکرہ کیا تو اس نے آپ کو اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ اس واقعے کو خود بیان کرتے ہوئے بتاتے ہیں۔ ''اس وقت میری ماں کے پاس اتنے روپے بھی نہ تھے کہ میں سر و سامان بہم پہنچا سکتا۔ آخر بے چاری نے گھر رہن کیا، تب کام چلا۔ جب میں یمن پہنچا تو میں نے باقاعدہ کام شروع کیا اور والی کی طرف سے امور انجام دینے لگا''۔

بہت جلد آپ کی دانائی اور عدل کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔ ایک روایت کے مطابق آپ کو نجران کی گورنری مل گئی تھی۔ نجران کے خوشامدی اور چاپلوس لوگ جو پرانے گورنر کو رشوتیں دے کر کام نکلوایا کرتے تھے جب آپ سے رعایتیں حاصل کرنے میں ناکام ہو گئے تو ان کی طرف سے مختلف الزامات سامنے آنا شروع ہوئے۔ تاہم عوام آپ کے بہت معتقد تھے۔ والیٔ یمن جس کے زیر اثر نجران کا علاقہ بھی تھا، آپ کی انصاف

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پسندی کو برداشت نہ کرسکا۔ وہ موقع کی تلاش میں رہنے لگا، جب آپ پر کسی طرح کا الزام لگا کر گلو خلاصی کرا سکے۔ اسے یہ موقع اس وقت ہاتھ آیا جب عباسی خلفاء کے خلاف علوی تحریک نے سر اٹھانا شروع کیا۔ اس نے خلیفہ ہارون الرشید کو لکھا ''یہاں علوی تحریک کے لوگ موجود ہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ یہ لوگ ضرور خروج کریں گے۔ انہی میں شافع مطلبی کا لڑکا (امام شافعی) بھی ہے جو نہ میرا حکم مانتا ہے، نہ میری پابندیوں کو خاطر میں لاتا ہے''۔

دوسری روایت کے مطابق ایک عامل نے ہارون الرشید کو عریضہ لکھا کہ اگر آپ یمن کی خیر چاہتے ہیں تو محمد بن ادریس شافعی کو نکالئے اور سزا دیجئے۔ اس شخص کا یہاں بڑا اثر ہے۔ سادات کا خاندان پھر خلافت کے خواب دیکھ رہا ہے اور شافعی چونکہ خود ہاشمی ہے اس لئے اس کی اعانت بھی سادات کو حاصل ہے۔

جو بھی وجہ رہی ہو بہرصورت ہارون رشید آپے سے باہر ہوگیا اور ان تمام افراد کو طلب کیا جن پر شک کا اظہار کیا گیا تھا۔ امام شافعی کو بھی پکڑ لیا گیا۔ خلیفہ نے سب افراد کے قتل کا فیصلہ صادر کیا۔ جب آپ کے قتل کی باری آئی تو آپ نے ایسی موثر اور پردرد تقریر کی جس سے ہارون رشید کانپ اٹھا اور اس نے آپ کے قتل کے حکم کو منسوخ کردیا۔ وہ آپ کے بارے میں کوئی سخت فیصلہ کرنے سے پہلے امام محمد سے رائے لینا چاہتا تھا۔ (امام محمد کا تذکرہ گذر چکا ہے۔ آپ امام اعظم ابوحنیفہ کے شاگرد رشید تھے) ان سے جب امام شافعی کے متعلق دریافت کیا گیا تو انہوں نے فرمایا ''شافعی کو علم سے حصہ وافر عطا ہوا ہے۔ وہ ایسے نہیں ہیں جیسے کہا جارہا ہے۔'' اس پر خلیفہ نے کہا: ''یہ بات ہے تو فی الحال اس شخص کو اپنے پاس رکھئے۔ پھر اس کے بارے میں کوئی آخری فیصلہ کروں گا''۔

عمر کے چونتیسویں برس میں جس آزمائش سے آپ کو گذرنا پڑا وہ آپ کے لئے باعثِ رحمت ثابت ہوئی۔ آپ امام محمد کے زیرسایہ آ گئے اور فقہ عراق اور حنفی فقہ کے اصول وقواعد اور مسائل کو سمجھنے کا موقع ہاتھ آ گیا۔

امام محمدؒ کی خدمت میں

امام محمد کے باقاعدہ شاگرد کے طور پر ایک بار پھر آپ علومِ دینیہ خصوصاً فقہ کی تعلیم حاصل کرنے میں لگ گئے۔ یہاں تک کہ خود فرماتے ہیں ''میں نے امام محمد سے جو کچھ پڑھا سنا، نقل کیا اور لیا اس علم کی مقدار ایک بارِ شتر کے برابر ہے۔'' ایک شاگرد کی حیثیت سے آپ نے امام محمد کا حد درجہ احترام ملحوظ رکھا۔ آپ کو مسائل کی تشریح کے لئے بعض اوقات امام محمد سے عاجزانہ التماس کرتے ہوئے بھی دیکھا گیا۔ آپ اپنے استاد کی تعریف میں رطب اللسان رہتے۔ خود فرماتے ہیں ''جب بھی کوئی پیچیدہ یا نازک مسئلہ میں نے کسی فقیہ سے دریافت کیا تو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس کے چہرے پر ناگواری کے اثرات دیکھے، البتہ امام محمد کی ذاتِ گرامی ایسی نہ تھی۔''

خود آپ کو فقہ حنفی کے چند مسائل سے اختلاف تھا لیکن استاد کے سامنے زبان کھولنے اور مناظرہ کرنے سے بچتے تھے۔ البتہ استاد کے جانے کے بعد ان کے شاگردوں سے آپ کا خوب مناظرہ ہوتا۔ ایک بار امام محمد کے شاگردوں نے اس کی خبر ان کو دی کہ آپ کی غیر موجودگی میں شافعی خوب بحث کرتے ہیں۔ اس پر امام محمد نے بااصرار آپ کو اس بات پر راضی کرلیا کہ آپ ان سے بھی متنازعہ مسائل پر گفتگو کریں۔ اس پر آپ نے طبیعت پر جبر کر کے بحث چھیڑی اور بعض روایات کے مطابق آپ ہی غالب رہے۔

آپ کے اور امام محمد کے تعلقات آپس میں بے حد خوشگوار تھے۔ امام محمد نے بارہا آپ کی مالی مدد کی۔ ایسا بھی دیکھنے میں آیا کہ امام محمد اور امام شافعی ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے جا رہے ہیں۔

مکہ میں قیام اور امام شافعیؒ کی شہرتِ عامہ

بغداد سے امام صاحب مکہ آ گئے اور حرم مکہ میں بیٹھ کر درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اب آپ کا علم و تجربہ وسیع ہو چکا تھا۔ مدینہ اور عراق جو فقہی علوم کے مراکز تھے، دونوں سے آپ استفادہ حاصل کر چکے تھے۔ استدلال اور نکتہ رسی کی جو صلاحیت اللہ نے آپ کو عطا کی تھی، اس کی وجہ سے آپ کی شہرت پورے عالم اسلام میں پھیل گئی اور لوگ دور دور سے فیض اٹھانے کے لئے آنے لگے۔ حج کے موقع پر خصوصی طور پر لوگ آپ سے مستفید ہوتے۔ امام احمد بن حنبلؒ نے جو کہ چوتھے امام کے طور پر عالم اسلام میں پہچانے جاتے ہیں، اسی دوران آپ کے پاس حاضری دی۔ امام احمد آپ سے بے حد متاثر ہوئے۔ وہ آپ کی بہت عزت کرتے۔ اسحٰق بن راہویہ کہتے ہیں:

> ''ایک بار احمد بن حنبلؒ میرے پاس آئے اور کہنے لگے: ''ابو یعقوب اٹھو تمہیں ایسے شخص سے ملائیں کہ ایسا تمہاری نظروں سے کوئی اور نہ گزرا ہوگا''۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ احمد بن حنبل مجھے لے کر زمزم کے احاطے میں پہنچے، جہاں ایک سفید پوش شخص بیٹھا ہوا تھا۔ گندم گوں، خوبرو، بشرہ سے ذہانت و فراست آشکار، احمد نے مجھے اس کے پہلو میں بٹھا دیا اور امام صاحب کو پکارتے ہوئے کہا ''اے ابو عبداللہ! یہ اسحٰق بن راہویہ حنظلی ہیں۔'' اس شخص نے مجھے مرحبا کہا اور میرا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ پھر ہم دونوں باتیں کرنے لگے۔ دورانِ گفتگو مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس شخص کا علم کتنا وسیع اور گہرا ہے اور اس کی قوت حفظ کا کیا عالم ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جب کافی دیر گذر گئی تو میں نے احمد سے کہا ہمیں اس (بزرگ) شخص کے پاس تو لے چلو جس کا ذکر کر رہے تھے۔ احمد نے جواب دیا، یہی تو وہ شخص ہیں۔ میں نے کہا یہ بھی ایک رہی۔ تم مجھے اس شخص کے پاس سے اٹھا لائے ہو جو زہری سے روایت کرتا ہے۔ میں نے سوچا تھا جس شخص سے تم ملاؤ گے وہ زہری جیسا بزرگ یا ان کے لگ بھگ ہوگا۔ تم تو اس نوجوان کے پاس لے آئے۔ (یہاں اسحٰق بن راہویہ کی مراد عمر رسیدہ اور وضع قطع سے کسی بزرگ نظر آنے والے شخص سے تھی) احمد نے یہ سن کر کہا ''ابو یعقوب! اس شخص سے کچھ حاصل کر لو، اس جیسا صاحب کمال میری نظر سے آج تک نہیں گذرا۔''

امام شافعیؒ کو نہ صرف علومِ دین پر قدرت حاصل تھی، بلکہ استدلال کی غیر معمولی صلاحیت بھی موجود تھی۔ کوئی شخص مناظرے میں آپ سے جیت نہ سکتا تھا۔ اس کی بے شمار مثالیں کتابوں میں ملتی ہیں۔ جن کی تفصیل میں جانا طوالت کے خوف سے ممکن نہیں ہے۔ یہاں ہم مختصراً دو واقعات بیان کرتے ہیں، جن سے امام صاحب کی حاضر جوابی کا اندازہ ہو سکے گا۔

امام شافعی نے ایک بار امام احمد ابن حنبل سے پوچھا۔ ''میں نے سنا ہے تم کہتے ہو کہ ایک وقت نماز چھوڑنے سے آدمی کافر ہو جاتا ہے''۔ امام احمد نے جواب دیا۔ ''جی ہاں''۔ امام شافعی نے فرمایا۔ ''اگر ایسا کافر مسلمان ہونا چاہے تو کیا کرے''؟ انہوں نے کہا: ''نماز پڑھنے لگے''۔ امام شافعی نے کہا: ''کیا تمہارے نزدیک کافر کی نماز صحیح ہوگی یا صحت نماز کے لئے پہلے قبول اسلام شرط ہے''؟

اسی طرح کا ایک اور واقعہ ملتا ہے جب فقیہ ربیعہ نے امام شافعی سے کہا کہ: ''اگر کوئی شخص رمضان کا ایک روزہ قضا کرے تو اس کو بارہ روزے رکھنے چاہئیں۔ چونکہ اس مہینے کا ایک دن اور مہینوں کے بارہ دن کے برابر ہوتا ہے''۔ امام شافعی نے کہا: ''یہ فقہ ہے یا مذاق؟ اگر تمہارا یہی نظریہ ہے تو پھر شب قدر میں اگر نماز فوت ہو جائے تو ہزار مہینے تک اس کی قضاء کرنی ہوگی۔ کیونکہ "ليلة القدر خير من الف شهر "خود قرآن مجید میں ہے''۔ اس پر ربیعہ خاموش ہو گئے۔

بنائے اصولِ فقہ

امام شافعیؒ کے زمانے میں لوگوں نے فقہ میں ہر قسم کی موشگافیاں شروع کر رکھی تھیں۔ کچھ مسائل تو تمدن کے پھیلاؤ کے باعث پیش آ ہی رہے تھے اور کچھ خواہ مخواہ اختراع کر کے فقہاء سے ان کا جواب طلب کیا جاتا۔ فقہاء اپنی طبعی ذہانت اور وسعت معلومات کے مطابق جواب دیتے جو بعض اوقات باہم متعارض ہوتے۔ جوشِ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عقیدت کے سبب عوام اسے مقدس اور لازمِ تقلید جانتے۔ ان کے پیروکاران کے ایسے پابند ہو جاتے جیسے کہ قرآن اور حدیث کی بات حرف آخر کا درجہ رکھتی ہے۔ ایک جگہ کے رہنے والے دوسرے مقامات والوں کی آراء قبول نہ کرتے اور یوں حجاز، کوفہ، شام ہر جگہ کی فقہ نے ایک خاص مزاج اختیار کر لیا۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کے لائق ہے کہ عمومی طور پر یہ کیفیت ان معتقدین کی ہوتی جو اپنی محبت میں حد سے بڑھ جاتے۔ باقی رہے اہل علم حضرات تو وہ ایک دوسرے کی آراء کا نہ صرف احترام کرتے، بلکہ حصولِ علم کے لئے کسی بھی عالمِ حق کی شاگردی اختیار کرنے سے نہ ہچکچاتے۔

یہ بھی سچ ہے کہ ماسوائے رسول اکرم ﷺ کے دور کے، ہر دور میں اہل علم و اہل نظر حضرات کی تعداد نسبتاً کم ہی رہی ہے۔ غالب تعداد ان لوگوں کی ہوتی ہے جن کا علم اور نظر دونوں محدود ہوتے ہیں۔ باہم متعارض آراء کے باعث عوام اس الجھن میں پڑ جاتے ہیں کہ کس کا قول حق ہے۔

امام شافعی ان حالات کو ملاحظہ کر رہے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ امام شافعی کی شخصیت فقہ جدید کے بانی کی حیثیت سے نمایاں تر ہوتی جا رہی تھی۔ برسوں علومِ فقہ اور مسائلِ فقہ جاننے میں صرف کرنے کے بعد آپ یہ محسوس کرنے لگے کہ صحیح اور غلط کی تمیز کے لئے ایسے پیمانے ہونے چاہئیں جن کی بدولت درست نتیجے تک پہنچا جا سکے۔ چنانچہ آپ نے قواعدِ استنباط وضع کرنے کے لئے غور و فکر شروع کیا۔

مروجہ حنفی اور مالکی طریقے کو اختیار کرنے کے بجائے سب سے پہلے آپ نے اپنی توجہ کتاب اللہ پر مرکوز کی، تاکہ اس کے طریقۂ دلالت کی معرفت حاصل کر سکیں۔ پھر سنت پر غور و فکر کیا کہ اس سے استدلال کے کیا طریقے ہونا چاہئیں۔ علاوہ ازیں اگر قرآن اور حدیث کسی معاملے میں خاموش ہوں تو ایسے موقع پر کن چیزوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اجتہاد کیا جائے۔ ایک مجتہد کے لئے کس طرح کی پابندیاں لازم ہیں تاکہ اجتہاد غلط روی سے محفوظ رہ سکے۔

مکہ میں اپنے قیام کے نو سالہ دور میں بالآخر آپ ان اصولوں اور قواعد کو وضع کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ان اصولوں کی موجودگی میں جزئی مسائل بیان کرنے لگے، پھر ان کو پرکھنے کے لئے ایک بار پھر بغداد کا سفر کیا جو فقہی علوم کا گڑھ تھا۔ وہاں کے علماء، شیوخ اور طالبینِ علم نے آپ کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور آپ سے اصول فقہ کا وہ نادر علم حاصل کرنے لگے جس کی تدوین میں آپ نے سالہا سال خرچ کئے۔ ایک نظر ان اصولوں پر ڈال لیتے ہیں۔ ان کی تفصیل بہت طویل ہے۔ ہم یہاں اس کی ہلکی سے جھلک دیکھیں گے۔

۱۔ دین میں اصل قرآن و حدیث ہے اور اگر ان سے استدلال نہ ہو سکے تو پھر قیاس جو قرآن و حدیث کے مطابق ہو۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۲- جب حدیث رسول اللہ ﷺ بسندِ صحیح متصل ثابت ہو جائے تو اس پر عمل لازمی ہے۔ لیکن حدیث خواہ کسی درجے کی ہو، قرآن مجید کی ناسخ نہیں ہوسکتی۔

۳- حدیث ہمیشہ اپنے ظاہری معانی پر محمول ہونی چاہئے اور جب اس میں متعدد معانی کا احتمال ہو تو جو معنی ظاہر حدیث کے قریب ہوں وہ لئے جائیں گے۔

۴- صحابہ کرام کا اجماع خبرِ واحد [۱] سے بالاتر ہے اور اجماعِ صحابہ نہ ہونے پر خبر واحد قابل عمل ہے۔

۵- جب چند احادیث باہم متعارض ہوں تو ان میں یہ غور کرنا چاہئے کہ راوی کیسے ہیں۔ دوسرے احکام کی ترتیب، تیسرے صحابہ کے تقدم و تاخر ایمان کا لحاظ کرنا چاہئے۔ (یعنی راوی صحابہ میں کون پہلے ایمان لایا اور کون بعد میں)

۶- حدیثِ مرسل [۲] بجز سعید بن میسّب کے ناقابل قبول ہے۔

۷- حدیثِ موقوف منقطع [۳] کی حیثیت حدیثِ متصل صحیح [۴] کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے۔

۸- آپ کے دور میں اقوالِ صحابہ جمع ہو گئے تھے اور بعض اقوال صحیح حدیث کے خلاف تھے۔ اس لئے امام شافعی نے یہ طے کیا کہ صحیح حدیث کے مقابلے میں اقوال صحابہ کچھ وقعت نہیں رکھتے اور فرمادیا ''وہ بھی آدمی تھے اور ہم بھی آدمی ہیں۔''

۹- ہر عام حکم میں مستثنیات (exceptions) بھی ہوتے ہیں اور عام حکم قطعی (Absolute) نہیں ہوتا۔

۱۰- اگر کسی کام میں نفع بھی ہے اور نقصان بھی تو سب سے بہتر یہ ہے کہ نقصان کو دفع کیا جائے۔

اس سلسلے کی پہلی کتاب ''الرسالہ'' تھی، جس نے بے پناہ شہرت حاصل کی۔ امام رازی مناقبِ شافعی میں اس کے تحریر میں لانے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ''روایت ہے کہ عبدالرحمٰن بن مہدی نے شافعی سے استدعا کی جبکہ ابھی وہ نوجوان ہی تھے کہ ان کے لئے ایک ایسی کتاب لکھ دیں جس میں قرآن، سنت، اجماع اور قیاس

---

(۱) خبر واحد: جس حدیث کے راوی تعداد میں متواتر حدیث کے راویوں سے کم ہوں۔

(۲) حدیثِ مرسل: وہ حدیث جس میں تابعی تک سند متصل ہوتی ہے پھر تابعی کسی راوی صحابی کی سند کے بغیر کہتا ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا۔

(۳) حدیثِ موقوف منقطع: وہ حدیث جس میں صحابی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لئے بغیر حدیث بیان کرے یا اپنے خیال کا اظہار کرے وہ موقوف کہلاتی ہے۔ جبکہ وہ حدیث جس میں ایک یا زائد راوی مختلف مقامات سے ساقط ہوں منقطع کہلاتی ہے۔

(۴) حدیثِ متصل صحیح: وہ حدیث جس کی اسناد اول تا آخر متصل ہوں اور راوی ثقہ، پرہیزگار اور قابل اعتبار حافظے کے مالک ہوں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے استدلال کے شرائط درج ہوں۔ نیز ناسخ ومنسوخ کا بیان بھی ہو۔ عموم اور خصوص کے مراتب بھی ذکر کئے گئے ہوں۔ چنانچہ شافعی نے ایک کتاب تحریر کی جس کا نام ''الرسالہ'' رکھا اور اسے عبدالرحمٰن کے پاس بھیج دیا۔ جب عبدالرحمٰن نے اسے پڑھا تو وہ اس کی جامعیت اور خوبی دیکھ کر بہت متاثر ہوئے''۔

عراق میں اپنے دوسالہ قیام کے دوران آپ اپنے طریقۂ جدیدہ کی تلقین اور نشر واشاعت میں مصروف رہے۔ اسے مختلف اصحابِ علم کے سامنے پیش کرتے اور خود بھی مختلف مسائل پر اپنی ناقدانہ رائے کا اظہار کرتے۔ اس کے بعد آپ واپس تشریف لے گئے۔ ۱۹۸ ہجری میں پھر بغداد کا سفر کیا۔ لیکن ایک مہینہ قیام کے بعد مصر کی راہ لی۔ امام صاحب کے لئے اب بغداد میں رہنا قابل قبول نہ تھا۔ مامون الرشید خلافت پر متمکن تھا اور اس کے اوپر معتزلی افکار کا گہرا اثر تھا۔ اس کے گرد معتزلی حضرات جمع ہوگئے تھے۔ یہ لوگ علم الکلام کے قائل تھے۔ یونانی طرز پر دین کی سادہ تعلیمات کو گنجلک کرکے پیش کرتے اور لاحاصل بحثیں کرکے کفر کے فتوے لگاتے۔ یہ لوگ اپنی رائے کو دھونس سے منوانا چاہتے تھے۔ امام صاحب معتزلی فکر کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ چنانچہ مصر منتقل ہوگئے۔

امام مالکؒ سے اختلاف

جیسا کہ گزشتہ تذکرے میں گذر چکا ہے کہ امام شافعی، امام مالک کے شاگرد تھے۔ آپ اپنے استاد کی عزت کو ہمیشہ ملحوظ خاطر رکھتے۔ جن معاملات اور مسائل پر آپ امام مالک سے اختلاف رکھتے تھے، ان میں بھی علی الاعلان ان کی نکیر کرنے کے بجائے صرف اپنی رائے بیان کرنے پر اکتفا کرتے۔ اس لئے آپ کا شمار برابر اصحابِ مالک میں ہوتا رہا۔ لیکن آپ کو خبر ہوئی کہ اندلس میں امام مالک کی ایک ٹوپی تھی جس سے لوگ برکت حاصل کیا کرتے تھے اور یہ کہ جب لوگ حدیث رسول اللہ ﷺ پیش کرتے اور کہتے آپ ﷺ نے یہ فرمایا ہے تو یہ عقیدت مند لوگ کہتے مالک نے یہ کہا ہے۔ امام شافعی نے سوچا، مالک بہرحال آدمی تھے، ان سے غلطی کا ارتکاب بھی ہوسکتا ہے اور غلط روی کا بھی اور یہ کہ حدیث کے مقابلے میں ان کی رائے کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔
پھر امام مالک کی فقہ پر غور کرنے سے امام شافعی کو یہ بھی محسوس ہوا کہ بعض اوقات وہ خود اپنی بیان کردہ حدیثوں کے خلاف جاتے ہیں۔ وہ اس طرح کہ کبھی تو وہ اصل لے لیتے ہیں اور فرع یعنی تفصیل کو چھوڑ دیتے ہیں اور کہیں فرع کو لے لیتے ہیں اور اصل کو ترک کردیتے ہیں۔ چنانچہ آپ نے اپنی کتاب ''خلافِ مالک'' تحریر کی۔ استاد کی غلطیاں اور کوتاہیاں گنوانا آپ کے لئے کوئی آسان کام نہ تھا، لیکن سنتِ رسول کے مقابلے میں کسی شخص کی بات یا رائے کو زیادہ اہمیت دینا اس سے بھی زیادہ ناقابل قبول تھا۔ آپ کتاب کو تحریر کرنے کے بعد بھی ایک

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سال تک منظر عام پر نہ لائے۔ اسی تردد میں استخارہ کیا اور بالآخر اس کو پیش کر دیا۔

مصر میں مالکی فقہ پورے طور پر اپنے قدم گاڑ چکی تھی۔ کتاب کے سامنے آتے ہی امام مالک کے معتقدین والی مصر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ شافعی کو مصر سے نکال دیا جائے۔ امام شافعی کو اپنے موقف کی سچائی کا یقین تھا۔ آپ اس پر ڈٹے رہے۔ نہ مجادلے سے گریز کیا اور نہ مناظرے سے راہ فرار اختیار کی۔ کسی کے لئے برے الفاظ استعمال کئے بغیر اپنا موقف اور رائے پیش کرتے رہے۔

آپ نے امام مالک کے علاوہ عراق کے فقہاء کے طریقے سے بھی اختلاف کیا۔ امام اوزاعی کے افکار پر اپنی کتاب ''السیر'' میں تنقید کی۔ اہل حجاز اور اہل عراق فقہ میں اونچا مقام رکھتے تھے اور پورا عالمِ اسلام فقہی معاملات میں ان کی طرف دیکھتا تھا۔ یہ دونوں مکاتبِ فکر امام شافعی کے پیچھے پڑ گئے۔

اہلِ سنت اور اہلِ رائے کے مابین اعتدال کی راہ

امام شافعی کے عہد پر نگاہ ڈالی جائے تو فقہاء کو دو گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اہلِ سنت حضرات اور اہلِ رائے حضرات۔ اہلِ سنت فقہاء زیادہ تر احادیث رسول ﷺ کے حافظ تھے۔ ان کی پوری فقہ کا انحصار روایت پر تھا۔ اگر روایت نہ ہوتی تو وہ فتویٰ دینے میں توقف کرتے۔ جو مسائل پیش نہ آئے ہوں ان پر بحث سے پرہیز کرتے، تاکہ فتنوں سے بچا جا سکے۔ ان حضرات میں سے کچھ ضعیف احادیث کو بھی قابلِ حجت سمجھتے۔ یہ لوگ بحث و مناظرہ کے فن سے بالکل ناواقف تھے۔ جب کبھی ان کے سامنے نئے دور کے مسائل سے متعلق کوئی مشکل پیش آ جاتی تو حیران و پریشان ہو کر اس کا جواب دینے سے عاجز رہتے۔ دوسری جانب اصحابِ رائے کا یہ حال تھا کہ ان کے اندر آثار و سنن میں ضروری مہارت کی مزید گنجائش تھی، رائے کی کثرت پائی جاتی تھی۔ البتہ اگر بعد میں صحیح حدیث مل جاتی تو اپنی رائے سے رجوع کر لیتے۔ یہ لوگ مسائل کے پیش آنے سے قبل محض مفروضوں کی بنیاد پر احکام وضع کرتے تھے۔ یہ حضرات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہوئے اس اندیشے سے خائف رہتے کہ کہیں کوئی غلط لفظ آپ ﷺ سے منسوب نہ ہو جائے۔ اس لئے یہ ضعیف احادیث کو رد کر دیتے۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ عام محدثین حدیث و روایت میں درایت(۱) سے بالکل کام نہیں لیتے تھے۔ چنانچہ اہل رائے حضرات نے بہت سی حدیثیں اس بناء پر قبول نہ کیں کہ وہ اصولِ درایت کے موافق ثابت نہ ہوئیں۔ اہل سنت حضرات کا مرکز حجاز جبکہ اہل الرائے کا مرکز عراق تھا۔

---

(۱) درائیت: علم درائیت کے ذریعے راویوں کے حالات کی پوری طرح چھان بین کی جاتی ہے جس کی بناء پر روایت کو قبول یا رد کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ روایت شدہ حدیث کے مضمون کی تحقیق کر کے کھرے اور کھوٹے کا فرق معلوم کیا جاتا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

امام شافعی نے دونوں گھاٹ کا پانی پیا تھا۔ دونوں طرز ہائے فکر کی کمزوریوں اور اچھائیوں سے واقف تھے۔ خود غور و خوض کے بعد قوانینِ استنباط مرتب کر چکے تھے۔ قرآن کے حافظ تھے، احادیث نبوی ﷺ کو بہت اچھی طرح پہچانتے تھے۔ فقہ کے اصولوں سے واقف تھے۔ آداب بحث و مناظرہ خوب آتے تھے۔ فصاحتِ کلام میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ آپ نے معتزلی طریقہ کار سے بھی واقفیت حاصل کر لی تھی۔ آپ خود حریف کے اقوال سے ہی اس کے خلاف دلیل قائم کرتے۔ آپ نے ایک طرف احادیثِ رسول ﷺ کی حجیت کا دفاع کیا تو دوسری طرف اہل حدیث حضرات کی کمزوریوں کو بھی پیش نظر رکھا۔

فقہ شافعی

امام صاحب کی تصنیفات پر ایک نظر ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ پہلے آپ ان اصولوں کا تذکرہ کرتے جو آپ نے بسلسلہ استنباط وضع کئے تھے۔ پھر ان مسائل کا تذکرہ کرتے جن میں اختلاف درپیش تھا۔ اس کے بعد سنت رسول ﷺ اور اختلافات صحابہ کو زیر بحث لاتے اور یہ سب کرنے کے بعد ان آراء میں جس رائے کو اپنے مقرر کردہ اصولوں کے مطابق پاتے اسے اپنا لیتے۔

امام صاحب کے نزدیک علم کے پانچ درجے ہیں، ان میں سے ہر درجہ اپنے بعد والے درجے پر فوقیت رکھتا ہے۔ یہ پانچ مراتب حسب ذیل ہیں:

۱۔ کتاب وسنت

امام شافعی کتاب وسنت کا تذکرہ ایک ہی جگہ کرتے ہیں۔ بعض تصنیفات میں آپ نے سنت کو کتاب الٰہی کا ہم مرتبہ نہیں بلکہ اس کے قریب قریب رکھا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جہاں تک کتاب الٰہی کا تعلق ہے اسناد کی حیثیت سے اس میں رتی برابر شک کی گنجائش نہیں ہے۔ اس کے برعکس سنت میں اسناد کے کئی مراتب ہیں۔ چنانچہ وہ سنت جو ثابت ہو، متواتر ہو یا مشہور ہو اس کا مرتبہ بھی اتنا ہی بلند ہوگا۔ البتہ احادیثِ آحاد[1] قوت میں قرآن کے برابر نہیں ہیں۔ اسی طرح اگر کسی معاملے میں قرآن وسنت میں باہم مطابقت نہ ہو تو قرآن کی بات پر عمل کیا جائے گا۔

امام شافعی قرآن کو قرآن سے ہی سمجھنے کو فوقیت دیتے تھے۔ لیکن قرآن میں اکثر احکامات کا تفصیل سے تذکرہ نہیں ملتا۔ سنت کے ذریعے سے ان کی جزئیات اور تفصیل معلوم ہوتی ہے۔ قرآن نے مبادی اور اصول پر

---

(۱) احادیث آحاد: وہ حدیث جس کے راوی کسی طبقے میں اتنے زیادہ نہ ہوں کہ ان کا کذب پر اتفاق عادتاً محال سمجھا جائے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اکتفا کیا ہے جبکہ سنت نے بیان وتفصیل کا فریضہ انجام دیا ہے۔

۲-سنت

امام صاحب کے دور میں فتنۂ انکارِ حدیث سر اٹھا چکا تھا اور منکرینِ حدیث کے تین گروہ سامنے آئے تھے:

(۱) وہ منکرینِ حدیث جو مکمل طور پر حدیث کی حجیت کا انکار کرتے تھے۔

(۲) وہ منکرینِ حدیث جو صرف ان احادیث کو تسلیم کرتے تھے جو قرآن کے احکام سے مطابقت رکھتی تھیں۔

(۳) وہ منکرینِ حدیث جو صرف مشہور حدیث کے قائل تھے۔

ایسے میں امام شافعی اٹھے اور آپ ﷺ کی سنت مبارکہ اور حدیث کی حجیت کو قرآنی آیات کے ذریعے ثابت کیا۔ آپ نے واضح کیا کہ اللہ نے قرآن میں معصیتِ رسولؐ کو خود اپنی معصیت قرار دیا ہے۔ لہٰذا سنت فقہ اسلامی کے مصادر میں سے ایک اہم مصدر ہے۔ بلکہ یہ ایسا علم ہے جو اپنے مرتبے میں قریب قریب کتاب الٰہی کا ہم پایہ ہے۔ پھر خبرِ واحد کے حجت ہونے پر بھی ایسی ایسی دلیلیں خود آنحضرت ﷺ کے دور اور صحابہ کرام کی مثالوں سے پیش کیں کہ خوارج اور زنادقہ ان کا جواب دینے سے قاصر تھے۔ البتہ امام شافعی نے تصریح کی کہ خبر واحد مرتبہ میں قرآن پاک تک نہیں پہنچ سکتی۔ کیونکہ کتابِ الٰہی اور ثابت شدہ سنتیں شک وشبہ سے بالاتر ہیں۔ نیز شافعی مرسل احادیث کو چند کڑی شرطوں کے بعد قبول کر لیتے ہیں۔ اسی طرح باہم متعارض احادیث کے لئے بھی چند قاعدے بنائے جن کی بناء پر ایک حدیث کو دوسری حدیث پر ترجیح حاصل ہوگی۔

''کتاب الام'' میں سنت کی اصل حجیت سے اختلاف رکھنے والے علمائے بصرہ سے امام شافعی کے مناظروں کا تذکرہ ملتا ہے۔ اس کے علاوہ اس موضوع پر آپ کی کتاب ''الرسالہ''، ''کتاب جماع العلم'' اور ''اختلاف الحدیث'' میں ان کا تفصیلی بیان ہے۔ ان خدمات کی وجہ سے آپ کو ناصر السنہ کہا جانے لگا۔

۳-اجماع

امام صاحب کتاب وسنت کے بعد اجماع کو حجت تسلیم کرتے ہیں۔ آپ کے نزدیک جب علمائے عصر کسی حکم پر اتفاق کرلیں تو وہ اجماع درست ہے۔ پہلا اجماع جو امام صاحب کے نزدیک قابل حجت ہے اجماع صحابہ ہے۔ آپ نے امام مالک کے برخلاف بلاد اسلامیہ کے تمام علماء کے اتفاق سے وقوع پذیر ہونے والے اجماع کو معتبر سمجھا ہے جبکہ امام مالک صرف اہل مدینہ کے اجماع کو معتبر سمجھتے تھے۔ اسی کے ساتھ ساتھ امام صاحب اہل مدینہ کے اجماع کو نہایت احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اسے غیر معمولی اہمیت دیتے ہیں۔ اپنی کتاب

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

''اختلاف الحدیث'' میں آپ نے تصریح کی ہے کہ آنحضرت ﷺ کے صحابہ اور تبع تابعین میں سے کسی شخص نے فرائض کے سواء جن کے سب لوگ مکلّف ہیں، کسی اور مسئلہ پر اجماع کا دعویٰ نہیں کیا۔

۴- قیاس

سب سے پہلے قیاس سے متعلق قواعد وضوابط مرتب کرنے اور اس کی اساس و بنیاد کو واضح کرنے والی ہستی امام شافعی کی ہے۔ آپ نے واضح کیا کہ وہ فقہ جس کا مآخذ قیاس ہو اور وہ فقہ جو نص سے ماخوذ ہو دونوں کے مابین قوت وضعف کے اعتبار سے کتنا زبردست فرق ہے۔ اس کے علاوہ قیاس کرنے والے فقیہ کے لئے ضروری خصوصیات بھی بیان کیں۔ آپ نے قیاسِ صحیح اور اپنی رائے سے استنباط کے فرق کو واضح کیا۔ آنے والے ادوار میں علمائے امت نے آپ کی تعریفِ قیاس اور ضوابط کو پیش نظر رکھ کر فقہ کی عمارت کا ڈھانچہ ترتیب دیا۔

یہاں ہم امام شافعی کی کتاب ''الرسالہ'' سے اقتباس پیش کریں گے جس کی روشنی میں یہ سمجھنا آسان ہوگا کہ آپ کتاب وسنت اور قیاس کو کس درجے میں رکھتے تھے:

> ''کتاب وسنت کا جو حکم ازروئے اجماع ثابت ہو وہ ہمارے نزدیک ظاہر و باطن دونوں لحاظ سے حجت ہے۔ مگر جو سنت انفرادی اعتبار سے ثابت ہو نیز اس پر لوگوں کا اجماع نہ ہو، وہ صرف ظاہری لحاظ سے حجت ہوگی کیونکہ اس میں غلطی کا امکان موجود ہے۔ قرآن و سنت کے بعد اجماع اور پھر قیاس کا درجہ ہے اور قیاس سب سے ضعیف ترین دلیل ہے۔ کیونکہ حدیث کی موجودگی میں قیاس کی ضرورت نہیں ہے اور اس کی مثال سفر میں پانی نہ ملنے پر تیمّم کی سی ہے جو پانی ملنے پر باطل ہو جاتا ہے''۔

۵- استحسان

امام شافعی استحسان کی حوصلہ افزائی نہیں کرتے۔ استحسان دراصل ہر وہ اجتہاد ہے جو کتاب وسنت، اثر و اجماع یا قیاس پر مبنی نہ ہو بلکہ عقل کی بنیاد پر فیصلہ کیا جائے۔ چونکہ استحسان کے لئے کوئی ضابطہ مقرر نہیں کیا جا سکتا، پھر نبی اکرم ﷺ بھی اپنے معاملات کے لئے وحی آسمانی کا انتظار کرتے تھے (ماسواء چند واقعات کے) اور اگر صحابہ آپؐ کے پاس موجود نہ ہوتے اور استحسان سے فتویٰ دیتے تو آپ ﷺ ناپسند فرماتے، لہٰذا امام شافعی استحسان کے ذریعے تخریجِ احکام کو باطل قرار دیتے ہیں۔

تاہم مصالح مرسلہ کا اثبات کرتے ہیں۔ مصالحِ مرسلہ سے مراد کسی ایسی رائے کے حق میں فیصلہ دینا جس پر قرآن وسنت اور اجماع سے کوئی دلیل تو نہ ملتی ہو مگر وہ مصلحتِ عامہ میں ہو اور شریعت سے متعارض نہ ہو۔ اس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

معاملے میں غلو سے بچنے کے لئے انہی مصالح کو لائق اعتبار سمجھتے جو شارع کے مصالح کے مشابہ ہوں۔

وفات

امام صاحب مدّت سے عارضۂ بواسیر میں مبتلا تھے۔ مرض کی شدت اتنی زیادہ تھی کہ بعض اوقات سواری کی حالت میں خون نکلنا شروع ہوتا تو بہتے بہتے پائجامے سے موزوں تک آ جاتا۔

اس کے علاوہ ایک اور روایت کے مطابق ایک شخص سے آپ کا مباحثہ ہوا اور اس نے خلافِ تہذیب گفتگو کی۔ بات مقدمہ بازی تک جا پہنچی تو امیر مصر نے اس شخص کے خلاف فیصلہ دے دیا۔ اس شخص نے یا اس کے حامیوں نے اندھیری رات میں موقع پا کر آپ پر ایسا گرز مارا کہ سر پھٹ گیا۔ ادھر آپ بواسیر کی وجہ سے بے حد کمزور تھے۔ مرض الموت شروع ہو گیا۔

۲۰۴ ہجری ۳۰ رجب کو عصر کے وقت آپ کی طبیعت زیادہ بگڑ گئی۔ امام مزنی اس وقت پاس بیٹھے تھے۔ انہوں نے عرض کیا: ''اے استادوں کے استاد، کیسا مزاج ہے''؟ امام شافعیؒ نے فرمایا ''آج میں دنیا سے رخصت ہونے والا ہوں اور اپنے بھائیوں سے جدا ہونے والا ہوں اور اپنے برے اعمال کی سزا پانے والا ہوں۔ خدا کی بارگاہ میں پیش ہونے کا وقت آ گیا ہے اور خدا کی قسم مجھے یہ خبر نہیں کہ آیا میری روح جنت میں جائے گی اور میں اسے مبارکباد دوں گا یا دوزخ میں جائے گی جہاں مجھے اس کی تعزیت کرنی پڑے گی۔'' وفات سے ذرا قبل آپ نے وصیت فرمائی کہ فلاں شخص کو کہہ دینا کہ مجھے وھو دے (اس وقت وہ شخص کہیں گیا ہوا تھا)۔

اس کے بعد آپ نے عشاء کی نماز پڑھی۔ نماز سے فراغت کے بعد لیٹے ہی تھے کہ نزع کا عالم طاری ہو گیا۔ زبان دعا وزاری میں مصروف تھی۔ کچھ دیر بعد روحِ مبارک قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ اگلے دن جمعہ کی نماز کے بعد آپ کو قاہرہ کے باہر قبرستان میں دفن کیا گیا۔ امام ناصر السنہ کے سفر آخرت میں الوداع کہنے والوں کا ہجوم تھا۔ خلقت ٹوٹی پڑ رہی تھی۔ امام صاحب ۵۴ سال کی مختصر مگر کارآمد زندگی گذار کر ربِ کریم سے جا ملے۔

آپ کے انتقال کے بعد وہ شخص لوٹا جس کے بارے میں آپ نے وصیت کی تھی۔ لوگوں نے اسے خبر دی کہ امام صاحب نے وفات سے قبل تمہارے بارے میں یہ فرمایا تھا تو اس شخص نے آپ کے ذمے ستر ہزار درہم کا قرضہ معاف کر دیا اور کہا میرا دھوڈالنا آپ کے قرض کو معاف کرنا تھا۔

معمولاتِ زندگی اور سیرت و اخلاق

امام صاحب کی زندگی کا بڑا حصہ تحصیلِ علم میں خرچ ہوا۔ پھر جب اپنا حلقۂ درس قائم کیا تو صبح سے شام تک

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

طالبینِ علم کا ہجوم آپ سے فیض اٹھاتا۔ ربیع بن سلیمان کا قول ہے:

''امام شافعی فجر پڑھ کر اپنے حلقے میں بیٹھ جاتے اور فوراً ہی طالبانِ علمِ قرآن حاضر ہو جاتے۔ طلوعِ آفتاب کے وقت یہ لوگ اٹھ جاتے۔ پھر طالبانِ علم حدیث کا گروہ پہنچ جاتا۔ یہ لوگ حدیث کے معنی اور تفسیر کے سلسلہ میں سوالات کرتے رہتے۔ جب دھوپ چمک اٹھتی تو یہ گروہ بھی اٹھ جاتا۔ پھر حلقۂ مناظرہ قائم ہو جاتا۔ دوپہر سے پہلے تک یہ جمگھٹا قائم رہتا۔ اس کے بعد عربیت، عروض، شعر اور نحو کے تشنہ کام آتے اور دوپہر تک وہ فائدہ اٹھاتے''۔

ابتداء میں جب بغداد کی جامع مسجد میں آپ تشریف لائے تو آپ کے ساتھ صرف چھ اصحاب تھے۔ اس کے بعد آپ کا حلقہ درس اس قدر وسعت پذیر ہوا کہ پھر مسجد میں آپ کے سوا کسی کا حلقہ درس باقی نہ رہا۔

امام صاحب کی وہ بہترین صفت جو کہ خال خال ہی لوگوں میں نظر آتی ہے آپ کی راست فکری اور منصف مزاجی تھی۔ جو بات حق و صداقت سے قریب تر ہوتی اس کو قبول کرتے، چاہے اس کی کیسی ہی قیمت چکانی پڑتی اور جو بات درست معلوم نہ ہوتی چاہے وہ آپ کے استاد ہی کی رائے کیوں نہ ہو یا چاہے وہ ایسے مکتبہ فکر کی جانب سے ہی کیوں نہ کی گئی ہو جس کا طریقہ آپ کو پسند ہو، آپ اس کے خلاف جاتے تھے۔

آپ نے ہمیشہ پوری جرأت اور قوت کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کیا، خواہ وہ لوگوں میں رائج مانوس افکار سے متصادم ہی کیوں نہ ہو۔ خود اپنی رائے اور افکار کو بھی برابر پرکھا کرتے اور ان پر نظر ثانی کا سلسلہ جاری رہتا۔ اس لئے ایک ہی مسئلے پر آپ کی مختلف آراء ملتی ہیں۔ ایک متلاشیٔ حق کے طور پر جب بھی کوئی بات آپ پر روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی تو آپ اپنی گزشتہ رائے سے رجوع کر لیتے۔

ندرتِ فکر کے باوجود نبی اکرم ﷺ کے اقوال و طریقے کو نہ صرف ہر چیز پر مقدم جانتے بلکہ اس کی صحیح قدر پہچانتے تھے۔ معجم یاقوت میں ربیع بن سلیمان کی ایک روایت درج ہے کہ ایک شخص شافعی سے ایک مسئلہ دریافت کر رہا تھا۔ اثنائے گفتگو میں اس نے کہا نبی ﷺ سے ایسا ایسا مروی ہے۔ لیکن اے ابوعبداللہ! آپ یہ کہہ رہے ہیں۔ یہ سنتے ہی شافعی کانپنے لگے۔ ان کا رنگ زرد پڑ گیا۔ حالت متغیر ہو گئی۔ انہوں نے کہا: ''کونسی زمین مجھے پناہ دے گی اور کونسا آسمان مجھے اپنے زیر سایہ رکھے گا کہ اگر میرے سامنے رسول اللہ ﷺ کی کوئی حدیث بیان کی جائے اور میں یہ نہ کہوں کہ ہاں! بے شک بسر و چشم''۔

نبیؐ کے اہل بیت سے آپ کی محبت کا اظہار بھی وقتاً فوقتاً آپ کے اقوال سے ہوتا رہتا تھا۔ یہاں تک کہ لوگ آپ کو رافضی کہنے لگے۔ اس الزام پر اپنے اشعار میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''اگر حبِ آلِ رسول

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ﷺ رفض ہے تو فرشتوں کو چاہئے کہ میرے رافضی ہونے کی گواہی دیں۔''

علومِ دین کے علاوہ آپ اعلیٰ انسانی صفات سے بھی متصف تھے۔ دنیاوی مال کی طلب اور لالچ سے بے پرواہ تھے۔ ایک بار عید کے موقع پر گھر میں کچھ نہ تھا۔ بیوی نے کہا اس دن کے لئے کچھ قرض لے لیجئے۔ آپ نے کسی سے ستر دینار قرض لے لیا۔ راستے میں فقیروں نے آ گھیرا، چنانچہ ساری رقم ان میں تقسیم کر دی اور خود خالی ہاتھ گھر آ گئے۔ بیوی نے یہ ماجرا سن کر کہا کہ آپ تو ہمیشہ اس طرح کرتے ہیں۔

امام مزنی ایک روایت میں بیان کرتے ہیں کہ عید کی رات کو وہ امام صاحب کے گھر کے دروازے تک پہنچے تو ایک غلام نے آپ کو سلام کیا اور ایک تھیلی اپنے آقا کی طرف سے پیش کی۔ اتنے میں ایک صاحب آئے اور بولے ''اے ابوعبداللہ، میرے گھر میں ابھی بچے کی پیدائش ہوئی ہے اور میرے پاس خرچ کرنے کو کچھ نہیں ہے۔'' آپ نے وہ تھیلی اس شخص کو دے دی اور خود مسکراتے ہوئے گھر میں چلے گئے۔

ابتداء میں امام صاحب تنگدستی اور عسرت سے رہے۔ بعد میں اللہ کے فضل سے کشادگی حاصل ہوئی تو بے انداز دولت ضرورتمندوں پر خرچ کرتے اور اپنے لئے بمشکل چوتھائی کے حساب سے رکھتے۔ لوگوں نے اس کی وجہ دریافت کی تو فرمایا: ''سنو دولت خدا اس لئے عطا کرتا ہے کہ اس کی مخلوق کو فائدہ پہنچایا جائے اور جب میں اس عطیہ وامانت سے خود فائدہ اٹھانے لگوں تو قیامت میں جب محمد رسول اللہ ﷺ شفیع بن کر کھڑے ہوں گے تو میرا کیا حشر ہوگا''؟ یہ فرماتے جاتے تھے اور زار وقطار روتے جاتے تھے۔

آپ اپنے دوستوں اور شاگردوں کی تواضع میں کوئی کسر نہ چھوڑتے۔ دورانِ مناظرہ اپنے مقابل اور حریف سے بھی شائستہ انداز میں گفتگو کرتے۔

امام صاحب کا علمی پایہ اس قدر بلند اور اتنا ہمہ جہت ہے کہ اس پر تفصیلی گفتگو کرنے کا موقع نہیں ہے۔ البتہ آپ کے ایک شاگرد کا قول نقل کرتے ہیں، جنہوں نے امام صاحب کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا ''شافعی جب قرآن کی تفسیر بیان کرنے لگتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے قرآن کریم کو نازل ہوتے انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔''

امام صاحب کی آواز میں بلا کی تاثیر تھی۔ تاریخِ بغداد میں آپ کے ایک معاصر کا بیان ہے کہ ''جب ہم رونا چاہتے تو اپنے کسی ساتھی سے کہتے آؤ اس مطلبی نوجوان کی طرف چلیں اور اس سے قرآن سنیں۔ جب ہم ان کے پاس جاتے تو وہ قرآن شروع کر دیتے۔ پھر تو یہ عالم ہوتا کہ لوگ سب کام چھوڑ کر ان کے سامنے جمع ہو جاتے اور شورِ گریہ برپا ہو جاتا۔ یہ دیکھ کر وہ قرأت سے باز آ جاتے۔''

امام صاحب نے اپنی رات کو تین حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ رات کے پہلے حصے میں سو جایا کرتے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دوسرے حصے میں پڑھنے لکھنے کا کام کرتے اور تیسرا حصہ عبادت کے لئے وقف تھا۔ شافعی کے شاگرد ربیع کا بیان ہے کہ ''شافعی کے ورودِ مصر سے پہلے ایک مدت تک ان کی خدمت میں حاضر رہا۔ ان کی ایک سیاہ فام باندی تھی۔ جب وہ کچھ لکھنا چاہتے تو اس سے کہتے ''اے جاریہ، اٹھ اور چراغ جلا۔'' وہ اٹھتی اور چراغ جلا دیتی۔ پھر جو کچھ اور جب تک جی چاہتا وہ بیٹھے لکھتے رہتے۔ ہمیشہ اسی طرح کام کرتے۔ کام ختم کرنے کے بعد خود ہی چراغ بجھا دیتے۔ میں نے ایک بار پوچھا ''آپ ایسا کیوں کرتے ہیں؟'' شافعی نے جواب دیا ''چراغ کی روشنی میں خیالات یکسو نہیں رہتے۔'' چنانچہ چراغ بجھا کر غور و فکر کیا کرتے تھے۔

یہاں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ امام صاحب کو خدا کی جانب سے بے شمار صلاحیتیں ودیعت ہوئی تھیں۔ مگر یہ مقام اور یہ شہرت محض اس لئے حاصل نہ ہوئی کہ آپ کا ذہن اچھا تھا، حافظہ قوی تھا، آواز پراثر تھی یا زبان دانی قدرت کی جانب سے حصہ میں آئی تھی، بلکہ اس میں انتہاء درجے کی محنتِ شاقہ اور طویل غور و فکر کا بھی بہت بڑا ہاتھ تھا۔ ہم میں سے بہت سوں کو اللہ کی جانب سے حیران کن صلاحیتیں عطا ہوتی ہیں۔ مگر کتنے ہیں جو محنت اور آزمائش کی بھٹی میں انہیں تپا کر خالصتاً للّٰہی مقصد کے لئے استعمال کرتے ہیں۔

یہاں امام صاحب کے کردار کے ایک اور پہلو پر بھی ہم دوبارہ نظر ڈالیں گے۔ امام صاحب نے اپنے دور کے بڑے بڑے آئمہ فن سے فیض اٹھایا۔ ان کی صحبت میں وقت گذارا اور ان کو ان کے مرتبے کے لائق عزت بھی دی۔ مگر شخصیت پرستی کبھی آپ کے مزاج کا حصہ نہ بن سکی۔ آپ ایک عبقری (جینئس) تھے۔ آنکھیں بند کر کے اپنے پیشرووں کے پیچھے چلنے کے بجائے غور و فکر اور خداداد فراست کی بناء پر اپنے اساتذہ اور معاصر سے اختلاف بھی کرتے اور ان کی فکری اور اجتہادی کوششوں سے فائدہ بھی اٹھاتے۔ ہر دو کے بارے میں نہ معذرت خواہانہ انداز اختیار کرتے اور نہ چھپاتے۔ تقلیدی روش عوام کے لئے مناسب ہو سکتی ہے لیکن علمائے امت کے لئے لازم ہے کہ فقہی مسائل کی تحقیق کے دوران نہ صرف یہ کہ ایک طالب علم اور سچے متلاشئ حق کی طرح بھرپور کوشش کریں بلکہ ساتھ ساتھ اپنے ذہن کو ہر طرح کے تعصب سے بھی پاک رکھیں۔

www.KitaboSunnat.com
محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

امام احمد بن حنبلؒ

فقہ حنبلی کے بانی' تیسری صدی ہجری کے مجدّد اور فتنۂ خلقِ قرآن کے مقابلے میں امام العزیمت

تعارف

نام احمد، کنیت ابوعبداللہ اور لقب الامام الحافظ تھا۔ آپ کا سلسلہ نسب اختلافِ روایت کی بناء پر مختصراً بیان کیا جاتا ہے۔ احمد بن محمد بن حنبل شیبانی المروزی۔

آپ خالص عرب تھے۔ باپ اور ماں دونوں کی طرف سے شیبانی تھے جو کہ عدنانی قبیلہ ہے اور نزار بن معد بن عدنان کے واسطے سے اس کا تعلق نبی اکرم ﷺ سے مل جاتا ہے۔ یہ قبیلہ اپنی دلیری اور شجاعت کے اعتبار سے بہت مشہور تھا۔ مثنیٰ بن حارثہ جنھوں نے ابوبکر صدیقؓ کی توجہ جنگِ عراق کی طرف دلائی اور خود شجاعت کی داستان رقم کی، اسی قبیلے سے تھے۔ عمرؓ بن خطاب نے جب بصرہ بسایا تو آپ کا خاندان بھی یہاں منتقل ہوگیا اور یہ لوگ بصری کہلائے جانے لگے۔

ولادت

احمد بن حنبل ربیع الاول ۱۶۴ ہجری میں بغداد میں پیدا ہوئے۔

پس منظر اور بچپن کے حالات

آپ کے دادا حنبل بن ہلال بصرہ سے خراسان چلے گئے اور وہیں اموی فوج میں شامل ہوئے۔ پہلے ترقی کرتے کرتے کمانڈر بنے اور کچھ عرصے بعد سرخس کے گورنر مقرر ہوئے۔ جب عباسیوں نے اہل بیت اور بنو ہاشم کے نام سے خراسان میں اپنی دعوت شروع کی تو حنبل اس دعوت کے ہمدردوں اور کارکنوں میں شریک ہوگئے اور اس راہ میں بڑی تکالیف اٹھائیں۔ آپ کے والد محمد بن حنبل بھی فوجی تھے۔ ابھی آپ بہت چھوٹے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تھے جب ان کا انتقال ہوگیا اور کچھ روایات کے مطابق آپ کی پیدائش سے قبل ہی وہ چل بسے۔

آپ کے والد نے ترکہ زیادہ نہ چھوڑا۔ بغداد میں ایک گھر تھا یا اتنی زمین جس سے تھوڑی بہت آمدنی ہو جاتی تھی۔ آپ کی والدہ ایک حوصلہ مند خاتون تھیں جنہوں نے آپ کی تربیت میں صبر وشکر، قناعت و بلند ہمتی جیسی خصوصیات شامل کیں۔

امام احمد بن حنبلؒ بچپن ہی سے اپنے ادب اور بہترین عادتوں کی وجہ سے پسندیدہ نگاہوں سے دیکھے جانے لگے۔ بہت سی عورتیں جن کے شوہر فوج میں تھے اور سرحدوں پر گئے ہوئے تھے، آپ سے خط پڑھواتیں اور جواب لکھواتیں۔ لوگ اپنے بچوں کی تربیت کرتے وقت آپ کی مثال سامنے رکھتے۔ آپ کی سعادت مندی اور اطوار وفضائل دیکھ کر اصحابِ نظر کہا کرتے تھے کہ ''یہ لڑکا اگر زندہ رہا تو اپنے اہلِ زمانہ کے لئے حجت ہوگا۔''

احمد بچپن ہی سے غلط روی اور غلط کاموں سے بچنے کا خوب اہتمام کرتے۔ اس کا اندازہ کچھ اس واقعے سے بھی ہوتا ہے کہ ایک بار والیٔ بغداد نے آپ کے چچا کو (جو اس کی غیر حاضری میں بغداد کی خبریں پہنچانے کے فرض پر مقرر تھے) طلب کر کے کہا کہ بغداد کی خبریں اسے نہیں ملیں۔ وہ چاہتا ہے کہ انہیں خلیفہ کو لکھ بھیجے۔ آپ کے چچا نے کہا ''وہ تو میں نے اپنے بھتیجے احمد کے ہاتھ روانہ کردی تھیں''۔ اب احمد کو طلب کر کے دریافت کیا گیا کہ وہ خبریں کہاں گئیں۔ احمد نے جواب دیا۔ ''میں نے انہیں پانی میں پھینک دیا''۔ پھر کہا: ''میں خبریں لئے آرہا تھا کہ خیال آیا کہ اللہ نے تجسس سے منع فرمایا ہے اور ہم نے اسے اپنی زندگی کا وطیرہ بنالیا ہے۔ چنانچہ خبروں کا سارا پلندہ دجلہ میں پھینک دیا''۔ یہ سن کر بغداد کے گورنر پر عجیب کیفیت طاری ہوگئی۔ کہنے لگا ''افسوس ہم پر! ہم تو اس لڑکے سے بھی گئے گزرے ہیں۔ یہ صاحبِ ورع لڑکا ہے۔ ہم اس کے ساتھ سختی نہیں کر سکتے۔''

تعلیم وتربیت

آپ بغداد جیسے شہر میں پلے بڑھے۔ اس زمانے کا بغداد پوری دنیا میں اسلام کا دارالخلافہ اور علم اور تہذیب کا مرکز تھا۔ ہر طرف سے طالب علم کھنچ کھنچ کر تحصیلِ علم کے لئے یہاں جمع ہوتے۔

آپ کی والدہ نے خاندانی پیشے کے برعکس احمد کے لئے علمِ دین کی تحصیل کو پسند کیا۔ آپ ابھی چھوٹے ہی تھے کہ مکتب میں بٹھا دیے گئے۔ قرآن حفظ کیا، پھر علمِ لغت حاصل کیا۔ اس کے بعد تحریر وکتابت کے فن کی طرف توجہ کی۔ خود فرماتے ہیں ''میں ابھی بالکل بچہ تھا کہ حفظِ قرآن سے فارغ ہوگیا۔ چودہ سال کا تھا کہ تحریر وکتابت کی مشق کرنے لگا۔'' آپ کی یادداشت حیرت انگیز تھی۔ جو کچھ پڑھتے وہ گویا ذہن نشین ہو جاتا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

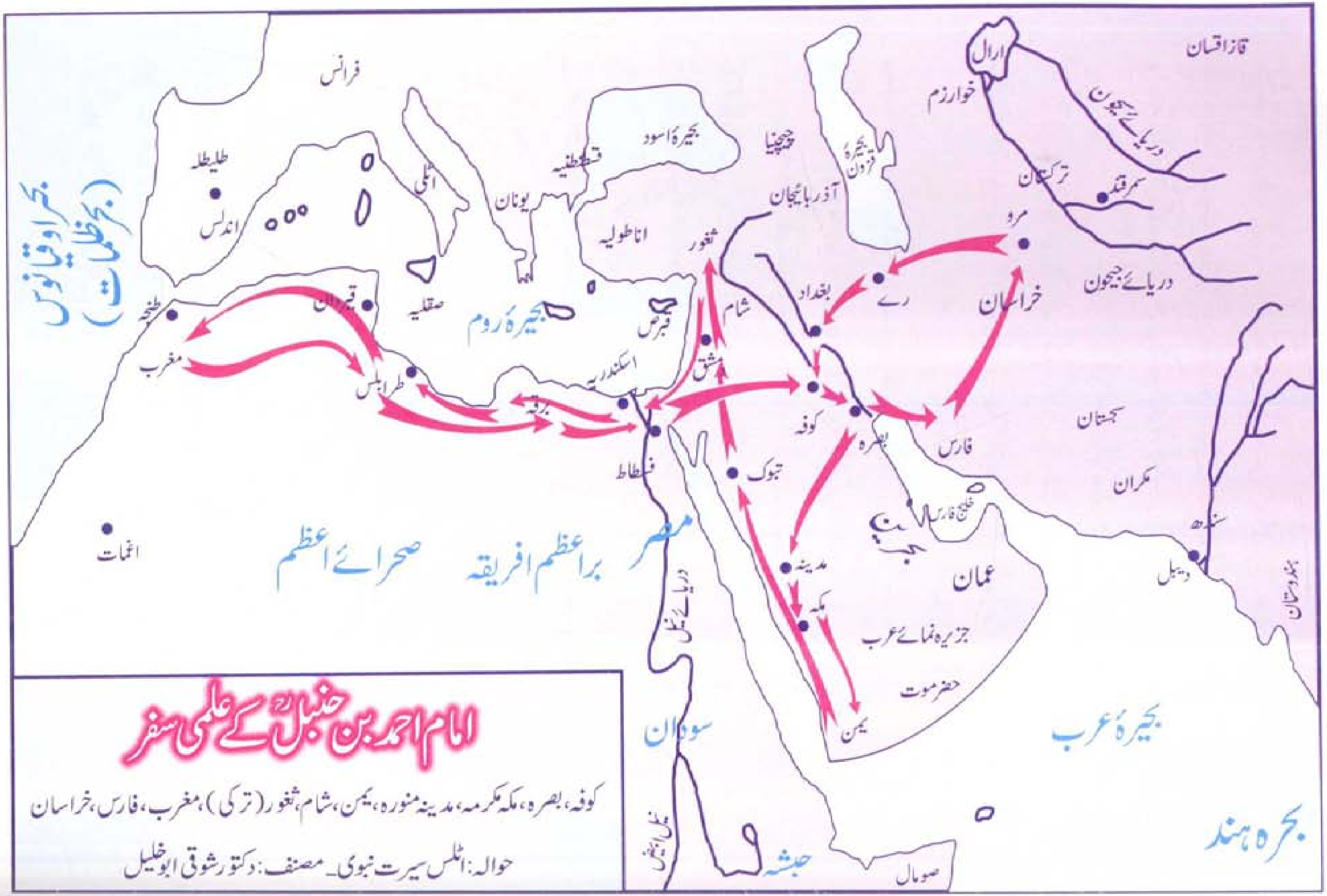

امام احمد بن حنبلؒ کے علمی سفر

کوفہ، بصرہ، مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، یمن، شام، ثغور (ترکی)، مغرب، فارس، خراسان

حوالہ: اٹلس سیرت نبوی۔ مصنف: دکتور شوقی ابو خلیل

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ابتدائی تعلیم مکمل کرنے کے بعد آپ کی توجہ علمِ حدیث کی طرف ہوئی۔ سولہ سال کی عمر میں سب سے پہلے امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد امام ابو یوسفؒ کے حلقہ درس میں پہنچے اور حدیث کا پہلا سبق ان سے لیا۔ اس کے بعد اگلے سات برس تک آپ بغداد کے چوٹی کے محدثین اور فقہاء کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے۔ ان میں ہشیم بن بشیر، عمیر بن عبداللہ، عبدالرحمن بن مہدی اور ابوبکر بن عیاش کے نام قابل ذکر ہیں۔

حصولِ علم کی سچی لگن آپ کو آرام سے نہ بیٹھنے دیتی۔ خود فرماتے ہیں ''اکثر ایسا ہوتا کہ میں صبح صبح تعلیمِ حدیث کے لئے باہر جانا چاہتا۔ میری والدہ میرا دامن پکڑ لیتیں۔ اتنا سویرے جانا انہیں پسند نہ آتا۔ یہاں تک کہ یا فجر کی اذان ہونے لگتی یا پو پھٹ جاتی اور صبح طلوع ہو جاتی۔''

شہر بھر کے علماء سے فیض اٹھانے کے بعد اب تحصیلِ علم کے لئے بغداد سے باہر جانے کا خیال پیدا ہوا۔ سب سے پہلے بصرہ تشریف لے گئے۔ پھر حجازِ مقدس کا سفر اختیار کیا۔ اس سفر میں امام شافعیؒ سے ملاقات ہوئی۔ آپ نے ان سے فقہ شافعی کے اصول، قرآن کے ناسخ و منسوخ کا بیان سنا اور موطا امام مالک کی بھی سماعت کی۔

حدیث کے علم سے آپ کو سچی محبت تھی۔ اس کے حصول کی راہ میں بڑی سے بڑی قربانی دینے کو تیار رہتے۔ ۱۹۸ ہجری میں آپ نے حج کرنے کا اور اس کے بعد یمن کے دارالخلافہ صنعاء جانے کا ارادہ باندھا تاکہ مشہور محدث عبدالرزاق سے حدیث کی سماعت کر سکیں۔ آپ کے ساتھ راہِ علم کے ساتھی امام یحییٰ بن معین بھی تھے۔ وہ آپ کے اس ارادے سے باخبر تھے۔ ابھی آپ دونوں مکہ میں داخل ہوئے تھے اور طوافِ قدوم میں مصروف تھے کہ عبدالرزاق بھی طواف کرتے دکھائی دیئے۔ ابن معین نے انہیں دیکھ لیا اور سلام کے بعد اگلے روز حاضر ہو کر حدیث سماعت کرنے کی اجازت طلب کی۔ طواف سے فارغ ہو کر امام احمد ابن حنبل سے کہنے لگے۔ ''خدا نے آپ کو مسافت کی زحمت، آمد و رفت کی مصیبت اور زادِ راہ کی فکر سے نجات دی۔'' امام صاحب کہنے لگے ''نہیں، یہ خدا کی مرضی نہیں ہے۔ میں نے ایک نیت کر لی تھی، اب تمہاری بات مانوں تو وہ توڑنا پڑے گی۔ نہیں ہم یمن جائیں گے اور وہیں سماعتِ حدیث کریں گے۔''

صنعاء تک کا سفر زادِ راہ نہ ہونے کے سبب سے انتہائی کٹھن تھا۔ جب پونجی بالکل ختم ہو گئی تو ساتھیوں نے مدد کی پیشکش کی، مگر خودداری اس درجے کی تھی کہ خدا کی ذات پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنے دست و بازو سے کام لیا اور مزدوری کر کے اپنے مصارفِ سفر کا بندوبست کیا۔ وہاں پہنچ کر امام عبدالرزاق نے آپ کی حالت دیکھ کر دیناروں سے بھری تھیلی دینا چاہی تو ادب سے عرض کیا کہ ''خدا کا شکر ہے، جس حال میں ہوں ٹھیک ہوں''۔ دو سال تک آپ نے سخت تنگی میں گزارا کیا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس تنگیٔ معاش کے باوجود سفر کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ پانچ بار بصرہ اور پانچ بار حجاز مقدس کا سفر کیا۔ اس حال میں کہ تین بار پیدل حج کیا اور ہر حج پر ۲۰ سے ۳۰ درہم سے زیادہ خرچ نہ کیا۔ سفر کی تھکن، زادِ راہ کی کمی، کچھ بھی آپ کے شوق کی راہ میں حائل نہ ہوا۔ کتابوں کا پلندہ پیٹھ پر لادے لمبی لمبی مسافتیں طے کرتے۔

امام صاحب تحصیلِ حدیث اور حفظِ حدیث کے علاوہ فقہ و استنباط کے فن سے بھی گہرا لگاؤ رکھتے تھے۔ امام شافعی سے فقہی مضامین کی تخریج اور استنباط کے علم کے حصول کے لئے خصوصی طور پر مصر آنے کا وعدہ کیا تھا۔ اسی طرح جریر بن عبدالحمید سے فائدہ اٹھانے کے لئے رے جانے کا ارادہ تھا۔ مگر سفر کی نوبت نہ آسکی۔ اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں ''میں بے حد متمنی تھا کہ کاش میرے پاس دس درہم بھی ہوتے تو میں رے جاتا۔ میں دیکھتا تھا کہ میرے ساتھی رے جارہے ہیں۔ لیکن بے زری کے سبب خود نہ جاسکا''۔ ابن ابی حاتم آپ کے امام شافعی کے پاس دوبارہ حاضر نہ ہونے کا سبب بھی شدید مالی مجبوری بتاتے ہیں۔

علم کے حصول کے لئے محنتِ شاقہ اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی خصوصی عنایت نے بہت جلد آپ کو اس مقام پر لاکھڑا کیا جس کی تمنا اہل علم ہمیشہ کرتے رہیں گے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق آپ کو لاکھوں احادیث حفظ تھیں۔ اس مقام تک پہنچنے کے لئے جو غیر معمولی محنت درکار ہوتی ہے وہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔ خود بیان کرتے ہیں کہ امام اعظم کے شاگرد یحییٰ بن قطان کی مجلسِ حدیث میں حاضر ہوتے تو ان کا رعب وجلال اس قدر ہوتا کہ خود بیٹھنے کی جرأت نہ کرتے اور عصر سے مغرب تک کھڑے ہو کر فنِ رجال کا علم حاصل کرتے۔

حلقۂ درس

امام صاحب درس وافتاء کی مسند پر اس وقت تک نہیں بیٹھے جب تک کہ حصولِ علم کے لئے موجود تمام ذرائع استعمال کرنے کے بعد آپ واقعی یہ سمجھنے نہ لگے کہ اب تدریس کے قابل ہو گئے ہیں۔

چالیس برس کی عمر سے قبل مجلسِ درس کا آغاز نہیں کیا۔ البتہ اگر انفرادی طور پر کوئی شخص مسئلہ پوچھتا تو جواب دے دیتے۔ جب آپ کی شہرت آسمان سے باتیں کرنے لگی اور لوگ مسائل دریافت کرنے کے لئے آپ پر ٹوٹ پڑے تو آپ نے ارادہ کیا کہ جواب دینے کے لئے مسجد میں بیٹھ جائیں۔ اس طرح آپ کے حلقۂ درس کی ابتداء ہوئی جس کی شہرت پوری مملکتِ اسلامیہ میں پھیل گئی۔ ایک روایت کے مطابق درس کے اس حلقے میں اندازاً پانچ ہزار لوگ شریک ہوتے تھے۔ ان میں پانچ سو تو باقاعدہ طالب علم تھے۔ جبکہ باقی وعظ ونصیحت اور کچھ صرف امام احمد کے اخلاق وکردار کا تذکرہ سن کر آپ کے دیدار کے لئے آتے تھے۔ درس کا وقت عصر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے مغرب تک ہوا کرتا تھا۔ آپ کی مجلس میں ایک خاص قسم کا وقار اور سنجیدگی چھائی رہتی۔ ہنسی مذاق کی باتوں سے امام صاحب بہت اجتناب کرتے۔ تاریخ ذہبی میں مروزی (امام صاحب کے ساتھی) ان مجالس کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں ''کسی مجلس میں، میں نے امام ابوعبداللہ کی مجلس سے زیادہ کسی کم مایہ اور فقیر شخص کو معزز اور ممتاز نہیں دیکھا۔ وہ دنیا والوں سے میل جول کم رکھتے تھے۔ حلیم اور بردبار تھے۔ عجلت پسندی کو پسند نہ کرتے تھے۔ کثیر تواضع تھے۔ سکینت اور وقار ان کی سرشت میں تھا۔ اپنی مجلس میں جب عصر کے بعد تشریف فرما ہوتے تھے تو اس وقت تک خاموش رہتے تھے جب تک ان سے سوال نہ کیا جاتا''۔

امام صاحب کے درسِ حدیث کی ایک خاص بات یہ ہے کہ آپ قوی الحافظہ ہونے کے باوجود حدیث کے معاملے میں یادداشت پر بھروسہ نہیں کرتے تھے۔ دورانِ طالب علمی تحریرِ حدیث کو لازمی خیال کرتے۔ آپ کو یہ اندیشہ لاحق رہتا کہ ممکن ہے حافظہ دھوکہ کھا جائے اور اس طرح کلماتِ حدیث میں تحریف کا گناہ ملے۔ حدیثیں آپ کو ازبر ہوتیں مگر سائل کے پوچھنے پر کتابیں ڈھونڈ کر وہ حدیث تلاش کرتے اور بیان کرتے۔ آپ کے صاحبزادے عبداللہ کی روایت کی مطابق ''میں نے اپنے والد کو بغیر کتاب کے صرف یادداشت کی بناء پر حدیث روایت کرتے نہیں دیکھا۔ سوائے کچھ احادیث کے جن کی تعداد سو سے کم ہوگی۔''

یہ سارا اہتمام شدتِ احتیاط کی وجہ سے تھا کہ نبی اکرم ﷺ کی زبان سے نکلا ہوا کوئی لفظ بھی آگے پیچھے نہ ہو جائے۔ جبکہ یہ بات یقینی ہے کہ قوتِ حفظ وثقاہت کے اعتبار سے آپ اپنے زمانے کے ممتاز ترین لوگوں میں سے تھے۔ آپ اپنے شاگردوں کو بھی خاص تلقین کیا کرتے تھے کہ بغیر کتاب دیکھے روایتِ حدیث نہ کیا کریں۔

فتنۂ خلقِ قرآن اور امام العزیمت کا بے مثال کردار

ہر دور میں کھرے اور کھوٹے کی پہچان کے لئے اللہ سبحانہ وتعالیٰ مختلف آزمائشیں بھیجتے رہے ہیں۔ امام صاحب کے دور کا فتنہ مسئلہ خلقِ قرآن تھا۔ اس مسئلے کے مطابق: کلام اللہ جو ہمارے پاس کتاب کی شکل میں موجود ہے اس میں الفاظ ہیں، الفاظ کے معنی اور آواز ہے جو مختلف حرکاتِ زبان واطرافِ زبان سے بنتی ہے اور نکلتی ہے۔ لہٰذا اللہ کا کلام جو کہ ظاہری شکل رکھتا ہے حادث اور مخلوق ہے۔

فتنۂ خلقِ قرآن عباسی دور میں پروان چڑھا جب عباسی خلیفہ ہارون الرشید کا بیٹا مامون الرشید خلیفہ بنا۔ وہ یونانی فلسفیوں کی کتابیں پڑھ کر مذہبِ اعتزال کی طرف مائل ہونے لگا۔ مذہبِ اعتزال میں عقلیت پسندی کو بنیادی اہمیت حاصل تھی۔ اس فرقے سے وابستہ لوگ جو معتزلی کہلاتے ہر مسئلہ پر اپنے موقف کے حق میں عقلی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دلائل کے ڈھیر لگا دیتے۔ چنانچہ مامون جب عقائد کی چھان پھٹک کے لئے مناظرہ کرواتا تو ان سے بہت متاثر ہوتا۔ یہاں تک کہ اونچے مناصب کے لئے وہ معتزلیوں کا انتخاب کرنے لگا۔ رفتہ رفتہ معتزلی عقائد کے مطابق وہ قرآن کو مخلوق ماننے لگا۔

معتزلی عقائد کا پرچار کرنے اور اسے تمام بلادِ اسلامیہ کا مسلک بنانے کی غرض سے مامون نے بغداد کے نائب حاکم کو خط لکھا جس میں اسے ہدایت کی کہ وہ قاضیوں کو طلب کر کے ان کے عقیدے کا امتحان لے۔ اگر وہ قرآن کو اللہ کی مخلوق تسلیم کریں تو درست ورنہ ان کی شہادت ترک کر دی جائے۔ اس پر عمل کیا گیا اور اس کی تفصیلی رپورٹ مامون کو روانہ کر دی گئی۔ اب مامون نے بغداد کے سات بڑے علماء کو طلب کیا اور قرآن کے مخلوق ہونے کے بارے میں ان کی رائے معلوم کی گئی۔ ان علماء نے حالات کی سنگینی کو پیش نظر رکھتے ہوئے سرکاری موقف کی تائید کی۔ اس واقعے کو خصوصی شہرت دی گئی تاکہ عوام کو قائل کیا جا سکے۔

پھر مامون کے حکم پر فقہاء، محدثین اور حکام کی ایک اور جماعت کو طلب کر کے ان کے عقیدے کا امتحان لیا گیا۔ ان سب کو مامون کے خط کے مندرجات پڑھ کر سنائے گئے جس میں عقیدہ خلقِ قرآن سے متعلق اظہار خیال کیا گیا تھا۔ امام احمد بن حنبل کو بھی طلب کیا گیا اور آپ کی رائے دریافت کی گئی۔ آپ نے کہا ''قرآن کلام الٰہی ہے۔'' اس پر والیٔ بغداد اسحٰق بن ابراہیم نے پوچھا ''کیا وہ مخلوق ہے؟'' آپ نے کہا ''وہ کلامِ الٰہی ہے اور میں اس سے زیادہ کچھ کہنے کو تیار نہیں ہوں۔'' گورنر کے بار بار اصرار پر آپ نے قرآن مجید کی آیت تلاوت کی ﴿لیس کمثلہ شیءٌ وھو السمیع البصیر﴾ " خدا کی طرح کوئی چیز نہیں ہے اور وہ سمیع اور بصیر ہے۔'' اس پر گورنر بولا: ''خدا کے قول سمیع اور بصیر کے کیا معنی ہیں''؟ آپ نے جواب دیا۔ ''اس نے اپنا وصف جیسا بیان کیا ہے وہ ویسا ہی ہے۔'' گورنر نے پوچھا۔ ''اس کے کیا معنی ہوئے؟'' امام صاحب نے دوبارہ جواب دیا ''میں نہیں جانتا، بس وہ ویسا ہی ہے جیسا اس نے اپنا وصف بیان کیا۔'' پھر باقی سب حضرات کو بلا کر ان سے رائے لی گئی تو سوائے چند ایک کے سب نے جواب دیا کہ ''قرآن کلام الٰہی ہے۔''

یہ تمام گفتگو اور علمائے دین کے خیالات قلمبند کر کے مامون کے پاس روانہ کر دیئے گئے اور ان حضرات کو روک لیا گیا تاکہ مامون کے اگلے حکم کا انتظار کیا جا سکے۔ چند روز کے بعد مامون کا سخت احکامات پر مشتمل خط موصول ہوا۔ اس میں امام احمد کے بارے میں یہ تحریر تھا ''اور ہاں احمد ابن حنبل کے بارے میں جو کچھ تم نے لکھا امیرالمومنین نے اسے پڑھا۔ احمد کو بتا دو کہ امیرالمومنین اس کے مفہوم ومنشاء سے پورے طور پر واقف ہیں۔ اس مسئلے پر وہ اس کے جاہلانہ عقیدے سے مطلع ہوئے۔ اس کا خمیازہ بہرحال اسے بھگتنا پڑے گا۔''

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اسی طرح جن محدثین وفقہاء نے اس باطل عقیدے کے خلاف سر جھکانے سے انکار کیا تھا ان کی کردارکشی کی گئی اور ہر ایک کا ذکر حقارت کے ساتھ کیا گیا۔ اب خط کا وہ حصہ سامنے آتا ہے جس کے بعد تعذیب اور ظلم وجور کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہونے والا تھا۔ مامون لکھتا ہے ''جن لوگوں کے نام تم نے اپنے مکتوب بنام امیرالمومنین میں تحریر کیے ہیں یا جن کے نام امیرالمومنین نے لکھے ہیں یا جن کا ذکر اس خط میں نہیں کیا گیا ہے تو اگر یہ اپنے شرک سے باز نہ آئیں اور قرآن کے مخلوق ہونے کا اقرار نہ کریں تو بشر بن الولید اور ابراہیم بن المہدی کے علاوہ سب کو زنجیروں میں جکڑ کر سرکاری محافظوں کے ساتھ امیرالمومنین کی خدمت میں روانہ کردو تاکہ ان کا امتحان لیا جائے اور اگر وہ اپنے عقیدے سے رجوع نہ کریں اور تائب نہ ہوں تو ان سب کی گردنیں تلوار سے اڑادو۔ ان شاء اللہ ولا قوۃ الا باللہ۔''

مامون کا یہ حکم سن کر امام احمد ابن حنبل، سجادہ، محمد بن نوح اور قواریری کے علاوہ دیگر سب علماء نے رخصت کا راستہ چنا اور قرآن کے مخلوق ہونے کا اقرار کرلیا۔ چنانچہ ان کو چھوڑ دیا گیا۔ حق گوئی کے جرم میں ان چاروں حضرات کو رسیوں سے جکڑ کر بیڑیاں پہنادی گئیں۔ اس سختی کی تاب نہ لاکر پہلے سجادہ اور پھر قواریری نے ہمت ہاردی اور رہائی پائی۔ اب دو بلند حوصلہ آدمی باقی رہ گئے۔ محمد بن نوح اور امام احمد بن حنبل سے پوچھا گیا ''کیا تم اس وقت مانو گے جب تلوار کے نیچے کھڑے کردیے جاؤ گے؟'' امام صاحب نے جواب دیا۔ ''نہیں۔'' جب آپ کے عزم میں کسی قسم کی کمی نہیں پائی گئی تو آپ کو محمد بن نوح کے ساتھ طرطوس روانہ کردیا گیا۔ ابھی چند ہی منزلیں طے کی تھیں کہ مامون کے انتقال کی خبر ملی۔ نئے احکامات صادر ہونے تک امام احمد اور ان کے جلیل القدر ساتھی کو جیل پہنچا دیا گیا۔

محمد بن نوح دورانِ سفر ہی بیمار رہنے لگے تھے۔ زمانہ قید میں ان کی بیماری بڑھ گئی۔ اب واپس بغداد طلبی ہوئی جہاں انہیں نئے خلیفہ معتصم باللہ کے سامنے پیش ہونا تھا۔ راستے میں محمد بن نوح راہِ حق میں جان نچھاور کر بیٹھے۔ اب راہِ عزیمت کے تنہا مسافر امام احمد بن حنبلؒ پاؤں میں چار چار بیڑیاں پہنے رات کے وقت معتصم کے محل کے زندان میں پہنچا دیے گئے۔ رات بھر اللہ کے حضور رکوع وسجود اور دعاوزاری کرتے رہے۔ اگلے روز معتصم کے دربار میں حاضری ہوئی۔ معتصم خود علم سے کورا تھا مگر اپنے بھائی مامون کی وصیت پر عمل کرتے ہوئے عقیدۂ خلقِ قرآن کو پوری مملکت سے بزور منوانا چاہتا تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ اپنے بھائی مامون کی خاص وصیت کے مطابق قاضی ابن ابی داؤد کو اس کے منصب پر برقرار رکھا تھا۔ یہ شخص معتزلی افکار کی تبلیغ میں پیش پیش تھا اور مامون کا سیکریٹری نامزد ہونے کے بعد سے وہ مامون کے معاملات پر چھا گیا تھا۔ بعض حضرات کی رائے میں وہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مکتوبات بھی جو مامون سے موسوم کئے جاتے ہیں دراصل ابن ابی داؤد نے لکھے تھے۔اسی نے مامون کے مرض الموت میں اس کے نام سے احکامات کا اجراء کیا۔اب یہی ابوداؤد معتصم کے دربار میں نہایت کروفر سے بیٹھا تھا۔ایک طرف اس عہد کے بہت بڑے شافعی فقیہ ابوعبدالرحمٰن الشافعی بھی کھڑے تھے۔دربار میں سناٹا تھا اور امام صاحب کی حاضری سے قبل دو آدمیوں کی گردنیں ماری جا چکی تھیں جن کے لاشے پڑے تھے۔

امام صاحب انتہائی سکون سے دربار میں داخل ہوئے۔اہل دربار پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی جو خون آلود لاشوں پر سے گزرتی ہوئی ابوعبدالرحمٰن شافعی پر مرتکز ہوگئی۔پھر آپ ابوعبدالرحمٰن کی طرف متوجہ ہوکر پوچھنے لگے۔ ''مسح کے بارے میں تمہیں امام شافعی کا کوئی قول یاد ہے؟'' دربار کی ہیبت،خلیفہ کی موجودگی،لاشوں سے بہتا ہوا خون،کچھ بھی امام صاحب کو دہشت زدہ نہ کر سکا۔ابن ابی داؤد حیرت سے چلا اٹھا۔''اس شخص کو دیکھو،اس کی گردن ماری جانے والی ہے،مگر یہ فقہ کے مسائل کی تحقیق کر رہا ہے۔''

پھر معتصم اور امام صاحب کے درمیان گفتگو ہوئی جس میں آپ نے خلیفہ کو زچ کر دیا۔یہاں تک کہ وہ کہنے لگا''احمد!میرے پیشرو نے اگر تمہیں گرفتار نہ کیا ہوتا تو میں تم سے کوئی تعرض نہ کرتا۔'' پھر مناظرہ شروع ہوا جو تین دن تک جاری رہا۔معتزلی علماء نے آپ کو ہر طرف سے گھیرنے کی بھرپور کوشش کی مگر آپ نے ان کے ہر نکتے کا جواب دلائل کی روشنی میں پیش کیا۔آپ بار بار اصرار کرتے کہ قرآن وسنت کی دلیل پیش کی جائے۔ اگلے دن امام صاحب کو جیل کی کوٹھری میں دوبارہ پہنچا دیا گیا۔خود فرماتے ہیں کہ حالات کے تیور دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ کل کچھ ہوکر رہے گا۔میں نے ڈوری منگوائی اور اس سے اپنی بیڑیوں کو کس لیا اور جس آزار بند میں بیڑیاں باندھ رکھی تھیں اس کو اپنے پاجامے میں پھر ڈال لیا کہ کوئی سخت وقت آ جائے تو برہنہ نہ ہو جاؤں۔اب امام صاحب اعلائے حق کی پاداش میں آنے والے وقت کی سختیوں کو سہنے کے لئے بالکل تیار تھے۔آگے کے واقعات کو ہم ابوالکلام آزاد کی زبان میں تحریر کرتے ہیں:

''رمضان المبارک کے عشرہ آخر میں جس کی اطاعت اللہ کو تمام دنوں کی طاعات سے زیادہ محبوب ہے آپ بھوکے پیاسے جلتی دھوپ میں بٹھائے گئے اور اس پیٹھ پر جو علوم و معارفِ نبوت کی حامل تھی کوڑے اس طرح مارے گئے کہ جلاد دو ضربیں پوری قوت سے لگا کر پیچھے ہٹ جاتا اور پھر تازہ دم جلاد اس کی جگہ لے لیتا۔اس کو بھی ہنسی خوشی برداشت کر لیا۔مگر اللہ کے عشق اور حق بات سے منہ نہ موڑا نہ ہی راہِ سنّت سے منحرف ہوئے۔ تازیانے کی ہر ضرب پر جو صدا زبان سے نکلتی تھی وہ نہ تو جزع فزع کی تھی اور نہ شور وفغاں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی بلکہ وہی تھی جس کے لئے یہ سب کچھ ہو رہا تھا: ''القرآن کلام اللّٰہ غیر مخلوق (قرآن اللہ کا کلام اور غیر مخلوق ہے'')۔ جلادوں کا مجمع چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھا۔ خود معتصم باللہ سر پر کھڑا تھا۔ وہ بار بار کہہ رہا تھا اے احمد! میں تم پر اپنے بیٹے ہارون سے بھی زیادہ شفقت رکھتا ہوں۔ اگر تم خلقِ قرآن کا اقرار کرلو تو خدا کی قسم ابھی اپنے ہاتھوں سے تمہاری بیڑیاں کھول دوں گا۔ لیکن اس پیکرِ حق اور مجسمۂ سنت کی زبانِ صدق سے صرف یہی جواب نکلتا تھا۔ اللہ کی کتاب میں سے کچھ دکھلا دو یا اس کے رسول کا کوئی قول پیش کردو تو میں اقرار کروں گا۔ اس کے سوا میں کچھ نہیں جانتا۔

معتصم عاجز آ کر قاضی ابن ابی داؤد اور علمائے بدعت و اعتزال سے کہتا ''اس سے مناظرہ کرو اور بحث کرو۔'' اور وہ حضرات کتاب و سنت کے میدان میں عاجز آ کر اپنے اوہام و ظنون کو باہم عقل و رائے سے پیش کرتے تو وہ اس کے جواب میں بول اٹھتے۔ ''نہیں، میں کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ سے اس کی دلیل چاہتا ہوں۔''

جب معتصم نے جلادوں کو کوڑے مارنے کا حکم دیا تو وہ علمائے اہل سنت بھی دربار میں موجود تھے جو مصائب کی تاب نہ لا سکے اور اقرار کر کے چھوٹ گئے۔ ان میں سے بعض نے کہا: ''خود تمہارے ساتھیوں میں سے کسی نے ایسی ہٹ کی ہے جیسی تم کر رہے ہو''؟ امام صاحب نے جواباً کہا: ''یہ تو کوئی دلیل نہیں ہوئی! لاؤ میرے پاس کوئی چیز کتاب و سنت سے۔'' عین حالتِ روزہ میں، کہ پانی کے صرف چند گھونٹ پی کر روزہ رکھ لیا تھا، تازہ دم جلادوں نے پوری قوت سے کوڑے مارے۔ یہاں تک کہ پیٹھ زخموں سے چور ہوگئی اور تمام جسم خون سے رنگین۔

انیس کوڑے لگ گئے تو معتصم امام صاحب کے پاس آیا اور کہنے لگا۔ ''احمد کیوں اپنی جان کے درپے ہو؟ بخدا مجھے تمہارا بہت خیال ہے۔ اپنی ہٹ چھوڑ دو۔'' مگر امام صاحب پر عجیب کیفیت طاری تھی۔ انسان نما درندے انہیں بھنجھوڑ رہے تھے۔ عجیف نامی ایک شخص انہیں اپنی تلوار سے کچوکے دیتا تھا اور کہتا تھا کہ کیا تم ان سب لوگوں پر غالب آنا چاہتے ہو۔ کوئی کہتا خلیفہ تمہارے سر پر کھڑا ہے اور تم سرکشی کر رہے ہو۔ کوئی چاپلوسی کرتے ہوئے معتصم سے کہتا ''امیر المومنین آپ روزے سے ہیں اور دھوپ میں کھڑے ہیں۔'' معتصم

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پھر کہتا ''احمد ضد چھوڑ دو۔'' مگر امام صاحب اس کو وہی جواب دیتے اور معتصم بپھر کر پھر کوڑے مارنے کا حکم دیتا اور مشق ستم پھر شروع ہو جاتی۔

اس واقعے کے ایک عینی شاہد کا بیان ہے کہ امام احمد روزے سے تھے، میں نے کہا بھی کہ آپ روزے سے ہیں، اپنی جان بچانے کے لئے رخصت کی راہ اختیار کر کے اس عقیدے کا اظہار کرنے کی گنجائش موجود ہے۔ لیکن انہوں نے میری اس بات پر ذرا دھیان نہ دیا۔ ایک مرتبہ پیاس کی شدت انتہاء کو پہنچ گئی تو پانی طلب فرمایا۔ چنانچہ جب پیالہ پیش کیا گیا تو آپ نے اس کو ہاتھ میں لیا۔ کچھ دیر اس کی طرف دیکھتے رہے اور پھر پیئے بغیر واپس کر دیا۔ اسی اثناء میں آپ کی حالت بگڑ گئی۔ آپ کے حواس جاتے رہے، اوندھے منہ گر کر آپ بے ہوش ہو گئے۔

خود کہتے ہیں کہ جب ہوش آیا تو میں نے دیکھا کہ میری بیڑیاں کھول دی گئی ہیں۔ چند آدمی پانی لائے اور کہا لو پانی پی لو۔ مگر میں نے انکار کر دیا کہ روزہ نہیں توڑ سکتا۔ وہاں سے مجھے اسحٰق بن ابراہیم کے قصر میں لے گئے۔ ظہر کی نماز کا وقت ہو گیا تھا۔ ابن سماعہ نے امامت کروائی اور میں نے نماز پڑھی۔ ابن سماعہ نے کہا: ''تم نے نماز پڑھی، حالانکہ خون تمہارے کپڑوں سے بہہ رہا ہے'' (یعنی دمِ جاری وکثیر کے بعد طہارت کہاں رہی؟) میں نے جواب دیا: ''میں نے وہی کیا جو عمرؓ نے کیا تھا۔ صبح کی نماز پڑھ رہے تھے کہ قاتل نے انہیں زخمی کیا اور اسی حالت میں انہوں نے نماز پوری کی''۔

آپ اپنی گرفتاری کے بعد کچھ روایات کے مطابق ڈیڑھ سال اور کچھ کے مطابق ۲۸ مہینے تک قید و بند کی اذیتیں سہتے رہے۔ جب ہر طرح کی اذیت اور زبردستی کے بعد معتزلی حضرات مایوس ہو گئے تو آپ کو رہا کر دیا گیا۔ آپ اپنے گھر اس حال میں پہنچے کہ مار پیٹ سے بدن چور تھا اور زخموں سے خون رس رہا تھا۔ جب اس قابل ہوئے کہ مسجد تک جا سکیں تو پھر مسجد میں مسند درس پر بیٹھ گئے۔ یہاں تک کہ معتصم کا انتقال ہو گیا۔

معتصم کی بدقسمتی اور بدبختی پر افسوس کہ وقت کے امام اور محدث کو اذیت دینے کا گناہ اس کے حصے میں آیا۔ وہی وقت جس میں وہ اپنے اس فعل شنیع کی بناء پر قعرِ مذلت میں جا پڑا اور تاریخ میں قیامت تک اس کا نام کالے حروف سے تحریر کیا جائے گا، امام صاحب کے لئے رفعِ درجات کا اور سعادت کا باعث بنا۔ حقیقت یہ ہے کہ نیکی اور بدی میں بس ایک قدم کا فاصلہ ہی ہے۔ انسان کا ایک قدم آگے کی طرف بڑھ جائے تو احسنِ تقویم کا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

درجہ اور ایک قدم پیچھے کی طرف اٹھ جائے تو اسفل سافلین میں شمار۔

معتصمؒ کے بعد واثق مسندِ خلافت پر بیٹھا تو اسے اندازہ ہوا کہ امام صاحب پر مزید سختی لوگوں میں آپ کی وقعت کو بڑھا دے گی۔ چنانچہ اس نے جسمانی ایذا تو نہ دی البتہ حکم جاری کیا کہ امام صاحب کو کسی سے ملنے جلنے کی اجازت نہ ہوگی۔ امام صاحب کی نظر بندی پر اس سختی سے عملدرآمد ہوا کہ آپ کو نماز کے لئے بھی گھر سے باہر جانے کی اجازت نہ تھی۔ درس کا سلسلہ منقطع ہوگیا جو واثق کی موت کے بعد دوبارہ شروع ہوسکا۔ چودہ سال کی اذیتوں اور مصائب کوسہنے کے بعد جب امام صاحب مسند درس پر دوبارہ بیٹھے تو عوام کے دلوں میں آپ کے تقوے اور خلوص، نیز راہِ حق میں عظیم قربانی دینے کی وجہ سے محبت اور گرویدگی میں کئی گنا اضافہ ہوگیا۔ آپ کے بیٹے اس ثابت قدمی کے ضمن میں تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''میرے والد ہمیشہ ایک شخص کے لئے دعا فرمایا کرتے تھے۔ خدا ابوالہیثم کی مغفرت کرے۔ میں نے کہا یہ ابوالہیثم کون ہے؟ کہا۔ جس دن سپاہی مجھ کو پکڑ کر لے جارہے تھے اور مجھے کوڑے مارتے جاتے تھے تو راستے میں یہ شخص ملا۔ اس نے کہا مجھے پہچانتے ہو؟ میں مشہور ڈاکو ابوالہیثم ہوں۔ میرا نام دفترِ شاہی میں درج ہے۔ صرف کوڑوں کی مار اگر گنواؤں تو سب ملا کر اٹھارہ ہزار کوڑے میری پیٹھ پر پڑے ہوں گے۔ لیکن میں بھی اپنی دھن کا پکا ہوں۔ ادھر چھوٹا ادھر پھر چوری کی۔ سنو، شیطان کی اطاعت میں میری استقامت کس قدر عجیب ہے۔ اس لئے مجھے تم پر افسوس ہوگا اگر اللہ کی راہ میں تم جیسا آدمی ثابت قدم نہ رہ سکے۔ اس کی یہ نصیحت میرے دل میں گھر کر گئی''۔

بلند پایہ محدث اور فقیہ

امام صاحب کی علمِ حدیث کے لئے محنت اور جستجو نے آپ کو رہتی دنیا تک کے لئے آسمانِ حدیث کا درخشاں ستارہ بنا دیا۔ احادیث کی جمع و ترتیب کا کام تو آپ نے ۱۸۰ ہجری میں اس وقت ہی شروع کر دیا تھا جب آپ کی عمر ابھی محض سولہ برس تھی۔ پھر زندگی کے شب و روز اس کام میں صرف کر دیئے۔ عمر کے آخری حصے میں وہ سب اوراقِ کثیر جمع کئے، انہیں جدا جدا اجزاء میں تقسیم کیا یہاں تک کہ وہ ایک مسودہ بن گیا۔ پھر اسے اپنے بیٹوں اور مخصوص لوگوں کو جمع کر کے املا کروادیا۔ ابھی اس کی ترتیب بھی مکمل نہ ہوئی تھی کہ پیغامِ اجل آ گیا اور آپ اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔ گو بظاہر آپ اپنے حوالے سے کسی چیز کو ترتیب دینے کے خلاف تھے۔ لیکن اپنے بیٹے کے دریافت کرنے پر خود فرماتے ہیں: ''یہ کتاب میں نے لوگوں کی رہنمائی کے لئے لکھی ہے۔ جب سنت رسول اللہ ﷺ کے سلسلے میں لوگوں کے درمیان کوئی اختلاف رونما ہوگا وہ اس کی طرف رجوع کریں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

گئے۔''

احادیث کے اس مجموعے کا نام جسے آپ نے ترتیب دیا ''المسند'' ہے۔ اس کتاب کو آپ کے صاحبزادے امام عبداللہ نے اپنے والد سے روایت کیا اور اس کا علم لوگوں میں پھیلایا۔ امام احمد چنے ہوئے ثقہ راویوں سے روایت کیا کرتے تھے۔ ایک بار اپنے بیٹے عبداللہ کو اپنے طرزِ روایت کی تفصیل بتاتے ہوئے فرمایا۔''اے بیٹے! حدیث کے بارے میں میرے اس طریقہ سے تم واقف ہو کہ میں حدیث کی مخالفت نہیں کرتا، اگر چہ ضعیف ہو لیکن یہ جب ہے کہ اس کے بارے میں کوئی حدیثِ صحیح موجود نہ ہو۔''

اس اصول کے تحت مسند میں جو احادیث ہیں ان میں قوی بھی ہیں اور غیر قوی بھی۔ البتہ آپ کو کسی ضعیف حدیث کے مقابل کوئی قوی حدیث مل جاتی تو ضعیف حدیث کو مسند سے خارج کر دیتے۔

امام صاحب کی علمِ حدیث پر کیسی نظر تھی، اس بات کا اندازہ ان روایات سے ہو جاتا ہے کہ آپ کے استاد امام شافعی بعض اوقات حدیث کی مشکلات میں آپ کی طرف رجوع کرتے اور فرماتے کہ تم حدیث کے معاملے میں مجھ سے زیادہ علم رکھتے ہو۔

امام صاحب کی شہرت ایک فقیہ کے بجائے ایک محدث کے طور پر زیادہ ہے۔ لیکن مختلف مسائل کے سلسلے میں آپ سے جو فتاویٰ منسوب ہیں ان کو سامنے رکھتے ہوئے یہ بات آسانی سے کہی جا سکتی ہے کہ آپ بہت بڑے فقیہ بھی تھے۔ البتہ آپ ابتداء میں اس بات کو سخت ناپسند کرتے تھے کہ جو فتاویٰ آپ سے منقول ہیں ان کی زبانی نقل کی جائے۔ آپ کو یہ اندیشہ بھی تھا کہ کہیں دوسری چیزیں زیرِ کتابت لا کر لوگ علمِ حدیث سے بے پرواہ نہ ہو جائیں۔

جب طرح طرح کے مسائل لے کر لوگ آپ پر ہجوم کرنے لگے تو آپ اپنے اجتہاد اور رائے سے فتویٰ دینے پر مجبور ہو گئے۔ ساتھ ہی ساتھ اس خیال پر جمے رہے کہ یہ فتویٰ ضرورت کی بنیاد پر دیا گیا ہے۔ اسے یہیں تک محدود رہنا چاہئے۔ لہٰذا یہ کسی طور پر مناسب نہیں کہ اس پر قیاس کی عمارت تعمیر کی جائے اور نہ ہی یہ مناسب ہے کہ اسے پھیلایا اور نشر کیا جائے۔ آپ کے شاگرد مستقلاً اس بات پر اصرار کرتے رہے۔ یہاں تک کہ بالآخر امام صاحب اس پر رضامند ہو گئے کہ آپ کے فتاویٰ قیدِ کتابت میں لے آئے جائیں اور انہیں لوگوں میں پھیلایا جائے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فقہ حنبلی کی خصوصیات

آپ کی فقہ دراصل حدیث و آثار پر ہی مشتمل ہے۔ آپ نے فقہ سے متعلق نہ کوئی کتاب لکھی اور نہ ہی اپنے شاگردوں سے املا کروائی۔ البتہ آپ کے شاگرد آپ سے تحریری فتویٰ لے کر اس پر آپ کے تصدیقی دستخط لے لیتے۔

فقہ حنبلی کی خصوصیات کا تذکرہ طویل ہے۔ البتہ اس کی خاص بات یہ ہے کہ امام صاحب کی پوری کوشش ہوتی کہ آپ کی رائے انوکھی اور نئی نہ ہو بلکہ کسی صحابی یا امام سے مطابقت رکھتی ہوتا کہ دین کے معاملے میں بدعت سے حتی المقدور دور رہا جائے۔ لہٰذا امام صاحب کے زیادہ تر فتوے احادیث و اخبار اور سلفِ صالح کے آثار پر مبنی تھے۔ اس سلسلے میں آپ کا علم بہت وسیع تھا۔ امام صاحب فرضی مسائل کے جواب دینا پسند نہ کرتے تھے (یعنی جو چیزیں وقوع پذیر ہی نہ ہوئی ہوں ان سے متعلق سوالات)۔

فقہ حنبلی کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ حرام اور حلال کے معاملے میں اس اصول کی سختی سے پابندی کی جاتی ہے کہ جن چیزوں کو اللہ نے حرام کیا ہے، یا آپ ﷺ سے کوئی بات ہم تک پہنچی ہے بس وہ حرام ہیں۔ باقی جن پر اللہ اور اس کے رسول نے خاموشی اختیار کی ہے وہ سب حلال کے دائرے میں آتے ہیں۔ اس روش نے فقہ حنبلی کو وسعت اور گنجائش والا مسلک بنا دیا ہے۔

فقہ حنبلی صرف چیزوں کے ظاہر پر ہی نظر نہیں کرتی بلکہ وہ کوئی حکم لگانے سے پہلے اس کے اسباب، مقاصد اور نتائج پر بھی نظر ڈالتی ہے۔ یہ ایسا وصف ہے جو دوسرے مسالک میں اتنا نمایاں نظر نہیں آتا۔ مختصراً یہ کہ اگرچہ حنبلی مذہب زیادہ تر احادیثِ رسول اور صحابہ و تابعین وغیرہ کے فتوؤں پر مشتمل ہے، لیکن اس میں گنجائش اور وسعت موجود ہے۔

حنبلی مذہب کے اثرات

حنبلی مذہب شروع شروع میں عراق میں خوب پھیلا۔ لیکن حنبلی علماء کی سختی اور شدت نے اس کی ترقی روک دی۔ چوتھی صدی ہجری میں حنبلی فقہ مصر پہنچی مگر حکمرانوں کا جھکاؤ شافعی مذہب کی طرف تھا لہٰذا وہاں بھی اسے پنپنے کا موقع نہ مل سکا۔ جب ایوبی حکمرانوں کا دور ختم ہوا تو وہاں اس کا فروغ شروع ہوا۔ دوسرے ممالک میں بھی اس کے پیرو موجود تھے مگر قلیل تعداد میں۔ یہاں تک کہ امام محمد بن عبدالوہاب کے ذریعے نجدی لوگوں میں اسے قبول عام حاصل ہوا اور آلِ سعود نے اس کو حجاز میں نافذ کر دیا۔ آج تک سعودی عرب کے حکمرانوں کا مسلکِ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حنبلی پر ہی عمل ہے۔

امام احمد بن حنبلؒ کا طرزِ زندگی

امام احمد ابن حنبلؒ ایک ایسے عالم تھے جنہیں علم کے حصول اور دین کی خدمت کے سواء کسی چیز کا ہوش نہ تھا۔ ایسے میں گذر اوقات کے لئے لازمی طور پر آمدنی کا مستقل ذریعہ درکار تھا۔ آپ کے والد نے جو تھوڑی بہت جائیداد چھوڑی تھی اس کے علاوہ ان کی کچھ دکانیں تھیں۔ ان سب کو آپ نے کرائے پر چڑھا رکھا تھا۔ اسی کی قلیل آمدنی سے گزر بسر ہوتی۔ نہ عطیے قبول کرنا پسند کرتے اور نہ ہی لوگوں کے احسان لیتے بلکہ محنت مزدوری کر کے اپنی ضرورت کو پورا کرتے اور اس سلسلے میں کسی کام کو عار نہ سمجھتے تھے۔ کبھی معاوضے پر لوگوں کے خط پڑھ کر جواب لکھ دیتے۔ کبھی کپڑا بن کر بازار میں فروخت کر دیتے۔ یہاں تک کہ بار برداری کا کام بھی، اگر کوئی دوسری مزدوری ممکن نہ ہوتی تو کر لیتے تھے۔ کبھی ضرورت مجبور کرتی تو جلیل القدر محدث اور عالم کھیتوں کی بچی کھچی چیزیں جن پر کسی کا دعویٰ نہ ہوتا، چن کر لے آتے۔ یہ بھی ممکن نہ ہوتا تو مجبوراً قرض لے لیتے اور پھر اس کو ضرور لوٹاتے، چاہے قرض دینے والا واپس لینے سے کتنا ہی انکار کرتا۔

آپ اس امر کا سختی سے لحاظ رکھتے کہ جو مال ہاتھ آ رہا ہے وہ ہر شبہے سے خالی ہو۔ آپ کی احتیاط پسندی کا یہ عالم تھا کہ ساری زندگی شدید ضرورت و حاجت کے باوجود وقت کے خلفاء سے مالی امداد قبول کرنے سے انکار کرتے رہے۔ فتنۂ خلقِ قرآن سے پہلے مامون نے ایک خطیر رقم شیوخِ حدیث کو بھجوائی۔ ان میں سے کوئی بھی ایسا نہ تھا جس نے حسب ضرورت روپیہ نہ لیا ہو، سوائے احمد بن حنبل کے۔ آپ نے اس طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔

اس ضمن میں ایک واقعہ بیہقی میں درج ہے۔ امام شافعی نے ایک مرتبہ ہارون رشید سے تذکرہ کیا کہ یمن میں قاضی کی ضرورت ہے۔ ہارون نے جواب دیا: ''آپ سے بہتر انتخاب اس کے لئے کون کر سکتا ہے''۔ امام شافعی نے کہا کہ اچھا میں اس کا بندوبست کرتا ہوں۔ انہوں نے اس کا تذکرہ امام احمد سے کیا اور فرمایا کہ میں آپ کے سوا اس کام کے لئے کسی کو پسند نہیں کرتا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب امام احمد ایک طالب الحدیث کی حیثیت میں امام شافعیؒ کے یہاں آتے جاتے تھے۔ امام احمد نے سختی سے انکار کیا۔ امام شافعی نے اصرار کے ساتھ یہ پیشکش دہرائی تو اس کے جواب میں امام صاحب نے امام شافعی سے جو آپ کے استاد اور شیخ تھے اور جن کا آپ بے حد احترام کرتے تھے کہا ''اے ابوعبداللہ! اگر اس پیشکش کی بات میں نے آپ سے پھر سنی تو آپ مجھے بھی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اپنے حضور حاضر ہوتے کبھی نہیں دیکھیں گے۔''

خلیفہ معتصم اور واثق کا زمانہ آپ کے لئے ذہنی وجسمانی ابتلاء کا تھا، جس میں آپ اس آزمائش پر پورے اترے، لیکن خلیفہ متوکل کا دور شروع ہوا تو وہ آپ کا عقیدت مند بن گیا۔ اب تحفوں اور مال ودولت کے ڈھیر کی صورت میں ایک نئی آزمائش سے دوچار ہونا پڑا۔ امام صاحب نے سرکاری مال کو قبول کرنے سے انکار کیا۔ آپ کو یہ بھی کہا گیا کہ یہ روپیہ لے لیں اور خود صدقہ کر دیں۔ آپ اس پر بھی تیار نہ ہوئے کہ بھلا یہ کام حکومت خود کیوں نہیں کرتی۔ پھر ایک وقت ایسا آیا کہ آپ کو یہ اطلاعات ملیں کہ آپ کے دشمن خلیفہ متوکل کے کان بھر رہے ہیں کہ آپ خلافت کے دشمن ہیں۔ چنانچہ ایک بار متوکل کے وزیر نے آپ سے کہا ''امیر المومنین نے آپ کی خدمت میں تحفہ کی رقم بھیجی ہے۔ وہ آپ کو اپنے دربار میں شرف باریابی بخشنا چاہتے ہیں۔ خدا کے لئے ایسا نہ کیجئے گا کہ نہ آئیں اور مال واپس کر دیں۔ اگر ایسا کیا تو وہ لوگ جو آپ سے بغض رکھتے ہیں سچے ثابت ہوں گے۔'' یہ خط ملنے کے بعد آپ نے مجبوراً اس مال کو اپنے بیٹے صالح کے حوالے کیا اور حکم دیا کہ اسے فوری طور پر ضرورتمندوں کے سپرد کر دیا جائے۔

آخر کار متوکل کو آپ کے خلوص اور بے لوثی کا یقین ہو گیا۔ اب اگر کوئی آپ کی شکایت کرنا بھی چاہتا تو وہ کہتا ''اگر معتصم پھر سے زندہ ہو کر آ جائے اور وہ امام احمد کی شکایت مجھ سے کرے تو میں نہ مانوں گا۔'' اس کے بعد اس نے آپ کو اجازت دے دی کہ چاہیں تو تحائف قبول کریں اور چاہیں تو لوٹا دیں۔

متوکل ہی کے دور میں اس کے حکم سے آپ کو شاہی لشکر میں مہمان کی حیثیت سے ٹھہرایا گیا۔ روزانہ پرتکلف کھانوں سے دسترخوان سجا رہتا۔ آپ مستقل روزے رکھتے اور اس ستو سے افطار کرتے جو چلتے وقت اپنے ساتھ رکھ لیا تھا۔ غذا کی کمی کے باعث آنکھوں کے نیچے حلقے پڑ گئے اور سانس کے مرض میں مبتلا ہو گئے۔ یہاں تک کہ آپ کو لشکر سے واپسی کی اجازت مل گئی۔

ایک بار آپ کے صاحبزادے نے سوال کیا کہ آپ خلیفہ کی طرف سے بھیجی ہوئی رقم کو استعمال کیوں نہیں کرتے؟ یہ سن کر آپ نے کہا: ''بیٹے میں خلفاء کے عطیات کو حرام نہیں سمجھتا۔ لیکن اسے قبول کرنا نزہت نفس کے خلاف سمجھتا ہوں''۔

امام صاحب کے دو صاحبزادوں کا خصوصی طور پر تذکرہ ملتا ہے۔ صالح اور عبداللہ۔ یہ دونوں اپنے والد کے ساتھ ساتھ رہتے۔ امام صاحب ان کی تربیت کا خاص خیال رکھتے۔ چنانچہ صالح کہتے ہیں ''جب کوئی زاہد اور صالح شخص میرے والد کے پاس آتا تھا تو وہ مجھے ضرور بلواتے تھے تاکہ میں اسے دیکھوں۔ انہیں اس کی بڑی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تمنا رہتی تھی کہ میں بھی ایسے نیک اور زاہد لوگوں کی طرح بن جاؤں اور وہ مجھے انہی کی طرح دیکھیں۔''

امام صاحب کے چھوٹے بیٹے عبداللہ بھی بچپن سے علومِ حدیث کی طرف راغب تھے۔ یہاں تک کہ خود آپ فرماتے ''میرے بیٹے عبداللہ کو خدا نے علمِ حدیث میں ایسا حصہ دیا ہے کہ جو بات مجھے یاد نہیں ہوتی وہ یاد دلا دیتا ہے۔''

جب آپ کی اولاد نے خلفاء کے عطیات قبول کرنا شروع کئے تو آپ نے انہیں باز رکھنے کی کوشش کی۔ جب وہ باز نہ آئے تو فرمایا ''تم یہ مال کیوں لیتے ہو، جبکہ سرحدیں معطل اور غیر آباد ہیں اور فئے مستحق لوگوں میں تقسیم نہیں ہو پاتی۔''

اس کے بعد آپ نے ان کے گھروں سے کھانا پینا چھوڑ دیا کیونکہ اس مال کو آپ مشتبہ سمجھتے تھے۔ آپ کے بیٹے صالح ایک کثیر العیال شخص تھے۔ پھر ان کا ہاتھ بھی کھلا تھا۔ ان وجوہات کی بناء پر جب وہ طرطوس کے منصبِ قضاء کو قبول کرنے پر تیار ہوئے تو رونے لگے۔ پھر کہا: ''خدا بہتر جانتا ہے کہ میں یہ منصب ہرگز قبول نہ کرتا۔ لیکن قرض اور کثرتِ عیال نے مجھے مجبور کر دیا۔ بہر حال خدا کا شکر ہے۔''

کسی کا ذرہ برابر احسان لینا امام صاحب کو گوارا نہ ہوتا۔ آپ کے صاحبزادے صالح فرماتے ہیں کہ ''میرے والد ماجد وضو کا پانی بھی کسی سے نہ منگواتے تھے۔ بلکہ اپنے ہاتھ سے کنوئیں میں ڈول ڈالتے اور پانی نکالتے''۔

ذاتی معاملات میں بھی آپ بڑی بڑی چوٹوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کر لیتے۔ ایک مرتبہ آپ نے امام ابوحنیفہ کی رائے سے اختلاف کیا۔ اس پر ایک متعصب شخص نے غضبناک ہو کر کہا ''تم جیسے بے مایہ لوگوں سے ابوحنیفہ کا پیشاب بہتر ہے۔'' پھر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد نادم ہو کر حاضر ہوا اور معذرت کے لہجے میں بولا۔ ''جو الفاظ آپ کی شان کے خلاف میرے منہ سے نکلے تھے وہ غیر ارادی تھے۔ آپ مجھے معاف کر دیجئے۔'' آپ بولے ''میں نے تو بھائی تمہیں اسی وقت معاف کر دیا تھا۔''

آپ کی پوری زندگی سنت پر عمل کی بہترین مثال تھی۔ اس ضمن میں آپ کے اس قول کو کہ ''میں نے رسول اللہ ﷺ کی کوئی حدیث نہیں لکھی جس پر خود بھی عمل کرنے کی کوشش نہ کی ہو۔'' اس تناظر میں دیکھنا چاہئے کہ ہزاروں حدیثوں کو آپ نے اپنے قلم سے تحریر کیا تھا۔

ان تمام خصوصیات کے ساتھ ایک نمایاں وصف شخصی وجاہت اور وقار تھا۔ لوگ آپ کی محفل میں مرعوب اور باادب بیٹھا کرتے اور آپ کی بات کو رد کرنے اور حجت کرنے سے کتراتے تھے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اخلاقِ عالیہ اور علمِ کثیر کے باجود کسر نفسی کا یہ عالم تھا کہ فرماتے ''میں چاہتا ہوں مکہ جا کر وہاں کی گھاٹیوں میں سے کسی گھاٹی میں چھپ کر بیٹھ رہوں تا کہ میرا کسی کو پتہ نہ چلے۔'' کبھی فرماتے ''وہ شخص کتنا اچھا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے شہرت نہیں دی۔'' طبیعت میں موجود انکساری کی گواہی آپ کے ساتھی امام یحیٰی بن معین دیتے ہوئے کہتے ہیں ''میں نے احمد بن حنبل جیسا کوئی شخص نہیں دیکھا۔ پچاس سال تک میں ان کا ہم مجلس رہا۔ اس طویل مدت میں اپنے زہد اور صالحیت کے برتے پر ہم میں سے کسی پر بھی انہوں نے فخر اور گھمنڈ کا اظہار نہیں کیا۔''

امام صاحب نے یہ خصوصیات کس طرح اپنے اندر پیدا کیں؟ اس کا جواب آپ کے اس قول میں پوشیدہ ہے کہ کسی سائل نے سوال کیا ''قوت کیا ہے؟'' فرمایا ''اس چیز کا ترک جو تمہارا منتہائے آرزو ہو۔'' یعنی خواہشاتِ نفس پر مکمل اقتدار اور پورا قابو۔ اسی میں امام صاحب کی عزیمت بھری زندگی کا راز پوشیدہ ہے۔ اسی لئے آپ کے ساتھی یحیٰی ایک موقع پر گواہی دیتے ہوئے کہتے ہیں ''خدا کی قسم! احمد کی سی طاقت ہم میں کہاں، اس طریقے پر ہم نہیں چل سکتے۔''

وفات

۲۴۱ ہجری میں ۷۷ برس کی عمر میں بیماری کا آغاز ہوا۔ بیماری کے دوران عیادت کرنے والوں کا ہجوم لگا رہتا۔ خلیفہ کو خبر ہوئی تو دروازے پر پہرہ لگا دیا اور خبر دینے والے مقرر کر دیئے تا کہ آپ کی صحت سے متعلق امور پر مطلع رہ سکے۔ جمعہ کے دن ۱۲ ربیع الاول کو نو روز بیمار رہنے کے بعد انتقال فرمایا۔

سارا بغداد جنازے میں شرکت کے لئے ٹوٹ پڑا۔ آپ کو ایسے کپڑوں میں دفنایا گیا جنہیں نابالغ بچیوں نے بنا تھا۔ غسل دینے کی ہر چیز خریدی گئی۔ حتیٰ کہ پانی بھی خریدا گیا اور صاحبزادوں کے گھروں کا پانی استعمال نہیں کیا گیا۔ بغداد کے گورنر نے جو کفن بھجوایا اسے بشکریہ واپس کر دیا گیا۔ غرض جو احتیاط امام صاحب اپنی زندگی میں برتتے تھے اسے موت کے بعد بھی مدنظر رکھا گیا۔

آپ کا جنازہ اٹھا تو مردوں، عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کے ہجوم کا یہ حال تھا کہ دوپہر سے قبل جنازہ قبرستان کے لئے روانہ ہوا اور عصر کے بعد سپردِ زمین ہو سکا۔ روایات کے مطابق چھ سے سات لاکھ تک مجمع امام صاحب کو دفنانے نکلا تھا۔

کہتے ہیں کہ بغداد کی تاریخ میں اتنا بڑا جنازہ کسی کا نہ نکلا۔ مختار مسعود اپنی کتاب ''آوازِ دوست'' میں آپ کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

''بعض لوگوں کی قسمت میں ایسی زندگی لکھی جاتی ہے کہ وہ جیتے جی شہیدِ ناز ہو جاتے ہیں۔ اس قبیلے کے لوگ زندہ شہید کا درجہ رکھتے ہیں اوران کے امام کا نام احمد بن حنبل ہے۔ مامون کے عہد میں آپ کی مشکیں کَسی گئیں، معتصم کے عہد میں انہیں کوڑے مار کر بے ہوش کیا جاتا اور تلوار کی نوک چبھو کر ہوش میں لایا جاتا۔ واثق کا عہد آیا تو انہیں قید تنہائی کی سزا ملی۔ پیرانہ سالی آئی تو ابتلاء کی جگہ اس احترام نے لے لی جو ہزار برس گذر جانے کے باوجود لوگوں کے دلوں میں تازہ ہے۔ قیامت آئے گی تو کیا عجب کہ جہاں پیشانی سجدے کے نشان سے منور ہوگی وہاں پشت دُرّوں کے نشان سے روشن تر ہو جائے۔ وہ پشت جسے حاکم دُرّے لگانے کے لئے استعمال کرتے ہیں اس پر لوگ خوشی سے کئی نسلوں اور کئی صدیوں کا بوجھ اٹھا لیتے ہیں۔ دراصل جرأت ایک کیفیت ہے اور قربانی اس کیفیت پر گواہی ہے۔ جرأت ایک طرزِ اختیار کا نام ہے اور قربانی ایک طریقِ ترک کو کہتے ہیں۔ اس ترک واختیار میں بسر ہو جائے تو زندگی جہاد اور موت شہادت کا نام پاتی ہے۔''

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

امام بخاریؒ

قرآن مجید کے بعد معتبر ترین کتاب صحیح بخاری کے مصنف
اور حدیث کے عظیم ترین عالم اور حافظ

تعارف

آپ کا نام محمد، کنیت ابوعبداللہ اور لقب امام المحدثین تھا۔ آپ کا سلسلہ نسب یہ ہے:

محمد بن اسمٰعیل بن ابراہیم بن المغیرہ بن بردزبہ۔

آپ فارسی النسل تھے اور آپ کے آباؤ اجداد آگ کی پوجا کرتے تھے۔ مغیرہ جو آپ کے پردادا تھے، انہوں نے حاکمِ بخارا کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا اور بخارا (موجودہ ازبکستان) میں آ کر سکونت اختیار کی۔ آپ کے والد اسمٰعیل بڑے پائے کے محدث تھے۔ وہ امام مالک اور عبداللہ بن مبارک جیسی شخصیات کی صحبت اور تربیت میں رہے۔

ولادت

809 194

محمد بن اسمٰعیل جمعہ ۱۳ شوال ۱۹۴ ہجری بمطابق ۸۰۹ء کو بخارا شہر میں پیدا ہوئے۔

بچپن کے حالات

آپ کے بچپن کے حالات تفصیلی طور پر معلوم نہیں ہو سکے۔ البتہ اتنا پتہ چلتا ہے کہ آپ کو والدین کی طرف سے بہترین ماحول ملا۔ آپ کے والد علمی قابلیت کے ساتھ ساتھ انتہائی پاکیزہ نفس تھے۔ پیشے کے لحاظ سے باغبان تھے۔ آپ کی والدہ بھی بڑی عبادت گذار خاتون تھیں۔ ابھی آپ چھوٹے ہی تھے کہ والد کا انتقال ہوگیا۔ اپنی وفات کے وقت انہوں نے یقین سے فرمایا ''میں اپنے حاصل کردہ مال میں ایک درہم بھی مشتبہ نہیں پاتا۔''

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

والد کے انتقال کے بعد ایک اور آزمائش آئی۔ قدرت کی طرف سے بصارت سلب ہوگئی اور بینائی جاتی رہی۔ علاج معالجے کے باوجود کوئی فائدہ نہ ہوا۔ آپ کی والدہ نے اللہ کے آگے بہت گریہ وزاری کی۔ وہ اپنے بیٹے کی بینائی کے لئے اللہ سے رو رو کر دعائیں کرتی تھیں کہ ایک رات خواب میں ابراہیمؑ کو دیکھا۔ وہ فرما رہے تھے کہ تمہارے رونے اور دعا کرنے سے تمہارے بیٹے کی آنکھیں خدا نے درست کر دیں۔ وہ کہتی ہیں کہ ''جس شب کو میں نے خواب دیکھا، اس کی صبح کو میرے بیٹے (محمد) کی آنکھیں درست ہوگئیں۔'' والدہ نے اللہ کا شکر اس طرح ادا کیا کہ بیٹے کو دین کے علم کے حصول پر لگا دیا۔

تعلیم اور علمِ حدیث کا شوق

محمد بچپن ہی سے بہت ذہین تھے۔ دس برس سے کم عمر میں قرآن مجید کا حفظ مکمل کیا۔ پھر احادیث کے حفظ کا شوق پیدا ہوا۔ خود فرماتے ہیں ''خدا نے مجھے اس وقت حفظِ حدیث کا شوق دیا جبکہ میں مکتب ہی میں تھا۔''

گیارہ برس کی عمر میں آپ اتنا علم حاصل کر چکے تھے کہ ایک روز آپ نے اپنے زمانے کے بہت بڑے عالم علامہ داخلی کی ایک غلطی کی طرف ان کی توجہ مبذول کروائی۔ ہوا یوں کہ ایک روز علامہ داخلی نے ایک حدیث کی اسناد بتاتے ہوئے کہا ''سفیان نے سنا ابوزبیر سے اور ابوزبیر نے سنا ابراہیم سے۔'' ابھی علامہ داخلی نے اتنا ہی کہا تھا کہ کم عمر محمد نے اٹھ کر کہا ''استاذ ابراہیم سے ابوزبیر نے نہیں سنا۔'' علامہ نے جب یہ دیکھا کہ گیارہ برس کا لڑکا ان کی غلطی نکال رہا ہے تو انہوں نے اسے چنداں اہمیت نہ دی اور ڈانٹ دیا۔ امام بخاری نے بڑے ادب سے ان سے پھر کہا: ''استاذ! آپ اپنی اصل کتاب میں دیکھ لیجئے۔'' اب علامہ داخلی اٹھ کر اندر تشریف لے گئے۔ اپنی اصل کتاب دیکھ کر واپس آئے اور آپ کو مخاطب کر کے کہا ''لڑکے تم بتاؤ صحیح کیا ہے؟'' آپ نے جواباً کہا۔ ''سفیان نے زبیر سے (ابوزبیر سے نہیں) اور زبیر نے سنا ابراہیم سے۔'' اس کے ساتھ آپ نے یہ بھی بتایا کہ یہ زبیر بیٹے تھے عدی کے۔ یہ جواب سن کر علامہ داخلی نے قلم لیا اور اپنی کتاب میں غلطی کو درست کیا۔

علمِ حدیث کا شوق آپ کو اپنے وقت کے بڑے بڑے محدثین اور علماء کے پاس لے گیا۔ محمد بن سلام، عبداللہ بن مسندی اور ابراہیم بن الاشعث جیسے اصحاب آپ کے اساتذہ میں شامل ہیں۔ آپ کی معلومات کی وسعت سے خود آپ کے اساتذہ بھی مرعوب تھے۔ اسی مرعوبیت کا ایک واقعہ علامہ سلیم بن مجاہد بیان کرتے ہیں کہ ایک روز میں محدثِ وقت محمد بن سلام بیکندی کی خدمت میں حاضر ہوا تو وہ مجھ سے فرمانے لگے۔ اس سے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پہلے تم آتے تو ایک لڑکا ایسا دیکھتے جس کو ستر ہزار حدیثیں یاد ہیں۔ یہ سن کر مجھے حیرت ہوئی اور میں اسی وقت اس کی تلاش میں نکلا۔ اتفاقاً میری اس سے ملاقات بھی ہوگئی۔ میں نے کہا لڑکے تمہارا ہی دعویٰ ہے کہ مجھے ستر ہزار حدیثیں یاد ہیں۔ وہ کہنے لگا: ''ہاں بلاشبہ مجھے اس قدر احادیث یاد ہیں، بلکہ اس سے بھی زائد، اور احادیث کی یاد کے علاوہ آپ جس حدیث کی نسبت سوال کریں گے خواہ مرفوع ہو یا موقوف ان میں اکثر راویوں کی وفات، جائے سکونت اور دیگر حالات کا پتہ بھی دے سکتا ہوں''۔

اسی بناء پر آپ کے استاد بیکندی فرمایا کرتے تھے کہ ''جب محمد بن اسمٰعیل میرے حلقۂ درس میں آتے ہیں تو میں متحیر ہو جاتا ہوں اور حدیث بیان کرنے میں مجھے خوف ہوتا ہے کہ مبادا ان کے سامنے غلطی نہ کر جاؤں''۔

آپ کے علم کی یہ وسعت اس وقت تھی جب ابھی آپ کی عمر سولہ برس تھی۔

تحصیلِ علم کے لئے سفر

حصولِ علم کے لئے سفر کرنا علماء اور ائمہ امت کی روایت رہی ہے۔ اس راہ میں فاقے کاٹنا اور سفر کی صعوبتوں کو برداشت کرنا ابتداء ہی سے مسلمان اہلِ علم کا شیوہ رہا ہے۔ محمد بن اسمٰعیل نے بھی ۲۱۰ ہجری میں حصولِ علم کے لئے وطن سے باہر جانے کا ارادہ باندھا۔ آپ فرماتے ہیں: ''جب میں عبداللہ بن مبارک اور وکیع کی تصنیفات کو ازبر کر چکا اور اہلِ رائے کے کلام کو سمجھ چکا تو میں نے حجاز کا سفر کیا۔ میری عمر اس وقت سولہ برس تھی''۔ پہلے آپ نے اپنی والدہ اور بھائی کے ساتھ حج ادا کیا۔ حج کے بعد آپ کی والدہ اور بھائی تو واپس چلے آئے لیکن آپ وہیں اقامت گزین ہوگئے۔ مکہ میں سب دینی درسگاہوں میں حاضری دی اور فائدہ اٹھایا۔ اٹھارہ برس کی عمر کو پہنچنے سے پہلے ہی آپ ایک کتاب کے مصنف بن چکے تھے۔ یہ کتاب ''صحابہ اور تابعین کے فیصلے'' آپ نے صحابہ کے فضائل اور ان کے فتاویٰ کے بارے میں تالیف فرمائی۔

پھر مدینہ منورہ تشریف لے گئے اور حضور اکرم ﷺ کے روضہ مطہرہ کے پاس بیٹھ کر تاریخ کبیر کا مسودہ تحریر کیا۔ آپ راتوں کو چاندی کی روشنی میں بیٹھ کر اسے لکھا کرتے تھے۔

علمِ حدیث کے حصول کے لئے آپ کے سفر جاری رہے۔ خود فرماتے ہیں کہ ''میں نے تحصیلِ حدیث کے لئے مصر و شام کا دو بار سفر کیا۔ چار دفعہ بصرہ اور چھ دفعہ حجاز گیا۔ محدثین کے ساتھ کوفہ و بغداد تو اتنی مرتبہ گیا کہ اب صحیح تعداد بھی مجھے یاد نہیں رہی۔'' اس کے علاوہ خراسان، مرو، بلخ، ہراۃ اور رے تک کا سفر کیا۔ گویا تمام مملکتِ اسلامیہ کے طول و عرض میں اساتذہ سے حدیث حاصل کرنے پہنچے۔ آپ کو ایک بار کہتے سنا گیا: ''میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

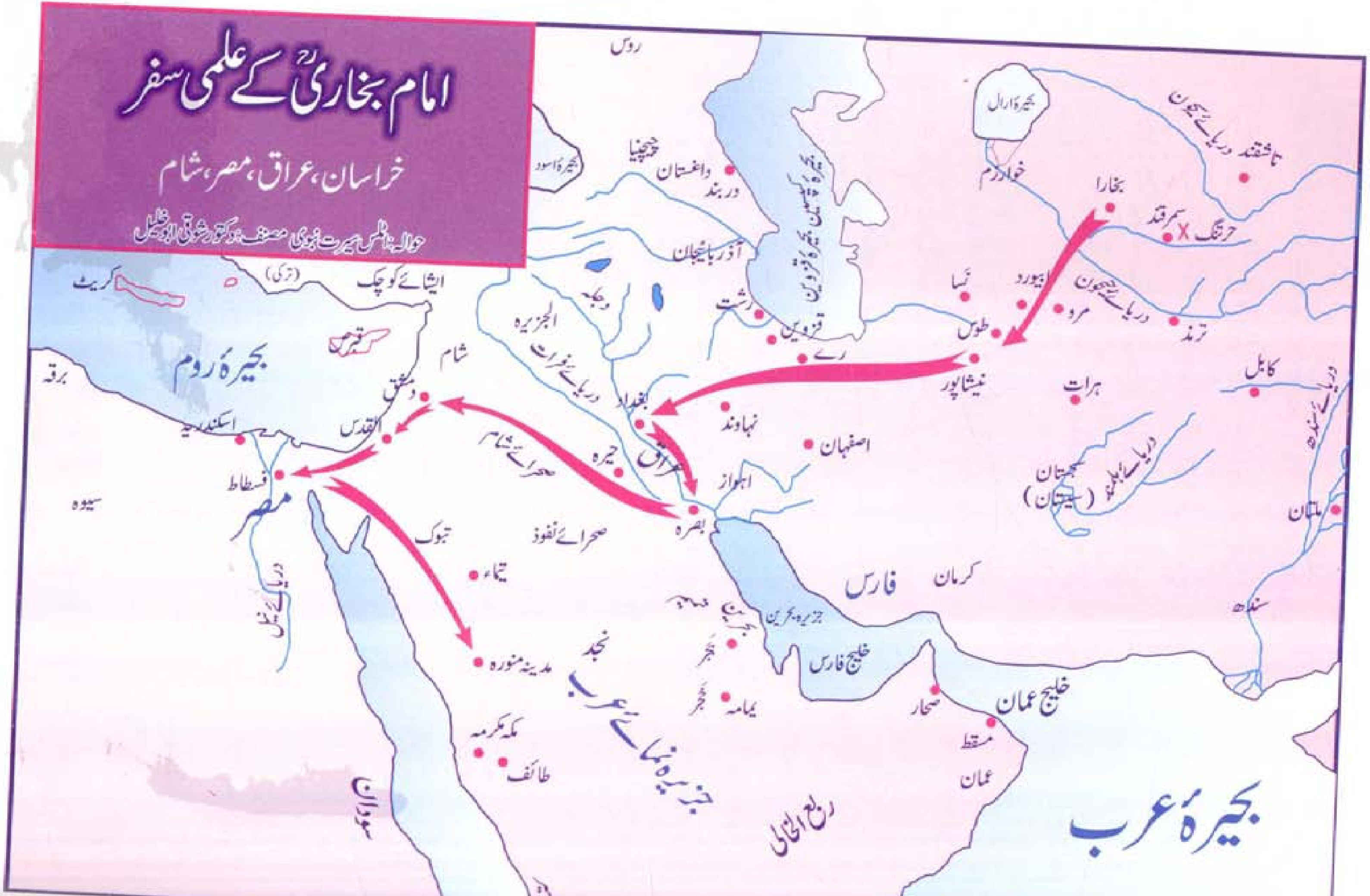

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اصحاب کی بیان کردہ احادیث کو پہلے ان کے بیان کردہ طریقے پر اور پھر درست طریقے سے پڑھ کر سنا دیا۔ اس میں تعجب انگیز بات یہ تھی کہ خود آپ نے ان احادیث کو غلط متن کے ساتھ ایک ہی بار سنا تھا۔ لیکن جس ترتیب سے سنا تھا اسی ترتیب سے اس کو پڑھ کر دہرا دیا۔ اس واقعہ نے اہلِ بغداد کو حیرت زدہ کر دیا۔

اسی طرح کا ایک واقعہ سمرقند میں بھی پیش آیا جہاں محدثین نے امتحان لینے کی غرض سے اہلِ شام، عراق، حجاز اور یمن کی اسناد کو آپس میں خلط ملط کر کے آپ کے سامنے رکھا۔ لیکن آپ کہیں پر بھی متن اور سند میں نہیں چوکے۔ یہاں تک کہ وہ آپ کے قائل ہو گئے۔

آپ کے بارے میں مشہور تھا کہ آپ جس کتاب کو ایک نظر دیکھ لیتے وہ آپ کو یاد ہو جاتی۔ حفظ حدیث کے علاوہ آپ نے علوم الحدیث میں بھی کمال حاصل کیا۔ علّتِ حدیث معلوم کرنا نہایت مشکل اور دقیق فن ہے۔ یہ ہر محدث کے بس کی بات نہیں۔ اس کے لئے حفظ، فہم اور فنِ حدیث کی وسیع معلومات بہت ضروری ہیں۔ علّتِ حدیث ان وجوہات اور اسباب کو کہتے ہیں جو چھپے ہوئے ہوتے ہیں، لیکن وہ حدیث کی صحت اور قبولیت میں حارج ہوتے ہیں۔ اس علم کے لئے راویوں کی پیدائش، وفات، تاریخی واقعات، سلسلۂ شاگردی و استاذی، راویوں کی سکونت، ان کی اپنے اساتذہ سے ملاقات کا زمانہ، نیز ایک حدیث کا مختلف اسناد سے معلوم ہونا، ہر ہر راوی کے الفاظِ حدیث اور علمِ حدیث کے مجموعے کا مکمل احاطہ بہت ضروری ہے۔

امام بخاریؒ اس فن کے اس قدر ماہر تھے کہ خود امام مسلم جو ان کے شاگرد بھی تھے انتہائی لجاجت کے ساتھ احادیث کی علتیں معلوم کرنے کے لئے درخواست کیا کرتے تھے۔ امام ترمذی جنہوں نے اپنی کتاب ''جامع ترمذی'' میں احادیث کی صحت پر سیر حاصل بحث کی ہے، فرماتے ہیں:

> ''جامع ترمذی میں جس قدر میں نے احادیث کی علتیں بیان کی ہیں یا رجال یا تاریخ میں کلام کیا ہے، اکثر حصہ اس کا امام بخاری کی تاریخ سے لکھا ہے اور زیادہ تر علل میں نے خود اپنے استاد امام بخاری سے بالمشافہ سیکھے ہیں۔''

تاریخِ تدوینِ حدیث اور فتنۂ وضعِ حدیث

امام بخاریؒ کے لازوال کارنامے صحیح بخاری کو بیان کرنے سے پیشتر مختصراً تدوینِ حدیث کی تاریخ بیان کرنا مناسب ہوگا۔

ہم جانتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ نبی اکرم ﷺ سے سچا عشق رکھتے تھے۔ آپ کے ہر حکم کی تعمیل کرتے اور ایک

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایک ادا پر جان دیتے تھے۔ آپ ﷺ کے عہدِ مبارک میں ابتداء میں چند صحابہؓ نے آپ ﷺ کے اقوال لکھنے کا اہتمام کیا تو آپ ﷺ نے منع فرما دیا۔ اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ حضور کو ڈر تھا کہ کہیں قرآن اور حدیث کے الفاظ آپس میں خلط ملط نہ ہو جائیں۔ چنانچہ صحیح مسلم میں آپ ﷺ کے یہ الفاظ ملتے ہیں۔ ''جس نے قرآن کے سوا میری کوئی بات لکھی ہے چاہئے کہ اس کو مٹا دے۔''

نبوی دور میں تدوینِ حدیث کی ابتداء

بعد میں جب صحابہ کرامؓ کی تربیت ہوگئی اور قرآن اور حدیث کے باہم مل جانے کا خدشہ جاتا رہا تو آپ ﷺ نے نہ صرف حدیث لکھنے کی اجازت دی بلکہ اس کو پسند فرمایا اور اس سلسلے میں لوگوں کی حوصلہ افزائی فرماتے ہوئے یہ کلماتِ خیر کہے:

''اللہ اس بندے کو شگفتہ و شاداب رکھے جس نے میری بات سنی اور محفوظ رکھا۔ پھر اس نے اسے اس شخص تک پہنچا دیا جس نے اسے نہیں سنا تھا۔'' (ابن ماجہ)

اس کے ساتھ ہی آپ ﷺ نے حدیث کی روایت کے معاملے میں سخت احتیاط سے کام لینے کا حکم بھی دیا۔ فرمایا ''جس نے مجھ سے منسوب کر کے کوئی جھوٹی بات کہی اس نے اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لیا۔'' آپ ﷺ نے یہ ہدایت اور تاکید بھی کی کہ ''وہ شخص جس سے کسی علم کے متعلق پوچھا جائے اور وہ اسے چھپائے تو قیامت کے دن اسے آگ کی لگام پہنائی جائے گی۔''

ان سب فرمودات کی روشنی میں صحابہ کرامؓ روایتِ حدیث کے معاملے میں بے حد محتاط ہو گئے تھے۔ البتہ اگر ان سے کوئی مسئلہ پوچھا جاتا اور وہ آپ ﷺ کے اس سے متعلق کسی حکم سے آگاہ ہوتے تو ضرور بتا دیتے۔ تاہم احادیث کو لکھنے کا رواج زیادہ نہ تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ ﷺ خود موجود تھے اور صحابہؓ کو جو معاملہ درپیش آتا وہ آپ ﷺ کے سامنے پیش کر دیتے۔ پھر عربوں کا حافظہ غیر معمولی تھا اور یاد رکھنے کے لئے کوئی چیز لکھنے کو وہ اپنے حافظے کی توہین سمجھتے تھے۔ ان کو اپنے گھوڑوں تک کے سلسلہ نسب یاد ہوتے تھے۔ اکثر اہلِ عرب لکھنے پڑھنے سے ناواقف تھے۔ اس کے باوجود عہد رسالت ﷺ میں بھی ایسے واقعات کا پتہ چلتا ہے جب احادیث کو باقاعدہ ضبطِ تحریر میں لایا گیا۔

ترمذی میں ایک روایت ہے جو غالباً کتابتِ حدیث کے آغاز کا واقعہ ہے کہ ایک دن ایک صحابی آئے (ان کا نام بیان نہیں کیا گیا) اور آپ ﷺ سے عرض کیا کہ ''آپ کی بیان کردہ باتیں بے حد اہم ہیں، مگر میرا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حافظہ کمزور ہے اور میں انہیں بھول جاتا ہوں۔ کیا کروں؟" آپ ﷺ نے جواب میں یہ الفاظ فرمائے۔ "اپنے سیدھے ہاتھ سے مدد لو۔" یعنی لکھ لیا کرو۔ بعد میں حضرت عبداللہؓ بن عمرو بن عاص نے جو کہ ذہین وفطین ہونے کے ساتھ ساتھ علم کے حصول کا شوق بھی رکھتے تھے اور اس وقت سترہ سال کے نوجوان تھے، اس اجازت کا فائدہ اٹھا کر لکھنا شروع کیا اور آپ ﷺ کی ہر بات کو ضابطۂ تحریر میں لانے لگے۔ اس پر لوگوں نے انہیں روکا اور کہا کہ تم رسول اللہ ﷺ سے جو بات سنتے ہو لکھ لیتے ہو، آنحضرت ﷺ بھی تو بشر ہیں اور بشر ہونے کے ناطے سے وہ بھی کبھی غصے میں ہوتے ہیں۔ حضرت عبداللہؓ بن عمرو بن عاص نے اس بات کا تذکرہ آپ ﷺ سے کیا۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا "قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے۔ ان دونوں ہونٹوں کے درمیان (جو زبان ہے) اس سے حق کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔ لہٰذا تم لکھ لیا کرو۔"

چنانچہ بعض روایات کے مطابق عبداللہؓ بن عمرو بن عاص نے جو صحیفۂ احادیث ترتیب دیا اس کا نام "صحیفہ صادقہ" رکھا گیا۔ اس میں دس ہزار کے قریب احادیث تھیں۔ اسی طرح حضرت انسؓ جو کہ آپ ﷺ کے خادمِ خاص تھے، انہوں نے نو برس آپ کی خدمت کی اور صحبتِ مبارکہ سے خوب فیض اٹھایا۔ انہوں نے بھی آپ ﷺ کی زندگی میں احادیث کا ایک مجموعہ تیار کر لیا تھا اور خود آپ ﷺ کو سنا کر اس کی توثیق بھی کروالی تھی۔ اسی طرح حضرت علیؓ نے بھی احادیثِ مبارکہ تحریر کی تھیں اور آپ ﷺ کے انتقال کے بعد نہ صرف یہ کہ ان کو بڑے اہتمام سے رکھتے تھے بلکہ مختلف مواقع پر ان کے اقتباسات بھی بیان کرتے تھے۔ یہ تو ذاتی حیثیت میں لوگوں کی کاوشیں تھیں۔ جبکہ مختلف مواقع پر آپ ﷺ کی طرف سے دیئے گئے احکامات، معاہدات اور خطوط تو تحریر میں موجود ہی تھے اور ان میں سے اکثر ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو گئے۔

دورِ صحابہ میں تدوینِ حدیث

آپ ﷺ کے انتقال کے بعد حدیث کو قیدِ تحریر میں لانے کا کام بہت سے صحابہ نے کیا۔ اس لئے کہ آپ ﷺ کی صحبت سے انہوں نے جو فائدہ اٹھایا اس کو محفوظ نہ کیا جاتا تو ضائع ہونے کا خدشہ تھا۔ چنانچہ سمرہؓ بن جندب، عبداللہؓ بن مسعود، سعدؓ بن عبادہ، عبداللہؓ بن عباس اور ابو ہریرہؓ سب کے پاس احادیث کے مدون مجموعے موجود تھے۔ خود حضرت ابو بکر صدیقؓ نے بھی آپ ﷺ کی وفات کے بعد حدیث کا ایک مجموعہ تیار کیا تھا جس میں ۵۰۰ احادیث تھیں اور لکھنے کے بعد اسے حضرت عائشہؓ کے سپرد کر دیا تھا۔ مگر اس کے بعد وہ پوری رات نہ سو سکے۔ صبح اٹھ کر عائشہؓ سے فرمایا "بیٹی میں نے تمہیں جو کتاب دی تھی وہ لے آنا کہ کہیں کوئی غلط بات رسول

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اللہ ﷺ سے منسوب نہ ہو جائے۔'' جب وہ لے آئیں تو حضرت ابو بکرؓ نے انہیں پانی سے دھو کر مٹا دیا۔

اسی طرح حضرت عمرؓ نے بھی احادیث کی تدوین کا ارادہ کیا۔ مگر یہ سوچ کر رک گئے کہ کہیں لوگ قرآن سے غافل نہ ہو جائیں۔ شیخین (ابو بکرؓ و عمرؓ) کی یہ سخت احتیاط اس بناء پر تھی کہ وہ روایتِ حدیث کو معمولی بات نہ سمجھتے تھے اور انفرادی اور اجتماعی ہر معاملے میں احادیث کو قرآن کے بعد دین کا مآخذ تسلیم کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ کا تو یہ حال تھا کہ اگر ان کی خلافت کے زمانے میں کوئی شخص نبی اکرم ﷺ سے ایسی بات منسوب کرتا جس کا ان کو علم نہ ہوتا تو اس حدیث پر دو گواہ طلب کرتے۔ اسی طرح حضرت عبداللہؓ بن مسعود (جن کا نبی ﷺ کے گھر میں کثرت سے آنا جانا تھا) کا یہ حال تھا کہ جب قال رسول اللہ کہتے تو کانپ اٹھتے۔ پھر کہتے ''اس طرح'' یا ''اس کے مثل''۔ کچھ صحابہؓ نے تو آخر عمر میں روایتِ حدیث کو اس بناء پر ترک کر دیا تھا کہ بڑھاپے میں عموماً بھول چوک کا اندیشہ ہوتا ہے۔ لہٰذا کہیں حدیث کے معاملے میں کوئی غلطی نہ ہو جائے۔

صحابہ کرامؓ کے بارے میں یہ گمان کرنا کہ روایتِ حدیث میں لاپرواہی سے بھول چوک کے مرتکب ہوئے ہوں گے یا بے توجہی کی بناء پر کوئی بات آگے پیچھے بیان کرتے ہوں گے انتہاء درجے کی لاعلمی ہوگی۔ صحابہ کرامؓ آپ ﷺ کے الفاظ ہی نہیں بلکہ اشارے تک یاد رکھتے تھے۔ ایک بار لوگوں نے حضرت خبابؓ سے پوچھا کہ رسول اللہ ﷺ ظہر و عصر میں قرأت کرتے تھے؟ بولے ہاں۔ لوگوں نے کہا کیونکر معلوم ہوا؟ فرمایا ''ہم آپ ﷺ کی داڑھی مبارک کی حرکت سے اس کا پتہ لگا لیتے تھے۔'' [ابوداؤد]

اسی طرح حضرت عبداللہؓ نے نماز کا طریقہ بتاتے ہوئے فرمایا کہ ''مجھے رسول اللہ ﷺ کی انگلیوں کی گردش نظر آ رہی ہے۔'' [ابوداؤد]

صحابہ کرامؓ اشاعتِ حدیث کے لئے مفتوحہ علاقوں میں پھیل گئے اور لوگوں کو نہایت شوق کے ساتھ حدیث کی تعلیم دی۔ ابو درداء خولانی کہتے ہیں کہ میں حمص کی مسجد میں گیا تو ایک حلقہ دیکھا جس میں ۳۲ صحابہ کرامؓ موجود تھے۔ میں بھی وہاں بیٹھ گیا۔ ایک شخص روایت کر چکتا تو دوسرے صاحب اس سلسلے کو شروع کرتے۔ اسی طرح کوفہ میں حضرت حذیفہؓ بن یمان اور دمشق میں ابو درداءؓ مساجد میں درس دیا کرتے تھے اور ان کے ساتھ بڑے بڑے ہجوم ہوا کرتے تھے۔ جابرؓ بن عبداللہ عین مسجد نبوی ﷺ میں بیٹھ کر درس دیا کرتے تھے۔ حضرت ابو ذر غفاریؓ تو یہاں تک کہتے تھے ''اگر تم میری گردن پر تلوار رکھ دو اور مجھے معلوم ہو کہ ایک کلمہ بھی جس کو میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے ادا کر سکوں گا تو قبل اس کے کہ تلوار اپنا کام کرے میں اس کو ادا کروں گا۔''

ابو ہریرہؓ جن سے سب سے زیادہ احادیث مروی ہیں ان کا یہ حال تھا کہ ان کے گرد طالبانِ علم کی بھیڑ لگی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رہتی اور لوگ ان سے احادیث کی جستجو میں رہتے۔ ابوسعید خدریؓ روایتِ حدیث کرتے تو ان کے گرد آدمیوں کی دیوار کھڑی ہو جاتی۔ ام المومنین حضرت عائشہؓ سے شاگردوں کی ایک بڑی تعداد جن میں عورتیں اور مرد دونوں شامل تھے حدیث کی تعلیم حاصل کرتی۔

صحابہ کرامؓ جب تک بقیدِ حیات رہے ان کے پاک نفوس اس روشنی کو پھیلانے میں ہر دم لگے رہے۔ مختصراً یہ کہ:

(۱) صحابہ کرامؓ نے آپ ﷺ کے الفاظ اور آپ ﷺ کے طریقوں کو محفوظ کرنے کے لئے انسانی حد تک ہر ممکن کوشش کی۔

(۲) اس سلسلے میں احادیث کو بالکل درست طریقے پر بیان کرنے کے لئے وہ جس قدر سعی کرتے تھے اس کے بعد احادیث کے الفاظ پر شک کرنے کا کوئی عقلی جواز نہیں ہے۔

(۳) دورِ صحابہ میں کتابتِ حدیث کا کام وسیع پیانے پر ہوا۔ بڑے بڑے صحابہ کرامؓ کے پاس اپنے اپنے مجموعۂ احادیث بھی تھے۔ البتہ وہ اس معاملے میں حد درجہ احتیاط برتتے تھے۔ عمومی طور پر لوگوں میں احادیث کو اپنے سینوں میں محفوظ کرنے کا رواج زیادہ تھا۔

سبائی فتنہ۔ وضعِ حدیث کی ابتداء

اگر معاملہ یہاں آ کر ختم ہو جاتا تو علمِ حدیث کی تاریخ نسبتاً مختصر ہوتی۔ اصل مسئلے نے اس وقت سر اٹھایا جب حضرت عمرؓ کے وفات پا جانے کے بعد حضرت عثمانؓ کے عہد میں چند فتنہ پرست عناصر نے پر پرزے نکالنے شروع کئے۔ ان لوگوں کا سرغنہ ابن سبا تھا جو یہودی النسل تھا۔ بعد میں مسلمان ہو گیا تھا۔ وہ یمن کا رہنے والا تھا۔ اس کا سازشی دماغ مسلمانوں کے درمیان فساد ڈلوانے کی ترکیبیں سوچتا رہتا۔ اس نے اپنے گرد چند منافق جمع کر لئے اور صحابہؓ کے مقدس نفوس کو نشانہ بنایا۔ یہ شخص اچھی طرح جانتا تھا کہ قرآنِ کریم کی جمع و تدوین ہو چکی ہے، سب مسلمان اس پر متفق ہیں اور اس محاذ پر اسے قطعاً کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ اس نے صحابہ کرامؓ کو نشانہ بنایا۔ بعض کی فضیلت کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا اور بعض پر مختلف الزامات لگائے تاکہ ان کی متفقہ حیثیت کو مشکوک کر کے مسلمانوں کے اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا جائے۔

اس کا موقف تھا کہ ابوبکرؓ و عمرؓ نے پیغمبرِ اسلام کے بعد آپؐ کی منشاء کے خلاف کام کئے اور صحابہؓ کی اکثریت نے ان کا ساتھ دیا۔ اس کی ان گمراہ کن باتوں نے لوگوں کے کان کھڑے کر دیئے۔ ابن سبا ایک کے بعد ایک شہر سے نکالا گیا۔ بصرہ اور کوفہ سے شہر بدر کئے جانے کے بعد مصر چلا گیا۔ لیکن یہ شخص اپنے پیچھے فسادیوں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی ایک جماعت چھوڑ جاتا۔ یہ وہ لوگ تھے جو بادیہ عرب سے نکل کر مسلمانوں کی فوجی نوآبادیوں میں آ کر مقیم ہو گئے تھے۔ صحابہ کرامؓ کے آہستہ آہستہ دنیا سے اٹھ جانے کے بعد ان کی بدویانہ عادتیں دوبارہ ابھر آئی تھیں۔ اس سازش کا شکار ہونے والوں میں زیادہ تعداد ان ہی کم علم اور کمزور کردار کے لوگوں کی تھی۔ یہ لوگ سبائی فتنے کا شکار ہو کر صحابہ کرامؓ کی طرف سے شکوک وشبہات کا شکار ہو گئے اور کھلے عام صحابہؓ سے متعلق لوگوں کو ورغلانے لگے۔ عام عرب سادہ لوح ہونے کے باجود حق و باطل کی تمیز کی عام فطری قوت سے محروم نہ تھے۔ تاہم اس سازشی گروہ نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لئے جھوٹی احادیث گھڑ گھڑ کر بیان کرنا شروع کر دیں۔

دوسری طرف سیاسی محاذ پر حضرت عثمانؓ کی رحمدلی اور نیک نفسی سے فائدہ اٹھا کر ان لوگوں نے طوفان کھڑا کر دیا۔ آخر کار عثمانؓ شہید کر دیئے گئے اور یہ لوگ نومنتخب خلیفہ حضرت علیؓ کی فوج میں اس طرح گھل مل گئے کہ ان کی شناخت مشکل ہو گئی۔ یہ لوگ اپنی ضرورت کے تحت من گھڑت باتوں کو نبی اکرم ﷺ سے منسوب کر دیتے۔ یہ بات آخر کہاں تک چھپی رہتی۔ حضرت علیؓ کو اس کی خبر ہو گئی۔ انہوں نے اعلان کرایا کہ اس قسم کے لوگوں کو کوڑوں کی سزا دی جائے گی۔ پھر ابن سبا کو بلا کر سمجھایا اور وہ جو پھیلاتا پھر رہا تھا کہ ''قرآن کے سوا رسول اللہ ﷺ کے خصوصی علوم علیؓ تک پہنچے ہیں''۔ بھری مجلس میں انہوں نے سب کے سامنے اس کا انکار کیا۔ پھر بھی جب وہ اپنی حرکتوں سے باز نہ آیا تو اس کے منہ پر فرمایا ''قیامت سے پہلے تیس دجالوں کے پیدا ہونے کی جو خبر دی گئی ہے ان میں سے ایک تو بھی ہے۔''

آخر کار اسے کوفہ سے جلاوطن کر دیا گیا۔ حافظ ابن حجر نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ ''جلادیا حضرت علیؓ نے ان لوگوں کو اپنی خلافت کے زمانے میں۔'' لیکن اس کا پھیلایا ہوا زہر تمام عالمِ اسلام میں سرایت کر چکا تھا۔ سیدھے سادھے عام مسلمان ان بے سروپا روایتوں کا تذکرہ بڑے اعتماد کے ساتھ کرنے لگے گویا کہ وہ واقعی رسول اللہ ﷺ اور ان کے صحابہ کی بیان کردہ روایتیں ہیں۔ اب تو بہت سے حق پرست لوگ بھی حدیث کی طرف سے استغناء برتنے لگے۔ احتیاط اور ایک دوسرے پر بے اعتباری کا یہ عالم تھا کہ لوگ روایتِ حدیث سے کترانے لگے اور قرآن کو کافی سمجھنے لگے۔ یہ صورتحال انتہائی پریشان کن تھی۔ جھوٹی حدیثوں کے طوفان میں علم حدیث اپنا اعتبار کھو رہا تھا۔ حضرت علیؓ نے سبائی فرقے سے نمٹنے کے لئے بعد احادیث کی اہمیت کو نئے سرے سے اجاگر کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ چنانچہ فرمایا ''جب تمہارے سامنے آپ ﷺ کی حدیث بیان کی جائے تو خیال کرو، اسی میں سب سے زیادہ رہنمائی ہے۔ وہی سب سے بہتر بات ہے۔ اسی میں تقویٰ کی ضمانت ہے۔''

پھر ان حالات سے نمٹنے کے لئے حضرت علیؓ نے جو حکمت عملی اختیار کی وہ یہ تھی کہ اللہ کے رسول کا طریقہ صاف صاف بیان کیا جائے تا کہ غلط اور صحیح اور جھوٹ اور سچ واضح ہو جائیں۔ ایک موقع پر وہ منبر پر کھڑے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہوگئے اور اعلان کیا "کون ہے جو ایک درہم کے بدلے علم کا ذخیرہ مجھ سے خریدے گا۔" پھر احادیث کی کتابت کرواتے اور لوگوں کو پکڑ پکڑ کر لاتے اور اصرار کرتے کہ وہ ان سے ان امور کے متعلق پوچھیں جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے بتائے ہیں۔

صحابہ پر بے سروپا الزامات لگانے کے بارے میں فرماتے "خدا انہیں غارت کرے، کتنی روشن جماعت کو انہوں نے سیاہ کر دیا اور رسول اللہ ﷺ کی کتنی احادیث کو انہوں نے بگاڑ دیا۔" پھر اس باطل کے سیلاب کا زور توڑنے کے لئے لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا "انہی باتوں کو لوگوں کے سامنے بیان کرو جنہیں پہچانتے ہو اور جنہیں نہ پہچانتے ہو انہیں چھوڑ دو۔"

حدیثیں گھڑنے میں مختلف فرقوں کا کردار

حضرت علیؓ اور ابن عباسؓ و دیگر صحابہ اپنی کوششوں میں لگے ہوئے تھے کہ حضرت علیؓ کی شہادت کا واقعہ پیش آ گیا۔ اب تو ان مفسدین نے طرفداران حضرت علیؓ میں سے سادہ دل لوگوں کو ان کی فضیلت سے متعلق جھوٹی احادیث نیز خود حضرت علیؓ سے منسوب جھوٹی باتوں کو رواج دینا شروع کیا۔ حضرت علیؓ سے اندھا دھند محبت کے دعویدار تو ان باتوں کو گویا الہام کے قریب مرتبہ دینے لگے۔

تابعین کرام نے اس موقع پر آگے بڑھ کر احادیث کے مقام کا تعین کرنا ضروری سمجھا۔ لیکن اب معاملہ صرف سبائیوں ہی تک محدود نہ تھا بلکہ امراء کے خوشامدی، قصہ گو حضرات، روافض، خارجی، غرض ہر کوئی اپنی مقصد برآری کے لئے احادیث پر طبع آزمائی کرنے لگا۔

"فرقہ زنادقہ" نے چودہ ہزار احادیث وضع کیں۔ لیکن عوام ان کی گمراہی سے واقف تھے لہٰذا ان کی طرف ملتفت نہ ہوئے۔ بعض قصہ گو افراد نے احادیث گھڑ کر عوام میں مقبولیت حاصل کی اور مسجدوں میں واعظوں کی جگہ ان کا تقرر کیا گیا۔ ان لوگوں نے نبی اکرم ﷺ سے احادیث منسوب کر کے پرلطف داستانیں سنائیں تو عوام کی دلچسپی بڑھ گئی۔ محدث ابن عون نے لکھا ہے کہ "کوفہ کی مسجدوں میں اعلیٰ مرتبت علماء کے حلقۂ درس میں تو گنتی کے طلبہ شرکت کرتے، لیکن ان قصہ گو حضرات کی تقریروں میں اتنا مجمع ہوتا کہ تل دھرنے کی جگہ نہ ملتی۔"

اموی دور میں بعض ایسے حضرات کی خوب رسائی ہوئی جو حکام اور سلاطین سے متعلق اچھی رائے قائم کرنے کے لئے احادیث وضع کرنے سے دریغ نہ کرتے۔ یہ سلسلہ بعد میں بھی جاری رہا۔ اس بارے میں ایک واقعہ ملتا ہے کہ غیاث بن ابراہیم ایک دفعہ خلیفہ مہدی کے دربار میں حاضر ہوا۔ خلیفہ مہدی نے اپنی تفریح کے لئے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایک کبوتر پال رکھا تھا۔ وہ اس وقت موجود تھا اور خلیفہ کا دل بہلا رہا تھا۔ غیاث سے کہا گیا کہ امیر المومنین کو کوئی حدیث سنائیے۔ اس نے فوراً ایک فرضی سند کے ساتھ کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مقابلہ صرف تیتر، اونٹ، گھوڑے اور پرندے میں جائز ہے۔ مہدی نے اس کے جانے کے بعد کہا ''میں شہادت دیتا ہوں کہ اس نے یہ حدیث میری وجہ سے وضع کی ہے''۔ پھر اس نے کبوتر کو ذبح کرا دیا۔

اسی طرح بعض بے وقوف علماء نے لوگوں کو ترغیب دینے یا ڈرانے کے لئے احادیث وضع کیں۔ جب ان سے پوچھا جاتا تو وہ کہتے کہ ہم نے تو اس وجہ سے حدیثیں وضع کی ہیں کہ لوگ خوف سے زہد و پرہیز گاری اختیار کریں۔

اس ضمن میں آخر میں محدث ابن جوزی ابو جعفر بن محمد طیالسی سے روایت کردہ ایک واقعہ بیان کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ امام احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین نے ایک مسجد میں نماز پڑھی۔ نماز کے بعد انہوں نے دیکھا کہ ایک واعظ کھڑا ہوا اور حدیث بیان کرنے لگا۔ ''مجھے احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین نے حدیث سنائی۔ انہوں نے عبدالرزاق سے اس نے معمر سے اس نے قتادہ سے اس نے انس سے روایت کیا کہ حضور ﷺ نے فرمایا جو شخص ''لا الہ الا اللہ'' کے الفاظ کہتا ہے تو اللہ ہر لفظ پر ایک پرندہ تخلیق کرتا ہے جو سونے کی چونچ اور مرجان کے پر رکھتا ہے''۔ غرض اس ضمن میں اس واعظ نے بیس اوراق سنا دیئے۔

امام احمد بن حنبلؒ اور یحییٰ جو محفل میں موجود تھے ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھنے لگے اور ایک دوسرے سے پوچھا کہ کیا انہوں نے ایسی کوئی حدیث روایت کی ہے۔ جواب نفی میں تھے۔ امام یحییٰ نے اس واعظ کو بلایا تو وہ سمجھا کہ یہ حضرات اس کو کچھ نذرانہ یا عطیہ دیں گے۔ قریب آنے پر یحییٰ نے اس سے پوچھا کہ یہ حدیث تم نے کس سے سنی ہے۔ کہنے لگا احمد بن حنبل سے اور یحییٰ بن معین سے۔ اس پر انہوں نے کہا یحییٰ میں ہوں اور احمد بن حنبل یہ ہیں۔ ہم نے تو یہ حدیث آج تک نہیں سنی۔ اس پر وہ بولا میں نے سنا تھا کہ یحییٰ بے وقوف ہیں۔ آج اس کی تصدیق ہوگئی۔ آپ لوگ کیا سمجھتے ہیں کہ آپ کے علاوہ کوئی اور یحییٰ اور احمد نہیں۔ سترہ یحییٰ اور احمد ہیں جن سے میں نے روایت کی ہے۔ یہ کہہ کر وہ ان لوگوں کا مذاق اڑاتا ہوا چلا گیا۔

دورِ تابعین میں تدوینِ حدیث

دوسری صدی ہجری میں جہاں احادیث کی جمع و تدوین کے لئے محدثین نے دنیائے اسلام کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چکر لگائے، وہیں انہیں یہ فکر بھی دامن گیر ہوئی کہ اصل احادیث کو چھانٹ کر الگ کیا جائے۔ تابعین کرام جنہوں نے صحابہؓ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور ان کی صحبت سے فیضیاب ہوئے تھے، کم

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہوتے جا رہے تھے۔ عجمی قوموں سے اختلاط کی وجہ سے محاورات اور مفاہیم بھی بدلتے جا رہے تھے۔ تابعین کے بعد تبع تابعین نے حدیث کی جمع و تدوین کا کام شروع کیا۔ حکومتی سطح پر ابتدائی کوششیں عمر بن عبدالعزیز کے حکم پر ہوئیں اور احادیث کا ایک دفتر تیار ہو گیا۔ مدینہ میں امام مالک نے موطا لکھی۔ مکہ میں ابن جریج، شام میں امام اوزاعی، کوفہ میں سفیان ثوری، بصرہ میں حماد بن سلمہ نے علمِ حدیث کی خوب خدمت کی۔ احادیث کے حفظ کا اہتمام ہونے لگا اور کتابت کا رجحان بھی بڑھ گیا۔ اس زمانے کے محدثین کی ریاضتوں اور حدیث سے ان کے عشق بلکہ جنون کی داستانوں سے کتابیں بھری پڑی ہیں۔ ایک ایک حدیث کی جستجو کے لئے سینکڑوں میل کا سفر طے کیا جاتا تھا۔

فنِ علمِ حدیث۔ مسلمانوں کا عظیم الشان کارنامہ

علمِ حدیث کی ایک باقاعدہ فن کے طور پر بنیاد پڑی۔ روایت درایت اور علمِ اسماء الرجال کا حصول علمِ حدیث کے لئے لازمی قرار دیا گیا۔ علمِ اسماء الرجال میں لاکھوں راویانِ حدیث کے حالات، اخلاق، عادات اور معاملات وغیرہ کی مکمل جانچ کی جاتی اور اس کی کسوٹی ایسی سخت ہوتی کہ کسی سے ذرہ برابر رعایت نہ کی جاتی۔

ڈاکٹر اسپرنگر نے لکھا ہے ''کوئی قوم دنیا کی ایسی نہ گذری نہ آج موجود ہے جس نے مسلمانوں کی طرح ''اسماء الرجال'' کے عظیم فن کو ایجاد کیا۔ جس کی بدولت آج پانچ لاکھ انسانوں کا حال معلوم کیا جا سکتا ہے۔''

ان تمام اصولوں کے مقرر کرنے کے بعد غلط احادیث کا سدباب کیسے ہوا، اس کی ایک مثال یہ ہے کہ خیبر کے یہودیوں نے دربارِ خلافت میں ایک دستاویز اس دعوے کے ساتھ پیش کی کہ آنحضرت ﷺ نے اسے تحریر کروایا تھا۔ اس کے مطابق خیبر کے یہود کو جزیہ اور بیگار معاف کر دیا گیا تھا۔

حکومتِ وقت نے کسی فیصلے پر پہنچنے سے پہلے یہ دستاویز محدثین کو دکھائی۔ محدثین نے اسے رد کر دیا اور یہ دلائل بیان کئے۔

۱۔ اس پر سعدؓ بن معاذ کی گواہی ہے۔ وہ غزوہ خیبر سے قبل وفات پا چکے تھے۔

۲۔ کاتب کا نام معاویہ بن ابی سفیان لکھا ہے۔ وہ اس وقت تک مشرف بہ اسلام نہ ہوئے تھے۔

۳۔ جزیہ اس صورت میں معاف ہو سکتا ہے جب اسلام کی دوستی اور حمایت کا معاملہ ہو، جبکہ خیبر کے یہود اسلام دشمن تھے۔

۴۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں بیگار کا رواج نہ تھا۔ اس لئے اس کی معافی کا سوال نہیں۔

۵۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ جزیہ کا حکم اس وقت تک نازل ہی نہ ہوا تھا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس طرح یہود کی یہ دستاویز رد کردی گئی۔اس زمانے میں بہت سے حضرات نے اپنی روایت شدہ احادیث کو جمع کیا۔ان میں امام احمد بن حنبل،عثمان بن ابی شیبہ اور اسحاق بن راہویہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ان اصحاب کی کوششوں سے احادیث کا ایک ضخیم مجموعہ امت کے لئے تیار ہوگیا۔

محدثین کرام نے قبول حدیث کے لئے مقرر کردہ اصولوں کی پیروی لازمی قرار دی اور راویوں کے حالات ان کی زندگی اور کردار اور احادیث کے متن کو سامنے رکھ کر اس پر جرح کرنے کا فن سامنے آیا۔امت کو سخت ضرورت تھی کہ اس کے سامنے احادیث کا ایسا مجموعہ ہو جس کے بارے میں یقین سے کہا جاسکے کہ انسانی حد تک پوری کوشش اور تحقیق کے بعد اس کو تیار کیا گیا ہے۔ایسا ذخیرۂ حدیث جو گھڑی ہوئی اور موضوع احادیث سے پاک ہو،جس کے بارے میں شکوک وشبہات نہ ہوں اور محدثین کے علاوہ عام آدمی بھی ڈھیر سارے علوم جانے بغیر صحیح احادیث تک پہنچ سکے۔

صحیح بخاری......قرآن کے بعد صحیح ترین کتاب

امام بخاریؒ کے علمِ حدیث سے عشق کا تذکرہ گذر چکا ہے۔آپ احادیث کی مدون کتابوں سے خوب باخبر تھے۔آپ کو ان میں ہر قسم کی صحیح اور ضعیف احادیث نظر آتی تھیں۔اس بات کو آپ شدت سے محسوس کرتے تھے۔اسی زمانے میں ایک روز آپ مشہور محدث امام اسحاق بن راہویہ کی خدمت میں حاضر تھے کہ انہوں نے فرمایا''کاش نبی کریم ﷺ کی صحیح احادیث سے ایک مختصر کتاب تم جمع کرتے۔''

امام بخاریؒ کہتے ہیں''یہ بات میرے جی میں بیٹھ گئی اور آگ میں روغن کا کام دے گئی۔میں نے اسی وقت سے جامع صحیح کی تدوین شروع کردی۔''اس پر مستزاد یہ ہوا کہ آپ نے خواب میں اپنے آپ کو اس حالت میں دیکھا کہ آپ کے ہاتھ میں پنکھا ہے اور آپ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہیں اور اس پنکھے سے آپ ﷺ کے اوپر سے مکھیوں کو بھگا رہے ہیں۔جب آپ بیدار ہوئے اور اس کی تعبیر معلوم کی تو تعبیر بتانے والوں نے کہا رسول اکرم ﷺ کی طرف جن جھوٹی احادیث کی نسبت کی جاتی ہے آپ ان کو دفع کریں گے۔اب آپ نے جامع صحیح کی تالیف کا مصمم ارادہ کرلیا۔

یہ کوئی معمولی درجے کا کام نہ تھا۔گزشتہ ادوار میں بے تحاشہ احادیث گھڑی گئی تھیں۔مختلف افراد کے بارے میں مشہور ہے کہ انہوں نے ہزاروں حدیثیں گھڑیں۔عبدالکریم وضاع نامی شخص نے خود چار ہزار احادیث اختراع کرنے کا دعویٰ کیا۔

ان حالات میں امام بخاری نے کمر ہمت باندھی۔خود ہر ہر حدیث کی پوری تحقیق کرنے کے بعد جب اس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی صحت پر یقین ہو جاتا تو اس پر استخارہ کرتے اور پھر اس کو ''الجامع الصحیح'' میں داخل کرتے۔ اس کام کی آپ کو کتنی دھن تھی وارق نے ایک واقعہ اس ضمن میں بیان کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ میں امام بخاری کے ساتھ تھا۔ میں نے آپ کو ''کتاب التفسیر'' لکھتے ہوئے دیکھا کہ آپ رات میں پندرہ بیس مرتبہ اٹھتے اور آگ روشن کر کے چراغ جلاتے اور حدیثوں پر نشان دے کر سو رہتے۔ میں عرض کرتا کہ آپ مجھے اٹھا لیا کریں۔ فرماتے تم جوان آدمی ہو، میں تمہاری نیند خراب نہیں کرنا چاہتا۔

احادیث کے معاملے میں تمام احتیاط برتنے کے باوجود اللہ کی توفیق کے طلبگار رہتے۔ خود فرماتے ہیں۔ ''میں نے کوئی حدیث ''الجامع الصحیح'' میں اس وقت تک داخل نہیں کی جب تک غسل کر کے دو رکعت نماز ادا نہ کرلی ہو۔'' تالیف کا یہ کام مسجد حرام میں بیٹھ کر بھی کیا۔ اٹھارہ سال کی محنت کے بعد اس کی تکمیل ہوئی۔ احادیث کو مضمون کے مطابق ترتیب دینے کا ارادہ کیا (جسے محدثین کی اصطلاح میں ترجمۃ الباب کہتے ہیں) تو اس کام کے لئے مدینہ منورہ تشریف لے گئے اور وہاں روضہ مبارک اور منبر رسول ﷺ کے درمیانی مقام پر اس اہم کام کو انجام دیا اور ہر ترجمے پر دو رکعت نفل ادا کیے۔ ایک اندازے کے مطابق چھ لاکھ احادیث کے مجموعے میں سے چھانٹ کر جب آپ اپنی جامع صحیح مکمل کر چکے تو اسے امام احمد بن حنبل، یحییٰ بن معین اور علی المدائنی جیسے محدثین کے سامنے پیش کیا۔ انہوں نے اسے بے حد پسند کیا، اس کی صحت کی تعریف کی اور محض چار احادیث پر جرح کی۔

آپ کی یہ تالیف آپ کی زندگی میں ہی اس قدر مقبول ہوئی کہ خود آپ سے نوے ہزار آدمیوں نے بلا واسطہ سنا۔ صحیح بخاری کو اس وقت سے لے کر آج تک قرآن کے بعد صحیح ترین کتاب مانا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی آپ سے روایت کردہ بہت سی کتابوں کے نام ملتے ہیں لیکن وہ دستیاب نہیں ہیں۔

صحیح بخاری کی خصوصیات

یہاں ہم ان خصوصیات کا تذکرہ کریں گے جن کی بناء پر صحیح بخاری کو قرآن کے بعد دنیا کی صحیح ترین کتاب قرار دیا گیا۔

(۱) بخاری میں ایسی احادیث ملتی ہیں جو امام بخاری اور رسول ﷺ کے درمیان صرف تین واسطے سے پہنچیں۔ ایسی احادیث ثلاثیات کہلاتی ہیں۔

(۲) تمام محدثین میں سب سے پہلے امام صاحب نے اس بات کی ذمہ داری لی کہ وہ اپنی کتاب میں صحیح ترین احادیث کو جمع کریں گے اور اس کے لئے چھ لاکھ احادیث کے مجموعے میں سے تقریباً چار ہزار احادیث کو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

منتخب کیا۔ اگر مکررات (دہرائی جانے والی احادیث) کے ساتھ تعداد شمار کی جائے تو سات ہزار دو سو پچھتر بنتی ہے۔

(۳) امام بخاریؒ نے جو احتیاط احادیث کے چناؤ میں راویوں کے حالات سے متعلق برتی وہ ایک مثال ہے۔ احادیثِ رسول کے سلسلے میں کھرے کو کھوٹے سے چھانٹنے کے لئے آپ پوری تحقیق کرتے۔ البتہ الفاظ کے استعمال میں احتیاط برتتے۔ چنانچہ "ترکوہ، انکرہ الناس، المتروک، الساقط" جیسے الفاظ ملتے ہیں۔ وضاع (گھڑنے والا) اور کذاب (جھوٹا) جیسے الفاظ سے جرح بہت کم ثابت ہے۔ جب آپ کسی پر سخت جرح کرتے تو اسے منکر الحدیث کہتے اور اس سے مطلب یہ ہے کہ اس سے روایت کرنا جائز نہیں سمجھتے۔ احادیث کے چناؤ میں راویوں کے کردار کا کتنا خیال ہوتا اس سلسلے کا مشہور واقعہ ہے کہ ایک بار امام صاحب حدیث کی تلاش میں بہت دور سفر کر کے ایک آدمی کے پاس پہنچے۔ اس کو اس حال میں پایا کہ اس کا گھوڑا چھوٹ گیا تھا اور وہ اس کو بلانے کے لئے جھولی سی بنائے ہوئے تھا، یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ اس میں کھانا ہے۔ جب گھوڑا قریب آیا تو اس نے جھولی جھٹک دی۔ اس پر آپ نے وہیں سے واپسی کی راہ لی کہ جو شخص جانور سے دھوکہ کرسکتا ہے وہ انسانوں کو بھی دھوکہ دے سکتا ہے۔

(۴) صحیح بخاری ایک ایسی کتاب ہے جس کو نوے ہزار افراد نے خود امام صاحب سے سنا۔ اس کے تواتر کا کیا کہنا۔ امام نجم الدین ابوحفص عمر جنہوں نے صحیح بخاری کی شرح لکھی ہے، فرماتے ہیں۔ میرا سلسلۂ سند امام بخاری تک پچاس طریقوں سے پہنچتا ہے۔ قرآن کریم (جس کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ نے لیا) کے علاوہ قدیم کتابوں میں بہت کم ایسی ہیں جو بالکل اصلی حالت میں ہوں، مگر امام صاحب کی الجامع الصحیح بخاری کے بارے میں اس طرح کا کوئی الزام کبھی سامنے نہیں آیا۔

(۵) صحیح بخاری میں جہاں امام صاحب نے احادیث کی صحت کا حد درجہ اہتمام کیا ہے وہاں یہ بات بھی مدنظر رکھی ہے کہ ان احادیث سے فقہی احکامات بھی اخذ ہو جائیں۔ اس طرح ایک ایک حدیث سے اگر تین چار احکامات بھی نکل رہے ہوں تو ان کو دوبارہ دوسرے عنوان کے تحت الگ اسناد سے بھی درج کر دیا ہے۔ اس کے لئے وہ یہ اہتمام بھی کرتے ہیں کہ پہلے قرآنی آیات سے استدلال کر کے احادیث کی تطبیق کرتے ہیں۔ اس طرح صحیح بخاری احادیث کا مجموعہ ہونے کے ساتھ ساتھ غور و فکر کرنے والوں کے لئے بہت سے معاملات میں فقہی رہنمائی بھی فراہم کرتی ہے۔

(۶) صحیح بخاری کے لئے احادیث قبول کرنے کی امام صاحب کی شرائط بہت سخت تھیں۔ مثلاً:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

راوی حدیث صحابہ تک ثقہ ہوں اور ان کی ثقاہت پر اتفاق ہو۔ یعنی تمام راوی مسلم، صادق، سچے، غیر مدلس [1]، غیر مختلط، عادل [2]، ضابط [3] اور متحفظ [4] ہوں۔ سلیم الذہن ہونے کے ساتھ ساتھ قلیل الوہم اور سلیم الاعتقاد ہوں۔

سلسلہ روایت منقطع [5] نہ ہو۔

حدیث کی صحت اور مقبولیت پر پہلے کے محدثین کا اتفاق ہو۔

علت اور شذوذ [6] سے خالی ہو۔

راوی اعلیٰ طبقے کے ہوں۔ ادنیٰ یا اوسط غیر کافی ہیں۔ اس کا معنی یہ ہے کہ راوی نہ صرف حفظ اور یقین میں بڑھے ہوئے ہوں بلکہ جس شیخ سے وہ روایت کر رہے ہیں، اس کی صحبت میں خوب وقت گذارا ہوا اور اس کی بیان کردہ احادیث کو خوب پہچانتے ہوں۔

ان سب خصوصیات نے صحیح بخاری کو تمام کتب احادیث پر ترجیح دلائی۔ زمانہ موجودہ تک صحیح بخاری کی سینکڑوں شرحیں لکھی جا چکی ہیں اور اہلِ علم نے اس کا کوئی پہلو ایسا نہیں چھوڑا جس پر بحث نہ کی ہو۔ کسی نے لغت سے بحث کی ہے تو کسی نے رجال سے، کسی نے نحوی طریقے سے اس کو جانچا ہے تو کسی نے اسکی تلخیص کی کوشش کی ہے۔ مسلمانوں کے اتنے فرقوں میں بٹ جانے کے باوجود امام صاحب کی یہ کتاب عرب وعجم اور دنیا کے ہر خطے کے لوگوں کے لئے قرآن مجید کے بعد معتبر ترین ہے۔ محدث ہوں یا فقیہ، متکلم ہوں یا صوفی حضرات، سب راہنمائی کے لئے اللہ کے رسول کے اقوال کے محتاج ہیں اور اس کے لئے صحیح بخاری کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ صدیاں گذرنے پر بھی اس کی مقبولیت میں ذرہ برابر کمی نہیں آئی ہے۔ امام صاحب کی زندگی بھر کی محنت سے اربوں مسلمانوں نے اب تک فائدہ اٹھایا ہے۔ آپ خود صحیح بخاری کو اپنے لئے کیا سمجھتے تھے؟ آپ کا قول

---

(۱) غیر مدلس: خبرِ مردود جسکی اسناد میں پوشیدہ سقوط ہو جسے صرف ماہر ہی سمجھ سکتا ہو خبرِ مدلس کہلاتی ہے۔ ایسا راوی جس کی روایت شدہ احادیث اس خامی سے پاک ہوں غیر مدلس کہلائے گا۔

(۲) عادل: راوی کا مسلمان، عاقل و بالغ ہونا، درست اور صحیح عقائد کا قائل ہونا نیز اخلاقی عیوب سے پاک ہونا۔

(۳) ضابط: ایسا راویٔ حدیث جو حدیث کی ایسی محافظت کرے (چاہے ذہن میں محفوظ کرے یا کتاب میں) کہ اس میں کسی قسم کا شبہ، خلل یا خطا کا اندیشہ نہ رہے۔

(۴) متحفظ: قوتِ حفظ میں ممتاز ہونا۔

(۵) منقطع: وہ حدیث ہے جس میں دو راوی متفرق مقامات سے ساقط ہوں۔

(۶) شذوذ: کسی امر میں ثقہ راوی کا اپنے سے زیادہ ثقہ راوی کی مخالفت کرنا شذوذ کہلاتا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے: ''میں نے اس کو اپنی نجات کے لئے حجت بنایا ہے۔''

تلامذہ

امام بخاریؒ کی خوش قسمتی تھی کہ آپ کو شاگرد بھی ایسے ملے جو بعد میں اس پائے کے محدث بنے کہ ان کی کتابوں کو صحاحِ ستہ میں جگہ ملی۔ امام مسلم، امام نسائی، امام ترمذی (رحمہم اللہ) تینوں آپ کے شاگرد تھے۔ امام مسلم نے صحیح بخاری کو دیکھ کر صحیح احادیث پر مشتمل کتاب صحیح مسلم کی بنیاد رکھی جو صحیح بخاری کے بعد احادیث کی سب سے اہم کتاب مانی جاتی ہے۔ وہ خود گواہی دیتے ہیں کہ امام بخاری اس فن میں ہر طرح سے منفرد ہیں۔ وہ آپ کو سید المحدثین کے لقب سے پکارا کرتے تھے۔ امام ترمذی علی الاعلان اس بات کا اقرار کرتے تھے کہ جامع ترمذی میں انہوں نے جس قدر حدیث کی علتیں بیان کی ہیں یا رجال یا تاریخ میں کلام کیا ہے اس کا اکثر حصہ امام بخاری کی تاریخ سے لکھا ہے اور زیادہ تر علل خود استاد بخاری سے سیکھے ہیں۔ ان تینوں اماموں کے علاوہ امام دارمی اور امام ابن خزیمہ نے بھی آپ سے فیض اٹھایا۔

یہ تو وہ خاص لوگ ہیں جن کے ناموں سے ہم واقف ہیں۔ امام صاحب سے لوگ علم حاصل کرنے کے لئے اس طرح بے چین رہتے تھے کہ راستے میں بٹھا کر حدیثیں لکھتے اور دیکھتے ہی دیکھتے ہزاروں کا مجموعہ ہو جاتا۔

مخالفت اور ابتلاء

امام صاحب سلاطین اور امراء کی صحبت سے بچتے تھے اور ان کی بیجا تعریف اور خوشامد کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ آپ فرماتے ''امراء کی صحبت میں علم کی ذلت ہے اور ان کی خوشامد میں دین کا نقصان۔'' حدیثوں کے عظیم الشان مجموعے کی جمع و تدوین کے بعد جب آپ اپنے وطن بخارا لوٹے تو آپ کی شہرت سے تمام عالمِ اسلام گونج رہا تھا۔ آپ کے استقبال کے لئے آنے والے لوگوں نے شہر سے تین میل دور تک ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ کیا خواص اور کیا عوام ہر کوئی آپ کے دیدار کا خواہشمند تھا۔

بخارا میں سکونت اختیار کرنے کے بعد آپ نے درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ شائقینِ حدیث کی جماعت فیض یاب ہونے کے لئے جوق در جوق چلی آ رہی تھی۔ بخارا کے حاکم کو بھی شوق پیدا ہوا مگر وہ علم کا قدر شناس نہ تھا۔ اس نے ایک آدمی کے ہاتھ پیغام بھجوایا کہ ''آپ اپنی کتاب لے کر میرے پاس آ جائیں اور اپنی جمع کی ہوئی احادیث مجھے سنائیں۔'' امام صاحب نے جواب میں کہلا بھیجا ''میں علم کو ذلیل نہیں کرنا چاہتا اور اسے لے کر حکمرانوں کے دروازے پر نہیں پھرنا چاہتا۔ اگر تمہیں علم حاصل کرنا ہے تو خود چل کر میری مسجد میں یا میرے گھر پر آؤ۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں جو علم کو چھپاتے ہیں۔ یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا کہ میں علم کی باتیں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خاص خاص لوگوں کو سناؤں اور عام لوگوں کو نہ سناؤں۔''

حاکمِ بخارا کو یہ جواب قطعاً پسند نہ آیا۔ اس نے اصرار کے ساتھ پیغام بھجوایا کہ اگر آپ تشریف لانا نہیں چاہتے تو کم از کم شہزادوں کے لئے وقت مقرر کر دیں جس میں عام لوگ شریک نہ ہوں۔ امام صاحب نے کہا'' یہ آنحضرت ﷺ کی میراث ہے۔ اس میں خاص و عام سب کا حق ہے۔ میری درسگاہ اور مسجد کا دروازہ ہر وقت ہر شخص کے لئے کھلا ہے۔ جس کو شوق ہو وہ آ کر مستفید ہو۔ اس کے لئے کسی کی روک ٹوک نہیں ہے۔''

والیٔ بخارا کو یہ بات اتنی گراں گذری کہ وہ آپ پر ہاتھ ڈالنے کی تدبیر سوچنے لگا۔ اس نے چند لوگوں کو اس کام پر مامور کیا کہ وہ آپ کے اوپر کوئی الزام قائم کریں۔ چنانچہ آپ پر یہ الزام لگایا گیا کہ آپ فتویٰ دینے میں غلطی کرتے ہیں نیز آپ قرآنی الفاظ کے مخلوق ہونے کے قائل ہیں۔ اس غلط الزام کو شہرت دی گئی اور اس کا بہانہ بنا کر آپ کو شہر چھوڑنے کا حکم دیا گیا۔ آپ نے شہر سے نکلتے وقت بددعا دی'' اللہ جس بات کا مجھ پر ان لوگوں نے ارادہ کیا تو وہی بات ان کی ذات اور ان کی اولاد میں رکھ۔'' ابھی ایک ماہ بھی پورا نہ گذرا تھا کہ امیر بخارا خلیفہ کے حکم سے معزول ہوا اور گدھے پر سوار کر کے شہر بھر میں گھمایا گیا۔ پھر قید میں ڈال دیا گیا۔ دیگر سازشی عناصر بھی کسی نہ کسی جان و مال یا اولاد کی آفت میں گرفتار ہوئے۔

امام صاحب بخارا سے نکل کر بیکند پہنچے۔ مگر وہاں بھی حالات کو سازگار نہ پایا۔ اس عرصے میں سمرقند کے لوگوں نے درخواست بھیجی کہ آپ ہمارے پاس آ کر ہمیں اپنے علم سے بہرہ مند فرمائیں۔ آپ نے ان کی درخواست قبول کی، سمرقند کی جانب روانہ ہوئے اور نزدیکی بستی خرتنگ میں ایک عزیز کے گھر ٹھہرے۔ کچھ دنوں کے بعد بیمار ہوگئے۔ اس حالت میں بھی سمرقندیوں کی طرف سے برابر بلاوے کے پیغام آتے رہے۔ آپ نے بیماری ہی میں سفر کا ارادہ کیا۔ لیکن جلد ہی یہ خبر پہنچی کہ سمرقند کے اندر بھی دو گروہ ہو گئے ہیں۔ ایک آپ کا موافق اور ایک مخالف۔ اس بات کا آپ کو بڑا افسوس ہوا۔ رات تہجد کے وقت دعا کی'' اللہ! تیری زمین بہت بڑی ہے، مگر میرے لئے تنگ ہوگئی۔ اب تو مجھے اپنے پاس بلالے۔'' آپ کی دعا قبول ہوئی اور جلد بلاوے کا وقت آ گیا۔

وفات

اسی اثناء میں سمرقند کے لوگوں کی طرف سے دوبارہ پرزور اصرار آیا کہ لوگوں میں آپ کے حق میں اتفاق ہوگیا ہے۔ لہٰذا ضرور تشریف لائیے۔ چنانچہ آپ نے سواری طلب کی اور چلنے کے لئے تیار ہوگئے۔ دو آدمیوں نے مل کر بازو تھامے اور سواری کی طرف لے کر چل پڑے۔ ابھی ذرا ہی چلے ہوں گے کہ فرمایا مجھے چھوڑ دو۔ پھر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آپ نے ہاتھ اٹھا کر دعا کی اور لیٹ گئے۔ جسم سے بے تحاشا پسینہ جاری ہوا اور اسی کیفیت میں شب عید ۲۵۶ ہجری میں ۶۲ سال کی عمر میں انتقال فرما گئے۔

خرتنگ میں عیدالفطر کے دن بعد نماز ظہر دفنائے گئے۔ دفن کے بعد قبر سے نہایت تیز خوشبو نکلی جس کی مہک عنبر اور مشک سے بھی بڑھی ہوئی تھی۔ اس خوشبو کا ایسا چرچا ہوا کہ لوگ دور دراز سے اس کی تصدیق کرنے آتے اور واپسی پر مٹی اپنے ہمراہ لے جاتے۔ یہاں تک کہ بستی والوں نے اس خوف سے کہ قبر کی مٹی کم ہو جائے گی اس کو چاروں طرف سے گھیر دیا۔

عادات، خصائل و معمولات

امام بخاریؒ کو اپنے والد کے ترکے سے بڑی دولت ہاتھ آئی تھی۔ یہ وہ دولت تھی جس کے بارے میں آپ کے والد نے مرتے وقت واضح کر دیا تھا کہ سو فیصد حلال طریقے سے کمائی گئی تھی۔ امام صاحب نے اس مال کو تجارت میں لگا دیا۔ اس طرح آپ بالکل فارغ ہو کر علمِ نبوی ﷺ کی خدمت میں مصروف ہو گئے۔ اس تجارت سے جو نفع حاصل ہوتا اس کو اہلِ علم حضرات اور طلباء کی ضروریات پر خرچ کرتے۔ مال کی محبت کے دل میں گھر کرنے کو سخت ناپسندیدہ سمجھتے تھے۔ ایک بار شام کے کچھ تاجروں نے آپ سے پانچ ہزار کی رقم ادا کر کے کچھ مال خریدنا چاہا۔ آپ نے انہیں اگلے روز جواب دینے کا وعدہ کیا۔ اگلی صبح کچھ اور تاجر آ گئے اور دس ہزار تک بولی دی۔ مگر آپ نے انکار کر دیا اور کہا کہ میں نے رات والے تاجر کو مال دینے کی نیت کر لی تھی۔ اب اسے توڑنا پسند نہیں کرتا۔ اس موقع پر یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ جب آپ نے کسی قسم کا وعدہ نہ کیا تھا تو پھر منافع کا سودا کیوں نہ کیا۔ یہ دراصل پاکیزگیٔ قلب کی ریاضت تھی۔ آپ لالچ اور حرص جیسے موذی امراض سے قلب کو پاک رکھنے کے لئے اس طرح کی احتیاط برتا کرتے تھے۔

آپ کے مالی حالات ہمیشہ بہت اچھے نہیں رہے بلکہ طالب علمی کے زمانے میں آپ نے کئی بار بڑا سخت وقت بھی دیکھا۔ ایک بار دورانِ سفر زادِ راہ ختم ہو گیا تو کئی روز گھاس اور پتیاں کھا کر گذارا کیا مگر کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلائے۔ بصرہ میں تعلیم حاصل کرنے کے دوران ایک بار خرچہ ختم ہو گیا تو بدن کے کپڑے بیچنے کی نوبت آ گئی۔ لوگوں نے درس میں غیر حاضر پا کر تلاش کیا تو آپ اپنے حجرے میں ملے۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ سب کچھ فروخت ہو چکا ہے، لیکن مارے غیرت کے کسی سے اس کا تذکرہ نہ کیا۔

سنتِ رسول ﷺ کی پیروی کا رنگ آپ کی ذات میں گہرا نظر آتا ہے۔ آپ نے بخارا کے باہر ایک مہمان سرا بنوایا تھا۔ تعمیر کے وقت مزدوروں، معماروں کو اینٹیں پہنچانے میں خود امام بخاریؒ بھی شامل تھے۔ آپ اپنے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سر پر اینٹیں رکھ کر لے جاتے اور معماروں کو دیتے۔ ایک شاگرد نے یہ دیکھ کر دلسوزی سے کہا کہ آپ کو اس محنت کی کیا ضرورت ہے؟ آپ نے فرمایا یہ وہ کام ہے جو مجھے نفع دے گا۔ دراصل آپ کا اشارہ اس واقعے کی طرف تھا جب غزوۂ خندق کے موقع پر رسول اللہ ﷺ اپنے ہاتھوں سے خندق کھودتے تھے۔ تیر اندازی کا فن آپ نے محض اس لئے سیکھا کہ احادیث سے اس کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔ تیر اندازی کی مشق کے لئے آپ میدان میں تشریف لے جاتے۔ حالانکہ یہ فن علماء کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتا۔

دیگر ائمہ امت کی طرح امام صاحب بھی بظاہر چھوٹی باتوں اور معاملات میں حد درجہ احتیاط برتتے تھے۔ ایک بار دوران تیر اندازی آپ کا تیر ایک پل کی میخ پر جا کر ایسا بیٹھا کہ پل کو نقصان پہنچا۔ آپ فی الفور سواری سے اتر کر پل کے پاس تشریف لے گئے، تیر کو میخ سے نکالا اور ساتھی سے کہا کہ مالک سے جا کر اس پل کی دوبارہ تعمیر یا اس کی قیمت کی واپسی پر بات کرنی چاہئے تاکہ وہ ہمارا قصور معاف کر دے۔ پل کے مالک کو علم ہوا تو کہنے لگا کچھ مضائقہ نہیں۔ میرا کل مال اور دولت آپ پر قربان ہو۔ یہ سن کر آپ کو اطمینان ہوا اور آپ نے سو درہم خیرات کی۔

زبان کے استعمال میں بھی اسی قسم کی احتیاط مدنظر رہتی۔ فرماتے ہیں ''جب سے مجھے علم ہوا کہ غیبت کرنی حرام ہے اس وقت سے میں نے کسی کی غیبت نہیں کی اور مجھے امید ہے کہ میرا کوئی دعویدار قیامت کے دن اس معاملے میں نہ ہوگا۔'' اسی ضمن میں یہ واقعہ لائق تذکرہ ہے کہ ایک دن آپ ایک شخص ابو معشر سے معافی مانگنے لگے۔ اس نے حیران ہو کر کہا ''کس بات کی معافی؟'' آپ نے کہا ''میں نے آپ کو ایک دن دیکھا کہ آپ بہت خوش ہیں اور خوشی سے سر اور ہاتھ کو عجیب طرح ہلا رہے ہیں۔ جس پر مجھے ہنسی آ گئی۔'' ابو معشر نے جواب دیا۔ ''آپ پر خدا رحم کرے۔ آپ سے کسی طرح کی باز پرس نہیں۔''

آپ کی اس بے داغ شخصیت کے پیچھے غیر معمولی محتاط رویہ تھا۔ آپ احادیثِ نبوی اور سنتِ رسول ﷺ کے پہنچانے اور پھیلانے والے کی حیثیت سے اپنا مقام جانتے تھے۔ ایسے بلند مرتبہ شخص کی معمولی سی کوتاہی بھی اس کے سارے کام پر پانی پھیر سکتی ہے۔ برسوں کی محنت کے بعد اگر لوگوں کو آپ کے خلوص پر شبہ ہو جاتا تو وہ آپ کے کام پر بھی شبہ کرتے۔ اس سے متعلق ایک واقعہ ملتا ہے کہ آپ تحصیلِ علوم کے زمانے میں ایک دفعہ پانی کے جہاز پر سفر کر رہے تھے۔ آپ کے پاس ایک ہزار اشرفیاں تھیں۔ ایک شخص مستقل آپ کی خدمت گذاری میں لگا رہا تو آپ نے بطور تذکرہ اسے ان پیسوں کی اطلاع دی۔ ایک روز یہ شخص سو کر اٹھا تو اس نے رونا، چیخنا اور سر پیٹنا شروع کر دیا۔ لوگوں کے پوچھنے پر کہنے لگا کہ میرے پاس ہزار اشرفیوں کی تھیلی تھی جو کسی نے چرا لی۔ جب کشتی والوں نے سب کی تلاشی لینا شروع کی تو امام صاحب نے چپکے سے وہ تھیلی سمندر میں پھینک دی۔ جب

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آپ کی تلاشی لی گئی تو وہ تھیلی برآمد نہ ہوئی۔موقع ملنے پر جب آپ اکیلے ہوئے تو اس آدمی نے آپ سے پوچھا کہ آپ نے اشرفیوں کی وہ تھیلی کیا کی؟ آپ نے کہا کہ وہ تو میں نے سمندر میں پھینک دی۔اس نے کہا آپ نے اتنی کثیر رقم کیوں ضائع کی؟ آپ نے کہا تمہاری عقل کہاں ہے؟ کیا تم نہیں جانتے کہ میری تمام عمر رسول اللہ ﷺ کی حدیثوں کی طلب میں ختم ہوئی اور میری بات کا اعتبار اور ثقاہت دنیا میں مشہور ہے تو کیا میں چوری کا الزام اپنے سر لے لیتا؟ جس دولت کو میں نے ساری عمر میں حاصل کیا اس کو چند اشرفیوں کے عوض کھو دیتا؟

امام صاحب جتنا اپنے معاملے میں احتیاط برتتے، اتنا ہی دوسروں کے لئے گنجائش رکھتے۔آپ کے قرضدار آپ سے مہلت مانگتے تو آپ ان کو کھلے دل سے مہلت دے دیتے۔لوگ اس پر اعتراض کرتے کہ یہ لوگ آپ سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں تو فرماتے: ''تم مجھ سے زیادہ میرے خیر خواہ نہ بنو۔ہم کو مناسب نہیں کہ قرضدار کو خواہ مخواہ پریشانی میں مبتلا کریں۔'' آپ کا دل انتہائی نرم تھا اور رحمدلی مزاج کا حصہ تھی۔

اللہ کے ذکر کا کثرت سے اہتمام کرتے۔آپ کا قول ہے ''میں نے جب کوئی دنیا کی بات کی تو پہلے اللہ کی حمد وثناء کر لی۔'' آپ کا معمول تھا کہ آخرِ شب تیرہ رکعتیں نماز پڑھتے۔نماز میں مشغولیت کا عالم یہ ہوتا کہ ایک بار دوران نماز بھڑ نے آپ کو کاٹ لیا۔آپ نے اطمینان سے نماز ادا کی پھر بھڑ کو ہٹایا تو جسم پر جگہ جگہ ورم آ گیا تھا۔لوگوں نے کہا کہ آپ نماز جلد مکمل کر لیتے تو فرمایا ''میں ایک سورۃ کی تلاوت میں مشغول تھا۔جی چاہا کہ اس کو مکمل کر لوں۔''

امام بخاریؒ کا قول تھا ''انسان کو ایسی حالت میں رہنا چاہئے کہ اگر وہ دربارِ الٰہی میں سوال کرے تو اس کا سوال رد نہ کیا جائے۔'' اس پر سب سے زیادہ عمل خود آپ کا تھا۔مستجاب الدعوات تھے۔جو دعا مانگتے تھے وہ پوری ہو جاتی تھی۔امام بخاریؒ کی سیرت کے تذکرے کو ہم آپ ہی کے ایک بیان پر ختم کرتے ہیں۔فرماتے ہیں: ''میں نے دربارِ الٰہی میں دو باتوں کی درخواست کی۔خدا نے دونوں اسی وقت منظور کر لیں۔اس سے مجھے خوف ہوا کہ ایسا نہ ہو کہ میری مزدوریوں کا بدلہ یہیں مل جائے اور آخرت گھاٹے میں رہے۔اسی لئے میں نے درخواست کرنی ترک کر دی۔''

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

امام غزالیؒ

پانچویں صدی هجری کے مجدد، یونانی فلسفے اور دیگر مروّجه علوم کو دائرہ شریعت میں لانے والے عبقری

تعارف

آپ کا نام محمد، لقب حجۃُ الاسلام، کنیت ابو حامد اور عرف غزالی تھا۔ سلسلہ نسب یہ ہے: محمد بن محمد بن احمد۔ آپ کے والد کپڑا بننے والے تھے۔ غزال کے معنی کاتنے کے ہیں اور اسی مناسبت سے آپ کا خاندان غزالی کہلاتا تھا۔

ولادت

آپ خراسان کے ضلع طوس میں بمقام طاہران ۴۵۰ ہجری میں پیدا ہوئے۔

بچپن اور تعلیمی پس منظر

محمد کے والد اتفاق سے تعلیم سے محروم رہ گئے تھے۔ اس چیز کا انہیں بہت افسوس تھا۔ اپنی اولاد کی تعلیم کے لئے فکر مند تھے کہ پیغامِ اجل آ گیا۔ جب مرنے لگے تو انہوں نے آپ کو اور آپ کے چھوٹے بھائی احمد کو اپنے ایک دوست کے سپرد کیا اور کہا کہ مجھ کو نہایت افسوس ہے کہ میں پڑھنے لکھنے سے محروم رہ گیا، اس لئے میں چاہتا ہوں کہ ان دونوں لڑکوں کو تعلیم دلائی جائے تاکہ میری جہالت کا کفارہ ہو جائے۔ ان کے مرنے پر ان صاحب نے آپ کی تعلیم کا بندوبست کیا۔ ابتدائی مراحل کے بعد تعلیم کے اخراجات باقی نہ رہے۔ جو رقم آپ کے والد دے گئے تھے وہ ختم ہو چکی تھی۔ چنانچہ والد کے دوست نے آپ کو صورت حال سے آگاہ کرتے ہوئے کہا کہ تمہارے والد کا سرمایہ ختم ہو چکا اور میرے پاس کچھ مال نہیں اس لئے تم دونوں بھائی کسی مدرسے میں داخل ہو جاؤ۔ اس زمانے میں اگرچہ باقاعدہ مدارس کی تعداد کم تھی لیکن گھر گھر تعلیم دینے کے لئے مدرسے کھلے ہوئے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تھے اور وہاں ٹھہرنے والے تمام طالبعلموں کا خرچہ شہر کے امیر لوگ برداشت کیا کرتے تھے۔ چنانچہ محمد اور احمد دونوں نے ان کے حکم کی تعمیل میں درس گاہ کا رخ کیا۔

آپ نے ابتدائی تعلیم کے بعد فقہ کی کتابیں خصوصاً فقہ شافعی سے متعلق احمد بن محمد رافکانی سے پڑھیں۔ اس کے بعد مزید علم حاصل کرنے کے لئے جرجان پہنچے اور امام ابونصر اسمٰعیلی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس زمانے میں قاعدہ یہ تھا کہ استاد جو تقریر کرتا، شاگرد اسے محفوظ کرتے اور یہ سب یادداشتیں تعلیقات کہلاتیں۔ نوعمر محمد نے بھی وہ یادداشتیں محفوظ کرلیں۔ محمد غزالی معلومات کا یہ خزانہ لے کر وطن لوٹے۔ راستے میں ڈاکوؤں نے گھیر لیا اور سب سامان چھین لیا۔ آپ کی تعلیقات بھی ضبط ہوگئیں تو آپ بے چین ہو کر ڈاکوؤں کے سردار کے پاس پہنچے اور کہا ''میں اپنے سامان میں سے صرف اس مجموعے کو مانگتا ہوں کیونکہ میں نے اسی کی خاطر اتنا سفر کیا تھا۔'' ڈاکوؤں کا سردار یہ سن کر ہنس پڑا اور کہنے لگا '' تم نے کیا خاک سیکھا جب کہ تمہاری یہ حالت ہے کہ ایک کاغذ نہ رہا تو تم کورے ہوگئے''۔ یہ کہہ کر اس نے کاغذات واپس کر دیئے۔ اس بات کا ایسا اثر ہوا کہ وطن پہنچ کر زبانی حفظ کا ارادہ کیا اور تین برس لگا کر ان مسائل کو ازبر کرلیا۔

امام الحرمین کی خدمت میں

طلبِ علم اب آپ کو چین سے نہ بیٹھنے دیتی تھی اس لئے نیشاپور جانے کا ارادہ کیا۔ نیشاپور اس زمانے میں علم کا مرکز تھا اور خصوصی طور پر امام الحرمین کی وہاں موجودگی نے طالبینِ علم کی توجہ اس طرف مرکوز کر دی تھی۔ امام الحرمین نہ صرف یہ کہ بہت بڑے عالم، واعظ اور مصنف تھے بلکہ حکومت کی طرف سے تمام ممالکِ اسلامیہ کا اوقاف ان کے سپرد تھا۔ محمد غزالی نہایت انہماک سے تعلیم حاصل کرنے لگے اور جلد ہی ذہانت اور محنت کی وجہ سے نمایاں ہوگئے۔

اس زمانے میں نامور علماء کے ہاں معمول تھا کہ جب وہ درس دینے جاتے تو شاگردوں میں جو سب سے لائق ہوتا وہ باقی طالبعلموں کو دوبارہ درس دیتا تھا تاکہ سب کو وہ اچھی طرح ذہن نشین ہو جائے۔ یہ منصب بہت کم طالب علموں کو حاصل ہوتا۔ آپ کو اس کام کے لئے چنا گیا اور آپ کے استاد آپ سے اس قدر خوش ہوئے کہ وہ کہا کرتے تھے کہ غزالی دریائے ذخار ہیں۔ استاد اپنے لائق شاگرد پہ فخر کرتے کیونکہ اس کم عمری میں ہی آپ صاحبِ کتاب ہو چکے تھے۔

جب تک امام الحرمین زندہ رہے آپ ان کی خدمت میں حاضر رہے۔ ان کے انتقال کے بعد آپ نیشاپور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے روانہ ہوگئے۔ آپ کے علمی پائے کا یہ حال تھا کہ پورے عالم اسلام میں کوئی بھی آپ کا ہم سر نہ تھا اور اس وقت آپ کی عمر محض اٹھائیس برس تھی۔

نظام الملک کے دربار میں

سلطنتِ عباسیہ کی کمزوری کے ساتھ ہی مختلف مسلمان علاقوں نے خودمختاری کا اعلان کرنا شروع کر دیا۔ ۴۲۵ ہجری میں ارطغرل بیگ نے عراق پر اپنی حکومت مستحکم کی اور سلجوقی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ اس کے بیٹے الپ ارسلان اور پوتے ملک شاہ نے اس کی سلطنت کو ایسی وسعت دی کہ وہ اپنے زمانے کی بڑی سلطنتوں میں شمار کی جانے لگی۔ امن اور تہذیب وتمدن کی ترقی کے لحاظ سے یہ یادگار زمانہ تھا۔ ملک شاہ نے جو امام غزالی کا معاصر تھا اپنی سلطنت کا سارا انتظام لائق وزیر نظام الملک طوسی کے ہاتھ میں دے رکھا تھا۔

نظام الملک نے حسن تدبیر سے ملک چلانے کے علاوہ علم کے فروغ کے لئے اپنی کوششوں کی وجہ سے خوب شہرت حاصل کی۔ سینکڑوں علماء اور فضلاء اس کے دربار میں حاضر رہتے۔ امام غزالی کو اس کا علم ہوا تو درس گاہ سے نکل کر نظام کے دربار کا رخ کیا جہاں آپ کا استقبال نہایت پرجوش انداز میں کیا گیا۔

امام غزالی کی شہرتِ عامہ اور تقرر بحیثیت مدرّسِ اعظم

اس زمانے میں علمی مباحث کے لئے مناظروں کا بہت زور تھا۔ جو شخص تقریر میں غالب آ جاتا وہی ممتاز سمجھا جاتا اور اس کی فضیلت اور کمال کو تسلیم کر لیا جاتا۔ نظام الملک کے دربار میں بھی اہلِ علم کی موجودگی کی وجہ سے ہر وقت مختلف موضوعات پر جلسے، مباحثے اور مناظرے ہوتے۔ امام صاحب ان میں آگے آگے رہتے اور اپنی نمایاں قابلیت کی بناء پر سب پر حاوی نظر آتے۔ نظام الملک نے آپ کی صلاحیتوں سے بھرپور فائدہ اٹھانے کے لئے آپ کو مدرسہ نظامیہ کی صدارت کے لئے منتخب کیا۔ ۳۴ برس کی عمر میں یہ اعزاز کبھی کوئی حاصل نہ کر سکا تھا۔ مدرسہ نظامیہ کی صدارت ایک ایسا اعزاز تھا جس کے لئے اہلِ علم آرزو کیا کرتے تھے۔

بغداد کے مدرسہ نظامیہ میں جب درس کا آغاز کیا تو حسنِ تقریر اور علمیت کی وجہ سے آپ کی دھوم مچ گئی۔ عوام کے علاوہ خواص بھی شرکت کرنے لگے۔ آپ کے درس میں تین سو مدرسین اور سوا سو اُمراء اور رؤساء حاضر ہوتے تھے۔ طبقہ امراء خاص طور سے آپ کا قدردان ہو گیا۔

حکومتی حلقوں میں آپ کا کیا اثر تھا اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ آپ نے اپنے رسوخ کو استعمال کرتے ہوئے سلجوقی خاندان کی ملکہ شاہ محل ترکان کو عباسی خلیفہ کے نام کا خطبہ پڑھنے پر راضی کیا تھا۔ اس طرح

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایک بڑا فتنہ دور ہوا جس کا بنیادی سبب ملکہ کے دل میں آپ کی تعظیم کے جذبات تھے اور وہ آپ کی بات کو رد نہ کر سکی۔

عباسی خلیفہ مستنصر باللہ نے آپ سے درخواست کی کہ فرقۂ باطنیہ کے رد میں ایک کتاب لکھی جائے۔ چنانچہ اس کی فرمائش پر آپ نے جو کتاب لکھی اس کا نام خلیفہ کی نسبت سے ''مستظہری'' تھا۔

امام غزالیؒ وادیٔ تشکیک میں

اس سے قبل ذکر کیا جا چکا ہے کہ امام غزالیؒ کے زمانے میں علمیت کی ایسی قدر تھی کہ خود خلفاء، امراء اور وزراء علماء کے شاگرد ہوتے اور ان کی ایسی تعظیم کرتے کہ ان کی بات رد نہ کیا کرتے۔ جب یہ حال خواص کا تھا تو عوام ان کو کس قدر عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہوں گے۔ اس ضمن میں ایک واقعہ شبلی نعمانی نے ''الغزالی'' میں درج کیا ہے جو علامہ ابواسحق شیرازی کے بارے میں ہے۔ وہ اور امام الحرمین تمام لوگوں کے نزدیک استاد الکل تسلیم کئے جاتے تھے۔ ہوا یوں کہ علامہ ابواسحق شیرازی عباسیوں کی طرف سے سفیر ہو کر بغداد سے نیشاپور کو چلے تو جس جس شہر سے گذرتے پورا شہر ان کے استقبال کو نکلتا اور تمام دکاندار اشرفیوں کی بارش کر دیتے۔ غرض اکرام اور قدر و منزلت کا ایسا مظاہرہ ہوتا جو کسی بھی شخص کو جاہ پسندی میں مبتلا کرنے کے لئے کافی تھا۔

امام غزالی کو بھی یہ سب اچھا لگنے لگا۔ اتنی سی عمر میں یہ مقام اور ایسی شہرت، آپ کو اور کیا چاہئے تھا۔ سارا وقت علمی مشاغل میں گذرتا۔ آپ کی طبیعت میں تحقیق کا مادہ بہت تھا اور بغداد میں نیشاپور کے برعکس دنیا بھر کے عقائد اور خیالات کا دنگل تھا۔ شیعہ، سنی، معتزلی، زندیق، ملحد، مجوسی اور عیسائی نہایت آزادی سے اظہار خیال کرتے۔ امام صاحب کی طبیعت کے تجسس نے آپ کو آمادہ کیا کہ مختلف لوگوں کے خیالات اور آراء دریافت کریں۔ مختلف فرقوں سے ایک ہی موضوع پر ملنے والی مختلف آراء نے آپ کو تشکیک کی وادی میں لا کھڑا کیا۔ مختلف قسم کے شکوک وشبہات ذہن میں ابھرنے لگے۔ بچپن سے جو باتیں ذہن میں پختہ تھیں ان پر ایمان متزلزل ہونے لگا۔ فرماتے ہیں ''میں نے خیال کیا کہ عیسائی و یہودی بچے بھی اپنے عقائد پر پرورش پاتے ہیں۔ حقیقی علم تو یہ ہے کہ کسی قسم کے شبہ کا احتمال نہ رہ جائے۔''

دو ماہ تک تو یہ کیفیت رہی کہ علم کے تمام ذرائع پر شک ہونے لگا۔ حواس، عقل ہر چیز پر سے اعتبار جاتا رہا۔ طبیعت کی بے اعتدالی دور ہوئی تو مختلف علوم کا تفصیلی جائزہ لیا۔ متکلمین، باطنیہ، فلاسفہ، صوفیاء، غرض ہر فرقے کو ٹٹولا۔ حق و صداقت کی جستجو میں آپ ہر تاریک کونے میں داخل ہوئے۔ کسی فلسفی، کسی ماہر کلام، کسی صوفی، کسی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تارک الدنیا کو نہ چھوڑا، یہاں تک کہ کافروں اور زندیقوں سے بھی ان کے اعتقادات معلوم کئے، مگر تسلی نہ ہوئی۔

آگے کے حالات ہم آپ کی زبانی بیان کرتے ہیں جو آپ نے اپنی کتاب ''المنقذ فی ظلال'' میں لکھے ہیں۔ کہتے ہیں:

''مجھے معلوم ہوا کہ اصلی حقائق تک تعلیم کے ذریعے نہیں بلکہ ذوق، حال اور حالات کی تبدیلی سے پہنچا جاسکتا ہے۔ جو علوم میرا سرمایہ تھے، خواہ وہ شرعی ہوں یا عقلی، ان سے مجھے وجودِ باری تعالیٰ، ثبوت اور قیامت کے بارے میں پختہ ایمان حاصل ہو چکا تھا۔ مگر دلیل سے نہیں، قرائن اور تجربوں سے۔ مجھے یہ اچھی طرح سے واضح ہو چکا تھا کہ سعادتِ اخروی کی صورت صرف یہ ہے کہ تقویٰ اختیار کیا جائے اور نفس کو اس کی خواہشات سے روکا جائے اور اس کی تدبیر یہ ہے کہ دارِ فانی سے بے رغبتی، آخرت کی طرف میلان اختیار کر کے اور پوری یکسوئی کے ساتھ اللہ کی طرف توجہ اختیار کر کے اس طرح رہا جائے کہ دل میں دنیاوی خیالات و معاملات کا شائبہ نہ رہے، لیکن یہ جاہ و مال سے اعراض کئے بغیر ممکن نہیں ہے۔

میں نے اپنے حال پر غور کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ میں سرتاپا علائقِ دنیوی میں غرق ہوں۔ مجھے سب سے عمدہ عمل تدریس و تعلیم کا معلوم ہوتا تھا، لیکن اپنے آپ کو ٹٹولنے سے معلوم ہوا کہ میری تمام تر توجہ ان علوم پر ہے جو نہ تو اہم ہیں اور نہ آخرت کے سلسلے میں کچھ فائدہ پہنچانے والے ہیں۔ میں نے اپنی تدریس کی نیت کو دیکھا تو وہ بھی خالص لوجہ اللہ نہ تھی، بلکہ اس کا باعث بھی طلبِ شہرت تھی۔ تب مجھے یقین ہو گیا کہ میں ہلاکت کے غار کے کنارے کھڑا ہوا ہوں۔ اگر میں نے اصلاحِ حال کی کوشش نہ کی تو میرے لئے سخت خطرہ ہے۔ میں ایک عرصہ تک اس سب کو چھوڑ دینے اور بغداد سے نکل جانے کا ارادہ کرتا رہا، لیکن اس کا فیصلہ نہ کر سکا۔

چھ ماہ اسی کشمکش میں گذر گئے کہ کبھی تو دنیاوی خواہشات کشش کرتیں اور کبھی ایمان کا منادی پکارتا کہ کوچ قریب ہے، تھوڑی عمر باقی ہے، طویل سفر درپیش ہے، اور یہ سب علم و عمل محض ریا ہے۔ کبھی نفس کہتا کہ یہ عارضی حالت ہے، اللہ نے جو کچھ عزت دے رکھی ہے، چھوڑنے کے بعد اگر پھر واپس آنے کا خیال ہوا تو اس کا دوبارہ حصول مشکل ہے۔ غرض اسی میں چھ ماہ گذر گئے یہاں تک کہ معاملہ بس سے باہر ہو گیا۔ زبان بھی رک گئی جیسے اس میں تالا پڑ گیا ہو۔ میں کوشش کرتا تھا کہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آنے جانے والوں کی خوشی کے لئے ایک ہی دن پڑھاؤں، لیکن زبان بالکل ساتھ نہ دیتی تھی اور ایک لفظ بھی نہیں نکلتا تھا۔

زبان کی بندش سے قلب میں ایک رنج وغم کی کیفیت پیدا ہوئی۔ جس کے اثر سے قوتِ ہاضمہ نے بالکل جواب دے دیا۔ کھانے پینے کی خواہش بالکل جاتی رہی۔ یہاں تک کہ ایک گھونٹ پانی، کھانے کے ایک لقمے کا ہضم کرنا بھی میرے لئے دشوار ہوگیا۔ رفتہ رفتہ تمام قوائے جسمانی پر ضعف کا غلبہ ہوا۔ یہاں تک کہ اطباء نے علاج سے ہاتھ اٹھالیا اور کہا کہ قلب پر کوئی اثر ہے اور اس سے مزاج متاثر ہوگیا ہے۔ جب تک قلب سے یہ اثر نہ جائے، اس وقت تک علاج کچھ سودمند نہیں۔ جو میں نے دیکھا کہ میں اس معاملے میں بالکل بے بس ہوں تو میں نے اللہ کی طرف رجوع کیا اور اضطراری کیفیت کے ساتھ اس سے دعا کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس جاہ و مال اور اہل و عیال کو چھوڑ دینا مجھے آسان معلوم ہونے لگا۔ میں نے مکہ کا ارادہ ظاہر کیا اور میرے دل میں یہ تھا کہ میں شام جاؤں گا اور بڑی حیل وحجت کے بعد بغداد سے نکلنے کا سامان کیا۔

اہلِ عراق کو جب میرے ارادے کی خبر ہوئی تو انہوں نے چاروں طرف سے مجھے ملامت کرنی شروع کی، اس لئے کہ کسی کے خیال میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ اس ترک کا کوئی دینی سبب بھی ہوسکتا تھا۔ اس لئے کہ ان کے خیال میں مجھے دین کا بلندترین منصب حاصل تھا۔ پھر لوگوں نے طرح طرح کی قیاس آرائیاں شروع کیں۔ جو مرکزِ حکومت سے دور تھے، انہوں نے خیال کیا کہ اعلیٰ حکام کے اشارے کی وجہ سے یہ خدمت ترک کی جارہی ہے۔ لیکن جن لوگوں کا حکومتی حلقوں سے تعلق تھا، وہ دیکھتے تھے کہ اہلِ حکومت کو کس قدر میرے قیام پر اصرار ہے اور ان کی کیسی شدید خواہش ہے کہ میں اپنے کام میں مشغول رہوں۔ وہ یہ کہتے تھے کہ اس کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ اسلام کی اس رونق اور علمی چہل پہل کو کسی کی نظر لگ گئی ہے کہ یہ شخص سب چھوڑ چھاڑ کر جارہا ہے۔ غرض میں نے بغداد کو الوداع کہا اور جو کچھ میرے پاس مال و متاع تھا، اس میں سے بقدرِ ضرورت رکھ کر باقی سب بانٹ دیا''۔

اس کے بعد امام صاحب دنیا تج کر کے نکل کھڑے ہوئے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

امام غزالیؒ کے دور کے حالات

قبل اس کے کہ امام صاحب کی زندگی کے مزید حالات بیان کئے جائیں اور آپ کے کارناموں کا تذکرہ کیا جائے، اس زمانے کے حالات پر روشنی ڈالنا ضروری ہے۔

امام غزالی کا دور فلسفے اور تعقل پرستی کا دور تھا۔ یونانی فلسفیوں کی کتابوں کا عباسی خلفاء (خصوصاً مامون) کی دلچسپی کی وجہ سے عربی زبان میں ترجمہ کیا جارہا تھا۔ ان میں ہر طرح کی کتابیں تھیں۔ ریاضی، منطق اور طبیعات کے علاوہ دنیا بھر کے موضوعات پر یونانیوں کے کام سے مسلمان ذہن متاثر ہونے لگے۔ ان سے استفادے میں کوئی حرج نہ تھا، مگر فلسفے کی کتابوں میں اٹھائے جانے والے سوالات اور ان کے جوابات جو یونانی مصنفین نے دیئے تھے ان سے مسلمانوں کی سوچ وفکر کا طرز بدلنے لگا۔ ہر ذہین و متجسس نوجوان نے ان بنیادی سوالات پر اسی طرز سے سوچنا شروع کیا، جس طرح یونانی فلسفیوں نے سوچا تھا۔

دنیا کیا ہے؟ انسان اور کائنات کا تعلق کیا ہے؟ کائنات اور خدا کا باہم تعلق کیا ہے؟ خدا کی خصوصیات کیا ہیں؟ یہ اور اس طرح کے دوسرے سوالات کے جوابات سے قرآن کریم بھرا پڑا ہے، لیکن وہ اب مسلمانوں کے لئے کافی نہ رہے۔ قرآن کریم جس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کی معرفت، نوعِ انسانی اور کائنات کی ابتداء اور انتہاء اور آغاز و انجام کا یقینی علم بخشا تھا، اس کے بجائے اب یونانی فلسفیوں کی ہوائی باتوں، گمان اور اندازوں پر مبنی نظریات اور دیومالائی مفروضات نے انہیں اس طرح متوجہ کیا کہ انہوں نے منطق، طبیعات اور ریاضیات کی طرح اس علم کو بھی ہاتھوں ہاتھ لیا۔ یہ ایسا خطرناک رجحان تھا جس سے کوئی چیز بھی محفوظ نہ رہی۔ دینی اصطلاحات کو نئے نئے معنی پہنائے جارہے تھے۔ آیاتِ قرآنی کی تعبیریں سلف کے طریقے کے برعکس عقل کے پیمانے پر کی جانے لگیں۔

اس وقت روئے زمین پر مسلمان وہ واحد قوم تھی جو علوم وفنون کی دلدادہ تھی۔ تحقیق وجستجو ان کے مزاج کا حصہ بن چکی تھی۔ تسخیرِ کائنات کا شوق انہیں آرام سے نہ بیٹھنے دیتا، وہ علم کو ہر جگہ سے اور ہر وقت حاصل کرنے کے لئے تیار رہتے۔ اسی قابلِ قدر جذبے کے تحت انہوں نے یونانیوں کے علم کو بھی حاصل کرنا چاہا۔ لیکن وہ یہ بھول گئے کہ تمام علوم کو کتاب اللہ اور سنتِ رسول کی کسوٹی پر پرکھے بغیر بعینہ قبول کرنا کس قدر خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔ انسانی فطرت عموماً انتہاؤں پر رہنا پسند کرتی ہے۔ کہاں تو اس دور کے مسلمان جو علوم کے ایسے شائق تھے کہ ان کی تحصیل میں وہ غلط اور صحیح کی تمیز نہ کرسکے اور کہاں آج کا مسلمان جو جدید علوم سے اتنا بے بہرہ ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فلسفۂ یونان کو مسلمانوں کے ذہین ترین افراد نے پسند کیا۔ یعقوب کندی، ابوالنصر فارابی اور بوعلی سینا جیسے لوگوں کی صلاحیتیں اس فلسفے کی جزئیات اور تفصیلات کو سمجھنے اور سمجھانے میں لگیں۔ ارسطو کے اقوال، اس کی شخصیت اور اس کے افکار نے مسلمان معاشرے پر ایسا سحر طاری کیا کہ گویا وہ (معاذ اللہ) پیغمبری کے مرتبے پر فائز تھا۔

ان حالات میں چوتھی صدی کے وسط میں ''اخوان الصفاء'' کے نام سے فری میسن کے طرز پر ایک خفیہ انجمن بغداد میں قائم ہوئی۔ جس میں فلسفۂ یونان کو معیار قرار دے کر دینی مباحث اور عقائد پر گفتگو ہوتی تھی اور مسائل کو طے کیا جاتا تھا۔ ابوالحسن علی ندویؒ اپنی کتاب ''تاریخ دعوت وعزیمت'' میں اس انجمن کا منشور بیان کرتے ہیں۔ ''اسلامی شریعت جہالتوں اور گمراہیوں کی آمیزش سے گندی ہوگئی ہے۔ اس کو صرف فلسفے کے ذریعے سے دھویا اور پاک کیا جاسکتا ہے۔ اس لئے کہ فلسفہ اعتقادی علوم وحکمت اور اجتہادی مصلحتوں پر حاوی ہے۔ اب صرف فلسفۂ یونان وشریعت محمدی ﷺ کے امتزاج سے کمال مطلوب حاصل ہوسکتا ہے''۔

اس تحریک نے نوجوانوں کو خاص طور سے ٹارگٹ کیا کیونکہ ناپختہ ذہن نئی چیز کو قبول کرنے کی صلاحیت زیادہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے اپنے لٹریچر کو ہر طرف پھیلا دیا اور معتزلہ جو عقلیات کے سب سے بڑے علمبردار تھے، انہوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔

یہاں یہ بتانا مناسب ہوگا کہ معتزلہ نے اگرچہ دین کی بنیادی تعلیمات کو عقل سے ثابت کرنا چاہا تھا مگر ان کی جرأت یہاں تک نہ پہنچی تھی کہ وہ وحی، رسول، کتابوں اور اس سے بڑھ کر اللہ کی ذات پر بھی شک وشبے کا اظہار کرتے۔ لیکن اہلِ فلسفہ تو جن بھول بھلیوں میں بھٹک گئے تھے ان کا کوئی سرا نہ تھا:

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں
ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں

فلسفے کے اصول دین کے اصولوں سے بالکل متصادم تھے۔ دین میں بات کو جتنا سہل اور آسان بنا کر پیش کرنے کی ہدایت ہے، فلسفی حضرات اس کے برعکس ایسا پیچیدہ انداز اختیار کرتے جو عام عوام کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ البتہ وہ ان کے رعب میں ضرور آجاتے۔

دینِ اسلام کا بنیادی نکتہ انسان کی ہدایت ہے اور اس کے زیادہ تر مباحث اسی کے گرد گھومتے ہیں۔ جبکہ فلسفے کے تحت بعض اوقات ایسے لایعنی اور غیر ضروری سوالات کا جواب دینے کی کوشش کی جاتی ہے جن کا انسانی زندگی سے کوئی عملی تعلق نہیں ہوتا۔ ان سب سے بڑھ کر جو بنیادی فرق قرآن اور فلسفے کے درمیان ہے وہ علمِ یقینی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اورعلمِ غیریقینی کا فرق ہے۔قرآن کریم کی افتتاحیہ سورۃ فاتحہ کے بعد سورۃ البقرہ میں آغاز ان آیات سے ہوتا ہے: الٓـــم ۔ یہ کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں، ہدایت ہے متقین کے لئے''۔یعنی شک وشبہے میں پڑ جانے والوں کو اس سے ہدایت نہیں مل سکتی۔

فلسفہ کچھ بنیادی سوالات اٹھاتا ہے جن کے جوابات پر انسانی زندگی کی تعمیر منحصر ہے۔جس ہستی نے انسان کو پیدا کیا اس کی شانِ خلاقی وربوبیت کا تقاضہ ہے کہ ان بنیادی سوالات کے شافی جوابات مہیا کرے تاکہ اخروی جواب دہی کے تقاضے پورے ہوسکیں۔ یہ کام اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے ذریعے پورا فرمایا اور انسان کو ان چیزوں کے بارے میں یقینی علم عطا کیا جن کو فلسفہ اور عقل، گمان اور اٹکل پچو کے ذریعے حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔یقینی علم جس کا ماخذ خودربِ کائنات ہو، عقل پر یقیناً فوقیت رکھتا ہے۔مگر فلسفے کی اندھی تقلید نے دین کی وقعت اور انبیاء کی عظمت کو کم کر دیا۔عقائد اور اخلاق پر ان سب باتوں کا بہت اثر ہوا۔مسلمانوں میں ایک گروہ ایسا پیدا ہوا جو دین کی تحقیر کرتا اور اسلام سے فخریہ لاتعلقی کا اظہار کرتا غرض سوائے نام کے اسلامی اثر ان میں ختم ہو چکا تھا۔

فرقۂ باطنیہ کا ظہور

یونانی فلسفے کے عام رواج نے مسلمانوں کا مزاج اس طرح کا بنا دیا تھا کہ وہ نئی نئی اصطلاحات کو قبول کرنے اور اپنانے میں دیر نہ لگاتے تھے۔ چنانچہ اس ماحول کو مدنظر رکھتے ہوئے اسلام کے خلاف ایک سنگین سازش ہوئی جس کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ اسلامی تعلیمات کی بنیادوں پر حملہ کرکے مسلمانوں کو ان کے دین واخلاقیات سے دور کر دیا جائے تاکہ ان کی اجتماعیت پر ایسی ضرب لگے کہ جو برتری انہیں اقوام عالم پر حاصل ہے، وہ ان سے چھن جائے۔اس کی ابتداء کرنے والے وہ لوگ تھے جو اسلام کے مقابلے میں اپنی سلطنتیں کھو چکے تھے اور وقتی مصلحتوں کے تحت اسلام اختیار کئے بیٹھے تھے۔ان کا ساتھ دینے کے لئے وہ لوگ بھی موجود تھے جو اسلام کی اخلاقی قیود کو بے جا پابندیاں سمجھتے تھے۔ان کی لذت پسند طبیعتیں اپنے لئے ایسا اسلام پسند کرتی تھیں جو ان کی پسند اور ناپسند کو مدِ نظر رکھے۔اس پر مستزاد یہ کہ رافضی بھی اس نئی چھتری کے نیچے پناہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔

ان لوگوں نے اسلامی تعلیمات میں نقب لگانے کے لئے سب سے پہلے سارا زور اس نظریئے کی ترویج میں صرف کیا کہ جس طرح ہر لفظ کے کچھ ظاہری اور کچھ باطنی یا حقیقی معنی ہوتے ہیں، اسی طرح قرآن وحدیث کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کچھ ظاہری معنی ہیں اور کچھ حقیقی معنی ہیں۔صرف اہلِ عقل حضرات ہی جانتے ہیں کہ ان کے حقیقی معنی کیا ہیں۔ باقی جو لوگ ان کے ظاہری معنوں پر جاتے ہیں وہ کم عقل ہیں اور اسی لئے انہوں نے شریعت کی پابندیوں میں اپنے آپ کو جکڑ رکھا ہے۔ اگر ان اصطلاحات کی تشریح کا معاملہ عقلاء پر چھوڑ دیا جائے تو انسان بہت سے بوجھوں سے آزاد ہو سکتا ہے۔

غرض باطنیوں نے نبوت، رسالت، ملائکہ، معاد، آخرت، شریعت، فرض، حلال، حرام، صلوٰۃ، زکوٰۃ، روزہ، حج کے مطالب اور تشریحات من مانے طور پر کرنا شروع کر دیں۔ ان بنیادی اصطلاحوں پر اول روز سے مسلمانوں کے درمیان کوئی اختلاف نہ تھا، مگر باطنیوں نے اس نکتہ کو سمجھا کہ الفاظ و معانی کا یہ رشتہ امت کی پوری زندگی اور اسلام کے فکری و عملی نظام کی بنیاد ہے۔ اگر بنیاد کو کمزور کر دیا جائے تو پوری عمارت خود بخود گر جائے گی۔

دینِ اسلام میں ان من مانی تشریحات کی گنجائش نہیں ہے۔ اس لئے کہ اگر ہر شخص اپنے آپ کو صاحبِ عقل سمجھ کر دین کی خود ساختہ تشریحات کرنے لگ جائے تو دین مختلف لوگوں کی خواہشات، مجبوریوں، مصلحتوں اور آوارہ خیالیوں کا ملغوبہ بن جائے گا اور خدا کے آخری کلام کی معنوی تحریف کی جا سکے گی۔

یہاں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ باطنیوں نے محض اسلامی فکر پر ہی اثر انداز ہونے کی کوشش نہیں کی بلکہ ان کے سیاسی عزائم بھی تھے، جن کی تکمیل کے لئے وہ بڑے بڑے نامور لوگوں کو بالخصوص نشانہ بناتے تھے۔ طاقتور اسلامی حکومتیں ان سے بری طرح زچ تھیں۔ عالمِ اسلام کی لائق اور مفید ترین ہستیاں ان کا شکار ہوئیں۔ جن میں نظام الملک طوسی اور فخر الملک بھی شامل ہیں۔ عرصے تک کسی بڑے عالم اور مسلمان بادشاہ کو اس کا اطمینان نہیں تھا کہ وہ صبح صحیح سلامت اٹھے گا یا کسی باطنی کا شکار ہو جائے گا۔

غرض دینِ اسلام پر ایسی افتاد آ پڑی تھی جس سے کوئی طبقہ محفوظ نہ تھا۔ کچھ لوگ تو خود اس رَو میں بہہ رہے تھے اور کچھ تماشہ دیکھ رہے تھے۔ جو سمجھدار تھے وہ حالات کی سنگینی کو محسوس کر رہے تھے، مگر اپنی بے بسی سے مجبور ہو کر مسجدوں، مدرسوں اور خانقاہوں میں پناہ لئے ہوئے تھے۔

ترکِ وطن

قرآن مجید کی تعلیمات سے معلوم ہوتا ہے کہ نجات صرف انہی لوگوں کی ہوگی جو آگے بڑھ کر برائی کو روکنے والے ہوں گے، جیسا کہ اصحابِ سبت کے واقعے سے معلوم ہوتا ہے۔ برائی میں سرگرمی دکھانے والے،

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ان کی ہمت افزائی کرنے والے یا خاموش تماشائی جوان حالات پر مطمئن ہوں سب تباہ ہونے والے ہیں۔

امام غزالیؒ اسی ماحول میں پروان چڑھے اور رائج الوقت علوم پر نہ صرف بھرپور عبور حاصل کیا بلکہ اپنے وقت کے سب سے بڑے عالم قرار پائے۔ شب و روز علمی مشاغل میں گھرے رہنے کے بعد آپ نے یہ محسوس کیا کہ آپ اصل حقیقت یعنی معرفتِ ربانی سے ناآشنا ہیں۔ فقہاء کی بحثوں اور مجتہدین کے مناظروں نے علوم کے کھوکھلے پن کو آپ پر آشکار کر دیا۔ آپ تشکیک کی ایسی وادی میں کھو گئے جہاں سے نکلنے کا کوئی صحیح راستہ سمجھ میں نہ آتا تھا۔

چنانچہ سب کچھ ترک کر کے شام کا رخ کیا۔ وہاں خلوت، مجاہدے، نفس کے تزکیے اور ذکر اللہ کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔ مدت تک دمشق کی جامع مسجد میں معتکف رہے۔ آپ مسجد کے منارے پر چڑھ جاتے اور تمام دن دروازہ بند کئے رہتے۔ وہاں سے بیت المقدس کا رخ کیا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قبر اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مہد پر حاضری دی۔ وہاں آپ پر عجیب کیفیت طاری ہوگئی۔ معرفتِ حق کی تلاش کبھی آپ کو مختلف اصحابِ بصیرت کے پاس لے جاتی تو کبھی ویرانوں اور بیابانوں میں نکل جاتے اور فکر و مراقبہ کے ذریعے باطن کی اصلاح کی طرف متوجہ رہتے۔ اسی حال میں تھے کہ ایک شخص نے آپ کو بیابان میں دیکھا، اس وقت ایک خرقہ بدن پر تھا اور ہاتھ میں پانی کی چھاگل تھی۔ وہ آپ کو چار سو شاگردوں کے حلقے میں دیکھ چکا تھا، اس لئے حیرت زدہ رہ گیا۔ لیکن امام غزالی کو اس بات کی کوئی پرواہ نہ تھی کہ آپ خلق کی نگاہ میں کیسے نظر آتے ہیں:

کیا حسن نے سمجھا ہے، کیا عشق نے جانا ہے
ہم خاک نشینوں کی ٹھوکر میں زمانہ ہے

پھر حجاز کی محبت اور حج و عمرے کا شوق مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ لے گیا۔ اس کے بعد امام صاحب اپنے وطن واپس لوٹے۔ لکھتے ہیں:

"حج کرنے کے بعد اہل و عیال کی کشش اور بچوں کی دعاؤں نے مجھے وطن پہنچا دیا۔ حالانکہ میں وطن کے نام سے کوسوں دور بھاگتا تھا اور وہاں بھی میں نے تنہائی کا اہتمام رکھا اور قلب کی صفائی سے غافل نہیں ہوا۔ لیکن حوادث و واقعات، اہل و عیال کے افکار اور معاشی ضرورتیں طبیعت میں انتشار پیدا کرتی رہیں اور دلجمعی اور سکونِ قلب مسلسل نہیں رہتا تھا۔ لیکن میں اس سے مایوس نہیں ہوتا تھا اور وقتاً فوقتاً اس سے لذت یاب ہوتا رہتا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تھا۔ دس برس اس حالت میں گذر گئے۔ ان تنہائیوں میں مجھے جو انکشافات ہوئے اور جو کچھ مجھے حاصل ہوا اس کی تفصیل اور اس کا استقصاء تو ممکن نہیں لیکن ناظرین کے نفع کے لئے اتنا ضرور کہوں گا کہ مجھے یقینی طور پر معلوم ہوگیا کہ صوفیاء ہی اللہ کے راستے کے سالک ہیں۔ ان کی سیرت بہترین سیرت، ان کا طریق سب سے زیادہ مستقیم، ان کے اخلاق سب سے زیادہ تربیت یافتہ اور صحیح ہیں۔ اگر عقلاء کی عقل، حکماء کی حکمت اور شریعت کے رمز شناسوں کا علم مل کر بھی ان کی سیرت و اخلاق سے بہتر لانا چاہے تو ممکن نہیں۔ ان کے تمام ظاہری و باطنی حرکات و سکنات مشکوٰۃ نبوت سے ماخوذ ہیں اور نورِ نبوت سے بڑھ کر روئے زمین پر کوئی نور نہیں، جس سے روشنی حاصل کی جائے۔''

ترکِ عزلت

غرض مجاہدے اور قلب کی ریاضت کے ساتھ ساتھ خاص رحمتِ الٰہی کے سبب تمام حجاب اٹھ گئے۔ شکوک و شبہات جاتے رہے۔ باطن روشن ہوا تو اس روشنی میں تمام علوم کی حقیقت و حیثیت صاف نظر آنے لگی۔ مسلمانوں کے ہر طبقے کی فکری و عملی خرابیوں اور گمراہیوں کا ادراک ہونے لگا۔ ان خرابیوں اور کمزوریوں کے حقیقی اسباب اور ان کے سدِ باب کے ذرائع اس طرح واضح ہو کر سامنے آنے لگے کہ خیال آیا کہ امت محمدی ﷺ کو اہلِ فلاسفہ کے شبہات، اہلِ تصوف کی گمراہیوں اور علماء کی بے عملی سے نکالنے کا کام سرانجام دینا چاہئے۔ اس وقت کیا خیالات آپ کے ذہن میں گردش کر رہے تھے، ان کا تذکرہ آپ نے ان الفاظ میں کیا ہے:

''یہ دیکھ کر میرے دل میں شدت سے یہ خیال پیدا ہوا کہ مجھے یہی کام کرنا چاہئے اور یہی وقت کا فریضہ ہے۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ تجھے یہ خلوت و عزلت کب جائز ہے۔ مرض پھیل گیا ہے اور طبیب خود بیمار ہیں۔ اللہ کی مخلوق ہلاکت کے کنارے پہنچ گئی ہے۔ پھر میں نے کہا کہ یہ عظیم الشان کام تم سے کیسے انجام پا سکے گا۔ عہدِ نبوت سے بہت بُعد ہوگیا ہے۔ باطل کا ہر طرف دور دورہ ہے۔ اگر تم نے خلقِ خدا کو ان کی محبوب و مانوس چیزوں سے ہٹانے کی کوشش کی تو سارا زمانہ تمہارا مخالف ہو جائے گا۔ تم تنہا کیسے ان کا مقابلہ کر سکو گے اور کیسے زندگی بسر کرو گے۔ یہ تو جب ممکن تھا کہ زمانہ مساعد ہوتا اور سلطانِ وقت دیندار اور صاحبِ اقتدار ہوتا۔ میں نے یہ کہہ کر اپنے دل کو سمجھا لیا اور اپنے لئے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عزلت وخلوت کی زندگی کو جائز قرار دے دیا۔لیکن اللہ تعالیٰ کو کچھ اور منظور تھا۔اس نے سلطانِ وقت کے دل میں خود ہی یہ بات ڈال دی اور ان فتنوں کا مقابلہ کرنے کے لئے اس نے مجھے نیشاپور پہنچنے کا تاکیدی حکم دیا۔یہ حکمِ سلطانی کچھ اس نوعیت کا تھا کہ مجھے محسوس ہوا کہ اگر میں نے اس کی تعمیل نہ کی تو ناراضی تک نوبت آ پہنچے گی۔میں نے خیال کیا کہ اب میرے لئے عذر باقی نہیں رہا۔اب میری گوشہ پسندی اور خلوت پسندی محض سستی اور راحت طلبی اور تن آسانی کے لئے اور آزمائش اور تکالیف سے گریز کے سواء کچھ نہیں ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:''کیا لوگوں نے سمجھ رکھا ہے کہ وہ چھوڑ دیئے جائیں گے کہ انہوں نے کہا ہم ایمان لائے اور وہ آزمائے نہ جائیں گے؟ حالانکہ ہم ان سب لوگوں کی آزمائش کر چکے ہیں جو ان سے پہلے گذرے ہیں۔اللہ کو تو ضرور یہ دیکھنا ہے کہ سچے کون ہیں اور جھوٹے کون''۔

رسول کریم ﷺ سے جو اس کے بندوں میں سب سے معزز ومکرم تھے، اس کا ارشاد ہے:
''تم سے پہلے بھی بہت سے رسول جھٹلائے جا چکے ہیں، مگر اس تکذیب پر اور ان اذیتوں پر جو انہیں پہنچائی گئیں، انہوں نے صبر کیا، یہاں تک کہ انہیں ہماری مدد پہنچ گئی۔اللہ کی باتوں کو بدلنے کی طاقت کسی میں نہیں ہے، اور پچھلے رسولوں کے ساتھ جو کچھ پیش آیا اس کی خبریں تمہیں پہنچ ہی چکی ہیں''۔

میں نے چند اہلِ دل اور اہلِ مشاہدہ حضرات سے بھی اس بارے میں مشورہ کیا۔ انہوں نے بھی بالاتفاق مجھے ترکِ عزلت کا مشورہ دیا۔اس کی تائید میں بہت سے صلحاء نے متواتر خواب بھی دیکھے۔جن سے پتہ چلتا ہے کہ میرا یہ اقدام بڑی خیر و برکت کا باعث ہوگا اور پانچویں صدی کے شروع میں جس میں ایک ہی مہینہ باقی تھا، کوئی شاید عظیم الشان تجدیدی کام ہوگا، اس لئے کہ حدیث میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر صدی کے سرے پر ایسے آدمی کو پیدا کرتا ہے جو اس امت کے دین کو تازہ کر دیتا ہے۔ان آثار وقرائن سے مجھے بھی اس کی امید پیدا ہوئی اور میں نے اس کارِ عظیم کا ارادہ کر لیا۔

یہ ۴۹۹ ہجری کا ماہ ذیقعدہ کا قصہ ہے۔بغداد سے ۴۸۶ ہجری میں نکلا تھا۔اس طرح سے میری گوشہ نشینی کی مدت گیارہ سال ہوتی ہے۔یہ سب تقدیرِ الٰہی کی کارفرمائی تھی۔جس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

طرح بغداد سے نکلنا اور وہاں کے جاہ اور اعزاز کو خیر باد کہنا تصور میں نہیں آتا تھا، لیکن اللہ کے حکم سے وہ سب آسان ہو گیا۔ اسی طرح سے اس عزلت کے زمانے میں خلوت سے جلوت کی طرف دوبارہ آنے کا خیال بھی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لیکن وقت پر اس کا سامان بھی ہو گیا۔''

اس کے بعد امام صاحب دوبارہ مدرسہ نظامیہ کی درس وارشاد کی مسند پر جا بیٹھے۔ اب دل کی کیفیات کیا تھیں اس کو خود امام صاحب کی زبانی سننا چاہئے۔ اس میں ہر داعی، واعظ اور مبلغِ اسلام کے لئے ایسا سبق ہے جو اسے ہمیشہ یاد رکھنا چاہئے۔ لکھتے ہیں:

''مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اگرچہ علم کی نشر واشاعت کی طرف میں نے پھر رجوع کیا ہے، لیکن درحقیقت اس کو پہلی حالت کی طرف بازگشت کہنا صحیح نہیں ہے۔ میری اس سے پہلی اور دوسری حالت میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ میں پہلے اس علم کی اشاعت کرتا تھا جو حصولِ جاہ کا ذریعہ ہے اور میں اپنے قول وعمل سے اسی کی دعوت دیتا تھا اور یہی میرا مقصود ونیت تھی، لیکن اب میں اس علم کی دعوت دیتا ہوں جس میں جاہ سے دستبردار ہونا پڑتا ہے۔ اب میں اپنی اور دوسرے کی اصلاح چاہتا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں اپنے مقصد تک پہنچوں گا یا اس سے پہلے میرا کام تمام ہو جائے گا۔ لیکن اپنے یقین ومشاہدے کی بناء پر میرا ایمان ہے کہ اصل طاقت اللہ کی طاقت ہے۔ اسی سے آدمی گمراہی اور شر سے بچ سکتا ہے اور ہدایت و طاعت حاصل کر سکتا ہے۔ دراصل میں نے اپنی طرف سے حرکت نہیں کی، اللہ مجھے حرکت میں لایا ہے۔ میں نے خود کام شروع نہیں کیا ہے، اللہ نے مجھے کام میں لگایا ہے۔ میری دعا ہے کہ پہلے اللہ میری اصلاح فرمائے، پھر مجھ سے دوسروں کی اصلاح ہو۔ پہلے مجھے راہ پر لگائے، پھر مجھ سے دوسروں کی رہنمائی فرمائے۔ حق مجھ پر منکشف ہو جائے اور اس کے فضل سے مجھے اتباع کی توفیق ہو۔ باطل مجھ پر واضح کر دے اور مجھے اس کی پیروی سے بچائے''۔

امام صاحب کا تجدیدی کارنامہ

امام صاحب نے اصلاح کی کوششوں کا آغاز زبان وقلم سے جہاد کی صورت میں کیا۔ امام صاحب نے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فلسفۂ الحاد اور باطنیت کو نشانہ بنایا، مگر اس کو رد کرنے سے پہلے یونانیوں کے اصول کے مطابق فنونِ فلسفہ پر کتابیں لکھیں۔ اس سے آپ شاید یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ آپ کو اس فن میں پورا کمال حاصل ہے۔ ''مقاصد الفلاسفہ'' کے نام سے جو کتاب تحریر کی، اس میں آسان زبان میں فلسفے کے مختلف نظریات کا احاطہ کیا۔ اس کتاب کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں آپ نے دقیق سے دقیق مسئلے کو اس طرح بیان کیا ہے کہ ہر عام و خاص اس کو سمجھ سکے۔ اس کوشش نے فلسفے کو آدمی کی پہنچ میں کر دیا، اور اس کا غیر ضروری رعب جو عوام پر طاری تھا اس کا اثر کم کر دیا۔

اس کتاب کا فائدہ یہ ہوا کہ لوگوں پر فلسفے کے نظریات کھل کر واضح ہو گئے۔ اب ضرورت اس امر کی تھی کہ ان نظریات کا ابطال کیا جائے۔ چنانچہ کہتے ہیں ''ہمارے زمانے میں ایسے لوگ پیدا ہو گئے، جن کو یہ زعم تھا کہ ان کا دل و دماغ عام آدمیوں سے ممتاز ہے۔ یہ لوگ مذہبی احکام اور قیود کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ان کا خیال ہے کہ حکمائے قدیم مثلاً افلاطون، ارسطو وغیرہ مذہب کو لغو سمجھتے تھے اور چونکہ یہ حکماء تمام علوم و فنون کے بانی اور موجد تھے اور عقل و ذہن میں ان کا کوئی ہمسر نہیں ہوا، اس لئے ان کا انکارِ مذہب اس بات کی بین دلیل ہے کہ مذہب حقیقت میں لغو اور باطل ہے اور اس کے اصول و قواعد فرضی اور مصنوعی ہیں جو صرف ظاہر میں خوشنما اور دلفریب ہیں۔ اس بناء پر میں نے ارادہ کیا کہ ان حکماء نے الٰہیات پر جو کچھ لکھا ہے، ان کی غلطیاں دکھاؤں اور یہ ثابت کروں کہ ان کے مسائل اور اصول بازیچۂ اطفال ہیں اور ان کے بہت سے اقوال و نظریات حد درجہ مضحکہ خیز بلکہ عبرت انگیز ہیں۔''

ان اسباب کو سامنے رکھتے ہوئے آپ نے اپنی معرکتہ الآراء کتاب ''تہافت الفلاسفہ'' لکھی۔ اس میں آپ نے فلسفیانہ نظریات کی چیر پھاڑ کی اور ان کی خامیوں پر اسلامی نقطہ نظر سے تنقید اس شان سے کی کہ فلسفۂ یونان کا رعب و طلسم ٹوٹ گیا۔ مدافعانہ انداز کے بجائے جارحانہ انداز اختیار کیا اور مرعوب ہونے کے بجائے آگے بڑھ کر ان باطل نظریات کو رد کیا، جن کا نہ سر تھا نہ پیر۔ ایک جگہ لکھتے ہیں: ''مجھے حیرت ہے کہ دیوانہ آدمی بھی ان خود ساختہ باتوں پر کیسے قانع ہو سکتا ہے، چہ جائیکہ وہ عقلاء جو بزعمِ خود معقولات میں بال کی کھال نکالتے ہیں۔''

یہی وہ چیز تھی جس کی عالمِ اسلام کو شدید ضرورت تھی۔ اب تک فلسفے کے مقابلے میں مسلمانوں کی طرف سے جو بھی کوشش کی گئی، اس کا لہجہ معذرت خواہانہ اور مدافعانہ تھا۔ آپ نے اپنی کتاب میں جو زبان استعمال کی وہ انتہائی پر اعتماد، پر یقین اور مساویانہ طرز پر تھی۔ اس کتاب کا اثر ایک طرف تو یہ ہوا کہ فلسفے کے حلقوں میں غم

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وغصہ دوڑ گیا تو دوسری طرف عوام کی صحیح بات کی طرف راہنمائی ہوئی۔

اہلِ فلاسفہ سے ٹکر لینے کے ساتھ ساتھ امام صاحب باطنیوں کی طرف بھی متوجہ ہوئے، جنہوں نے فلسفے کے طرز پر نئی اصطلاحات وضع کر کے مسلمانوں کی فکری بنیادوں کو کمزور کرنے کی مذموم کوشش کے علاوہ اسلامی اخلاقیات کا تارو پود بکھیرنے کا سامان پیدا کر رکھا تھا۔ مسلم معاشرہ کچھ ان کے زیر اثر اور کچھ مختلف طبقات کے اندر پھیلی ہوئی اخلاقی کمزوریوں کے سبب انحطاط کا شکار تھا۔

دورانِ خلوت جب آپ بظاہر تمام عالم سے کٹ چکے تھے اور مجاہدات میں مصروف تھے، تب بھی دل بار بار عوام کی حالت دیکھ کر بے قرار ہو جاتا تھا۔ امیر و غریب، عام و خاص، عالم و جاہل، رند و زاہد...... سب کے اخلاق تباہ ہو چکے تھے۔ علماء جو دلیلِ راہ بن سکتے تھے، طلبِ جاہ میں مصروف تھے۔ اس وقت ایک خاص کیفیت میں اپنی معرکۃ الآراء کتاب ''احیاء علوم الدین'' تحریر کی۔

احیاء علوم الدین۔ اصلاح، تزکیے اور احتساب پر بہترین کتاب

امام صاحب کی کتاب ''احیاء علوم الدین'' انسانی اصلاح و تربیت اور معاشرے کے مختلف طبقات پر تنقید و احتساب کے ساتھ ساتھ اخلاقی مواعظ پر مشتمل ایسی بہترین کتاب ہے جو صدیوں میں لکھی جاتی ہے۔ اپنے اثرات کی ہمہ گیری کی وجہ سے تاریخ اسلام میں آج تک لکھی گئی مشہور ترین کتابوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔

کتاب میں جہاں حقائق و معارف کا سیلاب امڈا ہوا نظر آتا ہے، وہیں احکامِ دین کی مصلحتیں انتہائی عمدگی سے بیان کی گئی ہیں۔ اس سے قبل اتنے مفصل انداز میں یہ کام نہیں کیا گیا تھا۔ اس کتاب کی ایک اور خاصیت جس میں یہ انوکھی ہے وہ ہے مختلف سعادتوں کے حصول کے لئے مددگار اصول یا tips اور مختلف برائیوں سے بچنے کے لئے کیا کیا چیزیں مددگار ثابت ہوتی ہیں، ان کا بیان۔ امام صاحب نے کوشش کی ہے کہ یہ کتاب ایک طالبِ حق کے لئے اپنی اصلاح و تربیت اور دوسروں کی تعلیم و تبلیغ کے لئے کافی ہو سکے۔ اس کے لئے انہوں نے قرآنی آیات اور احادیث نیز اقوالِ صحابہ کا بھی جگہ جگہ حوالہ دیا ہے۔

احیاء العلوم اسلامی فلسفۂ اخلاق پر بہترین کتاب ہے۔ روحانی و قلبی بیماریوں، انسانی نفسیات اور جبلی تقاضوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے دینِ اسلام پر چلنا کس طرح یقینی بنایا جا سکتا ہے، اس کا بیان نہایت عمدہ ہے آپ جب ایک موضوع کو لیتے ہیں تو اس کا ہر طرح سے احاطہ کرتے ہیں۔ مثلاً غیبت کے موضوع پر لکھتے وقت امام صاحب بتاتے ہیں کہ غیبت کیا ہے، اس کی وجوہات، اسباب اور اثرات کیا ہوتے ہیں، اس سے بچنے کے لئے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کیا تدابیر اختیار کی جاسکتی ہیں، اس پر قرآنی آیات و احادیث سے استدلال، صحابہ کے اقوال اور بزرگوں کے واقعات کو پیش کرتے ہیں۔ ان سب کو پڑھنے کے بعد قاری کے دماغ میں غیبت سے متعلق ایک مکمل اور واضح تصویر آجاتی ہے اور یہی امام صاحب کا مقصد ہے۔

امام غزالیؒ نے اصلاح و تربیت کے علاوہ احتساب و تنقید کے ذریعے معاشرے کے ہر طبقے میں موجود برائیوں کی نشاندہی کی۔ انہوں نے اس حقیقت کو بیان کیا کہ انسان کی زندگی کا مقصد سعادتِ اخروی اور رضائے الٰہی کا حصول ہونا چاہیے، لیکن نفس و شیطان کے فریب نے لوگوں کی نظر مقصد سے ہٹا کر ظاہری افعال اور رسومات تک محدود کر دی ہے۔ اس زمانے میں علماء اپنے علمی مناظروں، اہلِ ثروت حضرات اپنی عیاشیوں اور حکومتی طبقہ اپنے ظلم و جبر میں مصروف ہے۔ رہے عوام تو ان کو ان کی مذموم عادات، بدعات اور منکرات نے جکڑ رکھا ہے۔ امام صاحب اس موقع پر بگڑے ہوئے اسلامی معاشرے کا پوری قوت سے احتساب کرتے ہیں اور مختلف طبقات کی اصلاح کے لئے انتہائی مفید مشورے دیتے ہیں۔

سب سے پہلے آپ علمائے امت کا احتساب کرتے ہیں جو نورِ نبوت کو پھیلانے کے ذمہ دار ہیں۔ امام صاحب کا خیال ہے کہ علمائے سوء نہ ہوتے تو سلاطین اس طرح نہ بگڑتے اور ان کو علماء کی روک ٹوک کا خدشہ ہوتا۔ لیکن علماء خود حکمرانوں کے خوشہ چین بن چکے ہیں اور حق بیان کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو چکے ہیں۔ چنانچہ علمائے حق کی جرأت کا بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''یہ تھا علماء کا طرزِ عمل اور نہی عن المنکر کی شان، ان کو سلاطین کی شان و شوکت کی ذرا پرواہ نہ تھی۔ وہ اللہ تعالیٰ کے فضل پر اعتماد رکھتے تھے، اور ان کو اطمینان تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کی حفاظت فرمائے گا اور وہ اللہ تعالیٰ کے اس فیصلے پر راضی تھے کہ ان کو شہادت نصیب ہو۔ چونکہ ان کی نیت خالص تھی، اس لئے ان کے کلام سے پتھر موم ہو جاتے تھے اور بڑے سے بڑے سنگ دل متاثر ہوتے تھے۔ اب تو حالت یہ ہے کہ طمعِ دنیا نے علماء کی زبانیں گنگ کر رکھی ہیں اور وہ خاموش ہیں۔ اگر بولتے بھی ہیں تو ان کے اقوال و حالات میں مطابقت نہیں ہوتی، اس لئے کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اگر آج بھی وہ خلوص و صداقت سے کام لیں اور علم کا حق ادا کرنے کی کوشش کریں تو ان کو ضرور کامیابی حاصل ہو، کیونکہ رعیت کی خرابی سلاطین کی خرابی کا نتیجہ ہے اور سلاطین کی خرابی علماء کی خرابی کا نتیجہ ہے اور علماء کی خرابی کی وجہ دولت اور جاہ کی محبت کا غلبہ ہے اور جس پر دنیا کی محبت غالب آجائے وہ ادنیٰ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

درجہ کے لوگوں پر بھی احتساب اور روک ٹوک نہیں کرسکتا، چہ جائیکہ سلاطین واکابر۔''

امام صاحب اس بات سے نالاں ہیں کہ فقہ کے ایسے مسائل جن کی بعض اوقات انسان کو ساری عمر ضرورت پیش نہیں آتی، ان کے علم کا ایسا چرچا ہے اور وہ علوم جو ہر انسان کی اصلاح اور بہتری کے لئے لازم ہیں ان کا تذکرہ کرنے والا ملک بھر میں کوئی نہیں ملتا۔

اس کے بعد آپ سلاطین کا سختی سے احتساب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان کے پاس جو مال ہے، اس کا غالب حصہ حرام پر مبنی ہے اور ظالمانہ طریقے پر حاصل کیا گیا ہے۔ اس پر یہ مال وہ علماء کی خدمت میں پیش کر کے ان کے دل ودماغ کو خریدنا چاہتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

''آج سلاطین ان ہی لوگوں کے ساتھ یہ فیاضی کرتے ہیں، جن کے متعلق ان کو یقین ہو کہ وہ ان سے کام لے سکیں گے، ان سے ان کو سہارا حاصل ہوگا، وہ ان سے اپنی اغراض پوری کرسکیں گے، ان سے ان کے درباروں اور مجلسوں کی رونق بڑھے گی اور وہ ہمیشہ دعا گو، ثناء خواں اور حاضر و غائب ان کی تعریف وتوصیف میں لگے رہیں گے۔ اس سلسلہ میں پہلا درجہ سوال کی ذلت کا ہے، دوسرا خدمت کے لئے آمدورفت کا، تیسرا تعریف ودعا گوئی کا، چوتھا یہ کہ ضرورت کے وقت ان کے اغراض میں ان کی مدد کی جائے، پانچواں حاضر باشی اور درباداری، جلوس کی شرکت کا، چھٹا اظہارِ محبت، دوستی اور حریفوں کے مقابلے میں ان کی امداد اور نصرت کا، ساتواں ان کے ظلم اور ان کے عیوب اور بداعمالیوں کی پردہ پوشی کا۔ اگر کوئی شخص ان میں سے کسی درجہ کے لئے تیار نہیں ہے، تو خواہ وہ امام شافعیؒ کے مرتبے کا ہو، یہ سلاطین ایک پیسہ بھی اس پر خرچ کرنا گوارا نہیں کریں گے۔ اس لئے اس زمانے میں ان بادشاہوں سے ایسے مال کا قبول کرنا بھی جائز نہیں، جس کے متعلق یہ علم ہو کہ وہ حلال ہے۔ اس لئے کہ اس کے وہ نتائج ہوں گے جن کا اوپر ذکر ہوا ہے۔ اس مال کا تو کیا ذکر جس کے متعلق معلوم ہو کہ حرام یا مشتبہ ہے۔''

امام صاحب علماء اور سلاطین کے باہم گٹھ جوڑ کو فسادِ امت کی اصل وجہ سمجھتے ہیں اور علماء کو ہدایت کرتے ہیں کہ وہ بادشاہوں، ان کے درباروں اور وزراء اور امراء کے پاس آنا جانا ختم کردیں۔ نیز آپ نے خود بھی بادشاہ، اس کے عمال اور سلاطین کے اہم اراکین کو تبلیغی خطوط روانہ کیے۔

مجدّدین کی ایک بہت بڑی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ ہر طبقے کی عادات، انداز اور کمزوریوں سے متعلق ان کو بخوبی آگاہی ہوتی ہے۔ وہ زبردست نفسیات دان اور حقیقت شناس ہوتے ہیں۔ عوام کی نبض پر ہاتھ رکھتے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہیں اور مرض کا پتہ لگا لیتے ہیں۔ امام غزالیؒ کو بھی اس میں کمال حاصل تھا۔ آپ کی قوتِ مشاہدہ زبردست تھی، اور حق بیان کرنے کی جرأت بھی موجود تھی۔ آپ نے عوام کے روحانی امراض کی درست تشخیص کی اور ان کے عقائدِ باطلہ پر بھرپور اعتراضات کئے۔ معاشرے میں رائج الوقت منکرات، مغالطوں اور غلط رسومات پر گرفت کی۔ آپ نے ایسی باتوں کی طرف بھی توجہ دلائی جو معاشرے کے مزاج کا حصہ بن چکی تھیں اور لوگوں کو ان کے منکر ہونے کا احساس نہیں تھا۔ اس کے لئے آپ نے پوری شہری زندگی پر نظر ڈالی اور اس کے نمایاں منکرات کا تذکرہ کیا نیز مساجد سے لے کر بازاروں، سڑکوں، حماموں اور دعوت کی محفلوں تک کے منکرات کو شمار کر دیا۔

غرض اس کتاب کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اس میں کثیر موضوعات پر سیر حاصل گفتگو کے باوجود ہر موضوع کا حق ادا کر دیا گیا ہے۔ امام صاحب نے گویا دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ کتاب کی بے شمار خوبیوں اور فوائد نے اسے آنے والے وقتوں میں تمام طبقات میں یکساں مقبولیت دی۔ البتہ کمزور روایات اور ضعیف احادیث کی موجودگی کا احساس کتاب کے پڑھنے میں بار بار ہوتا ہے۔ امام صاحب چونکہ آخری وقت میں علمِ حدیث کی تحصیل کر سکے، لہٰذا کتاب میں جو احادیث وارد ہوئی ہیں ان کی صحت پر کلام کیا جا سکتا ہے۔ بہت سے اہلِ علم حضرات نے احیائے علوم کے حاشیوں میں ان احادیث کی نشاندہی بھی کی ہے۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔ اپنی اصلاح کے لئے فکر مند افراد کو اس کتاب کا مطالعہ بہت فائدہ دے گا۔

امام غزالی کی مخالفت

امام صاحب نے فخر الملک کے کہنے پر درس و تدریس کی مسند سنبھالی تھی۔ وہ سنجر سلجوقی (ملک شاہ سلجوقی کا بیٹا اور والیٔ خراسان) کا وزیرِ اعظم تھا اور نہایت علم دوست آدمی تھا۔ اس نے خود امام صاحب کے پاس حاضر ہو کر استدعا کی کہ وہ نظامیہ نیشاپور کی مدرسی قبول کریں۔ محض ایک برس کی بعد وہ ایک باطنی کے ہاتھوں شہید ہوا تو امام صاحب نے چند روز بعد ہی عہدۂ تدریس سے کنارہ کشی اختیار کر کے طوس میں خانہ نشینی اختیار کی اور گھر کے قریب ایک مدرسہ اور خانقاہ کی بنیاد ڈالی، جہاں مرتے دم تک ظاہری و باطنی علوم کی تلقین کرتے رہے۔

اس تمام عرصے میں جہاں آپ کی شہرت آسمان سے باتیں کر رہی تھی، وہیں حاسدین کا ایک گروہ آپ کی مخالفت میں جمع ہو چکا تھا۔ چنانچہ آغازِ شباب میں امام ابو حنیفہؒ کے متعلق ایک کتاب میں کی گئی نکتہ چینی کو بنیاد بنا کر سنجر کے دربار میں پیش کیا گیا۔ وہ خود صاحبِ علم نہ تھا۔ چنانچہ اس نے حاسدوں کی بات کا یقین کر لیا اور امام صاحب کو حاضری کا حکم دیا۔ امام صاحب عہد کر چکے تھے کہ کسی بادشاہ کے دربار میں نہ جائیں گے۔ لیکن حکمِ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سلطانی کی تکمیل کے لئے کچھ فاصلے پر جا کر رک گئے اور اسے تفصیلی خط لکھا۔ خط ملنے کے بعد تو وہ امام صاحب کی ملاقات کا اور شائق ہو گیا اور ان معاملات میں آپ کی رائے سننے کا خواہاں ہوا، جن پر آپ کے حاسدین نے طوفان اٹھا رکھا تھا۔ چنانچہ انتہائی مجبوری کے عالم میں امام صاحب چار و نا چار سنجر کے دربار میں گئے۔ وہ تعظیم کے لئے اٹھا۔ اس وقت امام صاحب کے جسم پر رعشہ طاری ہو گیا۔ ایک قاری ساتھ تھا، اس سے کہا قرآن کی کوئی آیت پڑھو۔ اس نے یہ آیت پڑھی

"الیس اللہ بکاف عبدہ" [سورۃ زمر]

یعنی: کیا اللہ اپنے بندے کے لئے کافی نہیں ہے۔ اس آیت کے اثر سے دل کو اطمینان نصیب ہوا اور آپ نے اس کے سامنے ایک طویل تقریر کی، جس میں جہاں مسلمانوں کے مصائب کا تذکرہ کیا، وہیں اپنے اوپر لگائے گئے الزامات کو بھی رد کیا۔

سنجر پر آپ کی تقریر کا بہت اثر ہوا۔ اس نے کہا کہ آج عراق اور خراسان کے تمام علماء کا مجمع ہوتا تو سب لوگ آپ کے کلام سے مستفید ہوتے۔ میں حکم دوں گا کہ تمام علماء سال میں ایک بار آپ کی خدمت میں حاضر ہوں اور اپنی مشکلات آپ سے حل کروائیں۔

تدریس کے لئے دوبارہ اصرار اور امام صاحب کی معذرت

ایک بار پھر امام غزالی کو نظامیہ بغداد کی مُدرّسی کے لئے آمادہ کرنے کی کوششیں شروع ہوئیں۔ اس بار عباسی خلیفہ کی اس خواہش کو آپ کے سامنے رکھا گیا اور وزیرِ اعظم نے بذریعہ خط خصوصی استدعا کی، ساتھ ہی دربارِ خلافت کے تمام ارکان کے دستخط ثبت کئے۔

اس کے جواب میں امام صاحب نے طویل خط لکھا جس میں ذاتی وجوہات کے علاوہ یہ وجہ بھی بیان کی کہ "میں نے مقامِ خلیل میں عہد کیا ہے کہ کبھی مناظرہ و مباحثہ نہ کروں گا اور بغداد میں مباحثے کے سوا چارہ نہیں ہے۔ اس کے علاوہ دربارِ خلافت میں سلام کرنے کے لئے حاضر ہونا ہو گا اور میں اس کو گوارا نہیں کر سکتا۔ سب سے بڑھ کر میں مشاہرہ اور وظیفہ قبول نہیں کر سکتا اور بغداد میں میری کوئی جائیداد نہیں ہے"۔ ان سب باتوں کے علاوہ آپ کو اپنے ان ڈیڑھ سو شاگردوں کا خاص خیال تھا جو طوس میں آپ سے تحصیلِ علم کے لئے جمع تھے۔

تحصیلِ علمِ حدیث

امام صاحب علمِ حدیث کے ماہر نہیں تھے اور آپ کو اس بات کا احساس بھی تھا۔ چنانچہ جب مشہور محدث عمر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بن ابی الحسن الرواسی طوس تشریف لائے تو آپ نے موقع غنیمت جان کر اپنے ہاں مہمان ٹھہرایا اور ان سے صحیح بخاری و مسلم کی سند لی۔

وفات

امام صاحب تدریس و تصنیف میں مشغول تھے کہ رب کی طرف سے بلاوا آ گیا۔ ۱۴ جمادی الثانی ۵۰۵ ہجری پیر کے روز صبح کے وقت بیدار ہوئے، وضو کر کے نماز پڑھی، پھر کفن منگوایا اور آنکھوں سے لگا کر کہا ''آقا کا حکم سر آنکھوں پر'' یہ کہہ کر پاؤں پھیلا دیئے۔ لوگوں نے دیکھا تو آپ انتقال کر چکے تھے۔ طاہران کے مقام پر انتقال کیا اور وہیں آپ کی تدفین ہوئی۔

امام غزالی کی شخصیت کی نایاب خصوصیات

امام غزالی کی زندگی پر ایک نظر ڈالی جائے تو ان کی شخصیت کی چند نادر و نایاب خصوصیات سے آگاہی ہوتی ہے جو تاریخ انسانی میں خال خال ہی نظر آتی ہیں۔

(۱) تلاشِ حق کے لئے کمال درجے کی سعی، راہ میں آنے والے بتوں کو ایک ایک کر کے پاش پاش کر دینا۔

(۲) حقیقت تک پہنچ جانے کے بعد محض جذبۂ خلوص اور امت کی اصلاح کے لئے عزلت اور خلوت کی زندگی کو ترک کر دینا اور پرعزیمت کردار۔

(۳) علومِ باطلہ کے توڑ کے لئے مکمل تیاری اور کوشش اور اسلامی علوم کی طرف سائنسی اندازِ فکر۔

ہم ایک ایک کر کے ان کا مختصر تذکرہ کرتے ہیں۔

تلاشِ حق کے لئے محنت اور خلوص

امام غزالیؒ کی تلاشِ حق کی داستان پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ معرفتِ حق وہ خزانہ ہے جو خداوند تعالیٰ ان دلوں کو بخشتا ہے جو اپنے آپ کو اس کے لئے خالص کر لیتے ہیں اور راہ میں آنے والے بت چاہے وہ شہرت، مال، اولاد، وطن، جاہ یا کسی بھی صورت میں کیوں نہ ہوں، انہیں پاش پاش کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اقبال نے کیا خوب کہا ہے:

براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں

حضرت سلمان فارسیؓ کی داستانِ تلاشِ حق ہو یا غزالی کی ،ایک مشترک چیز اس راہ میں نیت کا خالص ہونا اور اس کے لئے ہر قسم کی قربانی دینے کے لئے تیار رہنا نیز اس راستے میں انتہاء درجے کی سعی کرنا ہے۔اس کردار کا مظاہرہ ایک غیر معمولی انسان ہی کرسکتا ہے۔قرآن کریم تفصیل سے ابراہیم علیہ السلام کی تلاشِ حق کی داستان کو اور اس راہ میں ان کی قربانیوں اور بے نفسی کو بیان کرتا ہے۔اللہ نے ان کو اپنا خلیل بنایا اور آنے والے انسانوں کا امام۔ یہ مرتبہ ان کو اس لئے حاصل ہوا کہ راہِ حق میں ان سے جتنی قربانیاں طلب کی گئیں، انہوں نے دیں، یہاں تک کہ بڑھاپے کی اولاد کی قربانی دینے سے بھی نہ ہچکچائے۔کسی موقع پر ان کے قدم نہ ڈگمگائے۔اور یوں وہ قیامت تک آنے والے لوگوں کے لئے حنفیت اور تلاشِ راہِ حق کی لازوال مثال چھوڑ گئے۔

ابوالحسن علی ندویؒ اس ضمن میں کہتے ہیں کہ:''امام غزالیؒ کو اسی خلوص نے اقلیمِ علم کی سندِ شاہی ترک کروائی اور برسوں دشت و بیاباں کی خاک چھنوائی اور باوجود طلب و اصرار کے بادشاہوں کے دربار اور اپنے وقت کے سب سے بڑے اعزاز سے روگرداں اور بے نیاز رکھا۔انہوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ آخری چیز جو صدیقین کے قلب سے نکلتی ہے وہ حبِّ جاہ ہے۔ان کی آخری زندگی شہادت دیتی ہے کہ وہ اس مقام سے محروم نہیں رہے''۔

غرض امام صاحب نے اس راہ میں شہرت،عزت، مال، وطن سب ترک کیا۔دنیا سے بے رغبتی اختیار کی، کبر کو شکست دی اور یوں حبِّ جاہ سے حبِّ الٰہی تک کا سفر کیا۔اپنے وقت کے مروجہ علوم پر مکمل عبور کے باوجود آپ کو یہ احساس رہا کہ علمِ حدیث کی تحصیل میں کمی ہے۔چنانچہ جب چہار جانب آپ کی علمیت کا ڈنکا بج رہا تھا تو استادوں کے استاد امام غزالی علمِ حدیث کو ایک سچے طالب علم کے طور پر سیکھ رہے تھے۔

اصلاحِ امت کی فکر اور عملی جدوجہد

دوسری خصوصیت امت کے حالات کی اصلاح کے لئے دنیا کی طرف واپس آنا تھا۔عام آدمی شاید اس بات کا اندازہ نہ کرسکتا ہو،لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس کو ایک بار اللہ کے ذکر،اس کی ذات وصفات کی معرفت اور حضوریٔ قلب کی کیفیت نصیب ہوجائے اس کے لئے دنیا کے معاملات میں دوبارہ حصہ لینا کچھ ایسا آسان نہیں ہوتا۔یہی اصل امتحان اور آزمائش تھی جس میں امام صاحب پورے اترے کہ پہلے اللہ کے لئے اس دنیا کو چھوڑا اور پھر اللہ ہی کے لئے دنیا کو اختیار کیا تاکہ امت کے احوال کی اصلاح کرسکیں۔اس اخلاص کا اثر آپ کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اقوال اور تحریروں میں صاف نظر آتا ہے۔

ابوالحسن علی ندویؒ لکھتے ہیں: ''ان کے اخلاص کا اعتراف موافق ومخالف سب کو ہے اور وہ ان کی تصنیفات کے لفظ لفظ سے ٹپکتا ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اگرچہ ان کے ناقد ہیں، اور ان کی بہت سی چیزوں سے ان کو اختلاف ہے، لیکن اس کے باوجود ان کو کبارِ مخلصین میں شمار کرتے ہیں۔ ان کی کتابوں کی تاثیر اور مقبولیت کی اصل وجہ ان کا یہی اخلاص ہے''۔

امت کی اصلاح کے لئے آپ نے تحریر اور تقریر کے علاوہ بادشاہ کے دربار میں جا کر علی الاعلان اس کو حق بات کی نصیحت کی۔ بڑی تعداد میں وزراء اور امراء کے نام خطوط لکھے جن میں ان کی کوتاہیوں کی طرف ان کی توجہ مبذول کروائی۔ آپ کی اصلاحی کوششوں کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ مگر چونکہ سلطنتوں کا خمیر سرے سے ہی بگڑ چکا تھا، لہٰذا اس کے لئے از سرِنو اسلامی اصولوں کی بنیاد پر سلطنت کے استوار کرنے کی ضرورت تھی۔ سلجوقی حکومت میں تو یہ ممکن نہ ہوسکا، البتہ آپ کے ایک شاگرد محمد بن عبداللہ تومرت نے جس کا تعلق اسپین سے تھا، آپ کی ہدایات کی روشنی میں علی بن یوسف تاشفین کی ظالمانہ حکومت ختم کر کے سلطنتِ موحدین کی بنیاد رکھی اور ایک لائق اور مخلص شخص عبدالمومن کو تخت پر بٹھایا۔ عبدالمومن اور اس کی اولاد نے جس طرز پر حکومت کی وہ اسلامی اصولوں کے عین مطابق تھا۔ یعنی شوریٰ، عدل اور رفاہ عامہ کے کام۔

ردِّ باطل کے لئے بھرپور تیاری

علومِ باطلہ کے توڑ کے لئے امام غزالیؒ نے جو محنت اور کوشش کی وہ علمائے امت کے لئے ایک مثال ہے۔ امام صاحب نے اپنے عمل سے مسلمانوں کو قیامت تک آنے والے علمی وعملی فتنوں کا مقابلہ کرنے کا طریقہ سمجھا دیا۔ آپ کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے دینی علوم پر مکمل دسترس حاصل کی جائے تاکہ صحیح اسلامی فکر اچھی طرح دل ودماغ میں اتر جائے۔ پھر رائج الوقت جدید علوم کا مطالعہ اس گہرائی میں کیا جائے کہ مشرق ومغرب میں ان علوم پر آپ کی مہارت اور عبور کو دوست دشمن سب تسلیم کرلیں۔ اس کے بعد ان علوم کی بنیادوں کو دین، عقل اور تجربہ کی کسوٹی پر پرکھا اور چیلنج کیا جائے۔ جو چیز ان پر پوری اترے اسے اختیار کیا جائے اور جو متصادم ہو اسے پورے اطمینانِ قلب کے ساتھ رد کردیا جائے۔ یہ طریقہ کار نہایت کامیابی سے باطل نظریات اور علوم کی جڑ کاٹ دیتا ہے۔

اگر تاریخِ اسلامی پر نظر ڈالی جائے تو اس افسوسناک حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ جہاں علماء نے دین کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تبلیغ اور ترویج کے لئے بھرپور کوششیں کیں وہیں وہ علومِ باطلہ کے مقابلہ پر ایسے کارنامے نہ دکھا سکے، جیسا کہ وقت کی ضرورت تھی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ شاید یہ رہی کہ وہ اس حقیقت کا ادراک ہی نہ کر سکے کہ باطل کے مقابلے پر آنے سے پہلے اس کے طریقہ کار اور انداز کو سمجھنے کے لئے کس درجہ محنت اور کس نوع کی تیاری کی ضرورت ہوتی ہے۔ علمائے دین نے محض دینی علوم میں مہارت کو کافی سمجھا اور یہی ان کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ دینی علوم میں مہارت آخرت کی کامیابی کے لئے تو ضرور کافی ہے، لیکن دنیا میں شیطانی قوتوں سے نبرد آزمائی کے لئے کم از کم اس درجے کی سعی لازمی ہے، جس درجے کا ریاض خود اہلِ باطل اپنی فوقیت ثابت کرنے کے لئے کرتے ہیں۔ آج مغربی افکار، خیالات اور نظریات کی ترویج کے لئے اگر ان اقوام کی کوششوں کا ہم سرسری سا بھی جائزہ لیں تو یہ جان کر شدید حیرت ہوتی ہے کہ اس راہ میں ان کی محنت اور کوشش لاجواب ہے۔ جبکہ نہ انہیں رضائے الٰہی کی فکر ہے اور نہ جنت کی آرزو۔ اس کے برعکس مسلمان جو حق کو پہچان چکے ہیں اور اس راہ میں کوشش کرنے والوں سے جو وعدہ ہے اس سے بھی باخبر ہیں ان کی تیاری، کام اور انداز کتنے پھسڈے اور غیر معیاری ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ نے دنیا کی امامت اہلِ مغرب کے سپرد کر دی ہے اور سارا عالم آج ہر معاملے کے لئے انہی کی طرف دیکھتا ہے۔

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سلطان صلاح الدین ایوبیؒ

صلیبی جنگوں کا فاتح بادشاہ جس نے بیت المقدس عیسائیوں کے قبضے سے آزاد کرایا

تعارف

نام صلاح الدین ایوبی تھا۔ سلسلہ نسب یہ ہے: صلاح الدین بن نجم الدین ایوب بن شادی۔

صلاح الدین روادیہ کرد خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور یہ قوم کردوں میں اشرف مانی جاتی تھی۔ اس خاندان کی قبائلی زندگی مہمان نوازی، جانبازی، بہادری، غیرت اور ناموس کی حفاظت جیسی خوبیوں سے متصف تھی۔

صلاح الدین کے دادا شادی سلطان مسعود سلجوقی کے عہدِ حکومت میں تکریت کے قلعے کے حاکم مقرر ہوئے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے بڑے بیٹے نجم الدین کو قلعے کا حاکم نامزد کردیا گیا۔ یہی نجم الدین ایوب صلاح الدین کے والد تھے۔ وہ نیک دل، حسن اخلاق سے آراستہ، ہنر پرور، علماء وفضلاء کے قدردان اور ایک فیاض طبیعت انسان تھے۔

ولادت

صلاح الدین ۵۳۲ ہجری بمطابق ۱۱۳۸ء میں قلعہ تکریت میں پیدا ہوا۔ جس روز صلاح الدین پیدا ہوا، اسی روز اس کے والد کو تکریت کے قلعے کی حاکمیت سے سبکدوش کرکے وہاں سے چلے جانے کا حکم ملا۔ اس کی مختلف وجوہات بیان کی جاتی ہیں۔ وجہ کچھ بھی ہو، صلاح الدین کے والد نجم الدین اور چچا شیرکوہ اپنے وقت کے عظیم بادشاہ اتابک اعظم عماد الدین کی خدمت میں حاضر ہوئے، جہاں ان کی خوب قدردانی ہوئی۔ دراصل عماد الدین زنگی اس احسان کو نہ بھولا تھا جو آپ کے والد نجم الدین نے اس پر کیا تھا۔

واقعہ کچھ یوں تھا کہ ۱۱۳۲ء میں اس کی شکست خوردہ فوج دریائے دجلہ پار کرنا چاہتی تھی اور اس کے لئے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کوئی راہ نہ سوجھتی تھی ۔ اس موقع پر نجم الدین نے جو تکریت کے قلعے کے حاکم تھے، اپنے طور پر کشتیوں کا ایک بیڑا مہیا کیا تھا جس کی مدد سے فوج دریا پار کر کے محفوظ مقام پر پہنچ گئی تھی ۔ اس احسان کا بدلہ دینے کے لئے عماد الدین زنگی نے نہ صرف انہیں جاگیریں دیں بلکہ قلعے ''بعلبک'' کا حاکم بھی مقرر کر دیا۔ عماد الدین کے انتقال کے وقت صلاح الدین کی عمر نو سال تھی ۔ اس کے والد اور چچا اسے لے کر عماد الدین زنگی کے بیٹے نور الدین محمود بن زنگی کی خدمت میں چلے گئے ۔ سلطان ان کی بہادری، غیرت اور انتظامی صلاحیتوں سے اتنا متاثر ہوا کہ انہیں اپنا مقرب بنا لیا۔ نیز سپہ سالاری کا منصب ان کے لئے پسند کیا۔

عہدِ شباب اور جہاد کا آغاز

صلاح الدین کے بچپن کے حالات تفصیل سے نہیں ملتے ۔ البتہ جب وہ سولہ سال کا ہوا تو اپنے والد اور چچا کے ہمراہ سلطان نور الدین زنگی کی خدمت میں حاضر ہونا شروع کیا ۔ وہ نوجوانی میں بھی سنجیدہ اور سمجھدار تھا۔ سلطان نور الدین زنگی نے اس کے اندر شرافت، ذہانت، عالی حوصلگی اور شجاعت کا اندازہ کر لیا تھا۔ لہٰذا اپنے زیر نگرانی وہ صلاح الدین کو مختلف مہمات پر بھیجنے لگا۔ صلاح الدین فطرتاً صلح جو طبیعت کا مالک تھا۔ لڑائی اور جنگ اس کے لئے پسندیدہ نہ تھی ۔

مصر کی دوسری مہم پر صلاح الدین سلطانی حکم پر مجبور ہو کر جنگ میں شرکت کے لئے راضی ہوا۔ اس ضمن میں اس کا بیان ہے کہ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کسی نے میرے سینے میں چھری گھونپ دی ہو۔ لیکن سلطان نے میری ایک نہ سنی اور میرے لئے سامان مہیا کر دیا۔ لہٰذا مجھے چار و ناچار جانا پڑا۔ اس واقعے کو ابن اثیر نے تفصیل سے بیان کیا ہے۔

صلاح الدین کو تقدیر نے جہاد کی راہ پر ڈال دیا تھا۔ اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس عہد کے نازک حالات کا مختصر جائزہ لیں۔

گیارہویں صدی کے آخر میں مشرق وسطیٰ کے حالات سخت خراب ہو گئے اور مسلمان اندرونی و بیرونی خطرات میں بری طرح گھر گئے ۔ بغداد کا عباسی خلیفہ بالکل بے بس اور مجبور تھا۔ شام میں چھوٹی چھوٹی عرب ریاستوں کا ایک جال بچھا ہوا تھا اور یہاں کے تقریباً ہر اہم شہر پر کسی نہ کسی آزاد امیر کا راج تھا۔ سلجوقی ترکوں کی عظیم سلطنت پارہ پارہ ہو چکی تھی ۔ مگر اسی سلطنت کے زیر سایہ پرورش پانے والا عماد الدین زنگی جو پہلے موصل اور بالائی الجزیرہ کا حاکم تھا چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو ختم کر کے شام، الجزیرہ اور کردستان کے علاقوں پر مشتمل ایک متحدہ مملکت کی بنیاد ڈالنے میں کامیاب ہو گیا۔ عماد الدین زنگی احکامات پر عمل کروانے میں بہت سخت اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کمزوروں کے حقوق کے معاملے میں انتہائی نرم دل واقع ہوا تھا۔ وہ فرض شناسی، محنت اور بیدار مغزی جیسی خصوصیات سے خود بھی متصف تھا اور ان کا قدردان بھی تھا۔ اسے نہ صرف اندرونی خلفشار کا سامنا تھا بلکہ صلیبیوں سے محاذ آرائی بھی جاری تھی۔

ابھی وہ اپنی مہمات میں مصروف تھا کہ اسے اس کے آزاد کردہ غلام نے موقع پا کر ہلاک کر دیا۔ اس کا بیٹا نورالدین زنگی اس سے بھی بڑھ کر بلند اقبال ثابت ہوا۔ اس کو اپنے دورِ حکومت میں مسلسل صلیبیوں سے نبرد آزما ہونا پڑا۔ صلیبی موقع بہ موقع حملے کے لئے تیار رہتے اور جہاں بھی مسلمانوں کو کمزور دیکھتے وہاں کے حالات سے فائدہ اٹھا کر قبضے کی ٹھان لیتے۔

اسی دوران عسقلان پر صلیبیوں کا قبضہ ہو گیا جس سے مصر کے لئے خطرات بہت بڑھ گئے۔ مصر میں فاطمی خلافت روبہ زوال تھی۔ حالات اس قدر خراب تھے کہ حکومت گویا وزراء و امراء کے درمیان کھیل بن چکی تھی۔ چنانچہ صلیبیوں نے فاطمی خاندان کے خزانوں اور وادیٔ نیل پر قبضہ کرنے کی خاطر سرحدوں پر چھیڑ خانی شروع کر دی۔

صلیبی جنگوں کا پس منظر

صلیبی کون تھے؟ وہ بار بار مسلمانوں سے کیوں ٹکراتے تھے؟ ان کے مقاصد کیا تھے؟ اس کو سمجھے بغیر صلاح الدین ایوبی کا کارنامہ سمجھ میں نہیں آ سکتا۔

حضرت عمر فاروقؓ کے دور میں بیت المقدس کی فتح سے عیسائی دنیا کے ساتھ مسلم سلطنت کے ٹکراؤ کا باقاعدہ آغاز ہو چکا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ حضرت عمرؓ اور ان کے بعد کے مسلم حکمرانوں نے عیسائی رعایا کے ساتھ بے مثال رواداری کا سلوک کیا اور ان کے مقدس مقامات اور زائرین کا خاص خیال رکھا۔ یہ برتاؤ بعد کی تمام حکومتوں نے برقرار رکھا لیکن بنی فاطمہ نے جب شام اور یروشلم پر قبضہ کر کے اپنی خلافت قائم کی تو عیسائیوں کے ساتھ ناروا سلوک برتا گیا۔ اس پر مستزاد یہ کہ عیسائی زائرین کی غالب تعداد کی اپنی اخلاقی حالت سخت مخدوش ہوتی گئی۔ یہ لوگ جہاں جہاں سے گذرتے وہاں کا امن و سکون تہہ و بالا کر دیتے۔ لہٰذا حکومت کی طرف سے بھی ان پر سختی کی جاتی۔

انہی زائرین میں ایک سپاہی ''پیٹر ہرمٹ'' بھی تھا جو نہایت متعصب مزاج شخص تھا۔ وہ ان بدسلوکیوں پر جو اس کے ساتھ فلسطین میں ہوئی تھیں سخت غصے میں تھا اور ہر وقت اسی خیال میں رہتا تھا۔ اس کے قول کے مطابق ایک دن جب وہ مسیح کی قبر کے سامنے سربسجود پڑا ہوا تھا اس نے مسیح کی آواز کو سنا جو اس سے کہہ رہی تھی: ''پیٹر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اٹھ کھڑا ہو! اور میرے لوگوں کی مصیبت کو مشتہر کرنے میں جلدی کر۔ اب یہ وقت ہے کہ میرے خادم مدد حاصل کریں اور مقدس مقامات چھڑا لئے جائیں۔'' [بحوالہ تاریخ مجاؤ]

اب تو پیٹر کے جوش و خروش کی کوئی حد نہ رہی۔ وہ پوپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور شام و یروشلم کے علاقوں کی تسخیر کی تجویز پیش کی۔ پوپ نے اس تجویز کا خیر مقدم کیا اور اس کی تشہیر کے لئے خود اس کو ہی مقرر کیا۔ اب پیٹر ملک بہ ملک، شہر بہ شہر عیسائیوں کی مصیبتوں کو دردناک انداز میں بیان کرتا۔ صلیب دکھا دکھا کر واسطے دیتا، چھاتی پیٹتا، اپنے آپ کو نوچتا اور رو رو کر دہائی دیتا۔ لوگوں کا جم غفیر اس کے پیچھے ہوتا اور لوگ اسے خدا کا ایلچی تصور کرتے۔

اسی اثناء میں رومی شہنشاہ نے جس کو ترکوں کے ہاتھوں قسطنطنیہ کے کھو بیٹھنے کا خوف تھا، پوپ کے پاس سفیر بھیج کر مدد طلب کی اور مدد کے عوض خزانوں کے منہ کھولنے کا وعدہ کیا۔ اس غرض سے جو پہلی کونسل قائم کی گئی وہ بے نتیجہ رہی۔ دوسری کونسل کے دس اجلاس منعقد ہوئے اور اس میں پادریوں اور سرداروں کا اس قدر ہجوم تھا کہ شہر میں سما نہیں رہا تھا۔ پیٹر اور پوپ کی تقریروں نے عیسائیوں کے جذبات میں ایسی آگ لگائی جو اگلی کئی صدیوں تک بھڑکتی رہی اور جس کی پیاس لاکھوں آدمیوں کے خون سے بھی بجھ نہ پائی۔ کونسل کے اختتام پر ہر ایک کی زبان پر یہ نعرہ تھا ''یہ خدا کی مرضی ہے۔'' فوج کی روانگی آئندہ سال میں اس دن قرار پائی جو عیسائیوں کے حساب سے حضرت عیسیٰؑ کے آسمان پر جانے کا دن تھا اور اس جنگ کا نام کروسیڈ تجویز کیا گیا۔

پہلی اور دوسری صلیبی جنگیں

شام اور یروشلم کی آزادی کی تحریک نے پورے یورپ کو جوش و خروش سے بھر دیا۔ فقیر اور تارک الدنیا لوگ اپنی عبادت گاہوں سے باہر آ گئے۔ درویش لوگ جنگلوں سے نکل کھڑے ہوئے۔ چوروں اور راہزنوں نے گناہوں سے توبہ کر کے صلیب تھام لی۔ تاجر، مزدور، نواب، لارڈ، غرض ہر طبقہ اپنی ذاتی زندگی سے دستبردار ہو کر اجتماعی مفاد کے لئے نکل کھڑے ہونے پر راضی ہو گیا۔

باپ خود اپنے بچوں کو لے جاتے تھے اور ان سے قسمیں لیتے تھے کہ فتح کریں گے یا یسوع مسیح کے واسطے مر یں گے۔ یہاں تک کہ غلام عورتیں اور بچے بھی شامل ہو گئے۔ پیٹر ہرمٹ کے گرد لاکھوں افراد کا مجمع جمع ہو گیا۔ انہوں نے باقاعدہ فوج کا انتظار بھی نہ کیا اور ۱۰۹۶ء کے موسم بہار میں روانہ ہوئے۔ راستے میں جس دیہات سے یہ گزرتے وہاں کے باشندے اپنے کل سامان کے ساتھ اس میں شریک ہو جاتے۔

کروسیڈروں کا پہلا دستہ ''والٹر پینی لیس'' کے ماتحت روانہ ہوا۔ یہ کوئی منظم لشکر نہ تھا نہ کوئی تربیت یافتہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جرنیل اس کا کمانڈر تھا۔ بس مذہبی جنونیوں اور آسانی سے مشتعل کیے جانے والے لاکھوں لوگوں کا ایک جمِ غفیر تھا۔ شروع شروع میں تو یہ جہاں سے گذرتے ان کی خوب آؤ بھگت ہوتی۔ جب یہ بلغاریہ پہنچے تو وہاں کی نیم عیسائی رعایا نے ان کو مفت رسد دینے سے انکار کر دیا۔ اس پر یہ ناراض ہو گئے اور اپنے ہم مذہبوں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ بالآخر وہاں کے عوام کے ہاتھوں یہ دستہ فنا ہو گیا۔

اب چالیس ہزار مرد و زن کا دوسرا دستہ خود پیٹر کی سرکردگی میں بھیجا گیا۔ ایک گوشہ نشین زاہد فوجوں کے انتظام سے بے خبر تھا۔ اپنی ناتجربہ کاری کی وجہ سے وہ راستے کی ضروریات کا اندازہ نہ کر سکا اور اس کے ہمراہیوں کو بھیک مانگ کر گذارا کرنا پڑا۔ جب یہ لوگ اس مقام پر پہنچے جہاں اہل بلغاریہ نے گزشتہ لشکر کو تہہ تیغ کیا تھا تو انتقاماً شہر پر حملہ کر کے سات ہزار باشندوں کو قتل کر دیا۔ یہ حالات دیکھ کر قیصرِ روم گھبرا گیا اور اس نے اس لشکر کو شہر میں داخل کیے بغیر جہازوں میں بٹھا کر باسفورس کے پار اتار دیا۔ ایشیاء میں قدم رکھنے کے بعد انہوں نے دل کھول کر مظالم ڈھائے۔ ماؤں کی گودوں سے بچے چھین کر ذبح کیے۔ اپنے اندھے پن میں انہوں نے تعصب کی حد کر دی اور صلیب کے جھنڈے کے نیچے ایسے جرائم کا ارتکاب کیا کہ فطرت کانپ اٹھتی ہے۔ قلیج ارسلان نے ان سے مقابلہ کیا اور شکست فاش دی۔ اس طرح سارا لشکر برباد ہو گیا۔

تیسرا گروہ جو جرمنی کے کروسیڈروں پر مشتمل تھا ان پر ایسی خود فراموشی طاری تھی کہ جس مقصد کے لئے نکلے تھے وہ بھول بھال کر راستے میں لوٹ مار اور قتل و غارت کرنے لگے۔ تنگ آ کر اہلِ ہنگری نے ان کا مقابلہ کیا اور بلگریڈ کے میدان کروسیڈروں کی ہڈیوں سے پٹ گئے۔

ان تلخ تجربات نے یورپ میں بددلی پھیلانے کے بجائے مزید جوش بڑھا دیا اور بالآخر ۱۰۹۷ء میں یورپ کے چھوٹے بادشاہوں نے ایک باضابطہ فوج تیار کی۔ یہ پانچ لاکھ پیادہ اور ایک لاکھ سواروں پر مشتمل تھی۔ ایک سال کی سخت ترین آزمائشوں کے بعد جن میں قحط اور وبا جیسی سختیاں بھی شامل تھیں، بالآخر ۱۰۹۸ء کے وسط میں صلیبی فوجیں انطاکیہ فتح کرنے میں کامیاب ہو گئیں جس سے عیسائیوں کے قدم مشرق میں جم گئے۔ اس کے ایک سال بعد وہ یروشلم پر بھی قابض ہو گئے۔ کئی ہفتوں تک شہروں میں قتل عام کیا گیا۔ صرف مسجد اقصیٰ میں ستر ہزار مسلمان قتل ہوئے۔ مسجد کے صحن میں گھٹنوں گھٹنوں خون بہنے لگا۔ بچ جانے والے مسلمانوں کے بارے میں کونسل نے موت کا فتویٰ دیا۔ ان کو چھتوں سے گرا کر اور کچھ کو آگ میں جلا کر مارا گیا یہاں تک کہ لاشوں کے ڈھیر لگ گئے۔ مسلمانوں کی ایک معمولی تعداد جان بچانے میں کامیاب ہو گئی۔ وہ بھاگ کر یروشلم کے مسلمانوں کی بے بسی کی دہائی خلیفۂ بغداد کے دربار میں دینے گئے۔ مگر وہاں سے کم ہمتی کے کلمات، جھوٹے دلاسوں اور آنسوؤں کے سوا انہیں کچھ نہ ملا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس کے بعد اگلے تیس سال تک عیسائی اور مسلمان مسلسل جنگوں میں مصروف رہے۔ عیسائیوں نے بار بار کی شکستوں کے باوجود کم ہمتی نہیں دکھائی۔ اگست ۱۱۳۱ء تک یروشلم کی حکومت مضبوط اور وسیع ہوگئی تھی۔ وہ مصریوں سے عکہ، صور اور طرابلس کے علاقے چھین چکے تھے۔ ان کے مقابل مسلمان امیر آپس میں اور عیسائیوں سے لڑ کر کمزور ہوگئے تھے۔ مصری سرحد پر صرف حلب، حمص، حماۃ اور دمشق چار شہر بچے تھے جن کی حالت ہر لحاظ سے ابتر تھی۔ تجارتی قافلے عیسائی حملوں کی وجہ سے عرصے سے بند ہوگئے تھے۔ سڑکیں ویران تھیں۔ جو شہر فتح نہیں ہوئے تھے وہ بھی عیسائیوں کو خوش رکھنے کے لئے خراج دیتے تھے۔

ان حالات میں عماد الدین زنگی نمودار ہوا۔ پہلے مسلمان امیروں سے نمٹ کر اس نے مسلمانوں کی طاقت کو یکجا کیا۔ پھر عیسائیوں کی طرف متوجہ ہوا۔ آس پاس کے علاقوں کو فتح کرنے کے بعد وہ ایڈیسہ کے صوبے کو فتح کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی مسلمانوں میں وہ انتہائی مقبول ہوگیا اور خلیفہ کے حکم سے اس کا نام بغداد میں خطبوں میں داخل کر دیا گیا۔ اس کی فتوحات میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا جب اچانک اس کے غلام نے اسے سوتے میں قتل کر دیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا نور الدین زنگی تخت نشین ہوا جو اپنے باپ کی طرح شجاع اور باہمت انسان تھا اور خاموشی سے بیٹھ کر تماشہ دیکھنے والوں میں نہ تھا۔

عیسائی ایڈیسہ کی شکست کو آرام سے ہضم نہ کر سکتے تھے۔ چنانچہ شہر پر قابض ہونے کے لئے رات کو شب خون مارا گیا۔ مگر وہ خود اپنی تدبیر کے دام میں گرفتار ہوئے اور نور الدین ان کو بدترین شکست دینے میں کامیاب رہا۔

یہ حالات دیکھ کر پادریوں کا ایک گروپ پھر یورپ روانہ ہوا اور زنگی خاندان کی طرف سے لاحق خطرات کی نشاندہی کی۔ ان کی یہ کوشش کامیاب ہوئی اور سینٹ برنارڈ نامی واعظ نے اپنی تقریروں کے ذریعے ہر طرف آگ لگا دی۔ یہاں تک کہ یورپ کے دو بڑے ملکوں کے بادشاہ (جرمنی اور فرانس) اس کا ساتھ دینے کے لئے تیار ہوگئے۔ دوسرے کروسیڈ کے آغاز میں جرمنی کا بادشاہ بہت بڑی فوج لے کر چل پڑا۔ مگر قونیہ کے سرحدی مسلمانوں نے اسے بے خبری میں جا پکڑا اور وہ بدترین شکست سے دوچار ہوکر واپس یورپ چلا گیا۔ شہنشاہ فرانس اب اپنی فوج کے ساتھ دمشق فتح کرنے کے ارادے سے روانہ ہوا۔ دمشق گرچہ خاصا کمزور ہو چکا تھا لیکن وہاں کے مسلمانوں نے آسانی سے ہار نہ مانی۔ طویل محاصرے اور لڑائیوں کے بعد بھی جب کوئی نتیجہ نہ نکلا تو فرانسیسی بادشاہ واپس یورپ لوٹ گیا اور یوں دوسرا کروسیڈ بھی ختم ہوا۔

نور الدین نے اس کے بعد دمشق کو فتح کرکے صلاح الدین کے چچا شیر کوہ کو اس کا حاکم مقرر کیا۔ نجم الدین ایوب (صلاح الدین کا باپ) تو پہلے ہی نور الدین کا مشیر خاص تھا۔ اس طرح صلاح الدین کا مستقل تعلق

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دربار شاہی سے پیدا ہو گیا۔

اس دوران میں عیسائیوں نے جو چین سے بیٹھنے والے نہ تھے عسقلان (جو خلافت مصر کے ماتحت تھا) پر قبضہ کرلیا۔ مصر مسلسل ان کی نگاہ میں تھا جس کے اندرونی حالات انتہائی دگرگوں تھے۔ اسی زمانے میں مصر کے ایک وزیر شاور سعدی کو جس نے بہت طاقت حاصل کر لی تھی چند وجوہات کی بناء پر مصر بدر کر دیا گیا۔ وہ سیدھا نورالدین زنگی کے دربار میں پہنچا اور فریاد کی۔ نورالدین پہلے ہی مصر کے خراب حالات کی بناء پر سخت پریشان تھا۔ اس نے صلاح الدین کے چچا شیرکوہ کو فوج دے کر شاور کے ساتھ کر دیا۔ شیرکوہ کو کامیابی حاصل ہوئی اور قاہرہ کی وزارت پر اس کا قبضہ ہو گیا۔ لیکن شاور اپنے عہد سے پھر گیا اور شیرکوہ کو مصر سے چلے جانے کو کہا۔ نہ صرف یہ بلکہ فلسطین کے صلیبیوں سے مدد بھی مانگ لی۔ چنانچہ بیت المقدس کا فرنگی بادشاہ ایمالرک ایک بڑے لشکر کے ساتھ مصر پہنچ گیا۔

شیرکوہ مجبوراً قلیل فوج کے ساتھ قلعہ بند ہو گیا۔ جب نورالدین نے اس بدعہدی اور عیسائی فوج کی آمد کی خبر سنی تو حارم نامی عیسائی شہر کا محاصرہ کرلیا اور جلد ہی انہیں شکست سے دوچار کیا۔ جب یہ خبر مصر پہنچی تو صلیبی فوج جس نے شیرکوہ کو گھیر رکھا تھا محاصرہ اٹھا کر واپس لوٹ گئی اور شیرکوہ واپس دمشق نورالدین کی خدمت میں حاضر ہوا۔

شیرکوہ نے واپس جا کر نورالدین کو یقین دلایا کہ مصر کی طاقت پارہ پارہ ہو چکی ہے اور اگر مسلمان آگے نہ بڑھے تو کل مصر بھی عیسائیوں کے قدموں تلے ہو گا۔ نورالدین حملے کے لئے راضی ہو گیا اور شیرکوہ صلاح الدین کو ہمراہ لے کر ایک بار پھر مصر کی جانب روانہ ہوا۔

اس اثناء میں صلیبی لشکر بانین کے مقام پر صف آراء ہو چکا تھا۔ یہ معرکہ حیرت انگیز ثابت ہوا جس میں چند ہزار کے مسلمان لشکر نے دشمن کو ذلت آمیز شکست دی۔ اس کے جواب میں عیسائیوں نے اسکندریہ (مصر) کا محاصرہ کرلیا۔ صلاح الدین ایوبی اور اس کی فوج نے بڑی بہادری سے شہر کو بچایا۔ اسی دوران شیرکوہ آس پاس کے علاقوں کو بھی زیر کرتا رہا۔ بالآخر مسلمانوں اور عیسائیوں میں صلح کا معاہدہ ہوا اور دونوں فوجیں مصر سے واپس چلی گئیں۔

شیرکوہ کے پلٹتے ہی عیسائیوں نے بدعہدی کر کے شاور سے معاہدہ کرلیا جس کی رو سے انہیں قاہرہ میں اپنا ایک نمائندہ رکھنے اور حکومتِ مصر کے خرچ پر ملک کے کچھ علاقوں میں فوج متعین کرنے کا حق مل گیا۔ اب انہوں نے مسلمانوں پر نئے سرے سے ظلم ڈھانے شروع کئے۔ فاطمی خلیفہ جو صرف نام کا خلیفہ تھا پھر سلطان نورالدین زنگی سے امداد کا طالب ہوا۔ سلطان نے شیرکوہ کو ایک لشکر دے کر مصر روانہ کیا۔ یہ وہی مہم ہے جس میں صلاح الدین بادل نخواستہ اپنے چچا کے ساتھ شریک ہوا۔ شیرکوہ کی آمد کی خبر سن کر صلیبی بھاگ گئے۔ فاطمی خلیفہ عاضد

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور مصری عوام نے انہیں اپنا نجات دہندہ سمجھ کر پر جوش استقبال کیا۔ خلیفہ عاضد کے حکم سے شاور کی گردن ماردی گئی اور شیرہ کوہ کو وزیراعظم اور فوج کا سپہ سالار مقرر کیا گیا۔ لیکن اس کے دو ماہ بعد ہی شیرکوہ کا انتقال ہو گیا۔

مصر کی وزارتِ عظمیٰ

شیرکوہ کے انتقال کے بعد خلیفہ عاضد کی نگاہ اس کے جواں سال بھتیجے پر پڑی جس کی قابلیت کا وہ قائل ہو چکا تھا۔ چنانچہ صلاح الدین کو وزارتِ عظمیٰ پر فائز کر دیا گیا۔ اسے ملک الناصر کا خطاب ملا۔

وزیراعظم بننے کے بعد صلاح الدین کے مزاج میں مزید سنجیدگی پیدا ہوگئی۔ اس نے تالیفِ قلب کے لئے خوب فیاضی سے کام لیا۔ رعایا، اہلکاروں اور اکابرینِ سلطنت کو خوش کیا۔ علماء وفضلاء کی صحبت اختیار کی۔ محلات کے بجائے ایک چھوٹے سے مکان میں رہائش پذیر ہوا۔ مصر میں شیعہ عناصر کے بجائے اہل سنت والجماعت کی تائید کی۔ اس کے اس اقدام سے مصر کے شیعہ عناصر ناراض ہو گئے۔ انہوں نے حبشیوں کی مدد سے صلاح الدین کے خلاف سازش کی جو بروقت پکڑی گئی۔

ابھی یہ فتنہ مکمل طور پر فرو نہ ہوا تھا کہ بیت المقدس کے صلیبی پھر آ پہنچے اور دمیاط کے علاقے کا محاصرہ کیا۔ قدرت کی خصوصی مدد بروقت آ گئی۔ شدید طوفان نے ان کے بیڑے کو تباہ و برباد کر دیا اور بارشوں نے ان کے خیمے اور دبابے الٹ دیئے۔ فوج محاصرہ اٹھا کر لوٹنے پر اصرار کرنے لگی اور بادشاہ مجبوراً ناکام و نامراد واپس چلا گیا۔

اب صلاح الدین ایوبی ایک مضبوط سلطنت کی بنیاد ڈالنے میں کامیاب ہو گیا۔ کچھ ہی عرصے بعد فاطمی خلیفہ عاضد کا بھی انتقال ہو گیا اور مصر میں فاطمی سلطنت کا چراغ بجھ گیا۔ اس زمانے میں صلاح الدین ایوبی اور نورالدین زنگی کے درمیان کچھ غلط فہمی پیدا ہوئی لیکن صلاح الدین کے والد نجم الدین کی بروقت مداخلت سے معاملات دوبارہ سنبھل گئے۔ ۱۱۷۳ء میں نجم الدین ایوب کا انتقال ہو گیا۔

محض ایک سال کے بعد عالمِ اسلام کے نامور فرزند نورالدین زنگی کی موت نے سب کو ہلا کر رکھ دیا۔ مسلمانوں کی تاریخ میں بہت کم بادشاہ منصف مزاجی، رحمدلی، دانشمندی، دینداری اور جہاد کی خواہش میں اس کے بالمثل نظر آئیں گے۔ قابل افسوس امر یہ تھا کہ اس کا جانشین گیارہ سالہ بچہ صالح تھا، جسے چند امراء نے پوری طرح قابو کر رکھا تھا۔ انہی میں کا ایک امیر سعدالدین گمشتگین نوعمر بادشاہ کو دمشق سے لے کر حلب چلا گیا اور شہر کو عیسائیوں کے حملے کے لئے بے سہارا چھوڑ دیا۔ عیسائی تو موقعے کے انتظار میں رہتے تھے۔ انہوں نے جھٹ شہر کا محاصرہ کر لیا۔ آخر اہل دمشق نے بھاری تاوان دے کر ان سے نجات حاصل کی اور صلاح الدین سے مدد کی درخواست کی۔ اس سے قبل یہ بتانا ضروری ہے کہ اس عرصے میں صلاح الدین نے سلطنتِ مصر میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

صالح کے نام کا سکہ جاری کروا دیا تھا اور اپنی اطاعت کا اسے یقین دلا چکا تھا۔

صلاح الدین سخت پریشانی کے حالت میں دمشق پہنچا تو شہر والوں نے اس کے لئے دروازے کھول دیئے۔ اس نے اپنے آقا نورالدین زنگی کے محل کا رخ کرنے کے بجائے اپنے باپ کے مکان میں سکونت اختیار کی اور نوعمر سلطان صالح کو یقین دلایا کہ اس کی دمشق آمد کا مقصد سلطنت کو تباہی سے بچانا ہے۔ مگر اس کے جواب میں سلطان صالح کی جانب سے اسے احسان فراموش اور نمک حرام ہونے کا طعنہ دیا گیا۔

صلاح الدین غصے میں بھرا ہوا اپنی صفائی پیش کرنے حلب روانہ ہوا مگر گمشتگین نے نوعمر بادشاہ کے کان بھر رکھے تھے۔ صلاح الدین شہر کے قریب پہنچا تو صالح گھوڑے پر سوار ہو کر حلب کے بازار میں نکل آیا اور اہلِ شہر سے اپیل کی کہ اس احسان فراموش شخص (صلاح الدین) کی یورش سے اسے نجات دلائیں۔ اہلِ حلب نے اس اپیل سے متاثر ہو کر صلاح الدین سے لڑائی کی اور شکست کھائی۔ اتابک خاندان کو بار بار صلح کی پیشکش کرنے کے باوجود صلاح الدین انہیں اپنی طرف مائل نہ کر سکا۔ تاہم اس نے شام کو صلیبی طاقتوں کے خطرے سے بچانے کی خاطر اس پر اپنا قبضہ برقرار رکھا۔ وقتاً فوقتاً اتابکی خاندان اس سے الجھنے کی کوشش کرتا یہاں تک کہ بدنام زمانہ گروہ حشاشین کے ذریعے سے اس پر قاتلانہ حملے کی سازشیں بھی کی گئیں جو سب ناکام رہیں۔ اب اکثر اتابکی حاکموں نے اس کی اطاعت قبول کر لی۔ ۱۱۷۵ء میں خلیفۂ بغداد کی جانب سے اسے مصر اور شام کے بادشاہ کی حیثیت سے خلعت سے نوازا گیا۔ ۱۱۸۱ء میں ملک صالح کے انتقال کے بعد محض ایک سال کے عرصے میں مغربی ایشیاء کے تمام فرمانروا سلطان کی بالادستی تسلیم کر چکے تھے جن میں قونیہ کا ترک حکمران اور آرمینیا کے حاکم بھی شامل تھے۔

صلاح الدین اور صلیبی دنیا

اس تمام عرصے میں عیسائی وقتاً فوقتاً سلطان سے ٹکر لیتے رہے۔ سلطان نورالدین زنگی کی وفات کے فوراً بعد یروشلم کے بادشاہ نے شہنشاہ قسطنطنیہ کے ساتھ مل کر مصر پر حملہ کیا مگر بدترین شکست سے دوچار ہوا۔

اس طرح کی مسلسل کارروائیاں صلاح الدین ایوبی کو چین سے نہ بیٹھنے دیتیں۔ اگر وہ عیسائیوں کی جانب سے غفلت برتتا تو وہ بے خبری میں اس پر آ پڑتے۔ لہٰذا فوج کا ایک حصہ جہاد کے لئے ہائی الرٹ رہتا تھا۔

۱۱۷۸ء میں سلطان خود بھی مصر سے جہاد کی غرض سے غزہ اور عسقلان گیا۔ عسقلان پہنچ کر سلطان کو کوئی فوج مقابلہ کرنے والی نظر نہ آئی اور لشکر شہر میں متفرق ہو گیا۔ عیسائیوں نے اس دوران لڑائی کے لئے تیاری مکمل کر لی۔ دورانِ جنگ مسلمانوں کی جنگی حکمت عملی ناکام ہوگئی اور ان کے پاؤں اکھڑ گئے۔ سلطان خود چند

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آدمیوں کے ساتھ ریگستان میں راستہ بھول گیا۔ کئی دن کی بھوک پیاس کی مصیبت جھیل کر بڑی مشکل سے مصر واپس پہنچا۔ مسلمان فوج بڑے نقصان سے دوچار ہوئی جس کی تلافی سلطان نے اگلے تین ماہ میں عیسائی بادشاہ بالڈون کو شکست دے کر اور اس کے نو تعمیر شدہ قلعے فورٹ جیکب پر قبضہ کر کے کی۔ عیسائی بادشاہ کو صلح کے سواء کوئی دوسرا راستہ سجھائی نہ دیا چنانچہ سلطان سے صلح کی درخواست کی جو قبول کر لی گئی اور دو سال کے لئے باہمی صلح نامہ طے پا گیا۔

اس تمام عرصے میں ریجنالڈ نامی شخص کی کارروائیاں مسلمانوں کے خلاف جاری رہیں۔ اس نے مختلف اوقات میں عیسائی امراء کی بیواؤں سے شادی کر کے قوت حاصل کر لی اور پہلے انطاکیہ اور بعد میں کرک کے نواح کے مسلمانوں کو تنگ کیا۔ روزانہ کرک کی نواحی بستیوں میں تازہ حملے کر کے وہ بربادی پھیلاتا۔ حاجیوں کے کاروانوں کو لوٹتا، عورتوں اور بچوں کو قید کرتا اور غیر مسلح لوگوں کو بے دریغ قتل کرتا۔ سلطان نے صلح نامے کا پاس کرتے ہوئے براہ راست ٹکر لینے کے بجائے بالڈون کے پاس اس عہد شکنی کی کئی بار شکایت کی۔ لیکن جب یہ سب بے اثر ہو گئیں تو سلطان نے ہتھیار اٹھانے کے بارے میں سوچا۔ اسی اثناء میں یہ خبریں گردش کرنے لگیں کہ ریجنالڈ نے حرمین شریفین کو فتح کرنے اور کعبہ کو لوٹنے کے ارادے سے بحری اور بری دونوں فوجیں روانہ کر دی ہیں۔ سلطان نے اس وحشتناک خبر کو سن کر سمندری فوج کے پیچھے مصر سے جہاز روانہ کئے اور خشکی پر شام سے لشکر بھیجے۔ عیسائی مقام رابغ تک جا پہنچے تھے، جب اسلامی فوج نے انہیں جا لیا اور چن چن کر ایک ایک کو قتل کر ڈالا۔

ایک برس کے بعد ریجنالڈ نے ایک بار پھر اپنے بحری بیڑے کے ذریعے بحر قلزم کے راستے مدینے پر حملے کا پروگرام بنایا۔ مسلمان امیر البحر لؤلؤ نے اس کا سمندری تعاقب کیا۔ عیسائیوں نے مسلمان فوج کو آتا دیکھا تو ان کے ہوش اڑ گئے۔ ساحلی بستی میں اتر کر پہاڑوں کی طرف بھاگنے اور چھپنے لگے۔ مسلمان سپاہ نے دشمن کا تعاقب کیا اور ایک ایک شخص کو اس کے انجام تک پہنچایا، سوائے ریجنالڈ کے جو ایک بار پھر بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔ کرک پہنچ کر وہ پھر اپنی مسلمان دشمن سرگرمیوں میں مصروف ہو گیا۔

سلطان نے ریجنالڈ کو مکہ، مدینہ کی طرف میلی نظر سے دیکھنے کی سزا خود دینا چاہی اور اپنی سپاہ کے ساتھ اس کے قلعے تک جا پہنچا۔ ریجنالڈ کے سپاہی قلعے میں گھس گئے اور اس کا پل گرا دیا۔ مسلمانوں نے قلعے کا محاصرہ کر لیا اور خندق کے سامنے منجنیقیں نصب کروا دیں۔ حملے کی رات قلعے میں عیسائی ملکہ سبل کی بہن شہزادی ازابیل کی شادی ریجنالڈ کے کسی عزیز کے ساتھ ہو رہی تھی۔ سلطان کو جب علم ہوا کہ قلعے کے ایک برج میں دلہا دلہن ٹھہرے ہوئے ہیں تو حکم دیا کہ اس برج کو نشانہ نہ بنایا جائے۔ قلعے کا محاصرہ مہینے بھر جاری رہا۔ اتنے میں طبریہ کا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حاکم ریمنڈ مدد لے کر پہنچا۔ اس نے سلطان سے ملاقات کر کے پانچ سال کے لئے صلح کر لی۔ سلطان مطمئن ہو کر واپس لوٹ گیا۔

ریجنالڈ ایک بار پھر اپنی طبیعت سے مجبور ہو کر مسلمانوں سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگا۔ تاجروں کے ایک بہت بڑے قافلے کو لوٹ لیا اور ان کو قیدی بنا لیا۔ جب سلطان کی طرف سے ان کی رہائی کا مطالبہ آیا تو اس نے بے پروائی کا اظہار کرتے ہوئے حاجیوں کے ایک اور قافلے کو لوٹ لیا۔ جب انہوں نے فریاد کی تو ریجنالڈ بولا ''کہاں ہیں تمہارے نبی محمد (ﷺ) بلاؤ انہیں مدد کے لئے۔'' پھر بہت سے حاجی شہید کر دیے گئے۔

یہ واقعات سلطان کو برانگیختہ کرنے کے لئے کافی تھے۔ اس کے صبر کا پیمانہ چھلک گیا۔ اس نے اپنے عزم کا اظہار کرتے ہوئے کہا: ''انشاء اللہ، اس شخص کو میں اپنے ہاتھ سے ختم کروں گا۔''

۱۱۸۷ء میں سلطان اپنی فوج کے ساتھ طبریہ کی طرف بڑھا۔ ادھر عیسائیوں کا لشکر صفوریہ کے چشموں پر پہنچ کر منظم ہو گیا۔ لشکر سلطان کے مقابلے کے لئے اپنی جگہ چھوڑنا نہ چاہتا تھا۔ چنانچہ سلطان نے بہترین حکمتِ عملی کا مظاہرہ کرتے ہوئے طبریہ پر حملہ کر دیا اور اسے باآسانی فتح کر لیا۔ وہیں ریمنڈ[1] حاکمِ طرابلس کی بیوی اور بچے بھی تھے۔ اس خبر نے عیسائیوں میں کھلبلی مچا دی۔ آخر کار وہ پیش قدمی پر مجبور ہوئے۔ شدید گرمی کے موسم میں سارا دن چلتے رہے اور رات کو اس طرح بے خبر سوئے کہ گرد و پیش کی سدھ بدھ نہ رہی۔

اگلے دن دونوں فوجیں ایک دوسرے کے مدمقابل ہوئیں اور میدان گرم ہوا تو مسیحی لشکر صلیب الصلبوت اٹھائے آگے بڑھا۔ یہ صلیب اس لکڑی سے تیار کی گئی تھی جس پر مسیحیوں کے عقیدے کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سولی دی گئی تھی۔ صلیبی مسلمانوں کی تاب نہ لا سکے۔ ان کے قدم اکھڑنے لگے، مگر صلیب کی لکڑی ان کے جوش کو تازہ کرتی۔ وہ بار بار پلٹ کر آتے مگر کب تک۔ مسلمان سواروں کے تیز حملوں کی تاب نہ لا کر وہ پسپا ہو گئے۔ رات آ گئی تھی اور عیسائی فوج سخت نڈھال تھی۔ اس کے چاروں طرف لاشیں ہی لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ صبح ہوتے ہی مسلمانوں نے نئے سرے سے جو حملہ کیا تو زیادہ تر دشمن مارے گئے۔ باقی قید ہوئے۔ صرف ریمنڈ ایک مختصر سا دستہ ساتھ لے جانے میں کامیاب رہا۔

یہ فتح ایسی شاندار اور مکمل تھی کہ اس نے صلیبی طاقتوں کی کمر توڑ ڈالی۔ عیسائیوں کی صفوں کی صفیں الٹ دی گئیں تھیں۔ عیسائی سوار سرتاپا لوہے میں غرق تھے۔ ان کے جسم پر نیزے اور تلوار سے زخم لگانا مشکل تھا، اس لئے

---

(۱) یہاں قارئین کی آسانی کے لئے واضح کر دیں کہ یروشلم کا عیسائی بادشاہ اموری مرنے کے بعد اپنے پیچھے ایک بیمار اور کم عمر لڑکا بالڈون چھوڑ گیا جو سلطنت چلانے کا اہل نہ تھا۔ چنانچہ اس وقت کی کونسل نے ریمنڈ والی طرابلس کو اس کا سرپرست مقرر کر دیا۔ بعد میں ایک موقع پر بالڈون نے یروشلم کے مخصوص علاقے پر اپنا کنٹرول رکھتے ہوئے باقی سلطنت اپنے بہنوئی گائی یا گوئی کے حوالے کر دی۔ ریمنڈ اور گائی کے درمیان اقتدار کی رسہ کشی چلتی رہی یہاں تک کہ مسلمانوں کی مخالفت اور ان سے مقابلے کے لئے دونوں متحد ہو گئے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مسلمان افواج کو دگنی محنت کرنی پڑی۔ پہلے گھوڑے کو قتل کر کے سوار کو زمین پر گرانا پڑتا تھا اور پھر اس کو مارا جاتا تھا۔ قیدیوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ ایک ایک رسی میں تیس تیس چالیس چالیس عیسائی باندھ دیئے گئے اور سو سو دو دو سو قیدیوں پر ایک ایک مسلمان محافظ مقرر کیا گیا۔

فتح کے بعد سلطان نے ایک دربار منعقد کیا۔ اس میں تمام شاہی قیدی اس کے سامنے پیش کئے گئے۔ ان میں یروشلم کا بادشاہ گائی، اس کا بھائی، پرنس ریجنالڈ اور تمام عیسائی امراء شامل تھے۔ بادشاہ گائی تو ہیبت سے کانپ رہا تھا۔ سلطان نے اس کی یہ حالت دیکھ کر اس سے نرمی اور عزت کا سلوک کیا اور اس کے پینے کے لئے ٹھنڈا پانی منگوایا۔ بادشاہ نے خود پانی پیا اور بچا کر پرنس ریجنالڈ کو دے دیا۔ اس پر سلطان نے ٹوک کر کہا ''یہ پانی تم دیتے ہو، میں نہیں دیتا۔'' اس سے مراد یہ تھی کہ ریجنالڈ اس سے کوئی رعایت حاصل نہ کر سکے گا۔ یہ وہ شخص تھا جس کی رگ رگ میں اسلام اور مسلمانوں سے نفرت بھری ہوئی تھی۔ اپنے ان اسلام مخالف جذبات کی تسکین کے لئے وہ کسی بھی حد تک جانے کو تیار رہتا تھا۔ بارہا اس نے نبی کریم ﷺ کے بارے میں ناشائستہ الفاظ استعمال کیے۔ انتہاء درجے کی بدعہدی اور بدفطرتی اس کے مزاج کا حصہ تھی۔ اب اس سے بدلہ لینے کا وقت آ گیا تھا۔ سلطان کو اپنے ارادے سے اب کوئی باز نہ رکھ سکتا تھا۔ بادشاہ نے گرج کر اس کو اس کے طعنے یاد دلائے اور بولا ''میں ہوں جو تمہارے مقابلے پر ناموسِ مصطفیٰ ﷺ کی حفاظت کروں گا۔'' پھر اس سے پوچھا گیا کہ کیا وہ اسلام قبول کرنے پر رضامند ہے؟ اس نے انکار کیا تو سلطان نے اپنی تلوار نکال کر اس کا کام تمام کر دیا۔

جب بادشاہ گائی نے اپنے رفیق کا یہ حشر دیکھا تو گھبرا گیا۔ اس کا خیال تھا کہ اب اس کی باری ہے۔ لیکن سلطان نے اسے تسلی دی اور کہا کہ ''بادشاہ بادشاہوں کو قتل نہیں کرتے۔ لیکن وہ شخص شرافت کی تمام حدوں سے تجاوز کر گیا تھا۔'' پھر گرفتار شدہ امراء کے ساتھ بھی مہربانی سے پیش آیا اور ان سب کو بحفاظت دمشق بھجوا دیا۔

اسلامی فوج نے حطین کی فتح کے بعد محض ایک دن آرام کیا اور پھر سیلاب کی طرح ملک میں پھیل گئی۔ طبریہ اور عکہ فتح کرنے کے بعد پانچ سو کے قریب چھوٹے بڑے مقامات آسانی سے فتح کر لئے گئے۔ ان میں زیادہ تر علاقے امن و مصالحت سے زیر کئے۔ یوں پورا فلسطین شمال میں بیروت سے لے کر جنوب میں غزہ تک محض دو ماہ میں مسلمانوں کے قبضے میں آ گیا۔ یہ علاقے عیسائیوں نے پوری صدی جنگیں لڑ کر اور لاکھوں کا خون بہا کر حاصل کئے تھے۔ عیسائی اب مسلمان علاقوں میں سے صرف یروشلم اور صور پر قابض تھے۔

فتحِ بیت المقدس

ان تمام فتوحات کے بعد یروشلم فتح کرنے کی خواہش جو سلطان کی زندگی کا مقصد اور سب سے بڑی تمنا تھی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کو پورا کرنے کا وقت آ گیا تھا۔ اس غرض سے اس نے اسلامی حکومتوں کی منتشر طاقتوں کو جمع کرنے کے لئے دن رات کوششیں کی تھیں۔

سلطان نے بڑے پیمانے پر تیاریوں کا حکم دیا۔ علماء اور فضلاء کو اپنے ساتھ لیا اور اللہ کا نام لے کر چل پڑا۔ بیت المقدس کے قریب پہنچنے پر تمام امراء و مصاحبین اور اہلِ لشکر کا دربار منعقد کر کے ایسی دلنشین تقریر کی کہ سب کے دلوں پر رعب طاری ہو گیا۔ پھر سلطان نے سب کے سامنے قسم کھا کر کہا ''جب تک بیت المقدس پر اسلام کا جھنڈا نصب نہ کرلوں اور رسول مقبول ﷺ کے قدم کی پیروی نہ کروں اور صخرہ مبارک پر قابض نہ ہو جاؤں تب تک لڑوں گا۔''

دوسری جانب بیس ہزار صلیبی جنگ کے لئے تیار تھے۔ ملکہ سبل اور شہزادی ازابیل اپنے تنازعات بھول کر ایک ہوگئی تھیں۔ شہر کے قلعے میں آس پاس کے مفتوحہ علاقوں کے پناہ گزین جمع ہو گئے تھے۔

۱۵ رجب ۵۸۳ ہجری کو سلطان بیت المقدس کی طرف جا اترا اور محصور عیسائیوں سے کہا ''تمہاری طرح میں بھی اس شہر کو مقدس سمجھتا ہوں۔ میں یہاں خون بہانا نہیں چاہتا۔ اگر تم شہر حوالے کر دو تو عیسائی باشندے اجارہ دار کسانوں کی حیثیت سے زندگی بسر کریں گے۔'' مگر اس فیاضانہ پیشکش کو ٹھکرا دیا گیا۔

پانچ روز تک سلطان فوج کی ترتیب و تنظیم کرتا رہا۔ جمعہ کے دن ۲۰ رجب کو اس نے قلعے کے گرد منجنیقیں نصب کروائیں اور تیراندازوں کو منظم کیا۔ حملے کا آغاز ہوا اور قلعے کی فصیلوں میں جگہ جگہ دراڑ پیدا کرنے کے لئے مسلمان حملہ آوروں نے زبردست کوشش کی۔ بالآخر وہ نقب لگانے میں کامیاب ہو گئے۔ اگلی کوشش کے طور پر دیواروں کی بنیادوں میں لٹھے رکھ کر انہیں آگ لگا دی گئی۔ لٹھوں کے جلتے ہی دیوار میں شگاف پڑ گیا اور مسلمان جانباز تیروں کی بوچھاڑ میں شہر کے اندر داخل ہو گئے۔

عیسائی فوج میں مسلمانوں کی اس دلیری اور کامیابی نے ابتری اور بے دلی پھیلا دی۔ اب انہیں سوائے امان طلب کرنے کے کوئی چارہ نظر نہ آیا تو سلطان سے خدا کے نام پر رحم کی اپیلیں کرنے لگے۔ اسی خدا کے نام پر جس کی مخلوق پر اکیانوے برس قبل ان کے ہم مذہبوں کو کوئی رحم نہ آیا تھا۔ سلطان نہ مال غنیمت کا بھوکا تھا نہ کشور کشائی کا شوق رکھتا تھا۔ اس نے آسان ترین شرائط پر اہل شہر کو شہر سے نکل جانے کی اجازت دے دی۔

اگلے دن عجیب منظر تھا۔ انسانوں کا ایک لامتناہی قافلہ اپنا ساز و سامان اور اسلحہ اٹھائے شہر سے امن کے ساتھ رخصت ہو رہا تھا۔ سب سے پہلے بطریق پادری پادریوں کی جماعت کے ساتھ مسیح کی مقدس قبر پر تعمیر شدہ گرجا گھر کے زیورات اور خزانے اٹھائے ہوئے آیا جو اتنے بیش قیمت تھے کہ اندازہ لگانے والے حیران تھے کہ ان کی مالیت کیا ہے۔ پھر ملکہ سبل اپنی تمام دولت، مال و اسباب اور خدام کے ساتھ اس حال میں نکلی کہ اس کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پرانی شان بحال تھی۔ سلطان نے خود اسے رخصت کیا۔ برائے نام تاوان بھی ادا نہ کر سکنے والے دس ہزار غریب شہریوں کا تاوان خود سلطان نے ادا کیا۔ کچھ روتی پیٹتی عورتیں سلطان کے پاس یہ التجا لے کر حاضر ہوئیں کہ ان کے آدمی جنگ حطین اور بعد کے معرکوں میں مسلمانوں کے قیدی بن گئے ہیں۔ اگر ان کو رہا نہ کیا گیا تو وہ بے سہارا ہو جائیں گی۔ سلطان کا دل نرم پڑ گیا، اس نے ان کے شوہر، بیٹے اور بھائی رہا کر دیئے۔ بعض لوگ اپنے کندھوں پر ضعیف والدین کو اٹھائے لئے جا رہے تھے۔ سلطان نے عیسائیوں کی خاص فوج (ہاسپٹلرز) کو حکم دیا کہ وہ بیمار اور زخمی شہریوں کی تیمارداری کا کام انجام دیں۔ مفتوح عوام کے جذبات کا لحاظ کرتے ہوئے سلطان اس وقت تک شہر میں داخل نہیں ہوا جب تک وہ سب رخصت نہ ہو گئے۔

جمعہ کے روز شبِ معراج ۵۸۳ ہجری کو بیت المقدس ۹۱ برس بعد ایک بار پھر مسلمانوں کے ہاتھ آ گیا۔ سلطان اپنے خیمے میں بیٹھا مبارکبادیں وصول کر رہا تھا۔ خوشی سے اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ ہر طرف خوشی و مسرت کا اظہار ہو رہا تھا۔ قاری حضرات قرآن مجید کی تلاوت کر رہے تھے۔ ایک طرف کچھ شعراء بیٹھے مبارکباد کے قصائد سنا رہے تھے۔ سلطان نے یہ خوشخبری تمام عالمِ اسلام میں پہنچانے کے لئے ستر سے زیادہ خطوط تحریر کروائے۔ سب سے طویل خط خلیفۂ بغداد کو تحریر کیا گیا۔

ایک صدی کے عرصے میں بیت المقدس کی ہیئت بالکل بدل گئی تھی۔ دیواروں پر تصویروں اور مجسموں کی کثرت نے توحید کا نام و نشان تک مٹا دیا تھا۔ صخرہ شریف کو سنگ مرمر کے سلوں سے چھپا دیا گیا تھا۔ مسجد کو اس حال میں دیکھ کر مسلمانوں کو بہت افسوس ہوا۔ سلطان نے مسجد کی اصلی حالت بحال کروائی۔ اس کو عرق گلاب سے دھلوایا اور صاف کرا کے نمازیوں کے لئے آراستہ کیا گیا۔ اگلا جمعہ مسلمانوں کی خوشی اور اسلام کی شان و شوکت کے مظاہرے کا دن تھا۔ مسجد نمازیوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ خطبے کے لئے سلطان نے قاضی محی الدین کو اشارہ کیا۔ انہوں نے بیت المقدس کی تاریخ اور پھر فتح کی صورت میں خداوند کریم کے خصوصی احسان کا بیان اتنے خوبصورت اور پراثر انداز میں کیا کہ لوگ رونے لگے۔ اس کے بعد وہ عالیشان منبر رکھا گیا جسے نور الدین زنگی نے ۲۳ برس قبل بیت المقدس کی فتح کی خواہش میں زر کثیر خرچ کر کے تعمیر کروایا تھا۔ لیکن وہ یہ تمنا دل میں لئے رخصت ہو گیا اور خدا تعالیٰ نے یہ سعادت اس کے جانشین صلاح الدین ایوبی کی قسمت میں لکھ دی۔

بیت المقدس کی فتح کے بعد سلطان نے طرطوس اور انطاکیہ کو بھی باآسانی فتح کر لیا۔ بقول ہیرلڈ لیمب ''صلاح الدین نے انطاکیہ کو ایسی آسانی سے فتح کیا جیسے دہقان پکی ہوئی فصل کو درانتی سے کاٹتا چلا جائے۔''
رمضان کا مہینہ آ گیا۔ اس بابرکت مہینے میں بھی سلطان نے جہاد کی مشقت برداشت کی اور کرک کے اس عظیم الشان قلعے کو فتح کر لیا جو کبھی ریجنالڈ کی پناہ گاہ تھا اور جہاں سے نکل کر وہ مسلمانوں پر حملے کرتا تھا۔ کرک کی تسخیر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے بعد سلطان واپس بیت المقدس پہنچا اور رمضان کے باقی دن مسجد اقصیٰ میں عبادت کر کے گزارے۔

تیسری صلیبی جنگ

ان فتوحات کی اطلاعات جب یورپ پہنچیں تو عیسائی دنیا میں غیض وغضب کی آگ بھڑک اٹھی۔ یروشلم کے سابق بادشاہ گائی (جسے سلطان نے معافی دے دی تھی) نے بدعہدی کرتے ہوئے افواج اور رضا کار جمع کیے اور سلطان کے مقابلے کے لئے نکل کھڑا ہوا۔ صلیبیوں نے عکہ شہر کا محاصرہ کر لیا۔ یہیں سے تیسری صلیبی جنگوں کا ایک سلسلہ چل نکلتا ہے جس کے واقعات کو اختصار کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے۔

سلطان عکہ کی حفاظت کے لئے جب پہنچا تو اس وقت تک شہر کا محاصرہ ہو چکا تھا۔ سلطان نے محاصرہ کرنے والی عیسائی افواج کے بالمقابل ڈیرے ڈال دیئے۔ اب اہل شہر عیسائیوں کے محاصرے میں تھے جبکہ عیسائی سلطان کے گھیرے میں تھے۔ ابتدائی معرکوں کے بعد ایک روز عیسائیوں نے توقع کے خلاف اس زور کا حملہ کیا کہ مسلمان افواج کچھ دیر کے لئے اسے برداشت نہ کر سکیں اور ممتاز مسلمان افسران نے جام شہادت نوش کیا۔ پھر بروقت سنبھلنے کی وجہ سے معرکے کا رنگ بدل گیا اور عیسائی دس ہزار سپاہ سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ ان لاشوں کی سرانڈ سے وبا پھوٹ پڑی اور سلطان کو مجبوراً کچھ عرصے کے لئے علاقہ چھوڑنا پڑا۔

معرکے کے دوسرے دور کے آغاز میں اہل شہر (عکہ) کو ایک نئی مصیبت کا سامنا کرنا پڑا۔ صلیبیوں نے عکہ کی فصیلوں سے بھی بلند برج اور دبابے اس طرح بنائے کہ ان پر آگ اثر انداز نہ ہو۔ ان پر منجنیقیں نصب تھیں۔ جو ان کی زد میں آتا وہ زندہ نہ بچتا۔ اس کا توڑ ضروری تھا۔ چنانچہ ایک دمشقی انجینئر نے ایسا آتش گیر مادہ تیار کیا جو مرتبانوں میں بھر کر دبابوں پر مارا گیا تو انہیں آگ لگ گئی اور اس کے ساتھ ان کا یہ ہتھیار بے کار ہو گیا۔

اہلِ شہر اور مسلمان سپاہ اپنی اس کامیابی پر خوش تھے کہ انہیں یورپ کے تمام بڑے بادشاہوں[1] کی روانگی کی اطلاعات ملیں۔ سلطان متفکر ہوا اور عالمِ اسلام سے مدد چاہی۔ مگر سوائے اس کی اپنی سلطنت کے کہیں سے مدد کی کوئی سبیل پیدا نہ ہوئی۔ اس کے باوجود خدا کا کرنا یہ ہوا کہ اگلے معرکوں میں صلیبی بری طرح شکست کھا گئے۔ ادھر سے یہ اطلاعات ملیں کہ جرمنی کا بوڑھا بادشاہ جو سلطان سے مقابلے کے لئے آ رہا تھا ڈوب کر مر گیا۔ اس کی فوج میں پھوٹ پڑ گئی اور اس کے بیشتر سپاہی وطن لوٹ گئے۔ اس مصیبت کے ٹلتے ہی فرانسیسی بادشاہ فلپ ایک لشکر کے ساتھ آ پہنچا۔ عکہ کے محاصرے کو ایک سال ہو چلا تھا۔ عیسائی فوج میں تازہ دم سپاہیوں کا

(۱) جرمنی کا بادشاہ فریڈرک، فرانس کا بادشاہ فلپ اور انگلستان کا بادشاہ رچرڈ صلاح الدین کے مقابل ہوئے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اضافہ ہورہا تھا۔ ایک بار پھر لڑائی کا آغاز ہوا۔ سلطان کی فوج اور سامنے سے اہل شہر نے انتہائی پامردی سے مقابلہ کیا اور عیسائیوں کا زور ٹوٹ گیا۔ ان لڑائیوں سے ابھی ذرا فرصت نہ ہوئی تھی کہ انگلستان کا بادشاہ رچرڈ بھی عظیم الشان لشکر کے ساتھ آدھمکا۔ یہ وہی رچرڈ ہے جو اپنی بہادری کے سبب تاریخ میں رچرڈ شیر دل کے نام سے جانا جاتا ہے۔ رچرڈ اور فلپ آپس میں ایک نہ تھے۔ فلپ مسلمانوں کے ہاتھوں نقصان اٹھانے کے بعد بد دل ہو کر واپس چلا گیا۔ مگر اپنی بیشتر افواج مقابلے کے لئے عکہ ہی میں چھوڑ گیا۔

رچرڈ کے تازہ دم لشکر نے فصیل میں شگاف کر دیا۔ اہل شہر فاقہ زدہ ہونے کے باوجود شگاف پر کرتے رہے۔ وہ آگ کے گولے پھینک پھینک کر عیسائیوں کو پیچھے ہٹاتے۔ ادھر سلطان ایک فوج سے نمٹتا کہ دوسری فوج آن پہنچتی۔ اس نے صلیبیوں کو بہت نقصان پہنچایا اور زیادہ تر لڑائیوں میں اس کا پلڑا بھاری رہا۔ مگر اب قحط اور وبا نے اہل شہر کو مجبور کر دیا کہ وہ صلح کی درخواست کریں۔ یوں دو سال کی طویل جنگوں کے بعد عیسائی شہر پر قابض ہو گئے۔ لیکن اس کے لئے انہیں ایک لاکھ بیس ہزار عیسائیوں کا خون دینا پڑا۔

اب سلطان اور رچرڈ کے درمیان کئی خونریز معرکے ہوئے۔ اکثر معرکوں میں رچرڈ کو بری طرح شکست ہوئی۔ مگر وہ ایسا شجاع تھا کہ اس کے پسپا ہوتے ہوئے سپاہی اس کی ہمت، بہادری اور شجاعت کو دیکھ کر واپس پلٹ آتے۔ اس پر یہ کہ وہ مایوس بھی نہ ہوتا تھا۔ اس نے عسقلان کو فتح کرنے کا پروگرام بنایا۔ سلطان کو خبر ملی تو تیزی سے وہاں پہنچ کر شہر خالی کرا دیا اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ رچرڈ اس عظیم شہر کے سامنے پہنچ کر مبہوت ہو گیا۔ اس پر سلطان کا رعب طاری ہو گیا۔ اس کی سپاہ بھی آرام کرنا چاہتی تھی۔ ایک اطلاع یہ بھی آئی کہ اس کے بھائی نے انگلستان میں شاہی خزانے پر قبضہ کر لیا ہے۔ ان سب اطلاعات کے ساتھ سلطان کا عزم سامنے رکھا تو اسے واپسی کا خیال آیا۔ بہر حال آخری کوشش کے طور پر وہ بیت المقدس کی جانب بڑھا مگر سلطان اس کی حفاظت کا انتظام کر چکا تھا۔ عیسائی محاصرہ کرنے سے گھبرا گئے اور رملہ کی طرف ہٹنے لگے۔ سلطان نے بڑھ کر جافا پر قبضہ کر لیا۔ لیکن یہ ہاری ہوئی جنگ رچرڈ نے مسلمانوں کے درمیان بدنظمی سے فائدہ اٹھا کر جیت لی اور جافا واپس لے لیا۔

اب رچرڈ اور اس کی افواج واپس جانا چاہتی تھیں۔ چنانچہ صلح کی گفتگو شروع ہوئی جس میں مسلمان اپنی مرضی کی شرائط تسلیم کروانے میں کامیاب ہو گئے۔ عکہ سے جافا تک کا علاقہ عیسائیوں کے قبضے میں رہا۔ رچرڈ اور اس کی فوج واپس چلی گئی اور تیسری صلیبی جنگوں کا سلسلہ اپنے اختتام کو پہنچا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وفات

معاہدہ رملہ سے فارغ ہونے کے بعد سلطان دمشق پہنچ کر حکومتی معاملات چلانے لگا۔ حج پر جانے کا ارادہ باندھا، مگر اس پر عمل پیرا نہ ہو سکا۔ حج کا موسم گذر گیا اور حاجی واپس آنے لگے تو سلطان ان کے استقبال کے لئے سخت سردی میں بغیر کسی اہتمام کے نکل کھڑا ہوتا۔ آخر کار سردی نے اثر کر دکھایا اور سلطان بیمار پڑ گیا۔ لوگوں کو اس کی علالت کی خبر ملی تو اس کی زندگی کے لئے دعائیں مانگی جانے لگیں۔

علالت کے بارہویں روز سلطان کی تمام رات اضطراب میں گذری۔ وہ مسلسل قرآن پاک کی تلاوت سنتا رہا۔ جب سورہ توبہ کی آخری آیات تلاوت کی جا رہی تھیں (جن کا ترجمہ یہ تھا کہ: اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، میں اسی پر توکل کرتا ہوں) تو سلطان کے چہرے پر تبسم نمودار ہوا۔ اس نے شہادت کی انگلی اٹھائی اور خالق حقیقی سے جا ملا۔ انتقال کے وقت اس کی عمر پچپن برس تھی۔

مسلمانوں پر یہ خبر بجلی بن کر گری۔ پورے عالم اسلام میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ سلطان کے کفن کا بندوبست قاضی فاضل نے اپنے ہاتھ کی کمائی سے کیا۔ لوگ غم سے نڈھال تھے۔ کئی ایک کو روتے روتے غش آ گیا۔ نماز جنازہ کے وقت نمازی اتنے مضطرب تھے کہ آہ وزاری کی وجہ سے نماز ادا کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ پرنم آنکھوں اور مغفرت کی دعاؤں کے ساتھ ۱۳ مارچ ۱۱۹۳ء بمطابق صفر ۵۸۹ ہجری نماز عصر کے وقت دمشق کے قلعے میں سلطان کو اس کی تلوار کے ساتھ دفن کر دیا گیا۔

سلطان کی سیرت ایک نظر میں

سلطان کی عظیم کامیابیاں اللہ کی خصوصی نصرت کے علاوہ اس کے کردار کی بہترین خصوصیات کا ثمرہ تھیں۔ سلطان ایسا سچا مجاہد تھا جس کے رگ و پے میں جہاد کا شوق خون کی طرح دوڑ رہا تھا۔ اسی شوق میں اس نے ہر دنیاوی نعمت کو خیرباد کہا۔ ابن شداد لکھتا ہے:

> ''میں نے سلطان کے واسطے جہاد سے متعلق ایک کتاب لکھی تھی جس میں اس موضوع کے مطابق آیات و احادیث جمع کر دی تھیں۔ سلطان ہر وقت اس کا مطالعہ کرتا رہتا تھا۔ اس مشکل راہ میں درکار محنت نے اسے کبھی نہ تھکایا اور کوئی مہم اور کوئی مصیبت اسے نہ ڈرا سکی۔ موسم سرما کی سرد راتیں ہوں یا طوفانِ باد و باراں، سلطان کی ہمت میں کمی نہ آتی تھی۔ قلعہ صفدر پر چڑھائی کے وقت سخت سردی کے دن تھے، اس پر موسلا دھار بارش بھی ہو رہی تھی۔ خیموں کے چاروں طرف سے سیلابی پانی گذر رہا تھا۔ کیچڑ میں حرکت کرنی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دشوار تھی۔ اس مشکل میں بھی سلطان رات بھر جاگتا رہا اور منجنیقیں نصب کرانے میں مصروف رہا۔ اسی طرح رملہ پر جنگ کے زمانے میں رات کو لڑائیاں ہوتی تھیں۔ سلطان اور اس کی فوج کے خیمے ہوا سے اکھڑ جاتے اور وہ تمام رات گھوڑوں کی پشت پر سوار رہتے تھے۔ جنگی امور سے متعلق اسے ایسی مصروفیت ہوتی کہ کھانے پینے اور آرام کی فرصت ہی نہ ملتی۔ یہاں تک کہ بیماری کی صورت میں بھی وہ اس سے بے پرواہ رہتا۔ عکہ کے محاصرے کے دوران وہ سخت بیمار تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پورا یورپ اس کے مقابلے پر تھا۔ اس کی کمر سے گھٹنوں تک تکلیف دینے والے پھوڑے نکلے ہوئے تھے۔ اس حالت میں بھی جبکہ وہ نہ سیدھا بیٹھ سکتا تھا اور نہ لیٹ سکتا تھا صبح سے شام تک افواج کی تربیت و تنظیم اور انتظام و انصرام میں مصروف رہتا۔ اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار بھی نہ ہوتے تھے۔ پوچھنے پر کہتا کہ سوار ہونے سے میرا درد کم ہو جاتا ہے اور سواری سے اترنے پر پھر عود آتا ہے۔''

عفو و درگزر

عموماً اتنی سخت مشقت کسی بھی انسان کو سخت مزاج بنا دیتی ہے۔ مگر سلطان کا دل انتہائی نرم تھا۔ وہ اپنی رعایا کے ساتھ ساتھ اللہ کی ساری مخلوق پر مہربان تھا۔ اس کے مدمقابل وہ عیسائی تھے جنہوں نے مسلمان قیدیوں کو ذبح کر کے ان کے گوشت کے ٹکڑوں کو سیخوں پر چڑھا کر کباب کی طرح بھونا تھا۔ مگر سلطان نہ تو فتح کے نشے میں چور ہو کر آپے سے باہر ہوتا تھا اور نہ ہی انتقام کی آگ اسے بے رحمی پر مجبور کر سکتی تھی۔ وہ جس علاقے کو فتح کرتا وہاں عیسائیوں کا قتل عام کرنے کے بجائے ان کی آبادی کو امن سے نکل جانے دیتا۔ وہ اس حقیقت سے باخبر تھا کہ یہی عیسائی پھر اس کے مقابلے پر آئیں گے اور یہی اس کا تجربہ بھی تھا۔ مگر اپنے اس طرزِ عمل میں اس نے کوئی تبدیلی نہیں کی۔ اس کی وجہ ہمیں اس کی وصیت میں ملتی ہے جو اس نے اپنے بیٹے کو کی تھی۔ ''میں تمہیں خونریزی سے ڈرتے رہنے کی وصیت کرتا ہوں۔ کیونکہ خون کبھی رائیگاں نہیں جاتا۔''

سلطان ایسا اصول پسند شخص تھا جس نے اپنے مقصد کو پورا کرنے کے لئے ہمیشہ جائز طریقوں سے کام لیا۔ عیسائیوں کی بدعہدیوں کے باوجود اس کا معاملہ ہمیشہ صاف رہا۔ عیسائیوں نے ہر موقع پر اپنے وعدے توڑے، یہاں تک کہ ایک دفعہ امان دینے کے بعد پانچ ہزار مسلمانوں کو تہہ تیغ کیا، لیکن سلطان نے مومنانہ شان کے ساتھ معاملہ کیا۔

فیاضی اور دریا دلی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سلطان کی فیاضی خاص طور سے لائقِ تذکرہ ہے۔ فتحِ بیت المقدس کے بعد جب وہ بے دریغ سخاوت دکھا رہا تھا تو کسی نے اس سے کہا: ''اگر آپ یہ مال محفوظ رکھتے تو بیت المال کے لئے ایک بڑا خزانہ جمع ہو جاتا اور مدتوں کام آتا''۔ سلطان نے جواب دیا۔ ''مجھے فیاضی سے راحت ہوتی ہے، کیونکہ یہ روپیہ اور مال میرا نہیں ہے۔ یہ اہلِ استحقاق کا ہے۔ جو شخص میرے پاس آکر اپنا حق ظاہر کرتا ہے اپنی امانت مجھ سے واپس لے لیتا ہے۔'' وہ دینے میں ایسی خوشی محسوس کرتا کہ اس کا چہرہ اس کی گواہی دیتا۔ خزانچی کچھ رقوم اس سے چھپا جایا کرتے تاکہ ضرورت کے وقت کام آسکیں ورنہ سلطان کو معلوم ہوتا تو وہ انہیں ضرورت مندوں میں فی الفور تقسیم کر دیتا۔ اتنا خرچ کرنے والے سلطان کی اپنی ذاتی زندگی انتہائی سادہ تھی۔ اپنی وفات کے وقت وہ محض ۴۷ درہم اور ایک دینار کا مالک تھا۔ زندگی بھر اس کے پاس کبھی اتنا مال جمع نہ ہوا جس پر زکوٰۃ فرض ہوتی۔

اس معاملے میں اس کی سوچ اس کے قول سے ظاہر ہوتی ہے۔ ''لوگوں میں ایسے بھی ہونے چاہئیں جو مال و دولت کو خاک کے برابر سمجھیں۔'' ایک بار جب اسے دمشق کا محل دکھایا گیا جو اس کے لئے تیار کیا گیا تھا تو کہنے لگا ''ہمیں یہاں ہمیشہ تو نہیں رہنا۔ یہ مکان اس شخص کے مطلب کا ہرگز نہیں ہوسکتا جو موت کا منتظر رہتا ہو۔ ہمارا مقصدِ حیات تو خدا کی بندگی ہے۔'' اس کی عملی زندگی بھی اس کی مظہر تھی۔ خیمہ اس کا محل اور گھوڑے کی پیٹھ اس کا تخت تھی۔

سادہ مزاجی اور حلم

سلطان اپنی نجی زندگی میں کسی قسم کی تمیز و امتیاز برتنے کا قائل نہ تھا اور اس معاملے میں وہ معصومیت کی حد تک سادہ تھا۔ ایک بار عکہ کی لڑائی میں اپنے سپاہیوں کے مانگنے پر اس نے بغیر قیمت بارہ ہزار گھوڑے بخش دیئے۔ لڑائی کے وقت دیکھا گیا کہ سلطان اپنی سواری کے لئے گھوڑا مانگتا پھر رہا ہے۔ اس کی سادہ مزاجی اور تحمل و درگذر کی وجہ سے اس کے ملازمین اس سے گستاخیاں کرگذرتے تھے۔ ایک بار اس نے اپنے خدمتگار سے پانچ دفعہ پانی مانگا مگر اس نے لاکر نہ دیا۔ آخر اس نے کہا خدارا میں پیاس سے مرچلا ہوں۔ تب اس نے پانی لاکر دیا۔ متحمل مزاج سلطان نے پانی پیا اور خاموش ہو گیا۔

ایک دفعہ سلطان سخت بیمار ہو گیا اور بہت کمزور بھی۔ پانی منگوایا جو بہت گرم تھا۔ سرد پانی منگوایا تو ملازم پھر گرم پانی لے آیا۔ سلطان خاموش رہا۔ دوبارہ ٹھنڈا پانی لانے کو کہا تو ملازم سے وہی غلطی ہوئی۔ اس پر سلطان نے اتنا کہا ''اگر تو مجھے قتل کرنا چاہتا ہے تو بتا دے۔''

رحماءُ بینھم

سلطان کی مجلسی زندگی بھی لائقِ تذکرہ ہے۔ وہ شائستہ گفتگو کرتا۔ اس کے دربار میں بات کرنے کی سب کو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اجازت ہوتی، مگر فحش الفاظ کے استعمال اور ذاتیات پر حملہ کرنے کو وہ برداشت نہ کرتا۔ اشتعال کی حالت میں بھی اپنی زبان اور قلم پر پورا قابو رکھتا۔ علماء وفضلاء کی مجلس کو پسند کرتا۔ اس کے قریب ترین ساتھیوں میں وقت کے دو بڑے عالم قاضی فاضل اور شیخ بہاء الدین تھے۔

سلطان فرائض کی ادائیگی میں سختی برتتا۔ وہ حج نہ ادا کر سکا جس کی اسے بہت خواہش تھی، لیکن آخر دم تک حاجیوں کی خدمت اور ان کے استقبال میں مصروف رہا۔ سلطان جب قرآن مجید سنتا تو خوب روتا۔ یہ وہی سلطان تھا جو دنیاوی غموں کو برداشت کرنے میں کمال رکھتا تھا۔ عین جنگ کی حالت میں جب اسے اس کے بیٹے کی موت کی خبر سنائی گئی تو خاتمۂ جنگ تک اس نے کسی کو پتہ نہ لگنے دیا۔ حالانکہ وہ اپنے بیٹوں سے شدید محبت کرتا تھا اور ایک شفیق باپ تھا۔

عدل وانصاف

سلطان صرف ذاتی زندگی میں اور سپہ سالار کے طور پر ہی قابلِ تقلید نہیں بلکہ حاکم وقت کی حیثیت سے بھی اس کا دور یادگار ہے۔ وہ انصاف کے معاملے میں بہت سخت تھا۔ کسی بھی درجے کا آدمی کیوں نہ ہو، قاضیوں کو رعایت برتنے کی اجازت نہ تھی۔ خود شہزادوں یا سلطان کے خلاف مقدمہ دائر ہوتا تو عام لوگوں کی طرح عدالت میں پیش ہوتے۔ اگر سلطان مقدمہ جیت جاتا تو مقدمہ ہارنے والے کے اخراجات برداشت کرتا اور خلعت سے نوازتا۔ یہاں تک کہ وہ خوش ہو جاتا۔

دورِ ایوبی کو تعلیمی لحاظ سے علم ودانش کی ترقی کا دور کہا جاسکتا ہے۔ سلطان کا مدارس قائم کرنے کا شوق شہزادوں، شہزادیوں نے بھی اپنالیا۔ پھر ان مدارس کے لئے جاگیریں وقف کرنے کا طریقہ بھی سلطان نے متعارف کرایا۔ کچھ ہی عرصے میں عالمِ اسلام کتب خانوں اور مدارس سے بھر گیا۔

سلطان کی کس کس خوبی کی تعریف کریں۔ آج حالات پھر اسی رخ پر جارہے ہیں۔ ایک ایک کر کے شہر اور ملک ہاتھ سے نکلے چلے جارہے ہیں۔ امتِ مسلمہ پھر محرومِ یقین ہے۔ یہ واقعہ بیان کرنا بے محل نہ ہوگا کہ دوسری جنگِ عظیم میں جب برطانوی افواج نے بیت المقدس فتح کیا تو ایک برطانوی جرنیل نے صلاح الدین ایوبی کی قبر پر لات مار کر کہا ''اٹھو صلاح الدین، دیکھو ہم یہاں تک پہنچ گئے۔'' عالمِ اسلام آج بھی کسی مردِ مجاہد صلاح الدین کا منتظر ہے۔

نہ اٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے
وہی آب وگلِ ایراں وہی تبریز ہے ساقی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

امام ابن تیمیہؒ

اسلامی تاریخ کے نمایاں ترین صاحبِ سیف وقلم اور ساتویں صدی ھجری میں تجدیدِ دین کے علمبردار

تعارف

نام احمد، کنیت ابو العباس اور تقی الدین لقب تھا۔ سلسلہ نسب یہ ہے:

احمد بن عبد الحلیم بن عبد السلام بن عبد اللہ بن خضر بن محمد بن الخضر بن علی بن عبد اللہ بن تیمیہ الحرانی۔

اگر چہ آپ کا نام احمد تھا، لیکن آپ کی شہرت ابن تیمیہ کے نام سے ہوئی۔ آپ کے خاندان کے تمام افراد تیمیہ کے نام سے پکارے جاتے۔ روایات میں آتا ہے کہ امام صاحب کی دور کی دادی تیمیہ تھیں۔ یہ اتنی بڑی عالمہ، فاضلہ تھیں کہ سارا خاندان ان کی طرف منسوب ہوگیا۔

ولادت

ابن تیمیہ ۱۲ ربیع الاول پیر کے روز ۶۶۱ ہجری میں شام کے تاریخی شہر حراں میں پیدا ہوئے۔

خاندانی پس منظر

ابن تیمیہ کا تعلق خالص علمی گھرانے سے تھا۔ آپ کا خاندان پشت ہا پشت سے علم وعمل اور زہد وورع میں ممتاز چلا آرہا تھا۔ آپ کے دادا عبد السلام بہت بڑے عالم اور بے مثال خطیب تھے۔ فقہ حنبلی کے آئمہ میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ان کی ساری زندگی درس وتدریس، تصنیف وتالیف اور وعظ وارشاد میں گذری۔ ان کی متعدد بلند پایہ علمی تصنیفات موجود ہیں۔

آپ کے والد شیخ عبد الحلیم بھی اپنے وقت کے علوم پر عبور رکھتے تھے۔ چنانچہ اپنے والد عبد السلام کے انتقال کے بعد ان کی جگہ جامع حراں کے خطیب مقرر ہوئے اور ساتھ ہی مدرسہ نوریہ میں درس وتدریس کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خدمات کا اعزاز بھی حاصل ہوا۔ ان کی عالمانہ بصیرت، محققانہ حیثیت اور درس و تدریس میں ان کے کمال کا تذکرہ ملتا ہے۔

یہ زمانہ مسلمانوں کے لئے بڑا پرآشوب تھا۔ تاتاریوں کے حملوں نے تمام عالمِ اسلام میں تہلکہ مچایا ہوا تھا۔ ۶۶۷ ہجری میں جب ابن تیمیہ ابھی سات برس ہی کے تھے، آپ کا شہر تاتاریوں کے حملے کی زد میں آ گیا۔ آخر مجبور ہو کر آپ کا خاندان بھی بے سروسامانی کی حالت میں دمشق کی طرف روانہ ہوا۔ حالت یہ تھی کہ گھر کا سامان لے جانے کے لئے ضرورت کے مطابق گاڑیاں تک دستیاب نہ تھیں۔ چنانچہ سب مال اور سامان چھوڑ کر صرف کتابیں اور چند ضروریات کی چیزیں ساتھ رکھیں۔ راستہ محفوظ نہ تھا۔ تاتاریوں کے حملے کا دھڑکا لگا ہوا تھا۔ آپ کے والد نے عورتوں اور بچوں کے ساتھ اتنا خطرناک سفر اس حال میں طے کیا کہ کتابوں کی گاڑی کو بھی خود ہی کھینچنا پڑتا تھا کیونکہ جانور دستیاب نہ تھا۔ بالآخر قافلہ اپنے ذخیرۂ علمی کے ساتھ دمشق پہنچ گیا۔

دمشق پہنچتے ہی اس علمی گھرانے کی آمد کی خبر مشہور ہوگئی۔ آپ کے دادا اور والد کا علم و فضل کسی تعارف کا محتاج نہ تھا۔ چند دن کے اندر ہی آپ کے والد کو دارالحدیث السکریہ کے درس کے لئے چن لیا گیا اور جامع مسجد اموی کا خطیب مقرر کر دیا گیا۔ دمشق جیسے شہر میں اپنی علمی فضیلت منوانا کوئی معمولی بات نہ تھی۔

تعلیم و تربیت

امام ابن تیمیہ کی ابتدائی تعلیم ''حراں'' میں ہوئی تھی۔ دمشق پہنچ کر آپ نے وہاں مدرسہ حنبلیہ اور دارالحدیث السکریہ سے مختلف علوم کا درس لیا۔ بہت جلد قرآن کریم حفظ کر لیا۔ اپنی نوعمری کے باوجود اپنے والد کی مجالس درس و وعظ اور علماء کے حلقوں میں شرکت کرتے تھے۔ آپ کو کھیل کود سے زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ ایک مرتبہ آپ کے والد بچوں کو سیر کرانے کی غرض سے باغ لے جا رہے تھے۔ آپ نے جانے کی حامی نہ بھری۔ شام کو جب وہ لوگ سیر سے واپس آئے تو والد محترم نے کہا ''احمد افسوس تم ساتھ نہیں تھے۔ آج کی تفریح بڑی دلچسپ رہی۔'' احمد اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کتاب کی طرف اشارہ کر کے بولے ''ابا جان، اگر آپ کے ساتھ چلا جاتا تو یہ کتاب کس طرح یاد کرتا۔'' والد نے تعجب سے پوچھا۔ ''کیا تم نے یہ ساری کتاب زبانی یاد کر لی؟'' بولے ''جی ہاں۔'' والد نے سنانے کو کہا تو پوری سنا ڈالی۔ والد خوش ہوئے اور محبت سے گلے لگا لیا۔

آپ کا حافظہ ایسا حیرت انگیز تھا کہ جو کتاب ایک بار نظر سے گذر جاتی اس کی عبارت ذہن میں محفوظ ہو جاتی۔ اگرچہ آپ کے دادا اور والد دونوں بڑے قوی الحافظہ تھے لیکن ابن تیمیہ کے سرعتِ حفظ نے آپ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے اساتذہ کو حیران کر دیا اور دمشق میں اس کی شہرت پھیل گئی۔

ایک بار حلب کے ایک عالم دمشق آئے تو انہیں آپ کے حافظے کا علم ہوا۔ امتحان لینے کی غرض سے اس راستے میں بیٹھ گئے جہاں مکتب سے واپسی پر ابن تیمیہ گذرا کرتے۔ جب آپ گذرے تو ایک درزی نے عالم صاحب کو بتایا کہ یہی وہ بچہ ہے جس کا آپ کو انتظار تھا۔ عالم صاحب نے انہیں بلا کر چند حدیثوں کے ذریعے امتحان لیا۔ وہ احادیث تختی پر لکھ دیتے۔ ایک نظر ابن تیمیہ ان کو پڑھتے پھر شیخ تختی اٹھا کر پوچھتے، سناؤ۔ اس طرح کئی بار فرق احادیث اور اسناد لکھ کر دیں اور ابن تیمیہ ایک دفعہ دیکھنے کے بعد ایک ایک لفظ درست سنا دیتے۔ شیخ یہ دیکھ کر فرمانے لگے۔ ''اگر یہ بچہ جیتا رہا تو کوئی چیز بنے گا۔ اس لئے کہ میری نظر میں ایسی حیرت انگیز قوت حافظہ کا مالک کوئی نہیں گذرا۔''

تفسیر قرآن آپ کا محبوب موضوع تھا۔ قرآن کی تفسیر کے لئے بے تحاشہ کتابوں کا مطالعہ کیا۔ خود آپ کا بیان ہے۔ ''بعض اوقات ایک آیت کے لئے میں نے سو تفسیروں کا مطالعہ کیا ہے۔ مطالعے کے بعد اللہ سے دعا کرتا کہ مجھے اس آیت کا فہم عنایت ہو۔ میں عرض کرتا کہ ''اے آدمؑ وابراہیمؑ کے معلم! میری تعلیم فرما۔'' میں غیر آباد مسجدوں اور مقامات کی طرف چلا جاتا، اپنی پیشانی پر خاک ملتا اور کہتا کہ ''اے ابراہیمؑ کو تعلیم دینے والے مجھے سمجھ عطا فرما۔''

قرآن مجید کے حفظ اور تفسیر کے علاوہ علمِ حدیث کی جانب توجہ دی اور دو سو سے زیادہ شیوخ سے استفادہ کیا۔ مسند امام احمد اور صحاح ستہ کی سماعت کی کئی بار نوبت آئی۔ حدیث پر آپ کو اس درجہ کا عبور حاصل تھا کہ اس خصوصیت میں آپ کا کوئی مدمقابل نظر نہیں آتا۔ یہاں تک کہ مشہور ہو گیا کہ جس حدیث کو ابن تیمیہ نہیں جانتے اس کے حدیث ہونے میں شک ہے۔

فقہ اور اصول فقہ کی کتابیں آپ نے اپنے والد ماجد سے پڑھیں جو فقہ میں اپنے وقت کے امام تھے۔ اس کے علاوہ قاضی القضاۃ ابو محمد عبد الرحمن اور شیخ زین الدین سے بھی فقہ کی تعلیم حاصل کی۔

ابن تیمیہؒ نے اپنے زمانے کے تمام مروجہ علوم کی تحصیل کی اور عربیت کی طرف خاص توجہ دی۔ لغت ونحو، عربی زبان وادب کی تاریخ اور قدیم وجدید عربی شعراء کے کلام پر مکمل عبور حاصل کیا۔ نحو میں کمال کا یہ عالم تھا کہ امام نحو سیبویہ کی کتاب ''الکتاب'' کا بڑے غور وخوض سے مطالعہ کر کے اس کے کمزور مقامات اور غلطیوں پر گرفت کی۔ اسلامی تاریخ کا وسیع مطالعہ کیا۔ عرب جاہلیت اور عربِ اوّلین کے حالات وواقعات کا مطالعہ کیا۔

آپ کے زمانے میں اشاعرہ کے علم الکلام کا بڑا چرچا تھا۔ حنبلی عموی طور پر اشاعرہ کے مدِ مقابل سمجھے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جاتے تھے۔ بحث ومناظروں میں اشاعرہ کا پلڑا اکثر بھاری رہتا کیونکہ وہ عقلی استدلال سے کام لیتے۔ جبکہ حنبلی حضرات منطق، فلسفے سے زیادہ آیات واحادیث کے ظاہری مفہوم سے بحث کرتے تھے۔ ابن تیمیہ نے یہ بات محسوس کی اور علم الکلام، فلسفے اور منطق کا گہرا مطالعہ کرکے ان پر ایسا عبور حاصل کیا کہ وہ ان علوم کی کمزوریوں اور حکمائے یونان کی غلطیوں سے واقف ہوگئے۔ بعد میں ان علوم کی تنقید پر ایسی عالمانہ کتابیں لکھیں جن کا جواب کوئی نہ دے سکا۔

نظری علوم کے علاوہ کتابت، خوش نویسی اور ریاضی کی طرف بھی توجہ دی۔ الغرض آپ نے اپنے زمانے میں کتاب وسنت کی ترجمانی اور دین کی صداقت ثابت کرنے کے لئے ایسی مکمل تیاری کی جس کی اس زمانے میں سخت ضرورت تھی۔ آپ نے اس تمام اسلحے کا استعمال سیکھا جس سے آپ کے حریف اور مخالفینِ اسلام مسلح تھے۔ علامہ ذہبی لکھتے ہیں ''احمد ابھی شباب کے ابتدائی مراحل میں تھا کہ وہ مدارس اور علمی محافل میں جاتا۔ وہاں مذاکرات ومناظرات میں علمی قابلیت کے وہ جوہر دکھاتا کہ بڑے بڑے عالم دنگ رہ جاتے۔ اس وقت اس کی عمر انیس برس تھی یا اس سے بھی کم''۔

حافظ سراج الدین اپنی کتاب ''الاعلام العلیۃ فی مناقب ابن تیمیہ'' میں لکھتے ہیں ''علوم وفنون کی شاید ہی کوئی ایسی کتاب ہو جس سے احمد واقف نہ ہوں۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ گویا اللہ نے تیز حافظے اور نہ بھولنے کی دولت سے صرف احمد کو نوازا تھا۔''

امام صاحب تقریباً انیس برس کے تھے کہ آپ کی غیر معمولی لیاقت اور قابلیت کو دیکھ کر شام کے قاضی شیخ شرف الدین ابوالعباس احمد المقدسی نے آپ کو فتویٰ دینے کی اجازت دے دی۔

مسندِ درس وتدریس

جب ابن تیمیہ ۲۱ برس کے ہوئے تو آپ کے والد عبدالحلیم کا انتقال ہوگیا اور دارالحدیث السکریہ میں ان کی مسند درس خالی ہوگئی۔ شیخ الحدیث کے منصب کے لئے آپ کو چنا گیا۔ ۲ محرم ۶۸۳ ہجری کو آپ نے پہلا درس دیا۔ دستورِ زمانہ کے مطابق رسمِ افتتاحِ درس کے موقع پر علمائے وقت، قاضی القضاۃ اور عمائدینِ شہر سب شریک تھے۔ یہ ایک ایسا کڑا امتحان تھا جس سے ہر نئے مدرس کو گزرنا پڑتا۔

اس درس میں امام صاحب نے بسم اللہ کے نکات اس خوبی سے بیان فرمائے کہ کوئی بھی آپ کی وسعتِ معلومات، نکتہ رسی، طرزِ استدلال اور اندازِ بیان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ لوگوں کو اندازہ ہوگیا کہ اس غیر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

معمولی قابلیت کے ساتھ قدرت آپ سے کوئی بڑا کام لے گی۔

اگلے مہینے ابن تیمیہ نے اپنے والد کی جگہ جامع اموی میں تفسیر کا درس دیا۔ آپ کے لئے خاص طور پر منبر رکھا گیا۔ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ وہ اپنے درس تفسیر میں اس کثرت سے جدید علوم اور مضامین بیان کرتے تھے کہ روز بروز درس کا حلقہ بڑا ہوتا گیا۔ تھوڑے ہی دنوں میں ان کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔

قرآن کریم کی تفسیر کے لئے آپ سب سے پہلے قرآن مجید کی دیگر آیات کا سہارا لیتے۔ پھر نبی اکرم ﷺ کی احادیث اور اس کے بعد صحابہ کے اقوال اور بیان کردہ تفسیر کو اختیار کرتے۔ موضوع اور گھڑی ہوئی حکایات کے بجائے سنت اور آثار صحابہ کا بیان مدلّل انداز میں ہوتا اور حقائق و بصائر کے انکشافات اس کثرت سے ہوتے کہ ایک ایک آیت پر ہفتوں تقریر جاری رہتی۔ سورہ نور کی تفسیر کئی برس میں جا کر ختم ہوئی۔

حافظ سراج الدین حفص عمر کہتے ہیں ''جب ابن تیمیہ درس و تدریس شروع کرتے تو اللہ ان پر اسرار رموز اور معارف و لطائف کے دروازے کھول دیتا۔ آپ ہر دعوے کے ثبوت میں آیات، احادیث، اقوال علماء اور اشعار عرب سے سند پیش کرتے اور سمندر کی موجِ تند کی طرح بہتے۔ دوران درس آنکھیں بند رکھتے۔ حاضرین کو آپ اتنے پرجلال و پرعظمت نظر آتے کہ ان پر ہیبت طاری ہو جاتی۔ جب آپ بعد از درس آنکھیں کھولتے تو یوں معلوم ہوتا کہ آپ کہیں غائب تھے اور اب واپس آ گئے ہیں۔''

درس و تدریس کا یہ سلسلہ پندرہ برس تک پورے سکون سے جاری رہا۔ ۶۹۵ ہجری میں آپ کو دارالحدیث حنبلیہ میں حنبلیوں کے سب سے بڑے عالم شیخ زین العابدین کے انتقال کے بعد شیخ الحدیث مقرر کیا گیا۔ زبان و قلم سے جہاد جاری تھا کہ ملک ایک بار پھر تاتاریوں کے حملوں کی زد میں آ گیا اور امام صاحب کو جہاد باللسان کے علاوہ جہاد بالسّیف کے میدان میں بھی اپنے جوہر دکھانے کا موقع ملا۔

فتنۂ تاتار

ساتویں صدی میں عالمِ اسلام کو وہ حادثہ پیش آیا جس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں کم ملتی ہے۔ خداوند تعالیٰ نے ایمان کی جس عظیم نعمت سے مسلمانوں کو نوازا تھا، اس سے ان کی لاپرواہی اور غفلت نے یہ دن دکھایا کہ تاتاری عذابِ الٰہی بن کر دنیائے اسلام پر ٹوٹ پڑے۔

اس فتنے کا آغاز کس طرح ہوا، اس کا مختصر حال بیان کرنا مناسب ہوگا۔ تاتاریوں کا اصل وطن منگولیا مغلستان کا صحرائے گوبی تھا۔ یہ ایسا بے آب و گیاہ علاقہ تھا کہ یہاں تمدن کی کوئی رمق نظر نہ آتی تھی۔ تاتاریوں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی زندگی وحشیانہ تھی۔ وہ کتوں کا گوشت تک کھا لیتے اور جانوروں کی کھال اوڑھتے تھے۔ ان کے قبائل میں آپس میں اکثر جنگ و جدال جاری رہتا۔ یہاں تک کہ چنگیز خان نے دیگر سرداروں کو زیر کر کے اپنی حکومت مضبوط کر لی اور اس کی حکومت صحرائے گوبی سے نکل کر چین و ترکستان تک پہنچ گئی۔ چنگیز خان نے تمدنی حیثیت سے تاتاری حکومت کو بڑی ترقی دی۔

اس زمانے میں عالم اسلام کے مشرقی حصے میں علاء الدین محمد خوارزم شاہ کی وسیع سلطنت تھی۔ چنگیز خان نے تجارت کی غرض سے تاتاری تاجر اس کے پاس بھیجے جنہیں اس نے بغیر کسی ٹھوس وجہ کے قتل کر دیا۔ جب چنگیز خان نے اس کا سبب دریافت کرنے کے لئے ایک سفارت بھیجی تو خوارزم شاہ نے سفیر کو بھی قتل کر دیا۔ اس خبر نے تاتاری خاقان چنگیز خان کو غصے سے بے حال کر دیا۔ وہ پہاڑی پر چڑھ گیا۔ تنہائی میں اس نے اس واقعے پر غور کیا۔ پھر انتقام کی آگ میں جلتا ہوا اپنی قوم کے پاس واپس آیا اور کہا ''جس طرح آسمان پر دو آفتاب نہیں رہ سکتے، اسی طرح زمین پر دو خاقان نہیں رہ سکتے۔''

چنگیز خان لشکر جرار کے ساتھ خوارزمی سلطنت پر حملہ آور ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے بخارا، سمرقند، رے، ہمدان، زنجان، مرو، نیشا پور سب پر قابض ہو گیا۔ اس کے بعد اس کے راستے میں جو بھی علاقہ آیا وہ اس کو پامال کرتا ہوا آگے کی طرف بڑھتا گیا۔ خوارزم شاہ جو اس وقت عالمِ اسلام کا سب سے طاقتور سلطان تھا تاتاریوں کے خوف سے بھاگا پھرتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک ویران جزیرے میں اس حال میں اسے موت آئی کہ کفن تک نصیب نہ ہوا۔

تاتاری حملے نہ صرف عالمِ اسلام کے لئے ذلت کا باعث بنے بلکہ یہ ایسی بلائے عظیم تھی جس سے دنیائے اسلام کی چولیں ہل گئیں۔ اس قدر تباہی دنیا نے شاید کسی قوم کی کبھی نہ دیکھی ہوگی۔ تاتاری اس قدر وحشی اور ظالم تھے کہ جس شہر کو فتح کر لیتے اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتے۔ پورے پورے شہروں کو آگ لگا دی جاتی اور کل آبادی کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا۔ عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو بلا تخصیص قتل کیا جاتا۔ عورتوں کے پیٹ چاک کر کے ان کے بچوں کو مار ڈالا جاتا۔ ان واقعات نے مسلمانوں کو خوفزدہ کر دیا اور ان پر مایوسی اور ذلت طاری ہو گئی۔ تاتاریوں کا مقابلہ کرنا اور انہیں شکست دینا ناقابل یقین معلوم ہونے لگا۔ بے غیرتی اور کم ہمتی کی انتہاء یہ تھی کہ ایک تنہا تاتاری فوجی مسلمانوں کے بھرے پرے گاؤں میں چلا جاتا اور لوگوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح کرتا اور کسی کی ہمت نہ ہوتی کہ اسے روکے۔

یہ حادثہ بنیادی طور پر تو مسلمانوں کے ساتھ پیش آیا، مگر اس کا شکار ساری دنیا ہوئی۔ پوری متمدن دنیا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تا تاری حملوں سے لرزہ براندام تھی جنہیں پہاڑ، سمندر، موسمی سختیاں، قحط، اور وبائیں کچھ بھی نہ روک سکے۔

چنگیز خان کی موت کے بعد اس کے بیٹے اور پوتے پوری دنیا کو تباہی سے دوچار کرتے رہے۔ ۶۵۶ ہجری میں چنگیز خان کے پوتے ہلاکو خان نے دنیائے اسلام کے دارالخلافہ، عظیم ترین علمی مرکز اور دنیا کے متمدن ترین شہر بغداد کا رخ کیا۔ بغداد ایک ایسا عجوبہ روزگار شہر تھا جس کے بازاروں، باغات، مکانات، کارخانوں، محلات اور علمی مراکز کے لحاظ سے دنیا کا کوئی شہر اس کا ہم پلہ نہ تھا۔ ساتھ ہی ساتھ اس کے اخلاقی تنزل کا جو حال تھا اس کی داستان بیان کرنے کا یہاں موقع نہیں ہے۔ مختصراً یہ کہ جب عباسی خلیفہ معتصم کو خبر ملی کہ ہلاکو خان منگولوں کی فوج کے ساتھ بغداد کی طرف بڑھ رہا ہے تو اس نے کچھ فکر نہ کی۔ اپنی خوبصورت کنیزوں کے ہجوم میں موسیقی سے لطف اندوز ہوتا رہا اور اپنے غدار وزیر ابن علقمی کی باتوں میں آ کر مطمئن بیٹھا رہا۔ ایک طرف حکمران طبقے کا یہ حال تھا تو دوسری طرف علماء کن مشاغل میں مصروف تھے اس کا اندازہ اس واقعے سے ہوتا ہے کہ جس وقت ہلاکو خان بغداد پر حملہ کر رہا تھا اس وقت مسلمان علماء اس بات پر مناظرہ کر رہے تھے کہ نبی اکرم ﷺ جس جانور (براق) پر سوار ہو کر معراج کے لئے گئے تھے وہ نر تھا یا مادہ۔ جس قوم کی یہ حالت ہو اس کے ساتھ قدرت کسی قسم کی نرمی نہیں برتتی۔ چنانچہ مختصر سی مزاحمت کے بعد ہلاکو خان نے بغداد پر قبضہ کر لیا۔ خلیفہ اور اکابرینِ شہر پہلے مرحلے میں قتل کر دیئے گئے۔ اس کے بعد چالیس روز تک تاتاریوں نے ایسا قتل عام کیا کہ شہر لاشوں سے بھر گیا۔ بغداد کی لاکھوں کتابوں پر مشتمل عظیم الشان لائبریری کو جلا کر راکھ کر دیا گیا۔ یہاں تک کہ دریائے دجلہ کا پانی انسانوں کے خون اور کتابوں کی سیاہی سے ہفتوں سیاہ رہا۔ تہذیب وتمدن کی کسی علامت کو باقی نہ چھوڑا گیا اور عظیم الشان بغداد آگ اور خون میں ڈوب گیا۔

قریب تھا کہ سارا عالمِ اسلام اس سیلاب میں بہہ جائے کہ تاتاریوں میں اشاعتِ اسلام شروع ہو گئی۔ اسلام کی تبلیغ ودعوت کی برکت سے محض ایک صدی کے اندر ساری تاتاری قوم مسلمان ہو گئی۔ تاہم صحیح اسلامی تربیت کے فقدان کی وجہ سے یہ برابر اپنے مسلمان بھائیوں پر حملہ کرتے رہے۔

جہاد فی سبیل اللہ

قبل اس کے کہ ابن تیمیہ کی جہاد میں شرکت اور مجاہدانہ کردار پر نظر ڈالی جائے ضروری ہے کہ مختصراً اس زمانے کے سیاسی حالات کا جائزہ پیش کیا جائے۔

ابن تیمیہ کی ولادت سے تیرہ برس پہلے سے مصر اور شام پر خاندانِ غلاماں کی حکومت تھی۔ یہ صلاح الدین

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایوبی کے خاندان کے آخری بادشاہ نجم الدین ایوب کے ترک غلام تھے جن کو ان کی بہادری اور وفاداری کی بناء پر مصر میں آباد کیا گیا تھا۔ انہی میں کے ایک فرد عزالدین ایبک نے حکومت پر قبضہ کرلیا تھا۔ ۶۵۷ھ ہجری میں اس کے غلام سیف الدین نے تخت پر قبضہ کرلیا اور ابن تیمیہ کی ولادت سے صرف تین برس پہلے تاتاریوں کو شکست فاش دی۔ بعد ازاں نجم الدین ایوب کے دوسرے غلام رکن الدین بیبرس نے اسے قتل کردیا اور عنان مملکت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ امام ابن تیمیہ کی ولادت اور بچپن کا زمانہ اسی کا دور تھا۔ اس نے اٹھارہ سال تک شان و شوکت سے حکومت کی اور تاتاریوں پر فتوحات حاصل کیں۔ اس کے بعد تخت خلافت پر بار بار خلیفہ بدلے۔ یہاں تک کہ المنصور سیف الدین قلاووں تخت نشین ہوا جس نے تاتاریوں کو ۶۷۸ھ ہجری میں سخت شکست سے دوچار کیا اور بارہ سال تک بڑی شان سے حکومت کی۔ ۶۹۰ھ ہجری میں اس کا بیٹا الملک الناصر برسرِ اقتدار آیا اور ۴۲ سال تک حکومت کرتا رہا۔ یہی الملک الناصر امام ابن تیمیہ کا اصل معاصر تھا۔ شام اس زمانے میں چونکہ مصر کے زیرِنگیں تھا اس لئے سلطان کا نائب یا گورنر یہاں کے انتظام پر مامور تھا۔

۶۹۹ھ ہجری سال کے آغاز کے ساتھ تاتاریوں کے حملے کی افواہوں نے پورے شام کو دہشت زدہ کردیا۔ بالآخر جب حملہ ہوا تو سلطان مصر ملک ناصر خود مقابلے کے لئے آیا۔ دمشق کے باہر تاتاری بادشاہ قازان اور سلطان کے درمیان معرکے میں ناصری فوج کو شکست ہوئی۔ مصری افواج پسپا ہوکر دمشق چھوڑ گئیں۔ شہر میں اس خبر سے کھلبلی مچ گئی۔ بڑے بڑے امراء وعمائدین مصر سے روانہ ہوگئے۔ حکومتی عملہ رخصت ہوگیا۔ افراتفری کا یہ عالم تھا کہ قیدیوں نے جیل توڑ ڈالی اور لوٹ مار کا بازار گرم ہوگیا۔ شہری ایک طرف اس ہلڑبازی سے پریشان تھے تو دوسری جانب تاتاریوں کی شہر میں آمد اور دہشت گردی کے تصور نے ان کے ہوش اڑا دیئے۔

یہ حالات دیکھ کر امام صاحب بے چین ہوگئے۔ چند علماء اور رفقاء کے ساتھ قازان سے ملاقات کے لئے نکلے تاکہ اہلِ دمشق کے لئے پروانۂ امن حاصل کرسکیں۔ ملاقات کا حال ''کمال الدین الانجا'' بیان کرتے ہیں جو خود بھی اس موقع پر موجود تھے۔

> ''میں شیخ ابن تیمیہ کے ساتھ اس مجلس میں موجود تھا۔ وہ تاتاری سلطان قازان کو عدل و انصاف کی آیات واحادیث سناتے تھے۔ ان کی آواز بلند ہوتی جاتی تھی اور وہ برابر سلطان کے قریب ہوتے جاتے تھے، یہاں تک کہ قریب تھا کہ ان کے گھٹنے سے مل جائیں۔ سلطان کو اس سے کچھ ناگواری نہ ہوئی۔ وہ بڑی توجہ سے کان لگائے ان کی گفتگو سن رہا تھا اور ہمہ تن متوجہ تھا۔ اس پر ان کا رعب ایسا طاری تھا کہ اس نے لوگوں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے پوچھا ''یہ عالم کون ہے؟ میں نے ابھی تک ایسا شخص نہیں دیکھا اور نہ اس شخص سے زیادہ کوئی دلیر اور قوی القلب آج تک دیکھنے میں آیا۔''

ابن تیمیہ نے قازان نے کہا۔ ''تمہارا دعویٰ ہے کہ تم مسلمان ہو اور مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہارے ساتھ قاضی، امام، شیخ اور مؤذن بھی رہا کرتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود تم نے ہم مسلمانوں پر حملہ کیا۔ حالانکہ تمہارے باپ دادا ایسے اعمال سے محترز رہے۔ انہوں نے جو کچھ عہد کیا تھا وہ پورا کیا اور تم نے جو عہد کیا تھا وہ توڑ دیا اور بندگان خدا پر ظلم کیا''۔

اس مجلس میں ابن تیمیہ کے سامنے کھانا رکھا گیا اور سب شریک ہو گئے سوائے آپ کے۔ جب اصرار کیا گیا تو کہنے لگے یہ کھانا کب جائز ہے۔ یہ تو غریب مسلمانوں کی بھیڑ بکریوں سے تیار کیا گیا ہے اور لوگوں کے درختوں کی لکڑی کے ایندھن سے پکایا گیا ہے۔ قازان نے ان سے دعا کی درخواست کی تو شیخ نے ان الفاظ کے ساتھ دعا کی کہ ''خدایا اگر تیرے نزدیک قازان کا اس جنگ سے مقصد تیرے کلمے کی بلندی اور جہاد فی سبیل اللہ ہے تو اس کی مدد فرما اور اگر سلطنتِ دنیا اور حرص و ہوس ہے تو اس سے تو خود سمجھ لے۔'' حیرت کی بات ہے کہ شیخ دعا کر رہے تھے اور قازان آمین کہہ رہا تھا۔ ہمارا یہ حال تھا کہ ہم اپنے کپڑے سمیٹ رہے تھے کہ اب جلاد کو ان کی گردن مارنے کا حکم ہوگا تو ان کے خون کی چھینٹیں ہمارے دامن پر پڑیں گی۔

جب مجلس برخاست ہوئی اور ہم دربار کے باہر آئے تو ہم نے کہا آپ نے تو ہماری ہلاکت میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ ہم اب آپ کے ساتھ نہیں جائیں گے۔ انہوں نے کہا میں خود تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا۔ غیر اللہ سے تو وہ ڈرے جس کے دل میں کوئی بیماری ہو۔ چنانچہ ہم لوگ واپس آ گئے۔ امام صاحب ذرا ٹھہر کر واپس ہوئے۔ بہت سے قیدی ان کی سفارش سے چھوڑ دیئے گئے۔ یہ خوشخبری سن کر لوگ بڑی تعداد میں جمع ہو گئے اور آپ اس شان سے دمشق پہنچے کہ تین سو سوار آپ کے ہمراہ تھے۔ اس کے مقابلے میں ہم پر یہ گذری کہ ہم راستے میں تھے کہ ایک گروہ حملہ آور ہوا اور اس نے ہمارے کپڑے تک اتار لئے''۔

کچھ ہی عرصے میں قازان اپنے پایہ تخت تبریز میں حالات کی خرابی کی اطلاع سن کر واپس چلا گیا۔ مگر اپنے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پیچھے اپنے نائب امیر بولائی کو ساٹھ ہزار کی فوج کے ساتھ شام کی حفاظت کے لئے چھوڑ گیا۔ اس فوج نے دمشق کے اطراف میں غارت گری کرنی شروع کر دی۔ ابن تیمیہ نے ایک بار پھر امیر بولائی سے ملاقات کر کے قیدیوں کو رہا کروایا۔ چند ہی دن میں یہ خبر موصول ہوئی کہ سلطان ناصر شام کو آزاد کرانے کے لئے مصری افواج کے ساتھ روانہ ہو رہا ہے۔ اس خبر کے سنتے ہی تاتاری بھاگ گئے۔ اس وقت دمشق کا کوئی حاکم نہ تھا۔ شہر میں ابتری پھیلی ہوئی تھی۔ ان دنوں ابن تیمیہ کا معمول تھا کہ رات بھر شہر کا گشت کرتے اور لوگوں کو صبر اور جہاد کی تیاری کی تلقین کرتے۔ یہاں تک کہ نائب سلطنت جمال الدین آ پہنچا۔ اس نے سب سے پہلے ان قبائیلوں کی بیخ کنی کے لئے لشکرکشی کی جنہوں نے قازان کا ساتھ دیا تھا۔ ابن تیمیہ رضا کاروں کی جماعت کے ساتھ اس مہم میں شریک ہوئے۔ قبائل کے سرداروں کو جب آپ کی آمد کا پتہ چلا تو آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے ان کے سامنے تبلیغ کی۔ اس سے متاثر ہو کر انہوں نے بتوفیقِ خداوندی توبہ کی اور لوٹا ہوا مال واپس کرنے کی یقین دہانی کرائی۔ اس طرح وقتی طور پر اندرونی و بیرونی خطرات پر قابو پالیا گیا۔

اگلے سال پھر تاتاریوں کی آمد کی اطلاع ملتے ہی دمشق میں افراتفری پھیل گئی۔ لوگ شام چھوڑ کر مصر کا رخ کرنے لگے تو امام صاحب نے اپنے درس اور وعظ کے ذریعے لوگوں کو جہاد کی فرضیت اور فضیلت بتائی۔ میدان چھوڑ کر بھاگنے سے انہیں غیرت دلائی۔ سلطانِ مصر کی اپنی افواج کے ساتھ آمد کی اطلاع سے لوگوں کی کچھ ڈھارس بندھی تھی کہ خبر آئی کہ سلطان واپس قاہرہ روانہ ہو گیا ہے۔ یہ سن کر امام صاحب خود سلطان کو قازان سے مقابلہ پر آمادہ کرنے کے لئے تشریف لے گئے۔ ملاقات میں سلطان نے مختلف عذر پیش کئے۔ ابن تیمیہ نے سلطان کو سخت غیرت دلائی اور ناگواری کے ساتھ کہا کہ اگر تم شام کے مالک نہ ہوتے تب بھی مسلمانوں کی مدد کرنا تمہارا فرض تھا۔ اب تو تم ان کے والی ہو۔ اگر تم نے ان کی حفاظت کا فرض ادا نہ کیا تو اللہ تم سے باز پرس کرے گا۔ اگر تم کو شام کی حفاظت کی فکر نہیں ہے تو صاف کہہ دو۔ ہم اپنا انتظام خود کر لیں گے اور کسی کو وہاں کا حاکم منتخب کر لیں گے جو خطرے کے وقت اس کی حفاظت و خدمت کر سکے۔ پھر آپ سلطان کو یقین دلاتے رہے کہ فتح حق کی ہوگی۔ ظلم کے مقابلے میں اللہ ان کا حامی و ناصر ہے۔ سلطان آپ کی باتوں سے متاثر ہوا اور قازان سے نمٹنے کے لئے تیار ہو گیا۔ مصری افواج روانہ ہوئیں اور ابن تیمیہ نے دمشق پہنچ کر اہلِ شہر کو یہ خوشخبری سنائی کہ سلطان شام کی حفاظت کے لئے فوج کے ساتھ آ رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ اطلاع ملی کہ خراب موسم کی وجہ سے تاتاری افواج عراق واپس چلی گئی ہیں اور خطرہ ٹل گیا ہے۔

دو سال بعد ۷۰۲ ہجری میں ایک بار پھر تاتاری شام پر حملے کے ارادے سے نکلے۔ لوگوں میں اس خبر سے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اضطراب دوڑ گیا۔لیکن جلد ہی مصری افواج کے دستے دمشق پہنچ گئے۔ امام ابن تیمیہ شہریوں، لشکریوں اور امراء کی حوصلہ افزائی کرتے اور قسم کھا کھا کر کہتے کہ تم اس مرتبہ فتح پاؤ گے۔ آپ کو اس بات کا اس قدر یقین تھا کہ اگر کوئی کہتا کہ انشاء اللہ تو کہیے، تو فرماتے کہ ہم مظلوم ہیں اور مظلوم کی مدد ضرور ہوتی ہے۔ اس لئے وعدۂ خداوندی کی رو سے ہماری فتح یقینی ہے۔

۲ رمضان ۷۰۲ھ ہجری کو شامی و مصری فوجیں تاتاری فوج کے مقابلے پر صف آرا ہوئیں۔ امام صاحب نے فتویٰ دیا کہ روزہ نہ رکھا جائے تاکہ دورانِ جنگ کسی قسم کی کمزوری محسوس نہ ہو۔ آپ نے تمام امراء و سرداران کے سامنے خود روزہ افطار کیا۔ جنگ شروع ہوئی اور گھمسان کا رن پڑا۔ امام صاحب نے ایک امیر سے کہا ذرا مجھے موت کی جگہ دکھاؤ۔ اس نے انہیں ایسی جگہ پر کھڑا کر دیا جہاں تاتاریوں کے بے پناہ تیر برس رہے تھے۔ امیر موصوف کا بیان ہے کہ امام صاحب نے آسمان کی طرف اپنی نظریں بلند کیں اور تھوڑی دیر تک دعا کی، اس کے بعد میان سے تلوار نکال کر عقاب کی طرح دشمنوں پر جھپٹ پڑے اور نظروں سے غائب ہو گئے۔ یہاں تک کہ عصر کے بعد تاتاریوں کو شکست ہوئی تو امام صاحب میدان جنگ سے صحیح سلامت باہر نکل آئے۔

رات کو تاتاریوں نے ٹیلوں اور پہاڑوں میں پناہ لی۔ مصری افواج نے انہیں گھیر لیا۔ کچھ تیروں کی زد میں آ گئے، کچھ بھاگنے کی کوشش میں گھاٹیوں سے گر کر ہلاک ہوئے اور بہت سے دریائے فرات میں ڈوب گئے۔ اس طرح تاتاریوں کو عبرتناک شکست ہوئی۔

تجدیدِ دین-مخالفت اور اس کے اسباب

قبل اس کے کہ امام ابن تیمیہ کے تجدیدی کام پر نگاہ ڈالی جائے یہ جاننا ضروری ہوگا کہ اس وقت مسلمانوں کی فکری و اخلاقی حالت کیسی تھی اور آپ کو احیائے دین کے کام کی ضرورت کیوں پڑی۔

آٹھویں صدی ہجری کے حالات کا بغور جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام کی سادہ اور عام فہم تعلیمات کی جگہ مختلف باطل نظریات نے لے لی تھی۔ ان باطل نظریات کو اپنانے والوں کے اپنے اپنے گروہ تھے اور انہوں نے اسلام اور امتِ مسلمہ کو یرغمال بنا رکھا تھا۔ دین کا اصل چہرہ بگڑ چکا تھا اور آئے دن نئے نئے فتنے سر اٹھاتے رہتے تھے۔ آئندہ صفحات میں ہم اس بات کا جائزہ لیں گے کہ کس طرح امام صاحب نے مختلف محاذوں پر بیک وقت تن تنہا دین کا دفاع کیا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شرک اور قبر پرستی

عالمِ اسلام میں غیر مسلم اقوام کے اختلاط کی وجہ سے نقلی پیروں، فقیروں کے مشرکانہ عقائد ورسوم کا رواج عام ہو چلا تھا۔ بہت سے لوگوں نے وفات شدہ پیروں کو خدا کا درجہ اور اس زندہ پیر کو جو اس قبر کا مجاور ہوتا پیغمبر کا مرتبہ دے رکھا تھا۔ یہ لوگ صاحب قبر کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے اور مغفرت طلب کرتے۔ اپنے آئمہ اور شیوخ کی زیارت کو حج بیت اللہ سے افضل سمجھتے۔ ان کی بیبا کی اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ اپنے جانور ذبح کرتے وقت کہتے ''میرے آقا کے نام سے''۔ اس قبر پرستی کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ مساجد کی اہمیت کم ہوگئی اور پورے ملک میں جعلی قبروں اور مزارات کا جال بچھ گیا۔ امام صاحب نے تحریر وتقریر کے ذریعے ان مشرکانہ عقائد کی تردید کی۔ اپنے رسائل ''الرد علی البکری'' اور ''التواسل والوسیلة'' میں علی الاعلان اس بات کا اظہار کیا کہ غیر اللہ سے دعا مانگنا حرام ہے اور شریعت محمدی میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اللہ اور انسان میں واسطے کی حقیقت پر ایک کتاب ''الواسطہ بیان الخلق والحق'' کے نام سے لکھی۔ آپ نے عقیدۂ توحید کو انبیاء کی بعثت کا بنیادی مقصد قرار دے کر سادہ دل مسلمانوں کی توجہ اسلام کی دعوت کے اس مرکزی نقطے کی طرف مبذول کروائی۔ آپ کی یہ کوشش ضائع نہیں ہوئی اور توحید کی صدائیں ایک بار پھر گونجنے لگیں۔

فلسفیانہ روایت

دوسرا محاذ اہلِ فلسفہ اور علمِ کلام سے شغف رکھنے والوں کا تھا۔ علمِ کلام اگرچہ فلسفے کے مقابلے کے لئے وجود میں آیا تھا، مگر رفتہ رفتہ خود اس میں فلسفے کی روح گھس گئی۔ یونانی اصطلاحات کا استعمال، بات کو طویل و پیچیدہ بنا کر پیش کرنا، عقائد کے ثبوت کے لئے عقل کے استعمال پر اصرار اور پھر سب سے بڑھ کر ارسطو کی عظمت و تقدیس کا ایسا قائل ہونا کہ اس کی تحقیقات کو حرف آخر قرار دینا، ان سب باتوں نے مل کر علمِ کلام کو عجیب وغریب نظریات کا معجون مرکب بنا دیا تھا۔ امام ابن تیمیہ کے زمانے میں نصیر الدین طوسی کا طوطی بول رہا تھا جو یونانی فلسفہ اور منطق کو معیار فضیلت گردانتا تھا۔ محدثین وفقہاء چونکہ اس علم کی باریکیوں سے ناآشنا تھے لہٰذا مقابلے کی سکت نہ رکھتے تھے۔ جبکہ عام عوام مرعوبیت کا شکار تھے۔ ایسے میں امام صاحب نے علمِ کلام کو مستقل موضوع بنا کر یونانی فلسفہ کی تنقید اور علمی محاسبے کا کام انجام دیا۔ بغیر کسی تعصب کے انہوں نے اس بات کا اعتراف کیا کہ طبیعات وریاضیات کے میدان میں علمائے یونان کی کاوشیں مفید ہیں۔ لیکن الٰہیات میں انہوں نے فلسفیوں کو ناکام اور جاہل قرار دیا۔ اپنی کتابوں ''الرد علی المنطقیین''، ''نقض المنطق''، ''الرد علی البکری'' اور ''النبوات''

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں گن گن کران غلطیوں کی نشاندہی کی جو اہلِ فلاسفہ سے سرزد ہوئیں۔ آپ عقلی واستدلالی طریقے سے فلسفے کے پیچیدہ مضامین کا رد کرتے۔ اس طرح عالمِ اسلام جو گزشتہ چند صدیوں سے فلسفہ اور منطق جیسے علوم سے مسحور تھا اس سحر سے باہر آ گیا اور دین کی اصل اور سادہ تعلیمات ایک بار پھر نکھر کر سامنے آ گئیں۔ آپ نے لوگوں کو یہ باور کروایا کہ اگر یہ علوم عقلی ہیں تو ان کی بنیاد تقلید کے بجائے غور و فکر پر ہے۔ اس لئے ہر زمانے کے اہلِ عقل کو یہ حق ہے کہ وہ ان پر ناقدانہ نظر ڈالیں اور خلافِ عقل بات کو رد کر دیں۔ چنانچہ آپ نے عقلی جمود کے اس دور میں یونانی فلسفے پر تنقید کر کے فکر و اجتہاد کا نیا دروازہ کھولا۔

غیر اسلامی تصوّف

تیسری طرف اہلِ تصوف ایک بڑے حلقے میں انتہائی مقبول تھے۔ مختلف مذاہب خصوصاً ہندو مذہب کے عقائد و افکار کو اسلام کا لبادہ پہنایا جا رہا تھا۔ حلول کا عقیدہ، وحدۃ الوجود کا فلسفہ، نیز صوفیوں کے لئے احکامِ شریعت کا ساقط ہو جانا اس کی چند مثالیں ہیں۔ پھر تصوف کی چند شاخیں شعبدہ بازی اور نظر بندی کی نچلی سطح تک اتر آئی تھیں۔ عوام اور خواص دونوں ان سے متاثر تھے۔ وحدتُ الوجود کے عقیدہ میں اس قدر غلو پیدا ہو گیا تھا کہ ابن عربی کے بعد تلمسانی یہاں تک کہہ بیٹھے کہ قرآن تو سارا کا سارا شرک سے بھرا ہوا ہے۔ اس لئے کہ وہ رب اور عبد میں فرق کرتا ہے۔ توحید تو ہمارے کلام میں ہے۔ (معاذ اللہ)

فرقۂ جہمیہ کے شائقینِ عبادت مخلوقات کی پرستش کرنے لگے۔ یہاں تک کہ ارذل ترین مخلوقات بھی خدا ہونے کی بناء پر لائق عبادت ٹھہریں۔ اس پر مزید یہ کہ اس عقیدے کے مدعی قبیح گناہوں کے مرتکب ہوتے اور اسے اپنے عینی عقائد سے درست ثابت کرنے کی کوشش کرتے۔ بعض لوگ لڑکیوں کے عشق میں مبتلا ہوتے اور کہتے کہ ان میں بھی اللہ کی تجلی ہے۔ بعض بوسہ دیتے ہوئے اپنے محبوب سے کہتے کہ تو خدا ہے۔ (معاذ اللہ)

اس سلسلے میں امام صاحب نے ایک خط شیخ نصر بن سلیمان کو لکھا اور اس کو دعوت دی کہ وہ ابن عربی کے غیر اسلامی نظریات خصوصاً وحدت الوجود سے توبہ کرے۔ شیخ نصر کے حلقۂ اثر میں حکمران طبقہ بھی تھا۔ وہ آپ کے مدلل خط کا جواب تو نہ دے سکا البتہ یہ پورا گروہ آپ کا شدید مخالف ہو گیا۔

فرقۂ باطنیہ

چوتھا گروہ جس سے مسلمانوں کو بہت نقصان پہنچا تھا وہ فرقۂ باطنیہ تھا۔ ان کی تعلیمات مجوسی عقائد، افلاطونی تصورات اور خطرناک سیاسی اغراض کا مجموعہ تھیں۔ یہ مسلمانوں کے خلاف غیر مسلم طاقتوں اور بیرونی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حملہ آوروں کی ہمیشہ مدد کرتے۔ شام و فلسطین پر صلیبی حملوں کے موقع پر انہوں نے صلیبیوں کا ساتھ دیا۔ اس کے بعد بھی سازشوں اور بغاوتوں میں مصروف رہے۔ یہاں تک کہ تاتاریوں نے جب شام پر حملہ کیا تو انہوں نے کھل کر تاتاریوں کا ساتھ دیا۔ جب حالات ناقابل برداشت ہو گئے تو حکومت وقت نے ان کے خلاف اقدام کرنے کے لئے علماء سے فتویٰ دریافت کیا۔ امام صاحب نے نہ صرف ان کے خلاف جہاد کرنے کو فرض قرار دیا بلکہ دوسرے شہروں کے مسلمانوں کے نام بھی خطوط لکھے اور انہیں جہاد میں حصہ لینے کی ترغیب دی۔ آخر کار ایک زبردست لشکر کے ساتھ جس میں امام صاحب دیگر مجاہدین کے ساتھ شامل ہوئے ان کی جمعیت کو منتشر کر دیا۔

عیسائی مشنری یلغار

ایک بیرونی محاذ عیسائیوں نے اپنے مذہب کی حقانیت کو ثابت کرنے کے لئے کھول رکھا تھا۔ مسلمانوں کی سیاسی کمزوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ اپنے مذہب کی برتری ثابت کرنے کے لئے میدان میں آ گئے۔ نبوت محمدی ﷺ پر اعتراضات اور اپنے مذہب کی ترجیح پر کتابیں تصنیف کرنے لگے۔ قبرص کے عیسائیوں کی جانب سے ایک مناظرانہ تصنیف شام پہنچی جس میں مسیحیت کو دین حق ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اور نبی اکرم ﷺ کی بعثت کو عمومی کے بجائے عرب اقوام کے لئے مخصوص بتایا گیا تھا۔ جب اس کتاب نے شام کے دینی و علمی حلقوں میں شہرت حاصل کی تو امام صاحب نے اس موضوع پر قلم اٹھایا اور **"الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح"** کے نام سے چار جلدوں میں ایک کتاب لکھی۔ جس میں نہ صرف نبوتِ محمدی ﷺ کے ثبوت میں دلائل پیش کئے بلکہ مسیحیت کی بنیادوں پر حملہ کیا۔ ان کے عقائد کی غلطیاں، مسیحیت کی تاریخ، ان کی کتابوں میں تحریفات اور مسیحی علم الکلام پر اس قدر سیر حاصل بحث کی کہ یہ کاوش کسی ایک شخص کی معلوم نہیں ہوتی۔ شیخ ابوزہرہ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ "تنہا یہ کتاب ہی آپ کو غیر فانی مفکر کا مرتبہ دلانے کے لئے کافی ہے۔"

روحِ اجتہاد کی بیداری

ایک اور چیز جس نے امام صاحب کو بے چین کیا وہ مسلمان دنیا پر چھایا ہوا علمی جمود تھا۔ ہر گروہ اپنے فقہی دائرے سے باہر قدم نکالنا جرم سمجھتا تھا۔ جس کی وجہ سے کوئی عالم نئے مسائل کے استنباط کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ اسلامی فقہ اپنے نمو اور ارتقاء کی صلاحیت کھو چکی تھی۔ ایسے میں امام صاحب نے اس ناممکن کو ممکن بنایا۔ خود آپ کا تعلق حنبلی فقہ سے تھا، لیکن آپ نے چاروں اماموں کی آراء، متقدمین اور متاخرین کے اقوال سے رجوع کیا۔ یہاں تک کہ بہت سے امور میں خالصتاً اپنی رائے کو اختیار کیا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

امام صاحب نے ان فرقوں کے عقائد پر علی الاعلان تنقید کر کے گویا بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال دیا۔ ہر طرف سے شدت سے آپ کی مخالفت شروع ہوگئی۔ آپ چومکھی لڑائی لڑتے رہے لیکن اپنے موقف سے ایک انچ پیچھے نہ ہٹے۔ دن بدن آپ کے حریفوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ آپ کی ذہنی وعلمی سطح اپنے زمانے کے لوگوں سے بہت بلند تھی۔ جب وہ آپ کے مقابلے میں آتے تو اپنی علمی کم مائیگی کا احساس جذبۂ حسد کو جنم دیتا۔ آپ جہاں جاتے سب پر چھا جاتے۔ درس دیتے تو درس کی دیگر محفلیں بے رونق ہو جاتیں۔ پھر آپ کو اپنے راہِ حق پر ہونے کا اس قدر یقین تھا کہ بدعتیوں اور دیگر فاسد خیال لوگوں کے بارے میں سخت الفاظ کا استعمال کرتے۔ نہ صرف یہ کہ آپ زبان اور قلم سے جہاد کرتے بلکہ جہاں موقع ملتا وہاں بزور برائی کا قلع قمع کرنا ضروری سمجھتے۔ ایک بار آپ کے پاس ایک پیر لایا گیا جو لمبی چوڑی گدڑی پہنے تھا۔ بال اور ناخن بڑھے ہوئے تھے۔ گالی اور فحش کثرت سے بکتا تھا اور نشہ آور چیزوں کا استعمال کرتا تھا۔ آپ نے اس کی گدڑی کو تار تار کرنے کا حکم دیا، اس کے بال اور ناخن کٹوائے اور فحش گوئی اور نشے سے توبہ کروائی۔ دمشق کی جامع مسجد میں ایک چٹان سے لوگوں کو عقیدت ہوگئی تھی اور وہاں مشرکانہ رسمیں ادا کی جانے لگی تھیں۔ امام صاحب نے اس کو تڑوا کر پھنکوا دیا۔

رفاعی فرقے کے فقراء نے اپنی مقبولیت ثابت کرنے کے لئے کرتب دکھانے چاہے اور دعویٰ کیا کہ ہم پر آگ اثر نہیں کرتی۔ اگر ہم اپنے دعوے کو سچا ثابت کر دیں تو ہم برسرحق ہیں۔ امام صاحب نے اس کو جعل سازی قرار دیا اور کہا جو شخص آگ میں کودے اس کے جسم کو پہلے سر کے اور گھاس سے صاف کر کے نہلایا جائے۔ اگر پھر بھی وہ اپنا کمال دکھائے تو اس کو دجال سمجھا جائے۔ اس موقع پر ایک رفاعی صوفی نے اعتراف کیا کہ ہمارے کرتب شریعت کے مقابلے میں نہیں چلتے بلکہ تاتاریوں کے ہاں مقبول ہیں۔ یہ سب باتیں تھیں جنھوں نے آپ کو عوام الناس میں مقبول اور چند فرقوں میں انتہائی غیر مقبول بنا دیا تھا۔ آنے والے وقت میں مصائب کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ آپ کا منتظر تھا۔

مصائب وابتلاء کا طوفان اور ابن تیمیہؒ کی ثابت قدمی

امام صاحب پر سب سے پہلے علی الاعلان تنقید ۶۹۰ ہجری میں ہوئی جب صفات باری تعالیٰ کے مسئلے پر تقریر کرتے ہوئے آپ نے اشاعرہ پر سخت تنقید کی۔ اس پر شافعی حضرات آپ کی مخالفت میں کھڑے ہوگئے مگر قاضی القضاء کی حمایت کی وجہ سے ان کو خاموش ہونا پڑا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۶۹۸ ہجری میں حماۃ کے علاقے سے صفات باری تعالیٰ پر ایک سوال آیا جس کے جواب میں امام صاحب نے "العقیدۃ الحمویہ" تحریر کی۔ جس میں آپ نے سلف کے مذہب کو سراہا اور اشاعرہ متاخرین پر سخت تنقید کی۔ اس پر حاسدین نے اس مسئلے کو خوب اچھالا۔ یہاں تک کہ ایک مجلس کا اہتمام کیا گیا جس میں آپ کو اعتراضات کا جواب دینے کے لئے طلب کیا گیا۔ آپ نے تمام اعتراضات کا مدلل جواب دیا اور کسی کو زبان کھولنے کی جرأت نہ ہوئی۔

اسی اثناء میں شیخ نصر جسے امام صاحب نے ابن عربی کے نظریات سے توبہ کرنے کے لئے خط تحریر کیا تھا آپ کا شدید مخالف ہو گیا۔ نائب سلطنت اس کا معتقد تھا۔ شیخ نصر نے اس کو یقین دلایا کہ امام صاحب کا رسوخ شام میں سلطان کے لئے بڑا خطرہ بن سکتا ہے۔ چنانچہ ملک ناصر کو ساری صورتحال سے آگاہ کیا گیا۔ ملک ناصر نے نائب شام کو امام صاحب کے عقیدے کی جانچ کے لئے کہا۔ اس سلسلے میں نائب سلطنت شام کے زیر اہتمام تین مجلسیں منعقد ہوئیں جن میں علماء وفقہاء نے آپ کے عقائد کے بارے میں پوری تحقیق کی۔ لیکن کوئی بات بھی خلاف سنت ثابت نہ کر سکے۔ یہ روداد ملک ناصر کو لکھ کر بھیج دی گئی جس کو پڑھ کر وہ مطمئن ہو گیا۔

مخالفین سے یہ شکست برداشت نہ ہوئی اور انہوں نے سلطان ناصر کو یہ باور کروایا کہ نائب سلطنت خود امام صاحب کا طرفدار ہے اس لئے ان کے عقائد کی صحیح جانچ نہ ہو سکی لہٰذا انہیں مصر طلب کیا جائے۔ سلطان نے حکمنامہ صادر کیا اور امام صاحب مصر کے لئے روانہ ہوئے۔ جس روز آپ دمشق سے روانہ ہوئے اس دن سارا شہر آپ کی زیارت کے لئے ٹوٹ پڑا۔ شہر کے باہر راستوں پر لوگ کھڑے رو رہے تھے۔ انہیں اس بات کا اندیشہ تھا کہ آپ کے خلاف کوئی زبردست سازش ہونے والی ہے۔

مصر پہنچ کر آپ کے اوپر حکومت کی جانب سے مقدمہ قائم کیا گیا اور آپ کو سخت ترین سزا کا مستحق قرار دیا گیا۔ جوابِ دعویٰ کے لئے آپ تشریف لائے تو قاضی القضاۃ کے متعصبانہ رویئے کو دیکھتے ہوئے آپ نے بیان دینے سے انکار کر دیا۔ قاضی القضاۃ نے آپ کو اور آپ کے بھائیوں کو قید کرنے کا حکم دیا۔ قید میں امام صاحب کے وعظ وارشادات نے بہت سوں کی زندگی بدل ڈالی۔

آپ کے پیچھے آپ کے حامی اس بات کی کوشش میں لگے رہے کہ کسی طرح امام صاحب اور آپ کے مخالفین متنازع امور پر گفتگو کے لئے راضی ہو جائیں۔ آخر کار وہ اس کوشش میں کامیاب ہوئے۔ پہلے روز کی گفتگو کے بعد مخالفین میں اتنی ہمت نہ رہی کہ امام صاحب کو قید خانے بھیجنے پر اصرار کریں۔ بالآخر اٹھارہ ماہ کی اسیری کے بعد رہائی نصیب ہوئی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قاہرہ کے شہریوں کے اصرار پر آپ نے وہاں کچھ عرصے قیام کا فیصلہ کیا اور جامع حاکمی میں وعظ کا سلسلہ شروع کیا۔ ابھی قید سے رہائی کو پانچ ماہ ہی گذرے تھے کہ ایک جمعے کی تقریر میں آپ نے صوفیوں کے عقائد پر زبردست گرفت کی۔ صوفی اس تنقید کو برداشت نہ کر سکے۔ سلطان سے شکایت کی اور عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ امام صاحب نے جوابِ دعویٰ کے طور پر ایسی زبردست تقریر کی کہ مدعی خاموش ہوگئے اور عدالت کوئی فیصلہ نہ کر سکی۔ آخر کار مخالفین کے اصرار پر حکومت کی طرف سے آپ کے سامنے تین تجویزیں پیش کی گئیں: دمشق چلے جائیں، اسکندریہ میں چند شرائط کے ساتھ قیام پذیر ہوں ورنہ قید کی زندگی کو پسند کریں۔

امام صاحب اپنے عقیدت مندوں کے پرزور اصرار پر دمشق جانے کے لئے تیار ہوگئے۔ ابھی آپ راستے ہی میں تھے کہ آپ کی قید کا فرمان جاری کر دیا گیا۔ دراصل جب آپ نے دمشق جانے کا فیصلہ کیا تو نائب سلطنت (جو آپ کا مخالف تھا) کو احساس ہوا کہ دمشق پہنچ کر ایک بار پھر آپ آزادانہ طور پر اپنے کام میں مصروف ہو جائیں گے۔ لہٰذا بغیر وجہ بتائے دوبارہ گرفتار کر لئے گئے۔ قید کا بیشتر وقت ذکر الٰہی اور تلاوت قرآن میں بسر ہوتا۔ باقی وقت تصنیف و تالیف اور قیدیوں کو وعظ و نصیحت کرتے گذرتا۔ کچھ عرصے بعد آپ کے بھائی کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔

شوال ۷۰۸ ہجری میں نائبِ سلطنت امیر بیبرس نے سلطان ناصر کا تخت الٹ دیا۔ اس کو معلوم تھا کہ سلطان امام صاحب کے لئے دل میں نرم گوشہ رکھتا ہے۔ لہٰذا اس خدشے سے کہ کہیں امام صاحب کا اثر و رسوخ اس کے خلاف کوئی شورش نہ برپا کر دے آپ کو اسکندریہ بھیج دیا گیا جو صوفیاء کا گڑھ تھا۔ آپ کے مخالفین اس توقع میں تھے کہ کوئی متعصب صوفی آپ کا کام تمام کر دے گا اور ہمیشہ کے لئے آپ سے جان چھوٹ جائے گی۔

اگلے سال سلطان ناصر دوبارہ اقتدار حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ امیر بیبرس گرفتار ہو کر قتل ہوا۔ سلطان ناصر نے امام ابن تیمیہ کی رہائی کا حکم صادر کیا اور آپ کی آمد پر دربار میں گرمجوشی سے آپ کا استقبال کیا۔ کچھ عرصہ سلطان اور قاہرہ کے شہریوں کے اصرار پر آپ نے قاہرہ میں قیام کیا۔ پھر بیت المقدس کی زیارت کے بعد واپس دمشق آ گئے اور ایک بار پھر وعظ و نصیحت اور تصنیف و تالیف میں مصروف ہوگئے۔ صوفیاء، فقراء، بدعتیوں اور فقیہ حضرات سے اختلافات ایک بار پھر سامنے آنے لگے۔ آپ کی تصنیفات اور فتوے ان پر سخت گراں گذرے۔ حلف بالطلاق کے مسئلے پر بات بڑھ گئی۔ امام صاحب کی رائے تھی کہ حلف بالطلاق سے طلاق واقع نہ ہوگی بلکہ فسخ حلف کا کفارہ لازم آئے گا۔ اسی طرح چند اور مسائل پر امام صاحب کی رائے حکومت کے زیر سایہ رہنے والے عالموں سے بالکل مختلف تھی۔ قاضی القضاۃ کی جانب سے حکم دیا گیا کہ اس معاملے پر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آئندہ فتویٰ جاری نہ کیا جائے۔ آپ کو چونکہ اس معاملے میں شرح صدر حاصل تھا چنانچہ آپ نے اپنے موقف سے ہٹنے اور اپنے عقیدے کو چھپانے سے انکار کر دیا۔ ۲۲ رجب ۷۲۰ھ ہجری کو دوبارہ قید کر دیے گئے۔ جب علماء کا غصہ کچھ ٹھنڈا ہو گیا تو پانچ ماہ بعد آپ کی رہائی کے احکام آ گئے۔

اگلے پانچ سال تک پوری آزادی اور توجہ کے ساتھ درس و تدریس میں مصروف رہے۔ کچھ نئی کتابیں تصنیف کیں اور کچھ پرانی کتابوں پر نظر ثانی کی۔

علمائے وقت چونکہ ذاتی مفاد کی بناء پر امام صاحب سے دلی پرخاش رکھتے تھے۔ لہٰذا ایک بار پھر قبروں کی زیارت سے متعلق اس فتوے کی تشہیر کی جانے لگی جو سترہ سال پہلے آپ نے دیا تھا۔ جس کے مطابق قبر کی زیارت کی نیت سے سفر کرنے کو ناجائز کہا گیا تھا۔ یہاں تک کہ تصریح کی گئی تھی کہ نبی کریم ﷺ کی قبر کی زیارت کے لئے سفر کے اہتمام کے بجائے مسجد نبوی ﷺ میں نماز پڑھنے کی نیت سے آنا چاہئے اور قبر انور کی زیارت کے وقت اس طرح صلوٰۃ وسلام بھیجنا چاہئے جیسا کہ صحابہ و تابعین کا دستور تھا۔

اس بات کا خوب چرچا کیا گیا اور مخالفین نے شور مچا دیا۔ بالآخر حکومت نے آپ کی اسیری کا فرمان جاری کر دیا۔ یہ اطلاع پاتے ہی آپ نے فرمایا۔ ''میں تو اس کا منتظر ہی تھا۔ اس میں خیر اور مصلحت پوشیدہ ہے''۔ امام صاحب کی اسیری کی خبر نے اہلِ حق کو ایک بار پھر پژمردہ کر دیا۔ بے حساب خط سلطان کو لکھے گئے، جن میں آپ کی رہائی کے لئے سفارش کی گئی۔

جیل میں آپ کا سب سے بڑا مشغلہ تلاوت و تدبرِ قرآن تھا۔ باقی وقت علمی و فقہی سوالات کے جوابات تحریر کرتے گذرتا۔ امام صاحب کی ہر تحریر جیل سے نکلتے ہی ہاتھوں ہاتھ لے لی جاتی۔ مسئلہ زیارت کے متعلق ایک تحریر میں قاضی عبداللہ بن الاخنائی کی تردید کی اور ان کو قلیل العلم کہا تو قاضی صاحب نے سلطان سے شکایت کر دی۔ حکومت کی طرف سے آپ کے پاس سے لکھنے پڑھنے کا سامان ضبط کر لیا گیا۔ آپ کے لئے یہ سزا سب سے سخت تھی۔ پھر بھی صبر اور شکر بجالائے اور منتشر اوراق پر کوئلے سے لکھنا شروع کر دیا۔ اسیری کے دوران قرآن کے اسّی دور ختم کیے۔

وفات

زمانۂ اسیری میں ہی طبیعت خراب رہنے لگی تھی۔ بائیس روز تک علیل رہے۔ آخر کار ۲۲ ذیقعدہ ۷۲۸ ہجری کو ۶۷ سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ آپ کی وفات کی اطلاع قید خانے کے موذن نے مینار پر چڑھ کر دی۔ تمام

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شہر سکتے میں آ گیا۔ جب جنازہ جامع اموی میں لایا گیا تو ہجوم کا یہ حال تھا کہ میدان ،گلیاں ، بازار سب بھر گئے ۔ دکانیں بند ہوگئیں ۔لوگوں کو کھانے پینے کا ہوش نہ رہا۔ اس ہجوم میں کسی نے بلند آواز سے پکارا'' سنت کے پیشواؤں کا جنازہ اسی شان کا ہوتا ہے۔'' اس پکار نے کہرام مچا دیا۔ نمازِ جنازہ کے بعد جنازے کو کندھا دینے کا موقع ملنا مشکل تھا اور جنازہ سروں پر سے گذر رہا تھا۔ ہجوم کی وجہ سے لوگوں کی پگڑیاں ، رومال اور جوتے گر گئے اور کسی کو ان کا ہوش نہ رہا۔ جنازہ صبح کے وقت نکلا تھا اور عصر کے وقت تدفین کی نوبت آئی ۔ تمام عالمِ اسلام میں غائبانہ نمازِ جنازہ ادا کی گئی ۔ یہاں تک کہ چین کے ایک بعید ترین شہر میں نمازِ جنازہ کا اعلان ان الفاظ میں ہوا'' ترجمان قرآن شیخ ابن تیمیہ کی غائبانہ نماز جنازہ ادا کی جائے گی۔''

امام صاحب کی شخصیت اور اوصافِ حمیدہ

امام صاحب کے علمی پائے اور دینی غیرت وحمیت کا اندازہ ان واقعات سے ہوتا ہے جو گزشتہ صفحات میں بیان کئے گئے ۔ آپ کے ہم عصر جو آپ کے حریف بھی تھے آپ کے علمی کمال کے معترف تھے ۔ امام صاحب کے حریف کمال الدین الزملکانی کہتے ہیں'' ان جیسا جامعیت رکھنے والا شخص دیکھنے میں نہیں آیا۔ ابن تیمیہ کے لئے اللہ تعالیٰ نے علوم اس طرح موم کر دیئے تھے جس طرح داؤد علیہ السلام کے لئے لوہا نرم کر دیا تھا۔ جس علم کے بارے میں ان سے سوال کیا جاتا وہ اس طرح جواب دیتے کہ دیکھنے یا سننے والا یہ سمجھتا کہ وہ اس فن کے سواء کچھ نہیں جانتے اور یہ فیصلہ کرتا کہ ان کی طرح اس فن کا کوئی شخص عالم نہیں ہے۔''

آپ جس درجے کے عالم تھے، اسی درجے کے عابد بھی تھے۔ نماز فجر کے بعد اپنی جگہ بیٹھ رہتے ۔ یہاں تک کہ دن اچھی طرح نکل آتا۔ اس تمام عرصے میں ذکراذکار اور توبہ استغفار میں مصروف رہتے ۔ کوئی پوچھتا تو کہتے یہ میرا ناشتہ ہے ۔ اگر میں ناشتہ نہ کروں تو میری قوت زائل ہونے لگتی ہے ۔ پھر تلاوت قرآن کے بعد فقہی سوالوں کے جواب دیتے ۔ اس کے بعد دارالحدیث السکریہ اور دارالحدیث حنبلیہ کے طلبہ کو درس دیتے ۔ یہ سلسلہ نماز ظہر تک جاری رہتا۔ نمازِ عصر کے بعد عام مجلس ہوتی جس میں ہر کوئی شرکت کرسکتا تھا اور علمی اور غیر علمی ہر طرح کی گفتگو ہوتی ۔ نمازِ مغرب کے بعد دوبارہ طلباء کو پڑھاتے ۔ عشاء کے بعد رات گئے تک کتابوں کی تصنیف وتالیف کے کاموں میں مصروف رہتے ۔ رات کو تمام لوگوں سے علیحدہ رہتے تھے (آپ نے ساری زندگی شادی نہ کی)۔ اس وقت آپ ہوتے اور قرآن مجید ہوتا جس کی برابر تلاوت کرتے رہتے اور آنکھوں سے آنسو جاری رہتے ۔ نوافل وعبادت اور ذکر میں دیر تک مشغول رہتے ۔ جب نماز شروع کرتے تو آپ کے شانے اور اعضاء

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کانپنے لگتے۔ یہاں تک کہ ان کو دائیں بائیں لرزش ہوتی۔

غنائے قلب کی جس نعمت سے اللہ نے آپ کو نوازا تھا، اس کے بعد دنیا کی کوئی دولت آپ کے لئے اہم نہ تھی۔ ایک بار چند افواہوں سے متاثر ہو کر سلطان نے پوچھا۔ ''کہیں آپ میری سلطنت پر قبضے کے خواب تو نہیں دیکھ رہے؟'' آپ نے جواب دیا۔ ''میں ایسا کروں گا!!! خدا کی قسم تمہاری اور تاتاریوں کی سلطنت مل کر بھی میری نگاہ میں ایک پیسے کے برابر بھی نہیں ہے۔''

آپ کے حریف عمر بھر اپنے طور پر آپ کو ستاتے رہے۔ مگر جتنا وہ آپ کو ستاتے اتنا آپ صبر کرتے اور عزیمت کے درجات طے کرتے جاتے۔ خود فرماتے ''میرے دشمن میرا کیا بگاڑ سکتے ہیں۔ میری جنت میرے دل میں ہے اور میرا باغ میرے سینے میں ہے۔ میں جہاں بھی جاؤں گا وہ میرے ساتھ رہیں گے۔ میری قید میرے لئے گوشۂ تنہائی ہے۔ میرا قتل میری شہادت ہے اور میری جلاوطنی میری سیاحت ہے۔''

اپنے خون کے پیاسے دشمنوں کو فراخ دلی سے معاف کر دیتے۔ سلطان ناصر جب دوبارہ برسر اقتدار آیا تو جن جن لوگوں نے آپ کو تکلیف پہنچائی تھی ان کو قتل کرنے کا ارادہ کیا۔ آپ کو معلوم ہوا تو سلطان سے صاف کہہ دیا کہ میں اپنی ذات کے لئے کوئی انتقام نہیں لوں گا اور اس بات پر اتنا اصرار کیا کہ سلطان کو قائل کر لیا۔

امام صاحب کے اوصاف، کمالات اور اخلاقی محاسن اس قدر ہیں کہ اس مختصر مضمون میں ان کا احاطہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ اپنے مضمون کا اختتام ہم حافظ ذہبی کے ان الفاظ پر کرتے ہیں جو امام صاحب کی زندگی کے بارے میں پڑھنے کے بعد ہماری اپنی رائے بن گئی ہے۔ حافظ ذہبی اپنی کتاب میں جب آپ کی مدح لکھتے لکھتے تھک گئے تو کہا ''ان کا مقام اس سے کہیں ارفع و اعلیٰ ہے کہ مجھ جیسا شخص ان کی سیرت و فضیلت بیان کرے۔ قسم خدا کی اگر میں خانۂ کعبہ میں عین رکن یمانی و مقام ابراہیم کے درمیان کھڑے ہو کر قسم کھاؤں کہ نہ تو میری آنکھوں نے ان کا مثل دیکھا نہ خود انہوں نے اپنا ثانی تو میری قسم سچی ہوگی اور میرے لئے کفارہ نہیں''۔

تصانیف و تلامذہ

مولانا عطاء اللہ حنیف نے آپ کی ۵۸۲ تصنیفات کے نام گنوائے ہیں۔ تفسیر کے ضمن میں ۱۰۲، حدیث میں ۴۱، فقہ و فتاویٰ کی ۱۳۸، اصول فقہ کی ۲۸، عقائد و کلام کی ۱۲۶ اور اخلاق و تصوف میں ۸۷ چھوٹی بڑی کتابیں اور رسالے ہیں۔ آپ سے بے تحاشہ لوگوں نے فیض اٹھایا۔ آپ کے شاگردوں میں ابن قیمؒ، حافظ ابن کثیر، حافظ ابن عبدالہادی اور حافظ ذہبی نے بہت شہرت پائی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سلطان محمد فاتحؒ

قسطنطنیہ (استنبول) کو فتح کرکے بحری جنگی تاریخ کا معجزہ دکھانے والا عظیم عثمانی خلیفہ

تعارف

سلطان کا نام محمد ثانی تھا، لیکن تاریخ میں سلطان محمد فاتح کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

سلسلۂ نسب یہ ہے: سلطان محمد ثانی بن سلطان مراد دوم بن سلطان محمد اول بن سلطان بایزید یلدرم بن مراد اول بن سلطان اورخان غازی بن عثمان خان (بانی سلطنتِ ترکانِ عثمانیہ)۔

محمد فاتح سلطنتِ عثمانیہ کا ساتواں فرمانروا تھا۔

ولادت

سلطان محمد ثانی کی ولادت 20 اپریل 1424ء بمطابق ۲۶ رجب ۸۳۱ھ میں ہوئی۔

بچپن اور تعلیم و تربیت

محمد کا باپ سلطان مراد ایک عادل، مستقل مزاج، رحمدل، فیاض اور پابندِ شریعت مسلمان حکمران تھا۔ اس کی رعایا اس سے خوش تھی۔ اس کا عہد خوشحالی اور سکون کا تھا۔ سلطان مراد رفاہِ عامہ کے کاموں کے لئے بہت مشہور تھا۔

سلطان مراد نے شروع ہی سے اپنے بیٹے محمد کی تعلیم و تربیت کا بہترین انتظام کیا۔ مروجہ علوم وفنون کی تدریس کے لئے چوٹی کے علماء وفضلاء بڑی بڑی تنخواہوں پر مقرر کئے۔ محمد ثانی خود بھی ذہین تھا اور اس کے ساتھ ساتھ علم کے حصول کا شوقین بھی۔ اس کے اساتذہ اس کی ذہانت اور اعلیٰ صلاحیتوں کے معترف تھے۔ محمد کو بہت جلد اپنی زبان ترکی کے علاوہ عربی، فارسی، لاطینی، ہیبرو اور یونانی میں پوری مہارت حاصل ہوگئی۔ مذہب کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ساتھ ساتھ یونانی فلسفہ، مشرقی تہذیب وثقافت اور تاریخ کے موضوعات سے اسے خاص دلچسپی تھی۔ وہ بادشاہوں خصوصاً فاتحین کے حالات بہت شوق سے پڑھتا تھا، سکندر اعظم کے حالات زندگی اکثر پڑھا کرتا اور اسکے کارناموں کا بڑا گرویدہ تھا۔

فنونِ لطیفہ میں شعروشاعری کی طرف وہ فطری رجحان رکھتا تھا اور زمانۂ ولی عہدی میں ہی اساتذہ کی راہنمائی میں سخن فہمی اور شعرگوئی کے اعلیٰ مذاق کا مالک بن گیا تھا۔ اس نے ترکی، عربی اور فارسی شعراء کے بہترین اشعار یاد کر رکھے تھے۔ محمد کو بہت جلد تحریر وتقریر پر پوری قدرت حاصل ہوگئی۔ وہ ان علوم کے حصول کے ساتھ ساتھ جنگی فنون سیکھنے میں بھی دلچسپی لیا کرتا۔

خاندانِ عثمانیہ کے فرمانروا عیش پسند حکمران نہ تھے بلکہ سلطنت کی سربراہی کے ساتھ ساتھ فوجی جرنیل بھی ہوا کرتے تھے۔ محمد کو شجاعت اور بلند حوصلگی اپنے خاندان سے ورثہ میں ملی تھی۔ خود محمد کا باپ سلطان مراد ایک اولوالعزم مجاہد تھا جس کے زیرتربیت محمد نے سلطنت کی سربراہی، سیاسی امور میں مہارت اور جنگی منصوبہ بندی کی تربیت حاصل کی تھی۔

سلطان مراد اپنے عہدِ حکومت میں مسلسل دشمنوں سے برسرپیکار رہا لیکن اس کا سبب اس کی ہوسِ ملک گیری نہیں تھی بلکہ ہر بار اس کے دشمنوں نے ہی اس کو جنگ کے لئے مجبور کیا۔ وہ دشمن کے مطیع ہو جانے کے بعد ہتھیار رکھ دیتا اور صلح ناموں کی سختی سے پابندی کرتا۔ بائیس سال کی مسلسل لڑائیوں سے تنگ آکر جب زنجڈین کے مقام پر ہنگری کے بادشاہ سے اس کا دس سالہ معاہدۂ امن طے پا گیا تو واپسی پر اسے اپنے بڑے اور انتہائی ہونہار بیٹے علاؤالدین کی موت کی خبر ملی۔ اس خبر کا اسے اتنا صدمہ ہوا کہ اس نے سلطنت سے مستقل طور پر کنارہ کش ہونے کا فیصلہ کرلیا چنانچہ وہ اپنے دوسرے بیٹے محمد کو، جس کی عمر ابھی صرف چودہ برس کے قریب تھی، تختِ سلطنت پر بٹھا کر ایشیائے کوچک کے صوبے منگیشیا چلا گیا اور وہاں یادِ الٰہی میں مصروف ہوگیا۔

جوں ہی یہ خبر مشہور ہوئی کہ سلطان مراد سلطنت سے کنارہ کش ہوگیا ہے اور اس کی جگہ نوعمر و ناتجربہ کار محمد تخت نشین ہوا ہے، عیسائیوں نے صلح نامے کی پروا نہ کرتے ہوئے حملہ کردیا اور بحر اسود کے ساحلی علاقوں پر خوب خونریزی کی۔ درویش صفت مراد کو جب اس کی خبر ہوئی تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ مصلّی گھوڑے کی پیٹھ پر لادا، چالیس ہزار سواروں کی قیادت کرتا ہوا نکلا اور صلیبیوں کو وارنا کے مقام پر عبرتناک شکست سے دوچار کیا۔ اس فتح کے بعد سلطان مراد نے ایک بار پھر محمد کو تخت کا مالک بنایا اور منگیشیا چلا گیا۔ کچھ عرصہ بعد اسے فوج میں بغاوت کو فرو کرنے کے لئے تخت وتاج دوبارہ سنبھالنا پڑا۔ اگلے چھ سال تک وہ بڑی شان وعظمت کے ساتھ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حکومت کرتا رہا۔ اسی دوران محمد کی شادی ایک نومسلم کی بیٹی سے کر دی گئی۔ اس عرصے میں ولی عہدِ سلطنت کی حیثیت سے مختلف شعبوں میں چھ سال تک تجربات حاصل کرتا رہا، حتّٰی کہ وہ ساعت بھی آ پہنچی جب دو مرتبہ کی تخت نشینی کے بعد اکیس برس کی عمر میں مستقل طور پر تخت نشین ہو گیا۔

تخت نشینی

3 فروری 1453 بمطابق ۸۵۶ھ کو سلطان مراد ثانی کا انتقال ہوا تو شہزادہ محمد ثانی جو منگیشیا میں مقیم تھا یہ خبر سن کر خاموشی سے گیلی پولی آ گیا۔ وفات کی خبر کو اس نے خفیہ رکھا کیونکہ اسے بغاوت کا خدشہ تھا۔ باپ کے زمانے میں محمد نے جب بھی نظام حکومت کو اس کی مرضی سے اپنے ہاتھ میں لیا، وزیرِ اعظم خلیل پاشا اور اس کے حواریوں نے سلطان مراد سے اس کے رویے کی شکایت ہی کی اور کہا کہ وہ اپنی رائے کے آگے کسی کے مشوروں کو خاطر میں نہیں لاتا۔ اس گرفت سے محمد کو اپنے طرزِ عمل میں اصلاح کا موقع ملا لیکن اسے خطرہ تھا کہ اگر اس نے دانشمندی سے معاملات کو ہاتھ میں نہ لیا تو اس کی جانشینی خطرے میں پڑ جائیگی۔ چنانچہ مناسب موقع دیکھ کر سلطان مراد کی وفات کا اعلان کیا اور اس کے فوراً بعد اس کی تخت نشینی کی رسم انجام دی گئی۔ ۲۱ برس کی عمر میں اس بھاری ذمہ داری کو انجام دینے کا عملی ڈھنگ وہ پہلے ہی سیکھ چکا تھا، اب اس نے تدبّر اور فراست کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے والد کے زمانے کے تمام اعلیٰ عہدیداروں کو ان کے عہدوں پر برقرار رکھا اور صلاحیت اور اہلیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے نئے عہدیداروں کا تقرر بھی کیا۔

سلطان محمد چھ برس کی مدت میں نہ صرف یہ کہ امورِ مملکت چلانا سیکھ گیا تھا بلکہ اب وہ ایک آزمودہ جرنیل بھی بن چکا تھا لیکن شاہ قسطنطین اسے اب بھی ناتجربہ کار ہی خیال کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے سرحدوں پر چھیڑ چھاڑ شروع کر دی اور اپنا ایک سفیر سلطان کے دربار میں بھیجا جس نے بڑے گستاخ لہجے میں یہ پیغام دیا کہ:

> ''اگر سلطان نے اس عثمانی شہزادے (جو اس کی تحویل میں تھا) کا وظیفہ نہ بڑھایا تو ہم خود اس شہزادے کو سلطنتِ عثمانیہ کے تخت پر بٹھا دیں گے''۔

سلطان کو یہ پیغام اس وقت ملا جب وہ ایشیائے کوچک کے چند سرکش امراء کا مزاج درست کرنے میں مصروف تھا۔ سلطان نے پورے صبر و سکون سے اس دھمکی کو سنا اور ٹال دیا۔ سب کو آنے والے دنوں میں جنگ اپنے سروں پر مسلط نظر آ رہی تھی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عثمانی ترک اور قسطنطنیہ

اس سے قبل کہ ہم سلطان محمد فاتح کے اصل اور سب سے اہم کارنامے کا بیان کریں ضروری ہے کہ اس زمانے کے حالات اور پس منظر سے آگاہی حاصل کی جائے۔

ایشیائے کوچک کے علاقے میں مسلمانوں کے قدم صحیح معنوں میں گیارہویں صدی عیسوی میں سلجوقیوں کی کامیابیوں کی وجہ سے جمے۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ سلجوقیوں کی حکومت بھی زوال کا شکار ہونے لگی۔ باہمی چپقلش نے سلطنت میں پہلا سا دم خم نہ رہنے دیا تھا۔

تیرہویں صدی عیسوی کے وسط میں چنگیز خان کے خوف سے فرار ہو کر کچھ ترک گھرانے جن کا تعلق ''اغز'' قبیلے سے تھا خراسان چھوڑ کر ادھر ادھر بھٹکتے پھر رہے تھے۔ بالآخر انہوں نے سلجوقی فرمانروا علاؤالدین کے پاس پناہ حاصل کرنے کے لئے ایشیائے کوچک کی طرف سفر شروع کیا۔ جب وہ انگورہ کے قریب پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ ایک بہت بڑا گردوغبار ہے جس نے آسمان کو ڈھکا ہوا ہے۔ قبیلے کے سردار ارطغرل نے ایک ٹیلے پر چڑھ کر دور سے صورتحال کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ ایک میدان میں دو فوجیں گتھم گتھا ہیں۔ ایک فوج کی تعداد دوسری سے بہت کم ہے اور چھوٹی فوج عنقریب مغلوب ہو کر راہ فرار اختیار کرنے والی ہے۔ ترکوں کے یہاں عموماً کمزور کی امداد کا سبق دیا جاتا تھا، چنانچہ اس موقع پر ارطغرل نے کمزور فریق کی مدد کی جس نے جنگ جیت لی۔ جب جنگ اپنے اختتام کو پہنچی تو معلوم ہوا کہ ارطغرل نے دراصل علاؤالدین سلجوقی کی بروقت مدد کر کے اسے تاتاریوں کے ہاتھوں شکست سے بچالیا تھا۔

تاتاری حملوں نے دنیائے اسلام میں ہر جگہ تباہی مچائی ہوئی تھی اور اب وہ ایشیائے کوچک میں سلطان سلجوقی سے بھی برسرپیکار تھے۔ سلطان علاؤالدین سلجوقی نے احسان مندی کے جذبات کے ساتھ ارطغرل کو سرسبز وشاداب علاقہ جو یونانی سلطنت کے سرحدی صوبے سے ملا ہوا تھا بطور جاگیر بخش دیا۔ کچھ عرصے بعد جب ارطغرل نے سلجوقی سلطان کے نائب کی حیثیت سے یونانیوں اور منگولوں کو شکست دی تو سلطان نے خوش ہو کر مزید علاقہ بھی اس کے حوالے کر دیا اور اس کی ریاست کا نام ''سلطانونی'' رکھ دیا۔ اس کے علاوہ اسے اپنی فوج کے ایک حصے کا سالار بھی منتخب کر لیا۔ ارطغرل اپنی فوج کے لئے اپنے علاقے کے بہترین اور سب سے بہادر جوانوں کو منتخب کرتا تھا۔ اس کی مختصر فوج کے دلیر سپاہیوں نے یونانی سرحدوں پر اپنی جانبازی دکھا کر عیسائیوں کو مرعوب کر لیا تھا۔ ارطغرل کی وفات کے بعد سلجوقی سلطان نے اس کی ریاست اس کے لائق فائق بیٹے عثمان کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حوالے کر دی۔ یہی سلطان عثمان دولتِ عثمانیہ کا بانی اور سلطنتِ عثمانیہ کا پہلا تاجدار بنا۔

اگر چہ سلجوقی حکومت میں انتشار اور تفرقے کی وجہ سے اس کے امراء خودسر ہو گئے تھے مگر عثمان ہمیشہ سلجوقی حکومت کا وفادار رہا۔

سلطنتِ عثمانیہ کا قیام

آخری سلجوقی سلطان کی وفات کے بعد جب مختلف سرداروں نے چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کر لیں تو عثمان نے بھی خودمختاری کا اعلان کر دیا۔ اس طرح عثمان نے اس طویل وعریض عثمانی سلطنت کی بنیاد ڈالی جو ڈیڑھ سو برس کے اندر دنیا کی زبردست طاقتوں میں شمار کی جانے لگی، اور تین سو برس نہ گذرنے پائے تھے کہ عثمانی سلطنت اپنی وسعت اور طاقت کے لحاظ سے دنیا کی سب سے عظیم الشان سلطنت بن گئی۔ یہ سلطنت تقریباً سوا چھ سو برس قائم رہی اور ۱۹۲۴ میں اس وقت اختتام کو پہنچی جب غازی مصطفیٰ کمال پاشا اتاترک نے جمہوری حکومت کے قیام کا اعلان کیا۔

سلجوقی حکومت کے خاتمے کے بعد دس چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم ہو گئی تھیں۔ عثمان خان نے تھوڑے عرصے میں آس پاس کے سب علاقوں کو اپنی سلطنت میں جذب کر لیا۔ اس کی فتوحات کا دائرہ اتنا وسیع ہوا کہ وہ قسطنطنیہ کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ اب قیصرِ قسطنطنیہ نے تاتاریوں سے مدد طلب کی۔ عثمان کے بیٹے اور خان نے تاتاریوں کو پے در پے شکستیں دے کر تھکا دیا۔

بروصہ جیسے اہم شہر کی فتح کے وقت سلطان بسترِ مرگ پر تھا۔ مرنے سے پہلے اس نے اپنے بیٹے اورخان کو جو نصیحت کی اس سے اس کی سیرت اور حکمتِ عملی سمجھنے میں مدد ملتی ہے، اس نے کہا

> ''ظلم وتعدی اختیار نہ کرنا۔ رعایا کے ساتھ عدل وانصاف سے پیش آنا تاکہ وہ خوش ہوں اور ملک آباد رہے۔ فتوحات کا دامن پھیلانا تاکہ خدا کا دین ہر سو عام ہو۔ علماء فضلاء اور حکماء کو ہمیشہ اپنے قریب رکھنا اور انکے مشوروں پر عمل کرنا۔ شریعت کی پیروی واستواری پیش نظر رکھنا۔ رعایا اور امراء میں اچھے اخلاق اور اچھی سیرت پیدا کرنے کی جدوجہد کو ہر بات پر مقدم رکھنا، اس طرح انسانیت پھلے پھولے گی۔ میری زندگی کا ایک ہی مقصد تھا کہ دین پھیلے اور اخلاقِ حسنہ رواں ہو۔ تم بھی اس بات کو اپنا مقصد بنا لو''۔

عثمان خان کے بعد اس کے بیٹے اورخان نے نظامِ حکومت سنبھالا اور مملکت کی حدود وسیع کرنے کی طرف

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

توجہ دی۔ یورپ میں اس کا مقابلہ یونانیوں سے ہوا لیکن اورخان انہیں شکست دینے میں کامیاب ہوگیا۔ اس کا قبضہ اورنہ اور ایڈریانوپل پر ہوگیا اور کچھ عرصے بعد اسے دارالحکومت بنالیا گیا۔

بعد کے عثمانی سلاطین سرویا، بلغاریہ اور البانیہ پر بھی قبضہ کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ چوتھے خلیفہ بایزید اول کی کامیابیوں کے خلاف یورپ میں عیسائیوں نے متحدہ محاذ بنالیا۔ 1396ء میں نیکوپولیس کے مقام پر عثمانی افواج نے متحدہ یورپی افواج کو عبرتناک شکست دی۔ سلطان بایزید اب پہلے سے زیادہ پُر یقین تھا۔ اس نے قسطنطنیہ کا محاصرہ کرلیا۔ یہ دیکھ کر یورپی طاقتوں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور انہوں نے تیمور کو ایشیا سے اس کے مقابلے کے لئے بلا بھیجا۔ تیمور جو خود بہت بڑا فاتح تھا محض اپنی برتری ثابت کرنے کے لئے اپنے ہم مذہب بایزید کو نیچا دکھانے ایشیا سے ترکی کی جانب بڑھنے لگا۔ بایزید نے مجبوراً قسطنطنیہ کا محاصرہ اٹھادیا اور انگورہ کے مقام پر تاریخ اسلام کی افسوس ناک ترین جنگ لڑی گئی۔ اس میں بایزید کی ایک لاکھ بیس ہزار فوج کے مقابلے پر پانچ لاکھ تیموری افواج تھیں۔ بایزید کو شکست ہوئی اور وہ قید ہوا۔ بعض روایات کے مطابق تیمور نے اسے پنجرے میں بند کردیا جہاں وہ آٹھ ماہ بعد انتقال کرگیا۔ جنگِ انگورہ کے بعد بظاہر سلطنتِ عثمانیہ کا آفتاب غروب ہوگیا اور دیکھتے ہی دیکھتے سلطنت تسبیح کے دانوں کی طرح بکھر گئی۔ ایک ایک کرکے علاقے ہاتھ سے نکلنے لگے۔ یونانی پھر دلیر ہوکر سرحدوں پر دخل اندازی کرنے لگے۔ اس اثناء میں تیمور چین پر حملہ کرنے کے لئے روانہ ہوا تو بایزید کے بیٹوں میں تخت حاصل کرنے کے لئے کشمکش ہوئی جس میں بالآخر سلطان محمد اول کامیاب ہوا۔ اس نے نہ صرف عثمانی سلطنت کو پھر سے مستحکم کیا بلکہ اپنی افواج کو منظم کرکے اہلِ یورپ سے مقابلہ کرنے کی پوزیشن میں لے آیا۔

سلطان محمد اول کی وفات کے بعد اس کا بیٹا سلطان مراد ثانی تخت نشین ہوا۔ سلطان محمد فاتح اسی کا بیٹا تھا۔ سلطان مراد ثانی کے زمانے میں عثمانیوں کو بلقان پر پورا تسلط حاصل ہوگیا۔ وینس، یونان، ہنگری اور البانیہ میں فتوحات کے جھنڈے گاڑے گئے۔ وارنا اور کوسووکی تاریخی جنگوں میں زبردست کامیابی حاصل کرنے کے بعد یورپ میں دریائے ڈینوب تک کا سارا علاقہ سوائے قسطنطنیہ کے سلطان محمد فاتح کے والد مراد کے زیرنگیں آگیا۔ تاہم وہ قسطنطنیہ کی فتح کی خواہش لئے دنیا سے رخصت ہوگیا۔

قسطنطنیہ کی فتح کی اولین کوشش

قبل اسکے کہ ہم قسطنطنیہ کی فتح کا حال بیان کریں اس شہر کی اہمیت اور مسلمانوں کی اسے تسخیر کرنے کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کوششوں کا تذکرہ ضروری ہے۔

مسلمان حضرت امیر معاویہؓ کے دور ہی سے اس شہر کو فتح کرنے کے خواہش مند تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شہر کے مسلمانوں کے ہاتھوں پر فتح ہونے کی پیش گوئی کی تھی۔ آپ ﷺ نے قسطنطنیہ پر حملہ کرنے والے پہلے لشکر کی مغفرت کی خوشخبری بھی سنائی تھی، آپ ﷺ نے فرمایا تھا: ''میری امت کی پہلی فوج جو قیصر کے شہر پر حملہ آور ہوگی اس کو اللہ نے بخش دیا''۔ [صحیح بخاری]

اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو اس بات کا بھی علم دے دیا تھا کہ پہلی فوج فتح نہیں پا سکے گی اس لئے دوسری حدیث میں فتح کی بھی بشارت دی اور فرمایا: ''تم یقیناً قسطنطنیہ فتح کرلو گے۔ یہ فاتح فوج بھی اچھی ہوگی اور اسکا امیر بھی اچھا ہوگا''۔ [مسند احمد و حاکم و ابن شیبہ]

اس لئے صحابہ کرام کے دور سے ہی مسلمان اسے فتح کرنے کی خواہش رکھتے تھے۔

مسلمانوں کا پہلا لشکر امیر معاویہؓ نے ۴۸ ہجری میں برّی و بحری دونوں راستوں سے قسطنطنیہ بھیجا۔ اس لشکر میں بڑے بڑے صحابہ کرام شامل تھے جن میں حضرت ابوایوب انصاریؓ، عبادہ بن صامتؓ، ابوالدرداءؓ، عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن زبیرؓ اور عبداللہ بن عباسؓ قابل ذکر ہیں۔ لیکن قسطنطنیہ کی فصیل قدرتی طور پر نہایت مضبوط تھی اور وہاں کی سخت سردی مسلمانوں کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ ابوایوب انصاریؓ نے وہیں شہادت پائی اور وصیت کی کہ دشمن کے علاقے میں میری لاش لے جا کر فصیل کے نیچے دفن کرنا۔ اسی طرح کچھ اور مسلمان بھی شہید ہوئے اور شہر فتح نہ ہوسکا۔

بنوامیہ کے دور میں دوبار اور بنوعباس کے دور میں ہارون الرشید خود ایک لاکھ فوج لے کر قسطنطنیہ پہنچا لیکن وہاں کی ملکہ نے سالانہ جزیے پر صلح کرلی۔ آلِ عثمان نے جب ایشیائے کوچک میں اپنی سلطنت قائم کرلی تو یورپی بادشاہوں کے ساتھ ان کی مسلسل زور آزمائی جاری تھی۔ قسطنطنیہ کے علاوہ پورا بلقان عثمانیوں کے ہاتھوں فتح ہوگیا۔ بایزید یلدرم پہلا عثمانی سلطان تھا جس نے قسطنطنیہ کا محاصرہ کیا۔ پھر محمد کے والد سلطان مراد نے اس کو فتح کرنے کی کوشش کی مگر وہ بھی کامیاب نہ ہوسکا اور اپنی یہ خواہش لئے کہ قسطنطنیہ اس کے ہاتھوں فتح ہو دنیا سے چلا گیا۔

قسطنطنیہ کی اہمیت

سلطنتِ عثمانیہ کے لئے ابتداء ہی سے یہ شہر کیا حیثیت رکھتا تھا اس کے بارے میں تاریخ کی کتب میں اس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے بانی عثمان کے ایک خواب کا تذکرہ ملتا ہے۔ عثمان ایک بار اپنے پیرو مرشد ''ادہ بالی'' کے ہاں مقیم تھا کہ اس نے خواب میں دیکھا کہ ایک چاند ہلال بن کر ادہ بالی کے سینے سے نکلا اور رفتہ رفتہ چودھویں کا چاند بن گیا اور اس کے سینے میں اتر گیا۔ پھر اس کے پہلو سے ایک زبردست درخت نمودار ہوا جو بڑھتا ہی چلا گیا، یہاں تک کہ اس کی شاخیں بحرو بر میں چھا گئیں۔ اس درخت کی جڑ سے نکل کر دنیا کے چار بڑے دریا دجلہ، فرات، نیل اور ڈینوب بہہ رہے ہیں اور چار بڑے پہاڑ کوہِ قاف، کوہِ طور، کوہِ بلقان اور کوہِ اٹلس اس کی شاخوں کو سنبھالے ہوئے ہیں۔ اسی اثناء میں ایک نہایت تیز ہوا چلی اور اس درخت کی پتیوں کا رخ جو شکل میں تلوار سے مشابہ تھیں ایک عظیم الشان شہر کی طرف ہو گیا۔ یہ شہر جو دو سمندروں اور دو براعظموں کے اتصال پر واقع تھا ایک انگوٹھی کی طرح دکھائی دیتا ہے جس میں دو نیلم اور دو زمرد جڑے ہوئے تھے۔ عثمان اس انگوٹھی کو پہننا چاہتا تھا کہ اس کی آنکھ کھل گئی۔ بیدار ہونے کے بعد اس نے اپنا یہ خواب اپنے مرشد کو سنایا تو انہوں نے اسے خوشخبری دی کہ تو ایک بہت بڑی سلطنت کا بانی ہو گا اور تیری اولاد سے مسلمان بہت فائدہ پائیں گے اور یہ کہ میں تجھ سے اپنی لڑکی کا بیاہ کروں گا۔

یہ خواب پورا ہوا۔ اس میں عثمان خان نے جس شہر کو دیکھا تھا وہ دراصل قسطنطنیہ (استنبول) تھا جو ایک ہزار سال تک مشرق و مغرب کے لوگوں کی نگاہوں کا مرکز بنا رہا۔ اس کا محل وقوع، معتدل آب و ہوا، محفوظ بندر گاہیں، کشادہ بازار، صاف سڑکیں، بلند عمارتیں، عظیم الشان گرجا گھر، مضبوط قلعے اور تجارتی وثقافتی اہمیت کی وجہ سے تمام عالم میں اس شہر کو ممتاز حیثیت حاصل تھی۔ رومی قانون اور یونانی فلسفے سے دنیا کو متعارف کروانے میں اس شہر کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ یہاں کے کتب خانے اور درسگاہیں دنیا بھر میں مشہور تھے۔ اس کی بندرگاہ میں آس پاس اور دور دراز کے ملکوں کے تجارتی ساز و سامان سے بھرے ہوئے جہازوں کی ریل پیل تھی۔ روس، ہنگری، جرمنی، اٹلی، ہسپانیہ، سرویا، البانیہ، بلغاریہ، یونان اور دیگر ایشیائی ممالک کے ہزاروں باشندے آباد تھے جنہوں نے اس شہر کو بین الاقوامی حیثیت دے دی تھی۔ اس وجہ سے ہر زمانے میں بیرونی دنیا کی نظریں اس پر لگی رہیں اور اس شہر نے حملہ آوروں کی پے در پے چوٹوں کو برداشت کیا۔

مسلسل جنگی حالات نے اس کی اقتصادی اور عسکری قوت میں پہلے والی بات نہ رہنے دی۔ قسطنطنیہ میں بادشاہ کی حیثیت ایک ایسے ڈکٹیٹر کی رہی جسے سیاسی اختیارات کے علاوہ روحانی پیشوائی بھی حاصل رہی۔

چودھویں صدی عیسوی قسطنطنیہ کی عیسائی حکومت کے لئے اچھی ثابت نہ ہوئی۔ خود عیسائی ممالک جو رومن کیتھولک فرقے سے تعلق رکھتے تھے انہوں نے یونانی سلطنت کے بہت سے علاقے چھین لئے۔ قسطنطین، شہنشاہ قسطنطنیہ نے لاکھ چاہا کہ عیسائی ریاستوں کو ساتھ ملا کر متحدہ قوت سے ترکی کو یورپ کی سرزمین سے نکال دے، مگر اس کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہ کوشش بار آور نہ ہوئی۔ آخری دور میں اس کی ریاست صرف چند میل کے اندر محدود ہو کر رہ گئی تھی اور قسطنطنیہ ایک ایسا دارالحکومت تھا جو خود ہی پورا ملک بھی تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ فوج، قبائل کے سردار، سرکاری حکام اور گرجاؤں کے پادری سب ہی سازشی طبیعتوں کے تھے۔

ان حالات کے باوجود بھی قسطنطین ترکوں کو نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتا تھا۔ مسلمانوں کے ساتھ معاہدوں کو توڑنا تو گویا ان کی تاریخ کا حصہ تھا۔ سلطان محمد کے والد سلطان مراد سے صلح کر لینے کے بعد بھی قسطنطین کا یہ حال تھا کہ ادھر اس کی آنکھ بند ہوئی اور ادھر اس کے بیٹے کو دھمکی دینا شروع کر دی۔

سلطان محمد کی پیش قدمی

سلطان محمد فاتح نے اس موقع پر سب سے پہلے اندرونی معاملات پر اپنی گرفت مضبوط کی۔ اس کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ اب قسطنطنیہ کو تسخیر کرنے کا وقت آ گیا ہے ورنہ یہ ایک تلوار کی صورت میں مستقل سلطنتِ عثمانیہ کے سر پر لٹکا رہے گا۔ اس کے علاوہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئی بھی سلطان کے پیش نظر تھی۔

اسی فکر میں وہ اس قدر بے چین ہوا کہ ایک رات اسے نیند نہ آئی۔ جب بیقراری زیادہ بڑھی تو وزیر خلیل پاشا کو طلب کیا۔ وہ اس بے وقت کی طلبی سے گھبرا گیا۔ سلطان کی خدمت میں پہنچا تو سلطان نے کہا: ''تم دیکھتے ہو کہ رنج وغم سے میری کیا حالت ہے۔ کروٹیں بدلتا ہوں اور کسی پہلو نیند نہیں آتی۔ میں تم سے ایک سوال کرتا ہوں، وہ یہ کہ قسطنطنیہ مجھے دے دو''۔ وزیر جان گیا کہ سلطان کی طلب سچی ہے اور سچی طلب دنیا کے ناممکنات کو بھی ممکن بنا دیتی ہے، چنانچہ اس نے سلطان کو تسلی دی۔

سلطان نے پہلے مرحلے میں چند عیسائی ریاستوں سے صلح کا معاہدہ کیا اور قسطنطنیہ سے صرف پانچ میل کے فاصلے پر ایک قلعے کی تعمیر کا کام شروع کرا دیا۔ اس کی تعمیر کا مقصد عیسائیوں کے بحری بیڑے کی نقل و حرکت پر نظر رکھنا اور ساتھ ہی ساتھ کسی قسم کی کمک کے راستے کو مسدود کرنا تھا۔ جیسے جیسے قلعے کی دیواریں اونچی ہوتی گئیں سلطان اس میں جدید ترین اسلحہ جمع کرتا رہا۔ قلعے کی حفاظت کے لئے بڑی توپیں بھی ڈھالی گئیں۔ ادھر سلطان کو عیسائیوں کی جانب سے مسلسل دھمکیاں ملنے لگیں اور صورتحال کشیدہ ہونے لگی یہاں تک کہ ایک فوج نے آ کر قلعہ ''اناطولیہ حصار'' پر دھاوا بول دیا۔ لیکن قلعے میں متعین فوج نے اسے شکست دی اور عیسائی افواج لاشیں چھوڑ کر پسپا ہونے پر مجبور ہو گئیں۔

قسطنطین نے حالات کا رخ دیکھ کر کہ سلطان اب آمادۂ جنگ ہے عیسائی ریاستوں سے رجوع کیا اور مذہب کے نام پر امداد کی درخواست کی۔ یہاں یہ بات واضح ہونی چاہئے کہ اس وقت عیسائی دنیا مذہب کے نام

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پر دو حصوں میں بٹی ہوئی تھی:-

(۱) کیتھولک مذہب کے ماننے والے پوپ یا پاپائے روم کے تابع تھے۔

(۲) جبکہ قسطنطنیہ والے یونانی کلیسا کے زیر اثر تھے، اور ان دونوں میں دیرینہ دشمنی تھی۔

پوپ نے مدد کے لئے آمادگی ظاہر نہیں کی بلکہ جواباً اپنی پرانی شرائط پر اصرار کیا کہ کسی قسم کا معاملہ اس وقت تک آگے نہیں بڑھ سکتا جب تک یونانی کلیسا رومی کلیسا سے اتحاد نہ کرلے۔ قسطنطین کو جب اندازہ ہوا کہ اس شرط کو مانے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے تو اس نے اس پر رضامندی ظاہر کردی اور 300 پادریوں کی موجودگی میں سینٹ آیا صوفیہ نے ایک معاہدے کے تحت اپنا الحاق رومی کلیسا سے کرلیا۔ اس معاہدے کے نتیجے میں قسطنطنیہ کے عوام کا ایک بڑا حصہ اپنے بادشاہ سے ناراض ہوگیا۔ انہیں یقین ہوگیا کہ اس معاہدے کے نتیجے میں خدا کا عذاب نازل ہوگا۔ یہاں تک کہ قسطنطین کے نائب اور فوج کے سپہ سالار کو بھی یہ معاہدہ اس قدر ناگوار گذرا کہ اس کے نزدیک پوپ کی ذلت آمیز شرائط ماننے سے تو بہتر تھا کہ ترک ہی ان کے علاقے پر قابض ہوجائیں۔ ان تمام اقدامات کے باوجود جو قسطنطین اپنے علاقے کو بچانے کے لئے کررہا تھا عیسائی ریاستوں نے اس کی برائے نام مدد کی۔ چند سوسپاہ اور شرابوں کے تحفوں کے سواء یورپ کے پاس قسطنطین کو دینے کے لئے کچھ نہ تھا۔ اس کے پیچھے ترکوں کا خوف اور مذہبی تعصب دونوں ہی کارفرما تھے۔

قیصرِ قسطنطین نے پیشگی تیاریوں کے سلسلے میں سامانِ رسد اور غلّہ جمع کرنا شروع کیا۔ قسطنطنیہ کا شہر مثلث تھا جس کے دو حصے پانی میں گھرے ہوئے تھے۔ ایک حصہ گولڈن ہارن اور دوسرا بحرِ مامور کہلاتا تھا۔ خشکی سے حملہ صرف تیسری طرف سے ہی ہوسکتا تھا۔ اس جگہ کو دشمن کے حملوں سے بچانے کے لئے تین زبردست دیواریں تعمیر کی گئی تھیں۔ یہ دیواریں نہ صرف یہ کہ بہت موٹی تھیں بلکہ ان پر مضبوط برج بنے ہوئے تھے۔ ان دیواروں کے درمیان 60 فٹ کا فاصلہ تھا اور ان کے بیچ نہایت چوڑی اور سینکڑوں فٹ گہری خندق تھی۔ یہ دیواریں پانچویں صدی عیسوی میں اس وقت کے بادشاہ نے تعمیر کرائی تھیں جنہوں نے قسطنطنیہ کو ۲۱ محاصروں میں دشمن سے محفوظ رکھا تھا۔ سمندر کی جانب بندرگاہ کے دہانے پر ایک مضبوط آہنی زنجیر اس طرح دونوں طرف باندھی گئی تھی کہ کوئی جہاز بھی بندرگاہ میں داخل نہ ہوسکتا تھا۔ جب شہر والے خود چاہتے تھے کہ کسی جہاز کو اندر آنے دیں تو اس زنجیر کو سمندر کی گہرائی میں ڈھیلا کرکے ڈال دیتے تھے اور جہاز اندر داخل ہوجاتا۔ (نقشہ ملاحظہ کریں)

سلطان کو قسطنطنیہ کے حفاظتی حصار کا اور ان تیاریوں کا بخوبی علم تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس شہر کی فتح کے لئے ضروری ہے کہ ان دیواروں پر کامیابی سے گولہ باری کی جائے۔ چنانچہ عام توپوں پر انحصار کرنے کے بجائے اس نے ایک عیسائی انجینیر سے ایک زبردست توپ بنوائی جس میں سے ڈھائی فٹ کے بڑے بڑے گولے نکلتے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تھے۔ساتھ ہی اس نے چھوٹی اور آسانی سے حرکت کرنے والی توپوں کو بنانے کا حکم بھی جاری کیا۔ایک طرف زمینی حملے کے لئے اسلحہ تیار کیا جارہا تھا تو دوسری طرف بحری محاصرے کے لئے 180 جہازوں کا بیڑا بھی تیار کروایا گیا۔سلطان کو یہ بھی خیال تھا کہ قسطنطین کے دو بھائی یونان میں مقیم ہیں، عین ممکن ہے کہ وہ قسطنطنیہ کے لئے کسی قسم کی امداد لے کر پہنچیں چنانچہ اس نے فوج بھیجی جو جزیرہ نما مورچہ پر قابض ہوگئی جس سے یونان اور قسطنطنیہ کا بحری رابطہ کٹ گیا۔

فیصلہ کن معرکہ

ان تمام تیاریوں سے فارغ ہوکر سلطان بالآخر اپنی ڈھائی لاکھ فوج کے ساتھ 16 اپریل 1453ء کو قسطنطنیہ پہنچا۔اس موقع پر اس کی فوج کا مورال بہت بلند تھا۔ہر کوئی شہر فتح کرنے کے لئے بیتاب تھا۔علماء اور مشائخ بھی فوج کے ساتھ آئے تھے اور مجاہدین کے دلوں کو گرما رہے تھے۔سلطان نے اپنے ہیڈکوارٹر پر پرچم لہرانے سے پہلے نماز پڑھی اور اس کے پیچھے مجاہدین نے بھی یہی کیا۔نماز کے بعد فتح و نصرت کے لئے خصوصی دعائیں مانگی گئیں۔

سلطان نے جنگ شروع کرنے سے قبل قسطنطین کو پیغام بھجوایا کہ وہ شہر ترکوں کے حوالے کر دے تاکہ کسی قسم کی خونریزی سے بچا جا سکے۔مگر قسطنطین نے یہ نامنظور کر دیا۔حقیقت یہ ہے کہ سلطان کا مدمقابل بھی مضبوط اعصاب والا اور باہمت انسان تھا۔محاصرے سے قبل جب اس کو یہ مشورہ دیا گیا کہ وہ اپنے اہل خانہ کو لے کر شہر سے نکل جائے تو وہ سخت ناراض ہوا اور کہنے لگا کہ اس کا جینا اور مرنا قسطنطنیہ کے لئے ہے۔اس مصیبت کی گھڑی میں وہ اہل شہر کو تنہا چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔

قسطنطین کے شہر کو حوالے کرنے سے انکار کے فوراً بعد محاصرہ شروع ہوا اور قسطنطنیہ کو خشکی اور سمندر دونوں اطراف سے گھیر لیا گیا۔سینٹ رومانوس کے دروازے کی طرف سے فصیل کچھ کمزور تھی جس کے پیش نظر یہاں پر متعین افواج اپنا پورا زور لگا رہی تھیں۔سلطان کی خاص فوج ''ینی چری'' اور عیسائیوں کے درمیان زبردست معرکہ آرائی ہو رہی تھی۔سلطان کی بھاری توپیں بار بار فصیل میں شگاف ڈالتیں مگر یونانی اس کی فوری مرمت کر دیتے۔ایک دفعہ سلطان نے اپنی فوج کو خندق کے کنارے تک لے جا کر کئی جگہ سے خندق کو پاٹنے کے راستے بنائے۔اس کوشش میں عثمانی فوج فصیل تک جا پہنچی مگر عیسائیوں نے روغن جلا جلا کر ان پر پھینکنا شروع کیا۔مجبوراً انہیں واپس ہونا پڑا۔اب سلطان نے ایک اور تدبیر آزمائی۔لکڑی کے اونچے اونچے برج بنوا کر ان کے نیچے پہیے لگوا دیے۔ان میناروں کے ساتھ ساتھ ایک لمبی سیڑھی اوپر کے حصے سے بندھی ہوئی تھی۔ان میناروں کو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خندق کے کنارے لے جا کر اور اس سیڑھی کو اوپر سے اٹھا کر دوسرا سرا قلعے کی دیوار پر رکھ دیا گیا۔ اسطرح خندق کے پاٹنے کے لئے پل بنایا گیا۔ جب عثمانی سپاہی اس پر چڑھ کر فصیل تک پہنچنے کی کوشش کرنے لگے تو عیسائی محصورین نے ان میناروں پر جلتے ہوئے گولے پھینک کر ان میں آگ لگا دی، اس طرح یہ تدبیر بھی ناکام گئی۔

18 اپریل کو عثمانی فوج اور یونانیوں میں گھمسان کا رن پڑا لیکن یونانی سپاہ نے زبردست مدافعت کی جس کی وجہ سے ترکوں کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ دوسری طرف اسی روز کی بحری جھڑپ میں یونانیوں کے بڑے بڑے بحری جہازوں کو نقصان پہنچانے کی غرض سے جب ترکی بیڑا آگے بڑھا تو شدید گولا باری کی وجہ سے اسے خاصا نقصان اٹھانا پڑا۔ نیز سمندر کے گرد زنجیروں کو کاٹنے میں بھی وہ ناکام رہے۔ دو دن کے بعد جینیوا سے جہاز مدد لے کر پہنچے تو ترکوں نے انہیں سمندر میں گھیر لیا مگر ہوا اچانک اس طرح چلی کہ اطالوی جہاز عثمانی جہازوں کے درمیان سے راستہ بناتے ہوئے قسطنطنیہ کی بندرگاہ میں داخل ہو گئے۔

بحری جنگی تاریخ کا معجزہ

لگاتار ناکامیوں نے سلطان کے عزم میں کمی کرنے کے بجائے اسے مزید کوششوں پر آمادہ کیا۔ اس بار وہ قسطنطنیہ فتح کرنے کا پختہ ارادہ کر کے آیا تھا۔ اب وہ رات دن اس فکر میں رہتا کہ ان حالات میں جب برّی اور بحری فوجیں اپنا زور لگانے کے باوجود کامیاب نہیں ہو سکی ہیں کونسا لائحہ عمل بہتر رہے گا۔ کافی سوچ بچار کے بعد سلطان اس نتیجہ پر پہنچا کہ گولڈن ہارن پر واقع بندرگاہ کی طرف سے شہر کی فصیل نہ زیادہ اونچی ہے اور نہ خندق مضبوط، اگر اس طرف سے حملہ کیا جائے تو کامیابی کے امکانات زیادہ ہیں۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ گولڈن ہارن کے دہانے پر ایک زبردست زنجیر اور مضبوط یونانی بحری بیڑا موجود تھا جو ترکوں کو کسی صورت وہاں داخل نہ ہونے دیتا۔ سلطان چاہتا تھا کہ کوئی ایسا طریقہ اختیار کیا جائے کہ یونانی بحری بیڑے سے تصادم ہوئے بغیر اس کے جہاز گولڈن ہارن پہنچ جائیں۔ اس کے لئے ایک عجیب وغریب خیال اس کے ذہن میں آیا کہ بیڑے کے ایک حصے کو خشکی کے راستے گولڈن ہارن پہنچایا جائے۔ آبنائے باسفورس اور گولڈن ہارن کے بیچ میں خشکی کی ایک پٹی تھی جس کی لمبائی دس میل تھی۔ یہاں کی زمین ناہموار تھی اور اس میں جگہ جگہ چھوٹے درختوں کے جھنڈ تھے۔ سلطان چاہتا تھا کہ خشکی کے اس حصے میں سمندری جہاز چلیں اور بندرگاہ تک پہنچ جائیں۔ اس نے اپنے انجینیروں کے سامنے جب یہ تجویز رکھی تو وہ ششدر رہ گئے مگر سلطان نے ان کو قائل کر لیا۔ چنانچہ انہوں نے ٹیلوں کو ہموار کیا اور جنگل سے درخت کاٹ کر ان کے تختے بنوائے۔ پھر ہزاروں جانور ذبح کر کے ان کی چربی اور تیل ان تختوں پر ملوا کر اس طرح بچھا دیا گیا کہ ان پر کشتیاں چڑھا کر انہیں کھینچا جا سکے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

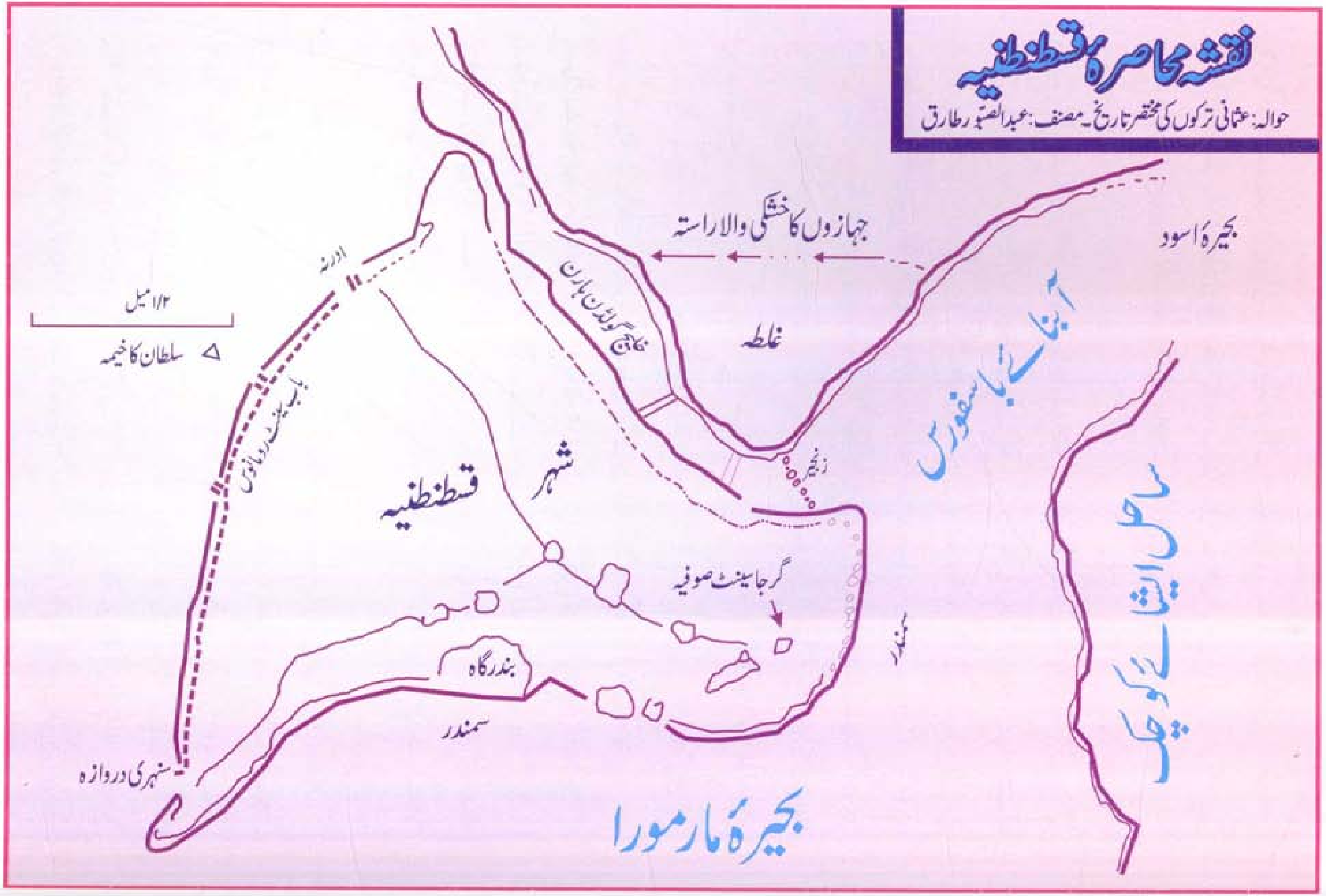

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

22 اپریل کی رات قسطنطنیہ کے لئے بہت سخت تھی۔ عثمانی توپیں گرج گرج کر آگ کے گولے اگل رہی تھیں تاکہ یونانی اپنی پوری توجہ اس طرف مرکوز رکھیں۔ دوسری طرف سلطان کے آدمی تیل ملے تختوں پر کشتیاں پھسلا پھسلا کر راتوں رات ستر اسّی کشتیوں اور چھوٹے جہازوں کو خشکی کے راستے گولڈن ہارن تک پہنچانے میں کامیاب ہو گئے۔

جب صبح اٹھ کر اہل شہر نے ترکی بحری بیڑے کو گولڈن ہارن میں موجود پایا تو ان کی حیرت و اضطراب اور خوف و ہراس کی انتہا نہ رہی۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ بھاری زنجیروں اور جنگی جہازوں کے مضبوط سلسلے کو ہٹائے بغیر ترکوں کی یہ کثیر التعداد کشتیاں کسطرح ان کے سروں تک پہنچ گئیں۔ قسطنطین کو جب عثمانی بیڑے کے بندرگاہ میں داخل ہونے کی خبر ملی تو وہ صدمے سے نڈھال ہو گیا۔ بحری تاریخ کا ناقابل یقین معجزہ ہو چکا تھا۔ بہر صورت قسطنطین نے اپنے جہازوں کو ترکوں پر حملہ کرنے کا حکم دیا مگر ترک جہاز چھوٹے تھے اور جہاں لنگر انداز تھے وہاں خلیج بہت کم گہری تھی۔ اس گہرائی میں یونانیوں کے بڑے بڑے جہاز داخل بھی نہ ہو سکتے تھے۔ ان جنگی جہازوں کی خوبی خرابی میں بدل گئی۔

آخری حملہ

جب محاصرے کو 51 روز گذر گئے تو سلطان نے آخری اور فیصلہ کن حملے کا فیصلہ کر لیا۔ اس سے قبل وہ قسطنطین اور اہل شہر کو بچانے کی ایک کوشش ابتداء میں ہی کر چکا تھا۔ اس نے اپنے ایک سردار اسفندیار اوغلی کے ذریعے قسطنطین کو پیغام بھجوایا کہ اگر وہ شہر اس کے حوالے کر دے تو اسے اور تمام اہل شہر کو ہر طرح کے تحفظ کی ضمانت دی جاتی ہے اور خود شہنشاہ کو ترکوں کے مقبوضہ جزیرہ نما موریا منتقل ہونے اور اپنی مرضی کے مطابق حکومت کرنے کی آزادی ہو گی۔ اس پیشکش کو نامنظور کرنے کی صورت میں شہنشاہ یا اہل شہر کی جان و مال کی کوئی گارنٹی نہیں ہو گی۔

27 اور 28 مئی کی درمیانی شب رات بھر عثمانی فوج کے خیموں میں چراغاں رہا۔ مجاہدین عبادت کرتے رہے۔ سارے کیمپ میں جوش و خروش نظر آ رہا تھا۔ دوسری جانب اہل قسطنطنیہ بھی جہازوں کی آمد کے بعد اپنے مستقبل سے مایوس نظر آ رہے تھے اور بڑے متوقع حملے کی اطلاع انہیں مل چکی تھی۔ ان کی یہ رات بے چینی اور اضطراب میں کٹی۔ شہنشاہِ قسطنطین سینٹ صوفیاء کے گرجے میں عورتوں اور مردوں کے ساتھ پہنچا اور خدا سے اپنے گناہوں کی معافی چاہی۔ پھر ایک ولولہ انگیز تقریر کی۔ قسطنطین کے انداز سے یوں معلوم ہو رہا تھا کہ اسے قسطنطنیہ کے ہاتھ سے چلے جانے کا یقین ہو گیا تھا۔ وہ اپنے عظیم محل کے بڑے بڑے کمروں میں گھومتا رہا جہاں وہ اور اس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے پیشرو بادشاہ صدیوں سے بڑی شان وشوکت سے حکومت کرتے رہے تھے۔ اب قیصروں کا آخری قیصران یادگاروں پر آہیں بھرتا ہوا اپنی فوج کو ہدایات دینے کے لئے روانہ ہوگیا۔

......اور قسطنطنیہ فتح ہوگیا

طلوعِ فجر سے پہلے ہی ترکوں نے حملہ کردیا۔ فصیل کے ہر حصے پر خوفناک لڑائی چھڑ گئی۔ سب سے زیادہ سخت معرکہ سینٹ رومانوس کے دروازے کی جانب ہوا۔ ترکوں کی طرف سے بے قاعدہ فوج نے حملے کی ابتداء کی۔ اس فوج کے حملے کا مقصد دشمن کی قوتِ مدافعت کو کمزور کر کے باقاعدہ فوج کے حملے کی راہ ہموار کرنا تھا۔ یہ مقصد کسی نہ کسی حد تک تو پورا ہوا لیکن دشمن اس زبردست طریقے سے مدافعت کر رہا تھا کہ پسپا ہونے کے آثار نظر نہ آتے تھے۔

سلطان اپنے ہاتھوں میں آہنی گرز لئے گھوڑے پر سوار تھا۔ دوپہر تک لڑائی پورے زور وشور سے جاری تھی کہ سلطان نے اپنے ایک ساتھی کو اپنے پیرو مرشد کی خدمت میں روانہ کیا جو خاص دعا اور روحانی مدد کے لئے اس کے ساتھ آئے تھے۔ سلطان کو اندیشہ تھا کہ اگر آج شہر فتح نہ ہوا تو ترک اس کو ناقابل تسخیر سمجھنے لگیں گے۔ چنانچہ اس نے اپنی تازہ دم فوج ''ینی چری'' کو آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ ینی چری جو سلطان کی خاص تربیت یافتہ فوج تھی انہوں نے پرزور طریقے سے حملہ کیا۔ آغا حسن جو ینی چری کا ایک تندرست وتوانا اور قوی ہیکل مجاہد تھا اپنے ساتھ تین مجاہدوں کو لے کر آگے بڑھا اور فصیل پر چڑھ کر علَم لہرانے کی کوشش کی۔ وہ اور اس کے ساتھی یکے بعد دیگرے جامِ شہادت نوش کر گئے تاہم ان کے پیچھے آنے والے دیگر مجاہدین کے لئے راستہ صاف ہوگیا۔ وہ بعجلت فصیل پر چڑھ کر شہر میں داخل ہوگئے اور سلطانی علَم لہرا دیا گیا۔ ایک طرف بری فوج کو کامیابی ہوئی تو دوسری طرف بحری فوج نے بھی ایک برج پر چڑھ کر سلطانی جھنڈا لہرا دیا۔ یونانیوں میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ شہر پر قبضہ ہوگیا ہے اور اس کے ساتھ ہی مدافعت دم توڑ گئی۔ شہنشاہِ قسطنطین نے اپنے وفادار ساتھیوں کے ہمراہ پسپائی کو روکنے، اپنے آدمیوں کو اکٹھا کرنے اور آگے بڑھ کر مجاہدین سے مقابلہ کرنے کی ناکام کوشش کی مگر وہ خود بغیر کسی شناخت کے انتہائی بہادری سے لڑتا ہوا مارا گیا۔ اگلے روز اس کی لاش لاشوں کے ایک ڈھیر سے برآمد ہوئی جو محض اس وجہ سے پہچان لی گئی کیونکہ اس کے ارغوانی جوتے ایک سنہری عقاب سے مرصع ہونے کے باعث بڑے نمایاں تھے۔ 45 سالہ شہنشاہ کی موت کے ساتھ ہی سلطنتِ قسطنطنیہ کا چراغ ہمیشہ کے لئے گل ہوگیا۔

ظہر کے وقت سلطان محمد ثانی فاتح قسطنطنیہ اپنے وزراء، سپہ سالار اور فوج کے جلو میں باب سینٹ رومانوس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے شہر میں داخل ہوا اور بازاروں سے گزرتا ہوا سینٹ صوفیاء پہنچا۔ دروازے پر پہنچ کر اس نے پاؤں سے جوتے اتارے اور اللہ کے آگے عاجزی کے اظہار کے لئے سر پر خاک ڈالی۔ اس کے بعد وہ گرجا گھر میں داخل ہوا اور اس کی خوبصورتی اور خوشنمائی دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ قربان گاہ پر پادریوں نے اس کا استقبال کیا۔ سلطان نے کلیسا کے سب سے بڑے افسر کو نہ صرف یہ کہ اس کے منصب پر فائز رکھا بلکہ مسیحیوں کے باہمی مقدمات کی عدالت کے اختیارات بھی اس کو سونپے۔ اس کو مسیحی برادری کے حقوق کے لئے سفارشات کرنے اور کسی قسم کی ناانصافی کی صورت میں اس کا ازالہ کرنے کا مختار بھی بنایا۔ اس کام سے فارغ ہوکر سلطان نے ایک شخص کو اذان دینے کا حکم دیا اور اسطرح پہلی مرتبہ آیا صوفیہ کی پرشکوہ عمارت سے گھنٹیوں کی آواز گونجنے کے بجائے خدا کی عظمت کی صدا بلند ہوئی۔ آج آیا صوفیا کی مسجد کا شمار عالم اسلام کی بڑی مسجدوں میں ہوتا ہے۔

گرجے سے نکل کر سلطان نے شہر کا ایک گشت لگایا۔ قدم قدم پر اسے گذرے ہوئے سلاطین کے محلات کے نظارے نے افسردہ کردیا اور اس نے یہ شعر پڑھا:

پردہ داری می کند بر قصرِ کسریٰ عنکبوت
بوم نوبت می زند بر گنبدِ افراسیاب

ترجمہ: کسریٰ شاہ ایران کے محل میں مکڑی نے جالے بنے ہوئے ہیں اور افراسیاب کے گنبد پر الّو اپنی نوبت بجارہا ہے۔

قیصر کے محلات جو یورپ اور ایشیا کی بہترین مصنوعات، نفیس چیزوں اور آثار قدیمہ سے بھرے پڑے تھے اب ترکان عثمانیہ کے قبضے میں آگئے تھے۔

سلطان محمد نے جب قسطنطنیہ فتح کیا اس وقت اس کی عمر 23 برس تھی۔ اس لحاظ سے اسے نپولین اور سکندر سے ایک گونہ نسبت ہے جنہوں نے اپنی فتوحات کا آغاز اندازاً اسی عمر میں کیا تھا۔ فتح کے بعد سلطان نے اپنے ایلچیوں کو اسلامی دنیا کے مختلف حصوں میں اس خوشخبری کے اعلان کے لئے بھیجا۔ اس مبارک خبر نے پورے عالم اسلام میں خوشی کی لہر دوڑادی۔ قسطنطنیہ فتح ہونے کے بعد ابتدائی طور پر کچھ خونریزی ہوئی اور لوٹ مار کے واقعات کا ذکر بھی ملتا ہے۔ لیکن تین دن کے بعد مکمل امن وامان قائم کردیا گیا۔ یہاں یہ سوال ذہن میں آنا بالکل فطری ہے کہ سلطان نے اس موقع پر اپنی افواج کو خونریزی سے منع کرنے کے لئے اختیارات کیوں نہ استعمال کئے اور قسطنطنیہ کی رعایا کو سلطان صلاح الدین ایوبی کی طرح جان و مال کا تحفظ کیوں نہ دیا جو اسلام کے مزاج کا خاصہ بھی ہے۔

اسکی بنیادی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ سلطان کو بادشاہت سنبھالے ہوئے زیادہ عرصہ نہ گذرا تھا اور ابھی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

معاملات پر اس کی گرفت اتنی مضبوط نہ تھی۔ نہ ہی اس کا ایسا رعب اور اعتبار قائم تھا کہ وہ جو چاہتا فیصلہ کرتا اور کوئی چوں بھی نہ کرتا۔ اگر ابتداء میں قسطنطین شہر بغیر کسی مزاحمت کے سلطان کے حوالے کر دیتا تو سلطان کی ہر عیسائی کی جان و مال کے تحفظ سے متعلق پیشکش موجود تھی۔ اس صورت میں وہ اپنی فوج کو بغیر قربانی دیئے قسطنطنیہ کو حاصل کرنے کے لئے اس بات پر راضی کر لیتا کہ وہ کسی بھی شہری کی جان و مال سے تعرض نہ کریں۔ اب جبکہ پوری فوج سر دھڑ کی بازی لگانے کے بعد شہر کو تسخیر کرنے میں کامیاب ہوئی تھی تو اس کو کنٹرول کرنا سخت دشوار تھا جبکہ مسلمانوں کو مسلسل عیسائیوں سے بدترین تجربات ماضی قریب میں پیش آ چکے تھے۔ اندلس میں مسلمانوں کے ساتھ عیسائیوں کے بدترین سلوک کو ترک بھلا نہ سکے تھے۔ اس کے بعد ان کے جذبات کو مکمل لگام دینا یقیناً مشکل تھا۔

بہرصورت فتح کے تین روز بعد جب مکمل طور سے امن بحال ہو گیا تو عیسائیوں کو ایسی آزادی اور سکون کی دولت نصیب ہوئی کہ وہ خود محسوس کرنے لگے کہ اپنے سابقہ حکمرانوں کی بہ نسبت اب وہ زیادہ پر امن زندگی بسر کر رہے ہیں۔

سلطان محمد فاتح کی دیگر فتوحات

قسطنطنیہ کی فتح کے بعد بھی سلطان محمد فاتح کی فتوحات کا سلسلہ جاری رہا۔ سلطان نے اپنے تیس سالہ عہدِ حکومت کا بیشتر وقت جنگوں میں ہی گذارا اور شاذ ہی کوئی مہم اسے ایسی پیش آئی ہوگی جس کے بعد اسکی مقبوضات میں کوئی نیا علاقہ شامل نہ ہوا ہو۔ یونان، سرویا، بوسنیا، کرمانیہ، البانیہ، کریمیا اور ٹرانٹو (اٹلی کے قریب ایک شہر) اسی کے دورِ حکومت میں تسخیر ہوئے۔

وفات

سلطان اپنی فتوحات میں مصروف تھا کہ پیغام اجل آ گیا اور وہ ۸۸۶ ہجری میں 51 برس کی عمر میں دنیا سے رخصت ہو گیا۔ سلطان کی تجہیز و تکفین اس مشہور مسجد میں ہوئی جسے اس نے قسطنطنیہ میں تعمیر کروایا تھا۔ سلطان فاتح کی وفات عالمِ اسلام کے لئے افسوسناک اور یورپ کے لئے خوشی کا باعث تھی۔

سلطان کا کردار

سلطان محمد بادشاہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک جید عالم بھی تھا۔ قرآن و حدیث کے علاوہ اس کو بہت سے علوم پر عبور حاصل تھا۔ وہ علماء کا زبردست قدردان تھا۔ اس کی محفلیں علماء اور اہلِ کمال سے پُر ہوتی تھیں۔ تاریخ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے اسے بہت دلچسپی تھی ۔ نامور فاتحین اور سلاطین کے واقعات بہت شوق سے پڑھا کرتا تھا۔اس کے پاس اپنا ذاتی کتب خانہ تھا جس میں ہزاروں نایاب اور قیمتی کتابیں جمع تھیں ۔ اگواسا کے شہر سے جہاں علم وفضل کا بڑا چرچا تھا اس نے خراج میں بجائے مال ودولت کے کتابیں طلب کی تھیں ۔

مولانا علاؤالدین طوسی کے درس میں آکر خود شریک ہوتا ۔اپنے استاذ الکھرانی کی اتنی عزت کرتا کہ خاص سواری ان کو بلانے کے لئے بھیجی جاتی ۔ یہ سلطان کے وہ استاذ تھے جنھوں نے ایک دفعہ شہزادگی کے زمانے میں چھڑی سے اس کی خوب پٹائی کی تھی ۔سلطان نے اپنے زمانے میں مدرسوں کے ساتھ ساتھ جو پہلے ہی شہروں اور قصبوں میں موجود تھے بڑے بڑے کالج قائم کئے ۔ان میں تعلیم دینے والے اساتذہ کا انتخاب وہ خود کرتا۔اس کے دور میں مسجدوں سے ملحق ہزاروں مدرسے کھولے گئے ۔اس کی مملکت میں کوئی گاؤں ایسا نہ تھا جہاں تعلیم گاہیں نہ ہوں اور کوئی بچہ ایسا نہ تھا جس کی تعلیم کی ذمہ داری خود حکومت نے نہ اٹھائی ہو۔سلطان نے شہروں میں کثرت سے ہسپتال اور مساجد قائم کیں اور ان کے اخراجات کے لئے بڑی بڑی جائیدادیں وقف کیں ۔

سلطان خود بھی اعلیٰ درجے کا شہسوار،فنونِ حرب کا ماہر،ترقی کا دلدادہ ، بیدار مغز اور سلطنت کے امور میں انتہائی سمجھ بوجھ رکھنے والا تھا ۔ جہاں بہادری اور شجاعت اسے اپنے اسلاف سے ورثے میں ملی تھی وہاں اسکی کامیابی کا ایک راز یہ بھی تھا کہ وہ نئی جنگی ایجادات سے استفادہ کرنے والا اور انوکھی فوجی تدابیر سوچنے کا ماہر تھا ۔

اس کی نجی زندگی بہت سادہ تھی ۔ اس کا دستر خوان بہت مختصر ہوتا۔مملکت کے امور نمٹانے کے علاوہ اس کا سارا وقت پڑھنے پڑھانے میں گذرتا یا فارغ وقت میں کبھی شکار کر لیا کرتا۔عیش وآرام سے اسے دور کا واسطہ نہ تھا۔راگ رنگ کی محفلوں میں کھوئے رہنا اسے سخت ناپسند تھا۔تنہائی اسے بہت محبوب تھی ۔اپنے وقار کو قائم رکھنے کے لئے وہ کبھی اپنے وزیرِ اعظم سے بھی بے تکلف نہ ہوتا ۔اپنے رازوں کو وہ صرف اپنے تک محدود رکھتا۔ جب جنگ کا ارادہ کرتا تو اس کے کمانڈروں کو بھی علم نہ ہوتا کہ حملہ کس سمت سے ہونے والا ہے۔ایک بار جب کسی مہم کے لئے سلطان کی فوجیں جمع ہونے لگیں تو اس کے خاص افسروں میں سے ایک نے سلطان سے پوچھا کہ کہاں کا ارادہ ہے؟ سلطان نے سختی سے جواب دیا: ''اگر میری داڑھی کے ایک بال کو بھی اندازہ ہو جائے تو میں اسے بھی توڑ کر آگ میں ڈال دوں گا''۔

وہ جنگ کی کامیابی کے لئے راز داری اور سرعتِ عمل کو نہایت ضروری سمجھتا اور یہ سختی وہ اس لئے برتتا تھا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ سلطان مغرور آدمی تھا ۔ عین لڑائی کے ہنگاموں میں بھی وہ اپنے معمولی سپاہیوں کی دل جوئی سے بھی نہیں چوکتا تھا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

غیر مسلم رعایا سے نرم برتاؤ کا قائل تھا۔فتحِ قسطنطنیہ کے موقع پر جو فرمان جاری ہوا تھا اس میں یہ بات بھی شامل تھی کہ یونانیوں کو مکمل مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔فتح کے بعد بھی یونانیوں اور ترکوں کے درمیان کسی قسم کا کوئی فرق روا نہ رکھا گیا۔محمد فاتح کے زمانے میں مذہبی تعصب اپنے عروج پر تھا۔مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان طویل عرصے سے جنگ جاری تھی۔ان حالات میں بعض اوقات دوران جنگ وہ اپنے دشمنوں کو کسی قسم کی رعایت دینے کے بجائے سختی سے کام لیتا تھا۔تاہم مجموعی طور پر وہ اپنی مسلم اور غیر مسلم رعایا کے لئے نرم تھا۔پابندیٔ شرع کے لئے سختی کو ناپسند کرتا تھا۔قرآن مجید سے اسے حد درجہ محبت تھی۔نماز باجماعت اور روزے کا سختی سے پابند تھا۔مزاجاً انصاف پسند تھا۔اس کے زمانے کی عدالتیں پوری طرح خودمختار تھیں۔بادشاہ لوگوں کی اپیل سن سکتا تھا مگر سفارش نہیں کر سکتا تھا۔

سلطان کی خوبیوں کی تعریف اور اوصافِ جمیلہ کا مکمل اقرار کرنا یورپی مؤرخین کے لئے محال تھا۔فتحِ قسطنطنیہ نے جہاں مسلمانوں میں سلطان کی عظیم الشان شخصیت کو چار چاند لگا دیئے تھے وہاں عیسائی مؤرخین کی اس سے نفرت کا جواز بھی بن گیا تھا۔ہر دور کے عیسائی مورخ اس کی خوبیوں کا کچھ نہ کچھ اعتراف کرتے ہوئے اس پر کوئی نہ کوئی الزام لگانا نہیں بھولتے۔کوئی اسے ظالم اور کوئی اسے معاہدوں کی پاسداری نہ کرنے والا کہتا ہے۔

اس معاملے میں از خود کوئی حتمی رائے دینے کے بجائے ہم نبی اکرم ﷺ کی وہ حدیث سامنے رکھتے ہیں جس میں آپؐ نے قسطنطنیہ فتح کرنیوالے سلطان اور اس کی فوج کی خاص طور سے تعریف فرمائی تھی۔سلطان کو نبی اکرم ﷺ کی زبانِ مبارک سے تعریفی کلمات سمیت لینے کے بعد کسی مورخ کی اپنے حق میں گواہی کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شیخ احمد سرہندیؒ (مجدّد الف ثانی)

1564 A.D — 1624 A.D

گیارھویں صدی ھجری کے مجدّد، امامِ طریقت و شریعت جنھوں نے ھندوستان میں حکومت کی اصلاح کا کارنامہ انجام دیا

تعارف

آپ کا نام احمد، لقب بدرالدین اور کنیت ابوالبرکات تھی۔ سلسلہ نسب یہ ہے: احمد بن شیخ عبدالاحد بن شیخ زین العابدین۔ آپ نسباً فاروقی تھے اور آپ کا سلسلہ نسب ۲۱ ویں پشت میں جا کر حضرت عمرؓ بن خطاب سے مل جاتا ہے۔ آپ کا خاندان ظاہری و باطنی علوم اور دینی فیوض و برکات کے لئے مشہور تھا۔ خود آپ کے والد اپنے وقت کے جید عالم تھے۔ انہوں نے علومِ دینی کے حصول کے لئے مختلف مقامات کے سفر کئے اور اپنے وقت کے معروف بزرگ شیخ عبدالقدوس گنگوہی اور ان کے بیٹے رکن الدین سے استفادہ کیا اور منازلِ سلوک طے کیں۔ وہ چشتی اور قادری سلسلہ میں خرقۂ خلافت سے سرفراز ہوئے۔ اس کے علاوہ مشہور بزرگ شاہ کمال کیتھلی سے بھی آپ کا خصوصی ربط تھا۔ آپ کے والد اکثر علوم میں مہارت رکھتے تھے۔ خصوصاً فقہ اور اصولِ فقہ میں ان کی نظیر نہیں ملتی۔ کتبِ تصوف کا بھی درس دیتے تھے۔ سنّت کے سخت پابند اور شریعت کا احترام کرتے تھے۔ ان کو خدا نے سات فرزند دیئے۔ سب نے دنیاوی علوم اور سلوک کی تعلیم اپنے والد سے لی۔ لیکن دین کی تجدید اور ہندوستان میں سرمایۂ ملّت کی نگہبانی کی سعادت تقدیر نے احمد سرہندی کے نام لکھ دی تھی۔

ولادت

۱۴ شوال ۹۷۱ ہجری بمطابق 1563ء کو ہندوستان کے شہر سرہند میں آپ کی ولادت ہوئی۔

ابتدائی حالات

شیخ احمد کا رجحان بچپن ہی سے دین کی جانب تھا۔ نماز بڑے شوق سے پڑھتے اور نوافل کی ادائیگی کا بھی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خاص خیال رکھتے۔ آپ کے والد کے شیخ شاہ کمال کیتھلی آپ پر خصوصی شفقت فرماتے۔ مشہور ہے کہ بچپن میں ایک بار شاہ کمال نے فرطِ محبت سے اپنی زبان آپ کے دہن میں دے دی تو آپ نے شاہ صاحب کی زبان پکڑ لی اور منہ میں دبالی۔ آخر شاہ صاحب کہنے لگے: ''بابا بس کرو، اتنا ہی کافی ہے۔ کچھ ہماری اولاد کے لئے بھی چھوڑ دو۔ تم نے تو ہماری نسبت ساری ہی کھینچ لی''۔ آپ کی عمر ابھی سات سال ہی تھی جب شیخ کمال نے رحلت فرمائی۔ آپ کو ان کا حلیہ اور جس گھر میں ان سے ملاقات ہوئی تھی اس کا نقشہ یاد رہا۔

تعلیم و تربیت

آپ کی تعلیم کی ابتداء حفظِ قرآن سے ہوئی اور تھوڑی ہی مدت میں آپ نے اس کی تکمیل کر لی۔ پھر والد صاحب سے مختلف مضامین کی تعلیم حاصل کرنے لگے۔ کچھ ہی عرصے میں آپ کی خداداد صلاحیتوں کا اندازہ ہونے لگا۔ آپ مشکل سے مشکل مضامین بھی آسان طریقے سے بیان کر دیتے۔ علم کے حصول کے لئے سیالکوٹ کا رختِ سفر باندھا جو ان دنوں مرکزِ علم بنا ہوا تھا۔ وہاں مولانا کشمیری سے جن کی ذکاوت، حافظے اور کثرتِ مطالعہ کا شہرہ تھا اس وقت کے نصابِ تعلیم کی بعض بہترین کتابیں پڑھیں۔

حدیث کی تعلیم شیخ یعقوب صرفی کشمیری سے حاصل کی جن کی تصنیفات میں صحیح بخاری کی ایک شرح بھی ہے اور وہ خود اپنے زمانے کے مشہور اساتذۂ حدیث سے شرفِ تلمذ حاصل کر چکے تھے۔

سترہ سال کی عمر میں آپ فارغ التحصیل ہوئے اور عربی و فارسی میں چند رسائل لکھے۔ اس کے علاوہ درس و تدریس کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ بائیس برس کی عمر میں آگرہ تشریف لے گئے۔ آگرہ میں آپ کا قیام طویل ہو گیا۔ آپ کے والد ملاقات کے شوق میں اپنی ضعیفی کے باوجود آگرہ تشریف لائے۔ واپسی پر آپ بھی ان کے ساتھ ہو لئے۔ راستے میں شہر تھانسیر سے گذر ہوا۔ وہاں کے حاکم نے اپنی بیٹی کی شادی آپ سے کرنے کی خواہش ظاہر کی اور اس کی وجہ یہ بیان کی کہ اسے خواب میں بارہا اس امر کو انجام دینے کا اشارہ ہوا۔ آپ کے والد نے اس رشتے کو منظور کر لیا۔ وہیں نکاح ہوا اور آپ اپنی دلہن اور والد کے ساتھ سرہند تشریف لے آئے۔ سرہند پہنچ کر آپ والد ماجد کی حیات تک انہی کی خدمت میں رہے اور سلسلہ چشتیہ و قادریہ کا سلوک طے کیا۔

والد کے انتقال کے بعد ادائے حج کے لئے رختِ سفر باندھا اور سرہند سے کوچ کر کے دہلی پہنچے۔ وہاں کے علماء جن میں مولانا حسن کشمیری بھی تھے آپ سے ملاقات کے لئے آئے۔ دورانِ ملاقات حسن کشمیری نے برسرِ تذکرہ حضرت خواجہ باقی باللہ کے بلند مرتبے اور قوتِ باطنی کی بہت تعریف کی۔ آپ کو بھی ملاقات کا شوق ہوا اور مولانا حسن کشمیری کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خواجہ باقی باللہ سے تعلقِ معرفت

خواجہ باقی باللہ عجیب وغریب روحانی قوت رکھتے تھے۔ جس پر آپ کی نظر پڑ جاتی اس کی قلبی کیفیات بدل جاتیں۔ دل اللہ کی معرفت کا مشتاق ہو جاتا اور اس پر محویت کا غلبہ ہو جاتا۔ لوگ آپ کے دروازے پر بے ہوشوں کی طرح پڑے رہتے۔ لیکن اس کے باوجود آپ انتہائی منکسر المزاج تھے۔ لوگوں سے اپنی باطنی کیفیات چھپایا کرتے تھے۔ لوگ آپ کے پاس باطنی استفادے کے لئے آتے تو انہیں یہ کہہ کر واپس کر دیتے کہ میرے پاس تو کچھ نہیں ہے۔ اپنے احباب کو بھی اپنے لئے تعظیماً کھڑا ہونے سے منع کرتے۔ اپنے مریدوں سے غلطی کا ارتکاب ہو جاتا تو اس کو اپنی غلطی بتاتے۔ انسانوں کے علاوہ بھی اللہ کی مخلوق پر اس قدر شفقت فرماتے کہ ایک بار سخت جاڑے کی ایک رات میں آپ کسی کام سے بستر سے اٹھ گئے۔ واپس آئے تو اپنے لحاف میں ایک بلی کو سوتا دیکھ کر اسے جگانے کے بجائے صبح تک بیٹھے رہے۔ قیامِ لاہور کے زمانے میں جب قحط پڑا تو اس عرصے میں اپنی خوراک تک محتاجوں میں صدقہ کر دیا کرتے۔

شیخ احمد خواجہ باقی باللہ کے پاس پہنچے تو وہ بہت محبت سے پیش آئے اور خلاف توقع آپ کو کچھ عرصہ اپنے ساتھ قیام کرنے کی دعوت دی۔ آپ نے حامی بھر لی۔ چند ہی دن میں خواجہ صاحب کی صحبت کا ایسا اثر ہوا کہ بیعت کی درخواست کی۔ حضرت خواجہ نے قبول کر لیا اور ذکرِ قلبی کی تلقین کی۔ آپ کی باطنی کیفیات میں روز افزوں ترقی ہونے لگی اور محض دو ماہ کے عرصے میں فنائے حقیقی کے وہ مدارج طے کر لئے کہ خود فرماتے ہیں کہ دل کو اس قدر وسعت حاصل ہوئی کہ اس کے مقابلے میں عرش سے لے کر مرکزِ زمین تک تمام عالم کی رائی کے ایک دانے کے برابر بھی قدر نہ تھی۔ اس قلیل عرصے میں اللہ کی مدد خاص سے آپ نے سلوک کے وہ مراحل طے کئے جو سالوں کی کوششوں کے بعد بھی لوگوں کو نصیب نہیں ہوتے۔ اس موقع پر حضرت خواجہ نے نسبتِ نقشبندی کے حاصل ہونے کی خوشخبری سنائی۔

دوسری بار جب آپ دہلی حاضر ہوئے تو خواجہ صاحب نے خلعتِ خلافت بھی عطا کی اور طالبانِ خدا کو تعلیم طریقت اور ارشاد و ہدایت کی اجازت دی۔ تیسری اور آخری ملاقات میں خواجہ صاحب نے بہت دور نکل کر آپ کا استقبال کیا۔ آپ کو بہت سی بشارتیں دیں اور اپنے دو چھوٹے بچوں کو بھی آپ کی خدمت میں پیش کیا تاکہ وہ آپ کی توجہ سے فائدہ اٹھائیں۔

آپ کے شیخ خواجہ باقی باللہ خود آپ کی کس قدر عزت کرتے تھے اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ ایک روز آپ اپنے تخت پر آرام فرما رہے تھے کہ اتفاقاً حضرت خواجہ تنہا آپ سے ملاقات کے لئے تشریف

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لائے۔ خادم نے آپ کو بیدار کرنا چاہا لیکن حضرت خواجہ نے نہایت اصرار کے ساتھ اس کو منع کر دیا اور خود حجرے کے باہر آپ کے بیدار ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ شیخ احمد اگرچہ گہری نیند سو رہے تھے لیکن فوراً اٹھ بیٹھے اور پوچھا کہ باہر کون ہے؟ حضرت خواجہ نے فرمایا ''فقیر محمد باقی۔'' آپ فوراً تخت سے اٹھے اور نہایت عزت واحترام سے ان کو اندر لا کر بٹھایا۔ آپ اپنے شیخ کا حد درجہ احترام کرتے، ان کے طلب کرنے پر آپ کے چہرے کا رنگ بدل جاتا۔

کچھ عرصے بعد شیخ نے آپ کو رخصت کیا اور رخصت کرتے وقت اس بات کا اندیشہ ظاہر کیا کہ اب زندگی کی امید کم ہے۔ یہ بات درست ثابت ہوئی اور تیسری حاضری کے بعد آپ کو حضرت خواجہ کی صحبت میسر نہ آ سکی۔

اس کے بعد آپ سرہند تشریف لائے اور خواجہ صاحب کے ارشاد کے مطابق تربیت و ہدایت کے کام میں مشغول ہو گئے۔ کچھ ہی عرصے میں محسوس کرنے لگے کہ ابھی بہتری کی بہت گنجائش ہے اور اپنی ذات میں کمی کا احساس ہونے لگا۔ وہ طالب علم جو آپ کے پاس تزکیے اور تربیت کے لئے جمع تھے، ان کو رخصت کیا، خود گوشہ نشینی اختیار کی اور اپنے باطنی احوال کی طرف توجہ کی۔ جب کچھ اطمینان نصیب ہوا تو دوبارہ طالبینِ حق آپ سے استفادہ کرنے لگے۔ اس تمام عرصے میں شیخ باقی باللہ سے خط وکتابت کا سلسلہ جاری رہا۔ انہی کے حکم پر لاہور کا سفر اختیار کیا۔ لاہور بھی ہندوستان کے علمی و دینی مراکز میں سے تھا۔ وہاں کے علماء نے آپ کا پرجوش استقبال کیا۔ بہت سے حضرات آپ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے۔ ذکر اذکار اور درس کی محفلیں سجائی جاتیں۔ اسی اثناء میں شیخ ومرشد کی وفات کا علم ہوا۔ اسی وقت پریشانی کی حالت میں دہلی روانہ ہوئے۔ سوگواران سے تعزیت کی اور شیخ کے مریدوں کی خواہش پر چند روز دہلی میں قیام کیا۔ تربیت وارشاد کی وہ محفلیں جن کا سلسلہ شیخ کے انتقال کے سبب رک گیا تھا انہیں جاری کیا۔ کچھ روز کے قیام کے بعد واپس سرہند تشریف لے آئے۔

تجدیدِ دین کا کارنامہ

شیخ احمد سرہندی کے تجدیدی کارنامے کو بیان کرنے سے قبل مناسب ہوگا کہ ان حالات پر بھرپور نظر ڈالی جائے جن کی وجہ سے تجدیدِ دین کی ضرورت پیش آئی۔

مجدد صاحب کا زمانہ سلطنتِ عثمانیہ کے اوجِ کمال کا زمانہ تھا۔ ایک طرف عثمانی ترکوں کی سلطنت یورپ سے لے کر مصر وشام تک پھیلی ہوئی تھی تو دوسری طرف ایران وخراسان میں صفوی خاندان کا راج تھا جس کا سب سے باعظمت بادشاہ شاہ عباس مجدد صاحب کا ہم عصر تھا۔ دسویں صدی کے آغاز میں ہندوستان میں لودھی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خاندان کی حکومت تھی۔ ۹۲۸ ہجری میں مغلیہ سلطنت کے بانی ظہیر الدین بابر نے قندھار فتح کیا اور ۹۳۲ ہجری میں ہندوستان میں لودھی خاندان کی حکومت کو ختم کر کے مغلیہ سلطنت کی بنیاد ڈالی۔

لودھی خاندان بنیادی طور پر دین کی محبت سے سرشار تھا۔ بابر کے آنے کے بعد بھی دین کو کوئی حقیقی خطرہ لاحق نہ تھا۔ ظاہری طور پر اس وقت پوری دنیائے اسلام میں مذہبی حمیت اور اسلامی جوش کا غلبہ تھا۔ حکمرانِ وقت بھی عوام کے جذبات کا پاس رکھتے ہوئے دینی امور کو اہمیت دینے پر مجبور ہوتے۔ یہ دور تصوف اور طریقت کے انتہائی عروج کا دور تھا۔ عالم اسلام کا کوئی ملک اور خطہ ایسا نہ تھا جہاں کوئی سلسلہ نہ پایا جاتا ہو۔ خود ہندوستان میں سلسلۂ قادریہ اور چشتیہ کی شاخیں پھیلی ہوئی تھیں اور ان میں مختلف صاحب کمال شخصیات گزری تھیں۔

یہ تمام باتیں مختصراً بیان کرنے کے بعد یہ معلوم ہو چکا کہ سیاسی اور عمومی طور پر یہ زمانہ مسلمانوں کی دین سے بیزاری یا بیرونی خطرات سے مقابلے کا نہیں تھا۔ لیکن بقول سید ابوالحسن علی ندوی:

> ''ہندوستان کے اسلام کے دینی وثقافتی مرکز (حجاز مقدس) سے دور ہونے، اسلام کے یہاں ترکستان وایران کا چکر کاٹ کر پہنچنے، عربی زبان کے رائج نہ ہونے، اور خاص طور پر علمِ حدیث (جس سے دین کی صحیح روح، سنت وبدعت کا فرق، امر بالمعروف، نہی عن المنکر کی ضرورت کا احساس اور صحیح دینی احتساب کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے) کی عدم اشاعت، حج اور طالب علموں کے لئے دوسرے ملکوں کے سفر کی دشواریوں اور اسلام کے حلقہ بگوشوں کے غیر مسلم اکثریت سے گھرے رہنے نے (جو اپنے مذہب میں سخت راسخ الاعتقاد، غیر اسلامی رسم ورواج کی سختی سے پابند اور حد درجہ توہم پرست تھی) ہندوستان کے مسلمانوں کو انتشار پسند دعوتوں، گمراہ کن فرقوں اور طالع آزما مذہبی پیشہ وروں کی آسان چراگاہ بنا دیا تھا۔''

مختلف فرقوں کی فتنہ انگیزیاں

سلسلہ عشقیہ شطاریہ (جس کے بانی عبداللہ شطار خراسانی ہیں) کی ایک شاخ نے پہلی مرتبہ جوگ کو تصوف کے ساتھ ملایا۔ اس سلسلے کے سب سے نامور شیخ محمد غوث گوالیاری تھے جو امیرانہ ٹھاٹھ باٹھ سے رہتے۔ ان کی جاگیر کی آمدنی نو لاکھ سکہ نقرئی تھی۔ ان کے پاس ۴۰ ہاتھی اور خادموں کی ایک فوج ظفر موج تھی۔ بازار میں نکلتے تو لوگ جھک جھک کر سلام کرتے۔ غرض سلف کے طریقے اور انداز چھٹ گئے تھے۔

ایک طرف صوفیاء کی شاخیں تھیں جو نئے نئے نظریات کے ذریعے فکری مغالطے پیدا کر رہی تھیں تو دوسری

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جانب اہل تشیع حضرات کی ایک شدت پسند جماعت نے کشمیر اور جنوبی ہند میں اپنا اثر پھیلانا شروع کیا۔ ان کی مبالغہ آمیز تعلیمات اور تشدد پر مبنی کارروائیوں نے اہلِ سنت حضرات کا جینا دوبھر کر دیا۔ مسجدوں، خانقاہوں اور بازاروں میں خلفائے ثلاثہ (حضرات ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ) پر علی الاعلان تبرا کیا جانے لگا اور اس ساری کارروائی کی سرپرستی والیٔ سلطنت برہان نظام شاہ خود کر رہا تھا۔

تیسری طرف ذکری فرقہ نے دعویٰ کیا کہ نبوّتِ محمدی ﷺ کا پہلا ہزار ختم ہونے پر اب ایک نئے پیغمبر کی ضرورت ہے اور دوسرے ہزار سال کے لئے خدا نے ملا محمد کو منتخب کیا ہے (جو اس فرقے کے بانی تھے)۔ پھر قادیانی جماعت کی طرح اپنے عقائد میں اتنا غلو کیا کہ ملا محمد کی فضیلت حضور ﷺ سے بھی بڑھا کر بتانے لگے اور ارکانِ اسلام کے منکر ہو گئے۔

ایک اور فرقہ روشنائیہ تھا۔ اس کا بانی بایزید انصاری تھا۔ وہ وحدت الوجود کے نظریئے کا قائل تھا اور دعویٰ کرتا تھا کہ اس کو الہام ہوتا ہے اور اس پر جبرئیلؑ نزول کرتے ہیں۔ وہ خود اپنے آپ کو نبی سمجھتا۔ نماز پڑھتے وقت قبلے کے تعین کو غیر ضروری گردانتا۔ طہارت و پاکی کے بارے میں احتیاط نہیں برتتا تھا۔ اس نے پشاور کے علاقے اور آس پاس کے افغان قبائل کو اپنا معتقد اور مرید بنا لیا تھا اور اسے زبردست کامیابیاں حاصل ہوئی تھیں۔

سب سے خطرناک تحریک جس کے اثرات دسویں صدی کے آخر تک باقی رہے وہ مہدویت کی تھی جس کے بانی سید محمد جونپوری تھے۔ ظاہری طور پر وہ بڑے بہادر اور جری آدمی تھے۔ سلوک کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد مجاہدہ اور ریاضت کرنے پہاڑوں میں نکل گئے۔ وہاں مراقبوں کے دوران انہوں نے دعویٰ کیا کہ انہیں غیبی اشارے ہوئے ہیں۔ انہوں نے مہدیٔ موعود ہونے کا اعلان کیا اور اس پر ایمان لانے کی دعوت دی۔ وہ صاحبِ تاثیر آدمی تھے۔ بڑے بڑے مناصب پر فائز لوگوں نے ان کی دعوت پر لبیک کہا اور سب کچھ ترک کر کے ان کے ساتھ ہو لئے۔ ایک بڑا علاقہ ان کے اثرات کے تحت آ گیا۔ ان کی زندگی ترکِ دنیا اور زہد و ایثار کا نمونہ تھی۔ ان کے ہاں ہر چیز بغیر کسی لحاظ اور خصوصیت کے برابر تقسیم ہوتی۔ چونکہ وہ صاحبِ حال آدمی تھے لہٰذا اس حالت میں ان کی زبان سے کچھ ایسے الفاظ و اقوال کا بھی پتہ چلتا ہے جن کی تشریح راسخ العقیدہ اہلِ سنت افراد کے لئے مشکل ہے۔ پھر غالی معتقدین نے ان کی عقیدت میں اس قدر مبالغہ کیا کہ اس نے باقاعدہ ایک فرقے کی شکل اختیار کر لی جس نے مسلم معاشرے میں انتشار و اضطراب پیدا کرنے میں اپنا کردار ادا کیا۔

فتنہ کبریٰ - دینِ الٰہی

یہ تمام فتنے اپنی جگہ لیکن شیخ احمد کے دور کا فتنہ کبریٰ ''دینِ الٰہی'' تھا جو مغل شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اپنی اختراع تھی۔ قبل اس کے کہ اس پر روشنی ڈالی جائے، یہ بتانا ضروری ہے کہ ابتداء میں اکبر بادشاہ بھی عام مسلمانوں کی طرح اور اپنے ماحول کے زیر اثر ایک سیدھا سادھا خوش اعتقاد مسلمان تھا جو بزرگوں سے عقیدت رکھتا تھا اور ان کے مزارات کی زیارت کے لئے طویل سفر کرتا، علماء و صلحاء کی صحبت اختیار کرتا اور خود بھی ذکر و اذکار کا اہتمام کرتا۔ ہر سال سرکاری خرچ پر ایک بڑی تعداد کو حج پر بھیجتا۔ خود بھی دین کی خدمت کے لئے کوشاں رہتا۔ یہاں تک کہ بعض اوقات مسجد میں جھاڑو بھی دیتا۔

اکبر ان پڑھ ہونے کے باوجود متجسس طبیعت کا مالک تھا۔ گذرتے ہوئے ماہ و سال نے اس کی دینی سوجھ بوجھ میں اضافہ تو نہ کیا البتہ تفریحِ طبع کے لئے سجائی گئی مناظروں کی مجلسوں نے اسے الحاد اور تشکیک کی وادی میں لا چھوڑا۔ شاہی دربار میں صرف ہندو ازم اور اسلام ہی پر گفتگو نہ ہوتی بلکہ توریت اور انجیل کے تراجم بھی منگوائے گئے اور ان مذاہب کے مذہبی پیشواؤں نے دربار میں حاضر ہو کر اپنے اپنے مذاہب کی حقانیت ثابت کرنے کی کوشش کی۔

ان حالات میں اہلِ بدعت اور ہوا پرست اپنی غلط آراء اور باطل شبہات کے ساتھ میدان میں نکل آئے اور باطل کو حق کی صورت میں اور خطا کو صواب کے لباس میں پیش کرنے لگے۔ بادشاہ جو طالبِ حق مگر ان پڑھ تھا اور کافروں سے مانوس تھا، شک میں مبتلا ہو گیا۔ ان شکوک و شبہات نے اسے شریعت سے دور کر دیا اور پانچ چھ سال کے بعد اسلام کا کوئی اثر نہ رہ گیا۔

دربار میں تفسیرِ قرآن غیر سنجیدہ اور بے باکانہ انداز میں بیان کی جانے لگی۔ علمائے دربار آپس میں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی سعی میں حد سے گذرنے لگے۔ یہاں تک کہ اکبر علمائے سلف کو بھی انہی پر قیاس کر کے سرے سے علماء کا منکر ہو گیا۔

مزید یہ کہ اکبر کو درباری بھی ایسے ہی ملے جنہوں نے بجائے دین کا دفاع کرنے اور بادشاہ کو راہِ حق پر لگانے کے زمانے کی رو دیکھ کر اس کو دین سے متنفر کرنے میں اپنا کردار ادا کیا۔ ہر وہ شخص جو معجزات اور عقائد پر زبان درازی کرتا اور اپنی چرب زبانی کی بناء پر اپنی بات کو وزنی بنا کر پیش کرتا وہ بادشاہ کے دربار میں بلند مقام پاتا۔ اس کی سب سے کھلی مثال ملاّ مبارک اور اس کے دو بیٹے ابوالفضل اور فیضی تھے۔

یہ اپنے عہد کے نہایت دانشور لوگ تھے اور ان کی ذہانت اور تبحر علمی کا ایک زمانہ معترف تھا۔ بادشاہ ان کے زیر اثر تھا اور پورے ملک میں ان کا طوطی بول رہا تھا۔ ان دونوں بھائیوں کے ملحدانہ خیالات نے اکبر کے اوپر گہرا اثر کیا۔ کچھ اپنی آزاد خیالی اور کچھ جاہ پسندی کی وجہ سے یہ دونوں اس کے ہر غلط اقدام کی حمایت کرتے۔ اکبر کے لئے یہی کافی تھا کہ یہ دونوں بھائی اس کو یقین دلاتے کہ مذہب سے متعلق اس کے نظریات

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

معاصر علماء سے کہیں افضل و بہتر ہیں۔

اکبر کو دین سے متنفر کرنے اور اسلام اور دیگر مذاہب کے ملغوبے سے ایک نیا مذہب ایجاد کرنے میں بڑا ہاتھ ان ہندو راجپوت رانیوں کا بھی ہے جن سے اکبر نے استحکامِ سلطنت کے لئے شادیاں کیں۔ پھر ان کے عزیز ہندو راجاؤں کا اعلیٰ مناصب پر تقرر کیا۔ ساتھ ہی دربار میں ہندو رسموں اور طور طریقوں کا اثر نظر آنے لگا۔ حالات یہاں تک جا پہنچے کہ شرعی عدالت کی طرف سے جاری کردہ سزاؤں پر بھی ہندو رانیاں اثر انداز ہونے لگیں اور جب قاضیٔ وقت نے اس دباؤ کو قبول کرنے سے انکار کیا تو انہوں نے بادشاہ سے شکایت کی کہ اس نے ملاؤں کو بہت سر چڑھا رکھا ہے۔ یہی وہ موقع تھا جب ملا مبارک کی مدد سے بادشاہ نے وہ محضر نامہ تیار کیا جس میں صاف طور پر اس بات کا اعلان کیا گیا کہ بادشاہ کا رتبہ مجتہد سے زیادہ ہے۔ ایسے دینی معاملات میں جن میں علماء کا آپس میں اختلاف ہے بادشاہ کی رائے حتمی ہوگی اور ہر ایک کو اس کی پابندی کرنا ہوگی۔

اس محضر نامے پر تمام علماء سے دستخط کروائے گئے۔ اب بادشاہ کے دل میں یہ بات پختہ ہوگئی کہ دینِ اسلام کو آئے ایک ہزار برس پورے ہونے کو ہیں۔ یہی اس دین کی طبعی عمر ہے۔ اب کسی ایسی ہستی کی آمد کی ضرورت ہے جو نئے سرے سے دین کا اجراء کرے اور وہ بادشاہ کی ذاتِ قدسی صفات ہے۔ اس کے ساتھ ہی ''دینِ الٰہی'' کا ایک مذہب کے طور پر آغاز ہوا جس کا بانی خود اکبر بادشاہ تھا۔ اس میں کواکب پرستی اور عقیدۂ تناسخ کے علاوہ ہر اس چیز کو شامل کیا گیا جو انسانی نفس کے لئے باعث تسکین ہو یا اکبر کی سیاسی زندگی کے لئے مفید ہو۔

محل کے خدام غروبِ آفتاب کے بعد شمعیں روشن کر کے بادشاہ کے حضور آتے اور خدا کی حمد اور بادشاہ کی درازیٔ عمر کے لئے دعا کرتے۔ بادشاہ صرف گنگا کا پانی نوش کرتا۔ سود، شراب، جوئے اور خنزیر کے گوشت کو حلال کر لیا گیا۔ ایک طرف سور کے گوشت کو حلال کیا گیا تو دوسری طرف ہندو عقائد کے زیر اثر گوشت خوری کو ناپسندیدہ ٹھہرایا گیا۔ بادشاہ کو سجدہ تعظیمی کیا جانے لگا۔ دینِ الٰہی کے ماننے والے آپس میں ملاقات کے وقت السلام علیکم کی جگہ اللہ اکبر (بمعنی اکبر اللہ ہے) کہتے۔ جبکہ وعلیکم السلام کی جگہ جلّ جلالہ کہا جاتا۔

حکومتی سطح پر غیر اسلامی تہوار منائے جانے لگے۔ اسلامی شعائر اور ارکان کی توہین کی گئی۔ غرض اسلامی تاریخ کے ہزارویں سنہ کے پورے ہونے پر ہندوستان میں دینِ اسلام کو داخلی طور پر عظیم خطرہ درپیش تھا۔

تین محاذوں پر کام کی ضرورت

مجموعی طور پر صورتحال کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اسلام کی صحیح اور خالص تعلیمات کو عام کرنے کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لئے تین محاذوں پر کام کرنے کی ضرورت تھی:

(۱) انبیاء کی ضرورت اور مقام، نبی اکرم ﷺ کے خاتم النبیین ہونے اور قیامت تک آپ کی تعلیمات کے موثر ہونے پر زور، سنت کی ترویج اور بدعات کا رد۔

(۲) اہلِ تصوف کی اصلاح اور ان کے حد سے بڑھے ہوئے نظریات کی درستگی۔

(۳) بادشاہ، سلطنت اور حکومتی ارکان کو راہِ راست پر لانے کی ضرورت۔

ان تمام مسائل سے نمٹنے کے لئے ایک ایسی شخصیت کی ضرورت تھی جو ایک طرف سلوک کے سارے مراحل طے کر کے اس کی پر خار وادیوں سے نکل کر حقیقت کی تہہ تک پہنچ چکی ہو تو دوسری طرف نبی اکرم ﷺ کے خاتم النبیین ہونے پر نہ صرف پورا یقین رکھتی ہو بلکہ آپ ﷺ کے طریقے، سنت کے اتباع اور شریعت کے احترام کا بہترین نمونہ ہو۔ اس کے ساتھ ہی اس کے کردار، عمل اور بیان میں اس قدر خلوص، پختگی اور بے لوثی ہو کہ بادشاہ اور ارکانِ سلطنت بھی اس کو نظر انداز نہ کر سکیں۔

اس عہد آفریں اور تاریخ ساز کام کے لئے قدرت نے شیخ احمد سرہندیؒ کو چنا جنہوں نے دین کی تجدید کا بیڑا اٹھایا۔ وہ سنگین خطرات جن کی زد میں پورا عالمِ اسلام اور خاص طور پر ہندوستان تھا، ان کے خلاف آپ نے کمر ہمت باندھی اور ایک بہترین حکمت عملی تیار کی۔

آپ نے اپنے پاس آنے والے طالبینِ حق کو نہ صرف عقائد کے میدان میں اسلام کی سادہ اور خالص تعلیمات کی طرف متوجہ کیا بلکہ اس کے ساتھ ہی ان کی تربیت کا پورا بندوبست کیا اور انہیں بلادِ اسلامیہ کے طول و عرض میں پھیلا دیا۔ چنانچہ ۱۰۲۶ ہجری میں آپ نے اپنے بہت سے خلفاء تبلیغ و ہدایت کے لئے مختلف مقامات پر روانہ کئے۔ یہ حضرات ترکستان، عرب، شام، یمن، روم، کاشغر، توران، بدخشاں اور خراساں کی طرف روانہ ہوئے۔ اندرونِ ملک سے بھی نامی گرامی علماء اور مشائخ آپ کی شہرت کا سن کر استفادے کے غرض سے سرہند آنے لگے۔ آپ کچھ عرصہ ان کو اپنے ساتھ رکھتے، ان کی باطنی اصلاح اور عقائد کی درستی کے ساتھ ساتھ ان کو دعوت و تبلیغ کے کام کے لئے تیار کر کے واپس ان کے علاقوں کی طرف روانہ کر دیتے۔ یہ حضرات اپنے اپنے علاقوں میں عقائد کی اصلاح و بہتری کا باعث بنتے۔ چنانچہ دکن، آگرہ، سہارنپور، لاہور، پٹنہ، جونپور، بنگال، مانکپور، ہر جگہ آپ کے خلفاء نے اپنا کام پورے زور و شور سے شروع کر دیا۔ غرض پورا ہندوستان آپ کی تعلیمات کی صداؤں سے گونجنے لگا۔

دوسرا کام یہ کیا کہ اپنی بات پہنچانے، اللہ کے دین کو اس کی صحیح شکل میں پھیلانے اور امت کی اصلاح کے لئے آپ نے اپنے خطوط اور مکتوبات کو ذریعہ بنایا۔ سینکڑوں کی تعداد میں خطوط پورے ملک میں روانہ کئے جن

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں آپ نے مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا اور ضرورت کے تحت افراد کے مزاجوں اور ان کے عقائد کی بے اعتدالیوں کو دیکھتے ہوئے انہیں نصیحت کی۔

مقامِ نبوّت کی وضاحت اور سنّت کی اہمیت

آپ نے نبوتِ محمدی پر ایمان واعتماد کی تجدید کے لئے رسائل تحریر کیے۔ نیز اپنے مکتوبات میں انبیاء کی بعثت کی ضرورت پر بحث کی۔ مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ مختلف تحریکوں کے زیر اثر عقل یا پھر کشف کو معرفتِ حق کے لئے کافی سمجھنے لگا تھا۔ آپ نے ثابت کیا کہ ان دونوں کے ذریعے حاصل کیے گئے نتائج لغزش اور غلط فہمی سے مبرّا نہیں۔ اللہ کی صحیح معرفت انبیاء ہی کے ذریعے سے حاصل ہوتی ہے۔ جس طرح عقل کا مرتبہ حواس سے ماوراء ہے، اسی طرح نبوت کا مرتبہ عقل سے ماوراء ہے۔ میر محمد نعمان کے نام اپنے خط میں آپ لکھتے ہیں:

"نبوت کا طریق عقل وفکر کے طور سے ماوراء ہے۔ جن امور کے ادراک میں عقل قاصر ہے ان کا ثبوت نبوت کے طریق سے ہوتا ہے۔ اگر عقل کافی ہوتی تو انبیاء کس لئے مبعوث ہوتے اور آخرت کے عذاب کو کیوں ان کی بعثت کے ساتھ وابستہ کیا جاتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "وما کنا معذّبین حتی نبعث رسولا" ترجمہ: ہم اس وقت تک عذاب کرنے والے نہیں ہیں جب تک کسی پیغمبر کو نہ بھیجیں۔

عقل اگرچہ حجت ہے، لیکن حجتِ بالغہ نہیں ہے اور اپنے حجت ہونے میں کامل نہیں ہے۔ حجتِ بالغہ انبیاء کی بعثت سے ثابت ہوئی ہے اور اس نے مکلفین کی زبانِ عذر بند کر دی ہے۔ اللہ فرماتا ہے:

"پیغمبر جو بشارت دینے والے ہیں اور ڈرانے والے ہیں تاکہ لوگوں کے لئے اللہ کے اوپر کوئی حجت باقی نہ رہے انبیاء کی بعثت کے بعد اور اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔"

جب بعض مسائل میں عقل کے ادراک کا عجز اور کوتاہی ثابت ہوگئی پس تمام احکامِ شرعیہ کو عقل کی ترازو میں تولنا مستحسن نہیں۔ ہمیشہ ان مسائل واحکام کو عقل کے مطابق کرنے کی کوشش اور اس کی پابندی عقل کے کافی ہونے کا فیصلہ کرنا ہے اور نبوت کے طریق کا انکار۔ اللہ ہم کو اس سے پناہ میں رکھے۔"

اپنے ایک اور خط میں خواجہ عبداللہ کو لکھتے ہیں:

"یہ نہ سمجھیں کہ نبوت کا طریقہ کچھ عقل کے طریقے کے خلاف ہے بلکہ بات یہ ہے کہ عقل کا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

طریق انبیاء کی تقلید کے بغیر اس مقصدِ عالی تک پہنچ نہیں سکتا۔ مخالفت دوسری چیز ہے اور نارسائی دوسری چیز۔ اس لئے کہ مخالفت پہنچنے کے بعد متصور ہوسکتی ہے۔''

انبیاء کے طریقے کی حقانیت کو ثابت کرنے کے لئے بیسیوں مقامات پر آپ نے ٹھوس دلائل اور بلند پایہ علمی نکات بیان کئے۔

تصوف کے میدان میں اولیاء اور صوفیاء کو ان کے معتقدین نے نبیوں سے بھی زیادہ مرتبہ اور عزت دینا شروع کردی تھی۔ اس کے رد کے لئے آپ نے اپنے بے شمار مکتوبات میں انبیاء و اولیاء کے مقام اور مرتبے کے فرق کو واضح کیا:

''اس فقیر پر اللہ نے واضح کر دیا کہ کمالاتِ ولایت کا کمالاتِ نبوت کے مقابلے میں کوئی شمار نہیں۔ وہ نسبت بھی نہیں جو کہ قطرہ کو سمندر سے ہوتی ہے۔ پس جو خصوصیت اور فضیلت نبوت کی راہ سے حاصل ہوتی ہے وہ اس فضیلت سے کئی گنا زیادہ ہوتی ہے جو ولایت کی راہ سے حاصل ہوتی ہے۔''

کرامات کو اللہ کے تقرب کی دلیل سمجھا جانے لگا تھا۔ جس بزرگ سے جتنے کمالات صادر ہوتے، فضیلت کے اعتبار سے وہ اتنے ہی بلند درجے پر فائز سمجھا جاتا۔ مجدد صاحب نے متعدد بار اس موضوع پر قلم اٹھایا۔ اپنے ایک مکتوب میں جسے مولانا محمود اشرف عثمانی صاحب نے اپنی کتاب ''ارشاداتِ مجدّد الف ثانی'' میں شائع کیا ہے، فرماتے ہیں:

''وہ خوارق جو امت کے بعض اولیاء سے ظاہر ہوئے ہیں اصحاب کرام سے ان کا سواں حصہ بھی ظہور میں نہیں آیا۔ حالانکہ اولیاء میں سے افضل ولی ایک ادنیٰ صحابی کے درجے کو نہیں پہنچتا۔ خوارق کے ظہور پر نظر رکھنا کوتاہ نظری ہے اور تقلیدی استعداد کے کم ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ نبوت و ولایت کے فیض قبول کرنے کے لائق وہ لوگ ہیں جن میں تقلیدی استعداد ان کی قوتِ نظری پر غالب ہو۔''

اہلِ تصوف کی اصلاح

مجدد صاحبؒ کا دور چونکہ تصوف اور اہلِ تصوف کے غلبے کا تھا اور اس راہ میں بھٹکنے اور منزل گم کرنے کا خدشہ بہت زیادہ ہوتا ہے لہٰذا ہر ہر قدم پر درست بات کی طرف راہنمائی کرنے کا فریضہ انجام دیا۔ بعض اونچے پائے کے بزرگوں سے جو باتیں منسوب کی جاتی تھیں وہ سراسر شریعتِ اسلامی کے خلاف تھیں، چنانچہ اپنے ایک

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مکتوب میں فرماتے ہیں:

''بعض مشائخِ قدس سے جو غلبۂ حال اور سکر کے وقت میں اہلِ حق کی صحیح روایتوں کے برخلاف علوم و معارف ظاہر ہوئے ہیں، چونکہ ان کا باعث کشف ہے اس لئے معذور ہیں۔ امید ہے کہ قیامت میں ان کا مواخذہ نہیں کیا جائے گا۔ وہ خطا کار مجتہد کا حکم رکھتے ہیں کہ اس کو خطا پر بھی ایک اجر ملے گا اور حق علمائے اہلِ حق کی طرف ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی کوششوں کو مشکور کرے کیونکہ علماء کے علوم چراغِ نبوت سے لئے ہوئے ہیں جن کی وحی قطعی سے تائید کی گئی ہے اور ان صوفیاء کے معارف کا اقتداء کشف اور الہام ہے کہ خطا کو اس میں دخل ہے اور کشف والہام کی صحت کا مصداق علمائے اہلِ سنت کے علوم کے ساتھ ان کا مطابق ہونا ہے۔ اگر سرِ مو بھی مخالفت ہے تو دائرہ صواب سے باہر ہیں۔ یہی علمِ صحیح اور حقِ صریح ہے اور اس کے سوا گمراہی ہے۔''

اُس دور کا سب سے بڑا فکری مغالطہ جسے اہل تصوف کے یہاں بڑی قدر و منزلت سے دیکھا جاتا تھا وہ مسئلہ ''وحدث الوجود'' تھا۔ یہ نظریہ اس قدر پیچیدہ ہے اور اس کے ضمن میں استعمال کی جانے والی اصطلاحات اتنی غیر مانوس ہیں کہ قارئین کے لئے اس کو سمجھنا اور آسان الفاظ میں اس کو سمجھایا جانا بہت مشکل ہے۔ مختصر یہ کہ اس نظریئے کے تحت جو دو وجود کا قائل ہوا کہ ایک اللہ کا وجود ہے اور ایک ممکن کا تو وہ شرک کر رہا ہے اور اس کا یہ شرک، شرکِ خفی ہے اور جو شخص صرف ایک وجود کا قائل ہوا اور اس نے کہا کہ وجود صرف اللہ کا ہی ہے اس کے سواء جو کچھ ہے وہ اس کے مظاہر ہیں اور مظاہر کی کثرت اس کی وحدت کے منافی نہیں تو یہ شخص موحد ہے۔ نیز اس بات کا یقین رکھنا کہ لاموجود ولا الہ الا اللہ (اللہ کے سوا نہ کوئی موجود ہے اور نہ کوئی معبود ہے)۔

اس نظریئے کے کچھ ماننے والے اپنی حدود سے باہر نکل آئے اور کہنے لگے کہ فرعون نے جو انا ربکم الاعلیٰ کا دعویٰ کیا تھا تو وہ بالکل درست تھا۔ کیونکہ اسے منصبِ حکومت حاصل تھا۔ اس لئے جب سب کسی نہ کسی نسبت میں رب ہیں تو اس کا یہ کہنا کہ ''میں سب سے اعلیٰ ہوں۔'' درست تھا کیونکہ اسے حکومت اور فیصلے کا اختیار دیا گیا تھا۔ اس قسم کی بہت سی لغویات نے جڑ پکڑ لی تھی۔ خصوصاً ہندوستان تو اسلام سے قبل بھی ''ہمہ اوست'' کے نظریئے کا قائل تھا۔ شیخ ابن عربی کے اس نظریئے کو یہاں بہت شہرت حاصل ہوئی اور اس نے مقامی مزاج سے ہم آہنگ ہو کر ایک نیا مکتبِ خیال پیدا کر لیا۔

وحدث الوجود کے نظریئے کے رد کے لئے علمائے حق اور جماعتِ اہلِ سنت کی طرف سے جو کوشش کی گئی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس کو وحدت الوجود کے حامی حضرات نے اس لئے رد کر دیا کہ یہ علمائے ظاہر جنہوں نے کبھی تصوف کے میدان میں قدم ہی نہ رکھا، جن پر مقامات اور مختلف کشف والہامات ظاہر ہی نہیں ہوئے وہ اس بات کی تہہ تک نہیں پہنچ سکتے کیونکہ وہ اس دریا کے غواص ہی نہیں ہیں۔ لیکن جب مجدد صاحب نے اس پر قلم اٹھایا تو کوئی آپ کی معرفتِ حقائق اور عملی تجربات سے ناآشنائی پر انگلی نہ اٹھا سکا۔ مجدد صاحب کے سامنے تین طرح کی آراء زیادہ مشہور تھیں:

۱- وہ لوگ جو وحدت الوجود پر مکمل یقین رکھتے تھے اور اس کو معرفت کی آخری منزل گردانتے تھے۔

۲- وہ لوگ جو اس کا انکار کرتے تھے اور اس کو وہم اور خیالِ باطل سے زیادہ اہمیت نہ دیتے تھے۔

۳- وحدت الوجود کے متوازی وحدت الشہود کا نظریہ رکھنے والے یہ سمجھتے تھے کہ سالک کو جو کچھ نظر آتا ہے وہ یہ نہیں کہ وجودِ واحد کے سوا ہر چیز معدوم ہے بلکہ دراصل وجودِ حقیقی کے نور نے ان پر ایسا پردہ ڈال دیا ہے کہ وہ معدوم نظر آتے ہیں۔ جس طرح ستارے طلوعِ آفتاب کے بعد اس کے نور کے سامنے ایسے بے حقیقت نظر آتے ہیں جیسے ان کا کوئی وجود ہی نہ ہو۔

مجدد صاحب نے ان تمام آراء اور نظریات کے مقابل یہ مسلک اختیار کیا کہ وحدت الوجود سالک کے مقامات میں سے ایک مقام ہے۔ اس مقام پر پہنچنے کے بعد واقعی یہ محسوس ہوتا ہے کہ وجودِ حقیقی (باری تعالیٰ) کے سوا کسی چیز کا وجود نہیں ہے۔ لیکن اگر اللہ کی توفیق شاملِ حال ہو اور شریعت پر مضبوطی سے عمل ہو تو منزلِ حقیقی بھی آجاتی ہے اور وہ وحدت الشہود کی منزل ہے۔

اس سلسلے میں آپ نے اپنے تجربات کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ پھر وحدت الوجود اور توحیدِ وجودی پر اعتقاد رکھنے والوں پر اعتراضات بھی کیے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے سمجھا کہ ہر چیز حق ہے تو پھر کفر و ایمان کے امتیاز اور فرق کو بے اصل سمجھ کر شریعت اور سنت پر عمل کو معمولی درجے کا کام سمجھا جانے لگا۔ اس کا تقدس اور احترام زمانے کی نظروں میں کم ہونے لگا۔ آپ نے سنتِ رسول ﷺ کی پیروی پر بار بار زور دیا۔ ایک مکتوب میں لکھا ''فضیلت تمام تر سنت کی پیروی سے وابستہ اور شریعت پر عمل کرنے سے مربوط ہے۔ مثلاً دوپہر کا سونا جو اتباعِ سنت کی نیت سے ہو کروڑوں شب بیداریوں سے افضل اور زکوٰۃ کا ایک پیسہ ادا کرنا سونے کے پہاڑ خرچ کر دینے سے جو اپنی طرف سے ہو افضل ہے۔''

آپ نے اپنے مکتوبات میں واضح کیا کہ فرائض جو کہ شریعت کی طرف سے مقرر کردہ ہیں ان کا درجہ اور ان کی ادائیگی کا اجر سب سے زیادہ ہے اور نبی اکرم ﷺ کی سنتیں اور آپ ﷺ کا طریقہ سب سے زیادہ اللہ سے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قریب کرنے والا ہے۔

صوفی قربان کے نام اپنے خط میں فرماتے ہیں:

''صوفیائے خام ذکر وفکر کو اہم کام سمجھ کر فرائض وسنن کی ادائیگی میں تساہل برتتے ہیں۔ چلّوں اور ریاضتوں کو اختیار کر کے جمعہ و جماعت ترک کر دیتے ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ جماعت کے ساتھ ایک فرض نماز کی ادائیگی ان کے ہزاروں چلّوں سے بہتر ہے۔ ہاں ذکر وفکر جو آداب شرعی کے ساتھ ہو، بہت بہتر اور ضروری ہے۔ ناقص علماء بھی نوافل کی ترویج میں کوشاں رہتے ہیں اور فرائض کو خراب وابتر رکھتے ہیں۔''

آپ نے بدعات کے رد اور ازالے کے لئے عَلَمِ جہاد بلند کیا۔ عوام اور خواص کو اس مغالطے سے نکالا کہ بدعات کی دو قسمیں ہیں۔ ایک بدعتِ سیئہ اور دوسری بدعتِ حسنہ۔ بدعتِ سیئہ اس کو قرار دیا گیا جو کسی سنت کی جگہ لے لے۔ جبکہ بدعتِ حسنہ وہ ہے جس سے کسی مسنون طریقے پر کوئی زد نہ پڑتی ہو۔ آپ نے واضح کیا کہ جب ہر نو ایجاد کردہ چیز بدعت ہے اور ہر بدعت ضلالت ہے تو کسی بدعت میں حسن پائے جانے کا کوئی سوال نہیں ہے۔ اپنے ایک مکتوب میں میر محبّ اللہ کو لکھتے ہیں:

''سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگوں نے کہاں سے کسی ایسے کام میں حسن ہونے کا فیصلہ کیا جو اسلام کے دین کامل اور خدا کے پسندیدہ ومقبول مذہب میں اتمام نعمت کے بعد ایجاد کیا گیا ہو۔ کیا ان کو یہ موٹی بات معلوم نہیں کہ اتمام واکمال اور قبولیت کے بعد کسی دین میں کوئی نئی بات ایجاد کی جائے تو اس میں حسن نہیں ہوسکتا۔ حق کے بعد صرف گمراہی کا درجہ رہ جاتا ہے۔''

مجدد صاحب نے متعدد بار اس بات کا اعادہ کیا کہ ہر قسم کی بدعات کے دروازے کو مطلقاً بند کر دینے میں ہی خیر ہے۔ اس کے جواز کا فتویٰ دے دیا جائے تو ہر کوئی غلط رسومات کے لئے راستہ نکال لے گا۔

اہلِ اقتدار کی اصلاح

اہلِ بدعت وشرک اور صوفیوں کے عقائد واعمال کی درستگی کے ساتھ ساتھ آپ کے پیشِ نظر بادشاہ اور اس کے درباریوں کی اصلاح کا عظیم کام بھی تھا۔

اکبر کے انتقال کے بعد جہانگیر تخت نشین ہوا جسے نہ صرف اسلام سے کوئی عناد نہ تھا بلکہ اکبر کی طرح دین

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے بارے میں نئی نئی موشگافیاں کرنے سے بھی کوئی دلچسپی نہ تھی۔لیکن جن نقصانات کا دورِ اکبر میں اسلام کو سامنا کرنا پڑا ان کے اثرات کو مٹانے کے لئے آپ نے بادشاہ کے مقرب امراء کے ذریعے بادشاہ کو نصیحت آمیز پیغامات بھیجے۔ اس موقع پر سمجھ لینا چاہئے کہ مجدد صاحب کو اس بات کا پورا احساس تھا کہ اللہ کو آپ سے شریعت کی ترویج و تبلیغ کا کام لینا ہے جو صرف خانقاہ میں پیری مریدی کر کے انجام نہیں دیا جاسکتا۔اس کے لئے بہت ضروری ہے کہ ایک طرف عوام کے عقائد کی درستگی اور اعمال کی اصلاح پر توجہ دی جائے تو دوسری طرف حکومت کی بھی اصلاح کی جائے جو اتنے بڑے ملک کا انتظام و انصرام چلانے پر مقرر ہے۔آپ نے خاص طور پر ان درباریوں کا انتخاب کیا جن کی دینی حمیت کچھ نہ کچھ لائقِ بھروسہ تھی۔آپ نے انتہائی دردمندی سے اپنے خطوط تحریر کئے جن میں اسلام کی غریب الوطنی کا تذکرہ بڑے پراثر انداز میں کرنے کے بعد اسلام کی تقویت کے لئے کام کرنے والوں کے اجر اور اعزاز کا بار بار ذکر کیا ہے۔ان خطوط میں مسلمانوں اور اسلام کی خیر خواہی کا جذبہ اور حکومتی کارندوں کو اللہ کی راہ کی طرف دعوت دینے کا شوق ایک عجیب تاثیر پیدا کرتا ہے۔یہ طویل مکتوبات نقل کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔البتہ سید فرید کے نام آپ کے مکتوب کا ایک مختصر اقتباس درج ذیل ہے:

> ''آج کے دن اسلام بڑا بے کس اور غریب الوطن ہے۔ایک پیسہ بھی جو اس وقت تقویتِ اسلام میں خرچ کیا جائے وہ کروڑوں میں خریدا جائے گا۔دیکھنا چاہئے کہ کون شاہباز ہے جس کو اس دولتِ عظمٰی سے مشرف کیا جائے گا۔''

ایک اور جگہ تحریر کرتے ہیں:

> ''بادشاہ کو عالَم سے وہی نسبت ہے جو دل کو بدن سے ہے۔اگر دل صحیح وصالح ہو تو بدن بھی صحیح وصالح ہوگا۔اور اگر وہ فاسد ہے تو بدن بھی فاسد ہوگا۔بادشاہ کا صلاح عالَم کا صلاح ہے اور اس کا فساد عالَم کا فساد ہے۔''

بادشاہ کے درباریوں کے ذریعے آپ نے سلطنت کے ارکان اور خود بادشاہ کی تربیت و اصلاح کا کام شروع کیا۔لیکن یہ اثر چونکہ بالواسطہ تھا لہٰذا اس کے لئے ایک مدت درکار تھی۔اسی اثناء میں قدرت نے آپ کے لئے وہ موقع پیدا کیا کہ آپ براہ راست بادشاہ اور اس کی سلطنت کے ارکان پر اپنا اثر ڈال سکیں۔جہانگیر کے کچھ درباریوں نے آپ کے خلاف اس کے کان بھرنے شروع کئے۔آپ کے کچھ خطوط پیش کئے گئے جو تصوف کے دقیق مضامین پر مبنی تھے۔دوسری جانب آپ کے وہ خطوط جو درباریوں تک پہنچ رہے تھے ان کی سن گن بھی بادشاہ کو مل رہی تھی۔ایک اور چیز جس نے بادشاہ کو متوجہ کیا وہ عوام میں آپ کی تیزی سے بڑھتی ہوئی مقبولیت تھی جسے دیکھ کر بادشاہ کو آپ کی طرف سے کسی سیاسی انقلاب کا خطرہ بھی محسوس ہوا۔چنانچہ اس نے آپ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کو دربار میں طلب کیا۔

صاحبِ عزیمت

آپ اپنے پانچ مریدوں کے ہمراہ بادشاہ کے دربار میں تشریف لے گئے۔ ملاقات کے وقت آپ نے خلافِ شرع شاہی آداب ادا نہ کئے۔ بادشاہ نے وجہ پوچھی تو فرمایا ''میں نے آج تک خدا اور رسول کے بتائے ہوئے آداب واحکام کی پابندی کی ہے۔ اس کے علاوہ مجھے کوئی آداب نہیں آتے۔'' بادشاہ نے ناراض ہوکر کہا ''مجھے سجدہ کرو۔'' آپ نے کہا ''میں نے خدا کے سوا نہ کسی کو سجدہ کیا ہے نہ کروں گا۔'' اس پر بادشاہ آپ سے ناراض ہوگیا اور ۱۰۲۸ ہجری میں گوالیار کے قلعے میں آپ کو نظر بند کر دیا گیا۔ قید کرنے کے بعد آپ کی حویلی، سرائے، کنواں، باغ اور کتابیں ضبط کر لی گئیں۔

آپ نے اسیری میں بھی دعوت وتبلیغ کا کام زور وشور سے جاری رکھا اور سینکڑوں بت پرستوں کو مسلمان کیا۔ آپ اپنے کام میں پوری طرح مصروف تھے کہ بادشاہ کو اپنے اقدام پر ندامت ہوئی اور ہر طرف سے لوگوں نے بھی اس کے اس عمل کو ناپسندیدگی سے دیکھا۔ اگلے سال آپ کی رہائی عمل میں آئی۔ اب بادشاہ نے درخواست کی کہ چند روز آپ بادشاہ اور لشکر کے ساتھ وقت گذاریں۔ آپ نے موقع غنیمت جان کر اس درخواست کو منظور کر لیا اور اپنے صاحبزادوں کو اس بارے میں تحریر کیا:

> ''لشکر میں اس طرح بے اختیار و بے رغبت رہنا بہت ہی غنیمت جانتا ہوں اور اس عرصے کی ایک ساعت کو دوسری جگہوں کی بہت سی ساعتوں سے بہتر تصور کرتا ہوں۔''

اب لشکریوں، درباریوں اور خود بادشاہ کے سامنے آپ کے کردار کی بے لوثی اور خلوص خوب کھل کر نمایاں ہوگیا۔ دن رات بادشاہ اور اس کے درباریوں سے صحبت رہتی جس میں دینی امور بھی زیر بحث آتے۔ بادشاہ کو آپ کی رفاقت سے فائدہ ہوا۔ اس نے آپ کے معمولات، طبیعت کے استغناء اور اصلاحِ عام کے لئے آپ کی کوششوں کو محسوس کیا۔ اگرچہ وہ خود تو آپ کے حلقۂ ارادت میں شامل نہ ہوا لیکن ہندوستان کے سیاسی حالات جو اسلام مخالف ہو چکے تھے اب اسلام کے احترام میں بدل گئے اور شعائرِ اسلام سے متصادم نہ رہے۔ جہانگیر نے دہلی، بنارس اور پھر اجمیر میں بھی آپ کو اپنے ساتھ رکھا۔ لشکرِ شاہی کے ساتھ آپ کا قیام ساڑھے تین سال رہا۔ اس عرصے میں آپ کو اصلاحِ احوال کا جو موقع ملا اس سے آپ نے بھرپور فائدہ اٹھایا اور جو مرید آپ کے ساتھ تھے ان کو بھی اس کارِ خیر میں شامل کیا۔ اپنے ایک مکتوب میں فرماتے ہیں:

> ''برخورداران اور رفقاء میں سے جو بھی ساتھ ہے، ان سب کو وابستگی حاصل ہے اور ان

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے احوال میں ترقی ہے۔ان کے واسطے یہ چھاؤنی گویا کہ خانقاہ بن گئی ہے۔''

سفرِ آخرت

لشکر کے قیام سے واپسی پر آپ نے خلوت اختیار کی۔ اندازہ ہوگیا کہ اب واپسی کا وقت قریب ہے۔ صرف نمازِ پنجگانہ اور نمازِ جمعہ کے لئے باہر تشریف لاتے۔ سارا وقت ذکر وفکر میں صرف ہوتا۔ اپنے بیٹوں کو بتادیا تھا کہ اب اس دنیا کی طرف رغبت معلوم نہیں ہوتی اور سفر کے دن قریب معلوم ہوتے ہیں۔ پھر گریئے کا غلبہ ہوجاتا۔ بخار مستقل رہنے لگا۔ اس حالت میں بکثرت صدقہ وخیرات کیا۔ ایک رات ثلث اخیر میں اٹھ کر وضو کیا اور تہجد کھڑے ہوکر پڑھی۔ پھر کہا: ''یہ ہماری آخری تہجد کی نماز ہے''۔ اس حالتِ ضعف میں بھی برابر سنت کی پابندی، بدعت سے اجتناب اور دوامِ ذکر کی وصیت فرماتے رہے۔ پھر فرمایا کہ میری تجہیز وتکفین میں سنت پر پورا عمل کیا جائے۔ چاشت کے وقت پیشاب کے لئے طشت منگوایا جس میں ریت نہیں تھی۔ چھینٹیں آنے کے خیال سے اس کو واپس کردیا۔ پھر فرمایا: ''میں وضو شکست نہیں کرسکتا۔ مجھے بستر پر لٹادو''۔ مسنون طریقہ کے مطابق دایاں ہاتھ رخسار کے نیچے رکھ کر ذکر میں مشغول ہوگئے۔ تھوڑی ہی دیر میں سانس تیز چلنے لگی اور پیر کے روز چاشت کے وقت ۱۰۳۴ ہجری میں اس عالم فانی سے کوچ کرگئے۔ وفات کے وقت عمر مبارک تریسٹھ برس تھی۔

معمولاتِ زندگی

آپ کی ساری زندگی شریعت کی متابعت میں بسر ہوئی۔سنت کی پیروی میں باریک باتوں کا بھی اس قدر اہتمام فرماتے کہ اس کی مثال مشکل ہے۔ اس تمام کوشش کو ہمیں اس تناظر میں دیکھنا چاہئے کہ آپ صاحب تصوف تھے۔کسی صوفی میں شریعت کی اس قدر پابندی کی مثال تاریخ میں مشکل ہی سے ملے گی۔

کثرتِ عبادت سے آپ کے پاؤں متورم ہوجاتے۔تہجد تک نوافل کی ادائیگی میں مصروف رہتے۔ فجر کی نماز سے اشراق کے وقت تک حلقہ فرماتے۔ پھر اشراق کی طویل نماز ادا کرکے طالبینِ حق کی تربیت پر ذاتی توجہ دیتے اور ان کے سامنے مضامینِ خاص وعام بیان فرماتے۔ نمازِ چاشت کے بعد گھر تشریف لے جاتے اور گھر والوں کے ساتھ کھانا نوش فرماتے۔ خادموں کا اس موقع پر خصوصی خیال رکھتے۔ دن بھر تلاوت، ذکر اذکار، دعوت وتبلیغ اور اصحاب کی باطنی کیفیات میں بہتری کی کوششوں میں وقت گذرتا۔ مریضوں کی عیادت کے لئے جاتے۔غیبت سے بہت بچتے۔جس کسی سے بھی تکلیف پہنچتی اس کی شکایت زبان پر کبھی نہ لاتے۔ سلام میں پہل کرتے۔لباس سادہ اور سنت کے مطابق پہنتے۔عید پر عمدہ لباس کا خصوصی اہتمام کرتے۔ اپنی باطنی کیفیات اور تقوے کا اظہار کبھی نہ کرتے۔ جو لوگ آپ کی صحبت میں رہتے انہوں نے بھی چند ایک بار ہی آپ کو بہ چشم نم

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دیکھا۔ ان تمام کوششوں کے باوجود اپنے عمل کو بہت قلیل جانتے۔ آپ کو بارہا یہ کہتے ہوئے سنا گیا کہ ''ہمارا عمل اور کوشش بھی کیا چیز ہے۔ جو کچھ ہے وہ سب فضلِ خداوندی ہے۔''

آپ کی پوری زندگی پر جو چیز سب سے زیادہ حاوی نظر آتی ہے وہ سنتِ رسول ﷺ کی سختی سے پابندی ہے جو اس ماحول میں اپنا اثر کم کر چکی تھی اور جس کو نئے سرے سے رائج کرنے کا کام اللہ نے آپ سے لیا۔ ایک مرتبہ کسی خادم سے کہا کہ فلاں مقام پر لونگیں رکھی ہیں۔ کچھ دانے لے آؤ۔ وہ چھ دانے لے آیا۔ یہ دیکھ کر ناگواری سے فرمایا: ''ہمارے صوفی کو اب تک یہ بھی معلوم نہیں کہ عددِ طاق کی رعایت سنت ہے''۔ پھر کہا: ''میں تو وضو میں منہ دھوتے وقت یہ خیال رکھتا ہوں کہ پہلے داہنے رخسار پر پانی پڑے کیونکہ داہنے طرف سے کام کی ابتداء کرنا بھی سنت ہے۔'' آپ کے یہاں سنت کا اہتمام اس حد تک ہوتا کہ ایک روز فرمایا: ''ایک دن سہواً جائے ضرور (بیت الخلاء) میں داخل ہوتے وقت دایاں پاؤں پہلے رکھ دیا۔ اس دن بہت سے احوال سے محرومی رہی۔''

آپ کے اثرات وتصنیفات

آپ کے انتقال کے بعد آپ کے شاگردوں کے ذریعے آپ کی تعلیمات ہندوستان کے گوشے گوشے میں پھیل گئیں۔ جہانگیر کے بعد اس کا بیٹا اورنگزیب عالمگیر تخت نشین ہوا تو اس کے اندر صحیح اسلامی روح موجود تھی۔ مجدد صاحب نے اپنی کوششوں سے وہ سب جھوٹے لبادے اتار پھینکے تھے جو مختلف طبقۂ فکر کے لوگوں نے اسلام کو پہنا رکھے تھے اور اسلام کی سادہ اور روشن تعلیمات نکھر کر سامنے آ گئی تھیں۔ اسی روشنی میں اگلے پچاس سال عالمگیر نے حکومت کی۔ نصف صدی پر محیط یہ عرصہ ہندوستان میں اسلام کے حق میں بہترین ثابت ہوا اور اسلام پسند قوتوں کو کام کرنے کا کھلا موقع ہاتھ آیا۔ مختصراً یہ کہ مجدد صاحب کے اثرات کو جاننے کے لئے ضروری ہے کہ پچھلے پانچ سو سال کی ہندوستان کی تاریخ میں اسلام کو قائم و نافذ کرنے کی کوششوں کا تفصیلی مطالعہ کیا جائے۔ ان سب کا بالواسطہ یا بلاواسطہ تعلق آپ سے نکل آتا ہے۔ اقبال کے الفاظ میں:

حاضر ہوا میں شیخِ مجدد کی لحد پر ۔۔۔ وہ خاک کہ ہے زیرِ فلک مطلعِ انوار
اس خاک کے ذروں سے ہیں شرمندہ ستارے ۔۔۔ اس خاک میں پوشیدہ ہے وہ صاحبِ اسرار
گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے ۔۔۔ جس کے نفسِ گرم سے ہے گرمیٔ احرار
وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہبان ۔۔۔ اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار

مجدد صاحب کی آٹھ تصنیفات دستیاب ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ شہرت ''مکتوباتِ امام ربانی'' کو حاصل ہے۔ اس کے تراجم مختلف زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ ان مکتوبات کی تعداد ۵۳۶ ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شاہ ولی اللہ دہلویؒ

1703 - 1762 A.D
1114 H.E - 1176 H.E

بارھویں صدی ھجری میں بر صغیر میں دینی اصلاح وتجدید کے لئے تصنیفی، تدریسی اور سیاسی خدمات سر انجام دینے والے عالم

تعارف

آپ کا نام ولی اللہ، کنیت ابو محمد اور لقب محدث دہلوی تھا۔

آپ کا سلسلہ نسب یہ ہے: شاہ ولی اللہ بن عبدالرحیم بن شہید وجیہہ الدین بن معظم بن منصور۔ آپ کا نسب اٹھائیسویں پشت کے بعد حضرت عمرؓ بن خطاب سے جا ملتا ہے۔

ہندوستان فتح ہونے کے بعد سادات اور قریش کی بڑی تعداد دہلی سے تیس کوس دور ''رہتک'' کے مقام پر قیام پذیر ہوئی۔ انہی میں آپ کے جد امجد شیخ شمس الدین مفتی بھی تھے۔ صدیوں سے آپ کا خاندان اپنے زہد، علم وتقویٰ اور شجاعت کی وجہ سے مشہور تھا۔ آپ کے والد عبدالرحیم اپنے وقت کے جید عالم شمار کئے جاتے تھے جنہوں نے دینی علوم کی اشاعت کے لئے دہلی میں مدرسہ رحیمیہ قائم کیا تھا۔ شاہ عبدالرحیم ملک کے ان ممتاز ترین علماء میں شامل تھے جنہیں فتاویٰ عالمگیری ترتیب دینے کے لئے چنا گیا تھا۔ وہ معتدل مزاج تھے، لباس اور غذا میں سادگی برتتے، ہر ایک سے خندہ پیشانی سے پیش آتے، علماء کی تعظیم کرتے اور کثرت سے ذکر کرنے والے تھے۔ ان کے پہلے نکاح سے ایک صاحبزادے صلاح الدین پیدا ہوئے جو کچھ بڑے ہو کر فوت ہو گئے۔ ۶۰ برس کی عمر میں چند غیبی اشارات اور بشارتوں کے ذریعے ان کو علم ہوا کہ ان کے ہاں ایسی بلند اقبال اولاد پیدا ہوگی جس سے قدرت کو بڑے بڑے کام لینے مقصود ہیں۔ چنانچہ اپنی اہلیہ کی موجودگی میں دوسری شادی کا ارادہ کیا۔ جب شیخ محمد پھلتی (جو آپ کے والد کے عقیدت مند اور خود بھی صاحب تاثیر وارشاد تھے) کو ان کے اس ارادے کی خبر ہوئی تو انہوں نے اپنی صاحبزادی کو ان کے نکاح میں دینے کا عندیہ دیا۔ ۱۱۱۴ ہجری کے اوائل میں یہ عقد ہو گیا۔ آپ کی والدہ فخر النساء علومِ دینیہ میں درک رکھتی تھیں۔ تفسیر وحدیث کی عالمہ تھیں اور روحانی حیثیت میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بھی اپنے دور کی خواتین میں ممتاز مقام رکھتی تھیں۔ آپ کی ولادت سے قبل آپ کے والد شاہ عبدالرحیم کو خواب میں خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کی زیارت ہوئی۔ انہوں نے فرزند کی بشارت دی اور فرمایا اس کا نام میرے نام پر رکھنا۔

ولادت

شاہ صاحب کی ولادت ۴ شوال ۱۱۱۴ ہجری کو اپنے ننھیال کے قصبے پھلت میں ہوئی۔ آپ کے والد نے آپ کا نام ولی اللہ رکھا۔ کچھ مدت کے بعد خواب یاد آیا تو آپ کا دوسرا نام قطب الدین احمد تجویز کیا گیا۔

تعلیم و تربیت

شاہ صاحب بچپن ہی سے اپنے عمدہ اخلاق اور پسندیدہ عادات کی وجہ سے اپنے ہم عمروں میں ممتاز نظر آتے تھے۔ پانچ سال کی عمر میں مکتب میں داخل کردیئے گئے۔ گھر کے پاکیزہ ماحول نے اثر دکھایا اور سات سال کی عمر سے نماز کی پابندی کرنے لگے۔ بلکہ نمازِ تہجد میں اپنے والدین کے ساتھ شریک ہوجاتے۔ اسی سال کے آخر میں قرآن مجید کے حفظ سے فراغت ہوئی۔ ہونہاری کے آثار بچپن ہی سے نمودار ہونے لگے تھے۔ والد نے آپ کی تعلیم و تربیت میں گہری دلچسپی لی۔

آپ کے والد عبدالرحیم نے آپ کے لئے علمی نصاب کا انتخاب بہت سوچ سمجھ کر کیا۔ ابتداء میں فارسی اور عربی کے مختصر مضامین پڑھائے جس سے مطالعے کی استعداد پیدا ہوگئی۔ فقہ، اصول فقہ، منطق، علم الکلام، سلوک، طب اور ریاضی سے متعلق اپنے دور کی بہترین کتب سے استفادہ کیا۔ غرض پندرہ سال کی عمر میں ہندوستان میں رائج علوم سے مکمل واقفیت حاصل کرلی۔ اب والد سے حدیث میں مشکوٰۃ اور صحیح بخاری کا کچھ حصہ جبکہ شمائل ترمذی مکمل پڑھی۔ فرماتے ہیں کہ خدا کا بڑا انعام ہوا کہ والد صاحب کے درس قرآن میں شریک ہونے کا کئی بار موقع ملا جس سے معانیٔ قرآن کا دروازہ کھل گیا۔ آپ کے والد محترم اکثر آپ کو عقل و دانش اور تہذیب و شائستگی کی باتیں سکھلاتے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ ایک روز زمانہ طفولیت میں اپنے ساتھیوں کی ایک جماعت کے ساتھ باغ کی سیر کو چلا گیا۔ واپس آیا تو والد صاحب نے فرمایا ولی اللہ، تم نے اس دن رات میں ایسا کون سا کام کیا ہے جس کا اجر باقی رہنے والا ہے؟ ہم نے تو اس دوران اتنا درود پڑھا۔ شاہ صاحب کہتے ہیں کہ یہ سن کر میرا دل باغات کی سیر و تفریح سے بالکل اچاٹ ہوگیا۔ اس کے بعد پھر اس کا شوق پیدا نہیں ہوا۔ آپ کے والد آپ کو خوش خلقی، سلام میں پہل اور کم مرتبہ لوگوں کی عزت افزائی کی ہمیشہ تلقین کرتے۔ طبیعت میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اعتدال برقرار رکھنے اور خواہشات کی تکمیل میں لذت جوئی کو مقصود بنانے سے زیادہ ضرورت کی تکمیل اور فضیلت کے حصول کو اہمیت دینے کی نصیحت کرتے۔

چودہ برس کی عمر میں آپ کی شادی آپ کی ماموں زاد بہن سے کر دی گئی جن سے آپ کے بڑے صاحبزادے شیخ محمد پیدا ہوئے۔ پندرہ برس کی عمر میں والد محترم سے بیعت کی اور سلسلہ نقشبندیہ کا خرقہ پہنا۔ اس تمام عرصے میں آپ کے والد آپ سے بہت خوش رہے۔ وہ آپ پر ایسی توجہ کرتے کہ خود فرماتے ہیں کہ کوئی باپ اپنے بیٹے سے اور کوئی استاد اپنے شاگرد سے ایسی شفقت نہیں برتتا۔ جب شاہ ولی اللہ سترہ برس کے ہوئے تو والد بیمار ہو گئے اور مرض الموت میں انہوں نے شاہ صاحب کو بیعت وارشاد کی اجازت دے دی۔ وہ بار بار فرماتے یدہ کیدی (اس کا ہاتھ میرے ہاتھ کی طرح ہے)۔ والد صاحب کی وفات کے بعد بارہ سال تک دینی و عقلی علوم کی کتابیں پڑھیں اور پڑھائیں۔ ایسے میں ان علوم میں غور وخوض کا خوب موقع ملا۔ ایک موقع پر تحریر کرتے ہیں کہ طالب علمی ہی کے زمانے میں مضامینِ عالیہ ذہن میں آتے تھے جن میں برابر ترقی محسوس ہوتی تھی۔

اسی اثناء میں آپ کی اہلیہ کا انتقال ہو گیا۔ دوسرا نکاح سید ثناء اللہ سونی پتی کی صاحبزادی بی بی ارادت سے ہوا۔ ان سے آپ کے چار بیٹے ہوئے جن میں سے ہر ایک نے ہندوستان میں دین کی نشاۃِ ثانیہ میں اہم کردار ادا کیا۔

سفرِ حجاز اور حصولِ تعلیم کا دوسرا دور

تیس سال کی عمر میں حج کرنے کا ارادہ کیا۔ فرض کی ادائیگی، حرمین کی زیارت اور عالمِ اسلام کے گوشے گوشے سے آئے ہوئے وفود سے ملاقات اور ان کے تجربات سے فائدہ اٹھانے کی غرض سے راستے کے خطرناک حالات کے باوجود حجاز کا سفر اختیار کیا۔ حج کی ادائیگی کے بعد حرمین کے شیوخ سے علم حدیث کا گہرا ادراک حاصل کیا۔ خصوصاً آپ کے استاد شیخ ابو طاہر محمد محدث ہونے کے ساتھ ساتھ صوفیاء کے بھی معتقد تھے۔ معرفتِ الٰہی کی جستجو اور شریعت کی پابندی، دونوں کا امتزاج ان کی شخصیت کا حصہ تھا جس نے شاہ صاحب کے اوپر گہرا اثر ڈالا۔ مفتیٔ مکہ شیخ تاج الدین سے بھی استفادہ کیا۔ حرمین کے پرنور ماحول اور پاکیزہ صحبتوں نے شاہ صاحب کے دل میں یہاں مستقل رہ جانے اور مختلف ممالک سے آنے والے طالبین علم کو فائدہ پہنچانے کی خواہش بیدار کی۔ مگر ہندوستان کے خراب سیاسی و مذہبی حالات نے آپ کو بے چین کیا اور آپ نے ہندوستان

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

واپسی کا فیصلہ کیا جس میں اللہ نے خیر و برکت ڈال دی اور آپ نے واپس آ کر وہ تجدیدی اور اجتہادی کارنامہ سرانجام دیا جس کے لئے ہندوستان کے مسلم عوام خصوصاً اور تمام امہ عموماً آپ کی احسان مند ہے۔

شاہ صاحب نے حجاز سے واپس آنے کے بعد اپنے والد صاحب کے مدرسہ رحیمیہ میں درس شروع کیا۔ اس درس کی ایسی شہرت ہوئی کہ لوگ ہر طرف سے کھنچ کھنچ کر آنے لگے۔ اس وقت یہ جگہ ناکافی محسوس ہونے لگی۔ اس بات کی خبر بادشاہِ وقت محمد شاہ کو ہوئی تو اس نے اس مقصد کے لئے شاندار مکان عنایت کیا جہاں شاہ صاحب یکسوئی سے درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔

شاہ صاحب کے دور کے علمی، تہذیبی و مذہبی حالات

شاہ صاحب کے تجدیدی کارنامے کو بیان کرنے سے قبل ضروری ہے کہ اس زمانے کے حالات و واقعات کا مختصراً تذکرہ کیا جائے۔

بارہویں صدی ہجری میں تقریباً تمام عرب ممالک سلطنتِ عثمانیہ کے تحت تھے۔ سلطنت عثمانیہ میں زوال کے آثار شروع ہو چکے تھے اور ماتحت علاقوں میں اس کا انتظام ڈھیلا پڑ رہا تھا۔ خصوصاً حجاز میں اقتدار کی رسہ کشی، راستوں کی بدامنی اور بدوؤں کی غارت گری دراصل ترکوں کی حجاز کے اندرونی معاملات میں مداخلت سے گریز کی پالیسی کا نتیجہ تھی۔

دوسری طرف ایران میں صفوی خاندان کی حکومت کے خاتمے کے بعد نادر شاہ تخت نشین ہوا تو فتوحات کے شوق میں قندھار، کابل اور پشاور پر چڑھ دوڑا۔ افغانوں کو ایران سے بے دخل کر دیا۔ پھر دہلی پر قبضہ کر کے وہاں بھی خوفناک قتل عام کروایا۔ اپنی فتوحات کا دائرہ وسیع کرنے کے بعد وہ ان علاقوں کا انتظام اس قابلیت سے نہ چلا سکا جو درکار تھی۔ اس کے قتل کے بعد ایران طوائف الملوکی کی زد میں آ گیا۔ کریم خان ژند نے کچھ عرصے اطمینان سے حکومت کی۔ لیکن متعدد کمزور جانشینوں کی وجہ سے ایران میں پائیدار حکومت کی بنیاد نہ ڈالی جا سکی۔ البتہ افغانستان میں نادر شاہ کے بعد احمد شاہ ابدالی نے حکومت سنبھالی اور افغان علاقے کو جو چھوٹی چھوٹی اکائیوں پر مشتمل تھا ایک مضبوط اکائی میں تبدیل کر دیا۔ احمد شاہ ابدالی ایک عالی ہمت سالار اور قابل قدر خصوصیات رکھنے والا شریف النفس حکمران تھا۔

ادھر ہندوستان میں اورنگزیب عالمگیر کے انتقال کے بعد اس کے کمزور جانشین اس کے دور میں کئے گئے اچھے اقدامات کے اثرات کو مٹانے کے علاوہ کچھ نہ کر سکے۔ عالمگیر کے جانشین بیٹے نے شیعہ مسلک اختیار کر لیا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وہ راتوں کو جاگتا اور دن چڑھے سوتا رہتا۔ بادشاہ ایسا سست اور بے خبر تھا کہ اس کے دستخطوں کا اعتبار بھی اٹھ گیا۔ اس کے جانشین فرخ سیر کو سادات بارہہ (حسنین علی خان اور عبداللہ خان) نے پوری طرح اپنے قابو میں کر لیا۔ آخر کار اس کو قید کر دیا گیا اور وہ اسی حالت میں دنیا سے رخصت ہو گیا۔ محمد شاہ کا عہد شروع ہوا تو دہلی پر نادر شاہ کا حملہ ہو گیا۔ نا اہل بادشاہ مقابلے کی صلاحیت سے محروم تھا۔ نادر شاہ نے مغل بادشاہ سے اس کا تخت تو نہ لیا مگر بھاری تاوان وصول کیا۔ اس زمانے میں بھی ملک کے انتظام کے کرتا دھرتا سادات برادران ہی تھے۔ انکے دور کے ختم ہونے کے بعد بھی محمد شاہ کو تن آسانی کے سوا کوئی کام نہ تھا۔ ہر وقت ہاتھ میں جام لئے مدہوشی کے عالم میں پھرتا رہتا۔ وہ محل سرا کی بیگمات سے بھی زیادہ سلطنت کے حالات سے بے خبر تھا۔

اسے سلطنت کی کتنی فکر تھی اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ نادر شاہ کے دہلی میں قتل عام کے بعد شہر مردوں سے بھرا پڑا تھا۔ مکانوں پر ویرانی برستی تھی۔ محلے کے محلے جلے پڑے تھے۔ کوئی کسی کو کفن دینے والا نہ تھا۔ نادر شاہ تاوان وصول کر کے جا چکا تھا اور بادشاہ کا حال یہ تھا کہ اس واقعے کے بعد کئی دنوں تک گہری نیند سوتا رہا۔ خزانہ خالی تھا اور محاصل اور خراج کا کچھ پتہ نہ تھا۔ سپاہ تباہ حال اور خستہ تھیں۔ امیر وزیر آپس کے جھگڑوں میں پڑے تھے۔ سلطنت کیا تھی بچوں کا کھیل تماشہ تھا۔ امن و سلامتی مفقود تھی۔ خانہ جنگی کی آگ ہر طرف بھڑک رہی تھی۔ پنجاب میں سکھ اور جنوبی ہند میں مرہٹے ہندو حکومت کا پرچم اٹھائے دہلی تک آ پہنچے تھے۔ یہ ایسی مصیبت تھے کہ جہاں جاتے علاقوں کو تاراج کر کے امن و امان کو تہہ و بالا کر دیتے اور کوئی ان سے مقابلہ کرنے اور قانون کی حکمرانی قائم کرنے کے قابل نہ تھا۔

محمد شاہ کا جانشین شاہ عالم ثانی اس قدر کم ہمت انسان تھا کہ انگریزوں کی کامیابیاں دیکھ کر گھبرا گیا اور ایک معاہدے پر دستخط کر کے انگریزوں کا وظیفہ خوار ہو گیا۔ اس طرح بنگال، بہار اور اڑیسہ کے محاصل کی وصولی ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھ میں آ گئی۔

الغرض اسلامی دنیا بالخصوص برصغیر کے سیاسی حالات سخت دگرگوں تھے۔ بڑی بڑی سلطنتیں اندر سے بالکل کھوکھلی ہو چکی تھیں۔ عثمانی خلافت اور مغلیہ حکومتوں میں امراء، وزراء، صوبوں کے منتظم اور مقامی رئیس آپس ہی میں برسر پیکار تھے۔ اس طرزِ حکومت نے لوٹ مار، ظلم اور جبر کی حوصلہ افزائی کی اور رعایا میں احساس محرومی پروان چڑھنے لگا۔

ایک طرف حکومتوں کی لاپرواہی اور دوسری طرف جاہل پیروں، فقیروں، حال مست صوفیوں اور تنگ نظر اور متعصب علماء نے عوام کو یرغمال بنا رکھا تھا۔ شریعت اور اتباع سنت کے بجائے بدعات، اوہام پرستی اور اندھی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تقلید کی وجہ سے پیدا ہونے والے جمود نے معاشرے کو فکری و ذہنی صلاحیتوں سے محروم کر دیا تھا۔ سید ابوالحسن علی ندوی ہندوستان کے تمدنی و مذہبی حالات کی تصویر کشی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "کھلی ہوئی قبر پرستی، مشائخ کے لئے سجدہ، مزار اور اس کے قرب و جوار کا حرم کی طرح احترام، قبروں پر چادریں چڑھانا، منتیں ماننا، بزرگوں کے نام پر قربانیاں کرنا، مزارات کا طواف، وہاں میلہ لگانا، تہوار منانا، گانا بجانا، چراغاں کرنا اور مختصر الفاظ میں ان کو قبلہ و کعبہ اور ملجا و ماویٰ سمجھنا کوئی ایسا واقعہ اور منظر نہ تھا جس کو دیکھنے کے لئے بہت دور جانا پڑے اور بہت دیر انتظار کی ضرورت ہو۔ شیخ سدّو کا بکرا، سید احمد کبیر کی گائے، غازی میاں کے جھنڈے اور چھڑیاں، محرم کے تعزیے، غیر اسلامی تہواروں کو شان و شوکت سے منانا، بیماریوں کو دفع کرنے کے لئے ارواح خبیثہ اور بعض اوقات دیوی دیوتا کی رضا جوئی کا خوف، اولیاء و صالحین کے لئے منتیں ماننا اور قربانیاں کرنا اور اولیاء اور ان کی نیک بیبیوں کے نام سے روزے کی نیت کرنا اور ان سے اپنی حاجت روائی اور مقاصد کی تکمیل کو وابستہ کرنا، اس سلسلے میں خاص دن، خاص کھانے (بی بی کی صحنک، مخدوم صاحب کا توشہ وغیرہ) اور ان میں خاص آداب کی پابندی، یہ اور ایسے بہت سے عنوانات ہیں جن کے ماتحت توہمات، عقائدِ فاسدہ، رسومِ جاہلیت اور التزامات اور پابندیوں کا طویل سلسلہ ہے۔"

اس زمانے میں علمائے حق کا وجود بھی نظر آتا ہے بلکہ علمی ذوق رکھنے والے نیز ایسے ایسے صاحب تصوف حضرات کے نام سامنے آتے ہیں کہ ان کے تذکرے کے لئے علیحدہ مضمون کی گنجائش ہے۔ پورے عالم اسلام میں علماء سرگرمی سے درس و تدریس میں مشغول تھے اور اپنی ذمہ داریاں ادا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن ان کی یہ مساعی جو کہ زیادہ تر انفرادی سطح تک محدود تھیں اس تنزل کو نہ روک سکیں جس کا عالم اسلام شکار ہوتا جا رہا تھا۔

اس پر مستزاد یہ کہ چند علماء کو چھوڑ کر اکثر مدرسوں کے فارغ التحصیل حضرات جہاں فقہ میں اپنے مسلک کی برتری ثابت کرنے میں مصروف نظر آتے وہاں قرآن پاک کے مطالب، احادیث کے احکامات اور شریعت کی مصلحتوں پر غور و فکر کرنے اور ان پر عمل کرنے کرانے میں کسی کو دلچسپی نہ تھی۔ فقہ میں تحقیق تو گویا جرم تھی۔ عربی زبان سے لاعلمی قرآن سے لاعلمی کی وجہ بن جاتی اور عوام جن کی اکثریت فارسی اور ہندی بولنے والوں پر مشتمل

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تھی اس بات سے بے خبر تھی کہ ان کا خالق ان سے کس چیز کا مطالبہ کرتا ہے۔ جو بات خانقاہ کے بزرگ اور مدرسوں کی مفتی بتا دیتے وہی ان کے لئے حرف آخر کا درجہ رکھتی۔ ان طبقوں میں صوفی حضرات قلب پر ضربیں لگانے اور علماء کی جماعت معمولی مسائل پر اپنے امام کے مسلک کی فوقیت بتانے کے علاوہ عوام کو کچھ نہ دے پا رہے تھے۔

غرض طبقہ امراء تو عیش و نشاط میں گم عوامی مسائل سے بے فکر اور لا پرواہ تھا ہی، عوام کی اکثریت بھی احساس و شعور سے عاری اور کھوکھلی تمناؤں کی تکمیل کو زندگی کا واحد مقصد سمجھ رہی تھی۔ زوال پذیر معاشروں کے عوام و خواص احساس زیاں سے عاری ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے اوپر منڈلاتے ہوئے مصائب و آفات سے بھی لا پرواہ ہو کر تباہی کے راستے پر بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

شاہ ولی اللہ کا تجدیدی کارنامہ incomplete

ان تمام حالات و واقعات کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں ہے کہ اس وقت امت مسلمہ اور خصوصاً ہندوستان کے مسلمانوں کو ایک ایسی عہد ساز شخصیت اور مجدد کی ضرورت تھی جو مختلف شعبوں میں پیدا ہونے والے مفاسد کا نہ صرف ادراک رکھتی ہو بلکہ ان کی درستی کے کام کو جامعیت سے انجام دینے کی ہمت اور صلاحیت بھی اس میں موجود ہو۔

شاہ صاحب نے محسوس کیا کہ سب سے پہلے مسلمانوں کے عقائد کی درستگی اور ان کا قرآن سے تعلق جوڑنے کی ضرورت ہے۔ دوسری طرف حدیث کی اشاعت اور اس کی ترویج بہت ضروری ہے تاکہ لوگ دین کی اصلی روح سے واقف ہو سکیں۔ فقہ میں تقلیدِ جامد کے خلاف آواز اٹھانے اور مسلم امہ کو اپنے مسائل میں غور و فکر کی دعوت دینے کا کام بھی لائق توجہ ہے۔ معاشرے کے مختلف طبقات کو مخاطب کر کے ان کا احتساب کیا جانا چاہئے اور ان کی اصلاح کے لئے مفید مشورے بھی دینے چاہئیں۔ ان سب کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے سیاسی افق پر انتشار کے اثرات کو دور کرنے کی بھی اشد ضرورت ہے۔ ان مسائل کو ذہن میں رکھتے ہوئے شاہ صاحب نے اپنے مشن کا آغاز قرآن کریم کی طرف دعوت دینے سے کیا۔

رجوع اِلی القرآن

شاہ صاحب نے سب سے پہلے یہ بات محسوس کی کہ ہندوستان کے مسلمانوں کا مسئلہ عمومی طور پر یہ ہے کہ قرآن اور حدیث سے ان کا تعلق استوار نہیں ہے۔ دین کو سمجھنے کے لئے جو فہم درکار ہوتا ہے وہ ان میں مفقود ہے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور اس کی سب سے بڑی وجہ عربی زبان سے نا آشنائی ہے۔ چونکہ عوام کی اکثریت عربی زبان نہیں جانتی لہٰذا غلط قسم کے مولویوں اور گدی نشین صوفیوں نے انہیں جس راہ پر لگا دیا ہے یہ اس پر چل پڑے ہیں۔ ہندو تہذیب کے ساتھ رہنے کی وجہ سے مشرکانہ رسوم و رواج سے بھی ہر وقت واسطہ رہتا ہے اور جن اعمال (قبر پرستی اور اولیاء پرستی) کو عبادت سمجھ کر بجالاتے ہیں وہ صریحاً گناہ بلکہ گناہِ کبیرہ کے زمرے میں آتے ہیں۔

اس مرض کے علاج کے لئے شاہ صاحب کو سب سے کارگر نسخہ یہ سمجھ میں آیا کہ لوگوں کا تعلق قرآن کریم سے جوڑ دیا جائے تاکہ لوگ دین کی اصلیت، توحیدِ حقیقی اور شریعت کے احکامات سے خود واقف ہوسکیں۔ سفر حجاز سے واپسی کے پانچ سال بعد شاہ صاحب نے فیصلہ کیا کہ قرآن کی تعلیمات کی براہ راست اشاعت و تبلیغ کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ قرآن مجید کا فارسی ترجمہ اور اس کی اشاعت ہے۔ ہندوستان کا ہر پڑھا لکھا مسلمان اس زبان کو سمجھتا تھا۔ لہٰذا فارسی ترجمے کی بدولت قرآن کو سمجھنے، اپنے خالق سے تعلق استوار کرنے اور اس کے احکامات جاننے کے لئے نام نہاد دینی شخصیات کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ ابوالحسن علی ندوی تاریخِ دعوت و عزیمت میں شاہ صاحب کی زبان سے قرآن کے ترجمے کے محرکات بیان کرتے ہیں:

> ''یہ زمانہ جس میں کہ ہم لوگ موجود ہیں اور یہ ملک جس کے ہم باشندے ہیں اس میں مسلمانوں کی خیرخواہی تقاضا کرتی ہے کہ ترجمہ قرآن سلیس اور بامحاورہ فارسی میں بغیر اظہار فضیلت اور عبارت آرائی کے اور متعلق قصوں اور توجہات کے ذکر کئے ہوئے کیا جائے۔ تاکہ عوام و خواص یکساں طور پر سمجھ سکیں اور چھوٹے بڑے سبھی معانی قرآن کا ادراک کرسکیں۔ اس لئے اس اہم کام کا داعیہ فقیر کے دل میں ڈالا گیا اور اس کے لئے مجبور کیا گیا۔''

شاہ صاحب سے پہلے بھی چند حضرات نے ترجمے کی کوشش کی تھی۔ مگر شاہ صاحب کے مطلوبہ معیار پر پورے نہ اتر سکے۔ کیونکہ نہ تو وہ اہل زمانہ کے ذوق کے مطابق تھے اور نہ ہی زبان کی وہ روانی تھی جو قرآن کی عربی زبان کا حصہ ہے۔

قرآن کریم کا ترجمہ، اس کی ترویج اور تبلیغ کوئی سادہ اور آسان کام نہ تھا۔ اس سے دینی حلقوں میں سخت بے چینی پھیل گئی۔ اس کی دو وجوہات تھیں۔ پہلی وجہ تو یہ تھی کہ عوام کی عربی زبان سے ناواقفیت کی بناء پر دین پر اجارہ داری اور قرآن کے مطالب و مفہوم بیان کرنے کا جو ذمہ انہوں نے لے رکھا تھا (جس کی وجہ سے عوام ان سے رابطے میں رہتے اور ان کو عزت دیتے تھے) وہ ہاتھ سے جاتا دکھائی دیتا تھا۔ دوسرے ہندوستان،

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

افغانستان، ایران اور دیگر عجمی اسلامی ممالک میں یہ بات تسلیم کر لی گئی تھی کہ قرآن کے مطالعہ اور اس میں غور و فکر کے لئے ایک درجن سے زائد علوم کا سیکھنا ضروری ہے۔ اس کو عوام کی براہ راست واقفیت میں لانا فتنے کا دروازہ کھولنے کے برابر ہے۔

شاہ صاحب کے ترجمے کے آسان فہم ہونے کی وجہ سے جہاں عوام الناس میں اسے قبول عام حاصل ہوا وہاں بہت سے شدت پسند لوگ جو قرآن کے ترجمے کو گناہ کا کام سمجھتے تھے آپ کے شدید مخالف ہو گئے اور آپ پر قاتلانہ حملے کی کوشش کی گئی۔ مگر اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے آپ کو بچا لیا۔ اس راہ میں آپ کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ مختصراً یہ کہ ان ساری مخالفتوں اور مشکلات کے باوجود آپ نے جس کام کو امت کے لئے فائدہ مند سمجھا اس کے کرنے میں کسی رکاوٹ کو حائل نہ ہونے دیا۔ آپ کے بعد بہت سے آنے والوں کا کام آسان ہو گیا۔ فارسی کے علاوہ دیگر زبانوں میں بھی ترجمے ہونے لگے۔ لوگوں کے شبہات دور ہو گئے اور عوام کے لئے قرآن کو سمجھنے کی راہ کھل گئی۔

توحید پر زور

شاہ صاحب نے اندازہ کر لیا تھا کہ عوام کا ایک بڑا طبقہ اسلام کے بنیادی عقیدے توحید کی اساس سے بالکل ناواقف ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے سمجھ رکھا ہے کہ شرک کا مطلب کسی ہستی کو اللہ کے ہم پلہ یا برابر سمجھنا ہے۔ البتہ اللہ کی بعض صفات کا اس کے کسی مقبول بندے کی طرف منسوب کرنا غلط نہیں۔ گویا اللہ نے اپنی مرضی سے اپنے اختیارات بعض خاص بندوں کے سپرد کر دیئے ہیں۔ اسی لئے ایسی ہستیوں کی حد سے بڑھی ہوئی تعظیم کرنا جو عبادت کی حد کو پہنچنے لگے شرک نہیں ہے۔ آپ نے اس تصور کی مکمل نفی کی اور جگہ جگہ اپنی تحریروں میں شرک کی حقیقت اور اس کی مختلف شکلوں پر بحث کی۔ نیز یہ بھی بیان کیا کہ نبی اکرم ﷺ کی بعثت سے قبل ایام جاہلیت میں شرک کی کیا نوعیت تھی۔ اس سلسلے میں آپ نے قرآن کی آیات کے حوالے بھی دیئے۔ اپنی کتاب ''حجۃ اللہ البالغۃ'' میں لکھتے ہیں:

> ''مشرکین عرب اس کے قائل تھے کہ اللہ تعالیٰ کا آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں کوئی شریک نہیں۔ اس طرح ان دونوں کے درمیان جو اجسام واشیاء ہیں ان کی خلقت میں بھی اس کا کوئی شریک نہیں۔ نیز اہم امور کے سرانجام دینے میں بھی کسی کی شرکت نہیں۔ اس کے فیصلے کو کوئی ٹالنے والا اور اس کے حکم قطعی کو کوئی روکنے والا نہیں۔ اللہ تعالیٰ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قرآن میں فرماتا ہے۔ ''اگر تم ان مشرکین سے پوچھو کہ آسمان وزمین کو کس نے پیدا کیا تو وہ یقیناً کہیں گے کہ اللہ نے۔'' [لقمان ۲۵]

قرآن خود شہادت دیتا ہے کہ یہ مشرکین خدا کو مانتے تھے اور اس سے دعا بھی کرتے تھے۔ حقیقت میں ان مشرکین کی گمراہی اور بے دینی یہ تھی کہ ان کا اعتقاد تھا کہ کچھ فرشتے اور ارواح ہیں جو (بڑے امور کو چھوڑ کر) اپنے پرستار کے ان جزئی و ضمنی معاملات کو سنبھال لیتے ہیں اور ان کا کام کر دیتے ہیں جن کا تعلق اس کی ذات، اولاد، اموال و املاک سے ہے۔ ان کے نزدیک ان کا خدا کے ساتھ ایسا ہی تعلق ہے جیسے کسی ناز پروردہ غلام کا شہنشاہ سے اور سفارشیوں اور مصاحبوں کا باجبروت بادشاہ سے ہوتا ہے۔ شرائع الٰہی میں جو کہیں اس بات کا تذکرہ آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض کام بعض فرشتوں کے سپرد کر دیئے ہیں یا یہ کہ مقربین کی دعائیں قبول ہوتی ہیں ان جاہلوں نے اسی کو بنیاد بنا کر ان کو ایسا صاحب اختیار اور صاحبِ تصرّف مان لیا جیسے خود بادشاہ بنفس نفیس ہوتے ہیں۔ حالانکہ یہ قیاس الغائب علی الشاہد تھا اور اسی سے خرابی پیدا ہوئی''۔

اس طرح شاہ صاحب نے اپنے وعظ وارشاد اور تحریروں میں مشرکانہ عقائد کی وجہ سے پیدا ہونے والے مغالطوں اور رسوم کی جڑ پر کاری ضرب لگائی۔

علمِ حدیث اور سنّت سے تعلق

اسلام کی تاریخ کا اگر مطالعہ کیا جائے تو امت مسلمہ کے زوال کے اسباب میں ایک بڑا سبب یہ رہا ہے کہ سنت اور حدیث سے مسلمانوں کے تعلق اور واقفیت میں بتدریج کمزوری آ گئی۔ یہی حال گیارہویں صدی ہجری میں ہندوستان کے مسلمانوں کا تھا۔ علم حدیث اور سنت کی واقفیت تو برائے نام رہ گئی اور کتب فقہ، اصول فقہ، ان کی شرحیں اور حکمت اور فلسفے کی کتابوں کا بہت زور ہو گیا۔ نتیجتاً بدعات اور منکرات نے برصغیر کے مسلمانوں کی زندگیوں میں پوری طرح جگہ بنالی۔ اس میں روحانی فلسفیوں نے بھی بھرپور حصہ ڈالا۔ ان سے مخصوص مہینوں کی نمازیں اور دعائیں منسوب کی جاتی تھیں جن کا حدیث سے کوئی ثبوت نہیں ملتا تھا۔ صلوٰۃ غوثیہ، صلوٰۃ معکوس، غیر اللہ کے نام پر روزہ اور عرس، فاتحہ کے نام پر طرح طرح کے جشن اور میلے اس کی چند مثالیں ہیں۔

ہندوستان میں علمِ حدیث کی طرف عدم توجہی کی بڑی وجہ برصغیر کی عربوں کے بجائے عجمی ممالک سے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قربت اوران کے اثرات کوقبول کرناتھی ۔ یہ حقیقت ہے کہ عجمی ممالک میں اسلام کے سادہ سرچشموں قرآن اور حدیث پر کم اور دیگر علوم مثلاً فلسفے ،فقہ وغیرہ پر زیادہ زور رہا۔عرب جہاں بھی گئے وہ علم حدیث کواپنے ساتھ لیتے گئے اوران کے زیراثر علاقوں میں حدیث کی درس واشاعت کا سلسلہ برابر جاری رہا۔جبکہ سندھ میں عربوں کی حکومت ختم ہونے کے بعدغزنوی اورغوری سلاطین کا دورشروع ہوا۔اس زمانے میں ہندوستان کے لوگوں میں شعر وشاعری،علم نجوم، ریاضی اوردینی علوم میں فقہ اوراصول فقہ کارواج بڑھ گیا۔حرمین کا سفراختیارکرنے والے علماء وہاں جاکرعلم حدیث کی لذت، افادیت اورحقیقت سے آشنا ہوتے تھےاور واپس آکراس کی نشرو اشاعت اورتبلیغ میں لگ جاتے ۔انہی میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا نام آتا ہے جنہوں نے حدیث کی ترویج کے لئے بہت محنت کی ۔لیکن ان کے جانشین اس سلسلے کوجاری نہ رکھ سکے ۔

شاہ ولی اللہ نے شدت سے اس بات کومحسوس کیا۔ان کی تحریروں میں بھی یہ بات جھلکتی نظرآتی ہے۔ حجۃ اللہ البالغہ کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

’’علومِ یقینیہ کا معتمدعلیہ اورسرمایہ وسرتاج اورفنونِ دینیہ کی اصول واساس علم حدیث ہے جس میں افضل المرسلین ﷺ کےقول وفعل یاکسی بات پرآپ کےسکوت ورضامندی کا ذکر خیر ہوتا ہے۔ اس لئے یہ حدیثیں تاریکی میں روشن چراغ، رشد و ہدایت کا سنگ میل اور بدرکامل کا حکم رکھتی ہیں۔ جوشخص ان پرعمل پیرا ہوتا ہےاوران کی نگہداشت کرتا ہےتو وہ ہدایت یافتہ اورخیرکثیر سےفیض یاب ہوتا ہےاورجو بدبخت اعراض وروگردانی کرتا ہے وہ گمراہ اور ہلاک ہوتا ہےاوراپناہی نقصان کرتا ہے۔اس لئے کہ آنحضرت ﷺ کی زندگی امرونہی، انذاروتبشیر اورنصیحت وتذکیر سے معمور ہےاورآپ کی حدیثوں میں یہ چیزیں قرآن ہی کی طرح یااس سےمقدار میں کچھ زیادہ ہیں۔‘‘

آپ نے اس حقیقت کا کھلم کھلا اظہار کیاکہ علم حدیث کا حصول اورسنت پرعمل کوئی معمولی درجے کی نیکیاں شمارنہیں ہوتیں، بلکہ ان کوکمترسمجھنے والا دنیاوآخرت کی ہلاکت میں پڑجائے گا۔ایک جگہ فرماتے ہیں:

’’میں ان طالبانِ علم سے کہتا ہوں جو اپنے آپ کو علماء کہتے ہیں کہ اللہ کے بندو! تم یونانیوں کےعلوم کےطلسم اورصرف ونحو کےمعانی کے دلدل میں پھنس کررہ گئے،تم نے سمجھ لیا کہ علم اسی کا نام ہے۔ حالانکہ علم یا تو کتاب اللہ کی آیتِ محکم ہے یارسول اللہ ﷺ کی سنتِ ثابتہ ۔تمہیں چاہئے تھا کہ تمہیں یہ یادرہتا کہ رسول اللہ ﷺ نے کیسے نماز پڑھی،آپ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کیسے وضو فرماتے تھے، قضائے حاجت کے لئے کیسے جاتے، کیسے روزہ رکھتے تھے، کیسے حج کرتے تھے اور کیسے جہاد کرتے تھے۔ آپ کا انداز گفتگو کیا تھا، حفظِ لسان کا طریقہ کیا تھا، آپ کے اخلاق عالیہ کیا تھے، پھر تم آپ ﷺ کے اسوہ اور آپؐ کی سنت پر عمل کرتے۔ تمہیں چاہئے تھا کہ تم دین کے احکام و مسائل سیکھتے۔ باقی سیر و سوانح اور صحابہ اور تابعین کی وہ حکایات جو آخرت کا شوق پیدا کریں تو یہ ایک تکمیلی چیز اور امرِ زائد ہے۔ اس کے مقابلے میں تمہارے مشاغل اور جن باتوں پر تم پوری توجہ صرف کرتے ہو وہ آخرت کے علوم نہیں ہیں، دنیاوی علوم ہیں۔''

حرمین کے سفر سے شاہ صاحب کو علم حدیث کی اہمیت کا اور بھی اندازہ ہو گیا اور اس کی محبت اور شوق میں بہت اضافہ ہو گیا۔ جب آپ اپنے استاد شیخ ابو طاہر مدنی سے رخصت ہونے لگے تو فرمایا:

''میں نے جو کچھ پڑھا تھا سب بھلا دیا۔ سوائے علم حدیث کے۔''

واپس ہندوستان پہنچے تو اس علم کی ترویج کے لئے ایسے کوشاں ہوئے کہ آپ کا مدرسہ رحیمیہ ہندوستان کے طول و عرض میں حدیث کی سب سے بڑی درسگاہ بن گیا۔ اس کے علاوہ علومِ حدیث پر کتابوں کی تصنیف کا کام بھی کیا۔ مصفّٰی (موطا امام مالک کی شرح) اور مسوّٰی (موطا کی عربی شرح) نیز شرح تراجم ابواب صحیح بخاری اور مجموعہ رسائلِ اربعہ قابل ذکر ہیں۔

فقہ اور علمِ حدیث میں تطبیق کی کوشش

شاہ صاحبؒ کے مجدّدانہ کارناموں میں سے ایک حدیث و فقہ میں مطابقت پیدا کرنا اور اجتہاد و تقلید کے درمیان نقطہ اعتدال اختیار کرنا تھا۔ شاہ صاحب کے زمانے میں فتاویٰ اور روایات فقیہ کا رواج بڑھ گیا تھا اور فقہی مسائل کو کتاب و سنت کی کسوٹی پر پرکھنے کا رواج کم ہو گیا تھا۔ ہر فقہ کے پیروکار اپنے آپ کو سو فیصدی درست سمجھتے تھے اور فقہی مسائل میں اپنے نظریئے کو درست ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے تھے۔ ہندوستان چونکہ حنفی فکر کے زیر اثر تھا لہٰذا یہاں کے علماء اپنے مسلک کی برتری، نیز امام ابوحنیفہ کی فضیلت کا بیان کرتے نظر آتے اور دیگر مسالک کی اہمیت اور آئمہ کی خدمات کو یکسر نظر انداز کر دیتے۔ امام ابوحنیفہ کی تقلید نہ کرنے والے کو گویا فاسق سمجھا جاتا تھا۔ ایک طرف یہ انتہاء تو دوسری طرف ایک قلیل گروہ ان لوگوں کا بھی تھا جو تقلید اور پیروی کو مطلق حرام سمجھتے تھے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شاہ صاحب کے حرمین کے سفر نے ان کے اندر وسعتِ نظر اور وسعتِ قلب کی خصوصیات کو خاص کر جلا بخشی۔ فقہ کے چاروں مسالک سمجھنے اور جانچنے کا بھرپور موقع ملا۔ آپ امام ابوحنیفہ کے اجتہاد اور استنباط کے، امام مالک کی عظمت اور موطا کی صحت کے، امام شافعی کی دقیق النظری کے اور امام احمد بن حنبل کے علمِ حدیث کے بہت قائل ہیں۔ ان کا اعتراف آپ کی تحریروں میں صاف نظر آتا ہے۔ آپ نے واضح طور پر بیان کیا کہ مذاہبِ اربعہ کے اختیار کرنے میں بڑی مصلحت ہے اور ان چاروں کو بالکل نظرانداز کر دینا فساد پھیلانے کے مترادف ہے۔ البتہ اپنے فقہی مذہب پر اس شدت سے اصرار کہ اسے مستقل دین کا درجہ دیا جانے لگے، قابل قبول نہیں۔ لکھتے ہیں:

> ''سب کو معلوم ہے کہ استفتاء اور افتاء کا سلسلہ عہد نبوی سے لے کر برابر چلتا رہا ہے اور ان دونوں میں کیا فرق ہے کہ ایک آدمی ہمیشہ ایک سے فتویٰ لیتا ہے یا کبھی ایک سے فتویٰ لیتا ہے کبھی دوسرے سے۔ ایسی حالت میں کہ اس کا ذہن بالکل صاف ہے، اس کی نیت سلیم ہے اور وہ صرف اتباع شریعت چاہتا ہے، یہ بات کیسے جائز نہیں؟ جبکہ کسی فقیہ کے بارے میں ہمارا یہ ایمان نہیں ہے کہ اللہ نے اس پر آسمان سے فقہ اتاری اور ہم پر اس کی اطاعت فرض کی ہے۔''

آگے لکھتے ہیں:

> ''اگر ہمیں رسول اللہ ﷺ کی جن کی اطاعت کو اللہ نے ہم پر فرض کیا ہے کوئی حدیث قابلِ وثوق سند سے پہنچے جو اس مجتہد یا امام کے فتوے کے خلاف ہو اور ہم اس حدیث کو چھوڑ دیں اور اس ظنی طریقے کی پیروی کریں تو ہم سے بڑھ کر ناروا طریقہ اختیار کرنے والا کون ہے اور کل ہمارا خدا کے سامنے کیا عذر ہوگا۔''

آپ نے یہ بھی محسوس کیا کہ ایک عرصے سے عالم اسلام میں اجتہاد کا دروازہ بند کر لیا گیا ہے جس کی وجہ سے فقہ میں جمود نظر آتا ہے اور مدون شدہ فقہ نئے زمانے اور حالات کے مسائل کے حل کے لئے ناکافی ہے۔ علماء کی خاموشی اور اجتہاد سے اعراض نے معاشرے میں گھٹن پیدا کر دی ہے۔ چنانچہ آپ نے اجتہاد کو فرضِ کفایہ بتایا۔ اس لئے کہ اللہ کے احکامات کو جاننے اور ہر زمانے میں اس پر عمل کرنے کے لئے کافی معلومات اور تحقیق درکار ہوتی ہے۔ اگر اس کا دروازہ بند کر دیا جائے تو نئے زمانے کے مسائل میں گمراہی اختیار کرنے کا الزام علمائے وقت پر آئے گا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تصنیفی خدمات

شاہ صاحب نے قلم سے جہاد کرنے کی متقدمین کی روایت کو برقرار رکھا۔ اس میدان میں آپ نے وہ کارنامے سرانجام دیئے جن کی مثال ماضی میں کم کم ملتی ہے۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی نے آپ کی ۵۰ سے زائد کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ ہم آپ کی تین معرکۃ الآ راء تصنیفات کا تذکرہ کریں گے جنہوں نے اسلامی علوم کی تاریخ میں گہرے نقش چھوڑے۔

۱۔ حجۃ اللہ البالغۃ

شاہ صاحب کی سب سے اہم اور مشہور کتاب ''حجۃ اللہ البالغۃ'' ہے جس میں اسلام کی تعلیمات کا ایسا جامع تصور اور ایسا مربوط بیان ہے جو بہت کم دینی تصنیفات میں نظر آتا ہے۔ ایمانیات، عبادات، اخلاق، معاملات، سیاست اور احسان کو ایسے ربط اور تناسب کے ساتھ پیش کیا گیا ہے کہ وہ ایک ہار کے موتی اور ایک زنجیر کی کڑیاں معلوم ہوتی ہیں۔ یہ کام صرف وہی شخص انجام دے سکتا ہے جس کو بیک وقت تمام علومِ دینیہ پر عبور ہو۔ اس کتاب میں آپ نے اللہ تعالٰی کے احکامات کی حکمتوں، مصلحتوں اور اسباب کو اس خوبصورتی سے بیان کیا ہے کہ ایک سوچنے سمجھنے والے حق پرست انسان کی تسلی کا پورا سامان اس میں موجود ہے۔ کتاب کی ابتداء میں اللہ کی طرف سے انسانوں کی ہدایت کا بندوبست اور انبیاء کی بعثت کے تذکرے ہیں۔ اس کے علاوہ انسان کے اعمال کے دنیا و آخرت میں مرتب ہونے والے اثرات بھی زیرِ بحث لائے گئے ہیں۔ اس کے بعد شاہ صاحب نے دینی تعلیمات کو انسانی زندگی کے باہمی روابط کے سیاق و سباق میں سمجھانے کے لئے ان مباحث کا تذکرہ کیا ہے جن کی پابندی سے ایک صحت مند معاشرہ اور ایک صالح تمدن وجود میں آتا ہے۔ اس طرح آپ کی کتاب آنے والے عقلیت پسند دور کی پیش بندی کے طور پر لکھی گئی معلوم ہوتی ہے جس میں دین و مذاہب کے باہمی تعلق اور دنیاوی و اخروی دونوں کامیابیوں کے حصول پر بھرپور نظر ڈالی گئی ہے۔

دین کی بنیاد پر پروان چڑھنے والے معاشرے کی تصویر پیش کرتے ہوئے آپ نے ارتفاقات کی اصطلاح استعمال کی جس سے مراد افراد کے تعاون اور اشتراکِ عمل سے معتدل شہری زندگی کے قیام کے لئے نفع مند تدبیریں ہیں۔ آپ نے ثابت کیا ہے کہ اگر معاشی، تعلیمی اور حکومتی سطح پر ان افراد کا زور ہو جائے جن کی اخلاقیات پر گہری نظر اور عمل نہ ہو تو اس کا اثر تہذیب و تمدن اور انسانوں کے باہمی تعلقات پر بہت برا پڑتا ہے۔ تمدن و معاشرے میں زوال کے اسباب اور انسانی معاشروں اور تہذیبوں کے عروج و زوال سے متعلق ایسے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حقائق بیان کئے ہیں جن کی نظیر نہیں ملتی ۔ خصوصی طور پر گذشتہ تہذیبوں جن میں ایرانی اور رومی تہذیبیں سرفہرست ہیں کے زوال کی وجوہات تفصیل سے بیان کی ہیں ۔ الغرض عقائد، عبادات، معاملات، احسان، مقامات، ارتفاقات، تدبیرِ منزل، خلافت، قضاء، جہاد، آداب معاشرت، تہذیبوں کا عروج وزوال اور آخری دور کے فتنوں کے تفصیلی تذکرے نے اس کو ایسی جامع کتاب بنا دیا ہے جو شرعی احکام کی حکمتیں بتا کر نہ صرف ذہنی شکوک رفع کرتی ہے بلکہ عملی زندگی (چاہے وہ انفرادی ہو یا اجتماعی) میں سعادت کے حصول کے ذرائع اور طریقوں سے بھی روشناس کراتی ہے ۔

۲ - ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء

شاہ صاحب کی دوسری بڑی تصنیف ''ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء'' ہے ۔ اپنی اس کتاب میں آپ نے اسلام کے اجتماعی نظام اور اس سے بڑھ کر اسلام میں خلافت کی حیثیت ومقام اور خلفائے راشدین کی خلافت پر قرآن سے استدلال کیا ہے ۔ یہ وہ کارنامہ ہے جس کو اس تفصیل سے انجام دینے والے آپ پہلے شخص تھے ۔ اس سے قبل بھی اس موضوع پر چند ایک رسائل لکھے گئے ، لیکن وہ موضوع کی اہمیت اور اس کی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے ناکافی تھے ۔ اسلام میں سیاستِ الٰہیہ اور خلافت علیٰ منہاج النّبوۃ کا تصور جتنا ہمہ گیر اور وسیع ہے اس حساب سے اس موضوع پر بہت کم قلم اٹھایا گیا ہے ۔

شاہ صاحب نے واضح کیا کہ اللہ کے قانون پر مبنی خلافت وامارت کیوں ضروری ہے ۔ خلافت جیسے مشکل موضوع پر قلم اٹھانا اور اس کو مقاصدِ شریعت کی روشنی میں آسان انداز میں پیش کرنا شاہ صاحب کا ہی کمال تھا ۔ یہاں ہم ایک مختصر اقتباس پیش کرتے ہیں جس سے اندازہ ہوگا کہ یہ معرکۃ الآ راء کتاب آج بھی لائق توجہ ہے :

> '' خلافت اس عمومی سربراہی اور ریاستِ عامہ کا نام ہے جو اقامتِ دین کے کام کی تکمیل کے لئے وجود میں آئے ۔ اس اقامتِ دین کے دائرہ کار میں علومِ دینیہ کا احیاء، ارکان اسلام کا قیام، جہاد اور اس کے متعلقات مثلاً لشکروں کی تربیت، جنگ میں حصہ لینے والوں کا مال غنیمت میں حق، نظام قضاء کا اجراء، حدود کا قائم کرنا، مظالم وشکایات کا ازالہ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرض کی ادائیگی شامل ہے اور یہ سب آنحضرت ﷺ کی نیابت اور نمائندگی میں ہونا چاہیے ۔''

شاہ صاحب نے خلافت کا مجموعی تصور اور اس کی حیثیت بیان کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ خلافتِ راشدہ کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اثبات میں ایسا استدلال کیا ہے جو آپ کے تمام تر علمی پائے اور بصیرت کے باوجود توفیقِ الٰہی سے القائی علم معلوم ہوتا ہے۔ آپ نے ثابت کیا کہ دورِ نبوی کے بعد خلفائے راشدین نے اسلامی اصول و تعلیمات کو کس طرح عملی شکل دی اور انسانی زندگی اور معاشرے پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوئے۔ اس طرح آپ نے اس تاثر کو زائل کرنے کی کامیاب کوشش کی کہ اسلام کو اس کی اصل شکل میں نہ کبھی نافذ کیا گیا اور نہ ہی نافذ کیا جا سکے گا۔ آپ نے شیعہ حضرات کو خاص طور سے اس کا ذمہ دار ٹھہراتے ہوئے واضح کیا کہ اللہ تعالیٰ کا ایمان لانے والوں سے یہ قرآنی وعدہ کہ وہ ان کو ملک کا حاکم بنا دے گا خلفائے راشدین کے زمانے میں پورا ہو چکا ہے۔ فرماتے ہیں:

> ''ایسا نہیں ہے جیسے اثنا عشری حضرات کہتے ہیں کہ خدا کو جو دین پسند ہے وہ ہمیشہ مستور اور مستخفی رہتا ہے اور اسی بناء پر ائمہ اہلِ بیت نے ہمیشہ تقیہ سے کام لیا اور ان کو اپنے دین کے کھلم کھلا اعلان کی کبھی قدرت حاصل نہیں ہوئی'' ولیمکننّ لھم دینھم الذی ارتضی لھم'' (ان کے لئے اللہ تعالیٰ اس دین کو قوت و غلبہ عطا فرمائیگا، جس کو اس نے ان کے لئے پسند کر لیا ہے)۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ دین خدا کا پسندیدہ اور منتخب دین نہیں جس کا زمانۂ خلافت میں اظہار نہ کیا جا سکے''۔

آگے اس وعدے کے ظہور کا وقت دورِ نبوت سے متصل قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں: ''استخلاف اور تمکین فی الارض کے وعدے کا ظہور انہی مہاجرینِ اولین اور نزولِ آیتِ استخلاف کے وقت موجود رہنے والے حضرات کے ذریعے ہوا، اور اگر یہ لوگ خلیفہ نہیں تھے تو اس وعدے کا ظہور ہی نہیں ہوا اور نہ قیامت تک ہونے والا ہے''۔

اس کتاب کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ اس میں آپ نے اسلام کے سیاسی و تمدنی حالات کی تبدیلی کے ساتھ ذہنی، علمی اور اخلاقی تبدیلیوں کا بھی ذکر کیا ہے جو مسلم معاشرے میں وقوع پذیر ہوتی رہیں۔ نبی اکرم ﷺ اور خلفائے راشدین کے بہترین دور کے بعد فتنوں کے ظہور اور اس سے متعلق احکامات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ یہ انداز اپنے اندر ایک نیا پن رکھتا تھا، کیونکہ اس سے قبل کی تصنیفات میں عموماً واقعات کا تذکرہ بغیر ان کی وجوہات کے کیا جاتا تھا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۳-التفہیمات الالٰہیہ

شاہ صاحب کی ایک اور کتاب ''التفہیمات الالہیۃ'' کا تذکرہ خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔اس کتاب میں آپ نے سلاطینِ اسلام، امراء، وزراء، سپاہیوں اور فوجیوں، اہل صنعت وحرفت، مشائخ کی اولاد، غلط کار علماء، دین میں تنگی پیدا کرنے والے واعظوں اور تارک الدنیا زاہدوں سے الگ الگ خطاب کر کے ان کی اصلاح احوال کے لئے نہ صرف یہ کہ ان کا احتساب کیا ہے بلکہ مرض کی تشخیص کے ساتھ ساتھ علاج بھی تجویز کیا ہے۔آپ نے امت سے عمومی خطاب کے علاوہ رسومِ معاشرہ کی تطہیر پر بھی بہترین مشورے دیئے ہیں۔

فہمِ قرآن کے طالبوں کے لئے آپ کی کتاب ''فوز الکبیر'' بہت مفید ہے۔اس میں قرآن مجید کے مضامین ومقاصد، اس کے طرزِ اسلوب کی خصوصیت اور فہم قرآن سے متعلق نکات کو جامع انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

زمانۂ انتشار میں قائدانہ کردار

تاریخ اسلامی یہ ثابت کرتی ہے کہ مسلمان قوم نے کسی ایسی شخص کو مجدد اور مصلح اعظم کے درجے پر فائز نہیں کیا جو ان کے اجتماعی معاملات میں براہ راست دلچسپی نہ رکھتا ہو اور ان کی اصلاح کے لئے اس کا کوئی کردار سامنے نہ آئے۔مختلف تخصصات (Specialisation) کی بناء پر مقبول ہو جانے والے افراد بھی ان افراد کے درجے پر نہیں پہنچ سکتے جو اسلام کی ہمہ جہتی دعوت کے پیغام پر لبیک کہنے والے اور اس کی مختلف النوع ذمہ داریوں کو محسوس کر کے جان کھپا دینے والے ہوں۔

ہندوستان کی سیاسی تاریخ پر تبصرہ پچھلے اوراق میں گذر چکا ہے۔مختصر یہ کہ بارھویں صدی کا ہندوستان ناخلف، عیاش اور کمزور مغلیہ حکمرانوں اور مختلف گروہوں کی چھاپہ مار کارروائیوں کی وجہ سے سخت انتشار اور طوائف الملوکی کا شکار تھا۔مرہٹوں کی طاقت اٹک سے جزیرہ نمائے دکن کے پچھلے سرے تک پھیلی ہوئی تھی۔ان کی ہنگامہ آرائیوں اور لوٹ مار کے شکار ہندو مسلمان سب تھے۔دوسری طرف سکھ تھے جن کے گرو کے قتل کے بعد اس کے بیٹے گوندرائے نے باپ کے انتقام میں سکھوں کو فوجی طاقت اور جنگجو قوم بنا دیا۔انہوں نے پنجاب میں وسیع پیمانے پر راہزنی کی وارداتیں شروع کیں۔سلطنت مغلیہ کے آپس کے جھگڑوں سے فائدہ اٹھا کر انہوں نے اپنی طاقت میں اضافہ کیا اور لوٹ مار اور دہشت گردی کی مثالیں رقم کرتے دہلی تک جا پہنچے۔

تیسری قوت جاٹوں کی تھی جنہوں نے حالات کا فائدہ اٹھا کر اپنے اقتصادی مقاصد کے حصول کے لئے ایک انتشار انگیز تخریبی قوت کی شکل اختیار کر لی تھی۔وہ کبھی آگرہ، کبھی دہلی اور کبھی ہندوستان کے کسی اور شہر میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لوٹ مار مچاتے۔ راستے میں آنے والے علاقوں کو وقتاً فوقتاً تاراج کرنا ان کا معمول بن گیا۔

دہلی کے باشندے سب سے زیادہ ان جنگجو قوموں کے زیرِ عتاب رہتے۔ اسی زمانے میں نادر شاہ نے بھی دہلی پر حملہ کر کے رہی سہی کسر نکال دی۔ شریف گھرانوں میں مصائب کے ہجوم کے باعث اجتماعی خودکشیوں تک کی نوبت آ گئی۔ شاہ صاحب جیسے حساس آدمی کی طبیعت ان حالات میں کیسے پرسکون رہ سکتی تھی۔ چنانچہ یہ جاننے کے باوجود کہ سلطنت مغلیہ کا مزاج عیش و عشرت، خودغرض مصاحبین اور کوتاہ نظر مشیران کی وجہ سے بالکل فاسد ہو گیا ہے اصلاح کی کوشش کے طور پر ایک خط مغل بادشاہ کو لکھا جس میں اسے حالات کی بہتری سے متعلق مفید مشورے دیئے۔ دوسری طرف آپ کی نگاہ امیر الامراء نجیب الدولہ پر پڑی جو اعلیٰ کردار اور سپاہیانہ و قائدانہ صلاحیتوں کی وجہ سے آپ کو اصلاحِ سلطنت کے لئے موزوں معلوم ہوا۔ شاہ صاحب نے ان کو متعدد خطوط تحریر کئے اور انتشار پسند طاقتوں سے مقابلے کے لئے انکو بار بار متوجہ کیا۔ اس کے ساتھ ہی آپ نے والیٔ قندھار احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان لانے کی خاص کوششیں شروع کیں۔ احمد شاہ ابدالی بارہویں صدی کے ممتاز ترین مسلمان قائدین میں شمار کیا جاتا ہے جس نے منتشر افغانوں کی شیرازہ بندی کے علاوہ بہترین قانون سازی کی۔ وہ سپہ گری، مکارمِ اخلاق اور شرافتِ نفس کی صفات کا جامع تھا۔ آپ کی نگاہ احمد شاہ ابدلی پر اس لئے پڑی کہ آپ نے محسوس کیا کہ ہندوستان کے مستقبل کو لاحق خطرات کو دور کرنے کے لئے ایک ایسے عسکری قائد اور منتظم سپاہ کی ضرورت ہے جو اسلام کی تقویت اور ملک کی حفاظت کے پیش نظر ان تخریبی قوتوں سے نجات دلا کر عنانِ اقتدار یہیں کے قدیم حکمران خاندان کے کسی اہل اور باصلاحیت فرد کے حوالے کر کے واپس چلا جائے۔

آپ نے نجیب الدولہ سے خطوط لکھوانے کے علاوہ خود بھی ایک خط تحریر کیا۔ جس میں احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان کے حالات کی تفصیل بیان کی اور صورتحال کا مقابلہ کرنے کے لئے اس کی مدد طلب کی۔ اپنے خط میں آپ تحریر فرماتے ہیں:

> ''ہم بندگانِ الٰہی حضور ﷺ کو شفیع بناتے ہیں اور خدا کے نام پر التماس کرتے ہیں کہ ہمت کو اس جناب متوجہ فرما کر مخالفین سے مقابلہ کریں تاکہ خداتعالیٰ کے یہاں بڑا ثواب جناب کے اعمال نامے میں لکھا جائے اور مجاہد فی سبیل اللہ کی فہرست میں نام درج ہو اور دنیا میں بے حساب غنیمتیں ملیں اور سلطان دستِ کفار سے خلاصی پا جائیں۔''

آخرکار آپ کی کوششیں رنگ لائیں۔ ۱۱۷۴ ہجری میں پانی پت کے مقام پر احمد شاہ ابدلی کی افغان فوجوں اور مرہٹوں میں فیصلہ کن جنگ ہوئی۔ اس میں مرہٹوں کو شکست فاش ہوئی۔ ان کی طاقت یکسر ختم ہو گئی۔ مرہٹوں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے علاوہ سکھوں سے بھی معرکہ ہوا۔ احمد شاہ ابدالی نے لدھیانے کے مقام پر انہیں تاریخی شکست دی اور وقتی طور پر ان کا زور کم ہوگیا۔ البتہ بعد میں انہوں نے پھر پر پُرزے نکال لئے۔

اس وقت اگر مغلیہ سلطنت میں تھوڑی سی بھی جان ہوتی تو وہ جنگِ پانی پت کے نتائج سے فائدہ اٹھا کر حالات کو اپنے حق میں کرسکتی تھی۔ مگر وائے افسوس مردہ قوم اور اس کے بے صلاحیت قائدین مستقبل میں آنے والے چیلنجوں کا ادراک نہ کرسکے اور بہت جلد ایسٹ انڈیا کمپنی پورے ہندوستان کو غلام بنانے میں کامیاب ہوگئی۔

شاہ صاحب کے کارناموں کی فہرست ادھوری رہ جائے گی اگر آپ کے ہونہار، سعادت مند اور باصلاحیت بیٹوں کا تذکرہ نہ کیا جائے جنہوں نے آپ کی تربیت اور تعلیمات سے فیضیاب ہوکر پورے ہندوستان میں نورِ خداوندی کے چراغ جلائے۔ شاہ عبدالعزیز، شاہ عبدالقادر، شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالغنی کی مساعی اور خدمات کو دیکھا جائے تو اتنا کہنا ہی کافی ہوگا کہ ہندوستان کی حد تک خیر و برکت کے تقریباً سب سلسلے صاحبزادگان کے توسط سے شاہ ولی اللہ سے جاملتے ہیں۔

وفات

شاہ صاحب نے ۶۲ برس کی عمر میں محرم الحرام کی آخری تاریخ کو ۱۱۷۶ ہجری میں انتقال فرمایا۔ دلی دروازے کے بائیں جانب ''منہدیاں'' کے مقام پر تدفین ہوئی۔

شاہ صاحب کے معمولات اور خصائص

شاہ صاحب کی زندگی کے معمولات کی تفصیل کسی کتاب میں نہیں ملتی۔ البتہ آپ کے بیٹے شاہ عبدالعزیز کی یادداشتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے والد قوی الحافظہ تھے۔ وقت کا استعمال بہت خوبصورتی سے کرتے تھے۔ اشراق کے بعد سے دوپہر تک ایسے بیٹھتے کہ نہ زانو بدلتے اور نہ ہی کھجلاتے۔ طبیعت میں بچپن سے نظافت و لطافت تھی۔ آپ خود حقائق و معارف کی تحریر میں مصروف رہتے۔ جس چیز کا کشف ہوجاتا اس کو تحریر کرلیتے۔ ہر فن میں ایک ایک ماہر آدمی تیار کردیا تھا۔ اس فن کے طالب علموں کو اسی کے سپرد کردیتے تھے۔ آپ کو قدرت کی طرف سے حق و باطل میں تمیز کا خصوصی ملکہ عطا ہوا تھا۔ آپ کی ایک اور خوبی یہ تھی کہ آپ بظاہر متصادم احکامات کے درمیان تطبیق پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ وسیع النظری کی بناء پر مختلف طبقات اور ان کے نظریات میں باہم مطابقت تلاش کرنا آپ کے لئے آسان ہوگیا تھا۔ مختلف علوم پر عبور نے آپ کو متقدمین اور معاصرین میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ممتاز مقام دلا دیا۔ آپ کی تحریریں آپ کی سوچ اور شخصیت کی عکاسی کرتی ہیں۔ ان کی زبان سہل، تحریر مضبوط اور جامع ہے۔ وہ تعصب اور منفی طرزِ تخاطب سے مبرا نظر آتی ہیں۔ آپ نے ہر طبقے کے افراد کو دین کی راہ میں حائل مسائل و مشکلات سے متعلق مفید مشورے دیئے ہیں۔ آپ کی تحریروں کے پیچھے خلوص اور اصلاح کا جذبہ واضح انداز میں کارفرما نظر آتا ہے۔

آخر میں مولانا مودودیؒ کے الفاظ میں ہم شاہ صاحب کو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔ مولانا شاہ صاحب کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ایک طرف ان کے زمانے اور ان کے ماحول کو اور دوسری طرف ان کے کام کو جب آدمی بالمقابل رکھ کر دیکھتا ہے تو عقل دنگ رہ جاتی ہے کہ اس دور میں اس نظر، ان خیالات اور اس ذہنیت کا آدمی کیسے پیدا ہو گیا۔ فرخ سیر، محمد شاہ رنگیلے اور شاہ عالم کے ہندوستان کو کون نہیں جانتا۔ ایک تاریک زمانے میں نشو و نما پا کر ایسا آزاد خیال مفکر و مبصر منظر عام پر آتا ہے جو زمانہ اور ماحول کی ساری بندشوں سے آزاد ہو کر سوچتا ہے۔ تقلیدی علم اور صدیوں کے جمے ہوئے تعصّبات کے بند توڑ کر ہر مسئلہ زندگی پر محققانہ و مجتہدانہ نگاہ ڈالتا ہے اور ایسا لٹریچر چھوڑتا ہے جس کی زبان، انداز بیان، خیالات، نظریات، مواد، تحقیق اور نتائجِ مستخرجہ کسی چیز پر ماحول کا کوئی اثر دکھائی نہیں دیتا۔''

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شیخ محمد بن عبدالوہابؒ

بارھویں صدی ھجری میں حجاز اور نجد میں احیائے دین کے لئے علمی سیاسی اور مجاھدانہ کردار ادا کرنے والے رھنما

تعارف

آپ کا نام محمد اور لقب شیخ الاسلام تھا۔

سلسلۂ نسب یہ ہے: محمد بن عبدالوہاب بن سلیمان۔

آپ کا نسب بنوتمیم کے قبیلے الیاس پر رسول اللہ ﷺ سے جاملتا ہے۔آپ کے دادا شیخ سلیمان عینیہ شہر کے فقیہ ترین شخص تھے اور پورے نجد میں اپنے علمی پائے کی وجہ سے ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔علمی مرتبے کے ساتھ ساتھ تواضع، شجاعت، سخاوت اور حسنِ اخلاق کی دولت سے مالا مال تھے۔عوام النّاس کے علاوہ امراء اور حکام بھی ان کے ایسے معتقد تھے کہ مصالحت کرانے اور حریفوں کے درمیان فیصلہ کرانے کے لئے انہی سے رجوع کیا جاتا کیونکہ ان کی شخصیت غیر متنازعہ اور سب کے نزدیک قابلِ توقیر تھی۔

ان کے انتقال کے بعد ان کے بیٹوں شیخ عبدالوہاب اور شیخ ابراہیم نے ان کے تدریسی و تعلیمی کام کو جاری رکھا اور شیخ عبدالوہاب (محمد کے والد) نے تو ایسی شہرت پائی کہ انہیں رئیس العلماء کا منصب ملا۔آپ کے والد شیخ عبدالوہاب علمِ فقہ، حدیث، تفسیر، علومِ قرآن اور عربی ادب میں ممتاز حیثیت کے مالک تھے۔حنبلی فقہ کے مطابق فتویٰ دیا کرتے تھے۔مسجد کے علاوہ گھر بھی طالب علموں سے بھرا رہتا تھا اور ان کے گھر پر عوام و خواص کا جمگھٹا دیکھنے میں آتا، یہاں تک کہ عینیہ کے حاکم اور اس کے صاحبزادے بھی ان سے رجوع کرتے تھے۔

ولادت

۱۱۱۵ ہجری بمطابق ۱۷۰۳ء میں شیخ عبدالوہاب کے ہاں محمد کی ولادت ہوئی۔ایک ایسا باسعادت بچہ جس سے قدرت کو بڑے کام لینے تھے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بچپن اور تعلیم و تربیت

محمد نے جس گھر میں آنکھ کھولی وہاں کے علمی ماحول اور اخلاقِ عالیہ نے آپ کے کردار پر بہترین اثر ڈالا۔ خود محمد آغازِ طفولیت ہی سے ذہانت اور قوتِ حافظہ میں ممتاز تھے۔ دس برس کی عمر میں قرآن مجید کے حفظ سے فارغ ہوئے۔ عینیہ میں مدارسِ عربیہ نہ تھے، بچوں کو تحصیلِ علم کے لئے دوسرے شہروں میں جانا پڑتا تھا، لیکن چونکہ آپ کا اپنا گھر ہی بہترین مکتب تھا، لہٰذا والدِ محترم سے فقہ حنبلی کی کتابیں پڑھیں اور بچپن ہی میں حدیث وتفسیر کی کتابوں کا کثرت سے مطالعہ کیا۔ حدیث کی کتابوں سے احادیث کو حفظ کرنے کا خاص اہتمام کرتے تھے۔ آپ کے والدا پنے ہونہار بیٹے کی ذہانت اور استعداد سے بہت خوش ہوتے، ان کا بیان ہے کہ محمد کی تدریس کے دوران وہ خود بھی اپنے ہونہار بچے کی ذہانت اور وسعتِ معلومات سے مستفید ہوتے۔ نو عمری کے باوجود وہ آپ کو امامت کے لئے آگے بڑھا دیتے۔ کم سنی ہی میں آپ کی شادی ہوگئی۔ محض بیس برس کی عمر میں آپ ایک عالم کی حیثیت سے پہچانے جانے لگے۔

دعوت کا آغاز

محمد کی طبیعت میں بچپن ہی سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر (نیکی کا حکم اور برائی کی ممانعت) کا رجحان بہت زیادہ تھا۔ قرآن اور حدیث کے مطالعے نے آپ کو اس نتیجے تک پہنچایا کہ جس معاشرے میں آپ رہ رہے ہیں اس کا ماحول وہ ہرگز نہیں ہے جو اللہ کو مطلوب ہے بلکہ دورِ جاہلیت کی بنیادوں پر تعمیر کردہ اس ماحول میں سوائے شرک، بدعات اور خرافات کے اب کچھ نہیں بچا۔ زندگی کے تمام شعبوں میں فساد رونما ہو چکا ہے۔ چنانچہ آپ نے اصلاحِ احوال کا عزم کرلیا۔ جہاں بھی کوئی کام دین کے اصولوں کے خلاف ہوتا دیکھا وہیں آواز بلند کی۔ اس سلسلے میں جب آپ نے دیگر علماء سے رجوع کیا تو چند ایک نے دبی زبان میں حمایت کی۔ مگر اکثریت نے سخت مخالفت کی اور آپ کی کوششوں کے خلاف طوفان کھڑا کر دیا۔ محض آپ کے خاندان اور چند شیدائیوں نے ساتھ دیا، باقی پورا شہر مخالف ہوگیا۔ مخالفت کے اس طوفان میں آپ کے والد نے عینیہ شہر سے منتقل ہونے کا ارادہ کیا اور اپنے معتقدین اور خاندان کی معیت میں عینیہ چھوڑ کر ۱۱۳۹ ہجری میں حریملا کی طرف چل دیئے۔

محمد اس ہجرت کے لئے قطعاً تیار نہ تھے۔ آپ نے والد کا ساتھ نہیں دیا اور عینیہ میں تنِ تنہا دعوت کا کام سرانجام دیا۔ علماء، امراء اور عوام مل کر بھی آپ کو چپ نہ کرا سکے۔ حال یہ ہوتا کہ ایک چوبیس پچیس سالہ نوجوان جس کے ساتھ محض گنے چنے ساتھی تھے، بازاروں اور گلی کوچوں میں توحید کی دعوت دیتا نظر آتا اور ایک جمِ غفیر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس کے گرد جمع ہوتا جو الزامات، طعن و تشنیع اور بالآخر گالی گلوچ پر اتر آتا۔ یہ سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ جب محمد کو یقین ہو گیا کہ عینیہ میں رہنا کسی بھی طرح سے مفید نتائج کا حامل نہیں رہا تو کسی اور جگہ جانے سے پہلے مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ جانے کا قصد کیا تاکہ حج کی سعادت سے بہرہ مند ہونے کے ساتھ ساتھ وہاں کے علماء سے مشورہ کیا جائے اور ان کی صحبت میں مزید علم حاصل کیا جائے۔

سفرِ حج اور حجاز سے علمی استفادہ

مکہ مکرمہ پہنچنے کے بعد نہ صرف یہ کہ مقامی علماء سے ملاقاتیں کیں بلکہ عالمِ اسلام سے فریضہ حج کے لئے آنے والے علماء سے بھی خصوصی نشستوں کا اہتمام کیا۔ علمائے کرام کے سامنے آپ نے اپنی دعوت کے بنیادی نکات پیش کئے۔ انہوں نے آپ سے سوال جواب کئے اور بالآخر آپ کے کام کی تائید کی۔ اس ہمت افزائی اور اپنی دعوت کے حق ہونے کے یقین نے آپ کو مزید پرعزم کر دیا۔

فریضہ حج کی ادائیگی سے فارغ ہو کر آپ مدینہ منورہ چلے آئے اور مشہور عالم عبداللہ بن ابراہیم بن سیف کے حلقہ میں شریک ہونے لگے۔ دورانِ ملاقات آپ نے شیخ ابنِ سیف سے ان تمام حالات کا تذکرہ کیا جو آپ پر گزر چکے تھے اور اپنی دعوت اور مشن سے انہیں آگاہ کیا تو وہ بہت خوش ہوئے اور آپ کو شیخ محمد حیات سندھی کی خدمت میں لے گئے جو مدینۃ الرسول میں حدیث و سنت کے مُسلّم استاد تھے۔ اب تو دیگر علماء تک آپ کا احوال پہنچ گیا اور وہ بھی بدعات اور خرافات کے ازالے کے لئے آپ کے مشن کے حامی بن گئے۔

اس تمام عرصے میں ایک طالب علم کی حیثیت سے حدیث کے علم میں مہارت حاصل کی اور اپنے اساتذہ سے اسناد حاصل کیں۔ اس کے علاوہ فقہ حنبلی کی کتابوں کی اجازت بھی مل گئی۔

قیامِ حجاز کے دوران شیخ محمدؒ اس نتیجے پر پہنچے کہ اگرچہ یہ دو شہر اسلامی مزاج اور شعائر کے آئینہ دار ہیں، پھر بھی اطراف میں ایسی حرکات نظر آتی ہیں جو صریحاً شریعت کے اصولوں سے متصادم ہیں۔ ایک بار آنحضرت ﷺ کے روضۂ مبارک کے سامنے کھڑے تھے۔ آس پاس نظر ڈالی تو ایک ہجوم کو قبرِ مبارک کی طرف رخ کر کے نبی اکرم ﷺ سے فریاد رسی کے لئے ہاتھ اٹھائے ہوئے دیکھا۔ قبرِ اطہر کے پاس جاہلوں کی سی حرکتیں دیکھ کر آپ سے ضبط نہ ہو سکا۔ لوگوں کو وضاحت کے ساتھ زیارت کی شرعی حیثیت بیان کی اور خلافِ شرع حرکات سے منع کیا۔ اتنے میں آپ کے استاد علامہ سندھیؒ بھی آ پہنچے۔ فوراً ان سے صورتحال بیان کی اور پوچھا کہ لوگوں کے یہ افعال کیسے ہیں؟ علامہ سندھی نے جواب میں یہ آیت تلاوت فرمائی:

ان ھٰؤلآء متبر ماھم فیه وباطل ما کانوا یعلمون

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ترجمہ:۔ یہ لوگ جس طریقے کی پیروی کررہے ہیں وہ تو برباد ہونے والا ہے اور جو عمل وہ کررہے ہیں وہ سراسر باطل ہے۔

غرض امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے جس کام کا بیڑا آپ اٹھا چکے تھے، اس کی ادائیگی میں آپ کہیں نہیں چوکے۔ یہاں تک کہ مدینہ منورہ میں روضۂ رسول کے سامنے کھڑے ہوکر اپنے استاد کی موجودگی میں بھی اس فرض کو انجام دیا۔ مدینہ سے رخصت ہوتے وقت ایک بار پھر اپنے احباب، رفقاء اور اساتذہ کے سامنے اس عزم کو دہرایا کہ طاغوتی قوتوں کو شکست دینے اور شرک و بدعات کے قلع قمع کے لئے ہر قسم کی کوشش جاری رکھیں گے۔ سب نے آپ کو اس مشن کی کامیابی کے لئے دعائیں دیں اور آپ روانہ ہوگئے۔

شیخ محمد بن عبدالوہابؒ کے دور کے حالات

شیخ محمد بن عبدالوہاب شاہ ولی اللہ کے ہم عصر تھے۔ اس زمانے کے عالمِ اسلام کے مجموعی حالات کا تذکرہ کسی حد تک پہلے گذر چکا ہے۔ یہاں ہم عرب خصوصاً نجد کے علاقے کے حالات کا مختصراً جائزہ لیں گے۔

بارہویں صدی کا عرب دوسرے اسلامی ممالک کی طرح بنیادی طور پر سلطنتِ عثمانیہ کے ماتحت تھا۔ عثمانی سلطنت نے اپنے زیرِ انتظام علاقوں کو داخلی خودمختاری دی ہوئی تھی۔ ہر علاقے کے سیاسی و مذہبی حالات کے لحاظ سے وہاں کے مقامی باشندوں کو عثمانی نمائندے کی حیثیت دی جاتی تھی۔ حجاز اور نجد میں ترک اندرونی معاملات میں امکانی حد تک دخل اندازی سے گریز کرتے تھے۔ اس کی وجہ عربوں کے ساتھ مروت و لحاظ کا خصوصی معاملہ تھا۔ حجاز (مکہ، مدینہ اور قرب و جوار کے علاقے) میں عثمانی سلطنت کا نمائندہ امیرِ حجاز یا شریفِ مکہ کہلاتا تھا۔ شرفائے مکہ سادات میں سے تھے۔ لیکن امارت کے لئے ان کے خاندان میں باہمی کشمکش کا سلسلہ برقرار رہتا اور عثمانی خلفاء ان معاملات سے چشم پوشی کرتے۔

یہ حالات حجاز تک محدود نہ تھے بلکہ ملحقہ علاقے نجد کا بھی یہی حال تھا۔ جغرافیائی طور پر علاقے کی باقاعدہ تقسیم نہ تھی۔ البتہ شہر القصیم اور العارض کے علاقے بنیادی اہمیت کے حامل تھے۔ العارض (جس کا مشہور شہر ریاض آج بھی سعودی حکومت کا پایہ تخت ہے) میں شیخ محمدؒ بن عبدالوہاب کی جائے پیدائش عینیہ اور دعوت کا مرکز درعیہ تھے۔ یہ علاقہ نجد کے قلب کی حیثیت رکھتا ہے۔ سیاسی وحدت نہ ہونے اور چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹے ہونے کی وجہ سے قبائل کے درمیان اقتدار کے لئے رسہ کشی خانہ جنگیوں کی صورت اختیار کرگئی تھی اور پورے نجد کا علاقہ سیاسی ابتری کا شکار تھا۔

مذہبی اعتبار سے نجد بارہویں صدی ہجری میں ضلالت و گمراہی کا مرکز بنا ہوا تھا۔ دینِ اسلام کی بنیادی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تعلیمات یعنی توحید اور رسالتِ محمدی ﷺ کے پیغامات سے دوری اس قدر بڑھ گئی تھی کہ دورِ جاہلیت کے تمام شعار اپنائے جا چکے تھے۔ شرک، بت پرستی، بدعات وخرافات کے مجموعے کا نام ہی گویا اسلام تھا۔ بنیادی عقائد میں تبدیلی آ چکی تھی، جن چیزوں کو اسلام مٹانے کے لئے آیا تھا وہی دین کی اساس بن کر رہ گئی تھیں۔ قبروں، درختوں اور چٹانوں سے دعائیں کی جاتیں، ان سے مرادیں مانگی جاتیں اور ان پر جانوروں کو ذبح کیا جاتا۔ صحابہ میں حضرت زید بن خطابؓ اور ضرار بن ازورؓ کی قبریں بدعتوں کی نمائش گاہ بنی ہوئی تھیں۔

الفداء قصبے میں کھجور کا ایک درخت جس کا نام فحال تھا، اس کی زیارت اور عبادت کے لئے دور دراز سے مرد وزن آتے تھے۔ اس کے آگے سجدے کرتے، اپنی حاجات اور خواہشیں اس کے سامنے بیان کی جاتیں۔ بیماری سے شفایابی، روزی میں کشادگی، شادی بیاہ اور اولاد کے لئے خصوصی دعائیں مانگی جاتیں۔ منتوں اور مرادوں کے دھاگوں اور رسیوں کی کثرت سے درخت کی شاخیں نظر نہ آتی تھیں۔ اسی طرح درعیہ کے پہاڑ کے دامن میں ایک غار تھا جہاں لوگوں کا ہجوم رہتا۔ یہ جگہ بنت الامیر کی قبر کی حیثیت سے مشہور تھی۔ یہاں کا طواف کیا جاتا اور دعائیں مانگی جاتیں۔ اس کا پس منظر یہ تھا کہ بنت الامیر ایک روز کسی کام سے نکلی اور اسی پہاڑ کے دامن سے گزری تو چند اوباش نوجوانوں نے ناپاک عزم سے اس کی طرف بڑھنا چاہا۔ اس لڑکی نے ان سے نجات پانے کے لئے اس دلسوزی سے دعا کی کہ ایک پتھر کا سینہ چاک ہو گیا اور وہ اس میں داخل ہو گئی۔ اسی بناء پر لوگ یقین رکھتے تھے کہ وہ غیر معمولی لڑکی مرنے کے بعد بھی مصیبتوں کو دور کرنے کی طاقت رکھتی ہے۔

اسی طرح خرج کے علاقے میں ایک ولی کی قبر لوگوں کی توجہ کا مرکز تھی۔ اس ولی کے بارے میں مشہور تھا کہ نابینا ہونے کے باوجود وہ تنِ تنہا دور دراز کے سفر کیا کرتا اور باوجود اس کے کہ اس کے پاس بے تحاشہ دولت تھی، کوئی چور ڈاکو اس سے غرض نہ رکھتا اور نہ ہی کوئی درندہ یا جانور اسے نقصان پہنچاتا۔ اس کی موت کے بعد لوگوں نے اس کی قبر کو عقیدتوں کا مرکز بنا لیا۔ نذر، نیاز اور پوجا پاٹ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

یہ صورتحال ان علاقوں سے ہی مخصوص نہ تھی بلکہ نجد کے اکثر علاقے کسی خاص قبر، خانقاہ یا مسجد کی تقدیس کی وجہ سے مشہور تھے جہاں شرکیہ اعمال وافعال اپنے عروج پر تھے۔ نیک وبد فال کے لئے لوگ پرندوں کو اڑاتے۔ مستقبل کا حال معلوم کرنے کے لئے بات بات پر نجومیوں سے مشورے لئے جاتے۔ دورِ جاہلیت کے مشہور نجدی کاہن ابلق سعدی کے پیروکار ہر طرف پھیلے ہوئے تھے۔ یہ لوگ دینِ اسلام کی پابندیوں سے آزاد ہو کر اپنی خواہشات کے مطابق زندگی گذارنے کے حامی تھے۔

یہ تو دینی حالات تھے، سیاسی اور معاشرتی حالات بھی کم سنگین نہ تھے۔ ایک مرکزی طاقت کا کنٹرول پورے علاقے میں نہ ہونے کے سبب ہر شہر ایک الگ یونٹ کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ قصبوں اور شہروں کا باہمی تعلق

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

منقطع ہو چکا تھا۔ قبائلی اور نسبی بنیاد پر حاکم چنے جاتے تھے جو تعصب اور اندھی عصبیت میں عدل و انصاف کے تقاضوں کو پسِ پشت ڈال دیتے تھے۔ طاقت ور اپنے سے کمزور کو نیچا دکھانے کے لئے ہر قسم کے ہتھکنڈے استعمال کرتا تھا۔ خونِ ناحق، عورتوں کی عصمت دری اور لوٹ مار روزمرہ کا معمول تھا۔

ان حالات میں جرائم پیشہ عناصر کو مزید کھلی چھٹی مل گئی۔ نجد کے جنگلات میں سفر کرنے والے لوگ چوروں اور ڈاکوؤں کے حملوں سے محفوظ نہ تھے۔ ان کے گروہ درختوں کے جھنڈوں اور غاروں میں چھپ کر تجارتی قافلوں کو لوٹتے۔ رات کے اندھیرے کے علاوہ دن دھاڑے ڈاکے ڈالے جاتے۔ کوئی پوچھنے والا اور منع کرنے والا نہ تھا۔ قانون کی عدم موجودگی نے افراتفری کو جنم دیا۔ خانہ جنگی اور بدحالی عام تھی۔ غرض پورے معاشرے کا امن و سکون غارت ہو چکا تھا۔

سماجی سطح پر لوگوں کا ذوق دورِ جاہلیت کے طرز کا ہوگیا تھا۔ جانوروں کی سی زندگی گذارنے کا چلن تھا۔ فارغ اوقات میں لوگ ٹولیوں کی شکل میں بیٹھ کر قصے، کہانیاں، روزمرہ کے حالات اور جنگوں کے واقعات دہراتے۔ مدارس ناپید اور مسجدیں غیر آباد تھیں۔ علم کے حصول کا شوق بالکل مفقود تھا۔ دفتروں میں عربی کے بجائے ترکی زبان رائج تھی۔ جب ماحول اس قدر آلودہ ہو تو اخلاقِ فاسدہ کا جنم لینا کوئی انوکھی بات نہیں ہوتی۔ بنیادی اخلاقی اوصاف اور انسانی اقدار جن کا دورِ جاہلیت میں بھی خیال رکھا جاتا تھا وہ بھی ناپید ہو چکے تھے۔

معاشی حالات کی دگرگونی کا یہ حال تھا کہ آئے دن کے ڈاکے اور رہزنی کی وارداتوں نے تجارت کا جنازہ نکال دیا تھا۔ درآمدت اور برآمدات کا سلسلہ منقطع ہو چکا تھا۔ ملک خود غذائی اجناس پیدا کرنے کی صلاحیت سے محروم تھا۔ زرعی زمینوں پر ناجائز قبضے نے زراعت پیشہ طبقے کی حوصلہ شکنی اس حد تک کر دی تھی کہ کاشتکاری کی آمدنی کو ناکافی تصور کرتے ہوئے وہ بھی چوروں اور ڈاکوؤں سے مل گئے تھے اور ملک میں عام قحط کی صورتحال تھی۔ بھوک کی شدت سے تنگ آئے ہوئے عوام خود بھی ناجائز طریقے سے روٹی حاصل کرنے پر آمادہ ہو جاتے۔

مسعود عالم ندوی صاحب اس انحطاط کا ذکر کرتے ہوئے اپنی کتاب ''محمد بن عبدالوہاب، ایک مظلوم اور بدنام مصلح'' میں امریکی اہلِ قلم اسٹاڈرڈ کے بیان کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایک غیر مسلم بھی ان حالات پر تعجب و افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے'' قرآن کریم کی تعلیم نہ صرف پسِ پشت ڈال دی گئی تھی بلکہ اس کی خلاف ورزی بھی کی جاتی تھی ...... یہاں تک کہ مقاماتِ مقدسہ (مکہ و مدینہ) بداعمالیوں کا مرکز بن گئے تھے اور حج جس کو رسول ﷺ نے فرائض میں داخل کیا تھا بدعات کی وجہ سے حقیر ہو گیا تھا۔ فی الجملہ اسلام کی جان نکل چکی تھی ......اگر محمد ﷺ پھر دنیا میں آتے تو اپنے پیروؤں کے ارتداد اور بت پرستی پر بیزاری کا اظہار فرماتے۔''

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دعوت کا از سرِ نو آغاز اور مخالفت

محمد بن عبدالوہاب نے حج سے واپسی کے بعد نجد سے ہوتے ہوئے بصرہ کا رخ کیا۔ وہاں شیخ محمد المجموعی سے تعلقات استوار کئے۔ بصرہ پہنچ کر آپ کو اندازہ ہوا کہ یہاں کے حالات بھی نجد سے کچھ مختلف نہیں تھے۔ لوگ شرک میں گھٹنوں گھٹنوں تک ڈوبے ہوئے تھے۔ شیخ محمد بن عبدالوہابؒ نے یہاں بھی نتائج سے بے پرواہ ہوکر لوگوں کو ان شرکیہ حرکتوں سے باز رہنے کی تلقین کی۔ یہ وعظ ونصیحت لوگوں کو پسند نہ آیا اور وہ مخالف ہو گئے۔ آپ نے بھی مخالفت کی ذرا پرواہ نہ کی۔ جواباً انہوں نے آپ سے آپ کا سامان اور کتابیں چھین لیں اور مار پیٹ کر کے شہر سے باہر نکال دیا۔

سخت گرمی کے موسم میں شیخ محمد بن عبدالوہابؒ بصرہ اور زبیر شہر کے درمیانی راستے میں بے ہوش ہو گئے۔ ہوش آیا تو بھوک اور پیاس سے نڈھال تھے۔ اللہ تعالیٰ سے مصیبت سے نکلنے کی دعا مانگی۔ اسی اثناء میں زبیر شہر سے ایک آدمی آتا دکھائی دیا۔ اس نے جو آپ کی یہ حالت دیکھی تو آپ کو پانی پلایا اور اپنے ساتھ سوار کر کے گھر لے آیا۔

وہاں کچھ دن آرام کیا اور شام کا ارادہ باندھا۔ جب اپنی حالت پر غور کیا تو دیکھا کہ اسباب کچھ نہ تھے۔ چنانچہ نجد کے شہر حریملا کا رخ کیا، جہاں آپ کے والد مقیم تھے۔ اس دوران آپ کے والد کا کیا ردعمل تھا اس کے بارے میں دو مختلف آراء ہیں۔ ایک رائے یہ ہے کہ وہ آپ کے نظریات کے پرزور حامی تھے اور آخر وقت تک آپ کی حمایت میں سرگرم رہے۔ دوسری رائے یہ ہے کہ والد نے آپ کی دعوتی مہم سے سردمہری دکھائی۔ اپنے والد کا احترام آپ نے ملحوظِ خاطر رکھا اور گو آپ کی دعوتی مہم حریملا میں بھی جاری رہی مگر اس کی رفتار سست تھی۔

ان دونوں آراء کے درمیان تطبیق کی شکل یہ پیدا کی جاسکتی ہے کہ اگرچہ آپ کے والد آپ کے خیالات اور نظریات سے تو متفق تھے مگر وہ اپنے علمی پائے اور عزت کی وجہ سے باقاعدہ کھلی مخاصمت کے قائل نہ تھے۔ صورتحال جو بھی ہو، شیخ حق بات کی تبلیغ سے باز آنے والے نہ تھے۔ چنانچہ یہاں بھی مخالف علماء اور ان کے معتقدین آپ کی جان کے درپے ہو گئے۔ لیکن آپ کے والد کے احترام کے سبب کوئی قدم نہ اٹھا سکے۔

۱۱۵۳ ہجری میں والد کے انتقال کے بعد جہاں شیخ کے مشن میں مزید تیزی آ گئی اور نوجوانوں کی ایک جماعت آپ کے زیرِ اثر توحید کے پیغام سے آشنا ہوگئی وہیں مخالفین کو کھلی چھٹی مل گئی۔ اب تو باپ کا سایہ بھی سر پر نہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے آپ کے خلاف اپنی کارروائیاں تیز کر دیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حریملا شہر میں آلِ رباع کے دو قبیلے بیک وقت اقتدار پر قابض تھے۔ دونوں میں شدید مخاصمت تھی اور باہم لڑائیاں معمول تھیں۔ دونوں قبائل نے ایک دوسرے سے مقابلے کے لئے غنڈے پالے ہوئے تھے جن کی بدکرداریوں سے کوئی محفوظ نہ تھا۔ شیخ نے جب اس کے خلاف آواز اٹھائی تو انہیں اس کے سواء کوئی چارہ نظر نہ آیا کہ آپ کا کام ہی تمام کردیا جائے۔ چنانچہ چند غنڈے رات کی تاریکی میں آپ کے گھر میں داخل ہونے کے لئے دیوار کے سائے میں چھپ گئے۔ اسی دوران ایک قافلہ شہر میں داخل ہوا۔ اس نے انہیں چوروں کا گروہ سمجھ کر شور مچادیا اور انہیں بھاگنا پڑا۔

شیخ کو بہت جلد اصل واقعے کی اطلاع ہوگئی۔ حریملا کی زمین بھی آپ پر تنگ ہوچکی تھی۔ ان تمام ایذا رسانیوں کو برداشت کرنے کے باوجود صبر وعزیمت کا یہ پیکر اپنے مشن سے ایک انچ پیچھے ہٹنے کو تیار نہ ہوا۔ ایک بار پھر اللہ کی راہ میں حریملا چھوڑ کر عینیہ کی طرف جانے کا ارادہ کیا۔ وہاں کے حاکم سے خط وکتابت کے بعد آپ کو اندازہ ہوا کہ وہ آپ کی دعوت سے متاثر ہے اور آپ کو اپنے پاس رکھنے پر آمادہ ہے۔

عینیہ کی طرف ہجرت اور حکمتِ عملی میں تبدیلی

شیخ اب اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ مشرکانہ ماحول میں خالص توحید کی تعلیم دینا اور صدیوں کے بگڑے ہوئے اخلاق کی اصلاح کا بیڑا اٹھانا کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ آپ خود تو اپنے اوپر ہر سختی برداشت کرنے کو تیار تھے لیکن کسی تحریک کو پنپنے کے لئے حالات کی سازگاری کی ضرورت اس حد تک ضرور ہوتی ہے کہ وہ اپنا وجود برقرار رکھنے میں کامیاب ہوجائے۔ اس کے لئے اگر علاقے کی حکومت مددگار ہو تو مقاصد جلد اور باآسانی حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ چنانچہ عینیہ کے حاکم عثمان بن معمر کو آمادہ پاکر آپ وہاں منتقل ہوگئے تاکہ یکسوئی سے دعوت کے کام پر توجہ دے سکیں۔

عثمان بن معمر حاکم عینیہ نے آپ کا اچھا استقبال کیا۔ آپ نے اس کے سامنے اپنی دعوت پیش کی، مشن کے مقاصد کو واضح کیا اور اس مہم میں اس کا تعاون طلب کیا۔ آپ نے کہا ''اگر تم لا الہ الا اللہ کی امداد کو آمادہ ہو تو آجاؤ، میں امید کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تم کو غالب کردے گا اور نجد اور اہلِ نجد کی باگ تمہارے ہاتھوں میں ہوگی۔'' عثمان نے اپنے تعاون کا یقین دلایا اور اپنی بھتیجی کو آپ کے نکاح میں دے دیا۔

شیخ نے ایک بار پھر دعوت کے کام کا آغاز پورے جوش وخروش سے کیا۔ اہلِ عینیہ کے دل بھی حق کے لئے کھل گئے اور آپ کو خاطر خواہ کامیابی نصیب ہوئی۔ زبانی دعوت کے بعد اب عملی اقدام کے طور پر آپ نے بدعات کے اڈوں کو ختم کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ سب سے پہلے ان درختوں کو جلایا گیا جن کی عقیدت عوام کے دلوں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

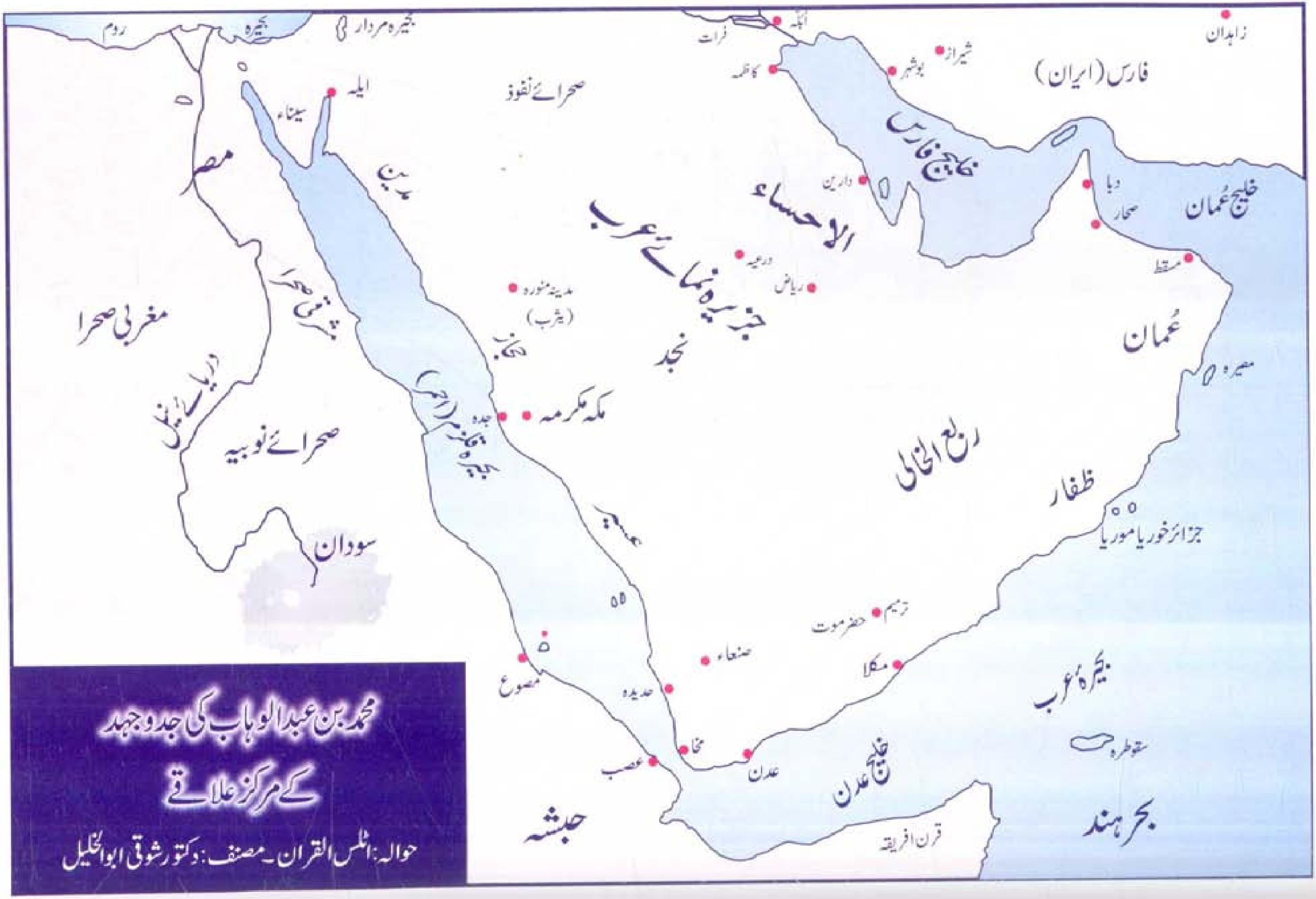

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں گھر کر چکی تھی۔ جب اس درخت کی باری آئی جس کے تقدس کے لوگ بہت قائل تھے تو شیخ نے مقررہ تاریخ کا اعلان کر کے لوگوں کو دعوت دی تا کہ وہ اس کا انجام دیکھ سکیں۔ مقررہ وقت پر شیخ خود نکلے اور جس طرح نبی کریم ﷺ نے بیت اللہ میں رکھے ہوئے بتوں کو پاش پاش کرتے ہوئے کہا تھا:

جآء الحقُّ وزھق الباطل انّ الباطل کان زھوقاً

ترجمہ: حق آ گیا اور باطل مٹ گیا، بے شک باطل مٹنے کے لئے ہے۔

آپ نے بھی سنت نبوی ﷺ کی اتباع میں یہی آیت پڑھی اور درخت اکھاڑ دیا۔ عقیدت مند مرد اور عورتیں اس انتظار میں تھے کہ دیکھیں اس جرمِ عظیم کی پاداش میں شیخ پر کیا عذاب نازل ہوتا ہے۔ مگر جب شیخ اور آپ کے ساتھی محفوظ رہے تو اندھی عقیدت کا جادو ان کے سر سے اتر گیا۔

نبی اکرم ﷺ کے صحابی زید بن خطابؓ جو حضرت عمرؓ کے بھائی بھی تھے، ان کی شہادت جنگِ یمامہ میں ہوئی تھی۔ ان کے نام سے مقامِ جبیلہ میں ایک قبر تھی۔ لوگ کثرت سے اس کی زیارت کے لئے جمع ہوتے اور تبرک کے طور پر جسم کو قبر کے ساتھ چپکاتے تھے، پھر وہیں اعتکاف کے لئے بیٹھ جاتے۔ شیخ نے اس کے انہدام کا فیصلہ کیا تو آپ کے معتقدین یہاں تک کہ خود والئ عینیہ عثمان بھی پس و پیش کرنے لگا۔ مگر آپ فیصلہ کر چکے تھے۔ اس واقعے کو ابن بشر نے اس طرح بیان کیا ہے کہ شیخ نے عثمان کو مخاطب کر کے کہا ''آؤ اب اس قبہ کو منہدم کریں جس کی بنیاد باطل پر رکھی گئی ہے اور جس کی وجہ سے لوگ راہِ ہدایت سے بھٹک گئے ہیں۔'' عثمان نے کہا ''آپ ہی اسے ہدم کریں۔'' شیخ نے فرمایا کہ ''ہمیں اہلِ جبیلہ سے خطرہ ہے، کہیں وہ ہمارے درپے آزار نہ ہو جائیں۔ آپ کی موجودگی کے بغیر میں ہدم نہیں کر سکتا۔''

اس پر عثمان چھ سو آدمیوں کے ساتھ چلا۔ قریب پہنچنے پر اہلِ جبیلہ نے بزور روکنے کا ارادہ کیا، لیکن جب انہوں نے عثمان کی طرف سے پوری تیاری دیکھی تو ہٹ گئے۔ اب عثمان نے شیخ سے کہا کہ ''ہم قبہ کو نہیں چھو سکتے۔'' اس پر شیخ نے خود ہتھوڑا لیا اور اپنے ہاتھ سے قبہ کو گرا کر زمین کے برابر کر دیا۔ اس رات کو اطراف کے جاہل بے چینی کے ساتھ انتظار کر رہے تھے کہ دیکھیں اس ناروا اقدام سے شیخ پر کیا مصیبت آتی ہے۔ لیکن جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ جب صبح ہوئی تو لوگ بہت مایوس ہوئے اور اہلِ حق کی ہمت بندھی۔ نیز کمزوروں کے ایمان میں تازگی آئی۔

ان واقعات کے تواتر نے لوگوں کی آنکھیں کھول دیں اور انہیں شیخ کی باتوں کا یقین ہونے لگا۔ تحریک زور پکڑنے لگی۔ لوگ دور دراز سے سفر کر کے شیخ کی خدمت میں حاضر ہونے لگے اور طلبِ علم کا شوق پیدا ہو گیا۔ عثمان کے تعاون سے ان کے قیام و طعام کا بندوبست کیا گیا اور ان کے لئے وظائف بھی مقرر کئے گئے۔ شیخ نے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عثمان کو نماز باجماعت کے احیاء کی تاکید کی اور اس کا اس قدر اہتمام کیا گیا کہ نہ پڑھنے والوں کے لئے سزائیں تجویز کی گئیں۔ حکام طرح طرح کے ٹیکس وصول کرتے تھے۔ شیخ نے ناجائز ٹیکسوں کا خاتمہ کر کے صرف زکوٰۃ کا اجراء کیا۔

عینیہ سے دربدری اور قتل کی کوشش

ابھی آپ اقامتِ دین کی کوششوں میں مصروف تھے کہ ایک واقعے نے حالات کا رخ ایک بار پھر پلٹ دیا۔ مسعود عالم ندوی اس واقعے کو اس طرح بیان کرتے ہیں ''ہونے والی بات تھی۔ ایک عورت، شادی شدہ گناہ کی مرتکب ہوئی اور اس نے شیخ کے سامنے گناہ کا اعتراف بھی کرلیا۔ بار بار جرح کرنے پر بھی وہ اپنے اقرار سے نہ پھری۔ مجبوراً شیخ نے سنگ ساری کا حکم دیا۔ عثمان نے مسلمانوں کی ایک جماعت کے ساتھ یہ فرض انجام دیا۔ سب سے پہلا شخص جس کا ہاتھ پتھر کی طرف بڑھا وہ عثمان تھا۔''

اس واقعے نے تو پورے علاقے کو ہلا کر رکھ دیا۔ برائی کے خوگر وہ لوگ جو دن رات بدافعالیوں کے مرتکب ہوتے تھے اس صورتحال کو کیسے برداشت کرتے۔ فوراً امیر احساء (علاقے کا نام) کے پاس پہنچے اور اسے تمام حالات سے آگاہ کیا۔ احساء کا امیر بہت طاقتور تھا اور اسے اپنی قوت پر بڑا ناز تھا۔ مزاجاً رنگیلا اور آوارہ ہونے کے سبب یہ ماجرا سن کر تن فن ہوگیا اور والیٔ عینیہ عثمان کو (جس کے باغات اس کے علاقے میں تھے) دھمکی آمیز انداز میں خط کے ذریعے تنبیہ کی ''یا تو شیخ کو قتل کر دیا جائے ورنہ جلاوطن کر کے ہمارے شہر روانہ کر دیا جائے، بصورتِ دیگر تمہیں ہمارے ہاں سے جو کچھ ملتا ہے وہ سب روک دیا جائے گا۔''

ادھر عینیہ کے حاکم کا کیا ردعمل ہوا اس پر دو مختلف روایات ملتی ہیں۔ ایک کے مطابق شیخ نے جب دیکھا کہ عثمان میں امیر احساء سے مقابلے کی طاقت نہیں ہے تو صلاح ومشورے کے بعد وہاں سے منتقل ہونے کا فیصلہ کیا۔ دوسری روایت کے مطابق عثمان نے خود شیخ کو شہر چھوڑنے کا پیغام دیا۔ اس پیغام کے نتیجے میں شیخ ریگستانِ عرب کی سخت گرمی میں اس حال میں نکلے کہ زبان پر یہ آیات جاری تھیں:

ومن يتق الله يجعل له مخرجا، ويرزقه من حيث لايحتسب [الآية]

ترجمہ: جو اللہ سے ڈرتے ہوئے کام کرے گا اللہ تعالیٰ اس کے لئے مشکلات سے نکلنے کا کوئی راستہ پیدا کردے گا اور اسے ایسے راستے سے رزق دے گا جدھر اس کا گمان بھی نہ جاتا ہو۔

ایک روایت کے مطابق عثمان کے اشارے پر ایک سپاہی بھی آپ کے پیچھے ہولیا اور جب اس نے آپ کے قتل کا ارادہ کیا تو اس پر ایسا رعب طاری ہوگیا کہ وہ اپنے ارادے کو عملی جامہ نہ پہنا سکا اور الٹے پاؤں عینیہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

واپس آ گیا۔

ابنِ سعود کی حمایت اور شیخ کی عوامی مقبولیت

عینیہ سے نکال دیئے جانے کے بعد شیخ نے درعیہ کا رخ کیا، جہاں کا والی محمد بن سعود ایک متقی آدمی تھا اور اپنے حسنِ اخلاق کی وجہ سے مشہور تھا۔ درعیہ پہنچ کر شیخ نے عبداللہ بن سویلم کے گھر قیام کیا جس نے عربی اخلاق سے مجبور ہوکر آپ کو پناہ دے دی ورنہ وہ اندر سے سخت خوفزدہ تھا۔ شیخ کی پشت پناہی کرنے والوں کا ہر علاقے میں جو انجام ہو رہا تھا وہ اس سے بے خبر نہ تھا۔ اس کو خطرہ تھا کہ شیخ کی موجودگی کی اطلاع سنتے ہی جو لوگوں کا تانتا بندھ گیا ہے، اس کی خبر ضرور والی کو دے دی جائے گی۔ اس دوران قرآن پاک کی تفسیر اور درس و تدریس کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ بعض طلباء نے محمد بن سعود کے بھائی ثنیان اور بیوی موضی سے جو دین کی حمایت، نیک دلی اور مروت کے لئے مشہور تھی شیخ کی آمد کا تذکرہ کیا۔ موضی کے دل میں شیخ کے علم و فضل کا سکہ جم گیا۔ اس نے اپنے شوہر اور حاکمِ درعیہ سے صورت حال بیان کی اور کہا ''اللہ نے یہ نعمت تمہارے لئے بھیج دی ہے، اٹھو اور اس کی مدد کرو۔ تمہاری دُنیا و آخرت دونوں سنور جائیں گی۔''

نیک دل بیوی کی باتوں پر محمد بن سعود نے اعتبار کرتے ہوئے شیخ سے ملاقات کی۔ شیخ نے اپنی دعوت کے اہم حصوں توحید، امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور جہاد پر مختصر سی تقریر کی۔ دعوت کی سادگی اور اخلاص نے امیر درعیہ محمد بن سعود کو متاثر کیا۔ وہ بولا ''اے شیخ! یہ تو بلاشبہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا دین ہے۔ میں آپ کی امداد، اطاعت اور مخالفینِ توحید سے جہاد کے لئے تیار ہوں، لیکن میری دو شرطیں ہیں:

۱۔ اگر ہم نے آپ کی مدد کی اور اللہ نے ہمیں فتح دی تو آپ ہمارا ساتھ نہ چھوڑیں گے۔

۲۔ اہلِ درعیہ سے فصل کے تیار ہونے کے وقت میں کچھ مقررہ محصول لیتا ہوں، آپ مجھے اس سے نہ روکیں گے۔'' شیخ نے جواباً کہا: ''پہلی شرط تو منظور ہے۔ ہاتھ لاؤ:

الدم بالدم والهدم بالهدم

یعنی تمہارا خون میرا خون ہے اور تمہاری عزت کو گرانا میری آبرو کے ساتھ کھیلنے کے مترادف ہے۔ رہی دوسری شرط، سو انشاء اللہ تمہیں فتوحات اور غنیمتوں سے اتنا کچھ مل جائے گا کہ اس خراج کا خیال بھی دل میں نہ آئے گا۔''

۱۱۵۷ ہجری میں امیر ابنِ سعود نے شیخ کے ہاتھ پر بیعت کی، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا عہد کیا اور سنت کے بتائے ہوئے طریقوں پر چلنے پر آمادگی ظاہر کی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

درعیہ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا جہاں عمومی طور پر جہالت تھی۔ امیر کا شیخ کے ہاتھ پر بیعت کرنا تھا کہ لوگ جو ابھی تک پس وپیش میں تھے، جوق در جوق شیخ کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔ درس کے حلقے قائم ہو گئے اور صبح سے شام تک آنے والے طالبین کے لئے کتاب وسنت کی تعلیم کا کام خود شیخ انجام دینے لگے۔ شیخ ہر علاقے میں اپنے معتقدین کے گروہ پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ اس خبر نے انہیں مسرور کر دیا کہ دعوت نے جڑ پکڑ لی ہے اور اسے ایک مضبوط اور محفوظ مقام میسر آ گیا ہے۔ چنانچہ ایک ایک کر کے سب نے اپنا رخ درعیہ کی طرف کر لیا اور درعیہ کا نقشہ ہی بدل گیا۔ جہاں جہالت کا دور دورہ تھا وہاں قال اللہ وقال الرسول کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ مساجد اور علمی محفلیں آباد ہو گئیں۔ اب امیرِ عینیہ عثمان بن معمر بھی دوبارہ شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا اور بیعت کرنے کے بعد حدود شریعت کے نفاذ کا عہد کیا۔ اہلِ حریملا نے بھی آ کر بیعت کی اور دعوت کا کام زور وشور سے جاری ہو گیا۔

شیخ محمد بن عبدالوہابؒ کی دعوت کے بنیادی نکات

شیخ کی دعوت کی بنیاد توحیدِ خالص اور رسالتِ محمد ﷺ کے مکمل اتباع پر تھی۔ اسی کا احیاء کرنے کی غرض سے آپ نے تحریک چلائی جس میں آپ کو خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی۔ نجد اور اس کے آس پاس کے علاقوں کی مذہبی اور اخلاقی حالت سے آگاہ ہونے کے بعد شیخ کی دعوت کے بنیادی نکات کو اسی تناظر میں دیکھنا اور سمجھنا چاہئے۔

۱-توحیدِ خالص کی طرف رجوع اور لوازمِ توحید

تحریک کا مرکزی نکتہ توحیدِ خالص کو اختیار کرنا تھا۔ توحیدِ خالص سے مراد یہ ہے کہ ہر قسم کی عبادات اور پرستش اللہ پاک کے لئے خاص ہے جس میں اس کا کوئی شریک نہیں۔ غیر اللہ سے دعائیں مانگنا، وسیلہ طلب کرنا اور مدد مانگنا ناجائز ہے۔ اسی طرح اولیاء اللہ کی عقیدت میں غلو کرنا، ان کے انتقال کے بعد ان کی قبروں کو عبادت گاہ بنا لینا اور ان کی شفاعت پر انحصار کرتے ہوئے نیک اعمال کی ضرورت محسوس نہ کرنا سب شریعت محمدی ﷺ سے متصادم ہیں۔

۲-قبروں کی زیارت

قبروں کی زیارت کے آداب بتاتے ہوئے آپ نے یہ بات واضح کی کہ اسلام زیارتِ قبور کی اجازت دیتا ہے بلکہ اس کو مستحب گردانتا ہے، اس صورت میں جبکہ زیارت کرنے والا قبر پر کھڑے ہو کر دنیا کی بے ثباتی کا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اقرار کرے اور عبرت حاصل کرے کہ جس طرح دنیا کی ہر شے کو فنا ہے، اسی طرح مجھے بھی سب چھوڑ چھاڑ اس دنیا سے چلے جانا ہے۔ پھر استغفار پڑھا جائے اور قبر والوں کو اس طرز پر سلام کیا جائے، جیسے کہ احادیث سے پتہ چلتا ہے اور ان کی مغفرت کے لئے دعا کی جائے۔

اس کے علاوہ قبروں کو میلہ گاہ بنانا، ان پر مسجدیں تعمیر کرنا، ان کا طواف کرنا، انہیں چومنا، صاحبِ قبر کو معبود، داتا سمجھ کر اس سے منتیں مرادیں مانگنا، مصیبتیں دور کرنے کی درخواست کرنا، رونا دھونا اور چیخنا چلانا، جانور قربان کرنا اور حج کی طرح اسے مذہبی فریضہ سمجھتے ہوئے اس کا طواف کرنا، یہ سب شرکیہ اعمال ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے خود اپنی قبر کو سجدہ گاہ بنانے سے منع فرمایا تھا تو باقی کسی اور کے لئے کیا گنجائش رہ جاتی ہے۔

۳۔ مسئلہ توسل بالانبیاء

مسئلہ توسل بالانبیاء کی حقیقت واضح کرنے سے پہلے اس کے مفہوم کو سمجھنا ضروری ہے۔ توسل کے معنی وسیلہ پکڑنے کے ہیں۔ توسل کا لفظ تین معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے:

۱۔ رسول اکرم ﷺ کی اطاعت کا وسیلہ۔ یہ فرض ہے، اس کے بغیر ایمان مکمل نہیں ہوسکتا۔

۲۔ دعا میں رسول اکرم ﷺ کا وسیلہ پکڑنا۔ یہ نبی کریم ﷺ کی زندگی میں تو ممکن تھا لیکن آپؐ کی وفات کے بعد دعا میں آپ کا وسیلہ پکڑنا جائز نہیں۔ البتہ کسی زندہ نیک آدمی کا وسیلہ جائز ہے۔ جیسا کہ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ خلافت میں بارش کے لئے اجتماعی دعا کرتے ہوئے فرمایا کہ جب ہم قحط سالی کا شکار ہوتے تو ہم نبی اکرم ﷺ کا وسیلہ پکڑتے تو اللہ پاک ہم پر بارش برسا دیتے۔ اب ان کی وفات کے بعد رسول اکرم ﷺ کے چچا حضرت عباسؓ کا وسیلہ پکڑتے ہیں۔ لہٰذا مرنے کے بعد کسی شخص کو اپنی دعاؤں میں وسیلہ نہ بنانا چاہئے، چاہے وہ انبیاء ہی کیوں نہ ہوں۔

۳۔ تیسرا وہ توسل ہے جس میں اللہ تعالیٰ کو انبیاء اور صالحین کی ذات کا واسطہ دے دے کر اپنی دعائیں قبول کرنے کی درخواست کی جاتی ہے۔ اس کا کوئی ثبوت قرآن، حدیث اور صحابہ کرامؓ کی زندگی میں نہیں ملتا اور یہ شرکیہ فعل ہے جس کا کرنا حرام ہے۔ خصوصیت سے یہی توسل شیخ کے زمانے میں عام تھا جس کی آپ نے سخت مخالفت کی اور لوگوں کو اس شرکیہ کام سے منع کیا۔

۴۔ مسئلہ شفاعت

شفاعت بھی ایک متنازعہ فیہ امر رہا ہے۔ شیخ محمد بن عبدالوہابؒ کے نزدیک شفاعت گناہوں سے معافی کی درخواست کا نام ہے اور آپ رسول اکرم ﷺ کی شفاعت کو صحیح احادیث کی روشنی میں یقینی سمجھتے تھے۔ البتہ قرآن

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی صریح آیات کی روشنی میں آپ اس کے قائل تھے کہ کوئی بھی اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر سفارش یا شفاعت نہیں کر سکے گا۔ جیسا کہ اس آیت میں تصریح کی گئی ہے:

من ذا الّذی یشفع عنده الّا باذنه [الایة]

ترجمہ: کون ہے کہ جو اس کی اجازت کے بغیر اس سے سفارش کر سکے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ نبی کریم ﷺ بھی اللہ کی اجازت کے بغیر سفارش نہ کر سکیں گے اور صرف اسی کی سفارش کر سکیں گے جس کی اجازت خود اللہ سبحانہ وتعالیٰ دے گا۔

صحیح احادیث کی روشنی میں قیامت کے دن انبیاء کرام کے علاوہ فرشتے اور اولیاء بھی اللہ کے اذن سے سفارش کر سکیں گے۔ لیکن کسی پیغمبر، صدیق، شہید، ولی اللہ یا فرشتوں سے شفاعت کی درخواست کرنا مثلاً یا محمد ﷺ میری سفارش کرنا، یا پھر اے علیؓ! تو ہی میرا شافع ہے، یا اے داتا! میری بخشش کرا دینا جیسے الفاظ بولنا اور شفاعت کے یقین پر نیک عمل کی کوشش نہ کرنا غلط افعال ہیں۔ نبی کریم ﷺ کی شفاعت کے خواستگار کو یوں کہنا چاہئے:

اللّٰھم شفّع فی نبیک وحبیک محمدا صلی اللّٰہ علیه وسلم

اے اللہ! میرے متعلق اپنے پیغمبر محمد ﷺ کی سفارش قبول فرما۔

۵۔ غیر اللہ کی قسم کھانا

شیخ محمد بن عبدالوہابؒ کے نزدیک غیر اللہ کی قسم کھانا بھی توحید کی روح کے خلاف ہے۔ مسلمانوں میں اس کا رواج عام تھا حالانکہ نبی اکرم ﷺ کی حدیث میں جو جامع ترمذی میں موجود ہے حلف بغیر اللہ کو شرک کہا گیا ہے۔ غیر اللہ کی قسم کھانے سے نہ قسم منعقد ہوتی ہے اور نہ اس پر کفارہ واقع ہوتا ہے۔ اس کی شدید ممانعت اس لئے ہے کہ اس سے اللہ کے علاوہ دوسری ہستیوں کی تعظیم مقصود ہوتی ہے۔

۶۔ صفاتِ الٰہیہ اور شیخ کا موقف

قرآن کریم میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی جو صفات آئی ہیں ان کی وضاحت سے متعلق علماء میں اختلاف رہا ہے۔ ایک گروہ تو اس معاملے میں مخلوق سے تشبیہ ہونے کی وجہ سے خود صفات کا منکر ہو گیا تھا۔ جبکہ دوسرا گروہ ان صفات کی تاویل میں کوشش کرنے لگا مثلاً ید اللہ (اللہ کا ہاتھ) کی تفسیر نعمت اور قدرت سے کی جانے لگی اور عرش پر اللہ تعالیٰ کے استواء کی کیفیت کو بیان کرنے کی کوشش کی گئی۔

اس بارے میں شیخ محمد بن عبدالوہابؒ کا مذہب سلف کے طریقے پر ہے۔ یعنی قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جو صفات آئی ہیں، ان کے ظاہر پر ایمان لانا اور انہیں ہو بہو تسلیم کرنا چاہئے۔ اپنی طرف سے اس کی تشریح و تاویل کرنا یا اس کے متعلق کریدنا غلط ہے۔ اصل مفہوم اور کیفیت کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے اور ایک مسلمان کا کام اس کی ذات وصفات پر بے چوں چرا ایمان لانا ہے۔

۷- اجتہاد

اجتہاد کے بارے میں شیخ کا مسلک بہت واضح تھا۔ آپ عقائد و اعمال میں قرآن وسنت اور سلف کے مذہب کی پیروی کرتے تھے جب کہ فقہی معاملات میں امام احمد بن حنبلؒ کے مسلک پر عمومی طور پر عمل کرتے تھے۔ لیکن اگر حنابلہ کے مسلک سے مخالف کوئی صحیح حدیث مل جاتی تو پھر آپ کسی کے قول کو مقدم نہیں سمجھتے۔

امام ابن تیمیہؒ اور امام ابن قیمؒ سے آپ بہت متاثر تھے اور ان کے اقوال سے استدلال بھی کرتے تھے۔ مگر مقلد محض بن کر ان کی تقلید کا پھندا بھی اپنے گلے میں نہیں ڈالتے۔

شیخ دیگر ائمہ کے مسالک کی پیروی کو بھی جائز سمجھتے تھے۔ البتہ صریح نص کے سامنے آنے کے باوجود اپنے امام کے موقف کی تائید محض ضد اور تعصب میں کئے جانے کو درست نہیں سمجھتے تھے۔

دعوت کی مقبولیت اور تحریک کے خلاف اعلانِ جنگ

تحریک کے پیروکار شیخ کی دعوت لے کر نجد، احساء اور بصرہ کے علاوہ آس پاس کے تمام علاقوں میں پھیل گئے۔ اطراف کے والیوں میں ریاض، احساء اور قطیف کے علاقوں کے حاکموں نے اس کو اپنے لئے خطرے کی گھنٹی سمجھا۔ شیخ کی دعوت انسانوں کو انسانوں کے پنجۂ ظلم سے نکال کر اللہ کے احکام کا پابند بنانے کی دعوت تھی۔ اپنے اقتدار کے لئے بڑھتا ہوا خطرہ دیکھ کر انہوں نے شیخ کے حامیوں پر زیادتیاں شروع کر دیں۔ ریاض کا حاکم دہام بن دواس انتہاء درجے کا ظالم شخص تھا۔ عوام اس کے ستم سے سخت عاجز تھے۔ شرفاء کو تنگ کرنا اور اذیتیں دینا اس کا خاص مشغلہ تھا۔ جب اس کی حرکتیں ناقابلِ برداشت ہوگئیں تو مجبوراً شیخ نے بھی جوابی اقدام کا فیصلہ کیا۔ امیر محمد بن سعود، ان کے بھائیوں اور بیٹوں نے مسلح لشکر کے ساتھ معاندین کی خوب خبر لی اور جنگ وقتال کا سلسلہ ایک عرصہ تک جاری رہا۔

محمد بن سعود کی وفات کے بعد امیر عبدالعزیز نے امارت سنبھالی تو وہ بھی برابر مقابلہ کرتے رہے۔ حاکم ریاض سے پچیس تیس سال تک چھیڑ چھاڑ کا سلسلہ قائم رہا۔ یہاں تک ۱۱۸۷ ہجری میں دہام ریاض چھوڑ کر فرار ہوا تو شیخ اور آپ کے حامیوں نے اس پر قبضہ کرلیا۔ اس دوران جہاں نجد اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں آلِ سعود کا اثر ورسوخ بڑھتا رہا، وہیں مخالفت بھی زور وشور سے جاری رہی۔ ابتداء میں تو نجدی حاجیوں کو حج کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اجازت بھی نہ ملی۔ امیر مکہ سے تعلقات کشیدہ رہے۔ کچھ عرصہ کے لئے صلح ہوئی، مگر زیادہ دن نہ چلی۔ شیخ کے انتقال کے بعد حالات مزید خراب ہو گئے، جس کا تذکرہ بعد میں کیا جائے گا۔

اسلامی نظامِ حکومت کا قیام

اس تمام عرصے میں پہلے محمد بن سعود اور بعد میں ان کے بیٹے اور جانشین عبدالعزیز محمد بن سعود نے شیخ کی رہنمائی میں اپنے علاقے میں اسلامی نظام قائم کرنے کی کوشش کی۔ شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہابؒ، ابن سعود کے مشیرِ خصوصی اور جج کی حیثیت سے تنازعات کا فیصلہ کرتے۔ دعوت کے کام میں پوری طرح منہمک ہونے کے باوجود حکومت کو اسلامی خطوط پر چلانے کے لئے مستقل راہنمائی فراہم کرتے۔ سعودی خاندان شیخ کی مرضی اور مشورے کے بغیر کوئی قدم نہ اٹھاتا۔ امراء اور حکام کو آپ کی ہدایات کی روشنی میں خط لکھے جاتے۔

محمد بن عبدالوہاب نے محمد بن سعود کے ساتھ مل کر جس اسلامی طرزِ حکومت کا احیاء کیا اس کا ڈھانچہ ان بنیادوں پر استوار کیا گیا:

۱۔ ایمان باللہ کی دعوت کو عام کرنا اور توحید خالص کو اس طرح نافذ کرنا کہ زندگی کے تمام شعبوں پر اس کے اثرات نظر آسکیں۔

۲۔ اقامتِ صلوٰۃ کا فریضہ انجام دینا یعنی حکومت کی سطح سے نماز کے قیام کو یقینی بنایا جائے۔

۳۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لئے حکومتی سطح پر مساعی اور کوششیں۔

اسلامی نظامِ حکومت کیا ہے اور کن بنیادوں پر استوار ہونا چاہئے، یہ ایک طویل بحث ہے۔ مختصراً اتنا کہا جاسکتا ہے کہ ان بنیادی اصولوں سے اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ البتہ ان پر عملدرآمد کس طرح کیا جانا ہے یہ بہت اہم ہے۔ مقصد نیک ہو لیکن حکمتِ عملی اور طریقۂ کار غلط ہو تو انسان ناکام ہو جاتا ہے۔ اسلامی حکومت کے قیام کا پسندیدہ کام بھی اس اصول سے مستثنیٰ نہیں۔

شیخ الاسلام کی تعلیمی سرگرمیاں

عبدالعزیز بن محمد بن سعود نے شیخ سے وفاداری کا پیمان اسی طرح سے نبھایا جس طرح اس کے پیش رو محمد بن سعود نے نبھایا تھا۔ اس طرح سیاسی محاذ اس کے پاس رہا اور دینی و علمی محاذ نیز ریاست کی راہنمائی کا کام شیخ انجام دیتے رہے۔ جب آپ اس کی بنیادیں استوار کرنے میں کامیاب ہو گئے اور ریاست کے لئے راہنما اصول عملی طور پر نافذ ہوتے ہوئے بھی نظر آنے لگے تو آپ نے اپنے آپ کو درس و تدریس کے لئے مخصوص کر لیا اور حکومت کے تمام امور عبدالعزیز کے سپرد کر دیئے۔ لیکن اس سے قبل شیخ سینکڑوں کی تعداد میں ان افراد کو تیار

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کر چکے تھے جو نہ صرف داعئ دین کی حیثیت سے تمام علاقوں میں پھیل چکے تھے بلکہ ریاست کو اسلامی بنیادوں پر چلانے کی بھرپور صلاحیت رکھتے تھے۔

وفات

شیخ کی عمر آرام کی متقاضی تھی۔ ۲۰ سال کی عمر سے علمی اور عملی جہاد شروع کیا تو اگلے ستر سال تک ہمہ وقت اس میں مصروف رہے۔ ۱۲۰۶ ہجری میں بیمار پڑے اور ذیقعدہ کے مہینے میں ۱۷۹۲ء میں داعئ اجل کو لبیک کہا۔

شیخ کی وفات کی خبر نے لوگوں کو افسردہ کردیا۔ علم وعمل کا آفتاب ڈوب چکا تھا مگر توحید کی روشنی سے پورا جزیرۂ نما عرب چمک رہا تھا۔ شیخ نے طویل عمر پائی اور اس طویل العمری کا کیا ہی اچھا استعمال کیا۔ ابتدائی عمر میں جن شدید ناکامیوں سے دوچار ہونا پڑا، اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اخیر عمر میں آپ کو اسی درجے کی کامیابیوں سے ہمکنار کیا۔ بہت کم لوگوں کو اپنی زندگی میں ایسی مقبولیت حاصل ہوئی ہوگی جو شیخ کے حصے میں آئی۔ آپ کی اپنی اولاد کے علاوہ آپ کے شاگردوں کو بھی آلِ شیخ کہا جاتا ہے جنھوں نے آپ کی تعلیمات کی روشنی میں آپ کے کام کو آگے بڑھایا اور مشن کو زندہ رکھا۔

اثرات

شیخ کی دعوت کی منفرد بات یہ ہے کہ آپ نے افرادِ کار کی تیاری اور تربیت کا کام بہت بڑے پیمانے پر کیا۔ آپ کے شاگرد اور حامی جہاں جہاں گئے وہاں وہاں آپ کے پیغام کے اثرات آج تک محسوس کئے جاسکتے ہیں۔ تمام اسلامی ممالک (جن میں مصر، شام، عراق، پاکستان، بنگلہ دیش، انڈونیشیا، سماٹرا، نائیجریا اور افریقہ کے ممالک شامل ہیں) میں شیخ محمد بن عبدالوہابؒ کی تحریک نے ایک بڑے طبقے کو متاثر کیا۔ ہندوستان میں سید احمد شہید کی تحریک جو سکھوں، مرہٹوں اور انگریزوں کے خلاف جہاد کی علمبردار تھی اس کی جڑیں بھی محمد بن عبدالوہاب کی دعوت وتحریک سے ملائی جاتی ہیں۔

شیخ کے انتقال کے بعد اگرچہ آلِ سعود کو دعوتی محاذ پر کامیابیاں حاصل ہوئیں مگر ساتھ ہی ساتھ اطراف کے علاقوں سے شدید مزاحمت بھی جاری تھی۔ امیرِ مکہ کی جانب سے نجدی حاجیوں کو مکہ میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی گئی اور یوں تعلقات اتنے کشیدہ ہوئے کہ بالآخر مصالحت کی کوششوں کی بار بار ناکامی کے بعد ۱۲۰۸ ہجری میں مکہ مکرمہ میں آلِ سعود کے فرمانروا فاتحانہ طور پر داخل ہوئے۔ تمام شرکیہ کاموں اور افعال پر پابندی عائد کردی گئی اور اصلاحات نافذ کی گئیں۔

نجدی حکومت کا اثر شمال میں حلب سے لے کر بحرِ ہند تک اور مشرق میں خلیج فارس اور عراق سے لے کر بحرِ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قلزم تک پھیلا ہوا تھا۔ ترکی خلیفہ باب عالی آلِ سعود کی بڑھتی ہوئی طاقت سے خطرہ محسوس کر رہا تھا۔ چنانچہ اس نے محمد علی پاشا کو جو والئ مصر تھا اہلِ نجد کی سرکوبی پر مامور کیا۔

مصری فوجیں مسلسل آلِ سعود سے برسرِ پیکار رہیں۔ یہاں تک کہ ۱۲۳۳ ہجری میں بالآخر والئ مصر کے بیٹے ابراہیم پاشا نے ایک بڑی فوج کے ساتھ درعیہ پر حملہ کیا اور چھ ماہ کے محاصرے کے بعد سقوطِ درعیہ کے ساتھ ہی آلِ سعود کی حکمرانی کی پہلی مدت ختم ہوئی۔ سعودی حاکم (عبداللہ بن سعود بن عبدالعزیز بن محمد بن سعود) کو اس کے ساتھیوں کے ساتھ گرفتار کر کے پہلے مصر لے جایا گیا۔ وہاں ان سے جی بھر کر بدسلوکی روا رکھی گئی۔ پھر انہیں ترکی روانہ کر دیا گیا جہاں ۱۸۱۸ء میں اسے ساتھیوں سمیت آیا صوفیاء کے صحن میں پھانسی دے دی گئی۔ اس طرح تقریباً پون صدی حکومت کرنے کے بعد اقتدار سعودیوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔

لیکن دعوت کے اثرات سیاسی ہی نہ تھے بلکہ روحانی اور اخلاقی بھی تھے۔ لہٰذا اس کی مقبولیت میں کمی نہ آئی اور آلِ سعود نے دوبارہ سر اٹھانا شروع کیا۔ بالآخر تقریباً سو سال کی جدوجہد کے بعد سعودی خاندان کا جلاوطن شہزادہ عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن آلِ رشید کو شکست دینے میں کامیاب ہو گیا۔ ۱۹۱۳ء تک مشرقی عرب کا بڑا حصہ مسخر کر لیا گیا۔ ۱۹۳۳ء تک ان کا قبضہ تمام حجاز اور نجد پر مکمل ہو گیا۔ مملکتِ نجد و حجاز کا نام بدل کر دولتِ سعودی عربیہ رکھ دیا گیا۔

سعودی عرب آج تک شیخ محمد بن عبدالوہاب کی تعلیمات پر عمل پیرا اور کاربند ہے اور اس کا تجربہ ہر عازمِ عمرہ و حج کو ضرور ہوتا ہے۔ سعودی حکومت کے ان رہنما اصولوں پر عملدرآمد کے بہترین نتائج سب کے سامنے ہیں۔ اقامتِ صلوٰۃ کا مثالی مظاہرہ اس کے ثمرات میں سے ہے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ معاملہ اقامتِ صلوٰۃ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر تک محدود نہیں ہے۔ شورائیت، عدل و انصاف کی مکمل فراہمی، اظہارِ رائے کی آزادی اور حکمرانوں کا سادہ طرزِ زندگی اسلامی نظامِ حکومت کے بنیادی لوازم ہیں۔ انہیں نظر انداز کر کے اسلامی نظام قائم کرنے کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ سعودی حکومت کو اس طرف بھی توجہ دینی چاہئے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ تمام خلفائے راشدین معاشرے کے بہترین افراد کو مشوروں میں اپنے ساتھ شریک رکھتے۔ نام نہاد جمہوریت یا ڈکٹیٹر شپ کے بجائے معاشرے کے صالح، دانشمند اور چنیدہ لوگ ریاست کے معاملات کو صحیح خطوط پر چلانے کے اہل سمجھے جاتے تھے۔ عدل و انصاف کی فراہمی کا یہ حال تھا کہ حکمران طبقہ عام عوام سے بھی بڑھ کر اپنے معاملات کا جوابدہ تھا۔ اس کی روشن مثالیں یہ ہیں کہ حضرت عمر فاروقؓ (خلیفہ عرب و عجم) اپنے جسم پر اوڑھی جانے والی چادروں کے بارے میں بھی سوال کیے گئے اور حضرت علیؓ جب عدالت میں فریقِ مخالف کے ساتھ حاضر کیے گئے تو اپنا مقدمہ ہار بیٹھے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اظہار رائے کی آزادی ہر شخص کا بنیادی اور پیدائشی حق ہے۔ ہر شخص کی رائے کو حکومت کی رائے کا پابند بنانا کم از کم اسلام کے مزاج کے مطابق نہیں ہے۔ ایک عام عورت بھی حضرت عمرؓ کو قانون سازی کے دوران مشورہ دیتی ہے اور قرآن کی ایک آیت کی طرف ان کی توجہ دلاتی ہے تو وہ اس کے مشورے میں وزن محسوس کرتے ہوئے قبول کرتے ہیں اور اسے سراہتے ہیں۔ دوسری طرف مسلمان حکومتوں کا معاملہ بھی سب کے سامنے ہے جو اس معاملے میں اسلام کے معیار پر تو کیا پوری اترتیں، اہلِ مغرب کے مقابلے میں بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔

اسلام کے نفاذ کی دعوے دار حکومت کے لئے اہل اقتدار کی اپنی زندگیوں کو شریعت کے مطابق اور سادہ بنانا ضروری ہے۔ اس کے بالمقابل عظیم الشان محلات میں تعیّشات سے بھرپور زندگی، بڑی بڑی گاڑیوں میں سفر، آگے پیچھے ہٹو بچو کے نعرے لگاتے ہوئے خدام کی فوجِ ظفر موج، ہوٹر اور سائرن بجاتی ہوئی گاڑیاں اور موٹر سائیکلیں، خمار آلود آنکھیں، مستانہ چال اور (کبر کی علامت) لمبے لمبے چوغے، یہ سب آلِ شیخ کو اور نہ ہی آلِ سعود کو زیب دیتا ہے۔ اللہ کے رسول کی لائی ہوئی شریعت کو اختیار اور نافذ کرنے والوں کو اپنے طرزِ عمل کی اصلاح لازمی ہے۔

اعتراضات

محمد بن عبدالوہاب کی تحریک کو جہاں بے تحاشہ پذیرائی حاصل ہوئی وہیں یہ عالمِ اسلام کی ان تحریکوں میں شامل ہے جسے اپنوں اور غیروں نے بدنام کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ انگریزوں، ترکوں اور مصریوں نے مل کر ایسا ہوّا بنایا کہ گویا یہ اسلام سے الگ کوئی دین ہے۔ ذیل میں ہم ان اعتراضات کا تذکرہ کریں گے جو اس تحریک پر وقتاً فوقتاً کئے جاتے رہے۔

ا- وہابیت ...... ایک فرقہ یا الگ دین؟

دینِ اسلام کی خالص تعلیمات کی طرف رجوع کی اس تحریک کو ''وہابیت'' کا نام دے دیا گیا اور ''وہابی'' کو معاذ اللہ گالی کے طور پر استعمال کیا جانے لگا۔ اہم بات یہ ہے کہ تحریک کے بانی تو شیخ محمد بن عبدالوہابؒ تھے، اگر تحریک کا سرا ان سے ہی جوڑنا تھا تو تحریک کو ''محمدی تحریک'' کہنا چاہئے تھا۔ لیکن اس نام سے تو کسی تحریک کو بدنام کرنے کی کوشش کبھی کامیاب نہ ہوتی۔ چنانچہ شیخ کے والد کے نام عبدالوہاب کی طرف اس کی نسبت کی گئی اور ''وہابی'' نام کو شہرت دی گئی اور تحریک کے متاثرین کو اسی نام سے آج تک پکارا جاتا ہے۔ حقیقت میں ''وہاب'' اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا نام ہے اور اس سے نسبت میں کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا۔ لیکن یہ نام اس طرح

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مشہور کیا گیا کہ یہ گویا اسلام سے الگ کوئی مذہب ہے۔اس افتراء پردازی کا آغاز جہاں سے بھی ہوا ہو، انگریزوں نے اسے خوب اچھالا اور اپنے مقاصد کے لئے اس نام کو بدنام کیا۔

۲۔سنت کے معاندین

شیخ اور آپ کی تعلیمات کو خلافِ سنت کہا گیا۔انکارِ حدیث کے علاوہ یہ طعنہ زنی بھی کی گئی کہ آپ رسول اللہ ﷺ اور اہلِ بیت کے دشمن تھے اور آپ ﷺ پر صلوٰۃ و درود بھیجنے کو جائز نہیں سمجھتے۔مسعود عالم ندوی صاحب اس بات پر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''زمانہ کی بوالعجبی بھی دیدنی ہے۔وہ شخص جس کا اوڑھنا بچھونا سنتِ رسول ہو، اسی پر انکارِ حدیث کا الزام رکھا جاتا ہے۔''

اس اعتراض کا جواب ہم شیخ کی ایک تحریر سے دیتے ہیں:

> ''میرے مخالفین سے کہہ دیجئے کہ تمام لوگوں پر فرض ہے کہ وہ نبی ﷺ کی وصیت کے مطابق زندگی گذاریں۔ میں تم سے کہتا ہوں کہ میری کتابیں تمہارے پاس موجود ہیں، ان کا مطالعہ کرو۔میرے کلام پر عمل نہ کرو۔البتہ رسول اللہ ﷺ کے احکامات جو تمہاری کتابوں میں بھی موجود ہیں ان کا اتباع کرو۔کیا کسی مسلمان کو مسلمان کہنا درست ہے جبکہ وہ رسول اللہ ﷺ سے دشمنی رکھتا ہو، جنہوں نے ہمیں دینِ حق کی ہدایت سے نوازا؟''

جس بات سے شیخ نے منع کیا وہ یہ تھی کہ انبیاء اور اولیاء کی حد سے بڑھی ہوئی عقیدت اختیار کرنا اور ایسی عقیدت جو انسان کو شرک کے گڑھے میں پھینک دے، جبکہ شرک کوئی معمولی گناہ نہیں ہے، بلکہ اسلام سے اخراج اور جہنم کا پروانہ ہے۔

۳۔مسلمانوں کی تکفیر

شیخ پر ایک الزام یہ بھی عائد کیا جاتا ہے کہ آپ اپنے اور اپنے پیروؤں کے سوا سب کو کافر سمجھتے ہیں۔آپ کا خیال ہے کہ جو آپ کے دائرہ اطاعت سے باہر ہے وہ اسلام سے خارج ہے اور اس کا مال اور خون حلال اور جائز ہے۔

اس کا یہ جواب کہ یہ محض ایک الزام ہے کافی نہیں ہے۔اس کی حقیقت یوں ہے کہ شیخ کے نزدیک اگر ایک شخص اسلام قبول کرنے کے بعد بھی قبر پرستی اور مشرکانہ افعال سے باز نہیں آتا تو وہ مشرک ہے۔اس لئے کہ اللہ کو خالق اور مدبر کائنات تو زمانۂ جاہلیت میں اہلِ مکہ بھی سمجھتے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ نذر، دعا، طواف، قربانی کرتے وقت اپنے بنائے ہوئے شریکوں کو بھی شامل کر لیتے تھے۔لہٰذا وسیلہ یا شفاعت جیسے نام رکھ دیئے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے کفر کی حقیقت نہیں بدلی جاسکتی۔

اس حقیقت کے باوجود کہ شیخ اس تمام عمل کو شرک سمجھتے تھے، آپ کمزور عقیدہ مسلمانوں پر کفر کا فتویٰ لگا دینے سے قبل ان پر تبلیغ کی حجت تمام کرنا فرض سمجھتے تھے۔ البتہ ایک بار حق واضح ہو جانے کے بعد اگر کوئی شرکیہ کاموں پر اصرار کرے تو اسے کافر سمجھتے تھے۔ عملی زندگی میں بھی آپ نے خود آگے بڑھ کر ان لوگوں کے خلاف تلوار نہیں اٹھائی بلکہ جب لڑائی مسلط کر دی گئی تو آپ نے بھی جواباً ان لوگوں سے قتال کیا اور ان کا خون بہایا۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ شیخ مسلمانانِ عالم کی عمومی تکفیر نہیں کرتے اور آپ نے بار بار اس کا انکار بھی کیا ہے۔ اس کے باوجود اگر ضد سے کوئی الزام دھرنا چاہے تو اس کا کیا علاج ہو سکتا ہے؟

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آپ تارکِ نماز سے قتال کو جائز سمجھتے ہیں۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ یہ امام احمد بن حنبلؒ کی فقہ کا مشہور مسئلہ ہے۔ حنابلہ کا اسی پر عمل ہے اور شیخ اور اہلِ نجد چونکہ فقہ کے اکثر مسائل میں حنبلی مسلک کی پیروی کرتے تھے لہٰذا تارکِ صلوٰۃ کا کفران کے نزدیک درست تھا۔

۴۔ انہدامِ قبور

شیخ اور آپ کے پیروؤں نے مزارات اور ان قبور کو جن کی عقیدت اور عظمت کے لوگ قائل تھے گرا دیا اور اس کی وجہ اس کے سواء کچھ نہ تھی کہ اسلام میں پکی قبریں اور ان پر عالیشان مزار بنوانے کی ممانعت اسی لئے ہے کہ کسی طرح شرک کا کوئی دروازہ کھلا نہ رہ جائے۔ اسی دلیل کی بناء پر شیخ نے ان کے انہدام کا حکم دیا۔ البتہ آپ نبی اکرم ﷺ کی قبرِ اطہر کی زیارت کو مستحب اور جائز سمجھتے ہیں۔

۵۔ دین میں تشدد

شیخ الاسلام اور آپ کے متبعین پر دین میں سختی اور شدت کا الزام لگایا جاتا ہے۔ اگرچہ شیخ نے متعدد بار اپنے شاگردوں اور حامیوں کو ہدایت کی کہ سختی سے بچیں، کیونکہ اس سے تفرقہ کا خطرہ ہے جو دین میں ناپسندیدہ ہے۔ مگر اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ آپ کے چند تلامذہ میں شدت موجود تھی اور عمومی طور پر اس کا مظاہرہ اب بھی سعودی معاشرے میں نظر آتا ہے۔ یہاں یہ حقیقت سمجھ لینا ضروری ہے کہ ابتداء میں تحریکیں اپنی اصل صورت میں موجود ہوتی ہیں۔ بعد میں ہر قسم کے افراد ان میں شامل ہو جاتے ہیں جو تربیت کی کمی اور جوش کی زیادتی میں ناروا حرکتیں کرتے ہیں۔

اس معاملے میں اللہ کے نبی ﷺ کے اسوہ کا تذکرہ ضروری ہے۔ آپ ﷺ سے بڑھ کر توحید کا پرچار کرنے والا کون تھا۔ مگر کوئی دشمن بھی آپ پر مزاج کی سختی اور شدت پسندی کا الزام نہ لگا سکا۔ آپ ﷺ نے بت شکنی بھی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی اور رحمت اللعالمین کا لقب بھی پایا۔ یہ دونوں چیزیں باہم متعارض نہیں ہیں۔ اپنی دعوت کے حق ہونے کا یقین ایک چیز ہے اور احساسِ برتری سے مغلوب ہوکر بات بات پر دوسروں کی نکیر کرنا دوسری چیز ہے۔ اول الذکر پسندیدہ اور بعد الذکر غیر مطلوب ہے۔

غرورِ زہد نے سکھلا دیا ہے واعظ کو
کہ بندگانِ خدا پر زبان دراز کرے

ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ ہمیں ہدایت دینے والی ذات اللہ تعالیٰ کی ہے ورنہ انسان از خود ہدایت یافتہ نہیں ہوسکتا اور قرآن مجید کے الفاظ میں جنتی خود اس کا اقرار کریں گے۔

الحمد للّٰہ الذی ھدٰنا لھذا وما کنّا لنھتدی لولا أن ھدٰنا اللّٰہ [الاعراف]

ترجمہ: ''تعریف خدا ہی کے لئے ہے جس نے ہمیں یہ راستہ دکھایا، ہم خود راستہ نہ پا سکتے تھے اگر خدا ہماری رہنمائی نہ کرتا''۔

اسی طرح ذرا ذرا سی بات پر حرام حرام کے فتوے لگانا اور عوام الناس کو احساس دلانا کہ گویا وہ دن بھر کے اکثر اوقات حرام کاموں میں گذارتے ہیں، تبلیغِ دین کی مصلحت کے صریحاً خلاف ہے۔ اس سلسلے میں نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد ہمارے لئے مشعلِ راہ ہے۔ ''دین میں نرمی کرو سختی نہ کرو، لوگوں کو خوشخبری سناؤ انہیں متنفر نہ کرو۔''

شیخ محمد بن عبدالوہابؒ کی شخصیت

شیخ محمد بن عبدالوہابؒ کی شخصیت آپ کے کام کے ہم رنگ تھی۔ طبیعت میں منکسر المزاجی کے ساتھ ساتھ رعب بھی نمایاں تھا۔ خاموش بیٹھے ہوئے ہوں یا گفتگو فرما رہے ہوں، حاضرین پر آپ کی ہیبت چھائی رہتی۔ زبان کا استعمال سوچ سمجھ کر کرتے۔ ناشائستہ گفتگو اور پرتکلف کلمات کو ناپسند کرتے۔ طبیعت میں سادگی تھی لیکن صفائی اور نظافت کا خاص خیال رکھتے۔ لوگ آپ سے متاثر ہوجاتے اور آپ کی بات سننے پر آمادہ ہوجاتے۔ انہیں آپ کی باتوں میں خلوص محسوس ہوتا۔ اس کے پیچھے آپ کی عمر بھر کی محنت کی گواہی تھی۔

شیخ الاسلام کی ایک نمایاں خوبی آپ کی بہادری تھی۔ آپ نے جس بات کو درست سمجھا، اس کے اعلان اور پرچار میں کوئی ہچکچاہٹ نہ دکھائی۔ کوئی مصلحت آڑے نہ آئی۔ پتھر بھی کھائے اور جلاوطن بھی ہوئے۔ ہجرت بھی کی مگر حق بات کہنے سے نہ حکمران آپ کو روک سکے نہ علمائے سوء اور نہ ہی جاہل اور بے وقوف عوام کی نفرت راستے کا پتھر بنی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس راہ میں جو سب پہ گذرتی ہے وہ گذری
تنہا پسِ زنداں کبھی رسوا سرِ بازار
گرجے ہیں بہت شیخ سرِ گوشۂ منبر
کڑکے ہیں بہت اہلِ حکم برسرِ دربار
چھوڑا نہیں غیروں نے کوئی ناوکِ دشنام
چھوٹی نہیں اپنوں سے کوئی طرزِ ملامت
اِس عشق، نہ اُس عشق پہ نادم ہے مگر دل
ہر داغ ہے اس دل میں بجز داغِ ندامت

شیخ نے جو عشق کیا اسے کیا خوب نبھایا۔ ستر سال تک کبھی واعظ بن کر، کبھی مصنف اور کبھی مجاہد بن کر اس کا حق ادا کیا۔ شیخ حق کو ڈھکا چھپا، روتا، سسکتا اور بے جان و مردہ نہیں بلکہ سربلند اور نافذ العمل دیکھنا چاہتے تھے۔ اسلام کا تصور شوکت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ شیخ الاسلام نے ابتدائی تجربات کے بعد یہ بات جان لی کہ اگر حکمران طبقہ حق قبول کر لے تو دین کے لئے کی گئی جدوجہد کے ثمرات دنیا میں بھی اسلامی حکومت کی صورت میں حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ اس کو آپ کی خوش قسمتی کہنا چاہئے کہ آلِ سعود کے حکمرانوں نے آپ کا بھرپور ساتھ دیا۔

شیخ الاسلام اور آلِ سعود کے حکمرانوں کے وفاق کے پیچھے ایک بہت اہم سبب شیخ کی بے لوثی اور بے غرضی تھی۔ اگر آپ چاہتے تو دولت کے انبار لگا لیتے، اقتدار پر خود قابض ہو جاتے یا اپنی اولاد کے لئے عہدے اور جائیدادیں طلب کرتے۔ مگر وہاں تو کچھ اور ہی معاملہ تھا۔ غریب طالب علموں کی خوراک، لباس اور رہائش کا انتظام بھی شیخ اپنی ذاتی آمدنی سے پورا کرتے۔ اس کا بوجھ بیت المال پر نہ ڈالتے۔ اس سلسلے میں آپ کو قرض بھی لینا پڑتا۔ قرض کی ادائیگی اس رقم سے کی جاتی جو تبلیغی مصارف کے لئے دی جاتی تھی۔ جب آپ کی وفات ہوئی تو آپ کے پاس ایک درہم بھی نہ تھا بلکہ آپ ہزاروں پونڈ کے مقروض تھے جن کی ادائیگی بعد میں ابنِ سعود نے کی۔

شیخ متانت، وقار، شجاعت، سخاوت اور قناعت کی خوبیوں سے متصف ہونے کے علاوہ عفو و درگذر کی اعلیٰ انسانی صفت کے بھی حامل تھے۔ شیخ کا بھائی سلیمان بن عبدالوہاب عالمِ دین ہونے کے باوجود آپ کی شہرت سے جلتا تھا۔ وہ تمام حجاز میں آپ کو بدنام کرتا تھا۔ یہاں تک کہ اس نے مخالفت میں ایک کتاب بھی لکھ ڈالی، جس میں آپ کو احمق اور بے وقوف تک کہا گیا۔ دوسری طرف شیخ اسے بار بار خطوط بھیجتے رہے اور سمجھانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ کچھ عرصے بعد جب اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا تو آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنی غلطیوں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پر معافی مانگی۔ شیخ بھائی کو اپنے سامنے پا کر خوشی سے پھولے نہیں سمائے۔ گمراہ، جھوٹا، باطل پرست جیسے الفاظ اپنے بارے میں سن چکنے کے بعد بھی اسے گلے لگا لیا۔

بھائی ہی کیا، بے شمار لوگ جو آپ کی دشمنی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے تھے، ایک ایک کر کے آپ کے پاس آتے گئے۔ شیخ ان کی غلطیوں سے صرفِ نظر کر کے انہیں اپنے حلقے میں شامل فرما لیتے۔ شیخ کی دعوت اپنی ذات کے لئے نہیں تھی بلکہ اللہ کے لئے تھی۔ اسی لئے دوستی و دشمنی کی بنیاد اور معیار بھی اپنی ذات نہیں تھی۔

شیخ کی زندگی ہر حق پرست انسان کے لئے مثال اور نمونہ ہے۔ ابتداء ہی میں قرآن و حدیث کے مطالعے نے آپ پر حق و باطل کی حقیقت کھول دی۔ آپ نے ہر سو باطل کا راج دیکھا۔ چاہتے تو آپ بھی آنکھیں بند کر کے دیگر علماء کی طرح درس کی مسند سنبھال لیتے، اہلِ حَکَم کے جرائم کی پردہ پوشی کرتے اور یونہی سکون و اطمینان سے ساری زندگی گذار دیتے یا دنیا کی فریب کاریوں سے بچنے کے لئے گوشۂ عافیت ڈھونڈ لیتے۔ لیکن آپ نے نیا زمانہ، نئی دنیا اور نئے انسان بنانے کا بیڑا اٹھایا۔ خدائے واحد کی اطاعت کا اقرار گویا سینکڑوں باطل خداؤں کا انکار تھا اور شیخ نے اپنے لئے یہی کانٹوں بھرا راستہ چنا۔

اے دیدۂ بینا

پھر دل کو مصفا کرو، اس لوح پہ شاید
مابینِ من و تو نیا پیماں کوئی اترے
اب رسمِ ستم حکمتِ خاصانِ زمیں ہے
تائیدِ ستم مصلحتِ مفتیٔ دیں ہے
اب صدیوں کے اقرارِ اطاعت کو بدلنے
لازم ہے کہ انکار کا فرماں کوئی اترے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فکرِ اقبالؒ اور شخصیت کی چند جھلکیاں

دورِ جدید میں اسلام کی نشأۃِ ثانیہ میں تجدیدِ فکر وفلسفہ کے میدان میں نمایاں ترین نام جس کے لئے شاعری ذریعۂ اظہار بنی

تعارف

آپ کا نام محمد اقبال، لقب حکیم الامت، شاعرِ مشرق، علامہ اور خطاب سر تھا۔ سلسلہ نسب یہ ہے: محمد اقبال بن شیخ نور محمد بن شیخ محمد رفیق۔

اقبال کا تعلق کشمیری برہمنوں کے ایک قدیم خاندان سے تھا۔ نویں صدی ہجری میں آپ کے خاندان کے جدِاعلیٰ بابا لولی حاجی نے اسلام قبول کیا۔ اس کا سبب ایک ولی اور عارف سے دلی عقیدت بتائی جاتی ہے۔ کشمیر سے ہجرت کر کے آپ کا خاندان انیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں سیالکوٹ پہنچا اور یہیں آباد ہو گیا۔

جیسا کہ اس زمانے میں متوسط گھرانوں کا طریقہ تھا، اقبال کا خاندان بھی روایتی طور پر دیندار تھا۔ اقبال کی پیدائش سے چند روز قبل آپ کے والد نے خواب میں دیکھا کہ کسی وسیع میدان میں بہت سے لوگ فضاء میں چکر لگاتے ہوئے ایک سفید کبوتر کو ہاتھ اٹھا اٹھا کر دیوانہ وار پکڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ کبوتر کبھی نیچے اترتا اور کبھی آسمان کی طرف اڑ جاتا۔ بالآخر اس نے اچانک فضا میں غوطہ لگایا اور ان کی جھولی میں آ گرا۔ آپ کے والد شیخ نور محمد اسے غیبی اشارہ سمجھے اور خواب کی تعبیر یوں کی کہ ان کے ہاں بیٹا پیدا ہو گا جو خدمتِ اسلام میں نام پیدا کرے گا۔

ولادت

محمد اقبال ۳ ذیقعدہ ۱۲۹۴ ہجری بمطابق ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ شیخ نور محمد نے اپنے خواب کی نسبت سے نومولود کا نام محمد اقبال رکھا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تعلیم وتربیت

اقبال کے گھر کا ماحول نہایت سادہ اور پاکیزہ تھا۔ آپ کے والد اپنے نیک اوصاف کی وجہ سے مشہور تھے۔ تجارت پیشہ ہونے کے باوجود صوفیاء اور علماء کی مجالس میں بیٹھتے تھے۔ شب بیدار رہنے اور نمازِ تہجد ادا کرنے کے عادی تھے۔ انہوں نے کبھی مکتب سے باقاعدہ تعلیم حاصل نہ کی مگر اردو، فارسی پڑھ لیا کرتے تھے۔ کلام اللہ کی اکثر تلاوت کرتے۔ تصوف کی مشکل باتوں کو سمجھ لیا کرتے تھے۔ اس لئے لوگ ان کو ان پڑھ فلسفی کہتے تھے۔ شیخ نور محمد کی ٹوپیوں کی دکان تھی، جس سے گذر اوقات ہو جاتی تھی۔ کاروبار میں انہیں زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ لہٰذا بقیہ وقت یادِ الٰہی میں یا علماء کی صحبت میں گذرتا تھا۔ مشہور صوفی مفکر ابن عربی کی کتابوں (فصوص الحکم اور فتوحات مکیہ) کا درس خود ان کے گھر میں ہوتا تھا۔

اقبال کی والدہ کا نام امام بی تھا۔ وہ لکھنا پڑھنا تو نہ جانتی تھیں مگر نماز باقاعدگی سے پڑھتی تھیں۔ سمجھدار، معاملہ فہم اور مدبر خاتون تھیں جو اپنے حسنِ سلوک کی وجہ سے محلے کی عورتوں میں بڑی مقبول تھیں۔ غریبوں کی امداد کرتی تھیں۔ ان کی نیک نامی کی وجہ سے لوگ اپنی امانتیں ان کے پاس رکھوایا کرتے تھے۔

متوسط طرز کے اس مکان میں جہاں بجلی بھی نہ تھی، چراغ کی روشنی میں اقبال نے اپنی زندگی کے ابتدائی سبق لئے۔ ساڑھے چار سال کی عمر میں آپ کے والد آپ کو مولانا غلام حسن کے پاس مسجد میں لے گئے اور قرآن سے تعلیم کی ابتداء کی۔

ایک دن مولانا سید میر حسن درس گاہ آئے اور اقبال کو وہاں بیٹھے درس لیتے دیکھا۔ سید میر حسن مردم شناس آدمی تھے، بچے کے اندر چھپے جوہر کو پہچان گئے۔ پوچھا یہ کس کا بچہ ہے؟ جب انہیں معلوم ہوا کہ شیخ نور محمد کا لڑکا ہے تو ان کے پاس جا بیٹھے اور انہیں سمجھایا کہ بچے کو محض دینی تعلیم دلوانا کافی نہیں، اسے جدید تعلیم سے بھی آراستہ کرنا ضروری ہے۔ شیخ نور محمد نے کچھ دن تو پس و پیش کیا، مگر سید میر حسن کے اصرار پر اقبال کو ان کے سپرد کر دیا۔ سید میر حسن نے بڑی توجہ سے تعلیم دینا شروع کی۔ یہ سلسلہ تقریباً تین سال تک جاری رہا۔ سید میر حسن کی صحبت میں دینی و دنیاوی دونوں طرح کی راہنمائی اقبال کو بچپن میں ہی میسر آ گئی۔ میر حسن نہ صرف علومِ اسلامی اور تصوف سے آگاہ تھے بلکہ جدید علوم، ادبیات، لسانیات اور ریاضیات کے ماہر تھے۔ ان کا مطالعہ حیرت انگیز تھا۔ حافظِ قرآن اور بہترین اخلاق کے مالک تھے۔ سید میر حسن نے اقبال کو عربی، فاسی، اردو ادبیات، علم و حکمت اور تصوف وغیرہ کی تعلیم دے کر ان کے دل میں حصولِ علم کے لئے بے پناہ تشنگی پیدا کر دی تھی۔

اقبال کے والد شیخ نور محمد اپنے بیٹے کی تربیت کی غرض سے جب بھی ٹوکتے تو قرآن مجید یا اسوۂ رسول سے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نصیحت کرتے۔ ان کی نصیحت میں موجود اخلاص اور دلسوزی کا اقبال پر بہت اثر ہوتا۔ بچپن میں ایک بار ایک فقیر گھر کے دروازے پر آ کھڑا ہوا۔ وہ کسی صورت نہ ٹلتا تھا۔ اقبال غصے میں آ گئے اور اسے دو تین تھپڑ ایسے مارے کہ جو کچھ اس کی جھولی میں تھا سب گر گیا۔ آپ کے والد یہ دیکھ رہے تھے۔ آپ کی اس حرکت پر وہ بہت افسردہ ہوئے اور ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ فرمایا:

''قیامت کے دن جب رسول اللہ ﷺ کے گرد غازیانِ اسلام، حکماء، شہداء، زہداء، صوفیاء، علماء اور عامیانِ شرمسار جمع ہوں گے تو اس مجمع میں اس مظلوم گداگر کی فریاد آنحضور ﷺ کی نگاہ کو اپنی طرف متوجہ کر لے گی اور آپ ﷺ مجھ سے پوچھیں گے کہ تیرے سپرد ایک مسلم نوجوان کیا گیا تھا کہ تو اس کی تربیت ہمارے بتائے ہوئے طریق پر کرے، لیکن یہ آسان کام بھی تجھ سے نہ ہو سکا تو تب میں اپنے آقا و مولا کو کیا جواب دوں گا۔ بیٹا اس مجمع کا خیال کر اور میری سفید داڑھی کو دیکھ۔ دیکھ میں خوف و امید سے کس طرح کانپ رہا ہوں! باپ پر اتنا ظلم نہ کر اور میرے مولا کے سامنے مجھے یوں ذلیل نہ کرنا۔''

ایک روز اقبال کے والد نے آپ سے کہا کہ میں نے تمہارے پڑھانے لکھانے میں جو محنت صرف کی ہے میں تم سے اس کا معاوضہ چاہتا ہوں۔ اقبال نے پوچھا، وہ کیا؟ کہنے لگے، بیٹے میری محنت کا معاوضہ یہ ہے کہ تم اسلام کی خدمت کرنا۔

لائق بیٹے نے باپ کی لاج رکھ لی۔ آنے والے دور میں آپ ہندوستان کے مسلمانوں کی عظیم الشان خدمت سرانجام دینے والے تھے جس کے پیچھے آپ کے والدین کی تربیت کا پورا پورا ہاتھ تھا۔ اقبال جب صبح صبح قرآن کی تلاوت کرتے تو آپ کے والد آپ کو دیکھ کر گزر جاتے۔ ایک روز آپ کے قریب آئے اور کہنے لگے، بیٹا جب تم قرآن پڑھو تو یہ سمجھو کہ قرآن تم پر ہی اترا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ تم سے ہم کلام ہے۔

قربِ الٰہی کا یہ تصور بچپن سے ہی انہوں نے اقبال کو منتقل کر دیا۔ اقبال اپنے والد کی ہم نشینی میں اس قدر راحت محسوس کرتے کہ فرماتے کہ: ''والد کی یہ محبت اور نگاہِ شفقت یورپ میں حاصل کردہ علوم پر بھاری ہے''۔

ایک دن آپ کے والد اپنے کسی عزیز کے انتقال کا تذکرہ کرتے ہوئے کہنے لگے ''معلوم نہیں بندہ اپنے رب سے کب کا بچھڑا ہوا ہے''۔ اس خیال سے اس قدر متاثر ہوئے کہ نیم بے ہوشی طاری ہو گئی۔

مولوی میر حسن کی خواہش پر شیخ نور محمد نے اقبال کو اسکاچ مشن اسکول میں داخل کر دیا۔ اسکول میں جدید تعلیم، وہاں سے واپسی پر سید میر حسن اور گھر پر والد صاحب، گویا اقبال کی تعلیم و تربیت دینی اور دنیوی دونوں طرح سے بھرپور انداز میں ہو رہی تھی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

علامہ اقبال چھوٹی عمر سے ہی بہت ذہین تھے۔ پڑھائی کا بہت شوق تھا۔ سخت محنتی تھے، رات گئے تک پڑھتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ نصف شب کے قریب آپ کی والدہ کی آنکھ کھلی تو کیا دیکھتی ہیں کہ اقبال لیمپ کے پاس بیٹھے اسکول کا کام کر رہے ہیں۔ انہوں نے دو تین بار آپ کو پکارا کہ اب سو جائیں تو کوئی جواب نہ آیا۔ جب انہوں نے اٹھ کر اقبال کو جھنجھوڑا کہ آدھی رات کو کیا کر رہے ہو تو اونگھتے ہوئے بولے ''سویا ہوا ہی تو ہوں۔'' دراصل اقبال پڑھتے پڑھتے سو گئے تھے۔

۱۸۹۳ء میں علامہ اقبال نے میٹرک کے امتحان میں فرسٹ ڈویژن لے کر کامیابی حاصل کی اور تمغہ و وظیفہ حاصل کیا۔ اندازاً اسی عمر میں اقبال نے چھوٹی چھوٹی غزلیں کہنا شروع کیں۔ گو اشعار سے مناسبت تو انہیں بچپن سے ہی تھی۔ اکثر ایسے جملے بول جاتے جو کسی نہ کسی بحر یا وزن میں ہوتے۔ آپ کی آواز بھی نہایت شیریں تھی۔ بازار سے منظوم قصے خرید کر لے آتے اور گھر کی عورتوں کو خوش الحانی سے پڑھ کر سناتے۔ ایف اے کے لئے اسکاچ مشن کالج میں داخل لیا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب آپ نے ہندوستان کے مشہور شاعر داغ دہلوی کی خدمت میں اپنی چند غزلیں اصلاح کے لئے بھیجیں۔ جناب داغ پہچان گئے کہ یہ طالب علم کوئی معمولی یا شوقیہ غزل گو نہیں ہے، اس لئے لکھوا بھیجا کہ کلام میں اصلاح کی گنجائش بہت کم ہے۔

۱۸۹۵ء میں اقبال نے ایف اے کا امتحان سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا اور اعلیٰ تعلیم کی غرض سے لاہور چلے آئے۔ ہوسٹل میں قیام رہا جہاں آپ کا کمرہ آپ کے دوستوں کی آماجگاہ بنا رہتا۔ ادبی مباحثے ہوتے، شعر کہے اور پڑھے جاتے۔ آپ کے دوستوں کو آپ کی صلاحیتوں کا کچھ اندازہ ہوا تو آپ کو کھینچ کر حکیم امین الدین کی مجلسِ مشاعرہ میں لے گئے جہاں شعر و ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کا ہجوم ہوتا۔ یہاں لاہور میں اقبال نے پہلی بار مشاعرے میں اپنی غزل سنائی۔ جب اس شعر پر پہنچے:

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لئے
قطرے جو تھے میرے عرقِ انفعال کے

تو حاضرین بے اختیار ہو کر داد دینے لگے۔ اقبال کے کلام کو سب نے پسند کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اقبال انجمن مشاعرہ کے رکن بن گئے۔ ابتدائی کلام میں شوخی اور بے ساختہ پن تھا۔ داغ کی زبان، انداز اور موضوعات کو اپناتے تھے۔

۱۸۹۷ء میں بی اے عربی انگریزی اور فلسفے کے مضامین میں سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا۔ مسلمان طلبہ میں آپ اول تھے۔ ایم اے فلسفہ میں داخلہ لیا جہاں پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ آپ کے استاد تھے۔ آرنلڈ جو سرسید اور شبلی نعمانی سے قریبی تعلق رکھتے تھے، اقبال کے لئے ایک استاد کے علاوہ دوست اور رہبر بھی ثابت ہوئے۔ وہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خود اقبال کی صلاحیتوں سے اس قدر متاثر ہوئے کہ اپنے احباب سے اکثر کہتے ''ایسا شاگرد استاد کو محقق اور محقق کو محقق تر بنا دیتا ہے۔'' ۱۸۹۹ء میں اقبال نے ایم اے میں تھرڈ ڈویژن لی۔ مگر یونیورسٹی میں اس مضمون میں واحد کامیاب طالب علم ہونے کی وجہ سے پنجاب بھر میں اول آئے۔

روایتی شاعری سے آغاز

طالب علمی کے دور کی شاعری کے مطالعے سے عیاں ہے کہ شاعری کی ابتداء اقبال نے روایتی غزل گو کی حیثیت سے کی، جس میں عشق مجازی سے متعلق غزلیں کہیں اور جنہیں آپ نے بعد میں خود ہی رد بھی کر دیا۔ اس زمانے میں آپ کی نظر گرد و نواح کے بجائے زیادہ تر اپنی ذات پر مرتکز تھی اور خود زندگی آپ کے سامنے ایک معمہ تھی۔ آپ کی زندگی کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اس نازک دور میں یورپی فلسفے کے مطالعے نے اقبال کو دہریت کی حد تک پہنچایا تھا۔ پھر فلسفہ وحدت الوجود اور خصوصاً انگریزی شعراء میں ورڈز ورتھ کے مطالعے نے آپ کو اس کیفیت سے نکالا۔ یہ دور بہرحال مختلف نظریات، افکار اور جذبات کو پرکھنے کا دور تھا۔ آپ نے ملی شاعری بھی کی، مگر اس کا انداز ماتمی تھا۔

اس زمانے میں اقبال تدریس کے شعبے سے وابستہ ہو گئے اور لاہور کے بہترین کالجوں میں انگریزی اور فلسفے کی تعلیم دینے لگے۔ انجمن حمایتِ اسلام سے آپ کی وابستگی اسی دور میں ہوئی۔ انجمن حمایتِ اسلام مسلمانوں کی اصلاح اور فلاح و بہبود کے لئے مختلف منصوبوں پر کام کر رہی تھی۔ اس کے چندہ جمع کرنے کے لئے منعقد کئے گئے سالانہ جلسے علمی میلوں کی شکل اختیار کر گئے تھے جن میں مشہور مسلمان شاعروں، ادیبوں اور ملّی راہنماؤں کی بڑی تعداد شامل ہوتی۔ ان میں حالی، شبلی، اکبر الٰہ آبادی، ارشد گورگانی، ڈپٹی نذیر احمد، مولانا ابوالکلام آزاد، خواجہ حسن نظامی، سر عبدالقادر اور مولانا نذیر احمد دہلوی قابل ذکر ہیں۔

اقبال نے پہلی مرتبہ انجمن کے اسٹیج پر ۲۴ فروری ۱۹۰۰ء کے سالانہ جلسے میں اپنی نظم ''نالۂ یتیم'' پڑھی۔ اس نظم میں اس سوز و گداز سے یتیموں کی حالت کا نقشہ اور دربارِ رسالت میں ان کی حاضری اور رسالت مآب ﷺ کی معرفت ان کی امداد کا پیغام دیا کہ لوگوں کی چیخیں نکل گئیں۔ لوگوں نے جیبیں الٹ دیں۔ نظم کے خاتمے پر صاحبِ صدر نے کہا کہ میں نے اپنے کانوں سے انیس و دبیر کے مرثیے سنے، مگر جس پائے کی نظم آج سننے میں آئی اور جو اثر اس نے میرے دل پر کیا وہ اس سے پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ لوگوں نے اقبال کو مجبور کر کے نظم دوبارہ پڑھوائی۔ دورانِ نظم ہی اس کی اثر پذیری دیکھ کر اقبال کو چند بند پڑھنے کے بعد روک دیا گیا کہ نظم کی مطبوعہ کاپیاں جن کی تعداد سینکڑوں میں تھی، فروخت کر لی جائیں تو پھر آگے پڑھیں۔ ایک ایک کاپی چار چار روپے میں فروخت ہوئی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مگر مانگ بدستور رہی۔ چنانچہ بعض حضرات نے اپنی خریدی ہوئی کاپیاں اس شرط پر انجمن کو مکرر عطیہ میں دے دیں کہ کوئی جلد پچاس روپے سے کم میں فروخت نہ ہو۔ چند لمحوں بعد وہ بھی بک گئیں۔ اقبال کے والد نے جو اس وقت گیلری میں بیٹھے تھے، سولہ روپے میں ایک جلد خریدی۔

۱۹۰۰ء سے ۱۹۰۴ء تک محض تیئس سال کی عمر میں اقبال انجمن کے جلسوں کی جان بن گئے۔ آپ کی نظمیں انجمن کے سالانہ جلسوں کی امتیازی خصوصیت بن گئیں اور آپ کا ڈنکا ہندوستان بھر میں بجنے لگا۔ لیکن یہی وہ وقت تھا جب آپ نے یورپ جا کر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا ارادہ کیا۔

اعلیٰ تعلیم اور قیامِ یورپ

۱۹۰۵ء کی آخری سہ ماہی میں اقبال یورپ روانہ ہوئے اور ۱۹۰۸ء کے وسط میں پی ایچ ڈی اور بیرسٹری کی ڈگری لے کر وطن واپس آ گئے۔

یورپ میں قیام کے دوران اقبال میں جو سب سے بڑا انقلاب آیا وہ فلسفے اور رائج الوقت تصوف سے متنفر ہو کر ذہنی اور قلبی طور پر آپ کا اسلامی تعلیمات کی طرف رجوع کرنا تھا۔ اپنے قیام کے دوران آپ نے بغور مغربی معاشرے کا مطالعہ کیا جو بظاہر جتنا بھرپور تھا باطنی طور پر اتنا ہی تہی دامن تھا۔ اقبال نے محسوس کیا کہ مغربی معاشرے کی بنیاد سراسر مادہ پرستی اور لادینیت پر رکھی گئی ہے جو دنی انسانی جذبات اور کم ظرفی کو جنم دیتی ہے۔ اگرچہ یورپ نے عقلی علوم، سائنس اور ٹیکنالوجی میں کمال حاصل کر لیا ہے مگر وہ اس عشق سے محروم ہے جو روح کے اندر حقیقی معنوں میں احترامِ آدمیت یا انسان دوستی کو جنم دیتا ہے اور ارتقائے حیات کا ضامن ہے۔

یورپ کے قیام کے دوران آپ کے خیالات میں ایک اور بنیادی تبدیلی آئی اور وطنی قومیت کی بنیاد پر اپنی برتری اور دوسروں کا استحصال آپ کو انسان دوستی اور احترامِ آدمیت کے آفاقی اصولوں کے سراسر منافی لگنے لگا۔ یورپی اقوام کے عسکری طاقت کے بل بوتے پر محض اپنے مفادات کے لئے ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہونے نے آپ کو ملوکیت، استعمار اور وطنی قومیت کے شدید مخالفین میں سے بنا دیا۔ یہ نفرت اس قدر شدید تھی کہ آپ کو ماضی کے اپنے اس کلام پر بھی افسوس ہونے لگا جو آپ نے وطنی قومیت کے جذبے سے سرشار ہو کر لکھا تھا (مثلاً سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا) اور آپ اپنے قیامِ یورپ سے قبل کے کلام کو زمانۂ جاہلیت کا کلام کہنے لگے۔

غرض قیامِ یورپ نے آپ کے خیالات میں جو انقلاب پیدا کیا اس کے متعلق لکھتے ہیں:

''اس زمانے میں سب سے بڑا دشمن اسلام اور اسلامیوں کا نسلی امتیاز و ملکی قومیت کا خیال

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے۔ پندرہ برس ہوئے جب میں نے پہلے پہل اس کا احساس کیا۔ اس وقت میں یورپ میں تھا اور اس احساس نے میرے خیالات میں انقلابِ عظیم پیدا کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یورپ کی آب و ہوا نے مجھے مسلمان کر دیا۔''

اقبال کے دور کے حالات

اقبال جس دور میں پیدا ہوئے اور پروان چڑھے اس دور میں مسلمانانِ عالم کو عموماً اور مسلمانانِ برصغیر کو بالخصوص دو طرح کے چیلنج درپیش تھے، داخلی اور خارجی۔

خارجی سطح پر یہ زمانہ دنیائے اسلام پر سخت آزمائشوں کا زمانہ تھا۔ مسلمانوں کی عظیم الشان سلطنتِ عثمانیہ کی گرفت اپنے علاقوں پر کمزور پڑ چکی تھی۔ اندرونی خلفشار اور معاشی کمزوری کی وجہ سے سلطنت بیرونی حملہ آوروں سے اپنا دفاع نہ کر سکتی تھی۔ ایک طرف سے روس وسطی ایشیاء کی مسلم ریاستوں کو ایک ایک کر کے ہڑپ کر رہا تھا تو دوسری طرف یورپ میں بیداری کی لہر اور نشاۃ ثانیہ کے نتیجے میں علمی ترقی اور صنعتی انقلاب نے ان کی سیاسی طاقت بھی کئی گنا بڑھا دی تھی۔ وہ طاقت کے نشے میں چور ایک دوسرے سے بڑھ کر فتوحات کے جھنڈے گاڑنے کی دوڑ میں لگ گئے تھے اور یوں افریقی مسلم ممالک بھی فرانسیسیوں اور انگریزوں کے قبضے میں چلے گئے تھے۔ صنعت و تجارت کے لئے نئی منڈیوں کی تلاش انہیں ایشیائی ملکوں تک لے آئی، جہاں کی نااہل اور روبہ زوال حکومتیں ایک کے بعد ایک سامراجی طاقتوں کے قبضے میں چلی گئیں۔ ان عالمگیر تبدیلیوں کے نتیجے میں سب سے زیادہ مسلمانوں نے نقصان اٹھایا۔

یہ ذلت اور پستی جو غلامی کی صورت میں مسلمانوں کے حصے میں آئی تھی، جہاں یورپ کی بیداری اور ترقی کے باعث تھی وہیں اس کا سب سے بڑا سبب مسلمانوں کی داخلی سطح پر نااہلی، دین سے دوری اور اتحاد کی کمی تھی۔ مسلمانوں کی سیاسی برتری سے شروع ہونے والی تاریخِ اسلام اب مختلف نشیب و فراز سے گزرتی ہوئی ایسے دور میں داخل ہو چکی تھی جہاں ذلت اور رسوائی کے سوا انکے ہاتھ کچھ بھی نہ آیا۔ ہندوستان میں مغل سلطنت اورنگزیب عالمگیر (متوفی ۱۷۰۷ء) کے بعد شکست و ریخت کا شکار ہونے لگی اور ایک طرف مرہٹوں، سکھوں اور جاٹوں نے علمِ بغاوت بلند کیا تو دوسری طرف تجارت کے لئے آنے والے انگریزوں، فرانسیسیوں اور پرتگالیوں نے ہندوستان کو اپنی نو آبادی بنانے کی مہم تیز کر دی۔ سو سال کی طوائف الملوکی کے بعد بالآخر ۱۸۵۷ء کی جنگ نے فیصلہ کر دیا، انگریز برِصغیر پر قابض ہو گئے اور ایک ہزار سال کی حکومت کے بعد ہندوستان مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل گیا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مسلمان پچھلی کئی صدیوں سے سائنسی علوم سے بے بہرہ تھے اور تصوف کی افیون کے دلدادہ چلے آ رہے تھے۔ یورپی عوام کی علمی ترقی اور بڑھتی ہوئی طاقت سے مقابلے کے لئے انہوں نے کوئی تیاری نہ کی۔ یورپ کے صنعتی انقلاب کا نہ ان کے پاس کوئی جواب تھا اور نہ انہوں نے اس کو اپنانے کی کوشش کی۔ سائنس و ٹیکنالوجی کے میدان میں آئے دن کی ایجادات میں بھی ان کا کوئی حصہ نہ تھا۔ بارود کی ایجاد نے عسکری طاقت کا توازن فیصلہ کن طور پر یورپ کے پلڑے میں ڈال دیا تھا۔ تہذیبی و تمدنی سطح پر بھی مسلمان بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ سیاسی میدان میں اٹھارویں صدی کے فرانسیسی انقلاب کے بعد دنیا بھر میں جمہوریت کا چرچا تھا۔ جبکہ مسلمانوں کی نااہل مطلق العنان حکومتیں نہ تو خود اقتدار سے علیحدہ ہو کر جمہوری نظام کی بنیاد ڈال سکیں اور نہ ہی عوام کی سطح پر اس کے لئے کوئی کوشش کی گئی۔ یوں پر جوش اور تازہ دم یورپی اقوام کا غلبہ بیسویں صدی کے نصف اول میں اس درجہ کامل ہو گیا کہ سوائے ایران اور افغانستان کے تمام عالمِ اسلام استعماری طاقتوں کے براہ راست زیرِ نگیں آ گیا۔

اسلامی تاریخ کے ابتدائی چھ سو سال علمی خدمات کے لحاظ سے یادگار رہے تھے۔ دینی و دنیاوی علوم میں نئے نئے فکری اضافے مسلسل ہو رہے تھے۔ حکمرانوں کی سختیوں اور کسی خاص مکتبہ فکر کی پشت پناہی نے بھی ان کی آزاد فکری اور مزید علوم کے لئے جستجو میں کمی نہیں آنے دی تھی۔ البتہ یونانی فلسفے کی غیر معمولی مقبولیت نے صحیح اسلامی فکر کو قابل ذکر نقصان پہنچایا لیکن امام غزالیؒ نے اس کا اثر زائل کرنے کی بھرپور کوشش کی اور علم الکلام اور تصوف کے اکثر تصورات کو فقہ کا پابند بنا کر داخلِ اسلام کر دیا۔ علمائے وقت نے آئے روز کے نئے نئے فتنوں سے امت کو بچانے کے لئے تقلیدِ محض اور ائمہ اربعہ کے فقہی مسالک سے ہٹ کر نئی راہ نکالنے پر گویا قدغن لگا دی۔ اگرچہ یہ اقدام ایک اچھے مقصد کے لئے صحیح نیت سے کیا گیا تھا لیکن یہ مسلمانوں کے لئے تباہ کن ثابت ہوا۔ علمی، عملی اور فکری سوتے خشک ہو گئے۔ جو لوگ ظاہری باتوں اور فقہی باریکیوں سے متنفر تھے وہ تصوف کی چادر تان کر گہری نیند سو گئے۔ دیگر حضرات اپنی فقہ کی دوسری فقہ پر برتری ثابت کرنے کی دھن میں لگ گئے اور اس مشغلے میں مسلمانوں نے کئی صدیاں ضائع کر دیں۔ بے عملی، تن آسانی اور تصوف و فلسفہ کی افیون نے انہیں اپنے حال میں مست کر دیا اور وہ یہ اندازہ ہی نہ لگا سکے کہ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے۔

غلامی کے پنجے سے آزاد ہونے اور اصلاحِ احوال کے لئے مسلمانوں کی طرف سے علمی اور سیاسی سطح پر کوششوں کا آغاز ہوا۔ ہندی مسلمانوں میں بھی سوچنے سمجھنے والے حضرات نے اس صورتحال سے نمٹنے کے لئے مختلف آراء پر غور کیا۔ مگر ان کا سیاسی مسئلہ کسی بھی دوسرے خطے کے مسلمانوں سے زیادہ پیچیدہ تھا۔ ان کو ایک ساتھ دو محاذوں پر مخالف قوتوں سے نمٹنا تھا۔ ہندو اکثریت، جس پر انہوں نے طویل عرصے تک اپنے برتر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نظریئے اور مذہبی جوش کی بدولت حکومت کی تھی اور انگریز جوان کا حاکم تھا اور جس نے ان سے حکومت چھین کر انہیں دیوار سے لگایا تھا۔ انگریزوں کے تعصب اور ہندوؤں کی چالاکیوں کے علاوہ نئے طرز کے جمہوری نظام میں فیصلہ اکثریت کو ووٹ کے ذریعے کرنا تھا جس کا انجام ان کو بخوبی معلوم تھا۔ ان حالات میں کوئی ایک چیز بھی ان کے حق میں نہ تھی۔

ایسے میں سرسید احمد خان اٹھے اور انہوں نے وقتی مصلحتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے مسلمانوں کو انگریزوں سے بگاڑنے کے بجائے بنا کر رکھنے کی تلقین کی اور انگریزوں اور مسلمانوں کے درمیان پل کا کردار ادا کیا۔ وہ جدید تہذیب سے سخت متاثر تھے۔ مغربی اقوام کی مختلف علوم میں کامیابیوں کے پیش نظر انہوں نے مسلمانوں کو تلقین کی کہ وہ اپنے خول سے نکلیں، وقت کے تقاضے کے مطابق انگریزی زبان سیکھیں، سائنسی علوم اور تحقیق کی طرف توجہ دیں اور تجارت اور صنعت وحرفت کے میدان میں کوشش کریں تاکہ ہندو اکثریت کے آگے وہ سر اٹھا سکیں۔ اس میدان میں علی گڑھ یونیورسٹی کے قیام کے علاوہ ڈھیروں علمی کارنامے ان سے منسوب ہیں۔ یہ بلاشبہ تازہ ہوا کا جھونکا تھا، لیکن سرسید کی انگریزوں سے حد سے بڑھی ہوئی وفاداری، اکثر معاملوں میں ان کی حمایت اور دینی معاملات کا فہم نہ ہونے کے باوجود اپنے دینی نظریات کی تشہیر نے علماء کو ان کے سخت خلاف کر دیا۔ شبہ کیا جانے لگا کہ مسلمانوں کی نئی نسل میں جدید تعلیم کے ذریعے سرسید اپنے مذہبی نظریات پھیلانا چاہتے ہیں۔ ان پر کفر کے فتوے لگے۔

اس ساری کشمکش کے دوران اتنا ضرور ہوا کہ مسلمانوں کا ایک طبقہ جدید تعلیم حاصل کرنے کے لئے رضامند ہو گیا مگر اس کے ساتھ ہی مغربی تہذیب کی یلغار کی نذر ہو گیا، جبکہ دوسرا طبقہ جو زیادہ تر روایت پسند مولویوں پر مشتمل تھا، جدید تعلیم کا سخت مخالف تھا اور انگریزوں پر ہندوؤں کو فوقیت دیتا تھا۔ پھر دنیا بھر میں وطنیت اور قومیت کے نعروں کا چرچا تھا جس سے نوجوان مسلم تعلیم یافتہ طبقہ متاثر ہو رہا تھا۔ ان تمام حالات کے تناظر میں مولانا محمد شبلی نعمانی نے (جو اگرچہ سرسید کے ساتھی بھی تھے مگر ان کے مذہبی اور سیاسی نظریات کے مخالف تھے) ۱۹۰۵ء میں علی گڑھ کالج چھوڑ کر ندوۃ العلماء سے تعلق استوار کیا اور تحریکِ اتحادِ اسلام میں گہری دلچسپی لی۔ آئے دن کسی نہ کسی مسلم ملک پر مغربی استعمار کے ہاتھوں مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا تھا جسے مسلمانانِ ہند محسوس کرتے تھے، مگر محض تماشائی بن کر رہنے پر مجبور تھے۔ نہ ان کی کوئی معقول سیاسی تنظیم تھی، نہ قیادت۔ اس لئے تعلیم یافتہ طبقہ بیک وقت وطنی قومیت اور عالمی اسلامی اخوت کے متضاد جذبات کا حامل تھا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اقبال کی یورپ سے واپسی اور مفکرِ اسلام کا کردار

اقبال بھی اسی تعلیم یافتہ مسلمان گروہ کے فرد تھے اور وطنی جذبات کی رو میں بہہ کر لکھ رہے تھے:

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

البتہ جیسا کہ اس سے قبل گذر چکا ہے، قیامِ یورپ نے آپ کے خیالات میں ایسا انقلاب برپا کیا جس نے آپ کو نہ صرف قومی اور وطنی نعروں سے سخت متنفر کر دیا بلکہ مشرق و مغرب کے موازنے نے بہت ساری حقیقتوں کا انکشاف کیا۔ چیزیں آپ پر واضح ہونے لگیں۔ عالمِ اسلام کے حقیقی مسائل اور خامیاں کھل کر آشکار ہو گئیں۔ امت کو اس حال تک پہنچانے کے ذمہ دار کیا اسباب تھے، ان کے جان لینے کے بعد اقبال کو وہ راستہ صاف نظر آنے لگا جس پر چل کر حالات کی اصلاح کی جا سکتی تھی۔ تاہم ابتداء میں آپ اس مقصد کے لئے شاعری کو ذریعہ اظہار بنانے پر رضامند نہ تھے اور دوران قیامِ یورپ ایک مقام پر آ کر اسے ترک کر دینا چاہتے تھے۔ مگر سر عبدالقادر اور پروفیسر آرنلڈ نے سمجھایا کہ آپ کے کلام میں وہ تاثیر ہے جس سے آپ کی درماندہ قوم اور بدنصیب ملک کے امراض کا علاج ہو سکنے کا امکان ہے۔ اس لئے ایسی مفید خداداد قوت کو معطل کر دینا مناسب نہیں ہے۔ بہرحال یورپ سے واپسی کے بعد شاعری ہی آپ کے پیغام کا بنیادی ذریعہ بنی۔

خودی

اقبال محسوس کرتے تھے کہ یقین و ایمان کی حقیقی دولت سے مسلمان محروم ہیں۔ اگرچہ بات بات پر وہ دین کا حوالہ دیتے ہیں مگر ایسا یقین جو انسان کا عمل بدل سکے وہ موجود نہیں:

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے

اور اس کی وجہ اس کے سواء کچھ نہیں ہے کہ اپنی خامیوں اور بیرونی طاقتوں کے رعب کی وجہ سے وہ اپنا مقام ہی فراموش کر بیٹھے ہیں۔ خلافتِ ارضی کا جو تصور قرآن نے دیا اور امامت کی جو ذمہ داری مسلمانوں پر ڈالی ہے اس کی طرف سے مسلسل عدم توجہی نے انہیں بے یقینی اور کم مائیگی کی قعر مذلت میں لے جا پھینکا ہے، جس سے انہیں سوائے ''خودی'' کے کوئی نہیں نکال سکتا۔ کہتے ہیں:

تیری خودی میں اگر انقلاب ہو پیدا
عجب نہیں ہے کہ یہ چار سو بدل جائے

اقبال خودی کا لفظی مطلب بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس کا مفہوم محض ''احساسِ نفس اور یقینِ ذات''

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے۔ اقبال کی بتائی ہوئی خودی دراصل عرفانِ ذات اور خود آ گاہی کا دوسرا نام ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ انسان کائنات میں اپنی حیثیت اور اپنے مقصدِ وجود کو پہچانے، پھر خدا کی جانب سے دی گئی اپنے اندر کی قوتوں، صلاحیتوں اور استعداد کا اندازہ لگائے، ان کو جگائے اور عمل میں ڈھالے۔ عمل ہی کو اپنا مقصودِ زندگی بنا لے اور اس مقصد کے حصول کی کوشش ہی کو زندگی سمجھے۔

شخصی سلطنتوں کے اثرات، پیہم مظالم اور مسلسل جنگوں کے نتیجے میں عام انسانوں میں زندگی سے بیزاری، اپنے مستقبل سے مایوسی اور احساس کمتری پیدا ہوگیا تھا اور انسان خود اپنی نگاہ میں ذلیل ہوگیا تھا۔ مغربی معاشروں میں عیسائیت کے زیرِ اثر انسان کے گناہ گار ہونے اور مسیح کا اس کی طرف سے کفارہ بننے کا عقیدہ موجود تھا۔ کلیسا سے نجات پانے کے بعد بھی مغربی معاشرے اس تصور سے جان نہ چھڑا سکے اور مادی تصورِ حیات کے تحت انسان کو پیداوار کا ایک آلہ، ایک بے جان مشین اور ترقی یافتہ حیوان سمجھا گیا جو صرف حیوانی تقاضوں کو پورا کرنا اور بازار کے لئے نفع بخش مال تیار کرنا جانتا تھا۔ اس تصور میں انسان کی خیر پسندی اور تمام مخلصانہ جذبات، روحانی اقدار اور باطنی کائنات سے قطع نظر کر کے اسے اندھی فطرت کے آگے ایک بے چاری و بے حقیقت مخلوق سمجھا گیا۔

یہ تو مغرب کا حال تھا جو دنیا کی قیادت کر رہا تھا۔ اس کی مفتوحہ اور زیرِ اثر کالونیوں میں حالات اس سے بھی بدتر تھے۔ برِصغیر میں مسلمانوں کا حال یہ تھا کہ انگریزوں کی غلامی سے قبل بھی عجمی تصوف نے اپنی ذات کو خدا کی ذات میں فنا کرنے کا نظریہ دے کر انکارِ ذات اور خود شکنی کی تلقین اتنے زور و شور سے کی تھی کہ خود شناسی جس پر حرکت، جدو جہد اور کشمکش موقوف ہے، ایک اخلاقی جرم اور ناپسندیدہ چیز سمجھی جانے لگی تھی۔ انسان کے مقام سے غفلت برتنے کی وجہ سے تحقیرِ انسانیت کی جس رو کا آغاز ہوا اس نے برصغیر کے مسلمانوں میں بے عملی کو جنم دیا۔ اقبال مشرق و مغرب کی اس حالت کا نوحہ پڑھتے ہیں:

خودی کی موت سے مغرب کا اندروں بے نور
خودی کی موت سے مشرق ہے مبتلائے جذام
خودی کی موت سے ہے روحِ عرب بے تب و تاب
بدن عراق و عجم کا ہے بے عروق و عظام
خودی کی موت ہے ہندی شکستہ بالوں پر
قفس ہوا ہے حلال اور آشیانہ حرام
خودی کی موت سے پیرِ حرم ہوا مجبور
کہ بیچ کھائے مسلمان کا جامۂ احرام

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اقبال کی نظر میں مسلمان تو خصوصاً جب تک شعوری طور پر اپنی حقیقت، ذمہ داری اور مقام سے آگاہ نہیں ہوگا، اس وقت تک اسلام کے پیغام کو سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہوگا اور عمل کے میدان میں اس کی کوششوں کو دیگر انسانوں کی کوششوں سے ممیّز نہیں کیا جاسکے گا جن کی خود سے لاعلمی نے انہیں حیوانی طرز کی زندگی گزارنے سے قریب تر کر دیا ہے اور وہ صبح و شام کے اسیر بن کر رہ گئے ہیں۔

اقبال مسلمانوں سے کہتے ہیں:

خودی میں ڈوب جا غافل یہ سرِّ زندگانی ہے
نکل کر حلقۂ شام و سحر سے جاوداں ہو جا

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

خودی کی یہ ہے منزلِ اولیں
مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں
تیری آگ اس خاکداں سے نہیں
جہاں تجھ سے ہے تو جہاں سے نہیں
بڑھے جا یہ کوہِ گراں توڑ کر
طلسمِ زمان و مکاں توڑ کر
خودی شیر مولا جہاں اس کا صید
زمیں اس کی صید آسماں اس کا صید

وجودی تصوف کے زیرِ اثر ''فنافی اللہ'' کے نظریے نے جہاں بے عملی کی بنیاد فراہم کی تھی وہاں غلامی نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی تھی۔ اپنی شناخت و پہچان، اپنے دین کی عظمت، اپنی اقدار کا پاس اور غیرت کا نام و نشان نہ رہا۔ ہندوستان کے مسلمان افراد کا ایسا ہجوم بن گئے جن کے پاس زندگی کے لئے کوئی نظریہ حیات، رہنمائی کے لئے کوئی اصول اور آگے بڑھنے کا کوئی جذبہ نہ تھا۔ ان کا اپنے اوپر سے اعتماد اٹھ چکا تھا۔ ایسے میں اقبال ان کی مجروح اور پامال خودی کو جگاتے ہوئے ان کی اہمیت کا احساس انہیں دلاتے ہیں:

تو رازِ کن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا
خودی کا رازداں ہو جا خدا کا ترجماں ہو جا

اجتماعی حیثیت میں بھی اقبال خودی کا پیغام دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ مسلمان من حیث القوم یہ جان لیں کہ اسلام اپنی ذات میں اور اپنی اصلیت میں انسانی معاشروں کو چلانے کی اعلیٰ ترین بنیادوں کا حامل ہے اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دوسروں کا محتاج نہیں:

مکاں فانی، مکیں آنی، ازل تیرا، ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام ہے تو، جاوداں تو ہے

اقبالؒ کہتے ہیں کہ ایک بار مسلمان اپنی خودی کو پروان تو چڑھائیں پھر دیکھیں کہ حالات کس طرح پلٹا کھاتے ہیں:

خودی کی پرورش و تربیت پہ ہے موقوف
کہ مشتِ خاک میں پیدا ہو آتشِ ہمہ سوز

جس قوم میں خودی پیدا ہو جائے تو ظاہری اسباب کے نہ ہونے کے باوجود کوئی اس قوم کی طرف میلی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتا:

اس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی
ہو جس کے جوانوں کی خودی صورتِ فولاد

کہتے ہیں کہ مسلمان غلامی کے طوق سے نجات بھی خودی کی بدولت حاصل کر سکتے ہیں:

سنا ہے میں نے غلامی سے امتوں کی نجات
خودی کی پرورش و لذتِ نمود میں ہے

اقبال کا پیغامِ خودی آپ کے اشعار میں اس یقین کے ساتھ جھلکتا ہے کہ اسی کی بناء پر مسلمان دنیا کی قوموں میں سرفرازی حاصل کر سکتے ہیں:

خودی کے زور سے دنیا پہ چھا جا
مقامِ رنگ و بو کا راز پا جا
برنگِ بحر ساحل آشنا رہ
کفِ ساحل سے دامن کھینچتا جا

فلسفۂ عشق

اقبال مسلمانوں کی اس حالتِ زار کا سب سے بڑا ذمہ دار خود مذہبی پیشواؤں کو قرار دیتے ہیں جو اسلام کی اصل روح کو ہی نہ سمجھ سکے اور یوں ملا ظاہری اسلام کا اور صوفی خانقاہوں میں بیٹھے حال و مقامات کا پرچار کرتے رہے۔ اسلام کے اصل فلسفے سے نہ یہ باخبر تھے اور نہ وہ اور جب یہ بے چارے خود ہی لاعلم تھے تو امت کو کیا خبردار کرتے۔ اقبال ملاّ سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عجب نہیں کہ خدا تک تری رسائی ہو
تری نگہ سے ہے پوشیدہ آدمی کا مقام
تری نماز میں باقی جلال ہے نہ جمال
تری اذاں میں نہیں ہے مری سحر کا پیغام

پھر مذہبی پیشواؤں کے Vision کا رونا روتے ہوئے کہتے ہیں:

اے مردِ خدا تجھ کو وہ قوت نہیں حاصل
جا بیٹھ کسی غار میں اللہ کو کر یاد
مسکینی و محکومی و نومیدیٔ جاوید
جس کا یہ تصوف ہو وہ اسلام کر ایجاد
ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

اقبالؒ کہتے ہیں کہ یہ وہ لوگ نہیں جو اسلام پر غور و فکر اور عمل کے بعد امت کی رہنمائی کے منصب پر پہنچے ہوں بلکہ یہ مسند تو انہیں میراث میں ملی ہے:

میراث میں آئی ہے انہیں مسندِ ارشاد
زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن

اقبال کہتے ہیں کہ اللہ مومن کے ہاتھ میں دنیا کی امامت دینا چاہتا ہے، جبکہ یہ ملا وخطیب وصوفی بال سے باریک مسائل پر عمریں بِتا رہے ہیں اور امامت کے تقاضوں سے بے خبر ہیں:

میں جانتا ہوں جماعت کا حشر کیا ہوگا
مسائلِ نظری میں الجھ گیا ہے خطیب

فرماتے ہیں:

کیا صوفی و ملا کو خبر میرے جنوں کی
ان کا سرِ دامن بھی ابھی چاک نہیں ہے

اقبالؒ صرف طنز ہی نہیں کرتے بلکہ انتہائی لجاجت سے انہیں اپنے اپنے خول سے باہر آنے اور امت کے مسائل حل کرنے کی دعوت دیتے ہیں:

اے پیرِ حرم رسم و رہِ خانقاہی چھوڑ
مقصود سمجھ میری نوائے سحری کا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اللہ رکھے تیرے جوانوں کو سلامت
دے ان کو سبق خود شکنی خودنگری کا
تو ان کو سکھا خارہ شگافی کے طریقے
مغرب نے سکھایا انہیں فن شیشہ گری کا
دل توڑ گئی ان کا دو صدیوں کی غلامی
دارو کوئی سوچ ان کی پریشاں نظری کا

اقبال کی نگاہ اس گوہرِ نایاب کو ڈھونڈتی ہے جو اپنے گفتار و کردار اور علم و عمل کو عشق کی آنچ سے تپا کر کندن بنا چکا ہو۔ کہتے ہیں:

صوفی کی طریقت میں فقط مستیٔ احوال
ملا کی شریعت میں فقط مستیٔ گفتار
شاعر کی نوا مردہ و افسردہ و بے ذوق
افکار میں سرمست! نہ خوابیدہ نہ بیدار
وہ مردِ مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو
ہو جس کے رگ و پے میں فقط مستیٔ کردار

کہتے ہیں:

تمدن، تصوف، شریعت، کلام — بتانِ عجم کے پجاری تمام
حقیقت خرافات میں کھو گئی — یہ امت روایات میں کھو گئی
لبھاتا ہے دل کو کلامِ خطیب — مگر لذتِ شوق سے بے نصیب
بیاں اس کا منطق سے سلجھا ہوا — لغت کے بکھیڑوں میں الجھا ہوا
وہ صوفی کہ تھا خدمتِ حق میں مرد — محبت میں یکتا حمیت میں فرد
عجم کے خیالات میں کھو گیا — یہ سالک مقامات میں کھو گیا
بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

اقبالؒ کے نزدیک عشق کسی شئے کو اپنے اندر جذب کر لینے اور اسے اپنا جزءِ حیات بنا کر اپنا لینے کا نام ہے۔ دین کی بنیادوں کو ایمان و یقین اور عشق و محبت سے مضبوط کیا جا سکتا ہے۔ اگر عشق و محبت کو بیچ میں سے نکال دیا جائے تو دین ظاہری رسوم اور بے جان احکام کے مجموعے کا نام رہ جائے گا جو زندگی کی رعنائی و توانائی سے خالی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور اثر و نفوذ سے عاری ہوگا۔ کہتے ہیں:

محبت کا جنوں باقی نہیں ہے
مسلماں میں خوں باقی نہیں ہے
صفیں کج، دل پریشان، سجدہ بے ذوق
کہ جذبِ اندروں باقی نہیں ہے

تکوینِ کائنات اور ارتقائے حیات دونوں کا سرچشمہ عشق ہے۔ اقبال اس عشق کے قائل نہیں جو صوفی کو بے جان لاشہ بنا کر چھوڑتا ہے اور وہ اس عشق میں ایسا گھلتا ہے کہ اس کا وجود ہی باقی نہیں رہتا۔ بلکہ آپ کے نزدیک عشق قوتِ عمل اور جوشِ انقلاب کا دوسرا نام ہے۔ عشق خلاقی ارتقاء اور قوت وجلال کا ضامن ہے:

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصلِ حیات، موت ہے اس پر حرام

مسلمان کے عشق کی نوعیت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

عشق دمِ جبرئیلؑ عشق دلِ مصطفیٰ
عشق خدا کا رسول عشق خدا کا کلام

عشق کے مختلف مظاہر کا تذکرہ بڑی خوبصورتی سے کرتے ہوئے کہتے ہیں:

صدقِ خلیلؑ بھی ہے عشق، صبرِ حسینؓ بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

آپ کے نزدیک یہ کوئی وقتی جذبہ نہیں ہے بلکہ یہ تو بندۂ مومن کی پوری زندگی پر محیط ہے:

شوق میری لے میں ہے، شوق میری نے میں ہے
نغمۂ اللہ ہو میری رگ و پے میں ہے

اقبالؒ کہتے ہیں کہ انسان کو فرشتوں پر اسی لئے فضیلت حاصل ہے کہ وہ مقصد آفرینی اور آرزو کی بیتابی کے ساتھ عشق کا سوز و گداز بھی رکھتا ہے۔ عشق کی عدم موجودگی خدا اور بندے کے درمیان حجاب کا باعث ہے:

شوق اگر تیرا نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب میرا سجود بھی حجاب

عشق کی بے تابیاں رات کی تاریکیوں میں آہِ سحری بن کر عرش تک جاتی ہیں اور دن کے اجالے میں پیہم عمل کی شکل اختیار کر کے رضائے الٰہی کی تلاش میں رہتی ہیں۔ اگر ایک بندۂ مومن کی یہ کیفیت نہ ہو تو قلب و نظر کی خواری اور رسوائی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تیری سزا ہے نوائے سحر سے محرومی
مقامِ شوق و سرورِ نظر سے محرومی

پھر تاریخ کے بڑے ناموں کا تذکرہ کرتے ہیں کہ:

عطار ہو، رومی ہو، رازی ہو، غزالی ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحر گاہی

آگے اقبال اپنے لئے اور مسلمان بچوں کے لئے خصوصی دعا کرتے ہیں:

شرابِ کہن پھر پلا ساقیا
وہی جام گردش میں لا ساقیا
مجھے عشق کے پر لگا کر اڑا
مری خاک جگنو بنا کر اڑا
تڑپنے پھڑکنے کی توفیق دے
دلِ مرتضیٰؓ سوزِ صدیقؓ دے
جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے
میرا عشق، میری نظر بخش دے

فقر

اقبال مسلمانوں کی ذلت اور پستی کا ایک سبب مغربی تہذیب کی اندھی تقلید کو بھی سمجھتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ مغربی تہذیب بظاہر بڑی چمکدار ہے۔ اس کی رعنائی تعمیر، رونق وحسن، تجارت، صنعت وحرفت سب انسانی ذہن کو مرعوب کرتے ہیں۔ مگر اس کی مادہ پرستی کا حال یہ ہے کہ اس کی تجارت میں ایک کا نفع اور لاکھوں کی موت پوشیدہ ہے۔ مغربی قائدین بنی آدم کا خون پیتے ہیں اور اسٹیج پر آ کر انسانی مساوات اور عدالتِ اجتماعی کی تعلیم دیتے ہیں۔ ان کے کمالات کی حد برق و بخارات سے آگے نہیں۔ جس تہذیب میں مشینوں کی حکومت ہو، صنعت وحرفت کی پادشاہی ہو، اس میں دلوں کی موت، احساسِ مروت اور انسانی شرف وعزت کی ہلاکت یقینی ہے۔ اقبال سمجھتے ہیں کہ یورپ کے سرمایہ دارانہ نظام میں ہر چیز کا ترازو مادی نفع ونقصان ہے۔ مادی نقطہ نظر حرص و ہوس، اضطراب وانتشار کو جنم دیتا ہے جو بالآخر انسانوں کے استحصال کا باعث بنتا ہے۔ اس کے مقابلے میں اقبال مسلمانوں کو فقر کی تعلیم دیتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک فقر ایک طرزِ زندگی ہے اور زندگی کے ایک رویئے کا نام ہے جو مادہ پرستانہ ذہنیت کے بالکل برعکس پروان چڑھتا ہے۔ شخصی فائدے، لالچ، طمع اور دنیا پرستی کے مقابلے میں اعلیٰ انسانی کردار کو جنم دیتا ہے۔

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ فقر معاشی بدحالی، مفلسی یا گداگری کا نام نہیں اور نہ ہی یہ ترکِ دنیا کا نام ہے بلکہ فقر قلب ونظر کی اس کیفیت کا نام ہے جو مزاج میں درویشی و بے نیازی کا جوہر پیدا کرے۔ مادی وسائل میسر آئیں یا مفلسی ہو، پوری کائنات کی حیثیت صاحبِ فقر کی نظر میں ایک ذرے کے برابر بھی نہ ہو۔ ایک حقیقی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فقیر وہ ہے کہ جس کا دل پروردگار کی تقسیم پر راضی ہو، جب اسے کچھ نہ بھی ملے تو شکر کرے اور مل جائے تو ایثار کرے۔ درحقیقت فقیر فانی راحت وعیش کے ہوسناک پھندے میں پھنسنے سے انکار کرتا ہے۔ لیکن یہ عالمِ آزادی و بے نیازی آسانی سے ہاتھ نہیں آتا:

ہمت ہو اگر ڈھونڈ وہ فقر
جس فقر کی اصل ہے حجازی
اس فقر سے آدمی میں پیدا
اللہ کی شانِ بے نیازی
یہ فقرِ غیور جس نے پایا
بے تیغ و سناں ہے مردِ غازی
مومن کی اسی میں ہے امیری
اللہ سے مانگ یہ فقیری

اقبال واضح انداز میں بتاتے ہیں کہ فقر امیری کے خلاف مفلسی اور غم واندوہ کا نام نہیں:

میں ایسے فقر سے اے اہلِ حلقہ باز آیا
تمہارا فقر ہے بے دولتی و رنجوری

اور نہ ہی فقر غیر متحرک زندگی گذارنے کا نام ہے:

کچھ اور چیز ہے شاید تیری مسلمانی
تری نگاہ میں ہے ایک فقر و رہبانی
سکوں پرستیٔ راہب سے فقر ہے بیزار
فقیر کا ہے سفینہ ہمیشہ طوفانی

اقبال فقیر کے دل کو گدا کے دل سے ممیّز کرتے ہیں:

جو فقر ہو تلخیٔ دوراں کا گلہ مند
اس فقر میں باقی ہے ابھی بوئے گدائی

علامہ اقبال حضرت سلمانؓ فارسی اور حضرت سلیمانؑ دونوں کو فقر کے انتہائی مقام پر سمجھتے ہیں، جبکہ سلمانؓ کا شمار اصحاب صفہ میں ہوتا تھا، سخت تنگدستی میں گذارا کرتے تھے اور سلیمانؑ خدا کے وہ پیغمبر تھے جنہیں انسانوں پر ہی نہیں جنوں پر بھی حکومت عطا ہوئی تھی اور دنیا کے وسیع خزانے ان کے تصرف میں تھے۔

یہ فقر مردِ مسلماں نے کھو دیا جب سے
رہی نہ دولتِ سلمانی و سلیمانی

علامہ حالتِ فقر کو دنیا کی ہر نعمت پر ترجیح دیتے ہیں۔ کہتے ہیں:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سلطنتِ اہلِ دل فقر ہے شاہی نہیں

اور ایک جگہ فرماتے ہیں:

فقر ہے میروں کا میر، فقر ہے شاہوں کا شاہ

غرض اقبال امت کو پیغام دیتے ہیں کہ زمانے اور حالات کے ساتھ اپنے آپ کو بدلتے وقت وہ زر پسندی اور مادہ پرستی کے اس شیطانی چکر میں نہ پھنس جائیں جس کا شکار اہلِ مغرب ہو چکے ہیں بلکہ اپنے کردار و عمل کی بنیادیں حجازی فقر پر رکھیں جو انسان کو قلب و نظر کی پاکیزگی عطا کرتا ہے:

فقر کا مقصود ہے عفتِ قلب و نگاہ

مردِ مومن

علامہ اقبال اس وسیع کائنات میں اس گمشدہ انسان کو ڈھونڈتے ہیں جو اس کائنات کا مقصدِ وجود ہے۔ انہیں اس بھری پری کائنات میں اس گوہرِ نایاب کی تلاش ہے جسے اربوں پر مشتمل آبادی میں انسان کے مقصودِ وجود کی وجہ قرار دیا جا سکے۔ اس میں انہیں کامیابی حاصل ہوتی ہے اور ان کی نگاہیں اس مردِ مومن تک پہنچتی ہیں جو قرآنی نظریے کا انسانِ کامل ہے:

جہاں تمام ہے میراث مردِ مومن کی
میرے کلام پہ حجت ہے نکتۂ لولاک

اقبال کہتے ہیں کہ وہ مردِ مومن یا مردِ کامل اپنے انسانی وجود میں طبعی قوانین کا ویسا ہی تابع ہے جیسا کہ عام انسان۔ اس معاملے میں اسے دوسروں پر نہ کوئی فوقیت ہے اور نہ کوئی امتیاز۔ البتہ ایمان کی قوت اور یقین کی ناقابلِ تسخیر طاقت اس کے اندر وہ اوصاف پیدا کرتی ہے جو اسے دوسروں سے ممیز کر دیتے ہیں:

نقطۂ پرکارِ حق، مردِ خدا کا یقیں
اور یہ عالم تمام وہم و طلسمِ مجاز

اقبال کہتے ہیں کہ مومن اس دنیا میں صرف احکامِ الٰہی کا پابند ہے۔ اپنی خامیوں اور نااہلیوں کے لئے وہ تقدیر کا رونا نہیں روتا بلکہ حکمِ الٰہی کی تکمیل کے لئے وہ ناممکن کو بھی ممکن بنا دیتا ہے۔

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات
مومن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند

مومن کی شخصیت میں اللہ کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔ کشادہ قلبی، عفو و درگذر، حلم و بردباری میں وہ خدا کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

صفتِ غفاری کا پرتو ہے۔ اسی طرح کفر و باطل پر غصہ اس کی صفتِ قہاری کا مظہر ہے:

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان
قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

اپنی معرکتہ الآراء نظم ''مسجدِ قرطبہ'' میں اقبال مردِ مومن کا نقشہ کھینچتے ہوئے کہتے ہیں:

تجھ سے ہوا آشکار بندۂ مومن کا راز
اس کے دنوں کی تپش، اس کی شبوں کا گداز
اس کا مقامِ بلند، اس کا خیال عظیم
اس کا سرور، اس کا شوق، اس کا نیاز، اس کا ناز
ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں، کارکشا، کارساز
خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی اس کا دلِ بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دلفریب، اس کی نگہ دلنواز
نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو
رزم ہو یا بزم ہو، پاک دل و پاکباز

اقبال کا مردِ مومن وسیع النظر ہے جس کی منزل چرخِ نیلی فام سے بھی آگے ہے۔ وہ زمان و مکان کی حدود سے متجاوز اور رنگ و نسل کے تعصب سے بہت دور ہے:

مومن کے جہاں کی حد نہیں ہے
مومن کا مقام ہر کہیں ہے

....

اس کی زمیں بے حدود، اس کا افق بے ثغور
اس کے سمندر کی موج دجلہ و دینوب و نیل

مومن اپنی نظر اللہ پر رکھتا ہے اور اس کی رضا کو زندگی کا مقصود بناتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ یہ کائنات اور اس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی تمام قوتیں اس کے تابع ہیں۔ اس کے برعکس کافر اس کائنات کی بھول بھلیوں میں الجھ کر رہ جاتا ہے:

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

اقبال کہتے ہیں کہ مومن نرم دل اور کم آمیز ہے، لیکن حق و باطل کے معرکے میں اس کا زور دیکھا چاہئے:

کہتے ہیں فرشتے کہ دلآویز ہے مومن
حوروں کو شکایت ہے کم آمیز ہے مومن

لیکن:

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

مومن زندگی کی غلط اقدار کے ساتھ کسی صورت مصالحت نہیں کرتا۔ وہ ظلم، ناانصافی اور انسان کی انسان پر حکومت کو برداشت نہیں کرتا:

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

اگر دعوت و تبلیغ اور حق گوئی کی پیہم کوشش کے باوجود کوئی نتیجہ نہ نکلے اور پورے کا پورا نظام فاسد ہو چکا ہو تو اتمامِ حجت کے بعد آخری چارۂ کار کے طور پر مومن "تخریب برائے تعمیر" کا عَلم بلند کر دیتا ہے۔ یہ جرأتِ رندانہ انقلابی تبدیلیوں کی راہ ہموار کرتی ہے اور بالآخر ایک نئی دنیا کی تعمیر پر منتج ہوتی ہے۔

ہو صداقت کے لئے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے
پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار
اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

مومن کا یقین و ایمان اس کے اندر ایسی قوت و توانائی بھر دیتا ہے جس کی طاقت کے سامنے عقلِ انسانی حیران رہ جاتی ہے۔ پھر اللہ کی مدد اور نصرت ہمیشہ اس کے ساتھ رہتی ہے۔ اس کے بڑھتے ہوئے قدموں کو نہ تو پہاڑوں کی بلندی روک سکتی ہے اور نہ ہی سمندر اس کی راہ میں حائل ہو سکتا ہے۔

دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تاریخ گواہ ہے کہ مٹھی بھر مسلمانوں نے ایمانی طاقت کے بل پر دنیا کو زیر کیا۔ اقبال کہتے ہیں کہ مومن خدائی طاقت کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا، نہ اسباب کی کمی کا رونا روتا ہے:

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی
کافر ہے تو تابع تقدیر مسلمان
مومن ہے تو آپ ہے تقدیرِ الٰہی

فرماتے ہیں:

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

کائنات اس مردِ مومن کے بغیر نا تمام ہے۔ عالم کی بقا کے لئے اس کا وجود ضروری ہے۔ اگر حیاتِ انسانی، پانی، ہوا، روشنی اور حرارت کے وجود پر منحصر ہے تو اسی طرح ایک ایسے مقصدِ زندگی، روحِ ایمانی اور اخلاق کا وجود بھی ناگزیر ہے جس کی روشنی انبیاء کی دعوت سے حاصل کی گئی ہو۔ جس کا بوجھ ایک مردِ مومن نے اپنے کندھوں پر اٹھا رکھا ہو اور اس کے قیام و بقا کے لئے اپنی زندگی کی ساری توانائیوں کو لگا رکھا ہو۔ لہٰذا ساری انسانیت کو اس کے ارادے اور عمل کا تابع ہونا چاہئے کیونکہ وہ حاملِ قرآن ہے:

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

مردِ مومن کے پاس سب سے قیمتی چیز دکھی انسانیت کے لئے اسلام کا زندہ پیغام ہے جو انسان کو انسان کی غلامی سے نجات دلا کر خدائی بندگی کی طرف لے جانے والا ہے اور دنیا و آخرت میں نجات کی واحد سبیل ہے۔

غلامی سے نجات

اقبال کو غلامی سے سخت چڑ تھی۔ آپ کے خیال میں اسلام اور غلامی ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے:

''وہ نبوت ہے مسلماں کے لئے برگِ حشیش
جس نبوت میں نہیں قوت و شوکت کا پیام''

اقبال کہتے ہیں کہ مسلمانانِ ہند اگر باعزت طور پر زندہ رہنا چاہتے ہیں تو انہیں آزادی کے لئے جدوجہد کرنا ہوگی:

آزاد کا ہر لحظہ پیامِ ابدیت
محکوم کا ہر لحظہ نئی مرگِ مفاجات!

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آزاد کا اندیشہ حقیقت سے منور
محکوم کا اندیشہ گرفتارِ خرافات

حرکت و عمل کا پیغام

اقبال کو خطرہ تھا کہ صدیوں کی کاہلی، اپنے اوپر بے اعتمادی اور مجروح انا نے مسلمانوں کو عضو معطل بنا کر چھوڑ دیا ہے اور وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے تو ان کا کوئی مستقبل نہیں ہے۔ چنانچہ آپ انہیں حرکت کا پیغام دیتے ہیں:

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

اقبال کا خیال ہے کہ پوری کائنات حرکت میں ہے۔ کائنات کا جز و حرکت چھوڑ دے گا بالآخر اپنے وجود کے حق سے محروم کر دیا جائے گا

اس رہ میں مقام بے محل ہے — پوشیدہ قرار میں اجل ہے
چلنے والے نکل گئے ہیں — جو ٹھیرے ذرا، کچل گئے ہیں

اقبال کا خیال ہے کہ جب تک مسلمان حرکت میں رہے زندگی کی حرارت ان سے عظیم الشان کام کرواتی رہی۔ انکے جامد اور یخ بستہ تنِ مردہ کی اب زمانے کو ضرورت نہیں رہی:

تھے تو آباء وہ تمہارے ہی، مگر تم کیا ہو
ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظرِ فردا ہو!

اقبال کے نزدیک حرکت کا لازمی نتیجہ سکون میں تغیر کی شکل میں نکلے گا۔ مسلمانوں کو اس سے خوفزدہ نہیں ہونا چاہئے۔ اسی میں دراصل ان کی اور امت کی زندگی پوشیدہ ہے:

جس میں نہ ہو انقلاب، موت ہے وہ زندگی
روحِ امم کی حیات کشمکشِ انقلاب

کورانہ تقلید سے گریز اور اجتہاد پر زور

اقبال کو یقین تھا کہ اسلام کا تصور جامد نہیں بلکہ متحرک ہے۔ اس کے برخلاف مسلمان نہ صرف عملی زندگی میں بلکہ نظریاتی اور علمی حیثیت سے بھی جس دورِ جمود اور تعطل سے گذر رہے ہیں اور اجتہاد سے جس طرح ان کی جان جاتی ہے، وہ حالات سے فرار کی ایک کوشش ہے۔ آپ نے سید سلیمان ندوی اور صوفی غلام مصطفیٰ کو جو خطوط لکھے ان میں اپنے یقین کا اظہار کیا کہ وہ زمانہ آنے والا ہے جب مسلم ممالک طوقِ غلامی سے آزاد ہو کر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اپنی اپنی حکومتیں لے کر بیٹھیں گے اور دنیا کی دوسری مملکتوں کے ساتھ استحکام اور عروج و ترقی کے میدان میں مسابقت کرنے پر مجبور ہوں گے۔ اس وقت سائنس اور ٹیکنالوجی کی غیر معمولی اور حیرت انگیز ترقیات کے نتیجے میں سینکڑوں، ہزاروں ایسے جدید مسائل پیدا ہوں گے جن کا حل اجتہاد کے بغیر ناممکن ہے۔

علامہ کے عہد میں مسلمانوں کے مذہبی طبقہ پر جو جمود طاری تھا، علامہ کو اس پر شدید رنج تھا۔ اس سلسلے میں اپنے خطبات ''تشکیلِ جدید، الٰہیاتِ اسلامیہ'' میں آپ نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ جدید علوم کی روشنی میں ایک نیا علم الکلام ترتیب دیا جائے اور قرونِ وسطیٰ کی تشریحات و تعبیرات کی کورانہ تقلید کے بجائے موجودہ زمانے کے حالات و ضروریات کے لحاظ سے احکام شریعت کی تشریح کی جائے۔ آپ کہتے ہیں کہ جب حرکت کائنات اور انسان کی سرشت میں ہے تو مذہب اور ثقافت میں بھی جاری و ساری رہنی چاہئے اور اس کا Instrument اجتہاد ہے۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ اسلامی فقہ کی تشکیلِ جدید سے علامہ کی مراد نماز، روزے کے احکام نہیں بلکہ اسلام کے جملہ اجتماعی (عمرانی) پہلوؤں مثلاً سماجی، سیاسی، اقتصادی و قانونی کی تعلیم مراد ہے۔ یعنی آپ چاہتے ہیں کہ اسلام کے اجتہادی اصول واحکام کی روشنی میں جدید عمرانی علوم Social Sciences کی تشریح و توضیح کی جائے اور اسلامی نقطۂ نظر سے ان علوم کو Reinterpret کیا جائے۔

اقبال نے اس سلسلے میں اپنے خطبات میں جو سوالات اٹھائے وہ بڑے بیباکانہ تھے۔ اس دورِ غلامی و جمود میں اس طرح کی بات زبان سے نکالنے کا کوئی سوچ بھی نہ سکتا تھا۔ نتیجتاً آپ پر کفر کے فتوے لگنا شروع ہوگئے۔ ہم اس موقع پر صرف اتنا کہیں گے کہ اقبال نے امت کے سامنے انتہائی اہم سوال اٹھائے تھے، ان کے جوابات نہیں دیئے تھے۔ یہ جذبہ خلوص پر مبنی تھا۔ آپ مصطفیٰ کمال پاشا کے طرز کی اصلاحات کے چنداں خواہشمند نہ تھے، کہتے ہیں ''قرآن پاک کا یہ ارشاد کہ زندگی ایک مسلسل تخلیقی عمل ہے، بجائے خود اس امر کا مقتضی ہے کہ مسلمانوں کی ہر نسل اسلاف کی رہنمائی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے مسائل آپ حل کرے، نہ یہ کہ اسے اپنے لئے رکاوٹ تصور کرے۔'' اپنی نظم ''اجتہاد'' میں کہتے ہیں:

حلقۂ شوق میں وہ جرأتِ اندیشہ کہاں
آہ! محکومی و تقلید و زوالِ تحقیق
خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق

مغرب کی اندھی تقلید۔ ذلّت و گمراہی کا راستہ

اقبال جس طرح اسلاف کی اندھی تقلید کو جائز نہیں سمجھتے اسی طرح مغرب کی کورانہ پیروی کو مسلمانوں کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لئے سخت نقصان دہ سمجھتے ہیں۔ آپ کے خیال میں مغربی تہذیب ممالکِ اسلامیہ کے مسائل حل کر سکتی ہے نہ ان میں زندگی کی نئی روح پھونک سکتی ہے۔ بھلا جو تہذیب اپنی موت آپ مر رہی ہو وہ دوسروں کے لئے باعثِ نجات کیسے بن سکتی ہے۔ اقبال اسلامی ممالک میں ''تحریکِ تجدید'' کے علمبرداروں سے سخت نالاں ہیں کہ تجدید کی دعوت اکثر و بیشتر تقلیدِ فرنگ کا بہانہ ہے:

تقلید سے ناکارہ نہ کر اپنی خودی کو
کر اس کی حفاظت کہ یہ گوہر ہے یگانہ
اس قوم کو تجدید کا پیغام مبارک
ہے جس کے تصور میں فقط بزمِ شبانہ
لیکن مجھے ڈر ہے کہ یہ آوازۂ تجدید
مشرق میں ہے تقلیدِ فرنگی کا بہانہ

آپ تہذیبِ نو کی اندھی تقلید کو باعثِ عار سمجھتے ہیں کہ جو قوم قیادت اور عالمی انقلاب کے لئے پیدا کی گئی ہو وہ پست درجے کی شاگردی اور ذلیل قسم کی نقالی پر خوش ہو۔ اس پر مستزاد مغربی تعلیم کے ایسے سنگین اثرات برآمد ہو رہے ہیں کہ مسلمان گو اپنا مذہب تو تبدیل نہیں کرتا مگر روحِ ایمانی کھو بیٹھتا ہے اور یوں مغربی خدا اسے جس رخ پر موڑنا چاہتے ہیں وہ باآسانی مڑ جاتا ہے:

تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو
ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے اسے پھیر
تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب
سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے اک ڈھیر

اقبال اس مغربی یلغار میں بہنے کا الزام یورپ کو نہیں دیتے، بلکہ خود مسلمان سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:

یورپ کی غلامی پہ رضامند ہوا تو
مجھ کو تو گلہ تجھ سے ہے یورپ سے نہیں ہے

یورپ سے جس شدید نوعیت کی مرعوبیت تھی اس کی تو لازمی سزا یہی تھی کہ تن کی غلامی مسلط ہو گئی اور من کی دنیا بھی ہاتھ سے گئی:

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مسلم نوجوانوں سے توقعات

اقبال کی نگاہ مسلمان جوانوں پر جا ٹکتی ہے، جن کے ہاتھ میں مسلمانوں کا مستقبل ہے۔ مگر وہ سخت کوشی اور جفاکشی کے بجائے تن آسانی، لذت طلبی اور عیش کوشی میں پڑے ہیں۔ توحید کی طاقت سے ناواقف ہیں اور فرنگ سے تہذیب کے لات و منات درآمد کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے۔ ان کی عقلیں کوری اور دل پتھر ہیں، ان کے علم وفن، دین و سیاست اور عقل و دل سب کا مرکز مادہ ہے۔ افکار میں تازگی اور خیالات میں بلندی مفقود ہے۔ نہ مدرسہ نہ خانقاہ اور نہ جدید تعلیمی ادارے، اقبال سب سے ناخوش ہیں:

شکایت ہے مجھے یارب خداوندانِ مکتب سے
سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاک بازی کا
گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا لاالٰہ الاالله

مکتبوں میں کہیں رعنائی افکار بھی ہے؟
خانقاہوں میں کہیں لذتِ اسرار بھی ہے؟

اٹھا میں مدرسہ وخانقاہ سے غم ناک
نہ زندگی، نہ محبت، نہ معرفت، نہ نگاہ

آہ مکتب کا جوانِ گرم خون
ساحرِ افرنگ کا صیدِ زبوں
نوجوانانِ تشنہ لب خالی ایاغ
شیشہ و تاریک جاں روشن دماغ
کم نگاہ و بے یقین و ناامید
چشم شاں اندر جہاں چیزے ندید

اپنی نظم ''ایک نوجوان کے نام'' میں لکھتے ہیں:

ترے صوفے ہیں افرنگی ترے قالین ہیں ایرانی
لہو مجھ کو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

امارت کیا شکوہِ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل
نہ زورِ حیدری تجھ میں نہ استغنائے سلمانی
نہ ڈھونڈ اس چیز کو تہذیبِ حاضر کی تجلی میں
کہ پائی میں نے استغناء میں معراجِ مسلمانی

اتحادِ امت کا پیغام

اقبال کو اصرار ہے کہ جب تک مسلمان ایک امت بن کر نہیں سوچیں گے ان کا بیڑا پار نہیں ہوسکتا:

بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی

آگے کہتے ہیں:

یہ ہندی وہ خراسانی، یہ تورانی وہ افغانی
تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا
غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغِ حرم اڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا

مسلمانوں کو صرف وطنی جھگڑوں سے نہیں بلکہ فرقہ بندیوں اور ذات برادری کے گورکھ دھندے سے بھی نکلنا ہوگا:

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

اقبال ملتِ اسلامیہ کے ہر فرد کو سختی سے جماعت کے ساتھ جڑے رہنے کا سبق دیتے ہیں:

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

امید کا شاعر

اقبال صرف گردوپیش کا ماتم ہی نہیں کرتے بلکہ مسلم معاشرے پر کڑی تنقید کے ساتھ رہنمائی کا حق بھی ادا کرتے ہیں اور پھر پوری امید رکھتے ہیں کہ حالات سدھریں گے۔ اسی لئے انہیں امید کا شاعر بھی کہا جاتا ہے:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے

ایک اور جگہ کہتے ہیں:

نہ ہو نومید، نومیدی زوالِ علم و عرفان ہے
امیدِ مردِ مومن ہے خدا کے رازدانوں میں

پھر مسلمان کو امید دلاتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایک نیا زمانہ وجود پذیر ہو رہا ہے۔ لہٰذا یہ بیدار ہونے اور عمل کرنے کا وقت ہے:

اٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

اقبال کا سیاسی کردار

گو کہ اقبال کا اصل میدان شاعری، علمی اور فلسفیانہ فکر تھا، تاہم مسلمانوں کی تاریخ اور اسلام کے احیاء سے گہری دلچسپی رکھنے کے باعث آپ برِصغیر کی مسلم سیاست سے ہرگز بے تعلق نہ تھے۔ اگرچہ عملی سیاست میں آپ نے ۱۹۲۶ء سے پہلے حصہ نہ لیا تھا، تاہم مسلم قومیت، جداگانہ یا مخلوط طرزِ انتخاب، دستوری سفارشات وغیرہ کے بارے میں کئی دہائیوں سے غور و فکر کرتے رہے تھے اور اپنی سوچی سمجھی رائے رکھتے تھے۔ عملی سیاست میں آنے کے بعد اقبال نے بہت سرگرمی دکھائی اور مسلمانوں کی سیاسی رہنمائی کا حق ادا کر دیا۔

اقبال عملی سیاست میں کیوں آئے؟ اس کا جواب دینے کے لئے ضروری ہے کہ اس سیاسی پس منظر کو ذہن میں رکھا جائے جو بیسویں صدی کی ابتداء میں برِصغیر کے مسلمانوں کو درپیش تھا۔ کانگریس کے جھنڈے تلے ہندو جمع تھے۔ متحدہ قومیت کے نعرے کے زیرِ اثر مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد انگریزوں کی غلامی سے جان چھڑانے کے لئے ہندو سے اشتراکِ عمل کی حامی تھی اور کانگریس کی حمایت کر رہی تھی۔ تاہم تمام مسلمان اس مشترکہ جدوجہد کے حق میں نہ تھے اور مسلم سیاست انتشار کا شکار تھی۔ مسلمانوں کی علیحدہ پارٹی مسلم لیگ اگرچہ وجود میں آ چکی تھی لیکن ابتداء میں وہ نوابوں کی جماعت تھی اور عوامی سطح پر مقبول نہ تھی۔

اقبال بھی شروع میں متحدہ قومیت کے حامی تھے لیکن آپ نے کانگریس میں کبھی شمولیت اختیار نہ کی۔ قیامِ یورپ کے دوران جب آپ کو تہذیبوں کے تقابلی جائزے کا موقع ملا تو آپ اس نتیجے پر پہنچے کہ وطنیت یا قومیت کی بناء پر اشتراکِ عمل کم از کم مسلمانوں کے لئے کسی صورت میں نفع بخش نہیں ہے۔ ۱۹۰۹ء تک آپ ہندو مسلم مشترکہ قومیت کی مخالفت میں یکسو ہو چکے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ میثاقِ لکھنؤ، تحریکِ خلافت اور ترکِ موالات کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حمایت نہ کی، کیونکہ وہ مسلمانوں اور ہندوؤں کی مشترکہ تحریکیں تھیں۔ یہاں تک کہ تحریکِ خلافت جس کا مسلمانوں میں بڑا چرچا تھا، جب اقبال نے اسے ہندوؤں کے ہاتھوں ہائی جیک ہوتا ہوا دیکھا تو کہا:

نہیں تجھ کو تاریخ سے آگہی کیا؟
خلافت کی کرنے لگا گدائی!
خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے
مسلماں کو ہے ننگ وہ پادشائی!

ہندوؤں سے اشتراکِ عمل کو اقبال تقریباً ناممکن سمجھتے تھے۔ بعد میں زیادہ تر مسلم قائدین جن میں قائداعظم (جو ہندو مسلم اتحاد کے سفیر کہلاتے تھے) بھی شامل تھے، ہندوؤں کے رویئے سے دلبرداشتہ ہوکر آپ کی رائے سے متفق ہو گئے۔ اقبال سرسید کے سیاسی مکتبہ فکر سے زیادہ قریب تھے جس کے مطابق جداگانہ بنیادوں پر مسلمانوں کو منظم کر کے ان کے مطالبات اور حقوق منوانے چاہئیں۔

پنجاب جہاں سے اقبال کا تعلق تھا گو کہ مسلم اکثریتی صوبہ تھا، تاہم یہاں کی سیاست میں شہری اور دیہی کی تقسیم سے مسلم ووٹ بٹ گیا۔ ۱۹۲۳ء میں یونینسٹ پارٹی کے پرچم تلے مفاد پرست اور انگریزوں کے حاشیہ بردار جمع ہو گئے۔ لیجسلیٹو کونسل کی ممبری کے انتخاب میں اقبال بطور آزاد امیدوار کھڑے ہوئے اور بھاری اکثریت سے جیتے۔ شروع میں اقبال نے کونسل میں اکثریتی یونینسٹ پارٹی میں شمولیت اختیار کی تاکہ حکومت کے پلیٹ فارم سے مسلمانانِ پنجاب کے لئے کچھ کام کروا سکیں۔ لیکن جلد ہی پارٹی کی سیاست اور اس کے لیڈروں کی منافقت سے بددل ہوکر الگ ہو گئے۔ تاہم عملی سیاست میں آنے کا فائدہ یہ ہوا کہ آپ مسلم لیگ پنجاب کے سیکریٹری بن گئے اور محض چار سال بعد آل انڈیا مسلم لیگ کی صدارت کے عہدے پر فائز ہو گئے۔

اقبال کی سیاسی بصیرت کا یہ حال تھا کہ تین بار آپ نے قائداعظم محمد علی جناح سے اختلاف کیا اور ہر بار آپ کی رائے کو حالات نے درست ثابت کیا۔ پہلی بار تجاویزِ دہلی کے موقع پر جداگانہ انتخاب کے مطالبے سے دستبردار ہونے کی تجویز تھی۔ اقبال نے اس کی شدید مخالفت کی کیونکہ آپ مسلم قومیت کو متحدہ قومیت میں ضم کر دینے کے حق میں نہ تھے۔ دوسرا سائمن کمیشن کا بائیکاٹ، کیونکہ کانگریس بھی ایسا ہی کر رہی تھی۔ اقبال نے اس کی مخالفت کی اور کچھ عرصے کے لئے مسلم لیگ دو دھڑوں میں بٹ گئی، جناح اور شفیع لیگ۔ اقبال شفیع لیگ کے ساتھ تھے۔ ۱۹۲۸ء کی نہرو رپورٹ کے بعد قائداعظم ہندوؤں سے کلیتاً مایوس ہو گئے اور انہوں نے چودہ نکات پیش کئے جن کی اشاعت کے بعد ۱۹۳۰ء میں دونوں مسلم لیگی دھڑے ضم ہو گئے۔ تیسرا موقع وہ تھا جب یونینسٹ پارٹی سے تعاون کے وقت اقبال نے قائداعظم کو خبردار کر دیا تھا کہ یونینسٹ پارٹی کی نیت میں فتور ہے، وہ مسلم لیگ کو ڈبل کراس کرنا چاہتی ہے۔ لہٰذا وہ اپنی حکمت عملی پر نظر ثانی کریں۔ بعد میں بالآخر مسلم لیگ کو ۱۹۴۴ء میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یونینسٹ پارٹی سے ٹکر لینا ہی پڑی، جس کی پیشگوئی اقبال کر چکے تھے۔

سیاسی میدان میں اقبال کے دو عظیم کارنامے یہ ہیں: علیحدہ مسلم ریاست کا تصور پیش کرنا اور قائداعظم کو قائل کرنا کہ وہ لندن کی سکونت چھوڑ کر برصغیر کے مسلمانوں کی قیادت سنبھالنے کے لئے واپس وطن آ ئیں۔ ۱۹۳۰ء میں پہلی گول میز کانفرنس لندن میں ہوئی جس میں کانگریس کا کوئی نمائندہ شریک نہ ہوا۔ اقبال مسلم نمائندوں میں شامل نہ تھے۔ یہ کانفرنس بے نتیجہ رہی۔ قائداعظم حکومتِ برطانیہ کے رویئے، ہندوؤں کے تعصب اور بھانت بھانت کے مسلمان لیڈروں سے اتنے بیزار ہوئے کہ سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر کے لندن ہی میں مقیم ہو گئے۔ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۴ء تک مسلم لیگ انتشار کا شکار رہی۔ بالآخر اقبال کے پیہم اصرار پر قائداعظم واپس ہندوستان تشریف لائے اور مسلم لیگ کا احیاء کیا۔

علیحدہ مسلم ریاست کے قیام کا تصور ۱۹۲۸ء سے اقبال کے ذہن میں تشکیل پانا شروع ہوا، یعنی عملی سیاست میں قدم رکھنے کے بعد سے۔ ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ الہ آباد میں اقبال نے اپنے صدارتی خطبے میں یہ خیال باضابطہ طور پر پیش کیا۔

۱۹۳۷ء میں الیکشن کے بعد اکثر صوبوں میں کانگریسی حکومتیں قائم ہوئیں جن کے بدترین سلوک نے مسلمانوں کو علیحدہ وطن کی ضرورت کا پورا احساس دلا دیا۔ اسی دوران قائداعظم کی کوششوں سے مسلم لیگ دوبارہ زندہ ہو رہی تھی۔ اقبال نے مسلم ریاست سے متعلق اپنے موقف کو قائداعظم کے نام اپنے خط میں یوں دہرایا:

> ''برصغیر میں شریعتِ اسلام کا نفاذ اور ارتقاء اتنی دیر ممکن نہیں جب تک یہاں ایک آزاد مسلم ریاست یا ریاستیں وجود میں نہ لائی جائیں۔ کئی برسوں سے میرا یہ عقیدہ رہا ہے۔ کیا آپ کے خیال میں اس مطالبے کا وقت آن نہیں پہنچا؟''

وفات

اقبال طویل عرصے سے بیمار تھے۔ گلے اور آنکھ کی تکلیف کے علاوہ دمے کے شدید دوروں نے آپ کو ہلکان کر رکھا تھا۔ ۲۰ اپریل ۱۹۳۸ء کو طبیعت زیادہ بگڑی اور بلغم کے ساتھ خون آنے لگا تو اقبال کے ساتھیوں نے ڈاکٹروں کے بورڈ کو بلوایا۔ مگر اسی رات حالت غیر ہو گئی۔ شانوں میں شدید درد اٹھا تو ساتھیوں نے دوا دینی چاہی۔ فرمایا ''دوا میں افیون کے اجزاء ہیں اور میں بے ہوشی کے عالم میں مرنا نہیں چاہتا۔''

پھر کچھ دیر بعد اپنا یہ قطعہ پڑھا:

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سر آمد روزگار ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

صبح کی اذانیں بلند ہوئیں۔ اقبال کے احباب نماز ادا کرنے کی غرض سے مسجد گئے تو اقبال کے پاس آپ کا پرانا ملازم علی بخش رہ گیا تھا۔ اچانک دل میں شدید درد اٹھا۔ آپ نے ''اللہ'' کہا اور اپنے ملازم کے ہاتھوں میں جان دے دی۔ ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کی صبح آپ کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کرگئی۔ وہ روح جو عمر بھی مسلمانوں کے لئے تڑپتی رہی آج اپنے رب کے حضور حاضری دینے جا پہنچی۔

اقبال کی رحلت کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ اخباری ضمیمے چھپے۔ سرکاری دفاتر، اسکول، کالج، عدالتیں، مدرسے سب بند ہوگئے۔ لوگ ہجوم در ہجوم تاریخ کے عظیم فلسفی، شاعر اور مفکر کا آخری دیدار کرنے کے لئے علامہ کی رہائش گاہ ''جاوید منزل'' جمع ہوگئے۔ جنازے میں ہر شعبۂ زندگی کے لوگ بلا امتیاز شامل تھے۔ حکومتی اراکین، جج، پروفیسر، ادیب، شاعر، صحافی، تاجر، طلباء، سرخ پوش رضا کار، خاکساروں کے جیش، کامریڈ مسلم، ہندو، عیسائی اور دیگر قومیتوں کے لوگ اقبال کو خراجِ تحسین پیش کرنے کی غرض سے نکل آئے۔ پچاس ساٹھ ہزار کے مجمع نے مولانا غلام مرشد کی امامت میں نمازِ جنازہ ادا کی اور جنازے کو شاہی مسجد کے احاطے میں دفنا دیا گیا۔

افسوس اقبال اپنے خواب کی تعبیر دیکھنے سے پہلے ہی اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔ مگر اس احسان کے ساتھ کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے ایک اسلامی ریاست کے قیام کے لئے پہلا ٹھوس اور عملی منصوبہ دینے والے آپ ہی تھے۔ علیحدہ وطن کا یہ مطالبہ ایسا مقبول ہوا کہ مسلم لیگ نے اسے باقاعدہ طور پر قراردادِ لاہور کے ذریعے منظور کیا جو بعد میں قراردادِ پاکستان کے نام سے مشہور ہوا۔

قراردادِ پاکستان منظور کئے جانے کے بعد قائداعظم نے اپنے پرائیویٹ سیکریٹری مطلوب الحسن سے فرمایا: ''اقبال اب ہمارے درمیان نہیں ہیں، لیکن اگر وہ زندہ ہوتے تو یہ معلوم کرکے خوش ہوتے کہ ہم نے بعینہٖ وہی کیا جو وہ ہم سے کروانا چاہتے تھے۔''

شخصیت کی جھلکیاں

اقبال کی شخصیت کا نجی پہلو اگرچہ ادائیگی فرائض اور اتباعِ سنت کے لحاظ سے غیر معمولی نہیں ہے البتہ آپ کے اندر چند ایسی شخصی خصوصیات موجود تھیں جو کم ہی لوگوں میں نظر آتی ہیں۔ ان میں سرفہرست اقبال کا قرآن اور نبی اکرم ﷺ کی ذات سے سچا عشق تھا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قرآن مجید سے تعلق

قرآن کریم سے علامہ کا قلبی تعلق تھا۔ دورانِ تلاوت آپ پر گریے کا ایسا غلبہ ہوتا کہ قرآن مجید کے اوراق تر ہو جاتے۔ ایک روایت کے مطابق آپ کا ملازم علی بخش مصحف کو سکھانے کی غرض سے چھت پر رکھ آتا۔ قرآن مجید کا مستقل مطالعہ کرتے اور اس کو سرہانے کی میز پر رکھتے۔ ایک بار ایک ملاقاتی نے اعتراض کیا کہ آپ کو اسے کسی بہتر اور بلند جگہ پر رکھنا چاہئے۔ یہ میز مستقل آپ کے استعمال میں رہتی ہے جس سے اس مقدس کتاب کی بے ادبی کا اندیشہ ہے۔ اس پر آپ کا کہنا تھا کہ ''مجھے اس کی ضرورت ہمیشہ رہتی ہے اور میں برابر اس سے استدلال کرتا ہوں''۔ قرآن کا اصل مقام تو مومن کا دل ہے اور مومن کا دل جو دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت سے نہیں کانپتا کلامِ الٰہی سے پگھل جاتا ہے۔ علامہ کا بھی یہی حال تھا۔ آپ کے بیٹے جاوید اقبال بتاتے ہیں کہ ایک بار ایک عرب قاری آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انہوں نے نہایت خوش الحانی سے سورۃ مزمل پڑھی تو اقبال اتنا روئے کہ تکیہ آنسوؤں سے تر ہو گیا۔

اقبال سحر خیز تھے۔ تنہائی کے اس وقت میں آپ باری تعالیٰ کے حضور دعائیں اور مناجات کرتے۔ آہ و زاری اور فریاد رسی کے لئے اس وقت کو بہت ہی مناسب سمجھتے تھے۔ خود فرماتے ہیں:

کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحر گاہی

دراصل اقبال محسوس کرتے تھے کہ اسلام میں مختلف فرائض و احکامات دراصل بندے کو رب سے قریب کرنے، اس کو پہچاننے اور اس کی معرفت حاصل کرنے کے لئے عائد کئے گئے ہیں۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ آج کے مسلمان ان کے ظاہری پہلوؤں پر قناعت کر گئے ہیں۔ نتیجتاً باطنی فوائد سے کلیتاً محروم ہیں۔

عشقِ رسول ﷺ

نبی اکرم ﷺ کے ساتھ آپ کو جو والہانہ عقیدت تھی اس کا اظہار ہر موقع پر ہوتا تھا۔ نامِ مصطفیٰ ﷺ آتے ہی اقبال بے قابو ہو جاتے اور جذبات کی شدت سے آنکھیں تر ہو جاتیں۔ اگر کبھی ان مظالم کا تذکرہ ہوتا جو آپ ﷺ اور صحابہ کرامؓ کے ساتھ مکی دور میں روا رکھے گئے تھے تو آپ کے ساتھی یہ دیکھ کر حیران رہ جاتے کہ علامہ چیخیں مار مار کر رو رہے ہیں۔ آخری عمر میں تو کیفیت یہ تھی کہ عقل و فلسفہ سب عشقِ محمد ﷺ کے تابع ہو چکے تھے۔

دیارِ حبیب کی زیارت کا ایسا شوق تھا کہ آخری ایام میں اکثر اوقات اسی کا تذکرہ رہتا۔ دوسری گول میز کانفرنس سے واپسی پر جب آپ کے دوست فقیر نجم الدین نے سفر کی تفصیلات سنیں تو دورانِ گفتگو کہا ''اقبال تم یورپ ہو آئے، مصر اور فلسطین کی سیر بھی کی۔ کیا اچھا ہوتا کہ واپسی پر روضۂ اطہر کی زیارت سے بھی آنکھیں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نورانی کر لیتے۔''

دوست کی زبان سے یہ بات سنتے ہی آپ کا رنگ زرد ہو گیا اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ چند لمحے تک یہی کیفیت طاری رہی۔ پھر کہنے لگے ''فقیر میں کس منہ سے روضۂ اطہر پر حاضر ہوتا۔''

اس زمانے میں تو شاید آپ کی ہمت نہ پڑی اور بعد میں طبیعت کی خرابی اس حد تک بڑھ گئی کہ جانا ممکن نہ رہا۔ سفرِ حجاز کے لئے دل بے قرار رہتا اور اسی بے قراری میں ''ارمغانِ حجاز'' دل کی گہرائیوں سے نکل گئی۔ حج پر جانے کے لئے پوری کوشش کی مگر طویل بیماری نے اس کی اجازت نہ دی۔ آخری وقت تک اسی دھن میں رہے کہ جانے کا کوئی نہ کوئی سلسلہ نکل آئے۔ آپ کی بہن نے توجہ دلائی کہ آپ کی آنکھوں میں پانی اتر رہا ہے۔ ایسی حالت میں حج کا سفر کس طرح کر سکتے ہیں۔ فرمایا ''آنکھوں کا کیا ہے! آخر اندھے بھی تو حج کر ہی آتے ہیں!!!'' اتنا کہنے کے بعد آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں جاری ہو گئیں۔

شاعری یا الہام

اقبال کو الہامی شاعر کہا جاتا ہے۔ گو یہ آپ کی شاعری اور پیغام کی مناسبت سے مشہور ہوا۔ لیکن دورانِ آمد آپ پر کیا کیفیت طاری ہوتی تھی اس کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ ایک بار فقیر وحید الدین نے آپ سے پوچھا کہ آپ شعر کیسے کہتے ہیں؟ اس کے جواب میں آپ نے یہ واقعہ سنایا:

> ''ایک بار کرسچن کالج لاہور کے پرنسپل ڈاکٹر لوکس دورانِ محفل مجھے ایک گوشے میں لے گئے اور کہنے لگے۔ اقبال مجھے بتاؤ کہ تمہارے پیغمبر پر قرآن کا مفہوم نازل ہوا تھا اور چونکہ انہیں صرف عربی زبان آتی تھی، انہوں نے قرآن کو عربی میں منتقل کر دیا یا یہ عبارت ہی اس طرح اتری تھی؟ میں نے کہا یہ عبارت ہی اتری تھی۔ ڈاکٹر لوکس حیران رہ گئے اور کہا کہ اقبال تم جیسا پڑھا لکھا آدمی اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ یہ عبارت ہی اس طرح اتری ہے؟ میں نے کہا ڈاکٹر لوکس! یقیناً! میرا تجربہ ہے! مجھ پر شعر پورا اترتا ہے تو پیغمبر پر عبارت پوری کیوں نہیں اتری ہو گی''۔

یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد آپ نے بتایا کہ جب شعر کہنے کی کیفیت مجھ پر طاری ہوتی ہے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ ایک ماہی گیر نے مچھلیاں پکڑنے کے لئے جال ڈالا ہے۔ مچھلیاں اس کثرت سے جال کی طرف کھنچی چلی آ رہی ہیں کہ ماہی گیر پریشان ہو گیا ہے۔ سوچتا ہے کہ اتنی مچھلیوں میں سے کسے پکڑوں اور کسے چھوڑوں۔ آپ سے پوچھا گیا کہ کیا یہ کیفیت ہمیشہ آپ پر طاری رہتی ہے۔ کہنے لگے: ''نہیں، یہ کیفیت تو مجھ پر سال بھر میں زیادہ سے زیادہ دو بار طاری ہوتی ہے۔ لیکن فیضان کا یہ عالم کئی کئی گھنٹے رہتا ہے اور میں بے تکلفی سے شعر کہتا جاتا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہوں۔ پھر عجیب بات یہ ہے کہ جب طویل عرصے کے بعد یہ کیفیت طاری ہوتی ہے تو پہلی کیفیت میں کہا گیا آخری شعر دوسری کیفیت کے پہلے شعر سے مربوط ہوتا ہے۔ گویا اس کیفیت میں ایک قسم کا تسلسل بھی ہے۔ یا یوں کہنا چاہئے کہ یہ فیضان کے لمحے دراصل ایک ہی زنجیر کی مختلف کڑیوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جب یہ کیفیت ختم ہو جاتی ہے تو میں ایک قسم کی تکان، عصبی اضمحلال اور پژمردگی محسوس کرتا ہوں''۔

اقبال کی راتیں عجب بے کلی میں گذرتیں۔ آپ رات گئے تک جاگتے رہتے۔ جب شعر کی آمد ہوتی تو طبیعت اور بھی زیادہ بے چین ہو جاتی۔ چہرے کا رنگ بدل جاتا۔ بستر پر کروٹیں بدلتے۔ کبھی اٹھ کر بیٹھ جاتے اور کبھی گھٹنوں میں سر دیتے۔ بسا اوقات رات کے دو تین بجے اپنے ملازم علی بخش کو بلاتے اور اسے اپنی بیاض لانے کا کہتے۔ جب وہ لے آتا تو بیاض پر اشعار لکھ دیتے۔ چہرے پر سکون کے آثار نمایاں ہو جاتے اور آپ لیٹ جاتے۔

اسپین کی مسجدِ قرطبہ دیکھنے جب اقبال پہنچے تو آپ پر عجیب کیفیت طاری ہوگئی۔ مسجد اب گرجا گھر بن چکی تھی۔ مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کے خیال اور انقلابِ زمانہ نے اقبال کو مغموم کر دیا۔ آپ نے وہاں نگرانی پر معمور پادری سے نماز پڑھنے کی خواہش ظاہر کی۔ پادری نے یہ سن کر تامل کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا: ''تم مسیحی ہم سے اس قسم کا سلوک روا رکھتے ہو، حالانکہ ہم نے تم سے کبھی ایسا سلوک نہیں کیا''۔ وہ پادری آپ کی باتوں سے متاثر ہوا اور بڑے پادری سے اجازت لینے کے لئے گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ واپس آتا اقبال اذان دے کر نماز پڑھ چکے تھے۔ ساڑھے چار سو سال بعد مسجد کی فضاء میں اذان کی صدا گونجی۔ نماز ادا کرنے کے بعد دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تو یکایک اشعار کا نزول ہونے لگا۔ حتیٰ کہ پوری نظم کی آمد ہوئی اور مسجد قرطبہ کے نام سے بعد میں شائع ہوئی۔ اقبال نے اپنے اسپین کے سفر کی تفصیلات بتاتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے۔ ''الحمراء کا تو مجھ پر کچھ زیادہ اثر نہیں ہوا، لیکن مسجد کی زیارت نے مجھے جذبات کی ایسی رفعت تک پہنچا دیا جو مجھے پہلے کبھی نصیب نہ ہوئی تھی۔''

سادگی اور قناعت

اقبال کو دیگر شاعروں پر ایک فوقیت یہ بھی حاصل ہے کہ آپ جو کہتے تھے اس پر بھرپور یقین بھی رکھتے تھے۔ خالی خولی ہوائی فلسفوں کے بجائے عملی زندگی میں اس کا مظاہرہ بھی کرتے تھے۔ خودی، قناعت، سادگی، رجائیت اور توکل یہ سب خصوصیات اقبال کی زندگی کا حصہ تھیں۔ خودنمائی سے آپ کو نفرت تھی۔ مشاعروں میں جا کر داد وصول کرنا، زبردستی اپنا کلام سنانا آپ کو منظور نہ تھا۔ یہاں تک کہ بعض اوقات لوگوں کی فرمائش پر بھی کلام سنانے پر رضامند نہ ہوتے۔ جو لوگ برسوں آپ کی خدمت میں حاضر رہے انہیں بھی آپ کا کلام آپ کی زبان

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے سننے کا زیادہ موقع نہ مل سکا۔ آپ کی ذاتی زندگی بھی نمود و نمائش اور بناوٹ سے عاری تھی۔ عام اور سادہ طرزِ زندگی کو پسند کرتے تھے۔ ہر قسم کے ٹھاٹ باٹ سے یکسر پاک رہائش گاہ میں قیام تھا۔ ملاقاتیوں کے لئے کوئی پابندیاں نہیں تھیں۔ بڑے بڑے دانشوروں اور لیڈروں سے لے کر عام عوام جن میں دھوبی، پہلوان، تانگے والے، غرض ہر قسم کے لوگ بلا روک ٹوک آپ کے پاس پہنچ جاتے۔ اکثر آپ کو سادہ حلیے میں دیکھ کر حیران رہ جاتے۔ گھر میں عموماً دھوتی اور بنیان میں ہی ہوتے۔ جب کپڑے ختم ہو جاتے تو اپنے سیدھے سادھے ان پڑھ ملازم سے کہہ دیتے۔ وہ بازار سے جا کر خود ہی کپڑا خریدتا اور درزی کے سپرد کر آتا۔ اس کی پسند یا کپڑے کی تراش خراش پر کوئی اعتراض نہ کرتے۔

آخری عمر میں انگریزی لباس ترک کر دیا تھا۔ اپنے بیٹے جاوید کو ہمیشہ شلوار قمیض یا اچکن پہننے کو کہتے اور سادہ رہنے کی نصیحت کرتے۔ کھانے پینے میں چند چیزیں نہایت مرغوب تھیں اور جوانی میں انہیں بڑے شوق سے کھایا کرتے تھے۔ مگر بعد میں زبان کے چٹخاروں سے بھی دلچسپی نہ رہی۔ اپنے والد کو خط میں لکھا کہ ''روحانی کیفیت میں سب سے بڑا ممد و معاون کھانے پینے میں احتیاط ہے۔ نبی کریم ﷺ کی ساری زندگی اس بات کا ثبوت ہے۔ میں خود اپنی زندگی کم از کم کھانے پینے کے معاملات میں اسی طریق پر ڈھال رہا ہوں''۔ آخری بیس پچیس برسوں میں دن رات میں ایک بار کھانا تناول کرتے۔

اقبال کی آمدنی ہمیشہ محدود رہی۔ جب گذارے لائق رقم کے مقدمات آ جاتے تو مزید مقدمات لینے سے انکار کر دیتے۔ آخری عمر میں جب ذرائع آمدنی انتہائی محدود ہو گئے اور مختلف بیماریوں نے کسی قابل نہ چھوڑا تو نواب بھوپال اور سر آغا خان کی طرف سے پانچ سو، پانچ سو روپے کے وظیفے کی پیشکش ہوئی۔ آپ نے آغا خان کا وظیفہ لینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ میں ہزار روپے ماہانہ خرچ کرنے کا عادی نہیں ہوں۔ ایک بار کسی نے برسبیلِ تذکرہ کہا کہ آپ نے جو کتابیں تصنیف کی ہیں ان کا اگر پبلشر سے معاملہ کر لیا جائے تو حقِ تصنیف کی خاصی رقم مل سکتی ہے جو آپ کے کام آئے گی۔ علامہ نے کہا: ''نہیں! ایک بار مجھے بھی اس کا خیال آیا تھا۔ لیکن پھر میں نے سوچا کہ نہ جانے کتنے ضرورت منداور مستحق لوگ میری تصانیف کے اس کاروبار سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ شاید اس فائدے میں بیواؤں اور یتیموں کا بھی حصہ ہو۔ اپنی ذات کے لئے ان سب کو اس مفاد سے محروم کر دینا کسی طرح مناسب نہیں ہے''۔

مسلمانوں کا درد اقبال کو ہر طرح کے ایثار پر آمادہ رکھتا تھا۔ افغانستان کے حالات خراب ہوئے تو نادر شاہ حالات کی بہتری کے لئے پیرس سے افغانستان روانہ ہوئے۔ راستے میں لاہور رکے تو اقبال ان سے ملنے ریلوے اسٹیشن جا پہنچے۔ کئی سو روپے کی جمع پونجی ان کے حوالے کی اور کہا کہ آپ جس نیک مقصد کے لئے جا رہے ہیں اس کے لئے روپے کی بھی ضرورت ہوگی۔ اس لئے میرا یہ ہدیہ قبول فرمائیے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حق گوئی

اقبال کی خودی نے آپ کو کبھی اپنے نظریات سے دستبردار ہونے اور حق بات کہنے سے نہیں روکا۔ جب آپ کی کسی کوشش کے بغیر حکومتِ برطانیہ کی طرف سے ''سر'' کا خطاب ملا تو جہاں دشمنوں نے مذاق اڑایا وہیں بعض دوستوں نے بھی خوب چوٹیں کیں۔ یہاں تک کہا گیا کہ ''سرکار کی دہلیز پہ سر ہو گئے اقبال''۔ لوگ سمجھے کہ خطاب پا کر اقبال اپنے سیاسی عقائد سے دستبردار ہو جائیں گے۔ لیکن زمانہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اقبال نے حکومتِ برطانیہ کے خلاف نہ صرف اپنے خیالات نہ بدلے بلکہ آپ کے لہجے میں مزید سختی آ گئی۔ خطاب ملنے کے چند روز بعد ہی ایک تقریر کے موقع پر آپ نے برطانوی سرکار کو اس طرح رگیدا کہ اخبارات میں حکومت مخالف جذبات رکھنے والے کو خطاب دینے پر لے دے ہونے لگی۔

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
نَے ابلۂ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند
اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

اقبال اپنے آخری ایام میں مختلف امراض کے حملوں کی شدید زد میں تھے۔ اس کے باوجود آپ کے افکار میں وہی تازگی، جذبات میں وہی نزاکت اور طبیعت میں وہی شگفتگی قائم رہی۔ صحت کی طرف سے ناامیدی نے کسی تلخی اور یاسیت کو جنم نہیں دیا۔ امید اور رجائیت کے پیامبر کو امراض شکست نہ دے سکے۔ اسی زمانے میں عبداللہ چغتائی کو خط میں تحریر کیا: ''بحثیت مجموعی ایک دائم المریض کی زندگی بسر کر رہا ہوں۔ تاہم صابر اور شاکر ہوں۔ انشاء اللہ جب موت آئے گی تو مجھے متبسم پائے گی۔''

چوں مرگ آید تبسم برلب اوست

اقبال کے جسم کو فنا کے ہاتھوں شکست ہوئی، مگر آپ کے زندہ و جاوید پیغام کی روشنی وحرارت آج بھی مسلمانانِ برصغیر اپنے دلوں میں محسوس کرتے ہیں۔ جب تک اردو اور فارسی زبانیں کرہ ارض پر بولی اور پڑھی جائیں گی اقبال کی باکمال شاعری اپنے لازوال پیغام کے ساتھ چھائی رہے گی۔ فارسی زبان سے نابلد ہونے کی وجہ سے اقبال کا بہترین کلام تو ہماری پہنچ سے دور ہو ہی گیا ہے، اندیشہ یہ ہے کہ جو سلوک اردو زبان کے ساتھ برتا جا رہا ہے اور جس طرح ہم خود اپنی زبان کے چیتھڑے اڑا رہے ہیں، نئی نسل کے لئے اقبال کا اردو کلام بھی اتنا ہی ناقابلِ فہم ہو جائے گا اور کبوتر کے تنِ نازک میں شاہین کا جگر پیدا کرنے کے لئے کسی فرنگی کو ہی نوا پیرا ہونا پڑے گا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مولانا اشرف علی تھانویؒ

سلوک وطریقت کے ذریعے لاکھوں نفوس کی اصلاح کرنے والے عالم اور برّصغیر میں سلسلۂ تجدیدِ دین کی اہم شخصیت

تعارف

نام اشرف علی اور لقب حکیم الامت تھا۔ سلسلہ نسب یہ ہے: اشرف علی بن عبدالحق۔ اشرف علی ددھیال کی طرف سے فاروقی اور ننھیال کی طرف سے علوی تھے۔ ہندوستان کے علاقے مظفر گڑھ کے قصبے تھانہ بھون کے شریف اور معزز خاندان سے تعلق تھا۔ آپ کے والد عبدالحق تھانہ بھون کے رئیس اور صاحبِ جائیداد آدمی تھے۔ گو عالم فاضل نہ تھے مگر حصولِ علم سے دلچسپی تھی اور فارسی زبان پر عبور حاصل تھا۔ اس کے علاوہ عربی بھی اچھی خاصی پڑھ لیا کرتے تھے۔

ولادت

آپ کی ولادت ۵ ربیع الثانی ۱۲۸۰ ہجری کو تھانہ بھون ہندوستان میں ہوئی۔ اس ضمن میں یہ واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ آپ کے والد کو خارشت کا ایسا شدید مرض تھا کہ کسی دوا سے فائدہ نہ ہوتا تھا۔ ایک ڈاکٹر نے علاج تجویز کیا، لیکن ساتھ ہی انتباہ کیا کہ دوا تو اکسیر ہے مگر قاطع النسل ہے۔ مجبوری میں وہی دوا استعمال کرنی پڑی۔ اس بات نے آپ کی والدہ کو پریشان کر دیا۔ ان کی کوئی نرینہ اولاد زندہ نہ رہتی تھی۔ انہوں نے اپنے گھر میں تذکرہ کیا۔ اس زمانے میں ان کے میکے میں حافظ غلام مرتضیٰ صاحب مجذوب پانی پتی آئے ہوئے تھے۔ اس بات کا جب انہیں علم ہوا تو کہنے لگے اب کی بار علی کے سپرد کر دینا (یعنی بچے کا نام ننھیال کے نام پر رکھا جائے، جس کے آخر میں علی آتا ہو)۔ پھر کہا کہ اس کے دو لڑکے ہوں گے اور زندہ رہیں گے۔ ایک کا نام اشرف علی اور دوسرے کا نام اکبر علی ہوگا۔ ایک میرا ہوگا، وہ مولوی ہوگا اور حافظ ہوگا اور دوسرا دنیا دار ہوگا۔ ان بزرگ کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پیشگوئی حرف بحرف پوری ہوئی اور پہلے اشرف علی اور بعد میں صرف چودہ ماہ بعد اکبر علی کی ولادت ہوئی۔

بچپن

اشرف علی ابھی پانچ سال کے تھے کہ والدہ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ والد صاحب نے اس محبت سے پالا کہ والدہ کی کمی محسوس نہ ہوئی، نیز محبت کے ساتھ ساتھ تربیت کی ذمہ داری بھی احسن طریقے سے پوری کی۔ وہ آپ کو حرص سے بچاتے اور غیرت کی تعلیم دیتے تھے۔ اپنے بچوں کے اخلاق پر کڑی نظر رکھتے اور انہیں بزرگوں اور بڑوں کا ادب سکھایا کرتے تھے۔ ایک بار ایک بزرگ کے بارے میں آپ نے یہ کہہ دیا کہ وہ پڑھے ہوئے نہیں ہیں۔ یہ سن کر ان کو اس قدر غصہ آیا کہ مارنے دوڑے۔ اگرچہ مارا نہیں، مگر بہت ڈانٹا کہ بزرگوں کی شان میں کہیں ایسے الفاظ کہا کرتے ہیں۔

اشرف علی اپنی عادات اور مزاج کی وجہ سے بہت جلد گھر اور باہر پسندیدہ ہو گئے۔ طبیعت میں شوخی ضرور تھی، مگر تکلیف دہ شرارتوں سے باز رہتے تھے۔ اسی وجہ سے اپنے ہم عمر لڑکوں سے نہ کھیلتے تھے۔ یہ بات انہیں بہت ناگوار گزرتی اور لڑکوں کی ایک ٹولی مستقل آپ کو پریشان کرتی۔

دین کی طرف بچپن ہی سے رجحان تھا۔ محض بارہ تیرہ برس کی عمر میں تہجد کو اٹھتے اور نوافل و وظائف ادا کرتے۔ وعظ کا شوق بھی بچپن سے تھا۔ جب کبھی بازار جاتے تو راستے میں جو مسجد پڑتی وہاں تنہائی میں جا کر خالی منبر پر چڑھ جاتے اور خطبہ دینے لگتے۔ آپ کے والد نے آپ کے طبعی رجحان اور اپنی شدید خواہش کو مدنظر رکھتے ہوئے آپ کو دینی تعلیم دلانے کا فیصلہ کیا۔

تحصیلِ علم

آپ کی تعلیم کا آغاز عربی زبان کی ابتدائی کتابوں سے ہوا۔ اس وقت آپ اتنے چھوٹے تھے کہ ابھی پاجامہ بھی نہ پہنتے تھے۔ پھر قرآن کریم کے حفظ کا سلسلہ شروع ہوا تو حافظ حسین علی صاحب کی زیرنگرانی پایۂ تکمیل تک پہنچا۔

اس عرصے میں فارسی کی کتب مولانا فتح محمد اور اپنے ماموں واجد علی صاحب سے پڑھیں۔ غرض قرآن، عربی اور فارسی کی تعلیم کا سلسلہ جاری تھا اور اساتذہ اور والد دونوں آپ کی ذہانت اور اپنے اسباق میں دلچسپی لینے کی وجہ سے آپ سے بہت خوش تھے۔ ایک روز آپ کی تائی نے والد صاحب سے کہا کہ ''تم نے چھوٹے کو تو انگریزی پڑھائی ہے وہ تو خیر کما کھائے گا، بڑا عربی پڑھ رہا ہے، وہ کہاں سے کھائے گا؟ اس کی گذر اوقات کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کیا صورت ہوگی؟ کیونکہ جائیداد وارثوں میں تقسیم ہو کر گذارے کے قابل نہ رہے گی۔''

یہ بات سن کر آپ کے والدِ محترم جوش میں آ گئے اور کہنے لگے:''بھابھی صاحبہ! تم کہتی ہو یہ عربی پڑھ کر کھائے گا کہاں سے؟ خدا کی قسم جس کو تم کمانے والا سمجھتی ہو ایسے ایسے اس کی جوتیوں میں لگے لگے پھریں گے اور یہ ان کی جانب رخ بھی نہ کرے گا۔''

پندرہ برس کی عمر میں ابتدائی علوم سے فراغت کے بعد آپ کو دارالعلوم دیوبند بھیج دیا گیا۔ وہاں کے حالات بیان کرنے سے قبل بہتر ہوگا کہ اس ادارے کا مختصر تعارف کرا دیا جائے۔

دارالعلوم دیوبند

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی جسے غدر کہا جاتا ہے بالآخر انگریزوں کے دلی پر قبضے پر انجام پذیر ہوئی۔ پورے ہندوستان سے مسلمانوں اور ہندی نوجوانوں نے اس میں شرکت کی۔ بات سور کی چربی سے بنی کارتوس کی گولی کو منہ سے چبا کر رائفل میں ڈالنے کے بلوے سے شروع ہوئی، جس پر مسلمان سپاہی انگریز کے خلاف بھڑک اٹھے تو آگ پورے ہندوستان میں لگ گئی۔ علاقہ تھانہ بھون کے رئیس قاضی عنایت علی خان کے بھائی کو پھانسی چڑھائی گئی تو وہ انتقام لینے کھڑے ہوئے۔ انہوں نے مجلسِ شوریٰ ترتیب دی جو علاقے کے بیدار مغز اشراف اور سرکردہ شخصیات پر مشتمل تھی۔ اس وقت وہاں کچھ ایسے لوگ بھی موجود تھے جن سے قدرت کو مستقبل میں بڑے کام لینے تھے۔ مولانا قاسم نانوتوی اور مولانا رشید گنگوہی (جو ابھی نوجوان تھے، لیکن دین کی طرف ان کے شغف کا حال کسی سے ڈھکا چھپا نہیں تھا) بھی موجود تھے۔ مولانا قاسم نے حضرت امداداللہ مہاجر مکی کا نام امام کے طور پر پیش کیا تاکہ ان حالات میں انگریزوں کے مظالم کے خلاف جنگِ آزادی میں شرکت کی جا سکے۔

مولانا امداداللہ مہاجر مکی تھانہ بھون کی مسجد میر محمد کے حجرے میں رہنے والے وہ صاحبِ حال بزرگ تھے جو سند یافتہ نہ ہونے کے باوجود اپنے باطنی کمالات کی وجہ سے طبقۂ علماء میں بھی مشہور تھے۔ بچپن میں کسی نے ان کی تعلیم کی طرف توجہ نہ کی تو خود ہی قرآن پاک کا حفظ شروع کر دیا۔ فارسی کی چند کتابوں کے پڑھنے کے بعد درود وظائف کا شوق ہوا اور دہلی میں آ کر شاہ امیرالدین سے بیعت کی۔ ابھی ۲۵۔۳۰ سال کے تھے کہ دلی کے شہزادے اور بیگمات آپ کی معتقد ہو گئیں۔ آپ نے خواب میں دیکھا کہ نبی کریم ﷺ نے آپ کا ہاتھ حضرت نور محمد جھنجھانوی کے ہاتھ میں دے دیا ہے۔ بعد میں یہ بات پوری ہوئی اور اس طرح آپ کا سلسلہ شاہ ولی اللہؒ سے جا ملا (حاجی امداداللہ مہاجر مکی۔ نور محمد جھنجھانوی۔ عبدالرحیم ولائتی۔ سید احمد شہید جو بالاکوٹ میں سکھوں کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خلاف جہاد کرتے ہوئے شہید ہوئے)۔

حاجی صاحب کی امامت میں جہاد شروع ہوا اور ابتدائی کامیابیوں کے بعد شاملی کے میدانِ جنگ میں معرکہ ہوا۔ شروع میں مجاہدین کا پلڑا بھاری رہا، مگر سپہ سالار کی اچانک شہادت اور دلی کے آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر کی گرفتاری کی خبر کے ساتھ ہی جہاد کرنے والوں کے حوصلے جواب دے گئے۔

مجاہدین میں سے مولانا قاسمؒ، مولانا رشید گنگوہیؒ اور حضرت حاجی امداداُللہ سب کے وارنٹ گرفتاری جاری ہو چکے تھے۔ حضرت حاجی صاحب ان حالات میں مکہ مکرمہ ہجرت کر گئے، جبکہ مولانا قاسم کچھ عرصے تک مقامات تبدیل کرتے رہے اور بچ گئے۔ مولانا گنگوہی گرفتار ہوئے، مقدمہ چلا مگر مشیت الٰہی سے بغیر کسی سزا کے رہا ہو کر باہر آ گئے۔

آہستہ آہستہ حالات معمول پر آ گئے اور مسلمانوں کو، جن کے حواس اس آفت عظیم کی وجہ سے جواب دے گئے تھے، سنبھلنے کا موقع مل گیا۔ دیوبند کے علاقے کے دو بزرگ مولوی رفیع الدین اور حاجی محمد عابد صاحب (جو چھتہ کی مسجد میں قیام پذیر تھے اور وہاں کے عوام میں انتہائی مقبول تھے) مولانا قاسم نانوتوی سے خاص تعلق رکھتے تھے انہوں نے تجویز کیا کہ ایک مدرسہ قائم کرنا چاہیے۔ اس سلسلے میں مولانا قاسم سے رابطہ کیا گیا جو اس زمانے میں میرٹھ میں تھے۔ انہوں نے بھی یہ سوچ کر سرگرمی دکھائی کہ نئے آنے والے حالات میں جب کہ مسلمانوں کو دینی زندگی اور دینی علوم سے منحرف کرنے کی کوشش کی جارہی تھی دینی تعلیم و تدریس کے نظام میں اصلاحات کر کے ایسا مرکز وجود میں لایا جائے جہاں تعلیم کے عصری لوازم اور تقاضوں کو بھی ممکنہ حد تک سمویا جاسکے۔ مسلمانوں میں یہ احساس تھا کہ دنیا تو ہاتھ سے گئی ہے، دین بھی نہ چلا جائے۔ چنانچہ حاجی محمد عابد صاحب نے چندہ اکٹھا کیا اور جنگِ آزادی کے دس سال بعد ۱۲۸۳ ہجری بمطابق ۱۸۶۷ء ضلع سہارنپور کے گمنام قصبے دیوبند کی چھتہ مسجد کے فرش پر انار کے درخت کے نیچے اس مدرسے کی بنیاد پڑی جس کی قسمت میں آئندہ ہندوستان کے مسلمانوں کا دینی مرکز و محور قرار پانا تھا۔ پہلے شاگرد بھی محمود (محمود الحسن) اور پہلے استاد بھی محمود (علامہ محمود صاحب دیوبندی) تھے۔

حاجی صاحب کو خبر ملی تو خوش ہو گئے۔ فرمایا ''سبحان اللہ! آپ فرماتے ہیں ہم نے مدرسہ قائم کیا ہے۔ یہ خبر نہیں کہ کتنی پیشانیاں اوقات سحر میں سربسجود ہو کر گڑگڑاتی ہیں کہ خداوند ہندوستان میں بقائے اسلام اور تحفظِ علم کا کوئی ذریعہ پیدا کر''۔ اس کے بعد فرمایا: ''یہ مدرسہ (یعنی دارالعلوم دیوبند) ان ہی سحرگاہی دعاؤں کا ثمرہ ہے'' اور یوں چھتہ مسجد کے احاطے میں افتتاح پذیر ہونے کے بعد اس مدرسے میں ایسی دن دگنی رات چوگنی ترقی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دیکھنے میں آئی کہ مغرب میں پنجاب اور کابل اور مشرق میں بنارس تک کے طلبہ پہلے ہی سال اس کے طالب علم بن چکے تھے اور کچھ ہی عرصے میں بہت سے مدرسوں نے اس سے الحاق بھی کرلیا۔ مولانا محمد قاسم اس کے سرپرستِ اعلیٰ بن گئے اور یہیں کے ہو رہے۔ آنے والے دنوں میں دارالعلوم نے ایسی ترقی کی جو ہندوستان میں مسلمانوں کی کسی اور درسگاہ کو حاصل نہ ہوسکی۔ مولانا قاسم نانوتوی، مولانا رشید گنگوہی اور شیخ محمود الحسن ایسے بڑے بڑے نام یہاں سے وابستہ ہیں جن پر دیوبند بجا طور سے فخر کرسکتا ہے۔

مولانا اشرف علی تھانوی کو بھی اس عظیم الشان اور قابلِ فخر درسگاہ سے تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا اور پانچ سال ۱۲۹۵ ہجری سے ۱۳۰۱ ہجری تک ان اساتذہ کی صحبت میں شب روز گذرے، جنہوں نے ہندوستان میں اسلامی علوم کو زندہ رکھنے کی بے نظیر کوشش کی جس کے لئے آج تک برصغیر کے مسلمانوں کا بچہ بچہ ان کا احسان مند ہے۔ ملا محمود، مولانا محمود الحسن، مولانا محمد یعقوب اور مولانا سید احمد آپ کے اساتذہ کرام تھے، جبکہ سند حاصل کرنے کے بعد دستار بندی خود مولانا رشید گنگوہی کے ہاتھوں ہوئی۔

حج کا مبارک سفر اور بیعت

مولانا اشرف علی تھانویؒ ابھی دارالعلوم دیوبند میں طالبِ علمی کے دور سے گذر رہے تھے کہ حضرت شیخ امداد اللہ مہاجر مکی نے آپ کے والد سے کہلا بھیجا کہ جب حج کو آئیں تو اپنے بڑے لڑکے کو بھی ہمراہ لیتے آئیں۔ یہ بات سب کے لئے باعث حیرت تھی، کیونکہ حضرت امداد اللہ تو آپ کی پیدائش سے قبل ہندوستان سے مکہ منتقل ہو چکے تھے اور ان کا آپ سے ظاہری طور سے کوئی تعارف نہ تھا۔ پھر ان کا جو مقام و مرتبہ تھا اس کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک کم عمر لڑکے کو ملاقات کے لئے خصوصی طور پر بلانا یقیناً کچھ معنی رکھتا تھا۔

اس طلبی پر لبیک کا موقع قدرت نے اس طرح فراہم کیا کہ مدرسہ دیوبند کی طرف سے تجارت کی ایک کمپنی قائم کی گئی جس میں ایک شخص پانچ سو روپے سے زیادہ کے حصے لینے کا مجاز نہ تھا۔ آپ کے والد نے زیادہ حصہ لینا چاہا تو اپنے نام کے علاوہ دونوں بیٹوں کے نام سے بھی حصہ ڈالا۔ کچھ عرصے بعد چند وجوہات کی بناء پر رقم واپس لینا پڑی۔ آپ کو اس کی خبر ہوئی تو والد سے پوچھا کہ یہ رقم میری ملک ہے یا آپ کی۔ انہوں نے کہلا بھیجا کہ رقم تو اصل میں میری ہی تھی، مصلحتاً تمہارا نام درج کرایا تھا۔ مگر اب اس رقم کو تمہاری ملکیت قرار دیتا ہوں۔ اس پر آپ نے لکھا کہ پھر اس رقم کی زکوٰۃ بھی واجب ہوگئی اور حج بھی فرض ہوگیا۔ والد صاحب نے زکوٰۃ کی رقم تو آپ کو بھجوادی اور کہلا بھیجا کہ حج کی ادائیگی کے لئے ہم دونوں اگلے سال تمہاری بہن کے نکاح سے فارغ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہو کر چلیں گے۔ آپ نے جواباً تحریر کیا کہ اگر آپ مجھے یہ لکھ کر دے دیں کہ میں اگلے سال تک زندہ رہوں گا تو میں انتظار کرنے کے لئے تیار ہوں۔ اس پر انہوں نے کہا کہ بھلا میں کیسے لکھ سکتا ہوں۔ آپ نے عرض کیا کہ حج تو میرے ذمے فرض ہو چکا اور زندگی کا کچھ اعتبار نہیں، تاخیر بلا عذر شرعی جائز نہیں اس لئے مجھے تو اسی سال حج کرنا لازم ہے۔

چنانچہ نہایت عجلت میں آپ کی بہن کا نکاح کیا گیا اور تقریب کے فوری بعد آپ والد کے ہمراہ حج کو روانہ ہو گئے۔ راستے میں سمندر میں سخت طغیانی آئی ہوئی تھی۔ راستے کی مشقت اٹھا کر جب مکہ پہنچے اور بیت اللہ شریف پر نظر پڑی تو کہتے ہیں کہ ایسی کیفیت میرے اوپر طاری ہوئی جو عمر بھر کبھی طاری نہیں ہوئی۔

حضرت حاجی امداد اللہ آپ کے آنے پر بہت خوش ہوئے۔ گو شرفِ بیعت سے تو وہ غائبانہ طور پر ہی مشرف کر چکے تھے، اب دست بدست بیعت کا موقع بھی حاصل ہو گیا۔ حج سے فراغت کے بعد بھی حاجی صاحب کا اصرار تھا کہ چھ ماہ کے لئے رک جائیں۔ مگر والد صاحب واپسی کے لئے تیار تھے اور اکیلے رکنے کی اجازت نہ دیتے تھے۔ چنانچہ والد صاحب کی اطاعت کو مقدم رکھتے ہوئے حاجی صاحب نے مشورہ دیا کہ ''ابھی چلے جاؤ، بعد میں دیکھا جائے گا۔''

چنانچہ محض بیس برس کی عمر میں نہ صرف ظاہری علوم سے فراغت ہوئی اور حج کی سعادت نصیب ہوئی بلکہ شیخ عرب وعجم کی بیعت سے بھی مشرف ہوئے۔

درس و تدریس

آپ ابھی دیوبند سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ کانپور کے مدرسہ فیضِ عام میں مدرس کے طور پر نامزد کیا گیا۔ چونکہ آپ بالکل جوان تھے، لہٰذا اتنے کم عمر مدرس کی تقرری سے مدرسین اور اہلِ شہر میں بہت جلد شہرت ہو گئی۔

تین چار ماہ کے بعد اراکینِ مدرسہ نے چندے کے لئے تحریک کروانا چاہی تو آپ کو بہت ناگوار ہوا۔ آپ اسے غیرتِ دینی کے خلاف سمجھتے تھے۔ کہا کہ اگر مجھے چندے ہی کی لئے وعظ کہنا ہے تو میں چندہ اپنے لئے کیوں نہ جمع کروں۔ یہ کام میرا نہیں بلکہ اراکین مدرسہ کا ہے۔ میرا کام تو پڑھانا ہے۔ چنانچہ وہاں سے رخصت ہوئے، تاہم وہاں کے لوگ آپ کو ایسا عزیز رکھتے تھے کہ خاص طور سے ایک نئے مدرسے کی منصوبہ بندی ہوئی، اور اس کے لئے آپ سے ایک بار پھر درخواست کی گئی۔ غرض ''جامع العلوم'' کے نام سے قائم کردہ اس مدرسے میں آپ تعلیم دینے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے طالب علموں میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور تدریسی مہارت کی وجہ سے طالبین

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کا ہجوم رہنے لگا۔

مولانا کا پڑھانے کا طریقہ بہت سہل تھا۔ آپ خود مشقت اٹھا کر مشکل سے مشکل مضامین کو سہل اور ترتیب وار بنا کر سمجھاتے تھے۔ کتاب کی ضروری اور اہم باتوں کو بیان فرماتے تاکہ طالب علموں کا وقت ضائع نہ ہو۔ آپ چاہتے تھے کہ طالب علم میں مضمون سمجھنے کی استعداد پیدا کر دی جائے، باقی نکات و دقائق خود ہی اسے سمجھ میں آنے لگیں گے۔

آپ اپنے تجربے کی بنیاد پر طالب علموں کو یہ بھی ہدایت کرتے کہ بس تم تین باتوں کا اہتمام کرو تو پھر میں ذمہ داری لیتا ہوں کہ تمہارے اندر استعدادِ علمی پیدا ہو جائے گی۔

اول: یہ کہ جو سبق پڑھنا ہو اس کا مطالعہ ضرور کر لیا جائے۔

دوئم: یہ کہ ایک بار استاد سے سمجھ کر پڑھ لو، اگر اس وقت سمجھ نہ آئے تو کسی اور وقت حاضر ہو کر پڑھ لو۔

سوئم: یہ کہ ایک بار خود بھی اس کو پڑھا دو یا اس سے متعلق بیان کرو۔ اس کے بعد بے فکر ہو جاؤ، چاہے یاد رہے نہ رہے استعداد ضرور پیدا ہو جائے گی۔ یہ تینوں باتیں تو درجۂ وجوب میں ہیں۔ جنہیں لازمی کرنا چاہئے اور اسکے ساتھ اگر کچھ نہ کچھ روزانہ پچھلا سبق دہرا لیا جائے تو مزید پختگی آ جائے گی۔

چودہ سال تک کانپور میں درس و تدریس کا شغل رہا۔ اس دوران آپ کی قلبی کیفیات ترقی کرتی رہیں۔

استفادۂ باطنی

مولانا کے اندر ذکر و شغل کا شوق تو ہمیشہ سے تھا۔ نابالغی کے زمانے میں بھی تہجد کی نماز ادا کرتے تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس میں اضافہ ہوا البتہ تعلیمی سرگرمیاں اور درس و وعظ کی مصروفیات زیادہ رہیں۔ ۱۳۰۷ ہجری میں اس طرف توجہ زیادہ ہوئی۔ اس کا سبب یہ ہوا کہ مولانا کے ایک ماموں صاحب حال درویش تھے۔ آپ کچھ عرصہ ان کے زیر اثر رہے تو دل کی کایا بالکل پلٹ گئی۔ تعلقات سے نفرت ہو گئی اور حضرت حاجی امداد اللہ سے بذریعہ خط ملازمت ترک کرنے کا مشورہ لیا۔ حاجی صاحب نے اس کی اجازت نہ دی کیونکہ اس میں عوام الناس کا نقصان تھا۔ چنانچہ ذکر و شغل کا سلسلہ بھی جاری رہا اور درس و تدریس بھی ہوتی رہی۔

مگر محض تین برس کے عرصے میں قلبی کیفیات اس قدر اضطراب انگیز ہو گئیں کہ کسی طرح سکون نہ آتا تھا۔ پریشان ہو کر سفر کا سامان باندھا اور حضرت حاجی امداد اللہ کے پاس مکہ پہنچ گئے۔ وہاں جا کر قدرے سکون ہوا۔ حضرت حاجی صاحب بھی آپ کی آمد سے بہت مسرور ہوئے اور کچھ عرصے کے استفادے کے بعد ہی وہ کہنے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لگے کہ بس تم پورے پورے میرے طریق پر ہو۔ دورانِ قیام توحید کے فلسفے پر بھرپور توجہ رہی اور چھ ماہ کی قلیل مدت میں باطنی دولتیں سمیٹ کر اس حال میں وطن واپس آئے کہ حضرت حاجی امداداللہ نے نہ صرف بیعت کی اجازت دی بلکہ اپنا جانشین وخلیفہ بھی بنا دیا۔

مکہ مکرمہ سے واپسی کے بعد گو طبیعت بظاہر پرسکون ہو چکی تھی لیکن دنیا سے بے رغبتی کا عنصر نمایاں تھا۔ لباس و طعام میں سادگی اور بے پرواہی نظر آنے لگی تھی۔ معرفت حق کا ایسا شوق غالب تھا کہ اس کے اثر سے مدرسے کے طلباء و مدرسین بھی ذکر کی محفلیں کرنے لگے اور تصوف کے مضامین جگہ جگہ بیان ہونے لگے۔ کچھ عرصہ ذوق وشوق کی یہ کیفیت رہی۔ پھر دوبارہ باطنی حالات نے پلٹا کھایا اور سارے مشاغل سے دل اچاٹ ہو گیا۔ پہلے وعظ بند ہوا، پھر جب دھن زیادہ لگی تو درس و تدریس کو بھی موقوف کر دیا۔ غیر ضروری تعلقات کو خیر باد کہہ کر یکسوئی سے ذکر میں لگ گئے۔

درس و تدریس اور وعظ کا بند ہونا تھا کہ کانپور کے مسلمانوں میں ہلچل مچ گئی۔ جب ان کا اصرار بڑھا تو فرمایا کہ میں تو خود فقیر ہوں، دوسروں کو کیا دوں۔ اسی زمانے میں مدرسے کا جلسہ ہوا۔ اراکینِ مدرسہ ان حضرات علماء کو بھی اپنے ہمراہ لیتے آئے جو مہمان تھے اور خاص جلسے کے لئے آئے تھے۔ یہ سب مل کر آپ سے سفارش کرنے لگے۔ اس موقع پر آپ سے انکار نہ ہوتا تھا۔ چنانچہ مجبور ہو کر گردن جھکا لی اور رونے لگے۔ یہ حال دیکھ کر مولانا ظہور الاسلام فتحپوری نے کہا: ''بس بھائی، اب انہیں کچھ نہ کہو۔ اپنے حال پر چھوڑ دو اور تنگ نہ کرو''۔

یہ کیفیات کبھی شدت اختیار کر جاتیں اور کبھی افاقہ ہوتا۔ یہاں تک کہ آپ کا دل کانپور سے اچاٹ ہو گیا۔ بظاہر اس کی وجہ نظر نہ آتی تھی، مگر آپ نے کانپور چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس موقع پر آپ کو حاجی صاحب کی دو وصیتیں خاص طور سے یاد آئیں۔ پہلی تو یہ تھی کہ ہندوستان پہنچ کر تم کو ایک حالت پیش آئے گی، عجلت نہ کرنا۔ دوسری یہ کہ کانپور کے تعلق سے دل برداشتہ ہو تو دوسری جگہ تعلق نہ کرنا، توکل بخدا کر کے تھانہ بھون جا بیٹھنا۔ اس وقت آپ کو بہت حیرت ہوئی تھی کہ کانپور سے جس درجہ آپ کو لگاؤ تھا اور وہاں کے لوگوں سے جو تعلق تھا اس کے بعد یہ محال نظر آتا تھا۔ اب جو قدرت نے خود ہی اس کا انتظام کر دیا تو کانپور کے مدرسے کا انتظام دوسروں کے سپرد کر دیا اور ۱۳۱۵ ہجری میں کانپور چھوڑ کر تھانہ بھون کا قیام اختیار کیا۔

www.KitaboSunnat.com
محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خانقاہ تھانہ بھون

تھانہ بھون منتقل ہونے کے بعد اپنے اس فیصلے کی اطلاع حاجی امداد اللہ کو دی تو انہوں نے اظہارِ مسرت فرمایا، پے در پے خطوط میں دعائیں تحریر فرمائیں اور نہایت وثوق سے یہ بات تحریر کی کہ بہتر ہوا آپ تھانہ بھون تشریف لے گئے۔ امید ہے کہ آپ سے خلقِ کثیر فائدہ اٹھائے گی اور یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

تھانہ بھون لوٹنے کے بعد آپ درس و مواعظ اور تصانیف میں مشغول ہو گئے اور متوکلانہ زندگی بسر کرنے لگے۔ والد کے ورثے سے جو کچھ ملا تھا اس میں سے بھی بغرضِ احتیاط ایک قلیل حصے کے سوا کچھ لینا منظور نہ کیا۔ کچھ ہی دنوں میں قرض چڑھ گیا تو اپنے استاد مولانا گنگوہی سے دعا کی درخواست کی۔ چند دنوں میں قرضہ ادا ہو گیا اور پھر کبھی تنگی نہ ہوئی۔ آپ کی خدماتِ دینی کا حال سن کر استاد محترم (رشید گنگوہی) مسرور ہوئے اور کہا ''میرا جی تو اس وقت خوش ہوگا جب تمہارے پاس کچھ اللہ اللہ کرنے والے بھی جمع ہو جائیں گے۔'' ان کی یہ خواہش جلد پوری ہوئی اور لوگ کثرت سے آپ کی طرف رجوع کرنے لگے۔

درس و وعظ

مولانا کو وعظ کہنے کا شوق تو بچپن ہی سے تھا۔ طالب علمی کے زمانے سے ہر شب جمعہ کو طلباء کی ایک انجمن کے تحت وعظ گوئی کا اہتمام کرتے تھے۔ وہاں اس کا موقع ملا اور خاصی مشق ہو گئی۔ البتہ جب اسی زمانے میں آپ کے نکاح کی تقریب ہوئی تو آپ کے ماموں نے اصرار کر کے مسجد میں آپ کے وعظ کا اعلان کر دیا۔ مولانا فرماتے ہیں: '' مجھے اتنی شرم آئی کہ منبر پر بھی نہیں بیٹھا بلکہ نیچے بیٹھ کر اور نظریں نیچی کئے ہوئے سورہ بقرہ کی آیات کا وعظ بیان کیا''۔ اس کے بعد تو یہ سلسلہ ایسا چلا کہ وفات سے کچھ پہلے ہی موقوف ہوا۔

مولانا کا دستور تھا کہ وعظ میں سوائے مصلحتِ عامہ کے اور کوئی غرض نہ رکھتے اور فرماتے کہ جب میں کسی کو کچھ نصیحت کرتا ہوں تو دل و جان سے چاہتا ہوں کہ یہ ایسا ہی ہو جائے۔ آپ پہلے سے مضمون سوچنے کے بجائے عین موقع پر جو خیال غالب آتا اسی سے متعلق وعظ فرما دیتے۔ اس کی وجہ یہ بیان فرمایا کرتے کہ اللہ تعالیٰ کو سب کے قلوب کا حال معلوم ہے۔ جو جس کے دل میں ہوتا ہے اسی کے مناسب مضامین میرے قلب میں ڈال دیتے ہیں اور میری زبان سے ادا کرا دیتے ہیں۔ یہ کسی ایک وعظ کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ اکثر مواعظ کے بعد لوگوں کو آپ پر کشف کا گمان ہونے لگا۔

مولانا کی بھرپور کوشش ہوتی کہ اختلافی مسائل سے گریز کیا جائے۔ لیکن جہاں ذکر آ جاتا تو پھر صاف

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

صاف مگر نرم اور خوشگوار طریقے سے اسے بیان کرتے۔ ایک موقع پر فرمایا ''میری عادت خود چھیڑ چھاڑ کی نہیں ہے، قصداً کبھی کوئی ایسی بات نہیں بیان کرتا جس میں کسی گروہ کی دل آزاری یا عناد پیدا ہو، لیکن اگر اصول شرعیہ کی تحقیق کے ضمن میں کسی ایسے مسئلے کے ذکر کی ضرورت ہی پیش آ جاتی ہے جس کا رسومِ بدعیہ سے تعلق ہے تو پھر میں رکتا بھی نہیں، اس لئے کہ یہ صریح دین میں خیانت ہے۔''

ایک بار جودھ پور میں خطاب سے پہلے ایک صاحب نے لکھا کہ لوگ دیوبند کے فارغ التحصیل لوگوں کو وہابی کہتے ہیں۔ اس لئے بہتر ہو کہ آپ وعظ میں امام ابوحنیفہ کے فضائل بیان کریں۔ اس پر آپ نے صاف انکار کیا کہ اس کے تو معنی یہ ہوئے کہ میں اپنی مصلحت کے لئے وعظ کہوں کہ لوگ مجھے حنفی سمجھیں، حالانکہ وعظ سامعین کی مصلحت کے لئے ہونا چاہئے۔

ایک بار آپ کو خبر ہوئی کہ اہل سنت والجماعت کے حضرات بھی جا کر شیعہ حضرات کی مجالس میں شہادت کے واقعات سننے کے عادی ہو رہے ہیں۔ چنانچہ آپ نے محرم کے عشرۂ اول میں روزانہ بالترتیب حضور اکرم ﷺ اور خلفائے راشدین کے واقعاتِ وفات بیان فرمانا شروع کر دیئے۔ لوگ کثرت سے اس میں شریک ہونے لگے اور نہ صرف سنی حضرات بلکہ خود شیعہ حضرات بھی شریک ہوئے۔

آپ کے وعظ علمی نکات، اثر پذیری اور اصلاحِ نفس کے لئے اس قدر مفید ہوتے کہ لوگ گھنٹوں بیٹھ کر نہایت دلچسپی سے سنتے۔ صورت یہ ہوتی کہ ہر طبقہ فکر کے لوگ شریک ہوتے اور مولانا چھ چھ سات سات گھنٹے کھڑے ہو کر بلا تکان بولے جاتے۔ ان کی اثر پذیری کا حال یہ ہوتا کہ ایک بار مسلسل دو ماہ تک محلّہ محلّہ صرف نماز ہی کے متعلق بیانات ہوتے رہے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ مسجدوں میں نمازیوں کی کثرت کی وجہ سے جگہ باقی نہ رہی اور نماز کا اتنا شوق بڑھا کہ تانگے والے اپنی سواریوں سے پوچھ پوچھ کر نماز یاد کرنے لگے۔ اللہ کی توفیق کے علاوہ اثر پذیری کی ایک خاص وجہ آپ کا اخلاص تھا۔ دن رات کی ان کوششوں میں وعظ کہنے کا کبھی کسی سے معاوضہ نہیں لیا حتیٰ کہ جس ہدیے میں معاوضے کی صورت پیدا ہوتی اس سے بھی اعراض فرماتے۔

باطنی اصلاح

مولانا باطنی اصلاح کی اہمیت پر بہت زور دیتے تھے۔ آپ اپنی طرف رجوع کرنے والوں کی توجہ اصلاحِ اعمال کی جانب رکھتے اور جب تک یہ مقصود حاصل نہ ہو جاتا نہ خود چین سے بیٹھتے نہ طالب کو چین لینے دیتے۔ جب یہ دیکھ لیتے کہ اصلاحِ اعمال کی اہمیت اچھی طرح اس کے ذہن نشین ہو گئی ہے اور اس کے اندر اس کا خاص

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اہتمام بھی پیدا ہو گیا ہے اس وقت اذکار بتاتے اور دونوں کا سلسلہ ساتھ ساتھ چلاتے ۔ فرماتے کہ:

''طالب کے اندر اصلاحِ اعمال کا اہتمام پیدا کر دینے سے قبل اس کو اذکار و اشغال میں مشغول کر دینا اکثر مضر ثابت ہوتا ہے ۔ کیونکہ پھر وہ اپنے آپ کو بزرگ سمجھنے لگتا ہے ۔ خاص کر اگر کہیں اتفاقاً اذکار و اشغال سے یکسوئی ہو کر اس پر کیفیات کا بھی ورود ہونے لگے تب تو گویا اس کے نزدیک بزرگی کی رجسٹری ہو گئی ۔ حالانکہ اس قسم کی کیفیات کا بزرگی سے کیا تعلق ۔ ایسی کیفیات تو بعض اوقات ریاضت اور مشق سے فساق و فجار بلکہ کفار تک کو حاصل ہو جاتی ہیں اور جب وہ ان کیفیات ہی کو بزرگی سمجھ لیتا ہے تو پھر اس کو اصلاحِ نفس اور اصلاحِ اعمال کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی ، نہ کبھی ادھر توجہ ہوتی ہے ، اس لئے ہمیشہ جہل ہی میں مبتلا رہتا ہے اور اصل مقصود یعنی وصول الی اللہ سے محروم رہتا ہے ۔ جس کا طریق شریعت نے صرف اصلاحِ اعمال ہی کو بتلایا ہے ۔''

آپ اس بات کا اہتمام بھی کرتے کہ اپنی طرف رجوع کرنے والوں کو فضولیات سے ہٹا کر ضروریات میں مشغول کر دیں ۔ وہ لوگ جو آپ سے ہمیشہ فقہی باریکیوں سے متعلق درپے رہتے ان سے کہہ دیتے کہ تحقیقِ مسائل کے لئے اس فن کے کسی ماہر کی طرف رجوع کرو ، مجھ سے تو اپنی اصلاح کے متعلق باتیں پوچھی جائیں ۔ پھر فرماتے کہ:

''ماشاء اللہ فتویٰ نویسی کا کام تو بہت جگہ ہو رہا ہے ۔ اس فن کے بفضلہٖ تعالیٰ مجھ سے کہیں بہتر جاننے والے موجود ہیں لیکن اصلاحِ باطن کا کام اہتمام خاص کے ساتھ آج کل کہیں نہیں ہو رہا ۔ اس لئے اس کی ضرورت دیکھ کر میں نے اپنے ذمے یہی خدمت لے رکھی ہے ''۔

ایک بار ایک صاحب نے آپ کو خط کے ذریعے اپنی کوتاہیوں سے آگاہ کیا ۔ آپ نے ان کوتاہیوں کے تدارک کی تدابیر بتائیں ۔ اگلے خط میں وہ اس تمام تذکرے کو تو گول کر گئے اور دعا کی درخواست کے ساتھ یہ لکھ بھیجا کہ آج رات تراویح میں گیارہ سپارے ہوئے ۔ اس پر آپ نے تحریر فرمایا کہ:

''تم نے اپنی تراویح کی تو اطلاع دی اور تم سے جو دوسروں کو تکالیف پہنچیں خصوصاً حقوق کے متعلق اور ان کا تدارک ان کو راحت پہنچانے سے ہو سکتا تھا ۔ تم نے تراویح کی اطلاع دی اور ان کی نہ دی ۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ مریض طبیب کو اپنی غذا کی خبر تو دے مگر دوا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور مرض کی خبر نہ دے۔ کیا طبیب اس سے خوش ہوگا بجز اس طبیب کے جو مریض کے نام سے اپنا رجسٹر بھرنا چاہتا ہو اور مریض پر شفقت نہ رکھتا ہو''۔

اسی طرح ایک صاحب نے خط میں لکھا کہ اللہ اللہ کرنے کو جی چاہتا ہے۔ فرمایا ''کیا صرف یہی مقصود ہے؟'' یہاں اپنے مختصر سے جواب کے ذریعے ان کی توجہ اصل مقصد کی طرف کروانا چاہی کہ اصل مقصود رضائے الٰہی ہے جو اعمال صالحہ کے ذریعے سے ہی حاصل ہوسکتا ہے نہ کہ محض ذکر اذکار کے ذریعے سے۔

آپ طالبین سے فرماتے کہ: ''محض اذکار و اشغال اصلاحِ اعمال کے لئے ہرگز کافی نہیں۔ اصلاح کے لئے تو ہمت، بہ تکلف استعمالِ اختیار، تدابیر اور ان کے تکرار کی ضرورت ہے۔ البتہ اذکار معاونِ اصلاح ضرور ہوتے ہیں''۔

لوگ آپ سے اپنی اصلاح کا طریقہ پوچھتے تو آپ فرماتے کہ: ''تم اپنے نفس کا ایک ایک عیب ظاہر کرو اور مجھ سے اس کا علاج پوچھو اور میں جو بتلاؤں اس پر عمل کرو اور عمل کر کے اطلاع دو''۔ اس طرح آپ لوگوں کے روحانی امراض کا علاج فرماتے۔ سینکڑوں لوگوں کو اس سے افاقہ ہوتا اور سالہا سال کی نفسانی و روحانی بیماریاں دور ہو جاتیں۔

آپ فرماتے کہ امراضِ روحانی کے بھی خاص اسباب ہوتے ہیں اور ان کا ازالہ ہی اس کا معالجہ و اصلاح کا طریقہ ہے۔ تشخیصِ اسباب میں دو معاملوں میں سے ایک ہوتا ہے، یا لاعلمی یا ارادے کی کمزوری۔ لاعلمی کا ازالہ تو حصولِ علم سے ہی ہوسکتا ہے جبکہ ارادے کی کمزوری دور کرنے اور ہمت کرنے کے لئے شیخ کامل یا نیک لوگوں کی صحبت اختیار کرنا، نیز اہل اللہ کے حالات و مجاہدات کا مطالعہ کرنا اور مراقبہ موت و مابعد الموت فائدہ مند ہوتا ہے۔ مراقبہ موت سے مراد ہے نزع کے وقت سے لے کر موت اور اس کے بعد کے حالات پر کسی فارغ وقت میں کم از کم بیس منٹ تک سوچنا۔

ایک طالب نے اپنا حال لکھا کہ دین اور دنیا دونوں کے متعلق یہ ہوس ہوا کرتی ہے کہ جو چیز اور جو بات ہو وہ اعلیٰ درجے کی ہو اور میں ہر فن میں سب سے بڑھ کر ہوں۔ آپ نے اس کا علاج یہ تجویز کیا کہ: ''جس دنیوی چیز کی تمنا ہو اس کے فنا ہونے کا تصور کر لو تاکہ اس کا معمولی اور ہیچ ہونا واضح ہو جائے اور اگر وہ دین میں مضر ہے تو اس کے نتیجۂ بد کا بھی تصور کرو۔ اس امر کے بار بار کرنے سے یہ ہوس کمزور پڑ جائے گی اور اگر امرِ دینی میں یہ کیفیت ہو تو اس کی تمنا پسندیدہ ہے اور اس کے علاج کی ضرورت نہیں، البتہ شرط یہ کہ جس کو وہ نعمت عطا ہوئی ہو اس کے زائل ہونے کی تمنا نہ ہو ورنہ وہ حسد اور حرام ہے''۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایک اور صاحب نے لکھا کہ جب میں پڑھی ہوئی یا سنی ہوئی کوئی اچھی بات دوسروں کو بتاتا ہوں تو ریا محسوس ہوتی ہے کہ جو کچھ کہتا ہوں وہ میرے افعال کے خلاف ہے اور یہ وعظ گوئی خلاف منصب ہے۔ آپ نے اس کا جواب یہ تحریر کیا کہ ''ریا ہر خیال کا نام نہیں، بلکہ جس خیال کی بنیاد بذریعہ دین لوگوں کو خوش کرنے کی ہو وہ ریا ہے اور یہ تو اختیاری امر ہے۔ جب اس کا قصد نہ ہو وہ ریا ہی نہیں، اگرچہ وہم ریا ہو۔ وہم ریا وسوسۂ ریا ہے، جس پر مواخذہ نہیں۔ ایسے وہم سے عمل صالح کو ترک نہیں کرنا چاہئے۔''

ایک اور سوالی نے پوچھا کہ جب کسی شخص میں واقعی خداداد فضیلتیں موجود ہیں تو اب ان موجودہ فضیلتوں کو کس طرح اپنے میں معدوم سمجھ کر اپنے آپ کو دوسروں سے ادنیٰ اور فرو سمجھے۔ اس کا جواب آپ نے یہ دیا کہ ''اکمل سمجھنا تو جائز ہے مگر افضل بمعنی اپنے آپ کو مقبولِ حق سمجھنا اور دوسرے کو مردود سمجھنا جائز نہیں کیونکہ ممکن ہے کہ اس کا کوئی عملِ صالح ایسا ہو کہ تمہارے تمام اعمال سے زیادہ پسندیدہ ہو اور تم میں کوئی رذیلہ ایسا ہو کہ اس کے سب رذائل سے زیادہ ناپسندیدہ ہو یا فی الحال نہ ہو تو آئندہ اس کا احتمال ہو۔ پس ان دونوں باتوں کو ذہن نشین رکھنا علاجِ کبر کے لئے کافی ہے۔ انسان اس سے زیادہ کا مکلّف نہیں ہے۔''

ایک صاحب نے غیبت کا علاج پوچھا تو چار چیزوں کے التزام کی تاکید کی:

(۱) غیبت کے انجام کا تصور۔

(۲) بولنے سے قبل سوچنے کا اہتمام۔

(۳) غیبت کے بعد معافی چاہنا۔

(۴) اپنے اوپر نقد یا نوافل کا جرمانہ۔

کچھ دن کے بعد انہوں نے ایک بار پھر رجوع کیا کہ ابھی یہ علاج پوری طرح راسخ نہیں ہوا۔ فرمایا کہ بتدریج راسخ ہو جائے گا، لگے رہنا چاہئے۔

ایک طالب علم نے فضول گوئی کی مرض کے بارے میں پوچھا اور اس کا سبب یہ لکھا کہ جب مجھ کو کوئی خوشی ہوتی ہے یا فکر کوئی نہیں ہوتا تو ایک جوش سا پیدا ہو جاتا ہے اور اس میں بہت باتیں کرتا ہوں۔ یہاں تک کہ فحش اور غیبت تک نوبت پہنچ جاتی ہے اور جب تک یہ نوبت نہیں آتی وہ جوش کم نہیں ہوتا۔ اس کا علاج یہ تحریر فرمایا کہ: ''علاج کی حقیقت ہے ازالۂ سبب۔ جب مرض کا سبب جوش ہے خوشی کا تو اس کا علاج اس جوش کا فرو کرنا اور اس خوشی کو اس کی ضد یعنی فکر و غم سے مغلوب کرنا ہے اور سب سے زیادہ فکر و غم کی چیز موت و احوال بعد الموت ہیں۔ پس ایسے وقت میں ان واقعات کا تصور کیا جائے اور اگر ایسے تصور نہ بندھتا ہو تو خلوت میں جا کر کوئی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کتاب اس موضوع کی مطالعہ کی جائے۔ اس کا علاج تو فوراً ہو جائے گا۔ پھر اگر اس عمل سے ہیبت طاری ہونے لگے تو رحمت و رجاء کی حدیثوں کو یاد کر لیا جائے''۔

اکثر طالبین غصے کا علاج پوچھتے تو آپ مندرجہ ذیل باتیں تجویز فرماتے:

(۱) اس موقع سے ہٹ جائیں اور فوراً کسی اور شغل میں لگ جائیں۔

(۲) جس پر غصہ آئے اس شخص کو کچھ نہ کچھ ہدیہ کریں گو قلیل ہی ہو۔

(۳) بے جا اور بے حد غصے پر دو وقت فاقہ کریں۔

(۴) جس پر غصہ آئے تو سب کے سامنے اس سے معافی مانگیں (بلکہ اس کے جوتے اپنے سر پر رکھیں)۔ ایک دو بار ایسا کرنے سے نفس کو عقل آ جائے گی۔

ایک صاحب نے لکھا کہ مجھ میں مروت بہت زیادہ ہے جس سے بعض دفعہ خلافِ شرع کام بھی سرزد ہو جاتے ہیں۔ محض اس خیال سے دوسروں کا دل نہ دُکھے۔ انکار اس قدر دشوار معلوم ہوتا ہے کہ پسینہ آ جاتا ہے۔ جواباً لکھا کہ دشوار ہونے سے ناممکن ہونا لازم نہیں آتا۔ جہاں مروت کرنا خلافِ شرع نہ ہو اس مروت پر عمل جائز ہے اور جہاں خلافِ شرع ہو وہاں جائز نہیں گو دشواری اور تکلیف ہو۔ اس تکلیف کو برداشت کرو، اس کے سوا کوئی علاج نہیں۔

ایک صاحب نے لکھا کہ نماز اور ذکر کے قبل اور بعد اکثر یہ خیال آتا ہے کہ اتنی محنت بے کار ہے۔ میں کوئی بزرگ تو ہو نہیں سکتا۔ بس یہ ہے کہ احکام کی پابندی کر لی جائے تو اس کے لئے زیادہ فکر کی کیا ضرورت ہے کیونکہ بخشش تو رحمت پر منحصر ہے۔ آپ نے جواباً فرمایا کہ یہ سوچنا چاہئے کہ اعمال صرف مغفرت ہی کے لئے نہیں بلکہ مالک کا حق ہیں مملوک پر اور مغفرت تو اس کی عنایت ہے۔

اسی طرح مختلف وسوسوں، روحانی بیماریوں، اخلاقی رذائل نیز روحانی و باطنی احوال سے متعلق ڈھیروں استفسارات کا روزانہ جواب دیتے۔ یہ جوابات نہ صرف مختصر اور جامع ہوتے بلکہ عملی نکات اور کوششوں پر مشتمل ہوتے۔ اس سلسلے میں آپ کے جوابات مخصوص بھی نہ ہوتے بلکہ حالات، واقعات اور کیفیات کے لحاظ سے ایک ہی بیماری کے مختلف علاج بھی تجویز کرتے۔ آپ اپنے سے رجوع کرنے والوں پر واضح کر دیتے کہ چاہے مرض کتنا ہی پرانا اور عادت کتنی ہی پختہ کیوں نہ ہو، اگر ہمت و اختیار سے چھوڑ دیا جائے اور پھر اس کی عادت بنا لی جائے تو وہ دور ہو جاتا ہے۔ لیکن اس راہ میں ہمت اور استقامت کو اختیار کئے بغیر کوئی Short Cut نہیں ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تربیت کے اصول

مولانا طالبینِ اصلاح کی تربیت کے معاملے میں چند اصولوں کی نہایت سختی سے پابندی فرماتے تھے اور اس معاملے میں کسی قسم کی مصلحت سے کام لینا پسند نہ کرتے۔ اکثر لوگ آپ کے پاس آ کر بیعت کی درخواست کرتے۔ فوراً حامی بھرنے کے بجائے آپ بیعت کرنے کی وجہ دریافت کرتے۔ اگر وہ رضائے الٰہی کے حصول کے سوا کوئی بات کہتا تو بار بار یہی سوال دہراتے تاکہ صحیح بات کی حقیقت اس پر واضح ہو سکے۔ اگر وہ خود ہی صحیح جواب دیتا تو فرماتے کہ رضائے الٰہی کے حصول کے لئے تو تعلیم اور تعلیم پر عمل کرنا کافی ہے، نری بیعت ہرگز کافی نہیں۔

بیعت کی حقیقت کے متعلق فرماتے کہ بیعت تو دراصل اپنے تعلیم کرنے والے پر اعتماد کا اظہار ہے۔ یعنی یہ کہ اس کو یقین ہو کہ یہ میرا خیر خواہ ہے اور جو مشورہ دے گا وہ میرے لئے نافع ہوگا۔ غرض اس پر پورا اطمینان ہو اور اپنی رائے اور تجویز کو اس کی تجویز و تشخیص میں دخل نہ دے۔ آپ فرماتے کہ بیعت کا لطف تو جبھی ہے جب پہلے تعلیم حاصل کرے اور پھر بیعت ہو، کیونکہ ظاہر ہے کہ جب اس کو تعلیم سے نفع ہوگا تو اپنے معلم سے محبت پیدا ہو جائیگی پھر بیعت کا لطف دوسرا ہوگا۔ لہٰذا شیخ کی صحبت میں بیٹھنے اور اس سے اپنی اصلاح کی غرض سے تعلیمی خط و کتابت جاری رکھنے سے طبیعت میں مناسبت کا اندازہ ہو جاتا ہے جو اصلاح کے لئے ضروری ہے۔ ایک اور بار تاخیر بیعت کی مصلحت یہ بیان فرمائی کہ ''امیدِ بیعت میں طالب اپنی اصلاح کی اور مناسبت پیدا کرنے کی بہت کوشش کرتا ہے ورنہ اگر درخواست پر فوراً بیعت کر لی جائے تو پھر بے فکر ہو جاتا ہے۔'' آپ کہتے کہ

> ''نئے آنے والے پہلے خاموشی سے بیٹھے ہوئے میرا طرزِ تربیت، میری عادات، میری خصوصیاتِ مزاج دیکھیں اور میری باتیں سنیں اور ان پر غور کریں، پھر یہاں سے جا کر آزادی کے ساتھ رائے قائم کریں۔ اگر میرا طریقہ اور مزاج پسند نہ آئے اور مجھ سے مناسبت پیدا ہونے کی توقع نہ ہو تو کسی دوسرے سے رجوع کریں اور اگر میری سب باتیں پسند ہوں تو پھر اصلاح سے متعلق مجھ سے خط و کتابت کریں''۔

غرض آپ اس بات کا بہت اہتمام فرماتے کہ آپ کے پاس آنے والے محض جوش میں آ کر دین کو تماشا نہ بنائیں بلکہ اگر اپنی اصلاح مقصود ہے تو اس کے لئے اس پورے عمل سے گزرنے پر راضی ہوں جو درکار ہے۔ فرماتے ''میرے یہاں تو وہ آوے جس کو رات دن اپنے نفس پر درّے چلانے ہوں۔''

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایک اور موقع پر مخالفتِ نفس کے لئے آسان تدبیر پوچھنے پر فرمایا:

''نفس کی مخالفت کرتے رہنے سے رفتہ رفتہ نفس کا مطالبہ بھی ضعیف ہو جاتا ہے اور اس پر قابو پانا آسان ہو جاتا ہے۔ یہی تدبیرِ تحصیل ہے اور یہی تدبیر آسانی اور سہولت کی بھی ہے۔ مگر بعض کو عمر بھر مجاہدہ ہی کرنا پڑتا ہے۔ غرض طالب کو اپنی طرف سے عمر بھر مجاہدہ ہی میں گذارنے کے لئے تیار رہنا چاہئے اور مجاہدے ہی کے لئے تو یہاں بھیجے گئے ہیں۔ چنانچہ اللہ کا ارشاد ہے: ''لقد خلقنا الانسان فی کبد'' بے شک ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا ہے) اور مجاہدے ہی سے تو اجر اور قرب بڑھتا ہے اور جن کو بعد مجاہدات کے سہولت ہو جاتی ہے ان کو بھی برابر مجاہدے کا اجر ملتا رہتا ہے، کیونکہ یہ سہولت مجاہدات ہی سے تو حاصل ہوئی ہے''۔

تصوف اور طریقت کی حقیقت

جو لوگ بیعت کی امید لے کر آپ کے پاس آتے تھے، ان کو طریقت کی حقیقت سمجھانے کے لئے چند اوراق دیئے جاتے تھے جنہیں ہم یہاں قارئین کی دلچسپی اور علم کے لئے لفظ بہ لفظ نقل کر رہے ہیں۔

''(۱) نہ اس میں کشف و کرامات ضروری ہے۔

(۲) نہ قیامت میں بخشوانے کی ذمہ داری ہے۔

(۳) نہ دنیا کی کار براری کا وعدہ ہے کہ تعویذ گنڈوں سے کام بن جائیں یا مقدمات دعا سے جیت لئے جائیں یا روزگار میں ترقی ہو یا جھاڑ پھونک سے بیماری جاتی رہے یا ہونے والی بات بتلا دی جایا کرے۔

(۴) نہ تصرفات لازم ہیں کہ پیر کی وجہ سے مرید کی ازخود اصلاح ہو جائے، اس کو گناہ کا خیال ہی نہ آئے، خود بخود عبادت کے کام ہوتے رہیں، مرید کو ارادہ بھی نہ کرنا پڑے۔ یا علمِ دین اور قرآن میں ذہن و حافظہ بڑھ جائے۔

(۵) نہ ایسی باطنی کیفیات پیدا ہونے کی کوئی میعاد ہے کہ ہر وقت یا عبادت کے وقت لذت سے سرشار رہے۔ عبادت میں خطرات ہی نہ آئیں۔ خوب رونا آئے۔ ایسی محویت ہو جائے کہ اپنی پرائی خبر نہ رہے۔

(۶) نہ ذکر و شغل میں انوار وغیرہ کا نظر آنا یا کسی آواز کا سنائی دینا ضروری ہے۔

(۷) نہ عمدہ عمدہ خوابوں کا نظر آنا یا الہامات کا صحیح ہونا لازمی ہے بلکہ اصل مقصود حق تعالیٰ کا راضی کرنا ہے،

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جس کا ذریعہ ہے شریعت کے حکموں پر پورے طور سے چلنا۔

ان حکموں میں بعض متعلق ظاہر کے ہیں، جیسے روزہ، نماز، حج وزکوٰۃ وغیرہ اور جیسے نکاح وطلاق وادائے حقوقِ زوجین وقسم وکفارہ وغیرہ اور جیسے لین دین وپیروی مقدمات وشہادت ووصیت وتقسیم وترکہ وغیرہ اور جیسے سلام وکلام وطعام ومنام وقعود وقیام ومہمانی ومیزبانی وغیرہ، ان مسائل کو علم فقہ کہتے ہیں۔ اور بعض متعلق باطن کے ہیں، جیسے خدا سے محبت رکھنا، خدا سے ڈرنا، خدا کو یاد رکھنا، دنیا سے محبت کم ہونا، خدا کی مشیت پر راضی رہنا۔ حرص نہ کرنا، عبادت میں دل کا حاضر رکھنا۔ دین کے کاموں کو اخلاص سے کرنا۔ کسی کو حقیر نہ سمجھنا۔ خود پسندی نہ ہونا، غصہ کو ضبط کرنا وغیرہ، ان اخلاق کو سلوک کہتے ہیں اور مثل احکامِ ظاہری کے ان احکامِ باطنی پر عمل کرنا بھی فرض وواجب ہے۔ نیز ان باطنی خرابیوں سے اکثر ظاہری اعمال میں بھی خرابی آ جاتی ہے۔ جیسے قلتِ محبتِ حق سے نماز میں سستی ہوگئی یا جلدی جلدی بلا تعدیلِ ارکان پڑھ لی یا بخل سے زکوٰۃ اور حج کی ہمت نہ ہوئی یا کبر وغلبۂ غضب سے کسی پر ظلم ہوگیا، حقوق تلف ہوگئے ومثل ذالک۔ اور اگر ان ظاہری اعمال میں احتیاط بھی کی جائے تب بھی جب تک نفس کی اصلاح نہیں ہوتی وہ احتیاط چند روز سے زیادہ نہیں چلتی۔

پس نفس کی اصلاح ان دو اسباب سے ضروری ٹھہری۔ لیکن باطنی خرابیاں ذرا سمجھ میں کم آتی ہیں اور جو سمجھ میں آتی ہیں ان کی درستی کا طریقہ کم معلوم ہوتا ہے اور جو معلوم ہوتا ہے نفس کی کشاکشی سے اس پر عمل مشکل ہوتا ہے۔ ان ضرورتوں سے پیرِ کامل کو تجویز کیا جاتا ہے کہ وہ ان باتوں کو سمجھ کر آگاہ کرتا ہے اور ان کا علاج وتدبیر بھی بتلاتا ہے اور نفس کے اندر درستی کی استعداد اور ان معالجات میں سہولت اور تدابیر میں قوت پیدا ہونے کے لئے کچھ اذکار واشغال کی بھی تعلیم کرتا ہے اور خود ذکر اپنی ذات میں بھی عبادت ہے۔ پس سالک کو دو کام کرنے پڑتے ہیں۔ ایک ضروری کہ احکامِ شریعہ ظاہری وباطنی کی پابندی ہے، دوسرا مستحب کہ کثرتِ ذکر ہے۔ اس پابندیٔ احکام سے خدا تعالیٰ کی رضا اور قرب اور کثرت ذکر سے زیادتی رضا وقرب حاصل ہوتا ہے۔ سلوک کے طریق اور مقصود کا یہ خلاصہ ہے''۔

اس تمام تفصیل سے اندازہ ہوتا ہے کہ رضائے الٰہی کے لئے شریعت وسنت کی پابندی کرنا اور اس کام کو خوش دلی، خوش اسلوبی اور اخلاص سے کرنے کی سعی کرنا ہی طریقت کی بنیاد ہے۔

اس طرح مولانا اصلاح کے کام کو دو طریقے سے انجام دیتے تھے:

(۱) اخلاقی وروحانی امراض کے لئے علاج اور تجاویز۔

(۲) باطنی احوال میں ترقی کے لئے ذکر کا انتخاب۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

امراض کے علاج کے لئے آپ مرض کے موافق علاج تجویز کرتے اور اس میں کسی قسم کی نرمی نہ برتتے جبکہ ذکر اذکار میں طالب کی استعداد اور دلچسپی، نیز اس کے حالات کی رعایت رکھتے تھے۔

ایسے لوگ جو اپنے مزاج اور عادات سے سخت بیزار ہوتے اور مایوسی کی کیفیت میں خط لکھتے ان کو نصیحت فرماتے کہ وہ غیر اختیاری امور کی فکر میں نہ پڑیں۔ اختیاری امور میں ہمت سے کام لیں۔ اگر کوتاہی ہو جائے تو ماضی کا استغفار سے تدارک کر کے مستقبل میں ہمت سے کام لیں اور ساتھ دعا کا بھی اہتمام کریں۔ فرماتے ہیں کہ بس ایک بار اچھی طرح توبہ کر کے پھر گناہوں کے غم میں نہ رہیں بلکہ کام میں لگ جائیں۔

ذکر سے متعلق بھی آپ کی ہدایات بہت واضح تھیں۔ فرماتے کہ ابتداء میں ذکر میں چاہے جی لگے نہ لگے، لیکن برابر کئے جاؤ۔ رفتہ رفتہ ایسی عادت پڑے گی کہ اس کے بغیر چین ہی نہیں آئے گا۔ البتہ ذکر کی مقدار نہ بہت زیادہ ہونی چاہئے کہ شدید مشقت اٹھانی پڑے اور نہ اتنی کم کہ پتہ بھی نہ چلے بلکہ ایسی ہونی چاہئے کہ جس میں محنت تو ہو لیکن جس کو مستقل مزاجی سے کیا جا سکے۔ تھوڑی محنت بھی فائدہ مند ہے تاکہ نفس کو کسی قدر محنت کی عادت پڑ سکے۔ ناغے کی بے برکتی سے بچنے کی خاص تلقین کرتے۔ ایک طالب علم نے ذکر کرنے کا صحیح طریقہ پوچھا تو فرمایا کہ یہ معلوم کرنا کیا مشکل ہے، قلب اور زبان دونوں کو شریک رکھنا ہی صحیح طریقہ ہے۔

عمومی طور پر انسانی طبیعت جلد باز ہے۔ ہر چیز کا بدلہ فوری مل جانے کی توقع بندھ جاتی ہے۔ چنانچہ اکثر طالبین ثمرات، کیفیات اور خوابوں سے متعلق تذکرہ کرتے تو آپ انہیں بتاکید اس بات کی ہدایت فرماتے کہ ثمرات کی روح تو اجر و قرب ہے۔ بس اس ثمرہ پر نظر رکھنا چاہئے۔ آپ ان کیفیات کی نفی تو نہ کرتے، البتہ فرماتے کہ ان کو مقصود اور کمال اور لازم بزرگی نہ سمجھ لیا جائے بلکہ اگر آپ سے کوئی خواب کی تعبیر پوچھتا تو بجائے تعبیر بتانے کے اکثر یہ فرما دیتے کہ مجھے تعبیرِ خواب سے مناسبت نہیں۔ مجھ سے بیداری کی باتیں پوچھی جائیں۔ اسی طرح اگر کوئی اپنی بیداری کی حالت کو تو درست نہ کرے اور خواب میں اپنے آپ کو عرش کی بھی سیر کرتے ہوئے دیکھے تب بھی اس کو ذرہ برابر قرب نصیب نہیں ہوتا۔

مولانا اس بات کا خاص خیال رکھتے کہ طبیعتوں میں اعتدال موجود رہے۔ لوگ قلتِ طعام اور کم خوابی کے ذریعے تزکیہ نفس کی کوششوں کا حال لکھتے تو فرماتے کہ قلتِ طعام خود مقصود نہیں ہے بلکہ اس سے نفسِ حیوانی کو کمزور کرنا مطلوب ہے تاکہ گناہوں کی طرف رغبت کم ہو سکے۔ اگر یہ بغیر قلتِ طعام حاصل ہو جائے تو کم خوراکی ضروری نہیں، کیونکہ اس زمانے میں قویٰ ضعیف ہیں اور قلتِ طعام سے جسمانی ضعف پیدا ہونے کا خدشہ ہے۔ آپ یہ بھی ہدایت کرتے کہ اچھا کھانے کی ممانعت نہیں، بلکہ جو چیز پسندیدہ نہیں ہے وہ یہ ہے کہ آدمی اسی کی فکر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں رہے کہ فلاں جگہ کی بالائی مشہور ہے تو وہاں سے منگوائی جائے۔ آج پائے کھانے کو جی چاہتا ہے تو کل نہاری۔ یہاں کی مٹھائی کھائی جائے تو وہاں کے پیڑے، غرض اگر بغیر خاص کوشش اور محنت کے خدا کی نعمتیں حاصل ہو جائیں تو ان کے استعمال کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں، بلکہ حاجی امداد اللہ تو یہاں تک کہتے کہ اگر پانی پینا ہو تو ٹھنڈا پینا چاہیے تاکہ اللہ کا شکر دل کی گہرائی سے کر سکے۔

آپ فرماتے کہ جو شخص فضولیات میں مشغول ہوگا عادتاً وہ ضروریات میں ضرور کوتاہی کرے گا اور صرف ہنسنا بولنا ہی نہیں بلکہ جتنے بھی مباح امور ہیں ان سب کی کثرت نقصان دہ ہے۔ لیکن اگر کثرت نہ ہو بلکہ مباحات میں اعتدال کے ساتھ مشغولیت ہو تو پھر وہ بجائے نقصان دہ ہونے کے فائدہ مند ہے۔ خصوصاً جب وہ کسی مصلحت پر مبنی بھی ہو کیونکہ اس سے طبیعت میں فرحت و خوشی پیدا ہوتی ہے اور خوشی اور نشاط اطاعتِ احکامات میں مددگار ہوتے ہیں۔

اسی طرح فرماتے کہ تقویٰ اور دینداری کا اہتمام تو بہت رکھے، لیکن اپنی طرف سے حتی الامکان کوئی ایسی امتیازی صورت نہ پیدا ہونے دے جس سے شہرت ہو جائے۔ جب لوگوں سے ملنے جلنے کا اتفاق ہو، کبھی کبھی کسی قدر بول بھی لے تاکہ لوگوں کو خواہ مخواہ بزرگی کا گمان نہ ہو لیکن ہنسنے بولنے کی کثرت ہرگز نہ کرے کیونکہ کثرت سے ہنسنا بولنا مضر ہے۔ چنانچہ زیادہ ہنسنے کے متعلق حضور اقدس ﷺ کا ارشاد ہے: ''اپنے آپ کو زیادہ ہنسنے سے بچاؤ، کیونکہ ہنسنے کی کثرت قلب کو مردہ کر دیتی ہے''۔

آپ کے ہاں اس امر کا بھی خاص اہتمام تھا کہ کسی موقع پر بھی کثرتِ اطاعت کے باوجود طالب علم کو مطمئن نہ کر دیا جائے کہ اب تم کامل ہو گئے یا خطا کار ہونے کی بناء پر مایوس نہ کر دیا جائے کہ اب تو کوئی سبیل بہتری اور امید کی نہیں ہے بلکہ امید و خوف کی درمیانی کیفیت جو مطلوب ہے وہ ہر ایک کو حاصل ہو، چاہے وہ کیسا ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ ایک بار ایک صاحب نے لکھا کہ یہ تو یقینی ہے کہ حالت جیسی چاہیے ویسی بالکل نہیں ہے۔ جواباً آپ نے تحریر کیا کہ وہ دن ماتم کا ہوگا جس دن یہ سمجھو گے کہ جیسی حالت چاہیے تھی ویسی ہو گئی، کیونکہ اس درگاہ میں تو حضرات انبیاء بھی اپنی حالت کے متعلق یہی فیصلہ کرتے ہیں کہ جیسی حالت چاہیے تھی ویسی نہیں ہے (''ماعبدناک حق عبادتک'' یعنی ہم آپ کی ویسی بندگی نہیں کر سکے جیسا کہ حق تھا)

ہندوستان کی مسلمان خواتین کی سماجی اور معاشرتی حالت

انگریز کے آنے سے پیشتر ہی ہندوستان کے مسلمانوں کے مجموعی حالات سخت زوال پذیر تھے۔ صرف

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سیاست ہی نہیں بلکہ تمام شعبہ ہائے زندگی میں تنزل اور گراوٹ نمایاں تھی اور سچ تو یہ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ زوال اور غلامی کسی قوم پر یونہی مسلط نہیں کرتا بلکہ اس بارے میں اس کا قاعدہ اور کلیہ بالکل واضح ہے۔ ہندوستان کے مسلمان اپنے آپ کو غلامی کا اہل ثابت کر چکے تھے۔حکومت کے محاذ پر جو ناکامی تھی اس کا بیان کچھ تو پہلے گذر چکا ہے اور مزید آگے آئے گا،لیکن معاشرتی اور انفرادی سطح پر اس تنزل کی کہانی بھی کم عبرتناک اور سبق آموز نہیں ہے۔

معاشرہ ایسی جماعتی زندگی کو کہا جاتا ہے جہاں ہر شخص کو رہنے سہنے اور ترقی کے لئے ایک دوسرے کی ضرورت پڑتی ہے۔انفرادی رویئے مل کر ہی مجموعی رویئے بنتے ہیں اور انہی کے اصلاح و بگاڑ پر قوم کی تقدیر بنتی اور بگڑتی ہے۔گھر معاشرے کی بنیادی اکائی یا Basic Unit ہے اور اس کو چلانے والی عورت ہوتی ہے۔ بظاہر اہم معاملات سے لاتعلق سمجھی جانے والی عورت کا کردار اس وقت بہت اہم ہو جاتا ہے جب نسلیں اس کے ہاتھ سے نکل کر معاملات کو انجام دیتی اور کار جہاں سنبھالتی ہیں۔ نپولین کی مشہور بات ہر ایک کے علم میں ہے کہ ''تم مجھے اچھی مائیں دو، میں تمہیں اچھی قوم دوں گا۔''

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو عورت کی تعلیم ، دینی و دنیاوی علوم کی سمجھ،اس کی شخصیت کی صحیح تعمیر اور اس میں سمجھداری اور دانش کا پایا جانا ایک اچھی قوم تیار کرنے کے لئے نہایت ضروری ہے۔ بدقسمتی سے ہندستان کی عورت آدمیوں کی سختی اور تنگ نظری اور اپنے غبی پن اور بزدلی کی وجہ سے ان تمام صفات سے محروم رہ گئی۔اس کا کام مردوں کے ذائقے اور لذت کی تسکین کے لئے انواع واقسام کے کھانے بنانا رہ گیا تھا۔حلوے،مربے، اچار اور چٹنیاں بنانے تو اسے خوب آتے تھے،لیکن دین و دنیا کی کامیابی کے لئے جملہ صفات سے وہ تہی دامن تھی۔ناظرہ قرآن پاک اٹک اٹک کر غلط تلفظ اور مخارج سے پڑھنا وہ جیسے تیسے سیکھ لیتی تھی اور شاید یہی وہ ایک واحد کام تھا جس کے لئے وہ اکثر اوقات محلے کی نالائق استانیوں کے پاس جانے کی اجازت حاصل کر پاتی تھی۔ اس کے علاوہ فہم دین و دنیا سے اس کو کوئی سروکار نہ تھا۔

سردیاں آتی تو سوئیٹر بنتی، گرمیاں آتیں تو مردوں کے ململ کے کرتے کاڑھتی، رمضان کا بابرکت مہینہ بروکیڈ کے انگرکھے بنانے میں گنواتی۔ پیدا ہوتی تو چند سال بعد سوئی دھاگا پکڑا دیا جاتا کہ اپنے جہیز کے لئے پلنگ پوش اور میز پوش تیار کرے۔سلیقہ اور طریقہ اسی کا نام تھا اور اپنے آپ کو اچھی لڑکی ثابت کرنے کے لئے یہی گن کافی تھے۔اس کا سارا دین سنی سنائی موضوع روایات پر مبنی تھا۔میلادوں،کونڈوں،شب براتوں کو دین کا اصل سمجھتی۔ وقت کی فراغت اور مشترکہ خاندانی نظام کے باعث غیبتوں، چغلیوں، بہتانوں کی پٹاری بنی رہتی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حقوق و فرائض سے نابلد ہونے کی بناء پر شوہر سے تو لڑتی جھگڑتی اور دور کے سسرالی رشتہ داروں سے بھی مروت برتتی۔ شوہر سے حجاب کا معاملہ ہوتا اور دیوروں سے ہنسی مذاق اور بے تکلفی میں کچھ مانع نہ ہوتا۔

اس پر مزید یہ کہ تعلیمی معیار میں زمین آسمان کا فرق ہونے کی وجہ سے اس کا اور شوہر کا مذاق بالکل فرق ہوتا اور ایسی جاہل، غبی اور بد اخلاق عورت کے پاس جانے کے بجائے آدمی کوٹھوں کا رخ کرتے جہاں طوائفیں نہ صرف یہ کہ تعلیم یافتہ ہوتیں بلکہ اعلیٰ ذوق کی مالک ہوتیں۔ بناؤ سنگھار کے ساتھ ساتھ وہ ایسی عمدہ گفتگو کیا کرتیں کہ آدمی مطمئن ہو جاتا۔ مردوں کے لئے یہ صورت کسی حد تک قابلِ قبول تھی کہ گھر کے کام کاج کے لئے ایک باندی بیوی کی صورت میں اور دل بہلانے اور آسودگی کے لئے محبوبہ کی صورت میں طوائف۔ عورتیں جو بیک وقت مجبور بھی تھیں اور بے وقوف بھی، اس منظر نامے کو بہر صورت قبول کر چکی تھیں۔

اولاد کی تربیت میں بھی ہندوستان کی عورت کا ذوق کچھ ایسا مختلف نہ تھا۔ زندگی کے ابتدائی سالوں میں بچے کے اندر مختلف صفات کا پیدا کرنا، اس کی شخصیت کی نشوونما، ادب آداب کا سکھانا، حقوق و فرائض کا علم دینا، معاملات کی صفائی، احکامات کی پابندی جن سے وہ خود نابلد تھی، اپنے بچے کو کیا سکھاتی۔

اس موقع پر یہ اعتراض اٹھایا جا سکتا ہے کہ وہ عورتیں ان پڑھ ہونے کے باوجود آج کی تعلیم یافتہ عورت سے زیادہ سمجھدار تھیں۔ اس کے لئے ہم اسی دور کے دو معتبر لوگوں کی گواہی پیش کرنا پسند کریں گے۔

ڈپٹی نذیر احمد، جنھوں نے عورتوں کی اصلاح کے لئے کتابیں تحریر کیں، اپنی کتاب مرأۃ العروس کے مقدمے میں لکھتے ہیں ''عورتوں میں پڑھنے لکھنے کا چرچا اس قدر کم ہے کہ دلی جیسے شہر میں اگر مشکل سے سو، سوا سو عورتیں وہ بھی شاید حرف شناس نکلیں بھی تو اس کو چرچا نہیں کہہ سکتے۔''

آگے عورتوں کی اصلی حالت کا بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''اسی طرح ہماری عورتوں میں حیا، پاکدامنی، پردہ داری، نیکی جو کچھ سمجھو خدا کے فضل و کرم سے بہتری ہے۔ مگر برا مانو یا بھلا مانو، ابھی تک ہے مجبوری کی۔ یعنی مذہب اور ملکی رواج اور مردوں کی حکومت نے عورتوں کو زبردستی نیک بنا رکھا ہے۔ لیکن اگر خود عورتوں کے دل سے نیکی کا تقاضا ہو تو سبحان اللہ، نور علیٰ نور۔''

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ علم کی کمی تو تھی ہی، اخلاق کا کچھ حصہ جو موجود تھا وہ بھی معاشرے کے دباؤ اور روایات کی پاسداری کی وجہ سے تھا۔ یہاں ہم یہ بھی واضح کرتے چلیں کہ گو ہنر کا سیکھنا قابلِ تعریف ہے، لیکن حصولِ علم سے باہم متعارض نہیں۔ ایسی روایت پرست عورت جو کھانے پکانے اور کاڑھنے بننے میں تو خوب ماہر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہو مگر دین کی ابجد سے بھی واقف نہ ہو، بہر حال ایسی عورت پر فضیلت نہیں رکھتی جو دین و دنیا کا علم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اس پر عمل پیرا بھی ہو اور اپنے گھر کی بنیادوں کو انہی پیمانوں پر استوار کر رہی ہو۔ احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ حوریں جو جنت کی خاص مخلوق ہوں گی اور اپنے حسن اور لباس میں یکتا ہوں گی، جنت کی عورتوں پر ان کو فضیلت حاصل نہ ہوگی جو اپنے عمل کی بنیاد پر اس کی مستحق ہوں گی۔

دوسری گواہی خود مولانا اشرف علی تھانویؒ کی ہے۔ لکھتے ہیں:

''ایک مدت سے ہندوستان کی عورتوں کے دین کی تباہی کو دیکھ دیکھ کر قلب دکھتا تھا اور اس کے علاج کے فکر میں رہتا تھا اور زیادہ وجہ فکر کی یہ تھی کہ یہ تباہی صرف ان کے دین تک محدود نہیں تھی بلکہ دین سے گزر کر ان کی دنیا تک پہنچ گئی تھی اور ان کی ذات سے گذر کر ان کے بچوں بلکہ بہت سے آثار کے اعتبار سے ان کے شوہروں تک اثر کر گئی تھی اور جس رفتار سے یہ تباہی بڑھتی جاتی تھی اس کے انداز سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ اگر اصلاح نہ کی جائے تو شاید یہ مرض قریب قریب لا علاج ہو جائے۔ اس لئے علاج کی فکر زیادہ ہوئی اور سبب اس تباہی کا بالقاء الہٰی اور تجربہ اور دلائل اور خود علم ضروری سے محض یہ ثابت ہوا کہ عورتوں کا علوم دینیہ سے ناواقف ہونا ہے۔ جس سے ان کے عقائد، ان کے اعمال، ان کے معاملات، ان کے اخلاق، ان کا طرزِ معاشرت سب برباد ہو رہا ہے بلکہ ایمان تک بچنا مشکل ہے، کیونکہ بعض اقوال و افعالِ کفریہ تک ان سے سرزد ہو جاتے ہیں اور چونکہ بچے ان کی گودوں میں پلتے ہیں، زبان کے ساتھ ان کا طرزِ عمل، ان کے خیالات بھی ساتھ ساتھ دل میں جمتے جاتے ہیں جس سے دین تو ان کا تباہ ہوتا ہے مگر دنیا بھی بے لطف و بے مزہ ہو جاتی ہے۔ اس وجہ سے کہ بداعتقادی سے بداخلاقی پیدا ہوتی ہے اور بداخلاقی سے بداعمالی اور بداعمالی سے بدمعاملگی جو جڑ ہے تکدرِ معیشت کی۔ رہا شوہر، اگر ان ہی جیسا ہوا تو دو مفسدوں کے جمع ہونے سے فساد میں اور ترقی ہوئی۔ جس سے آخرت کی تو خانہ ویرانی ضروری ہے مگر اکثر اوقات اس فساد کا انجام باہمی نزاع ہو کر دنیا کی خانہ ویرانی بھی ہو جاتی ہے۔ اور اگر شوہر میں کچھ صلاحیت ہوئی تو اس بے چارے کو جہنم بھر کی قید نصیب ہوئی۔ بی بی کی ہر حرکت اس بے چارے شوہر کے لئے ایذا رساں اور اس کی ہر نصیحت اس بی بی کو ناگوار اور گراں۔ اگر صبر نہ ہو سکا تو نوبت نا اتفاقی اور علیحدگی کی پہنچ گئی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور اگر صبر کیا گیا تو قیدِ تلخ ہونے میں شبہ نہیں اور اس ناواقفیتِ علومِ دین کی وجہ سے ان کی دنیا بھی خراب ہوتی ہے''۔

چنانچہ مولانا نے اللہ کا نام لے کر ۱۳۲۰ ہجری میں خصوصی طور پر عورتوں کے لئے اور عمومی طور پر سب کے لئے اپنی کتاب ''بہشتی زیور'' تحریر فرمائی۔ مندرجہ بالا اقتباس اسی کتاب کے آغاز سے لیا گیا ہے۔ اس کے بارے میں فرماتے ہیں

''تجویز کیا کہ کتاب خاص ان (عورتوں) کے لئے ایسی بنائی جائے جس کی عبارت سلیس ہو، جمیع ضروریات دین کو وہ حاوی ہو۔''

مولانا نے جیسا کہا ویسی ہی کتاب لکھ دی، جس کا چرچا آج تک ہمارے گھروں میں ہے۔ گو آج اس کتاب کو پڑھنے والی عورت اس سخت انداز کو سمجھنے سے قاصر ہے جو مولانا نے عورتوں کے لئے اختیار کیا۔ اس کی وجہ اس کے سواء کچھ نہیں کہ وہ اس زمانے کی عورت کی نفسیات سے ناواقف ہے اور ان عقائد، تصورات، رویوں اور ماحول کو سمجھ نہیں سکتی، جن کا علاج مولانا جیسے طبیب کو کرنا تھا۔

سماجی رویوں میں بہتری کا تجدیدی کام

گو مولانا نے اپنی کتاب بہشتی زیور میں خطاب عورتوں سے کیا ہے لیکن یہ کتاب مردوں کے لئے بھی کم مفید نہیں ہے۔ مولانا کی مندرجہ بالا کتاب کے علاوہ ڈھیروں ڈھیر تصانیف میں ایک پیغام جو صاف نظر آتا ہے وہ یہ ہے کہ ''امت صحیح عقائد و تصورات کے ساتھ اپنے معاملات اور کام درست طریقے پر سلیقے، قرینے اور حسنِ انتظام کے ساتھ انجام دے۔'' اس طرح ردِ بدعات اور اتباعِ شریعت کے عظیم کام کے ساتھ ایک تجدیدی کارنامہ جو آپ نے انجام دیا وہ تین محاذوں پر مسلمانوں کی توجہ کو مرکوز کرنا تھا۔ حقوق کی ادائیگی اور معاملات کی صفائی، حسنِ معاشرت، حسنِ انتظام۔

ا۔ ادائیگی حقوق

حقوق کی ادائیگی اور معاملات کی صفائی کے بارے میں فرماتے ہیں ''سب سے زیادہ اہتمام مجھ کو اپنے لئے اور اپنے دوستوں کے لئے اس امر کا ہے کہ کسی کو کسی قسم کی اذیت نہ پہنچائی جائے، خواہ بدنی ہو جیسے مار پیٹ، خواہ مالی ہو، جیسے کسی کا حق مار لینا یا ناحق کوئی چیز لے آنا، خواہ آبرو کے متعلق ہو، جیسے کسی کی تحقیر، کسی کی غیبت خواہ نفسانی ہو، جیسے کسی کو کسی تشویش میں ڈالنا یا کوئی ناگوار رنج دہ معاملہ کرنا اور اگر اپنی غلطی سے ایسی بات

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہو جائے تو معافی چاہنے سے عار نہ کرنا۔

مجھے ان کا اس قدر اہتمام ہے کہ کسی کی وضع خلافِ شرع دیکھ کر تو صرف شکایت ہوتی ہے مگر ان امور میں کوتاہی دیکھ کر بے حد صدمہ ہوتا ہے اور میں دعا کرتا ہوں کہ اس سے نجات دے''۔

مولانا کو خود حقوق کی ادائیگی اور معاملات کی صفائی کا ایسا اہتمام ہوتا کہ آپ کی زندگی کے ایک دو نہیں بلکہ ڈھیروں واقعات اس پر گواہ ہیں۔ مولانا نے دو شادیاں کی تھیں۔ اپنی دونوں ازواج کے ساتھ عدل کا ایسا اہتمام فرماتے کہ چیزوں کی تقسیم کے لئے جو وزن کی جاتی تھیں ایک نہایت صحیح کانٹا اپنی نشست گاہ کے سامنے لٹکا رکھا تھا جس کو مزاحاً میزانِ عدل کہتے۔ جو چیز بھی آتی وہ برابر تقسیم کرتے۔ ایک بار ایک کاشتکار آپ کی خدمت میں دو تربوز لایا۔ آپ نے پوچھا دو کیوں لائے ہو؟ کہنے لگا آپ کے دونوں گھروں کے لئے۔ آپ نے کہا اور اگر ایک کا وزن کم ہو تو یہ حق تلفی ہوگی دوسری کی۔ کہنے لگا میں آپ کے مزاج کو جانتا ہوں۔ تلوا کر لایا ہوں، دونوں برابر ہیں۔ آپ نے کہا اگر ایک کم میٹھا ہوا اور دوسرا زیادہ پھر؟ کہنے لگا میں ان کے اندر تو نہیں گھسا، آپ خود دیکھ لیں۔ اس پر آپ نے دونوں تربوزوں کا اندازہ کر کے بیچوں بیچ نشان لگایا، چاقو سے کاٹا اور دو ٹکڑے کئے۔ ایک ٹکڑا ایک تربوز کا اور دوسرا دوسرے کا ایک پلڑے میں اور اسی طرح بقیہ دو ٹکڑے دوسرے پلڑے میں ڈال دیئے۔ جب وزن برابر ہو گیا تو کہا اب ٹھیک ہے کہ برابر وزن کے اور مٹھاس کے ٹکڑے ہو گئے۔ اس پر وہ کاشتکار کہنے لگا، آپ تو بڑی محنت و مشقت اٹھاتے ہیں۔ فرمایا، یہاں کی تکلیف کچھ نہیں آخرت کے مقابلے میں۔

صرف مالی معاملات میں ہی نہیں بلکہ اوقات اور دلجوئی میں بھی برابری کا معاملہ رکھتے۔ یہاں تک کہ خط لکھتے تو برابر طوالت کے تحریر کرتے۔ فرمایا کرتے کہ ''میں تو ایک کی باری میں دوسری کا خیال لانا بھی خلاف عدل سمجھتا ہوں، کیونکہ اس سے اس کی طرف توجہ کم ہوگی، جس کی باری ہے اور یہ اس کی حق تلفی ہے۔''

مالی معاملات میں بھی آپ کی احتیاط کا یہی عالم تھا۔ ایک بار ایک طالب علم نے آپ سے یہ مسئلہ پوچھا کہ ان کے والد مرحوم نے دو نکاح کئے تھے لیکن مہر کسی کا بھی ادا نہ کیا۔ اب مرحوم کے ترکے سے ادائیگی مہر واجب ہے یا نہیں؟ اس سوال سے آپ کا ذہن اس جانب منتقل ہوا کہ خود آپ کے والد نے بھی چار نکاح کئے، اب معلوم نہیں کہ کسی کا مہر ادا کیا یا نہیں نہ ہی معافی کا علم ہے اور نہ ترکے میں سے ادا کرنے کا خیال آیا۔

چنانچہ اس طالب علم کے ممنون ہوئے کہ اس مسئلے کی طرف آپ کی توجہ دلائی اور باوجود یہ کہ اکثر علماء کا خیال تھا کہ ترکے سے مہر کی ادائیگی واجب نہیں آپ نے احتیاط ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے والد کی چاروں بیویوں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے ورثاء کی تحقیق کی جو دور دراز ملکوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ اس میں اتنی مشقت برداشت کی کہ دو سال خط و کتابت اور تفتیشِ حالات میں گذر گئے۔ آخر کار جب تحقیق مکمل ہوئی تو تقسیم فرمائی۔ کسی کے حق میں ایک آنہ اور کسی کے حق میں ایک پیسہ بھی آیا جس کو ادا کرتے ہوئے حجاب محسوس ہوتا تھا۔ چنانچہ ان کو لکھ بھیجا کہ ادائیگی حقوق میں میری مدد فرمائیں تو میں ممنون ہوں گا۔ اس پر انہوں نے خوشی سے قبول کرلیا۔

انفرادی حد تک تو کسی نہ کسی طرح حقوق ادا کردیئے جاتے ہیں، لیکن جب حکومت کو کچھ دینے کی بات ہوتی ہے تو اچھے خاصے فہمِ دین و دنیا رکھنے والے لوگ بھی ایسی تاویلات کرتے ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ مولانا کا اس معاملے میں طرز یہ تھا کہ گو حکومت انگریز کی تھی، آپ اس کی طرف سے مقرر کردہ ٹیکس اور محصول دینے کی پابندی کرتے۔ ایک بار سہارنپور سے کانپور جاتے ہوئے کچھ گنے ساتھ تھے۔ جب ادائیگی محصول کا وقت آیا تو کوئی تولنے پر تیار نہ ہوتا تھا کہ آپ یونہی لے جائیے۔ ہم گارڈ کو کہہ دیں گے۔ فرمایا یہ گارڈ کہاں تک جائے گا۔ لوگوں نے بتایا غازی آباد تک، کہا غازی آباد سے آگے کیا ہوگا؟ کہا گیا کہ یہ دوسرے گارڈ سے کہہ دے گا اور وہ کانپور تک پہنچا دے گا جہاں آپ کا سفر ختم ہوجائے گا۔ فرمانے لگے، وہاں ختم نہ ہوگا بلکہ آگے ایک اور سفرِ آخرت بھی ہے۔ وہاں کیا انتظام ہوگا؟

عمومی طور پر مولوی حضرات مسجد کے سامان اور چیزوں کو اپنی ملکیت سمجھتے ہیں۔ مولانا کا حال اس کے برعکس یہ تھا کہ مسجد کا گرم پانی وضو سے بچ جاتا تو اس کو بھی واپس جا کر سقاوہ میں ڈال کر آتے کہ مسجد کا مال ضائع نہ ہو۔

آپ نے ایک ایسا وصیت نامہ تیار کر رکھا تھا جس میں اپنے پاس موجود چھوٹی چھوٹی چیز کی تفصیل موجود تھی۔ یہاں تک کہ رقومات اور کتب کے علاوہ گھڑیوں، لوٹوں اور پنکھوں کی ملکیت اور بعد وفات ان کا کیا انتظام ہونا چاہئے سب کا بیان درج تھا۔

مولانا ان معاملات کا خصوصی خیال اپنے لئے ہی نہ کرتے بلکہ طالبین اور رجوعین سے بھی اس کی پابندی کرواتے۔ وہ طالب علم جو خانقاہ میں مستقل قیام کرنا چاہتے، ان سے دریافت کرتے کہ کسی کے حقوق تو ذمہ نہیں ہیں اور جب معلوم ہوتا کہ ہیں تو کہتے کہ پہلے جا کر ان کو ادا کرو، یا صاف کراؤ، پھر آنا۔

ایک طالب علم جن کو اپنی بیوی سے دلچسپی نہ تھی اور نہ حقوقِ زوجیت پر قادر تھے اپنی بیوی کو بڑے بھائی کے گھر چھوڑ آئے۔ فرمایا کہ ایسی حالت میں اس بیچاری کو معلق نہ رکھا جائے، اس کا تصفیہ کر کے اس سے یکسوئی حاصل کر کے آؤ۔ چنانچہ جب وہ اس کو طلاق دے کر آئے اس وقت ان کی تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۲-حسنِ معاشرت

مولانا کے زمانے میں اور فی زمانہ بھی برصغیر میں خصوصاً اور عمومی طور پر تمام عالمِ اسلام میں حسنِ معاشرت کا حال کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔ مولانا اس کمی کو شدت سے محسوس کرتے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

''اس وقت دین کے پانچ اجزاء میں سے عوام نے تو صرف دو ہی جزء کو داخلِ دین سمجھا۔ یعنی عقائد و عبادات کو اور علمائے ظاہر نے تیسرے جز کو بھی دین شمار کیا۔ یعنی معاملات کو اور مشائخ نے چوتھے جز کو بھی دین قرار دیا یعنی اخلاقِ باطنی کی اصلاح کو۔ لیکن ایک پانچویں جز کو کہ وہ ادبِ معاشرت ہے قریب قریب ان تینوں طبقات سے الا ماشاء اللہ اکثر نے اعتقاداً اور بعض نے عملاً دین سے خارج اور بے تعلق قرار دے رکھا ہے اور اسی وجہ سے اور اجزاء کی تو کم و بیش خاص طور پر یا عام طور پر یعنی وعظ میں کچھ تعلیم و تلقین بھی ہے لیکن اس جز کا کبھی زبان پر نام تک بھی نہیں آتا۔ اسی لئے علماً و عملاً یہ جز بالکل نسیاً منسیا ہو چلا ہے اور میرے نزدیک باہمی الفت و اتفاق میں (جس کی شریعت میں سخت تاکید کی گئی ہے اور اس وقت عقلاء بھی اس کی بہت کچھ چیخ و پکار کر رہے ہیں) اس کا بڑا سبب یہ سوءِ معاشرت بھی ہے، کیونکہ اس سے ایک کو دوسرے سے تکدر و انقباض ہوتا ہے اور وہ رافع و مانع ہے انبساط و انشراح کا۔''

شریعت کے حوالے سے آدابِ معاشرت کا بیان فرماتے ہوئے کہتے ہیں ''آدابِ معاشرت یہ ہیں کہ روزمرہ کے معمولات میں اس بات کا خاص طور سے اہتمام کیا جائے کہ کسی شخص کی کوئی حرکت اور کوئی حالت دوسرے شخص کے لئے ادنیٰ درجے میں کسی قسم کی تکلیف و اذیت یا ثقل و گرانی یا ضیق و تنگی یا تکدر و انقباض یا کراہت و ناگواری یا تشویش و پریشانی یا توحش و خلجان کا سبب اور موجب نہ ہو۔''

سیرت سے اس کی مثالیں دیتے ہوئے بتاتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے نہ صرف یہ کہ خود اپنے قول و فعل سے اس کا اہتمام کیا بلکہ اپنے اصحاب کی توجہ بھی بار باران امور کی طرف دلاتے رہتے تھے۔ چنانچہ ایک صحابی ایک ہدیہ لے کر جب بلا اجازت حضورؐ کی خدمت میں بغیر سلام و اجازت کے داخل ہو گئے تو آپ ﷺ نے فرمایا باہر واپس جاؤ اور السلام علیکم کیا میں حاضر ہو سکتا ہوں کہہ کر پھر آؤ۔ اسی طرح لہسن و پیاز کی بدبو سے دوسروں کو اذیت ہوتی ہے۔ چنانچہ اس خیال سے کہ نمازیوں کو اذیت نہ ہو مسجد آنے سے قبل ان کو کھا کر آنے کی ممانعت

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فرمائی۔ جمعے کے غسل کا اہتمام بھی اسی غرض سے ہے۔

یہ اور ایسے سینکڑوں معاملات ہیں جن سے ہر شخص کو زندگی کے ہر موقع پر واسطہ رہتا ہے۔ مولانا نہ صرف یہ کہ خود مثال قائم کرتے بلکہ سیرت کے واقعات سے Manners اور آداب کی اہمیت کو ثابت کرتے۔ آپ خود گھر کی جو چیز اٹھاتے بعد فراغت کے اس کو وہیں رکھتے تاکہ کسی اور کو ڈھونڈنا نہ پڑے۔ لوٹے کا پانی استعمال کرکے دوبارہ بھر دیتے۔ کسی کے ہاں سے برتن یا رومال میں کوئی چیز آتی تو فوراً خالی کرکے واپس کر دیتے۔ اپنے گھر بھی جاتے تو کنڈی کھٹکھٹا کر جاتے۔ جب تک بلاوا نہ آجاتا تشریف نہ لے جاتے۔ آپ خود لوگوں کے معاملات میں دخیل نہ ہوتے، نہ ہی اسے پسند کرتے کہ لوگ دخل دیں۔ کہتے کہ بعض دفعہ کوئی شخص اگر بلاضرورت پوچھتا ہے کہ آپ فلاں جگہ کب جائیں گے تو اس سوال سے مجھے سخت گرانی ہوتی ہے اور مسلمان کے قلب پر گرانی ڈالنا خود معصیت ہے۔ اگر سوال کرنے والا مخلص ہو جب بھی گرانی ہوتی ہے کہ اسے ہمارے ذاتی افعال کی تفتیش کا کیا حق ہے؟

اپنے کام کے لئے کسی کو خط لکھتے تو جوابی لفافہ بھیجتے اور اگر کسی سے کام ہوتا تو اس کو طلب کرنے کے بجائے خود جاتے، چاہے وہ عمر میں چھوٹا ہی کیوں نہ ہوتا۔ کسی کے گھر مہمان ہوتے تو اس کے نوکر سے حاکمانہ انداز سے بات کرنے کے بجائے اچھی طرح سے کسی کام کے انجام دینے کا کہتے۔ گھر میں اپنے زیادہ تر کام خود انجام دیتے۔ آپ خود کسی کی سفارش نہ کرتے۔ اگر مجبوراً کرنا پڑتی تو شرط لگاتے کہ اگر کسی قسم کی تنگی نہ ہو۔ پھر فرماتے کہ ''سفارش کرنا تو محض مستحب ہے اور دوسروں کو اذیت سے بچانا واجب ہے۔''

آپ محسوس کرتے تھے کہ ان معاملات میں روک ٹوک اور نصیحت ضرور کرنا چاہئے، گو بظاہر برا ہی کیوں نہ معلوم ہو۔ ایک بار ایک شخص مجلسِ خاص کے وقت آ بیٹھا۔ آپ نے فرمایا، یہ مجلسِ خاص کا وقت ہے۔ بعد ظہر کے پاس بیٹھنا، اس وقت جاؤ۔ وہ چلا گیا۔ بعد میں حاضرین سے کہا دیکھئے اگر میں مروت میں آ کر کچھ نہ کہتا تو جب تک یہ بیٹھا رہتا مجھ کو سخت الجھن ہوتی، اس کی طرف سے دل میں کدورت ہوتی اور جو یہ فوراً اٹھ گیا تو میرے قلب میں اس کی قدر ہوئی۔ اب بتائیں کہ کون سی صورت بہتر ہے؟

اس طرح کھانے پہننے اوڑھنے، رہنے سہنے، محفل میں بیٹھنے، راستہ چلنے، ہدیہ دینے، میزبانی و مہمانی سے متعلق، خط لکھنے اور سفر سے متعلق غرض تمام شعبہ ہائے زندگی میں جن آداب کی ضرورت ہوتی ان کو بیان فرماتے۔ آپ نے یہ بھی بیان کیا کہ ''وہ تمام امور جس سے اذیت ہو گو وہ بظاہر خدمتِ خلق سمجھے جاتے ہوں اور جانی و مالی خدمت ہو یا ادب و تعظیم، اس صورت میں سوءِ خلق سمجھے جائیں گے''۔ اس معاملے میں نبی کریم صلی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اللہ علیہ وسلم کی زندگی سے مثال پیش کرتے کہ آپؐ نے صحابہ کرام کو اپنے لئے تعظیماً کھڑے ہونے سے منع فرمایا تھا ۔ چنانچہ صحابہ کرامؓ (جن سے بڑھ کر عشقِ رسول میں کوئی نہ تھا) نے آپؐ کی طبیعت ومزاج کا پورا لحاظ رکھا اور محبت اور ادب کے نام پر صحابہ الگ الگ مصافحے، معانقے اور قیام وسلام کا اہتمام نہ کرتے۔ مولانا اس بارے میں ارشاد فرماتے ہیں: ''آج کل تو لوگ غضب ہی کرتے ہیں۔ ایک مرتبہ میں گردن جھکائے وظیفہ پڑھ رہا تھا۔ ایک شخص آیا اور مصافحے کے لئے کھڑا رہا۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں تو پکار کر کہنے لگا ''مصافحہ۔'' میں نے بھی اسی طرح جواب دیا ''وظیفہ۔''

اسی طرح آپ زبردستی کھانا کھلانے کو بغیر طلب اور بھوک کے منع فرماتے۔ اسی طرح وہ خدمات جو کسی کے سپرد نہ کی جائیں انہیں زور زبردستی کرنے سے بھی منع فرماتے۔ لکھتے ہیں:

''ایک شخص مجھے پنکھا جھل رہا تھا اور کبھی میرے سر پر ماردیتا تھا اور کبھی منہ پر۔ میں نے دل شکنی کی وجہ سے کچھ نہیں کہا۔ وہ تو اپنے دل میں خوش ہوتے ہوں گے کہ ہم نے تو خدمت کی، مگر کوئی میرے دل سے پوچھے کہ ایک گھنٹہ مجھ پر کیا مصیبت گزری۔''

غرض آداب کی صحیح نوعیت اور اس سے متعلق صحیح تصور کا معلوم کرنا بہت ضروری ہے۔ اس معاملے میں اپنی پسند اور فہم استعمال کرنے کے بجائے دوسرے کے مزاج اور حالات کا بھرپور خیال رکھنا چاہئے اور اپنی محبت کے نام پر دوسرے کو اذیت سے بچانا چاہئے۔ وفات کے موقع پر پورے پورے خاندان کا میت کے گھر پر قیام کرنا اسی کی ایک مثال ہے۔ بظاہر تو دکھ بانٹنے کی غرض ہے، لیکن لواحقین کے لئے اس موقع پر قیام وطعام کا بندوبست ان کے بوجھ میں اضافہ کرنے کا باعث ہے۔

آپ اپنی مجلس میں آنے والوں سے خاص طور سے ان آداب کی تکمیل کرواتے: دورانِ مجلس آپس میں گفتگو نہ کی جائے، تسبیح نہ کی جائے، دورانِ تقریر بے جوڑ سوالات نہ اٹھائے جائیں، مجلس میں بیٹھ کر پاؤں نہ ہلائیں، اس کے علاوہ مولانا کے کاموں کی خدمت اپنے سر لینے کی کوشش نہ کریں، وغیرہ وغیرہ۔

ظاہری تصنع و بناوٹ اور غیر ضروری آداب بجالانے والے لوگوں کے لئے یہ باتیں بالکل نئی تھیں۔ اسی طرح لوگ عوام کی سادہ مزاجی کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کے لئے گنجائش پیدا کرنے کی درخواست کرتے تو آپ فرماتے:

''اگرچہ کوئی بے عنوانی سے ناسمجھی کرے لیکن دوسروں کو تو اس سے پریشانی اور تکلیف ہوتی ہے۔ اگر کوئی شخص بلا قصد شکار کے کسی کو چھرا مارے تو وہ مجرم نہ سہی، لیکن دوسرے کو تو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چوٹ لگے گی اور اگر سب لوگ جاہلوں کی جہالت پر تحمل کیا کریں تو ان کی جہالت کی اصلاح کبھی نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ ان کو اپنی جہالت کی اطلاع کبھی نہ ہوگی اور ہمیشہ بدتہذیب وبدسلیقہ ہی رہیں گے۔''

بہت سے لوگ آپ کی روک ٹوک اور سختی سے ناراض ہوجاتے۔ آپ اس کی قطعی پرواہ نہ کرتے۔ فرماتے:

''افسوس آج کل بزرگوں نے بھی ان امور میں لوگوں کو روک ٹوک کرنا بالکل ترک کردیا ہے۔ کیونکہ دوسرے کی اصلاح میں اپنے کو کچھ نہ کچھ بداخلاق بنانا پڑتا ہے۔ بغیر اس کے، دوسرے کی اصلاح نہیں ہوتی، تو اکثر حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ ہم کیوں برا بنیں۔''

مولانا کے مزاج میں نزاکت بہت تھی اور ادھر تو پوری کی پوری حالت ہی قابلِ اصلاح تھی۔ ایک بار زچ ہوکر فرمانے لگے: ''یوں تو اصلاح کے بہت سے شعبے ہیں۔ میری ذمہ داری ساری اصلاح کی نہیں ہے۔ موٹی موٹی باتیں سلیقے اور تمیز کی اور دوسروں کو اذیت سے بچانے کی ذرا غور وفکر سے سمجھ آجاتی ہیں۔ ورنہ سارا وقت انہیں سمجھانے میں صرف ہوجائے گا تو باریک باتیں جن کو سمجھانے کی ضرورت ہے وہ کب کی جائیں گی۔''

لوگ اعتراض کرتے کہ سب کی عقل اور سمجھ ایک جیسی نہیں ہوتی۔ اس پر آپ فرماتے:

''میں عقل کی کمی پر مواخذہ نہیں کرتا، لیکن شکایت جو کچھ ہے وہ بےفکری کی ہے۔ بےفکری پر مواخذہ ہے۔ اگر فکر سے کام لیں تو اول تو بہت کم غلطیاں ہوں اور ہوں تو وہ ناگوار نہ ہوں۔ کیونکہ جب میں کسی کے اندر فکر اور اہتمام محسوس کرلیتا ہوں تو پھر جو غلطی بوجہ کمی عقل کے ہوتی ہے اس میں اس کو معذور سمجھ لیتا ہوں۔ لہٰذا ناگواری پیدا نہیں ہوتی۔ زیادہ اذیت تو بےفکری اور عدم اہتمام سے ہوتی ہے۔''

۳۔ حسنِ انتظام

مولانا حسنِ انتظام کی اہمیت کو وقتاً فوقتاً واضح کرتے رہتے۔ دیندار طبقے کو اس کی اہمیت جتلاتے ہوئے فرماتے ''کیا افسوس ہے کہ امورِ دنیا میں تو ہر شخص کے یہاں انتظام واہتمام ہے اور امورِ دین میں اس قدر بےاہتمامی اور بدانتظامی شائع ہوئی ہے کہ کچھ بھی انتظام نہیں رہا۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ دین میں انتظام نہیں ہے۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ اگر دین میں انتظام بالکل نہیں تھا تو حضرات صحابہ کو یہ عظیم الشان سلطنت کیا بےانتظامی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے مل گئی تھی؟''

آپ اکثر فرماتے کہ ''مسلمانوں کے ہاتھ سے جو سلطنت گئی ہے وہ بدنظمی ہی کی وجہ سے گئی کیونکہ سلطنت کفر کے ساتھ تو جمع ہوسکتی ہے لیکن بدانتظامی کے ساتھ ہرگز جمع نہیں ہوسکتی''۔

مولانا خود ایسے زبردست منتظم تھے کہ خانقاہ پہنچنے والے لوگوں کو آتے ہی اس کا اندازہ ہو جاتا۔ انہیں ایک پرچہ پکڑا دیا جاتا جس میں اپنے قیام، طعام اور مدتِ قیام سے متعلق سوالات کے جوابات تحریر کرنے ہوتے۔ ہر بات طے شدہ وقت کے مطابق سلیقے سے انجام پاتی۔ جن جن تاریخوں میں جو صاحب آنے کی اطلاع کرتے آپ ان کے نام اپنے یادداشتوں میں لکھ لیتے تاکہ ان تاریخوں میں اور کہیں نہ جائیں۔ بلا اطلاع آنے کی بھی ممانعت تھی۔ مصارف کے لئے جو پیسے آتے اس کے لئے بہت اہتمام ہوتا۔ کہیں مستحقین کی فہرستیں تیار ہوتیں، کہیں تخمینے لگائے جا رہے ہوتے، کہیں تقسیم کے لئے مدیں مقرر کی جا رہی ہوتیں۔

غرض آنے والا اگر خوش فہم ہوتا تو حسنِ انتظام سے متاثر ہوتا اور بعض لوگ جو علماء اور بزرگ حضرات کے وقت کو اپنی اجارہ داری سمجھتے، نیز دیندار لوگوں کی ان سے مروت کو اپنا حق سمجھتے کہ چاہے وہ خود جیسا بھی معاملہ کریں جواباً ان سے ان کی مرضی کے مطابق معاملہ کیا جائے ناراض ہو جاتے اور انتظام کو سختی سمجھتے۔ ایک صاحب نے آپ کے منہ پر کہا کہ ''آپ کے مزاج میں تو انگریزوں کا سا انتظام ہے''۔ فرمایا ''افسوس، گویا اسلام میں انتظام ہی نہیں بلکہ اسلام تو ان کے نزدیک بے انتظامی کا نام ہے۔ بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ انگریزوں میں مسلمانوں کا سا انتظام ہے تو ایک درجے میں صحیح ہوسکتا ہے۔'' ایک اور موقعے پر فرمایا: ''جس کو اسلامی تہذیب کے مقابلے میں اپنی جدید تہذیب کا دعویٰ ہو کچھ دن میرے پاس رہ کر دیکھ لے۔ اللہ کے بھروسے پر کہتا ہوں انشاء اللہ خود اسی کے منہ سے کہلواؤں گا کہ واقعی ہم بدتہذیب ہیں اور حقیقی تہذیب وہی ہے جس کی شریعت مقدسہ نے تعلیم فرمائی ہے۔''

وفات

مولانا زندگی کے بیاسی سال پورے کر چکے تھے۔ اس میں سے باسٹھ سال دین کی خدمت، تعلیم، تدریس، درس، وعظ اور تصنیف و تالیف میں بسر ہوئے۔ بیماری کا آغاز ضعفِ معدہ اور ورم جگر سے ہوا۔ جس کی وجہ سے کبھی قبض لاحق ہو جاتا تو کبھی پیٹ کی خرابی کی صورت ہوتی۔ پانچ سال تک مرض کی تکلیف بڑھتی گھٹتی رہی اور علاج کا سلسلہ دیگر مصروفیات کے ساتھ جاری رہا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آخری ایام میں فرماتے کہ اب کسی چیز سے رغبت نہیں ہوتی۔ البتہ جب صاحبِ فراش ہو گئے تو کام نہ کر سکنے کا بہت قلق ہوا۔ پھر فرماتے کہ اس طرح لیٹے لیٹے اللہ کا ذکر ہی ہو جاتا ہے۔ وفات سے دو تین روز قبل فرمایا کہ مجھے نماز اور حقوق کی بہت فکر ہے۔ دستوں کے شدید مرض کے ساتھ بھی صفائی و طہارت کے پورے انتظام کے ساتھ نماز ادا کرتے رہے۔

وفات کے دن جب ہاتھ پاؤں سے جان نکل چکی تھی نزع کا عالم طاری ہونے سے ذرا پہلے ایک بار پھر امانتوں کا صندوقچہ منگوایا کہ کہیں مدرسہ کی کوئی امانت تو نہیں ہے۔ لفافوں میں سے امانتوں کی رقم نکالی تو وہ چودہ آنے تھی۔ فرمایا پندرہ آنے ہوں گے۔ دوبارہ دیکھا تو ایک اکنی اسی لفافے سے مل گئی۔ ابھی یہ عمل جاری تھا کہ غشی طاری ہو گئی، نوٹ سینے پر بکھر گئے اور حقوق کی ادائیگی کا انتہائی خیال رکھنے والا اللہ کے حق میں اپنی جان سے دستبردار ہو گیا۔ اس طرح سولہ رجب ۱۳۶۲ ہجری بمطابق ۲۰ جولائی ۱۹۴۳ء کو بعد نماز عشاء ساڑھے گیارہ بجے وفات پائی۔ مولانا شبیر علی نے غسل دیا اور عوام کے انبوہ عظیم کے جلوس میں مولانا کے جسدِ خاکی کو ''عسقبازاں'' نامی تاریخی قبرستان میں مولانا عبدالکریم صاحب کے مدفن کے ساتھ سپرد خاک کر دیا گیا۔

معمولات و دیگر احوال

مولانا اپنی سخت مزاجی کے باوجود عوام میں بے حد مقبول تھے۔ فرماتے کہ مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ لوگ مجھے کیا سمجھتے ہیں۔ پھر اپنی سخت مزاجی کی وجہ خود بیان فرماتے کہ:

> ''یہ جو میں سختی کرتا ہوں بضرورت کرتا ہوں۔ کچھ اس میں میری خوشی تھوڑا ہی ہے۔ سچ کہتا ہوں کہ بعض وقت تو جی یہاں تک برا ہوتا ہے کہ معافی مانگنے کا تقاضہ پیدا ہوتا ہے۔ مگر دوسرے ہی کی مصلحت سے اس تقاضے پر عمل نہیں کرتا۔ اگر کبھی اصلاح کے کام کو چھوڑوں گا تو انشاء اللہ پھر متحمل ہو کر دکھلا دوں گا''۔

مولانا کو باوجود اس یقین کے اپنے نفس سے سوءِ ظن ہی رہتا۔ ہر دفعہ تنبیہ کے بعد بار بار افسوس و ندامت کا اظہار کرتے۔ یہاں تک کہ بعض دفعہ رات رات بھر نیند نہیں آتی۔ بعض اوقات خود معافی مانگتے اور بعض دفعہ مالی تدارک بھی کرتے۔ فرماتے کہ:

> ''یہ طرز میری طبیعت کے بالکل خلاف ہے اور مجھ کو بڑی کلفت اور ندامت ہوتی ہے اور رہ رہ کر سوچتا ہوں کہ بجائے اس طرح کہنے کے اس طرح بھی کہہ سکتا تھا۔ لیکن عین وقت

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پر مصلحتِ اصلاح کا ایسا غلبہ ہوتا ہے کہ اور کوئی مصلحت پیش نظر نہیں رہتی''۔

آگے فرماتے ہیں: ''میرا اصلی مذاق تو یہ ہے کہ کسی سے کچھ تعرض نہ کروں اور اپنے آپ کو سب سے یکسو رکھوں''۔ اپنے مریدوں اور طالبین میں سے اکثر کو رخصت کرتے وقت نہایت بشاشت کے ساتھ پیش آتے تاکہ اس کا دل اچھا رہے۔

اصلاح کے موقع کے علاوہ عام معاملات میں مولانا اس سختی سے گریز کرتے۔ آپ کی اپنی اولاد تو نہ ہوئی لیکن دوسرے بچوں کے ساتھ بے تکلفی اور شفقت سے پیش آتے۔ خدمت گاروں اور نوکروں سے تمیز کا معاملہ رکھتے اور اس کی ہدایت بھی کرتے۔ ان کی آسانی اور عزتِ نفس کا پورا خیال رکھتے۔ فرماتے ''میرے جو ملازم تنخواہ دار ہیں ان کو بھی جب تنخواہ دیتا ہوں یا کبھی کوئی ان کی مالی خدمت کرتا ہوں تو روپیہ پیسہ کبھی ان کی طرف نہیں پھینکتا، بلکہ سامنے رکھ دیتا ہوں یا ہاتھ میں دیتا ہوں، جیسے ہدیہ دیتے ہیں۔ پھینکنے میں ان کی اہانت معلوم ہوتی ہے، کیونکہ یہ ایک تحقیر کی صورت ہے اور ملازم کو حقیر اور ذلیل سمجھنے کا کوئی حق نہیں۔''

اپنی بیویوں کے ساتھ نرمی برتتے اور بار بار سب کو یہ ہدایت کرتے کہ عورتوں خصوصاً بیویوں کے معاملے میں نرمی کریں اور ان کے حقوق کی حفاظت کریں، کیونکہ انکے لئے تو شوہر ہی سب کچھ ہوتا ہے۔

مولانا جہاں دوسروں کی اصلاح کرتے وقت سخت کسوٹی پر پرکھتے تو اپنے نفس کو بھی اس سے مبرا نہ رکھتے۔ ایک بار ایک شخص نے کہا کہ مجھے اپنے عیوب نظر نہیں آتے۔ اس پر آپ نہایت جوش میں آ گئے۔ تین بار قسم کھا کر فرمایا ''مجھ کو تو اپنی نماز، اپنے روزے اور اپنے ہر عمل بلکہ اپنے ایمان تک میں شبہ عدم خلوص کا رہتا ہے اور ہم لوگ تو کیا چیز ہیں، حضرات صحابہؓ سے بڑھ کر کون مخلص ہوگا۔ حدیث میں وارد ہے کہ اصحاب بدر میں سے ستر حضرات ایسے تھے جن کو اپنے اوپر نفاق کا شبہ تھا کہ کہیں ہم منافق تو نہیں ہیں۔''

ایک موقع پر فرمایا: ''گو میں متقی، پرہیز گار تو نہیں لیکن الحمدللہ اپنی اصلاح سے غافل بھی نہیں۔ ہمیشہ یہی ادھیڑ بن لگی رہتی ہے کہ فلاں حالت میں فلاں تغیر کرنا چاہئے۔ فلاں نقص کی فلاں طریقے سے اصلاح کرنی چاہئے۔ غرض مجھ کو اپنی کسی حالت پر قناعت نہیں''۔

''اشرف السوانح'' آپ کے خلیفہ خواجہ عزیز الحسن نے آپ کی زندگی میں تحریر کی اور آپ کو اس کا مسودہ دکھا بھی دیا۔ چونکہ وہ آپ کے ایسے معتقد تھے کہ باوجود تاکید ونصیحت کے تعریف میں غلو بھی کر جاتے تھے، چنانچہ ایک موقع پر فرمایا ''پہلے تو مجھے اس کتاب سے بالکل دلچسپی نہ تھی بلکہ سخت وحشت اور نفرت تھی اور ایسی بے غیرتی معلوم ہوتی تھی کہ بعض اوقات جی چاہتا تھا کہ سب لکھے ہوئے مسودات کو جلوا دوں، لیکن اب جس طرز پر یہ لکھی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جا رہی ہے اس کی نافعیت دیکھ کر اس کے ساتھ تعلقِ خاطر ہو گیا ہے۔''

ایک اور موقع پر حسرت سے فرمایا: ''افسوس کوئی بات چھپی نہیں رہی۔ اول تو میرے پاس اعمال ہی کیا تھے اور جو کچھ تھے وہ سب ظاہر ہو گئے۔ واللہ! مجھے سخت اندیشہ ہے کہ کہیں وہ بھی اس اظہار کی وجہ سے حبط نہ ہو جائیں۔ لیکن کیا کروں، اس لئے اظہارِ حال اور بے غیرتی کو گوارا کیا کہ شاید کسی کو نفع پہنچ جائے۔''

مولانا نے تھانہ بھون میں کل وقتی دین کے کام کا بیڑا اٹھایا تو ابتداء میں تنگی ہوئی لیکن بعد میں ہدایا کی وجہ سے فراخی ہوگئی۔ مولانا ہدایا اور رقوم کی وصولی میں جس قدر احتیاط برتتے اسی طرح ان کے صحیح مصارف کے لئے بھی مشقت برداشت کرتے۔ آپ چاہتے تھے کہ خانقاہ میں آنے والوں اور تربیت حاصل کرنے والوں کو حرص اور مفت خوری کی عادت نہ پڑے۔ چنانچہ طالبِ اعانت کی درخواست کو فوراً پورا نہیں کرتے تھے بلکہ کسی قدر توقف اور مناسب تحقیق کے بعد پورا فرماتے۔

اسی طرح لوگوں کے ہدیئے اور رقوم اس وقت قبول کرتے جب وہ آپ کے اصول کے مطابق درخواست کرتے، ورنہ انکار کر دیتے۔ فرماتے: ''ہدیہ میں یہ میرا معمول ہے کہ دو چیزوں کو دیکھتا ہوں۔ ایک تو یہ کہ ہدیہ میں کامل شوق ہو۔ میں ایسے شخص کی خدمت کو منظور کر لیتا ہوں اور ایک یہ کہ ایک دن کی آمدنی سے زائد نہ ہو۔ اس میں حکمت یہ ہے کہ بعض اوقات شوق کے غلبے میں اپنے مصالح پر نظر نہیں رہتی۔ مگر اپنا جی چاہتا ہے کہ جو اپنے سے محبت کرے اس کو بھی تکلیف نہ ہو۔ اس لئے مصلحت سے زیادہ مقدار میں لینا اچھا معلوم نہیں ہوتا''۔ ایک طرف تو آپ اس کا اہتمام کرتے کہ لوگ مارے مجبوری یا دکھاوے یا مصلحت کے ہدیہ نہ دیں تو دوسری طرف اس کا بھی خیال رکھتے کہ ہدیہ دینے والا جائز اور حلال کمائی سے دے رہا ہو۔

ایک بار پانچ سو کی رقم بذریعہ بیمہ آئی تو آپ نے واپس کر دی۔ وہ رقم ترکے کی تھی اور مصارفِ خیر میں صرف کرنے سے متعلق بعض ورثاء سے اجازت نہیں لی گئی تھی۔ بعد میں ورثاء نے اجازت لکھ کر بھیجی تو قبول فرمائی۔ حاضرین ایسے مواقع پر اس قدر تفتیش پر حیران ہوتے تو فرماتے کہ: ''دیکھئے جو آنے والی چیز ہوتی ہے وہ آتی ہی ہے۔ چاہے اس کو لاکھ واپس کیا جائے۔ پھر کیوں نیت خراب کی جائے اور خلافِ اصول کا ارتکاب کیا جائے''۔ یہ بھی فرماتے کہ ہماری طرف جو کچھ لوگوں کی توجہ ہے وہ سب دین کی بدولت ہے۔ پس ہم کو اس دین کی عزت قائم رکھنے کی سخت ضرورت ہے۔

مولانا کے ہاں وقت کو کارآمد بنانے کا جو خصوصی اہتمام تھا اس کا تذکرہ مفید ہوگا۔ آپ کے ہاں ہر کام کا وقت بندھا ہوا تھا اور پہلے سے مقرر کردہ شیڈول کے مطابق انجام پاتا۔ صبح سے بارہ بجے تک تنہائی میں تصنیف و

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تالیف کا کام کرتے۔ اس وقت کسی کو ملنے کی اجازت نہ تھی۔ بارہ بجے سے ظہر تک قیلولہ اور نماز کا وقت تھا۔ ظہر سے عصر تک مجلس کرتے جس میں عام حاضری کی اجازت تھی۔ عصر کے بعد آپ کی ذاتی مصروفیت ہوتی تھی۔ بعد مغرب خطوط کے جوابات تحریر فرماتے اور عشاء کے بعد سب سے معذرت کر لیتے۔ اوقات میں پابندی اور حسنِ انتظام کے باعث آپ سینکڑوں کتابوں کی تصنیف کر سکے۔ ''اشرف السوانح'' کے مصنف نے آپ کی ۶۶۶ کتابوں کی فہرست دی ہے۔

آپ کی کتاب ''خطباتِ حکیم الامت'' کی ۳۲ جلدیں موجود ہیں۔ پھر روزانہ آنے والے خطوط کے جوابات اس کے علاوہ ہیں جن کی تعداد بیس سے پچاس تک ہوا کرتی تھی۔ بعض اوقات انتہائی لمبے چوڑے خطوط ہوتے جن کے مختصر اور جامع جوابات فی خط دو منٹ کے حساب سے تحریر کرتے۔ اس معاملے کی اتنی پابندی کرتے کہ بعض اوقات بعد عشاء بھی ان کے جوابات تحریر کرتے نظر آتے۔ ایسا بھی دیکھنے میں آیا کہ رات کو وعظ سے واپسی پر دیر ہوگئی تو اسی وقت ڈاک کو لے کر بیٹھ گئے اور سر درد کی حالت میں سر بھی دبا رہے ہیں اور جواب لکھ رہے ہیں۔ جب کہا جاتا کہ آرام کر لیں تو فرماتے کہ میری طبیعت پر کام کا اتنا تقاضا ہوتا ہے کہ اگر میں کام پڑے رہنے کی حالت میں سونا بھی چاہوں تو نیند نہیں آسکتی۔ پھر کام ہی کیوں نہ کروں۔

آپ اپنے روزانہ کے بنائے ہوئے معمولات میں آئے دن تغیر نہ کرتے بلکہ ان کی پابندی کرتے، یہاں تک کہ جب آپ کے استاد مولانا محمود الحسن تشریف لائے تو ان کے لئے تمام انتظامات مکمل کرنے کے بعد چونکہ تصنیف کا وقت شروع ہو چکا تھا، ان سے اجازت لے کر اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ اگرچہ دل نہ لگا اور تھوڑی دیر بعد واپس ان کی خدمت میں تشریف لے آئے، لیکن بالکل ناغہ نہ کیا۔

اسی طرح آپ کی عادت تھی کہ اکثر کاغذ، پنسل اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ جس وقت کوئی مضمون ذہن میں آتا اسے فوراً لکھ لیتے، بلکہ بسا اوقات رات کو بھی کوئی بات ذہن میں آتی تو روشنی کر کے نوٹ کر لیتے۔ اس طرح سفر و حضر میں بھی کوئی بات یا مضمون مطلب کا سامنے آتا تو اسے نوٹ فرما لیتے۔ اس طرح ذہن میں بات اٹکتی نہیں تھی۔

مولانا میں کام جلد ختم کرنے کا فطری تقاضا تھا۔ آپ کو جو کام کرنا ہوتا اسے فوری انجام دیتے اور ٹالتے نہ تھے۔ فرماتے ''اس میں تھوڑی تکلیف ہوتی ہے، لیکن بعد فراغت کے بالکل بے فکری ہو جاتی ہے اور بڑی راحت ہوتی ہے۔ ورنہ ٹالنے سے کام اکثر نہیں ہوتے۔ اگر ہوتے بھی ہیں تو جتنی فکر دامن گیر رہی، اتنی دیر کلفت بھی ہوتی ہے۔''

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جب تصانیف ختم ہونے کے قریب ہوتیں تو ساری ساری رات بیٹھے لکھتے رہتے اور ایک منٹ کے لئے بھی آرام نہ فرماتے اور اس کی وجہ یہ بتاتے کہ کام ختم ہونے سے قلب پر بار نہیں ہوتا۔ غرض آپ کے معمولات کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا کہ گویا ایک مشین ہے جو بلا تکان چل رہی ہے۔ یہ سب پابندیٔ اوقات اور انتظام کی برکت تھی۔ البتہ آپ اس پر یقین رکھتے تھے کہ قواعد انسانوں کے لئے ہیں، انسان قواعد کے لئے نہیں۔ استثنائی حالات میں لوگوں کو ملاقات کا وقت دے دیا کرتے اور ان کے کام خوش دلی سے کر دیا کرتے تھے

مولانا اشرف علی تھانویؒ کے انتقال کو آج نصف صدی سے زائد کا عرصہ گذر چکا ہے۔ اس عرصے میں قوم کو اللہ نے آزادی کی نعمت سے نواز کر ایک بار پھر اصلاح کا موقع دیا ہے۔ مگر افسوس جہاں دین کی بنیادی باتوں، باہمی معاملات، حقوق و فرائض، قانون اور ذمہ داری جیسے الفاظ سے واقفیت نہ ہو وہاں حسنِ معاشرت، حسنِ انتظام اور اوقات کی پابندی کا کیا حال ہوگا؟ جہاں ایک طرف سڑکوں کے کنارے اور چوراہوں پر لگے کوڑے کے ڈھیر، ابلتے ہوئے گٹروں کی ناقابلِ برداشت بدبو، خستہ حال گلیوں میں بہتی ناکوں والے میلے بچے، جگہ جگہ گرے ہوئے جوس کے ڈبے، ٹافیوں اور چپس کے ریپر، پھلوں کے چھلکے، پان کی پیکیں، بسوں کی کھڑکیوں سے چلتے ہوئے راہ گیروں پر گرنے والی بلغمی تھوکیں ہمارے قومی مذاق کی آئینہ دار ہیں تو دوسری طرف اوقات کی پابندی میں دنیا کی کوئی قوم ہماری ''اعلیٰ'' روایات کا مقابلہ کرنے سے قاصر ہے۔ تقریباً سو سال پہلے مولانا حالی نے مسدس میں جو لکھا، وہ اب تک درست ہے:

نہ ہمت کہ محنت کی سختی اٹھائیں
نہ جرأت کہ خطروں کے میداں میں آئیں
نہ غیرت کہ ذلت سے پہلو بچائیں
نہ عبرت کہ دنیا کی سمجھیں ادائیں
نہ کل فکر تھا یہ کہ ہیں اس کے پھل کیا
نہ ہے آج پروا کہ ہوتا ہے کل کیا

نہ قوموں میں عزت نہ جلسوں میں وقعت
نہ اپنوں میں الفت، نہ غیروں سے ملت
مزاجوں میں سستی، دماغوں میں نخوت
خیالوں میں پستی، کمالوں سے نفرت

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عداوت نہاں، دوستی آشکارا
غرض کی تواضع، غرض کی مدارا

غرض عیب کیجئے بیاں اپنے کیا کیا
کہ بگڑا ہوا یاں ہے آوے کا آوا
فقیہ اور جاہل ضعیف اور توانا
تاسف کے قابل ہے احوال سب کا

مریض ایسے مایوس دنیا میں کم ہیں
بگڑ کر کبھی جو نہ سنبھلیں وہ ہم ہیں

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حسن البنّا شہیدؒ

موجودہ دور میں عالمِ عرب میں سب سے بڑی اسلامی تحریک "اخوان المسلمون" کے بانی اور راہِ حق کے شہید

تعارف

آپ کا نام حسن البنّا تھا۔ سلسلۂ نسب یہ ہے: حسن بن احمد بن شیخ عبدالرحمٰن البنّا۔

حسن البنّا کے دادا شیخ عبدالرحمٰن مصر کے دور افتادہ گاؤں ''شمشیرہ'' کی معزز شخصیت سمجھے جاتے تھے۔ ان کے دو بیٹے تھے۔ ایک کا نام احمد اور دوسرے کا نام محمد تھا۔ احمد جو کہ تعلیم میں دلچسپی رکھتے تھے جامعہ الازھر سے وابستہ ہوگئے جبکہ محمد والد کے کام میں ان کا ہاتھ بٹانے لگے۔ عبدالرحمٰن البنا کے انتقال کے بعد محمد نے وراثت میں زیادہ حصے کا مطالبہ کر دیا۔ احمد نے اس سے اختلاف کیا مگر جھگڑے کی نوبت آنے سے پہلے بھائی کے حق میں ساری زمین سے دستبردار ہو گئے اور خود اپنی بستی سے ہجرت کر کے محمودیہ (جو کہ کاشتکاروں کی بستی تھی) میں آ کر بس گئے۔ احمد ہی حسن البنّا کے والد محترم تھے۔

احمد نے محمودیہ میں گھڑی سازی کا کام شروع کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کے علمی مشاغل جاری رہے۔ ان کی ذاتی لائبریری میں قیمتی اور نادر کتابوں کا بہترین ذخیرہ موجود تھا۔ محمودیہ کے لوگ اس سے بے خبر نہ تھے۔ چنانچہ جب انہوں نے اپنی مسجد کی تعمیر کی تو سب سے پہلے جمعے کی نماز پڑھانے کے لئے احمد سے درخواست کی۔ اس کے بعد تو وہ ان کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ مسجد کے مستقل امام اور خطیب کے طور پر انہیں منتخب کر لیا۔ مگر احمد نے اپنی خدمات کسی مادّی لالچ کی بنیاد پر پیش نہ کیں بلکہ گھڑی سازی کا پیشہ ہی روٹی کھانے کا ذریعہ رہا۔ اس دوران انہوں نے حدیث پر متعدد کتابیں بھی مدوّن کیں اور تنہا ایسا ٹھوس تحقیقی کام کیا جو ایک اکیڈمی ہی سرانجام دے سکتی ہے۔ احمد کی رفیقہ حیات بھی پاکباز خاتون تھیں جن سے حسن البنا کے علاوہ چار لڑکے اور دو لڑکیاں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہوئیں۔

ولادت

حسن البنا اکتوبر 1906 میں محمودیہ (مصر) میں پیدا ہوئے۔ آپ اپنے والد کے سب سے بڑے لڑکے تھے۔

ابتدائی تعلیم وتربیت

محمودیہ کی دیہاتی زندگی اپنے اندر سادگی اور قناعت کا رنگ لئے ہوئی تھی۔ اس پر آپ کا گھرانہ علم وفضل اور اعلیٰ اسلامی ماحول سے آراستہ تھا۔ ابتدا ہی میں والد نے حفظ قرآن پر توجہ کی اور پھر محمودیہ کی ابتدائی درسگاہ ''مدرسۃ الرشاد الدینیۃ'' میں داخل کرا دیا۔ تعلیم کا یہ ابتدائی دور استاذ محمد زہران کی زیر نگرانی تعلیم اور تربیت دونوں حوالوں سے آپ کے لئے بہترین ثابت ہوا۔ اس کا تذکرہ آپ کی یادداشتوں میں ملتا ہے۔ اپنے مدرسے کے طریقۂ تدریس اور استاذ محترم کی شخصیت سے آپ بہت متاثر تھے۔ یہاں احادیثِ نبوی کے حفظ اور فہم پر توجہ دینے کے علاوہ زبان وبیان پر عبور حاصل کرنے پر بہت زور دیا جاتا تھا۔ آٹھ سے بارہ سال کی عمر تک آپ اس کے ساتھ وابستہ رہے۔ اس زمانے میں آپ کے معمولات کو آپ کے بھائی نے خود آپ کو مخاطب کرتے ہوئے اس طرح تحریر کیا ہے:

> ''برادر بزرگ! تم عمر کے نویں سال میں تھے اور میں ساتویں سال میں۔ ہم دونوں مکتب میں قرآن کریم حفظ کرتے تھے اور تختیاں لکھا کرتے تھے۔ تمہیں قرآن کا دوتہائی حفظ ہو چکا تھا اور مجھے صرف ایک ثلث سورہ بقرہ سے سورہ توبہ تک یاد ہوا تھا۔ ہم مکتب سے لوٹتے تو ہمارے والد کا دستِ شفقت ہمیں لپک کرلے لیتا اور ہماری ساخت پرداخت میں لگ جاتا۔ والدِ محترم ہمیں سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اوراقِ مطہرہ اور فقہ، اصول فقہ اور نحو کے اسباق زبانی حفظ کراتے۔ والد بزرگوار نے ہمارے لئے ایک گھریلو نصاب تعلیم وضع کر رکھا تھا جسے وہ ہمیں پابندی سے پڑھاتے تھے''۔

مدرسۃ الرشاد کے منتظمین کی تبدیلی کے بعد حسن البنا نے مڈل اسکول میں داخلے کی خواہش کا اظہار کیا۔ آپ کے والد کی شدید خواہش تھی کہ پہلے آپ قرآن مجید کا حفظ مکمل کریں لیکن آپ کی اس یقین دہانی پر کہ اسکول کی تعلیم کے ساتھ ساتھ قرآن مجید کا حفظ گھر پر مکمل کرلیں گے انہوں نے آپ کو مڈل اسکول میں داخل کرا دیا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس دوران اپنے معمولات کی تفصیل خود اپنی یادداشتوں میں اس طرح بیان کی ہے:

’’ان دنوں میرا نظام الاوقات کچھ اس طرح تھا۔ دن کو تعلیم، مدرسے سے لوٹ کر نماز عشاء تک گھڑی سازی کا کام سیکھنا، اس کے بعد سبق یاد کر کے سو جانا۔ نماز فجر اور مدرسہ جانے کے درمیان قرآن کریم کا ایک حصہ حفظ کرنا‘‘۔

نہی عن المنکر کا شوق

اس دوران اپنے ہم عمر کمسن بچوں کے ساتھ مل کر ایک بزم قائم کی جس کا نام ’’جمعیت الاخلاق ادبیہ‘‘ رکھا۔ اپنے ہم عمروں میں سب سے آگے ہونے کی وجہ سے اس کے صدر منتخب ہوئے۔ اس کا مقصد ننھے طلبہ کے اندر اچھی عادات کو فروغ دینا تھا۔ کسی برائی کا ارتکاب کرنے پر جرمانہ عائد کیا جاتا اور جمع شدہ رقم سے کوئی بھلائی کا کام کیا جاتا۔ حسن البنا محض مدرسے میں ہی نہیں بلکہ مدرسے سے باہر بھی پوری طرح متحرک تھے۔

ایک دفعہ آپ کا گذر دریائے نیل کے اس کنارے کی طرف ہوا جہاں مزدور کشتیاں بنانے میں مصروف تھے۔ محمودیہ میں کشتیاں بنانے کی صنعت بہت عام تھی۔ آپ نے دیکھا کہ زیرِ تعمیر کشتیوں میں سے ایک کے مالک نے اپنی کشتی کے ستون کے ساتھ ایک برہنہ انسانی مجسمہ لٹکا رکھا ہے۔ ساحل کے اس حصہ میں عورتیں اور نوجوان لڑکیاں سیر و تفریح کی خاطر اور پانی حاصل کرنے کے لئے بکثرت آتی تھیں۔ آپ سے رہا نہ گیا اور فوراً مقامی پولیس افسر کے پاس پہنچے۔ آپ نے اس سے شکایت کی تو اس نے غیرت کے اس مظاہرے پر آپ کی حوصلہ افزائی کی اور کشتی کے مالک کو تنبیہ کی کہ اس مجسمے کو فی الفور اتار دے۔ اگلے دن وہ پولیس آفیسر آپ کے اسکول کے ہیڈ ماسٹر کے پاس پہنچا اور ننھے داعی کی ہمت کی داد دی۔ ہیڈ ماسٹر نے تمام بچوں کے سامنے یہ واقعہ بیان کیا اور نہی عن المنکر کی اس کوشش کی تعریف کی۔

حق بات کہنے اور منوانے کا شوق آپ کو بچپن ہی سے تھا۔ اس معاملے میں آپ اپنے سے بڑوں کو بھی ٹوک دیا کرتے تھے۔ اصلاحی کاموں کا ایسا شوق دامنگیر ہوا کہ ’’جمعیت انسداد المحرمات‘‘ کے نام سے جو تنظیم قائم ہوئی اس میں شامل ہو گئے۔ یہ تنظیم بستی کے باشندوں کو منکرات سے اجتناب کی دعوت دیتی اور خطوط کے ذریعے ان کو معروف کی تلقین کرتی۔ لوگوں کو یہ خط اچانک مل جاتے۔ مثلاً کوئی مرد اگر سونے کی بنی ہوئی چیزیں استعمال کرتا تو اسے خط لکھا جاتا کہ مردوں کے لئے شریعت میں سونے کا استعمال حرام ہے۔ جو کوئی عورت منہ پیٹتی یا ماتم کرتے وقت جاہلیت کی کوئی حرکت کرتی ہوئی دیکھی جاتی تو اس کے خاوند یا سرپرست کو اچانک چٹھی مل جاتی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس طرح جب بڑے چھوٹے سب ہی اس کی زد میں آنے لگے تو لوگوں کو آپ کے استاذ شیخ زہران پر شک ہونے لگا اور لوگ انہیں برا بھلا کہنے لگے۔ شیخ زہران صفائیاں پیش کرتے مگر لوگ اعتبار نہ کرتے۔ ایک بار خود شیخ زہران کو معمولی سی بات پر تنبیہ کی گئی کہ وہ شہر کے فقیہ ہیں اور انہیں اپنے تمام معاملات میں محتاط رہنا چاہئے۔ اس پر شیخ نے آپ کو طلب کیا اور حیرت کا اظہار کیا۔ آخر کار ایک روز بھانڈا پھوٹ گیا اور خط رکھنے والا قاصد رنگے ہاتھوں پکڑا گیا۔ اب تو سب کو پتہ چل گیا، چنانچہ جمعیت نے اپنی سرگرمیاں نرم کر دیں اور اصلاح کے لئے دوسرے ذرائع استعمال کئے جانے لگے۔

تصوّف اور عبادات میں انہماک

اسی زمانے میں آپ کو تصوف کی طرف رغبت ہوئی۔ آپکے بھائی اس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ''حسن البنا کو بچپن ہی میں نماز روزے اور ذکر اللہ کا بے حد شوق تھا۔ ہم دونوں چھوٹی مسجد میں عشاء کے وقت چلے جاتے اور نماز عشاء کے بعد ''حصافی اخوان'' کی مجلسِ ذکر میں شریک ہو جاتے۔ دیر تک ہم اس مجلس میں بیٹھے رہتے اور اہلِ ذکر کے ساتھ ذکرِ الٰہی میں مشغول رہتے۔ اس وقت مسجد میں اہلِ ذکر کے سواء کوئی انسان موجود نہ ہوتا۔ رات پر پردۂ سکوت چھا جاتا۔ صرف دعاؤں اور مناجات کی دھیمی دھیمی صدائیں کانوں میں پڑتیں اور حسن اس وقت توحید سے متعلق اشعار زیر لب پڑھتے رہتے''۔

ایسا بھی ہوتا کہ آپ اپنے دینی ساتھیوں کے ساتھ قبرستان چلے جاتے۔ وہاں خالی قبروں میں لیٹ کر اپنے آخری ٹھکانے کا تصور کرتے۔ وہاں سب پر ندامت کے ساتھ گریئے کا غلبہ ہو جاتا۔ پھر قریبی مسجد میں جا کر وظائف پڑھے جاتے اور انبیاء وصلحاء کے تقویٰ اور خدا خوفی کے قصے سنائے جاتے۔ اس طرح لڑکپن کے زمانے سے ہی طبیعت میں وہ سوز پیدا ہو گیا جو ایک مدّت کی ریاضت چاہتا ہے۔

جب حکومت کی جانب سے یہ فیصلہ سامنے آیا کہ ہائی اسکولوں کو ختم کر کے ابتدائی مدارس بنا دیا جائے تو آپ کے سامنے دو راستے تھے۔ ایک یہ کہ اسکندریہ چلے جائیں اور ازہر کی تعلیم حاصل کر کے علمائے ازہر میں شامل ہو جائیں۔ دوسرے یہ کہ ''دمھور'' کے ٹیچرز ٹریننگ اسکول میں داخل ہو جائیں اور تین سالہ کورس کریں۔ آپ نے آخر الذکر کو ترجیح دی۔ اسطرح چودہ سال کی عمر سے سترہ سال تک آپ ٹریننگ اسکول سے وابستہ رہے۔ آپ نے خود اس دور کو اپنے لئے عبادت اور تصوف میں استغراق کا دور کہا ہے۔ کثرت سے دینی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اجتماعات میں شریک ہوتے۔عشاء کے بعد ساتھیوں کے ساتھ اعتکاف کرتے۔ بیچ شب میں ذرا دیر کے لئے آرام کرتے اور پھر تہجد اور وظائف کا سلسلہ نمازِ فجر تک چلتا۔تعطیلات کے دنوں میں قرب و جوار کے بزرگوں اور علماء حضرات سے ملاقاتوں کا پروگرام بناتے۔

تزکیۂ نفس کے لئے خاموشی کا روزہ رکھ لیتے اور ضرورت کے وقت اللہ کے ذکر یا قرآن کی کسی آیت کو ذریعۂ اظہار بناتے۔آپ اور آپ کے ساتھیوں کی یہ حالت دیکھ کر ساتھی طلبہ تنگ کرنا چاہتے تو اساتذہ مداخلت کر کے طلباء کو ڈانٹ دیا کرتے۔ اس حالت میں بھی اپنے اسباق میں اپنی جماعت میں سب سے آگے رہتے۔خود لکھتے ہیں کہ اس زمانے میں اپنے دوستوں کا خط بھی اس خیال سے نہ کھولتا تھا کہ کہیں دل غیر اللہ کے خیال سے آلودہ نہ ہو جائے اور جہاں تک بس میں ہو اس کے لئے مجاہدہ کیا جائے۔اسلامی مدرسہ ہونے کے باوجود نمازوں کے اوقات میں کلاسیں ہوا کرتی تھیں۔چنانچہ آپ اپنے اساتذہ سے باخوشی اور بعض اوقات بحث و تمحیص کر کے باجماعت نماز ادا کرنے کی اجازت لے لیتے اور ظہر اور عصر کی اذان مدرسہ کی مسجد میں دیتے ۔درمیانی وقفے میں بھی گھر نہ جاتے بلکہ مسجد میں جا کر قرآن سنتے اور سناتے تھے۔

ایک بار ڈائریکٹر آف ایجوکیشن (جو آپ کے اسکول کے دورے پر تھے) نے آپ کے لباس پر (جو سنت کے مطابق تھا) خوب تنقید کی اور پوچھا کہ ''تم نے یہ لباس کیوں پہن رکھا ہے''؟ آپ نے جواب دیا:''اس لئے کہ یہ سنت ہے''۔انہوں نے کہا:''کیا تم نے دوسری تمام سنتیں قائم کر لی ہیں اور صرف لباس والی سنت باقی رہ گئی تھی''؟ آپ نے عرض کیا:''نہیں دوسری سنتیں کہاں پوری ہو رہی ہیں۔ہم اس معاملے میں بڑی کوتاہی کے مرتکب ہو رہے ہیں لیکن جتنا کچھ ہم سے بن سکتا ہے وہ تو کر ہی رہے ہیں''۔ڈائریکٹر کہنے لگے:''لیکن یہ نرالا روپ اختیار کر کے تم نے نظم کو توڑا ہے''۔آپ نے کہا:''وہ کیسے؟ مدرسے کا نظم ہے باقاعدگی،سو میں ہرگز اسباق میں غیر حاضری نہیں کرتا۔مدرسے کا نظم ہے اچھا کردار اور اخلاق،سو الحمد للہ تمام اساتذہ مجھ سے خوش ہیں،مدرسے کا نظم ہے تعلیم اور محنت،چنانچہ میں اپنی جماعت میں اول ہوں''۔اس پر ڈائریکٹر صاحب کہنے لگے: ''میاں جب تم فارغ ہو کر نکلو گے اور اپنے اسی لباس پر بضد رہو گے تو بورڈ آف ایجوکیشن تم کو کبھی مدرس مقرر نہ کرے گا''۔آپ نے کہا:''ابھی وہ وقت نہیں آیا۔جب وہ وقت آئے گا تو بورڈ بھی آزاد ہوگا اور میں بھی آزاد ہوں گا۔رزق اللہ کے ہاتھ میں ہے،بورڈ کے ہاتھ میں ہے نہ ہی وزارتِ تعلیم کے ہاتھ میں''۔یہ جواب سن کر ڈائریکٹر صاحب چپ ہو گئے۔پرنسپل صاحب نے مداخلت کر کے آپ کا تعارف بہت اچھے الفاظ میں کروایا اور یوں آپ کی جان چھوٹ گئی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انہی دنوں میں مصر میں بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی۔ آپ بھی بحیثیت طالب علم مظاہروں اور ہڑتالوں میں شرکت کرتے۔ اپنی یادداشتوں میں اسکا تذکرہ یوں کیا ہے:

''میں گو تصوف اور سلوک کی وادیوں میں گم تھا مگر اس کے باوجود میرا اعتقاد تھا کہ وطن کی خدمت جہاد ہے اور یہ ایسا فرض ہے جس سے استثناء کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اپنے اس عقیدے کی رو سے اور طلبہ کے اندر اپنے مقام و مرتبہ کی بناء پر (اس لئے کہ میں ان کی اگلی صفوں میں تھا) میں پابند تھا کہ قومی اور وطنی تحریکوں میں نمایاں کردار ادا کروں''۔

جمعہ کی تعطیل کے دن لازماً اپنے گھر محمودیہ جاتے اور دن بھر کا معمول اس طرح بناتے کہ ایک لمحہ بھی ضائع نہ ہو۔ اس دوران گھڑی سازی اور جلد سازی کا کام بھی سیکھتے۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں فقہ، اصولِ فقہ، حدیث اور نحو کی کتابیں اپنے شوق سے اساتذہ کرام کے گھر جا کر پڑھتے۔ ان ایام میں یہ بھی معمول رہا کہ فجر سے پہلے بیدار ہو کر گھر سے نکل جاتے اور مؤذنوں کو صبح کی اذان کے لئے بیدار کرتے۔ لکھتے ہیں:

''مؤذنوں کو صبح کی اذان کے لئے بیدار کرنے کے بعد میں ایک گہری مسرت میں ڈوب جاتا۔ انہیں بیدار کرنے کے بعد اسی جادو اثر اور جذبہ انگیز حالت میں دریائے نیل کے کنارے جا کھڑا ہوتا اور اذان سننے کے لئے ہمہ تن گوش ہو جاتا۔ میرا دل کہتا نمازیوں کی اتنی بڑی تعداد کی بیداری کا میں بھی ذریعہ بنوں گا اور رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کے مطابق مجھے بھی نمازیوں کے برابر اجر ملے گا کہ جو شخص ہدایت کی طرف دعوت دیتا ہے اسے اس کا بھی اجر ملتا ہے اور اس کی نیکی کا اجر بھی جو قیامت تک اس پر عمل پیرا رہے اور اس سے ان کے اجر میں ذرہ برابر کمی نہ ہوگی۔ یہ لذت و سعادت دو چند ہو جاتی جب میں مسجد جاتا اور اپنے آپ کو مسجد میں بیٹھنے والوں میں سب سے کم عمر پاتا۔ تمام تعریف اللہ کے لئے ہے''۔

دار العلوم قاہرہ میں داخلہ

تین سالہ کورس کے اختتام پر کچھ ساتھی دار العلوم قاہرہ میں داخلے کے لئے زور دینے لگے اور اس مقصد کے لئے مل کر پڑھنے کا پروگرام بنایا۔ آپ اس وقت تک اپنے آپ کو ذہنی طور پر یکسو نہ کر پائے تھے۔ بار بار یہ خیال آتا کہ کہیں علماء کی صف میں شامل ہونے کے لئے تو یہ سب تگ و دو نہیں ہے۔ کبھی یہ خیال آتا کہ شاید میں ایک معمولی پرائمری ٹیچر کے طور پر اپنے آپ کو پیش کرنے کے بجائے اعلیٰ تعلیم کا مدرس بننا چاہتا ہوں۔ پھر یہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سوچ ابھرتی کہ علم کی طلب کے لئے دارالعلوم سے وابستگی شرط تو نہیں ہے۔اسی ذہنی کشمکش میں تھے کہ آپ کے استاذ نے آپ کی راہنمائی کی اور سمجھایا کہ آپ کم از کم امتحان میں شریک ہو جائیں۔کامیابی کی صورت میں مرضی آپ کی ہوگی۔اگر ارادہ ہوتو داخلہ لے لیجیے گا۔خوش قسمتی سے آپ نے امتحان پاس کرلیا۔البتہ آپ کی کم عمری زبانی امتحان لینے والے اساتذہ کی نگاہ میں کھٹکتی رہی لیکن ذہانت اور حاضر جوابی کو سامنے رکھتے ہوئے انہوں نے چشم پوشی کی اور یوں آپ قاہرہ میں دارالعلوم سے وابستہ ہو گئے۔اسی زمانے میں ٹیچرز ٹریننگ اسکول کے تین سالہ کورس سے بھی فارغ ہو گئے اور اپنے اسکول میں اول اور پورے مصر میں پانچویں نمبر پر آئے۔

دارالعلوم قاہرہ میں آپ کی تعلیمی ترقی کی رفتار بہت تیز رہی۔امتحان میں اول آئے اور مدرسے نے آپ کو ایک پاؤنڈ ماہوار وظیفہ دینا شروع کر دیا۔وظیفے کے ان پیسوں سے آپ کتب خریدتے،مطالعہ کرتے اور ساتھ ساتھ روحانی اجتماعات اور دینی دروس میں بھی باقاعدگی سے شرکت کرتے رہے۔آپ کے اپنے الفاظ میں: ''اسطرح وہاں میری علمی،عملی اور روحانی زندگی بڑے سکون سے گذر رہی تھی اور الحمدللہ کوئی چیز اس سکون کو درہم برہم کرنے والی نہ تھی۔''اسی زمانے میں آپ کا سارا خاندان بھی قاہرہ منتقل ہو گیا۔ایام تعطیلات میں آپ اب بھی محمودیہ چلے جاتے اور اپنے پرانے ساتھیوں کے ساتھ عبادات میں مشغول ہو جاتے۔گھڑی سازی کا کام کرکے پیسے کماتے اور بقیہ وقت مطالعہ میں گذارتے۔آپ لکھتے ہیں:

> ''ہم ہر وقت عبادت میں مشغول ہوتے تھے لیکن پھر بھی ہم علم اور مطالعے کے عاشق تھے اور ان تمام باتوں سے نفرت تھی جو ظاہرِ دین اور اس کے احکامات کے خلاف تھیں۔ہم ان لوگوں پر سخت نکیر کیا کرتے تھے جو نام نہاد تصوّف کے لبادے میں اسلامی تعلیمات سے آزاد ہو رہے تھے۔گویا فکری لحاظ سے ہم آزاد قسم کے مرید تھے اگرچہ عبادات کی اہمیت، ذکر و فکر اور ادب وسلوک میں ہم پورے طور پر مخلص تھے''۔

دعوتِ اسلامی کی تحریک اور مصر کے حالات

حسن البنا کی تحریکِ اسلامی پر روشنی ڈالنے سے قبل ضروری ہوگا کہ اس زمانے میں مصر کے سیاسی،اجتماعی اور اخلاقی حالات پر ایک اجمالی نگاہ ڈالی جائے۔

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں مصر میں زبردست نظریاتی معرکہ آرائی ہوتی رہی۔ان میں مصری وطنیت،اسلامی خلافت،عرب قومیت اور قدیم وجدید کی کشمکش سرفہرست تھی۔1883ء

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں عرابی پاشا کی بغاوت کی ناکامی مصر پر انگریزوں کے تسلط کا پیغام لائی۔ مصری عوام انگریز استعمار سے ٹکرانے سے گھبرانے لگے یہاں تک کہ نوجوان طبقے میں دو قسم کے گروہ سامنے آئے۔ ایک ''الحزب الوطنی'' تھا جس کی قیادت مصطفیٰ کمال کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنی جدوجہد کو دینی جذبات اور اسلامی رشتے سے مربوط رکھا اور ثابت کیا کہ مذہب اور وطن سے محبت متضاد باتیں نہیں ہیں۔ ان کی دعوت میں جذبات انگیزی اور ہیجان خیزی غالب تھی۔

دوسرا گروہ ''حزب الامت'' مصری وطنیت کا علمبردار تھا اور اسلامی اتحاد یا اسلامی رشتے کی بنیاد پر زندگی کی تعمیر کے خلاف تھا۔ اس گروہ کی پسِ پردہ حوصلہ افزائی خود انگریز کر رہا تھا تاکہ مصری عوام نہ صرف یہ کہ ترکوں سے بیزار ہو جائیں بلکہ دورِ فراعنہ سے ان کا تعلق جوڑ کر انہیں عربوں سے بھی بیزار کیا جا رہا تھا۔ یہ لوگ انگریزوں کے مصر میں قیام کے حق میں دلائل دیتے نہ تھکتے تھے اور یہ ثابت کرتے تھے کہ انگریز مصر میں قیام کی مشقت اس لئے برداشت کر رہے ہیں کہ وہ مصریوں کو ظلم سے نجات دیں۔ ان کی پشت پر مصری پاشا، مختلف جاگیردار اور ابن الوقت قسم کے لوگ تھے۔ یہ ترکوں کو ظالم اور انگریزوں کو عادل کہتے تھے۔ ان کا اپنی بات کو پیش کرنے کا طریقہ دلیل وحجت پر مبنی تھا اور غیر ضروری جوش سے کام نہ لیا کرتے تھے۔ 1911 میں حالات اس قدر خراب ہوئے کہ ان دونوں گروہوں میں باہم تصادم برپا ہوا اور یہ معاملہ اسلامی وطنیت تک محدود نہ رہا بلکہ مسلمان بمقابلہ قبطی کی بحث شروع ہو گئی۔ بالآخر ریاض پاشا نے وزارتِ عظمیٰ سنبھالی تو خانہ جنگی کی آگ کو ٹھنڈا کیا۔

ان تمام حالات کے پس منظر میں ایک نیا گروہ سامنے آیا جو سال میں ایک بار تفسیر قرآن مجید کا درس دیتا اور ایک بار رقص وسرود کی محفل سجاتا۔ یعنی دونوں گروہوں کے درمیان پیوند لگانے کی مضحکہ خیز کوشش بھی کی گئی۔

انگریزوں نے مناسب موقع دیکھ کر مصر پر مغربی تہذیب کی یلغار کر دی اور ایک معقول تعداد نے اس کا اثر قبول کیا۔ یہ لوگ مغربی تہذیب سے سخت متاثر تھے۔ ان کی تاریخ، ان کا تمدن، ان کے ثقافتی ادبی اور فکری طرز اور رہن سہن کو مکمل طور سے اپنا چکے تھے جبکہ مسلمانوں اور اسلام سے ان کا رشتہ برائے نام رہ گیا تھا۔ مصر میں شراب خانے، قحبہ خانے اور سینما گھر جگہ جگہ کھل گئے۔ شخصی آزادی کے نام پر ہر پابندی سے آزاد ہوا جا رہا تھا۔ اسی زمانے میں مصر کو انگریز یانے کی کوششوں کو چار طرف سے پھیلانے کی کوشش کی گئی۔ پہلی تحریک انگریزوں کے مماثل پارلیمانی نظام کی داعی تھی۔ دوسری کوشش دین کو سیاست سے جدا کرنے کے لئے کی جارہی تھی۔ اس کے پس منظر کے طور پر یہ مثال سامنے رکھی جاتی کہ انگریزوں کی ترقی کلیسا سے نجات پانے کے بعد ہی ممکن ہوئی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور قرونِ وسطیٰ میں یورپ جن حالات سے دوچار رہا وہی حالات اب مصر میں پائے جاتے ہیں۔ اس ساری مساعی کے پیچھے یہ سوچ کارفرما تھی کہ عثمانی خلیفہ جو ساری مسلمان امت کے اتحاد کی علامت تھے ان کے خلاف ماحول تیار کیا جائے۔ اس ضمن میں ترکوں کے مظالم اور اسلام دشمنی کی جھوٹی داستانیں عام کی گئیں۔ تیسری طرف تحریکِ آزادئ نسواں زور وشور سے جاری تھی اور خود مصری مصنفین عورت کی آزادی کے حق میں دلیلیں دیتے ہوئے پردے اور حجاب کو بے جا پابندیاں گردانتے تھے۔ ایک چوتھا نعرہ عرب قومیت کا بھی بلند ہوا گو کہ اس کو قبولِ عام بعد میں حاصل ہوا۔ ان حالات میں انگریزوں نے مصر پر اپنی سرپرستی کا پورا پورا اعلان کر دیا۔

مصر اور ترکی (خلافتِ عثمانیہ) کے آپس کے تمام رشتے کاٹ دیئے گئے۔ ایسے موقع پر جبکہ ہنگامی قوانین نافذ تھے اور انگریز فوج متشددانہ کارروائیاں کر رہی تھی مصر کے عوام خاموش نہ بیٹھے بلکہ ان فیصلوں کے خلاف مظاہرے ہوتے رہے یہاں تک کہ پہلی جنگ عظیم کے بعد جب خلافتِ عثمانی ریزہ ریزہ ہوگئی تو مصر میں بھی بغاوت پھوٹ پڑی۔ اس زمانے میں انگریزوں اور ان کی کٹھ پتلی حکومت کی جانب سے مصریوں پر ناقابل بیان مظالم ڈھائے گئے۔ تنسیخِ خلافت کے بعد تجدیدِ خلافت کی ہر کوشش مسلمانوں کے اپنے اختلافات کی وجہ سے ناکام ہوگئی۔ اب مصر میں دوسرے عرب ممالک کی طرح عرب قومیت کا بھوت سر پر ناچنے لگا۔ دوسری طرف فرعونیت یا دوسرے الفاظ میں فراعنہ کے فروغ کی ایسی لہر اٹھی جس نے تمام فکری اور ثقافتی پہلوؤں پر اپنا اثر دکھایا۔ دور فراعنہ کے بتوں کو مصر کی تہذیبی علامت کے طور پر فخریہ پیش کیا جانے لگا۔ سرکاری اسٹیشنری و عمارات غرض ہر چیز پر ان کے عکس نظر آنے لگے۔ مصری قوم کا گویا مزاج بدلنے لگا۔ اخلاقی انارکی اور بے غیرتی نے اپنے قدم پورے طور سے جما لئے۔ قتل وغارت گری اور آبروریزی کے بکثرت واقعات پیش آئے۔ موقع پرست لوگوں نے اس صورتحال سے خوب فائدہ اٹھایا اور دیوثی اور دلالی کو خوب فروغ ملا۔ لہو ولعب اور خمر وقمار کے مراکز کی تعداد میں یکدم اضافہ ہوگیا۔

اس پر مزید یہ ہوا کہ دیہاتی علاقے جو ان اثرات سے کافی حد تک بچے ہوئے تھے وہ بھی ہزاروں کاشتکاروں کے اتحادی افواج کی خدمت کے لئے شہروں میں آنے کی وجہ سے زیر اثر آ گئے۔ یہ حضرات اپنے علاقوں میں اس حال میں لوٹے کہ انگریزوں سے سخت مرعوب اور اخلاقِ فاسدہ اور امراضِ خبیثہ میں بری طرح گرفتار تھے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

علماء کی بے عملی

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان حالات میں علمائے دین کیا کر رہے تھے؟ الحاد اور مغربیت کے اس طوفان میں علماء نے قرآن وحدیث اور سلف کے واقعات وآثار کا سہارا لینے کی کوشش کی مگر ان کا رویہ معذرت خواہانہ تھا۔ وہ قدیم (قدیم سے مراد ہر وہ چیز جس کا تعلق اسلام سے تھا) اور جدید (جدید سے مراد ہر وہ چیز جو یورپ سے آئی تھی) کے درمیان توافق پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ ان میں علامہ محمد عبدہ اور عبداللہ الندیم اپنے اپنے عہد میں ان چیلنجوں کا مقابلہ کرتے رہے مگر یہ حضرات خود بھی کسی نہ کسی حد تک یورپ سے مرعوب نظر آتے تھے۔ لہٰذا ان کے کام میں وہ ہمہ گیریت اور اثر نظر نہیں آتا جو ایک خالص اسلامی تحریک کا طرۂ امتیاز ہونا چاہئے۔

مختصراً حسن البنا کے دور کا مصر اب مغربی تہذیب اور ثقافت کو مکمل طور سے اپنانے کی راہ پر چل پڑا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وطن پرستی کے جذبات پوری قوم پر اپنا اثر دکھا رہے تھے۔ عربی زبان کی فصاحت کو کم کرنے کی کوششیں اپنے عروج پر پہنچ چکی تھیں تاکہ قرآن کریم سے رشتہ کمزور کیا جاسکے اور ان سب کا تکمیلی نقطہ لہو ولعب اور بے حیائی کا طوفان تھا جس نے مصری معاشرے کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔

حسن البنا کی اصلاحی کوششیں اور شیخ دجوی سے ملاقات

حسن البنا مصر کے دیہاتی علاقے کی سادہ زندگی سے نکل کر جب قاہرہ پہنچے تو آپ کو بے راہ روی اور اسلامی اخلاق سے بُعد کے ایسے مناظر نظر آئے جنہوں نے آپ پر بہت اثر کیا۔ آپ کے حساس دل نے بہت جلد یہ محسوس کر لیا کہ اس طوفان کے آگے بند نہ باندھا گیا تو اسلامی اقدار اور اخلاقیات کا جنازہ نکل جائیگا۔ ابتداء میں آپ لوگوں سے اس موضوع پر گفتگو کر کے دل کی بھڑاس نکالتے یہاں تک کہ دار العلوم کے آخری سال میں پہنچ گئے۔ اب حالات اس نہج پر تھے کہ جدیدیت کا کیمپ شباب پر تھا اور اسلامی کیمپ روز بروز سکڑتا جا رہا تھا۔ آپ کا اضطراب اس قدر بڑھا کہ فرماتے ہیں:

> ''اس سال رمضان المبارک کا نصف مہینہ سخت بے خوابی میں گذرا۔ بے چینی کی شدت اور حالات پر مسلسل سوچ بچار کی وجہ سے پلکیں نیند سے نا آشنا ہو چکی تھیں۔ میں نے کوئی مثبت کام کرنے کا تہیہ کر لیا تھا''۔

اس ضمن میں سب سے پہلے مسلمان راہنماؤں سے ملاقات کا پروگرام ترتیب دیا۔ پہلی ملاقات شیخ دجوی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے کی جن کی تحریروں سے آپ بہت متاثر تھے اور جن کے روابط ملک بھر کے علماء سے تھے۔ ملاقات کے دوران جب امت پر خصوصاً مصر کے عوام پر لادینیت کے غلبے کا ذکر آیا تو شیخ دجوی کی باتوں سے یہ تاثر سامنے آنے لگا کہ ہر طرح کی کوششیں کر کے دیکھ لیں، ان کا کوئی فائدہ نہیں نکلا لہٰذا حسن البنّا کو بھی تلقین کی کہ بقدرِ استطاعت کام کریں اور نتائج اللہ پر چھوڑ دیں۔ اس پر حسن البنّا کو بہت طیش آیا۔ کہنے لگے:

''میرا خیال ہے کہ معاملہ ضعفِ ارادہ، کم کوشی اور ذمہ داریوں سے گریز کے سوا کچھ نہیں۔ آپ حضرات کس چیز سے ڈرتے ہیں؟ حکومت سے یا ازہر سے؟ آپ لوگوں کے لئے پنشن کافی ہے۔ گھروں میں بیٹھ جایئے، اور پھر اسلام کے لئے کام کریں۔ قوم فی الحقیقت تمہارے ساتھ ہے۔ تم قوم کا سامنا تو کرو۔ یہ مسلمان قوم ہے۔ میں نے مسلمان قوم کو قہوہ خانوں میں دیکھا، مسجدوں میں دیکھا، سڑکوں اور فٹ پاتھوں پر دیکھا۔ میں نے ہر جگہ اسے ایمان سے لبریز پایا ہے لیکن یہ عظیم طاقت نظر انداز کی جا رہی ہے۔ یہ ملحد اور اباحیت پسند افراد کیا حقیقت رکھتے ہیں؟ ان کے اخبارات اور رسائل اس لئے نکل رہے ہیں کہ آپ خوابِ غفلت میں سو رہے ہیں۔ اگر آپ لوگ چوکنے اور ہوشیار ہوتے تو یہ سب لوگ اپنے بلوں میں گھس جاتے۔ استاذ! اگر تم اللہ کے لئے کچھ نہیں کرنا چاہتے تو اپنی دنیا کی خاطر کچھ کرو اور اس روٹی کی خاطر کچھ کرو جو تمہیں اس وقت مل رہی ہے کیونکہ اگر اس قوم کے اندر سے اسلام مٹ گیا تو ازہر بھی مٹ جائیگا اور علماء بھی مٹ جائیں گے۔ پھر تمہیں کھانے کو کچھ نہ ملے گا نہ پہننے کو۔ لہٰذا اگر تم گلستانِ اسلام کا دفاع نہیں کرتے تو اپنی ذات کا دفاع تو کرو۔ آخرت نہیں بنانا چاہتے تو نہ بناؤ، دنیا تو بناؤ۔ ورنہ تمہاری دنیا بھی برباد ہوگی اور آخرت بھی''۔

اس تقریر کے بعد ایک صاحب نے مقابلتاً تقریر کی۔ شیخ دجوی نے محفل کا یہ رنگ دیکھا تو کہنے لگے: ''اللہ سے دعا ہے کہ اس کام کی توفیق دے جس میں اس کی خوشنودی ہے''۔ اس کے بعد یہ سب حضرات رمضان کا روزہ افطار کرنے شیخ محمد سعید کے گھر پہنچے۔ آپ جان بوجھ کر ان کے ساتھ آ گئے اور موقع پا کر ان کے برابر میں بیٹھ گئے۔ انہوں نے آپ کو دیکھا تو کہا: ''ارے! تم بھی ہمارے ساتھ آ گئے''۔ آپ نے فرمایا: ''جب تک آپ کسی نتیجے پر نہیں پہنچتے میں آپ سے جدا نہیں ہوں گا''۔ شیخ نے مٹھائی پکڑ کر آپ کے ہاتھ پر رکھ دی اور کہنے لگے ''انشاء اللہ کچھ سوچوں گا'' آپ نے کہا: ''سبحان اللہ معاملہ اب غور و فکر برداشت نہیں کرسکتا، عمل کا متقاضی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے۔ اگر ان میووں اور مٹھائیوں کا میں شائق ہوتا تو میں انہیں ایک دو قرش میں خرید لیتا اور اپنے گھر پر آرام کرتا اور آپ سے ملاقات کی زحمت نہ اٹھاتا۔ اسلام کے خلاف سنگین جنگ برپا ہے اور مسلمان ائمہ نا و نوش میں غرق ہیں۔ اگر آپ لوگوں کے سواء اسلام کے کوئی پیشوا ہیں تو مجھے ان کا پتہ دیں، میں ان کے پاس چلا جاؤں، شاید مجھے وہاں سے وہ چیز مل جائے جو آپ کے پاس نہیں''۔ اس پر محفل میں سکوت طاری ہو گیا۔ شیخ دجوی کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں اور آنسوؤں سے داڑھی تر ہو گئی۔ کہنے لگے: ''بتایئے صاحب میں کیا کروں''؟ آپ نے کہا: ''ان لوگوں کے نام تجویز کریں جن میں دینی غیرت کے آثار ہوں۔ یہ لوگ سر جوڑ کر بیٹھیں اور کم از کم اس زہریلے لٹریچر کا مقابلہ کریں، چاہے اخبار کے ذریعے یا ہفت روزہ کے ذریعے۔ نوجوانوں کی انجمنیں تشکیل دی جا سکتی ہیں، اور بھی بہت سے کام ہو سکتے ہیں''۔ اس پر شیخ صاحب نے حکم دیا کہ کھانے پینے کی چیزیں سامنے سے اٹھا لی جائیں اور کاغذ قلم طلب کر کے علماء کے ناموں کی فہرست بنائی جانے لگی۔

اس کے بعد ان حضرات سے رابطہ کیا گیا جن کے نام منتخب کئے گئے تھے اور ان تمام کوششوں کا نتیجہ بالآخر ایک شاندار جریدے ''الفتح'' کی صورت میں منظر عام پر آیا جو غیور اور اسلام پسند نوجوانوں کے لئے مشعلِ راہ تھا۔ اسی عرصے میں آپ کی تعلیم مکمل ہو گئی اور آپ کی تقرری اسماعیلیہ شہر میں ہو گئی۔

اسماعیلیہ: دعوتِ اسلامی کا آغاز

اسماعیلیہ آپ کے لئے بالکل اجنبی جگہ تھی۔ ابتدائی ۴۰ دن تک آپ اپنا وقت مسجد، مدرسہ اور مکان پر تلاوتِ قرآن اور مطالعے میں گذارتے اور فارغ وقت میں نئے علاقے کی خصوصیات اور طرزِ زندگی سمجھنے کی کوشش کرتے۔ آپ نے محسوس کیا کہ اگرچہ شہر پر فرنگیت کا غلبہ ہے لیکن لوگ علماء کے گرد بھی موجود ہیں۔ تاہم ان کے دل یکجا نہیں ہیں۔ چنانچہ آپ نے مساجد میں لوگوں کو متوجہ کرنے کے بجائے قہوہ خانوں کا رخ کیا۔ اس غرض کے لئے تین بڑے قہوہ خانے منتخب کئے اور دعوت و درس کا کام شروع کیا۔ ابتداء میں یہ طریقہ لوگوں کے لئے بہت حیرت انگیز تھا مگر وہ جلد ہی اس سے مانوس ہو گئے اور اس میں دلچسپی لینے لگے۔ آپ ہمیشہ ان موضوعات کا انتخاب کرتے جو لوگوں کو اللہ سے جوڑنے والے اور آخرت کی تیاری سے متعلق ہوتے۔ فرقہ وارانہ گفتگو اور طنز و تشنیع سے گریز کرتے۔ آپ کا درس دس منٹ سے زیادہ کا نہ ہوتا۔ بہت جلد اس کے نتائج سامنے آنے لگے۔ لوگ آ آ کر آپ سے پوچھنے لگے کہ آخر انہیں کیا کرنا چاہئے تاکہ وہ اللہ کی طرف سے عائد شدہ ذمہ داری کو ادا کر سکیں۔ جب اصرار بڑھا تو قہوہ خانوں کے علاوہ اجتماعی مطالعے کے لئے دور دراز کی ایک جگہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کا انتخاب کیا گیا۔ کچھ حضرات تو وضو کے طریقے تک سے واقف نہ تھے۔ آپ نے انہیں وضو اور نماز کی عملی تربیت دی۔ اس درس کی شہرت جلد پھیل گئی اور ایک کے بعد دوسرا مرکز تعمیر ہو گیا۔

چند مواقع ایسے بھی آئے کہ لوگوں نے آپ کو فقہی بحثوں میں الجھانا چاہا تا کہ جان سکیں کہ آپ کس مسلک سے تعلق رکھتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اختلافی مسائل پوچھنا شروع کئے۔ آپ انتہائی حکمت سے ان سوالات کا رخ حق کی معرفت، دینِ حنیف کی خدمت اور مسلمانوں کے مابین اخوت و اتفاق برقرار رکھنے کی طرف موڑ دیا کرتے۔ رفتہ رفتہ آپ نے یہ بات ان کے ذہنوں میں پختہ کر دی کہ اپنے اپنے مسالک پر قائم رہتے ہوئے بھی اسلامی معاشرے کی وحدت کو تحمل، برداشت اور رواداری کی بنیاد پر قائم رکھا جا سکتا ہے۔

علماء حضرات کو آپ خصوصی عزت دیتے۔ جب کسی عالم کو آتا دیکھتے تو خود خطاب کرنے کے بجائے اس کو دعوت دیتے اور خود بیٹھ جاتے۔ تحائف کے ذریعے ان کے دل میں اپنے لئے جگہ پیدا کرنے کی کوشش کرتے۔ معززینِ شہر کے ساتھ اکثر نشستیں رہتیں۔ ان حضرات کا عوام پر گہرا اثر تھا۔ ان کے بھی دو کیمپ تھے۔ آپ دونوں کیمپوں کے معززین سے ملتے اور ان کی آپس کی غلط فہمیاں دور کرنے کی کوشش کرتے۔ اس طرح آپ کے تعلقات دونوں گروہوں سے بہترین طور پر استوار ہو گئے۔

اب آپ نے مزدوروں کی طرف توجہ مائل کی اور ان میں کام شروع کیا۔ وہاں بھی خاطر خواہ کامیابی ہوئی اور یوں آپ اسماعیلیہ کی ایک معروف شخصیت بن گئے۔ قاہرہ میں جس اسلامی جریدے کے اجراء کی کوششیں آپ نے کی تھیں وہ اب اسلامی اقدار کے فروغ کے لئے نمایاں کردار ادا کر رہا تھا۔ آپ نے اسماعیلیہ کے عوام میں اس کا تعارف کروایا۔ اور زیادہ سے زیادہ خریدار بنانے کی بھرپور کوشش کی۔

بالآخر اسماعیلیہ میں آپ اللہ کی توفیق سے وہ ماحول پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے جہاں لوگ سنجیدگی سے اسلام کی حقانیت، عملی زندگی میں اس کے تقاضے اور امتِ مسلمہ کے مسائل پر سوچنے لگے۔ یہ کام اتنا آسان نہ تھا۔ اس کے لئے حسن البنا نے دن رات ایک کیا۔ آپ کے دوست نے آپ کو قاہرہ سے اسماعیلیہ کے لئے رخصت کرتے ہوئے درست کہا تھا: ''پاک طینت انسان جہاں بھی اترتا ہے پاکیزہ اثرات ہی چھوڑ کر جاتا ہے۔ ہم امید رکھتے ہیں کہ ہمارا دوست بھی اسماعیلیہ میں اچھے اثرات چھوڑے گا''۔

الاخوان المسلمون

ذی قعدہ ۱۳۴۷ھ بمطابق مارچ 1928 میں آپ کی دعوت سے متاثر ہو کر چھ احباب آپ سے ملنے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آئے اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ اسلامی طرزِ حیات اپنانے اور نافذ کرنے کے لئے نیز انگریزوں کی غلامی سے نجات پا کر عزت ووقار سے زندگی گذارنے کے لئے کوئی عملی جدوجہد بھی ہونی چاہئے۔ ان حضرات کے جذبات اپنے عروج پر تھے۔ وہ کہنے لگے: ''ہم اس وقت جو خواہش لے کر یہاں آئے ہیں وہ یہ ہے کہ جو کچھ ہماری ملکیت میں ہے وہ آپ کو پیش کر دیں تا کہ ہم اللہ کے حضور اپنی ذمہ داری سے بری ہو سکیں''۔ پھر دلسوزی سے آپ سے راہنمائی مانگنے لگے۔ ''ہمارے پاس صرف یہ خونِ گرم ہے جو رگوں میں غیرت اور خودی کی حرارت کے لئے دوڑ رہا ہے، یہ جانیں ہیں جو ایمان و شرف کے احساس سے لبریز ہیں، یہ چند درہم ہمارے ہاتھ میں ہیں جو ہم اپنے بچوں کا پیٹ کاٹ کر لائے ہیں۔ جس طرح آپ کام کو سمجھتے ہیں ہم نہیں سمجھ سکتے''۔ ان کے عزم وہمت کو دیکھ کر حسن البنا کے دل پر بہت اثر ہوا۔ یہ سب حضرات آپ سے وہی تو مانگنے آئے تھے جس کے لئے آپ انہیں بلا رہے تھے۔ اب ذمہ داری کو اٹھانے کا وقت آیا تو آپ نے اپنے لئے راہِ فرار نہ ڈھونڈی بلکہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر اللہ سے اسلام کے داعی بننے کا عہد کیا۔ رسمی نام تجویز کرنے کے بجائے آپ نے ''الاخوان المسلمون'' کہلانا پسند کیا۔ کون جانتا تھا کہ یہ مبارک مجلس جس میں چند افراد اپنے دینی جذبات سے مغلوب ہو کر شریک ہوئے تھے عالمِ عرب کی سب سے بڑی اسلامی تحریک بننے والی ہے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے ''مدرسہ تہذیب وتربیت'' کی بنیاد رکھی گئی۔ مدرسے میں تجوید، حفظ قرآن، تفسیر، سیرت رسول ﷺ اور اسلامی تاریخ کے علاوہ سلف صالحین کی سیرت بھی پڑھائی جاتی تھی۔ پہلے تعلیمی سال کے اختتام پر ستر افراد (اخوان) فارغ ہوئے۔ مدرسے کی تعلیم اور ماحول نے انہیں محض دینی تعلیم ہی نہ دی بلکہ کردار کی مضبوطی اور اخلاق کی بہتری کے لئے کی گئی کوششوں کے اثرات بھی نظر آنے لگے۔ عظمتِ کردار کے ان واقعات (جو دورِ اول کے اخوان کا خاصہ تھے) کا ذکر آپ نے اپنی یادداشتوں میں بھی کیا ہے۔

فارغ التحصیل طلباء اب اخوان کے مستقل کارکن اور اسلام کے داعی بن گئے۔ حسن البنا کا ہاتھ بٹانے کو اب پوری جمعیت تیار ہو گئی تو اخوان کی دعوت زور پکڑنے لگی۔ لوگوں کی جانب سے اخوان کے مرکز کے قیام کا مطالبہ بھی سامنے آنے لگا۔ ان مراکز کے قیام کے لئے جہاں رقم جمع کرنے کے دوران قربانی کے حیرت انگیز مناظر دیکھنے میں آئے تو دوسری طرف فسادی عناصر کے پھیلائے گئے شکوک دور کرنے کے لئے اخوان نے بڑی کوشش کی۔ اخوان کے پہلے بڑے مرکز کی تعمیر کے لئے پتھر ڈھونے کا کام خود حسن البنا اور آپ کے ساتھیوں نے اپنے ہاتھوں سے کیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے دعوت تیزی سے پھیلنے لگی اور شبراخیت کے علاقے میں اخوان کی ایک شاخ کا قیام عمل میں آیا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لادین فسادی عناصر یہ سب کچھ کیسے برداشت کر سکتے تھے چنانچہ حسن البنا کے خلاف جھوٹے الزامات عائد کئے گئے اور ایک محضر نامہ وزیر اعظم کو بھیجا گیا۔ بڑے پیمانے پر آپ کے خلاف تحقیقات ہوئیں مگر اس کا نتیجہ بھی خیر کے سوا کچھ نہ نکلا کیونکہ انسپکٹر جنرل ایجوکیشن دورانِ تحقیقات اخوان کے کام سے ایسا متاثر ہوا کہ تقریب ملاقات میں بغیر کہے اخوان کا بیج لگا لیا۔ آپ کے خلاف الزام لگانے والوں میں ایک عیسائی بھی تھا جس نے آپ پر مذہبی تفرقہ بازی کا الزام لگایا تھا۔ یہ محضر نامہ جب تحقیقات کے لئے اسکول کے پرنسپل کے پاس پہنچا تو سارے شہر میں اس کی خبر پھیل گئی اور اسماعیلیہ کے اندر رہنے والے عیسائیوں نے اس افترا پردازی کی مذمت کی۔ ان کا ایک وفد جس کی قیادت آرتھوڈوکس چرچ کا نگرانِ اعلیٰ کر رہا تھا اسکول آیا اور عیسائیوں کے نام پر ایسی حرکت کرنے والوں کے خلاف پرنسپل سے احتجاج کیا۔ اس طرح نہ صرف یہ کہ آپ ان الزامات سے بری ہو گئے بلکہ آپ کی دعوت کا چرچا آس پاس کے علاقوں میں بھی ہونے لگا۔

اخوان کی غیر معمولی ترقی

بہت قلیل عرصے میں اسماعیلیہ کے آس پاس کے علاقوں میں دھڑا دھڑ اخوان کی شاخیں کھلنے لگیں۔ لڑکیوں اور بچیوں کے لئے مدرسہ امہات المؤمنین قائم کیا گیا اور ''الاخوات المسلمات'' کے شعبے کی تشکیل عمل میں لائی گئی۔

1933 میں حسن البنا نے اسماعیلیہ سے قاہرہ تبدیلی کروالی تاکہ اس مرکزی شہر کو اخوان کی دعوت و تحریک کا مرکز بنایا جائے۔ محض ایک برس کے اندر قاہرہ بھر میں اس کی شاخیں کھل گئیں اور تمام مصر میں پچاس سے زائد شہروں اور قصبوں میں اس کی دعوت پھیل گئی۔

1935 میں آپ نے سیاست میں براہ راست قدم رکھا اور حکومت کو اصلاحِ احوال کے لئے پے در پے خطوط لکھے۔ 1938 تک اخوان المسلمون کا کام اس قدر پھیل گیا کہ تمام عرب اس کی دعوت اور پیغام سے گونجنے لگا۔ مصری محقق شوقی زکی لکھتا ہے:

> ''1939 سے 1945 تک سیاسی لحاظ سے اخوان کی دعوت ایک نئے مرحلے میں داخل ہو گئی۔ اسکی سرگرمیوں اور پروگراموں میں غیر معمولی وسعت پیدا ہو گئی۔ اب اخوان کے اندر قاہرہ یونیورسٹی اور ازہر یونیورسٹی کے نوجوان جوق در جوق شامل ہونے لگے۔ مختلف پیشہ ور عناصر جن میں مزدور، تاجر، صنعت کار، کاروباری لوگ، انجینئرز، ڈاکٹرز، ٹیچرز

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور وکلاء حضرات شامل تھے اس جماعت سے وابستہ ہوگئے اور مصری معاشرے کے تمام گروہوں کی نمائندگی ہونے لگی۔ اخوان نے ایک طرف اقتصادی میدان میں بڑھ چڑھ کر سرگرمی دکھائی تو دوسری جانب اسکاؤٹنگ میں بھی حصہ لیا۔ اخوان کی شاخیں جو مصر میں پھیل چکی تھیں بڑے منظم طریقے سے ہر کام کو سرانجام دینے لگیں اور دیکھتے ہی دیکھتے اخوان ایسی طاقت بن گئے جسے اب نظرانداز نہیں کیا جاسکتا تھا''۔

اس دور میں اخوان کو ایسا عروج نصیب ہوا کہ صرف مصر میں اخوان کے فعال کارکنوں کی تعداد پانچ لاکھ تک پہنچ گئی جبکہ دوسرے عرب ممالک میں بھی ان کے مراکز کی اچھی خاصی تعداد ہوگئی۔ اس زمانے میں اخوان کے تحت نئی تجارتی فرمیں کھولی گئیں اور فوجی تربیت کے مراکز بنائے گئے۔

سیاست میں آمد اور آزمائشوں کا سلسلہ

اگر بات صرف درس وتدریس تک محدود ہوتی تو شاید حکومت اور بیرونی عناصر کو کوئی خطرہ نہ ہوتا لیکن اخوان معاشرے کے ہر پہلو کی اصلاح اسلامی طریقے پر کرنا چاہتے تھے اور اس کے لئے تمام جدید ذرائع بھی استعمال کر رہے تھے۔ مغرب اور اس کی کٹھ پتلی مصری حکومت کے لئے خطرے کی گھنٹیاں بجنی شروع ہوگئیں۔ برطانوی استعمار مصری حکومت پر زور دینے لگا کہ اخوان کی طاقت کو لگام دی جائے۔ چنانچہ پہلے مرحلے میں اخوان کے اخبارات اور رسائل پر پابندی لگائی گئی اور ان کا پریس ضبط کرلیا گیا۔ اس کے بعد اجتماعات پر پابندی لگائی گئی۔ اسی دوران وزارتوں کی تبدیلی عمل میں آئی اور نحاس پاشا کی وزارت نے اخوان کے ساتھ نسبتاً نرم رویہ اختیار کیا مگر اس کی حکومت کو برطرف کر دیا گیا۔ نئی حکومت نے اقتدار میں آتے ہی حسن البنا اور اخوان کے تمام عہدیداروں کو گرفتار کرلیا۔

رہا ہونے پر آپ نے انگریزوں کے خلاف جہاد کا اعلان کیا اور پورے ملک میں آزادی کی لہر دوڑا دی۔ دوسری طرف مسئلہ فلسطین کی سنگینی کو محسوس کرتے ہوئے اخوان نے فلسطینیوں کے حقوق کی پامالی کے خلاف زبردست احتجاج کیا، جلسے جلوس نکالے اور عرب ممالک سے مطالبہ کیا کہ فلسطین کے بچاؤ کے لئے جہاد کا راستہ اختیار کیا جائے۔ اس طرح کے ایک جلوس پر جس کی قیادت حسن البنا خود کر رہے تھے پولیس کی جانب سے فائرنگ کر دی گئی۔ لوگوں کو بچانے کے لئے آپ نے فوراً اپنے ہاتھ آگے کر دیئے۔ گولیاں آپ کے دونوں ہاتھوں پر لگیں جو خون آلود ہوگئے۔ اخوان میں اضطراب دوڑ گیا لیکن آپ کسی ردعمل کا اظہار کرنے کے بجائے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہی کہتے رہے کہ یہ تو معمولی سا زخم ہے۔معاملہ جلسے جلوسوں سے نکل کر عملی جدو جہد میں اس وقت داخل ہوا جب اخوان کے ہزاروں کارکن جہادِ فلسطین میں حصہ لینے کے لئے نکل کھڑے ہوئے اور دورانِ جہاد انہوں نے جواں مردی اور شجاعت کی داستانیں رقم کیں۔

شہادت

یہ تمام صورتحال دیکھتے ہوئے یہود ونصاریٰ اور اسلام مخالف قوتوں کو یقین ہو گیا کہ اگر اس تحریک اور اس کے سربراہ کو مزید موقع دیا گیا تو وہ عرب دنیا میں اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کو روک نہ سکیں گے اور ان کے ناپاک عزائم ہمیشہ کے لئے خاک میں مل جائیں گے۔

پورے مصر میں اخوان کے خلاف شدید آپریشن شروع کر دیا گیا۔جیلیں اخوان کے کارکنوں سے بھر دی گئیں اور مظالم کی خوفناک داستانیں رقم کی گئیں۔12 فروری 1949 کی شام کو شبان المسلمین کے مرکز کے سامنے قاہرہ کی سب سے بڑی سڑک پر گولی مار کر حسن البنا کو شہید کر دیا گیا۔مصر کے اسلام پسند عوام پر یہ خبر بجلی بن کر گری۔ان کا پیرومرشد محض ۴۳ برس کی عمر میں اللہ کی راہ میں اپنی جان دے بیٹھا تو انہیں یوں محسوس ہوا کہ گویا وہ یتیم ہو گئے ہیں۔

دو دہائیوں پر مشتمل دعوت کا یہ کام گویا صدیوں پر محیط تھا۔اس کے پیچھے اللہ کی خصوصی توفیق،حسن البنا کا جذبۂ عشق،شدید اخلاص،عزیمت کے راستے کا انتخاب اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات پر زبردست توکل تھا۔آپ کی شہادت کے واقعے پر مصر کے نامور عالمِ دین شیخ محمد غزالی نے ان الفاظ میں اظہار خیال کیا:

> ''قاتل کی گولی نے ایک ایسے جسم کو چیرا جسے خشوع وخضوع سے لبریز عبادت نے چکنا چور کر رکھا تھا۔جو طویل قیام اور طویل سجود کے سبب بے حد گھل چکا تھا۔جو راہِ خدا میں مسلسل سفر کرنے کی وجہ سے غبار آلود ہو چکا تھا۔جس کی پیشانی پے در پے دوروں کی وجہ سے خستگی کی غمازی کر رہی تھی''۔

کردار اور معاملات

بعض لوگ حیرت انگیز ہوتے ہیں۔وہ تنِ تنہا اتنا کام کر لیتے ہیں جتنا سینکڑوں لوگ بیسیوں سالوں میں بھی نہ کر سکیں۔اس کے باوجود اپنی نجی زندگی میں بھی وہ متوازن کردار کے مالک ہوتے ہیں۔حسن البنا بھی انہی میں سے ایک تھے۔آپ کے بھائی آپ کی شہادت کے بعد آپ پر ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

''اے میرے بھائی! میں نے تم سے بڑھ کر زندگی میں کثرت سے روزے رکھنے والا اور کثرت سے نمازیں پڑھنے والا نہیں دیکھا۔ تم سحری کے وقت بیدار ہو جاتے تھے اور قیام اللیل کرتے تھے۔ پھر مجھے نماز فجر کے لئے جگاتے اور نماز کے بعد میرے سامنے کاموں کی فہرست تلاوت کرتے۔ تم کہتے: ''پانچ سے چھ بجے صبح تک کا وقت قرآن کریم پڑھنے کا ہے۔ چھ سے سات تک تفسیر اور حدیث۔ سات سے آٹھ تک فقہ اور اصولِ فقہ'' یہ تو ہماری گھر کی تعلیم تھی۔ پھر ہم مکتب کی راہ لیتے۔ ہمارے والد ہمیں ترغیب دیتے تھے کہ ہم ان کی لائبریری کو دیکھا کریں۔ تم اس بارے میں گویا سبقت لے جاتے تھے۔ میں تمہارا ہمقدم بننے کی کوشش کرتا لیکن میں کہاں اور تم کہاں؟ تم غیر معمولی انسان تھے۔ میری اور تمہاری عمر کا فرق تو صرف دو سال تھا مگر مشیتِ الٰہی تم کو ایک عظیم کام کے لئے تیار کر رہی تھی''۔

دین کی دعوت دینا اور اس کو پھلتے پھولتے دیکھنا آپ کا ہمیشہ کا خواب تھا اور بچپن ہی سے اس کے لئے شدید تڑپ اور بے چینی کا اظہار کیا کرتے تھے۔ آپ کے بھائی عبدالرحمٰن البنا لکھتے ہیں: ''بچپن میں ایک روز میرے بھائی حسن البنا نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا: عبدالرحمٰن! کیا ہم دونوں نے اللہ کا یہ ارشاد سورۃ آل عمران میں حفظ نہیں کیا: ﴿ولتکن منکم امة یدعون الی الخیر ویأمرون بالمعروف وینھون عن المنکر﴾ (تم میں سے ایک گروہ ایسا ضرور ہونا چاہئے جو بھلائی کی دعوت دے۔ معروف کا حکم کرے اور منکر سے روکے) میں نے کہا ہاں! ہم نے یہ آیت حفظ کر رکھی ہے۔ میرے بھائی نے فوراً مجھے کہا: پھر اٹھو کوئی کام کریں۔ چنانچہ انہوں نے قصبے کے اندر ''جمعیت المنع المحرمات'' قائم کی۔ جس ہستی کی نوعمری میں یہ کیفیت تھی وہ عالمِ جوانی میں داخل ہو کر کب تک وسائل کی فراہمی اور حالات کی سازگاری کا انتظار کر سکتی تھی''؟

حسن البنا کی طبیعت میں انتہا درجے کی خاکساری تھی۔ مفتی اعظم فلسطین کہتے ہیں:

''مجھے یاد ہے کہ ایک دعوت میں میری ان کے ساتھ ملاقات ہوئی۔ اس دعوت کا اہتمام عرب لیگ کے سابق سیکرٹری جنرل عبدالرحمٰن عزام نے مرحوم قائداعظم محمد علی جناح کے اعزاز میں کیا تھا۔ قائداعظم کے ساتھ لیاقت علی خان مرحوم بھی تھے۔ صاحبِ دعوت کے گھر میں سب سے پہلے پہنچنے والوں میں میں اور حسن البنا تھے۔ ہم دونوں ان پاکستانی قائدین کے ساتھ دیر تک محوِ گفتگو رہے۔ اس کے بعد دیگر مدعوئین بھی یکے بعد دیگرے پہنچنا شروع ہو گئے۔ میں نے دیکھا جب کوئی نیا مہمان آتا تو حسن البنا اپنی نشست اس کے لئے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چھوڑ کر پیچھے ہو جاتے یہاں تک کہ وہ پیچھے ہوتے ہوتے دروازے کے پاس والی نشست تک جا پہنچے۔ جب مدعوئین کی تعداد پوری ہوگئی تو عبدالرحمٰن عزام نے حاضرین کو کھانے کے کمرے میں چلنے کی درخواست کی۔ شہید اپنی آخری نشست کی وجہ سے کھانے کے کمرے سے قریب تر تھے۔ عزام نے انہیں کمرے میں تشریف لے جانے کو کہا لیکن وہ دوسرے مہمانوں کو ترجیح دیتے رہے اور خود پیچھے ہٹتے رہے چنانچہ سب سے آخر میں جو شخص کھانے کے کمرے میں داخل ہوا وہ حسن البنا تھے''۔

تحریک میں غیر معمولی وسعت کے باوجود کبھی اپنے دفتر کے چوکیدار کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا لیتے، کبھی دفتر کے کلرکوں سے ان کا احوال دریافت کرتے۔ اپنی جماعت کے رفقاء میں سے ایک ایک کو خود سلام کرتے۔ نام لے لے کر ان کے بچوں کی خیریت دریافت کرتے، ان کے تعلیمی احوال کی خبر رکھتے بلکہ کاشتکار حضرات سے ان کے جانوروں کے بارے میں بھی پوچھ لیا کرتے۔

لوگوں کی غلطیاں معاف کر دیا کرتے۔ زمانہ طالبعلمی میں ایک ساتھی طالبعلم نے جذبہ رشک وحسد سے مغلوب ہو کر تیزاب کی شیشی آپ کے چہرے اور گردن پر پھینک کر اسے جھلسانے کی کوشش کی۔ خوش قسمتی سے آپ بچ گئے۔ بعد میں دوستوں کا اصرار بڑھنے لگا کہ پولیس کو رپورٹ کی جانی چاہئے۔ کہتے ہیں: ''میں نے بھی اس امر کا ارادہ کیا مگر میرے دل میں خیال آیا کہ میں بچ گیا ہوں اور خدا کے اس فضل پر اس کا جتنا بھی شکر کیا جائے کم ہے۔ اور شکر کی صرف یہی صورت ہے کہ حملہ آور کے ساتھ عفو ودرگزر کا سلوک کیا جائے''۔ بعد میں جب آپ تحریک کے سربراہ بن گئے تو ہر قسم کے لوگوں سے آپ کا واسطہ رہتا۔ خود آپ کے رفقاء سے غلطی ہو جاتی تو نہ صرف یہ کہ آپ اسے نظر انداز کر دیتے بلکہ اس طرح تصحیح فرماتے کہ دوسرے کی اصلاح بھی ہو جائے اور اس کو محسوس بھی نہ ہو کہ اس کی غلطی پر گرفت کی جا رہی ہے۔

آپ کے کردار کا ہر پہلو اتنا مضبوط تھا کہ دشمن اس کے سوا کچھ نہ کر سکے کہ آپ کی جان ہی لے لی۔ آپ کو سرکاری مناصب پیش کئے گئے جنہیں آپ نے ٹھکرا دیا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد انگریزوں نے آپ کو ہزاروں پاؤنڈ کی پیش کش کی لیکن آپ نے ضمیر اور ایمان کے سودے کی یہ پیشکش لانے والے کو گھر سے نکال دیا۔ آپ نے ملک کے اندر کثیر تعداد میں تجارتی کمپنیاں قائم کیں۔ ان کے معاملات درست رکھنے پر آپ کو سخت محنت کرنا پڑی۔ بارہا اخوان نے چاہا کہ آپ کوئی وظیفہ قبول کر لیں مگر آپ یہی کہتے رہے ''میں انسانوں سے نہیں اللہ سے اجر کا طالب ہوں''۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آپ کا طرزِ زندگی انتہائی سادہ تھا۔ سادہ لباس، معمولی کھانے اور کپڑے پر گذارا کرتے۔ آپ کو کرائے کا ایجنٹ کہنے والے، رشوت خوری کا الزام لگانے والے، کمپنیوں کے حصص میں اپنا حصہ لگانے کا الزام دھرنے والے اس وقت کچھ نہ کہہ سکے جب شہادت کے بعد معلوم ہوا کہ آپ کے پاس قاہرہ میں اپنا ذاتی مکان بھی نہ تھا بلکہ قدیم طرز کے محلے میں ایک بوسیدہ مکان میں قیام تھا جس کا کرایہ ایک پونڈ اور ۱۰ قرش ماہانہ تھا۔ آپ نے بچوں کے لئے جائیدادیں بنانے کی فکر میں زندگی نہیں گذاری۔ آپ کی آخری بیٹی تو اس روز پیدا ہوئی جس روز آپ کو شہید کر دیا گیا۔ اسی کی مناسبت سے اس کا نام ''استشہاد'' رکھا گیا۔ بعد کے دور میں آپ کے اکلوتے بیٹے کو تمام ملازمتوں سے محروم کر کے پچیس سال قید بامشقت کی سزا سنائی گئی۔

حسن البنا کی زندگی کی کہانی ختم ہوئی لیکن اخوان المسلمون پر ظلم کی داستان بہت طویل اور دردناک ہے۔ اخوان ایک زمانے تک آزمائشوں کی بھٹی میں جلتے رہے۔ ان آزمائشوں میں سے سونا بن کر نکلنے والوں میں سید قطب شہید، حسن الہضیبی اور زینب الغزالی نے بہت شہرت پائی۔

اے عشق مل سکیں گے نہ ہم جیسے سر پھرے
برسوں چراغ لے کے زمانہ اگر پھرے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سیدابوالاعلیٰ مودودیؒ

برِّصغیر میں عالمِ اسلام کی سب سے بڑی اسلامی انقلابی تحریک "جماعت اسلامی" کے بانی اور تجدیدِ دین کے لئے علمی وعملی خدمات سر انجام دینے والے رہنما

تعارف

آپ کا نام سید ابوالاعلیٰ مودودی تھا۔ سلسلہ نسب یہ ہے:

سید ابوالاعلیٰ مودودی بن سید احمد بن حسن بن سید حسن۔

آپ کا تعلق ساداتِ اہلِ بیت کی اس شاخ سے ہے جو چشت کے مقام پر آباد ہوئی۔ ان میں ہی صوفیاء کا مشہور سلسلہ چشتیہ جاری ہوا۔ ۳۹ویں پشت پر آپ کا نسب امام حسینؓ سے جاملتا ہے۔

آپ کا تعلق ایک ایسے خاندان سے تھا جس میں تیرہ سو برس سے سلسلۂ ہدایت وارشاد جاری تھا۔ آپ کے دادا سید حسن بھی دینداری کا یہی رنگ لئے ہوئے تھے۔ چنانچہ جب آپ کے والد احمد حسن کو سرسید نے قرابت داری کی بناء پر علی گڑھ کے ابتدائی زمانے میں یونیورسٹی میں داخل کیا تو انہیں ناگوار گذرا۔ مگر وہ سرسید کے خیال سے خاموش رہے۔ ایک بار ان کے کوئی عزیز علی گڑھ تشریف لے گئے تو اتفاقاً ان کی نظر آپ کے والد پر پڑی۔ یہ دیکھ کر انہیں سخت رنج ہوا کہ پیرِ طریقت کا لڑکا انگریزی لباس پہنے انگریزی طرز کا کھیل کھیل رہا ہے۔ آپ کے دادا سے ملاقات کے وقت کہنے لگے: ''بھائی صاحب احمد حسن سے تو ہاتھ دھولیجئے۔ میں نے اس کو علی گڑھ میں دیکھا کہ کافر کرتی پہنے گیند اور بلا کھیل رہا تھا''۔ یہ سنتے ہی آپ کے دادا کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ فوراً آپ کے والد احمد حسن کو علی گڑھ سے الٰہ آباد بلوالیا جہاں انہوں نے وکالت کی تعلیم حاصل کی۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد وقتاً فوقتاً ہندوستان کے مختلف شہروں میں وکالت کی۔ یہاں تک کہ اورنگ آباد میں مقیم ہوئے۔ اس زمانے تک انگریزی خیالات اور طرزِ معاشرت کا ان پر غلبہ تھا۔ یہاں ان کی ملاقات اکثر اپنے رشتے کے چچا مولوی محی الدین سے رہنے لگی۔ ان کی پاکیزہ صحبت نے ایسا اثر دکھایا کہ مذہب کی دبی ہوئی چنگاری بھڑک اٹھی اور ذکرو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شغل، ریاضت و مجاہدات میں ڈوب گئے۔ وکالت کا سلسلہ بھی ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ گو اس کا چلانا اب بار لگنے لگا تھا۔

ولادت

ابوالاعلیٰ کی پیدائش ۳ رجب ۱۳۲۱ ہجری بمطابق ۲۵ ستمبر ۱۹۰۳ء کو اورنگ آباد میں ہوئی۔ آپ کی پیدائش سے تین سال پہلے ایک بزرگ آپ کے والد کے پاس آئے تھے، انہوں نے آپ کی پیدائش کی پیشگوئی کی تھی اور والد صاحب سے فرمایا تھا کہ اس کا نام ابوالاعلیٰ رکھنا۔ اس نام کے ایک بزرگ پہلے بھی آپ کے خاندان میں گذر چکے تھے اور ان ہی کی ذات سے ہندوستان میں آپ کے خاندان کا سلسلہ شروع ہوا۔ آپ کے والد نے بزرگ کا مشورہ یاد رکھا اور آپ کی پیدائش پر آپ کو یہی نام دیا گیا۔

بچپن

آپ کا بچپن ریاست حیدرآباد دکن کے مشہور شہر اورنگ آباد میں گذرا۔ ابھی آپ ایک سال کے تھے کہ آپ کے والد نے دنیا ترک کر دی اور تین سال تک مکمل درویشانہ زندگی گزاری۔ مولوی محی الدین نے اس موقع پر نصیحت کی کہ رجوع الی اللہ کے لئے ترک دنیا لازم نہیں ہے، صرف یہ کوشش کرو کہ جو کچھ کماؤ جائز طریقے سے کماؤ۔ اس کے بعد گو انہوں نے پھر دنیا کی طرف رجوع کیا، مگر اس دنیا کی طرف نہیں جسے چھوڑا تھا بلکہ ایک خالص مذہبی دنیا کی طرف۔ ان کی زندگی کے اس انقلاب کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابوالاعلیٰ نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ والد اور والدہ دونوں کی طرف مکمل مذہبی رنگ لئے ہوئے تھا۔

آپ کے والد نے آپ کی تربیت بڑے اچھے انداز میں کی۔ وہ آپ کی عادات، اخلاق اور زبان کا خاص خیال رکھتے۔ خود بھی شرفاء کی نہایت ستھری زبان بولتے اور اپنی اولاد کے لئے بھی اس کا خاص اہتمام کرتے کہ زبان پر ناشائستہ اور بازاری الفاظ نہ آنے پائیں۔ رات کے وقت وہ آپ کو پیغمبروں کے قصے، تاریخ اسلام اور ہندوستان کے سبق آموز واقعات اور کہانیاں سنایا کرتے تھے۔ اخلاق کی درستی کے لئے کبھی آپ کو ایسے بچوں سے کھیلنے نہ دیا جن کی عادتیں بگڑی ہوئی ہوں۔ جیسے ہی وہ کوئی بری عادت محسوس کرتے اس وقت اسے چھڑانے کی کوشش کرتے۔ ایک بار آپ نے ملازم کے بچے کو مارا تو انہوں نے اس بچے کو بلا کر کہا ''تو بھی اسے مار۔'' آپ کہتے ہیں ''اس سے مجھے ایسا سبق ملا کہ پھر زندگی بھر میرا ہاتھ کبھی زیردست پر نہیں اٹھا''۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تعلیم

آپ کے والد کو آپ کی تعلیم کے ساتھ اخلاق کی اصلاح کا خیال بھی دامن گیر تھا۔ لہٰذا نو سال تک انہوں نے آپ کی ابتدائی تعلیم کا بندوبست گھر پر کیا تاکہ آپ کی تربیت خالص اپنی نگرانی میں کرسکیں۔ اساتذہ کرام آپ کو عربی زبان، فقہ اور حدیث کی تعلیم دینے آیا کرتے۔ آپ خود لکھتے ہیں: ''گھر کی یہ تعلیم میرے لئے مدرسے کی تعلیم سے زیادہ مفید ثابت ہوئی۔''

پڑھنے کے علاوہ جو وقت بچتا اس میں سے بیشتر وقت آپ ان کے ساتھ رہتے۔ وہ آپ کو اپنے احباب میں لے جاتے جو سب سنجیدہ اور شائستہ لوگ تھے۔ ان کی صحبت میں بیٹھنے کی وجہ سے چھوٹی عمر میں ہی آپ اچھی عادات اور مہذب طور طریقے سیکھ گئے۔ خود فرماتے ہیں۔ ''میں بڑی بڑی باتوں کو سمجھنے لگا۔ میری طبیعت میں جتنی شوخی تھی والد کی تربیت کی وجہ سے وہ شرارتوں اور دنگے فساد کے بجائے ظرافت میں ڈھل گئی''۔

نو سال کی عمر میں مدرسہ فوقانیہ میں داخل کرادیا گیا۔ چھ ماہ تک مڈل (آٹھویں جماعت) کی تعلیم حاصل کی اور امتحان میں شریک ہوگئے مگر ریاضی کے مضمون میں دلچسپی نہ ہونے اور اس کی برائے نام شدبد ہونے کی وجہ سے کامیاب نہ ہوسکے۔ صدر مدرّس آپ کے اندر کے چھپے ہوئے جوہر کو پہچان گئے تھے۔ انہوں نے ناکامی کے باوجود جماعت مولوی (میٹرک) میں داخل کرلیا۔

پہلی بار آپ جدید علوم سے روشناس ہوئے۔ مختلف اساتذہ کے اثر سے خیالات میں تحریک پیدا ہوئی اور بقول آپ کے مدرسے کے طلباء کے ساتھ میل جول کی وجہ سے طبیعت کی رکھائی بھی دور ہوگئی۔ اب مدرسے میں مزہ آنے لگا۔ مدرسے کی شریف ٹولی سے دوستانہ تعلقات پیدا ہوئے لیکن ساتھ ہی ساتھ شریر ٹولی کے دو تین سرغنوں کو دوست بنالیا۔ فرماتے ہیں

> ''میں ان کی شرارتوں میں شریک نہیں ہوتا، مگر مذاق اور لطیفہ گوئی کی وجہ سے میں نے ان کو رام کرلیا تھا۔ اس طرح میں شریف ٹولی کا بھی دوست رہا اور شریر ٹولی سے بھی تعلقات نہیں بگڑے۔''

مدرسے ہی میں پہلی بار آپ کو مضامین لکھنے اور تقریری مباحثوں میں حصہ لینے کا موقع ملا۔ ۱۹۱۴ء میں آپ نے مولوی (میٹرک) کا امتحان ریاضی میں کمزور ہونے کی وجہ سے درجہ دوم میں پاس کیا۔ اب ترقی پاکر مولوی عالم میں شریک ہوگئے۔ اس دوران آپ کے والد صحت کی خرابی کی بناء پر آپ کو حیدرآباد چھوڑ کر خود بھوپال

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تشریف لے گئے۔ نئے تعلیمی درجے کے چھ ماہ ہی گذرے تھے کہ اطلاع ملی کہ والد پر فالج کا سخت حملہ ہوا ہے۔

عملی زندگی اور میدانِ صحافت

حیدرآباد سے بھوپال جاکر والد کی خدمت میں لگ گئے، لیکن ڈیڑھ دو سال کے عرصے میں ان کی صحت بحال ہونے کے بجائے مزید خراب ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ بحالی صحت کی تمام امیدیں ختم ہوگئیں۔ اس عرصے میں معاشی استحکام کے لئے جدوجہد اور اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کی ضرورت محسوس ہوئی تو آپ نے دفتری ملازمت کے بجائے قلم کو وسیلۂ معاش بنانے کا فیصلہ کیا۔

آپ ابھی پندرہ سال کے تھے کہ بڑے بھائی سید ابوالخیر مودودی نے اخبار نویسی کے میدان میں قدم رکھا اور اخبار ''مدینہ'' کے ایڈیٹر مقرر ہوئے تو انہوں نے آپ کو بھی اس کام میں شریک کرلیا۔ مگر معاملہ زیادہ دن چل نہ سکا۔ اس کے بعد پہلے ہفتہ وار اور پھر روزانہ نکلنے والے اخبار ''تاج'' کی ایڈیٹری کی۔ اس اخبار کو تنہا آپ چلاتے تھے جبکہ اس وقت آپ کی عمر محض سترہ سال تھی۔ یہی وہ زمانہ ہے جب آپ کے والد محترم کا سایہ آپ کے سر سے اٹھ گیا۔

اخبار نویسی کے ساتھ ساتھ آپ تحریکِ خلافت میں بھی بھرپور طور سے شریک ہوئے اور انجمن اعانتِ نظر بنداں کے لئے کام شروع کیا۔ پھر جبلپور کے قیام کے دوران مسلمانوں کی طرف سے بولنے اور ان کا موقف بیان کرنے کے لئے آپ ہی کو تقاریر بھی کرنا ہوتی تھیں۔ اسی زمانے میں آپ کے ایک مضمون پر حکومت نے گرفت کی۔ اخبار کے پرنٹر پر مقدمہ چلنے کی وجہ سے آپ بچ گئے مگر آپ کو اس بچنے کی کوئی خوشی نہ تھی۔ لکھتے ہیں ''آئندہ کے لئے میں نے عہد کرلیا کہ دوسروں کی ذمہ داری پر اخبار نویسی نہ کروں گا بلکہ اپنی ہر جنبشِ قلم کی ذمہ داری خود اپنے سر لوں گا۔''

انگریزی کی تعلیم اور دیگر علوم کا حصول

۱۹۱۶ء سے ۱۹۲۱ء تک کا زمانہ آپ کے لئے سخت مصائب اور خانہ بدوشی کا زمانہ تھا۔ تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوچکا تھا۔ اس موقع پر آپ کے کیا احساسات تھے، خود تحریر فرماتے ہیں۔ ''گو مجھے اپنی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوجانے کا افسوس تھا مگر میں ان نقصانات کی تلافی کرنے پر قادر نہ تھا۔''

باضابطہ (Formal) تعلیم کا حصول تو اب ممکن نظر نہ آتا تھا، لیکن اخبار نویسی کی ضرورت نے آپ کو انگریزی پڑھنے پر مجبور کیا۔ چار پانچ ماہ تک ایک استاد سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ نے خود انگریزی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اخبارات، رسائل اور کتابوں کا مطالعہ کیا۔ آپ کہتے ہیں:

''اول اول تو میری سمجھ میں کچھ نہ آتا مگر اس کے باوجود میں ہر قسم اور ہر موضوع کی سہل اور مشکل عبارتیں پڑھے جاتا تھا۔ آہستہ آہستہ ان کی لغت، استعمال اور مختلف اسالیب بیان میرے ذہن نشین ہوتے چلے گئے اور میں نے اتنی استعداد بہم پہنچائی کہ انگریزی زبان میں تاریخ، فلسفہ، سیاسیات، معاشیات، مذاہب اور عمرانیات کا مطالعہ کر سکا اور کبھی مجھے علمی مضامین کے سمجھنے میں دقت پیش نہ آئی۔''

۱۹۲۱ء میں جمعیت علمائے ہند کے اخبار ''مسلم'' کے ایڈیٹر مقرر ہوئے تو دہلی میں پھر تکمیلِ تعلیم کی طرف توجہ کی اور اخبار نویسی سے جو وقت بچتا اسے مختلف اساتذہ سے عربی، ادب، تفسیر، حدیث، منطق اور فلسفے کی کتابیں پڑھنے میں صرف کرتے۔ اس طرح ہر فن پر دسترس حاصل کرنے کا موقع ملا۔

۱۹۲۴ء میں جمعیت علمائے ہند نے ''الجمعیۃ'' کے نام سے سہ روزہ نکالا تو آپ کو اس کی ایڈیٹری کے لئے منتخب کیا۔ قومی اور ملی مسائل پر تحریر و تقریر کا سلسلہ جاری تھا کہ ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس نے آپ کی زندگی کے رخ کو متعین کر دیا۔

اللہ کا بندہ...... اللہ کے دین کا نگہبان

۱۹۲۶ء کے اواخر میں آریہ سماج کے لیڈر سوامی شردھانند کو نبی اکرم ﷺ کی ذات پر ناروا حملے کرنے کی جسارت میں عبدالرشید نامی مسلمان نے جوش میں آ کر قتل کر دیا۔ اس کے بعد ایک ہنگامہ خیز مقدمہ شروع ہوا۔ اس واقعے پر ہندو اخبارات و رسائل نے ملک گیر طوفان کھڑا کر دیا۔ انہوں نے ہر طور یہ ثابت کرنا چاہا کہ اسلام دلیل کے بجائے تلوار کا مذہب ہے۔ یہ بھی کہا گیا کہ جب تک دنیا میں قرآن کی تعلیم موجود ہے امن قائم نہیں ہو سکتا۔ گاندھی جی نے اپنا حصہ ڈالتے ہوئے کہا کہ اسلام میں فیصلہ کن چیز پہلے بھی تلوار تھی اور اب بھی تلوار ہے۔ اس پروپیگنڈے کے طوفان میں مسلمانوں کے قائد مولانا محمد علی جوہر نے جمعے کے خطبے میں عوام کے جم غفیر سے خطاب کرتے ہوئے رندھی ہوئی آواز میں کہا ''کاش کوئی اللہ کا بندہ ہندوؤں کے ان الزامات کے جواب میں اسلام کا صحیح نقطۂ نظر پیش کرتا۔'' ہزاروں مسلمانوں کے اس اجتماع میں نوجوان مودودی نے مولانا جوہر کی بات گرہ میں باندھ لی اور ان کی اس پکار پر لبیک کہنے کا پکا ارادہ کر لیا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

الجہاد فی الاسلام

اس ارادے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے سید صاحب نے پہلے جہاد اور فنِ حرب کے بارے میں اردو، عربی اور انگریزی میں جتنی معتبر کتابیں میسر آسکیں انہیں جمع کیا، پھر دورِ جدید میں جنگوں کے بارے میں مواد اکٹھا کیا۔ مختلف مذاہب کے نقطۂ نظر اور ان کی تاریخ پر تحقیق کے بعد الجمعیہ میں ''الجہاد فی الاسلام'' کے عنوان سے ایک سلسلۂ مقالات شروع کیا۔ اس میں مختلف مذاہب، ان کی تاریخ اور فنِ حرب پر بہترین پس منظر بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اسلام کا نظریۂ جہاد تفصیل سے پیش کیا۔ آپ نے وضاحت سے بتایا کہ اسلام میں انسان کی جان قابلِ احترام ہے اور اسے ناحق قتل نہیں کیا جاسکتا۔ قیامت کے دن انسانوں کے درمیان سب سے پہلا مقدمہ خون کے دعویٰ سے متعلق پیش کیا جائے گا۔ لیکن اسلام نے حق کے ساتھ قتل کی تائید بھی کی ہے۔ ہر وہ فرد یا گروہ جو زمین میں فتنہ وفساد پھیلائے اور لوگوں کے مال اور جان سے تعرض کرے اس سے جنگ جائز ہی نہیں بلکہ فرض ہے۔ یہ سراسر انسانیت کی خدمت ہے کہ ان فتنہ پروروں سے اللہ کے بندوں کو نجات دلائی جائے۔ ابتداء میں ان مقالات کو چند اقساط تک محدود رکھنے کا ارادہ تھا۔ مگر موضوع کی اہمیت اور حساسیت کی بناء پر ۲۹ اقساط میں شائع ہوا اور آخر کار اسے ایک مستقل تصنیف ''الجہاد فی الاسلام'' کی شکل دے دی گئی۔

راہِ حق کا پہلا سنگِ میل ...... ترجمان القرآن

یہی کتاب مولانا کی تجدیدِ افکار کی کوششوں اور تحریکِ اسلامی کا نقطہ آغاز بنی۔ خود لکھتے ہیں:

> ''اس کتاب نے سب سے زیادہ فائدہ خود مجھے پہنچایا ہے۔ میں نے جب اس کتاب کے لکھنے کا ارادہ کیا تھا تو میرے اندر دینی حمیت سے زیادہ قومی حمیت کا جذبہ کام کررہا تھا۔ لیکن تالیف وتحقیق کے دوران میں جب مجھے ایک ترتیب کے ساتھ اسلام کے اساسی نظریات اور اس کے تفصیلی احکامات کا غور سے مطالعہ کرنے کا موقع ملا تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مجھ میں نہ صرف نظامِ شریعت کا فہم اور اس کی حقانیت کا غیر متزلزل یقین ابھر آیا بلکہ اس نظام کے احیاء کا ولولہ بھی مجھ میں پیدا ہوا اور اس کے لئے کام کرنے کا طریقہ بھی میری سمجھ میں آگیا اور یہ طے کیا کہ صحافت کی دنیا میں اگر آئندہ قدم رکھوں گا تو صرف اس شرط پر کہ اسے دینِ حق کی خدمت کا ذریعہ بناؤں۔''

دورانِ مطالعہ مولانا پر اس حقیقت کا انکشاف بھی ہوا کہ اسلام محض مذہب نہیں بلکہ ایک نظریۂ حیات ہے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور نہ صرف فرد اور معاشرے کی اصلاح سے متعلق واضح اصول رکھتا ہے بلکہ ان کے نفاذ کا مطالبہ بھی کرتا ہے۔ اسلام یہ کام صالح اور دینی تربیت یافتہ افراد سے لینا چاہتا ہے۔تا کہ " لیظهره علی الدین کله" (تا کہ اسلام ہی دنیا کے تمام دوسرے نظام ہائے حیات پر غالب آئے)۔

سید صاحب کو اس مشن کی اہمیت اور وسعت وعظمت کا اندازہ ہوا تو آپ کو احساس ہوا کہ اس نصب العین کو عام کرنے کی سخت ضرورت ہے جس سے مسلمان عمومی طور پر ناواقف ہیں۔ لہٰذا شاہ ولی اللہ کی دعوت اسلامی کے ٹھیک دوسو سال اور سید احمد شہید کی احیائے اسلام کی معرکہ انگیز تحریک کے سو سال بعد احیائے اسلام کی کوششوں کی طرف پہلا قدم اٹھاتے ہوئے سید صاحب نے ۱۹۳۳ء میں ماہنامہ ''ترجمان القرآن'' کا اجراء کیا۔

مسلمان تاریخ کے دو عبقری ایک مشن کے تحت یکجا

جہاد کے موضوع پر عالمانہ حیثیت کے ان بلند پایہ مقالات نے مسلمانوں میں دھوم مچا دی۔ مسلمان رہنماؤں نے اس تحریر کے پیچھے چھپے ہوئے نوجوان کی صلاحیت کو پہچان لیا۔ اسی کتاب کے ذریعے آپ کا تعارف علامہ اقبال سے ہوا۔ وہ اسے پڑھ کر اتنا متاثر ہوئے کہ فرمایا:

''یہ کتاب اسلام کے نظریۂ جہاد اور اس کے قانون صلح و جنگ پر ایک بہترین تصنیف ہے۔ میں ہر ذی علم کو مشورہ دیتا ہوں کہ وہ اس کا مطالعہ کرے۔''

زندگی کے آخری سالوں میں علامہ اقبال جن مختلف رسائل واخبارات کو پڑھوا کر سنا کرتے تھے ان میں سید صاحب کا ترجمان القرآن بھی تھا۔ لوگوں نے مولانا مودودی کے متعلق علامہ کا یہ جملہ بھی سنا کہ ''یہ مولوی رسول اللہ ﷺ کے قلم سے ان کے دین کو پیش کر رہا ہے۔''

یہ وہی زمانہ ہے جب شمالی پنجاب کے ضلع گورداسپور کے چودھری نذیر نے دینی وقومی جذبے سے معمور ہو کر اپنی کچھ زمین خالصتاً للّٰہی مقصد کے لئے وقف کرنے کا فیصلہ کیا اور اس پر عمارات بنانی شروع کیں۔ مگر وہ ابھی تک یہ فیصلہ نہ کر پائے تھے کہ یہ ادارہ کس قسم کا ہونا چاہئے۔ انہوں نے بیک وقت علامہ اقبال اور سید صاحب سے مشورہ مانگا۔ ان دونوں سے ان کے مراسم بھی تھے۔ مودودی صاحب نے جواباً ایک مثالی بستی بسانے کی تجویز بھیجی جہاں اسلام کی ظاہریت وروحانیت دونوں کا بھرپور مظاہرہ ہو سکے اور وہاں کے باشندوں کی پاکیزہ زندگی اور ماحول کا ایسا صحیح اور بہترین نقشہ دنیا کے سامنے پیش کیا جائے کہ لوگ کشاں کشاں اسلامی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نظام کی طرف لپکیں۔اس کے ساتھ ہی اس کا تفصیلی خاکہ ترجمان میں شائع بھی کر دیا گیا۔

دوسری طرف علامہ اقبال نے بھی فقہ اسلامی کی تدوین اور افراد کار کی تیاری کا مشورہ چوہدری نذیر کو دیا۔ چوہدری صاحب نے اس کام کے لئے علامہ کے سامنے مولانا مودودی کا نام پیش کیا۔ چنانچہ علامہ اقبال کی مرضی سے چودھری صاحب نے مولانا کو پنجاب آنے اور ایک مثالی بستی بسانے کی تجویز دی۔

مولانا تو پہلے ہی مشکلات اور لوگوں کی عدم توجہی کی بناء پر ترجمان کے دوسرے سال کے آغاز میں اداریئے میں یہ لکھنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ ''مسلسل کئی مہینے تک جو مشکلات مجھے پیش آتی رہی ہیں ان سے یقیناً میرے حوصلے پست ہو جاتے، اگر میرا اعتماد خدا کے بجائے دینوی اسباب اور خود اپنی قوت پر ہوتا۔'' چنانچہ علامہ کی دعوت پر جب آپ پہلی مرتبہ پنجاب آئے تو ذہن میں بہت سے خدشات تھے جو وہاں کی صحافت اور سیاست میں جوش، نعرہ بازی اور مذہبی مناظرہ انگیزی دیکھ کر پیدا ہوئے تھے۔

ستمبر ۳۷ء میں جاوید منزل لاہور میں حکیم الامت علامہ اقبال اور مولانا مودودی کے درمیان ملاقات ہوئی جس میں امت کے حالات کا جائزہ لیا گیا اور آئندہ کے لائحہ عمل کے حوالے سے گفتگو ہوئی۔ ان ملاقاتوں کے حوالے سے مولانا تحریر کرتے ہیں کہ:

> ''علامہ سے ان دو تین ملاقاتوں کے بعد ایسا محسوس ہوا کہ جیسے میری اور ان کی بہت پرانی واقفیت ہے اور ہم ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں۔ میرے اور ان کے درمیان یہ بات طے ہوگئی کہ میں پنجاب منتقل ہو جاؤں اور پٹھان کوٹ کے قریب اس وقف کی عمارت میں جس کا نام ہم نے بالاتفاق ''دارالاسلام'' تجویز کیا تھا، ایک ادارہ قائم کروں، جہاں دینی تحقیقات اور تربیت کا کام کیا جائے''۔

علامہ نے اس موقع پر مولانا مودودی سے یہ بھی وعدہ کیا کہ وہ ہر سال چند ماہ وہاں آ کر قیام کریں گے۔ مولانا کی حیدرآباد سے پٹھان کوٹ ہجرت کے ایک ماہ بعد ہی اپریل ۳۸ء میں حکیم الامت علامہ اقبال احیائے دین کا علَم مولانا کے ہاتھ میں پکڑا کر اس دارِفانی سے رحلت فرما گئے۔

اس موقع پر مولانا کے دل کی کیفیت کیا تھی، آپ خود بیان کرتے ہیں۔ ''سب سے بڑا امادی سہارا جس سے مدد کی توقع تھی اقبال کا سہارا تھا سو وہ بھی چھن گیا۔''

دارالاسلام کے ابتدائی ایام مولانا کے نظریات کے عملی مظاہرے کا امتحان تھے۔ اپنا سب کچھ چھوڑ کر مولانا کی دعوت پر لبیک کہہ کر اس بستی میں آباد ہونے والے لوگ اس جگہ کی نورانی فضا اور تربیت کے اس ابتدائی دور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کو کبھی نہ بھلا سکے اور آئندہ آنے والے وقتوں میں مولانا کے دستِ راست ثابت ہوئے۔ اس کے بعد چند وجوہات کی بناء پر مولانا کو لاہور منتقل ہونا پڑا۔ اگلے دس سالوں میں مولانا نے زبردست نظریاتی جدوجہد کے ساتھ ساتھ عملی کوششوں کا آغاز جماعتِ اسلامی کی بنیاد رکھ کر کیا۔

تجدیدِ دین کے لئے نظریاتی جدوجہد

اس موقع پر مناسب ہوگا کہ اس وقت کے عالمی اور خصوصاً برصغیر کے حالات کا پس منظر مختصراً بیان کر دیا جائے۔

انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں عالمِ اسلام انگریزوں کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ صدیوں کے جمود اور انحطاط کی بناء پر ہر لمحے بدلتی دنیا اور اس کی ترقی کی رفتار کا مقابلہ کرنے سے مسلم دنیا قاصر تھی۔ ان حالات میں مسلمان واضح طور پر دو گروہوں میں بٹے نظر آتے ہیں۔ ایک وہ جنہوں نے دوسرے مذاہب کے پیروکاروں کی طرح اسلام کو صرف عبادات تک محدود کر کے مغربیت کو پورا پورا تسلیم کر لیا تھا۔ دوسرے وہ جنہوں نے مغرب کے برے اثرات سے خوف کھا کر جدید ترقی کے ہر راستے کو اپنے اوپر بند کر لیا تھا اور یوں وہ دنیا کا مقابلہ کرنے، اس کو سمجھنے اور اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے سے قاصر تھے۔ جدید علوم سے ناواقفیت نے انہیں دنیا کی نظروں میں غیر معتبر ٹھہرا دیا تھا۔

اس وقت سب سے بڑی ضرورت اس امر کی تھی کہ موجودہ حالات کے مقابلے کے لئے کوئی ایسا شخص اٹھے جو برسوں سے طاری اس جمود کو توڑے۔ حالات حاضرہ کی مکمل آگہی کے ساتھ مختلف مذاہب اور ان کی تاریخ نیز سائنسی علوم اور مختلف فلسفوں اور نظام ہائے حیات کو سمجھتا ہو اور ان سب کی خامیوں کی نشاندہی کر کے ان پر اسلام کی برتری کو ثابت کر سکے۔ پھر نہ صرف یہ کہ اسلام کی علمی اور اخلاقی برتری کو ثابت کرے بلکہ اس کے عملی دنیا میں قابلِ عمل ہونے کے ثبوت بھی پیش کرے اور ان راستوں کی نشاندہی بھی کر سکے جن پر چل کر مسلم امت پہلے اپنی اصلاح کرے اور پھر امامت کے اس فریضے کو ادا کر سکے جس کو چھوڑنے کی وجہ سے صدیوں سے ذلت اور پستی ان پر دے ماری گئی تھی۔ علامہ اقبال اس سلسلے میں ایک بہترین کوشش اپنے اشعار کے ذریعے کر چکے تھے اور اسی پیغام کی گرمی نے مولانا مودودی کے کام کے لئے میدان ہموار کرنے کا ابتدائی کام بھی کیا تھا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایک طرف تنہا سید مودودیؒ......دوسری طرف تاریخ کے سارے فتنے یکجا (۱)

مولانا کے نصف صدی پر محیط فکری کام اور اس سلسلے میں پیش آنے والی رکاوٹوں کا تذکرہ بذاتِ خود ایک مستقل کتاب کا موضوع ہوسکتا ہے۔ یہاں ہم جامع انداز میں صرف اس کی ایک ہلکی سی جھلک دکھانے پر اکتفا کریں گے۔

مولانا مودودیؒ نے رائج الوقت نظریات، عقائد، اخلاقیات، قوانین، سیاسیات، معاشیات، معاشرت، تمدن، تاریخ اور فلسفۂ تاریخ، تعلیم اور نظامِ تعلیم، کلچر، ادب و آرٹ، فقہ اور قضاء کا بھرپور تنقیدی جائزہ لیا۔ اس سلسلے میں ان کے مدِ مقابل دنیا کے تمام نظام ہائے حیات آئے۔ انہوں نے سرمایہ داری، اشتراکیت، تھیاکریسی، سیکولر ڈیماکریسی، نیشنلزم (وطن پرستی) اور لادین سائنسدانوں اور فلاسفروں کی علمی کاوشوں سب کا بے لاگ تجزیہ کیا اور اس کے مقابلے میں خالصتاً قرآن، حدیث اور صحابہ کرام کے عمل سے جدید دنیا کے سوالات کا تشفی بخش جواب دیا۔ اسی کوشش کے نتیجے میں آپ کی کتابوں سود، مسئلہ قومیت، تحریکِ آزادی ہند، مسئلہ جبر و قدر، اسلامی تہذیب کے اصول و مبادی، پردہ، تفہیمات، تنقیحات، حقوق الزوجین، اسلام اور ضبطِ ولادت، دینیات، مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش، قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں، اسلام اور جاہلیت، نیا نظامِ تعلیم، انسان کا معاشی مسئلہ، سلامتی کا راستہ، مرتد کی سزا، اسلام کا اخلاقی نقطہ نظر، شہادتِ حق اور بناؤ بگاڑ نے بے حد مقبولیت حاصل کی۔

روایت پرستی کے خلاف جہاد

بات اگر صرف اتنی ہوتی کہ مقابلہ غیر مذاہب اور بیرونی دنیا سے ہوتا تو مولانا یکسوئی سے اس کام کو کرتے لیکن ان کا پیہم مقابلہ روایت پرست اور جمود کے شکار مسلمانوں سے بھی تھا۔ آپ کے قلم کی زد میں اپنے بھی اسی طرح سے آئے جس طرح اغیار آئے تھے۔ یہاں ہم مولانا کا نقطۂ نظر سمجھنے کے لئے خود آپ کے الفاظ کا سہارا لیتے ہیں۔ آپ اسلامی دنیا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں

> ''یہ دنیا کوئی اور دنیا ہے جس سے میری فطرت مانوس نہیں۔ جو کچھ یہاں ہو رہا ہے اور جن نظریات، جن جذبات، جن اغراض و مقاصد اور جن اصولوں کی بنیاد پر ہو رہا ہے سب

(۱) مولانا مودودیؒ پر ممتاز صحافی صلاح الدین شہیدؒ کے ایک معرکۃ الآراء مضمون کا عنوان۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے خلاف بغاوت کا علم بلند کرنے پر مجبور ہوں۔ میں اس کے اجزاء میں سے بعض کا باغی اور بعض کا حامی نہیں ہوں، بلکہ کُل کا باغی ہوں۔ میں ترمیم کا خواہشمند نہیں ہوں بلکہ موجودہ زندگی کی پوری عمارت کو توڑ ڈالنا چاہتا ہوں اور اس کی جگہ خالص اسلامی اصولوں پر دوسری عمارت بنانے کا خواہاں ہوں۔ اس کلی و ہمہ گیر بغاوت میں کوئی مجھے اپنا ساتھی نہیں ملتا۔ ہر طرف مجھے جزوی باغی ہی ملتے ہیں جو اس بت خانے کے کسی نہ کسی بت سے لَو لگائے بیٹھے ہیں۔ ہر ایک کا مطالبہ یہ ہے کہ سب بتوں کو توڑ دو مگر میرے بت کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھنا۔ ایسی حالت میں ناگریز ہے کہ جزوی باغی کسی نہ کسی مرحلے پر مجھ سے الگ ہو جائیں۔ میرا ساتھ صرف کلی باغی ہی دے سکتے ہیں اور وہ کم یاب ہیں۔ جب تک وہ نہیں ملیں اپنے محدود وسائل اور اپنی محدود طاقت سے محدود پیمانے پر میں تنہا جو کچھ کر سکتا ہوں وہی کرتا رہوں گا۔''

اسلام - مذہب یا دین؟

مولانا کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے ثابت کیا کہ اسلام آج کے دور میں بھی اسی طرح بہ تمام وکمال قابلِ عمل ہے، جیسے صدیوں پہلے تھا۔ اس پر روشنی ڈالتے ہوئے آپ بتاتے ہیں کہ پوری کائنات، اس کے اجزاء اور اس میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات میں ایک ربط ہے اور وہ ایک ہی حقیقت سے وابستہ ہیں جو خدا تعالیٰ کی ذات ہے۔ اس کائنات میں ہونے والی ہر تبدیلی میں کمال کا توازن ہے جو خدا تعالیٰ کی ان مصلحتوں کو ظاہر کرتا ہے۔ جن کے تحت وہ اپنی عظیم الشان سلطنت چلا رہا ہے۔ جس طرح پوری کائنات ایک ہی حقیقت سے وابستہ ہے اسی طرح اس میں موجود انسانی زندگی بھی ایک کُل ہے۔ اس کو مختلف خانوں میں بانٹ کر ہر خانے کو الگ الگ نظریے کے حوالے نہیں کیا جا سکتا۔ اسی لئے خالق کائنات نے انسانیت کے لئے دین اسلام کو پسند کیا جو منتشر خیالات اور اِدھر اُدھر کے فلسفوں کا معجون مرکب نہیں بلکہ ایک باضابطہ نظامِ حیات ہے جس کی بنیاد چند مضبوط اصولوں پر رکھی گئی ہے۔ اس کے بڑے بڑے ارکان سے لے کر چھوٹی چھوٹی جزئیات تک ہر چیز اس کے بنیادی اصولوں کے ساتھ ایک منطقی ربط رکھتی ہے۔ مولانا کے خیال میں مسلمانوں کے فکری انتشار کی وجہ یہ ہے کہ وہ جب اسلام کے مسئلے پر غور کرتے ہیں تو اس نظام پر بحیثیتِ مجموعی نگاہ نہیں ڈالتے جس سے وہ مسئلہ متعلق ہوتا ہے بلکہ نظام سے الگ کر کے ایک خاص جزء کو لے لیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ جزء حکمت سے خالی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نظر آتا ہے اور اس میں طرح طرح کے شکوک پیدا ہونے لگتے ہیں۔ اس کی مثال یہ ہے کہ اگر آپ پوری عمارت دیکھنے کے بجائے ایک ستون کو دیکھیں گے تو حیرت ہوگی کہ یہ آخر کیوں لگایا گیا ہے؟

یہ واضح کر دینے کے بعد آپ مسلمانوں کی توجہ بار بار اس حقیقت کی طرف دلاتے ہیں کہ اسلام سلف کی مقدس میراث نہیں ہے اور نہ ہی قرآن نظریات اور خیالات کی ایک نری مذہبی کتاب ہے جس کا مقام محض مدرسہ اور خانقاہ ہے۔ بلکہ اس کا مقام پہلے مرحلے میں خود انسان اور پھر اس کا گھر، محلّہ، اس کا ملک اور پھر ساری دنیا ہے جو اس کائنات کا حصہ ہے اور کائنات تو خود پوری کی پوری مسلم ہے۔

مولانا مغربی مفکرین کے نظریات کو چیلنج کرنے سے پہلے خود مسلمانوں کی سوچ کی سطحیت واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ اسلام کی صحیح تشریح کیا کریں گے،'' جبکہ وہ مغرب کے دماغ سے سوچتے ہیں، مغرب کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور مغرب کی بنائی ہوئی راہوں پر چلتے ہیں۔ خواہ ان کو اس کا شعور ہو یا نہ ہو بہرصورت یہ مفروضہ ان کے دماغوں پر مسلط ہے کہ حق وہ ہے جسے مغرب حق سمجھتا ہے اور باطل وہ ہے جسے مغرب نے باطل قرار دیا ہے۔ حق، صداقت، تہذیب، اخلاق، انسانیت اور شائستگی کا معیار ان کے نزدیک وہی ہے جو مغرب نے مقرر کر رکھا ہے۔ اپنے دین و ایمان، اپنے افکار و تخیلات، اپنی تہذیب و شائستگی، اپنے اخلاق و آداب سب کو وہ اسی معیار پر جانچتے ہیں۔''

آپ نے بتایا کہ مسلمانوں کو اپنی نا اہلی اور مغرب کی غلامی نے یہ تاثر دیا کہ مغرب بالکل بے عیب زندگی گذار رہا ہے اور اسی لئے غیر شعوری طور پر مسلمانوں میں یہ رائے قائم کر لی گئی ہے کہ جس کے پاس طاقت ہے اس کے نظریات بھی برحق ہیں۔

اہلِ مغرب کے نظریات کا علمی محاکمہ

مولانا کا زمانہ وہ زمانہ تھا جب دنیا میں ہر طرف ڈارون، مارکس اور فرائیڈ کے نظریات اور ان کی تعبیرات چھائی ہوئی تھیں۔ ان تین مغربی مفکرین نے اس عقیدے کو پاش پاش کر دیا تھا کہ انسان اشرف المخلوقات ہے اور یہ کہ دنیا میں اس کی موجودگی کا ایک اعلیٰ وارفع مقصد ہے۔ نظریہ ارتقاء کے قائلین نے انسان کی مرکزی حیثیت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا جس سے زندگی کے مفہوم میں سے روحانی عنصر کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ فرائیڈ نے تو انسان کے ذی عقل ہونے پر بھی شک کا اظہار کیا تھا اور ان سب پر مستزاد یہ کہ جدید علمِ افلاک کی اس دریافت نے کہ زمین کی حیثیت پوری کائنات میں ایک چھوٹے سے سیارے کی ہے، انسان کی حیثیت کو کم کر دیا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تھا۔ یہ سوال اٹھایا جا رہا تھا کہ ''انسانیت آخر کس شے کا نام ہے؟''

پھر ''ہیگل'' کے جدلی عمل کے نظریے نے خدا کا تعارف ایک ایسی ہستی کے طور پر کرایا جو اپنی ذات کی تکمیل کے لئے کوشاں ہے اور انسان بے چارے کو اپنے خارجی مظہر یا آلہ کار کے طور پر استعمال کر رہی ہے۔ ادھر کارل مارکس کے اس نظریئے کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہو رہی تھی کہ انسانی تہذیب میں مذہب اور اخلاقیات کی کوئی طے شدہ اقدار نہیں ہیں۔ لہٰذا انسان کو اپنے مادی مفادات کے حصول کے لئے ایک نیا مذہب اور اخلاقیات کا ایک نیا فلسفہ ایجاد کرنا ہوگا۔

مولانا اپنے مضمون ''عقلیت کا فریب'' میں مغرب کی عقلیت پسندی کا پردہ چاک کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ انہوں نے دو صدیوں تک اپنی عقلیت پسندی کا خوب ڈھنڈورا پیٹا ہے اور اس اشتہار بازی کے نتیجے میں وہ دنیا کو یہ باور کروانے میں کامیاب ہوگئے ہیں کہ ان سے بڑھ کر عقلیت پسند (Rational) اور کوئی نہیں ہے۔ حقیقتاً ان کی اپروچ سائینٹفک سے زیادہ قیاس آرائی (Speculation) پر مبنی ہے۔ خدا کی قدرت سے آزادی حاصل کرنے کے لئے انہوں نے یہ فرض کرلیا ہے کہ جو چیزیں تجربے اور مشاہدے میں نہ آسکیں وہ ناقابلِ یقین ہیں۔ وہ خدا کے وجود کا انکار اس بناء پر نہیں کرتے کہ دلائل و براہین سے اس کا عدم وجود ثابت ہوگیا ہے بلکہ وہ اس سے اس لئے بیزار ہیں کہ وہ ان کی آزاد خیالی کے مخالفین کا معبود ہے۔ ان کے انہی نظریات سے متاثر ہوکر دنیا کے زیادہ تر مذاہب کے پیروکاروں نے بدلتے حالات اور تقاضوں میں یا تو اپنے اصولوں کو جدید نظریات کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی خاطر تبدیل کر دیا یا پھر صرف ان جزئیات کو قبول کیا جو نئے نظریات سے ہم آہنگ ہونے میں حارج نہ ہوں۔

اس تجزیئے کے بعد مولانا اسلام کے انسان، خدا اور کائنات کے نظریات کو بطور جوابِ دعویٰ پیش کرتے ہیں۔ خدا تعالیٰ کی ذات، صفات اور اس کے مکمل ہونے کے تذکرے کے علاوہ انسان کی تکریم اور قرآن کے مطابق انسان میں روحانی جوہر کی موجودگی کی تصدیق کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بتاتے ہیں کہ اسلام نے انسان کو انتہائی راستے اختیار کرنے کے بجائے ''سواء السبیل'' (درمیانی راستہ) اختیار کرنے کا حکم دیا اور یہی فلاح و سعادت کا واحد راستہ ہے۔ ان سب موضوعات پر تفصیلی اور مدلل گفتگو کرنے کے بعد آپ مسلمانوں کو مشورہ دیتے ہیں کہ ایک دفعہ خدا کی حقانیت اور اس کے رسول کے لائے ہوئے پیغام پر ایمان لانے کے بعد انہیں یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ ہر حکم کی وجۂ جواز ہی تلاش کرتے رہیں۔ دین کے احکامات کی مصلحت معلوم کرنا اور چیز ہے اور انہیں شک کی نگاہ سے دیکھنا اور بات ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نظریۂ وطن پرستی کی مخالفت

اب مولانا اپنی توپوں کا رخ نیشنلزم کے اس فتنے کی طرف کرتے ہیں جو مسلمانوں میں پوری طرح اپنا اثر کر چکا تھا۔ مولانا لکھتے ہیں: ''بعض لوگ لفظ مسلمان سے دھوکا کھا کر اس غلط فہمی میں پڑ گئے ہیں کہ اصل سوال اسلام کے احیاء کا نہیں بلکہ مسلمانوں کے احیاء کا ہے۔ یعنی یہ قوم جو مسلمانوں کے نام سے پائی جاتی ہے اس کو ایک زندہ اور طاقتور قوم بنانا اور برسرِ عروج لانا مقصود ہے''۔ اس سلسلے میں مولانا جو مثال پیش کرتے ہیں وہ اس پوری تہذیب کے منہ پر طمانچہ تھی جو مسلم قوم پرستی کو احیائے دین کے پردے میں پیش کر رہی تھی۔ مولانا کہتے ہیں: ''ایک بڑے ممتاز لیڈر کو ایک مرتبہ اس امر کی شکایت کرتے ہوئے سنا گیا کہ بمبئی اور کلکتہ کے دولت مند مسلمان اینگلو انڈین فاحشات کے ہاں جاتے ہیں، حالانکہ مسلمان طوائفیں ان کی سرپرستی کی زیادہ مستحق ہیں۔'' آپ کہتے ہیں کہ ''لطف کی بات یہ ہے کہ مسلمان جو کچھ بھی کرے وہ اسلامی ہے۔ سودی بینک کھولے تو اسلامی بینک، انشورنس کمپنی قائم کریں تو وہ اسلامی انشورنس کمپنی ہوگی۔'' پھر آپ موسیقی، مصوری اور بت تراشی کو اسلامی آرٹ کہنے اور مسلم نیشنلسٹ اور مسلم کمیونسٹ جیسی اصطلاحوں کے استعمال پر تعجب کا اظہار کرتے ہیں۔ مولانا کو یہ خدشات آ گھیرتے ہیں کہ مسلم قوم پرستی کے نام پر اگر تحریکِ پاکستان چلائی جاتی ہے تو اس سے مطلوبہ مقاصد ہرگز حاصل نہیں ہوں گے بلکہ اس کام کے لئے صالح اور تربیت یافتہ لوگوں کا ہونا ضروری ہے تاکہ وہ قیامِ پاکستان کے بعد کی صورتحال میں ریاست کو اسلامی فلاحی بنیادوں پر چلا سکیں۔

آپ اس صورتحال پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی راہنمائی کے لئے جو گروہ اس وقت پیش پیش ہے ان میں نیشنلسٹ مسلمانوں کا گروہ بھی ہے جو آنے والے دور میں وہی پارٹ ادا کرے گا جو انگریزی دور میں خان بہادر طبقہ ادا کر چکا ہے۔ آئندہ یہی لوگ سرکار رہوں گے۔ ان کی مدد سے ترقیاں، نوکریاں، ٹھیکے اور تعلیم گاہوں کی گرانٹ وغیرہ ملا کرے گی اور یہی حکمران قوم اور محکوم کے درمیان واسطہ وسیلہ بنیں گے۔'' اسی لئے مولانا نے بار بار اس بات پر زور دیا کہ آپ کو ایسی آزادی درکار ہے جس میں اسلام پر عمل کرنے کی بھرپور آزادی ہو۔ آپ کی ان تحریروں نے مسلم لیگ کے ساتھ فاصلہ بڑھا دیا۔ مگر وقت نے مولانا کی پیش گوئی کو سچ ثابت کر دیا۔

ایک اور جگہ فرماتے ہیں: ''بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ ایک دفعہ غیر اسلامی طرز کا ہی سہی، مسلمانوں کا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قومی اسٹیٹ قائم تو ہو جائے۔ پھر رفتہ رفتہ تعلیم و تربیت اور اخلاقی اصلاح کے ذریعے سے اس کو اسلامی اسٹیٹ میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ مگر میں نے تاریخ، سیاسیات اور اجتماعیات کا جو تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے اس کی بناء پر میں اس کو سخت مشکل سمجھتا ہوں اور اگر یہ منصوبہ کامیاب ہو جائے تو میں اس کو ایک معجزہ سمجھوں گا۔''

جب لوگوں نے آپ سے پوچھا کہ کیا آپ تقسیمِ ہندوستان کے خلاف ہیں تو آپ نے لکھا ''مسلمان ہونے کی حیثیت سے میری نگاہ میں اس سوال کی کوئی اہمیت نہیں کہ ہندوستان ایک ملک رہے یا دس ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے۔ تمام روئے زمین ایک ملک ہے۔ انسانوں نے اس کو ہزاروں حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ یہ اب تک کی تقسیم اگر جائز تھی تو آئندہ مزید تقسیم ہو جائے گی تو کیا بگڑ جائے گا؟ اس بت کے ٹوٹنے پر تڑپے وہ جو اسے معبود سمجھتا ہو۔ مجھے تو اگر یہاں ایک مربع میل رقبہ بھی ایسا مل جائے جس میں انسان پر خدا کے سوا کسی کی حاکمیت نہ ہو تو اس میں کے ایک ذرۂ خاک کو تمام ہندوستان سے زیادہ قیمتی سمجھوں گا۔''

تجدیدِ اصطلاحات

مولانا کی تجدیدِ اصطلاحات کی خدمت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ آپ نے مسلمانوں کو دین، مذہب، رب، دعوت، جہاد، شہادت، ہجرت، اقامتِ دین، صبر، امت، ملت، جماعت اور امامت جیسی اصطلاحات کے حقیقی معنوں سے روشناس کروایا۔ ان اصطلاحات پر جمود کی گرد پڑ چکی تھی اور ان کی صحیح معنویت کو پہچاننا مشکل ہو گیا تھا۔ اسی وجہ سے یہ اپنا اثر بھی کھو چکی تھیں۔

مولانا عملیت پسند انسان تھے۔ دورِ حاضر کے تقاضوں سے واقف تھے۔ اس لئے اجتہاد کی اہمیت سے بھی واقف تھے۔ لیکن اس کے لئے آپ اصول اسلام سے لینا چاہتے تھے۔ آپ سو فیصد اسلامی نظریۂ زندگی کے حامی تھے۔ لیکن عملاً زندگی کا نظام بنانے میں آپ جدید ذرائع و وسائل اور علمی ترقیوں سب سے کام لینا ضروری سمجھتے تھے۔ اسکی ایک مثال یہ ہے کہ لاؤڈ اسپیکر کے استعمال کے جائز ہونے کے بارے میں سوال کے جواب میں فرمایا ''ہمارے لئے یہ ممکن نہیں کہ یہ فتویٰ دیں کہ اس آلے کا استعمال شرعاً حرام ہے۔ اس کا استعمال اس وقت حرام ہو گا جب یہ باطل کی آواز بلند کرے۔ مگر جب یہ آوازِ حق بلند کرے گا تو اس کا استعمال جائز و مستحب ہو گا۔''

جماعتِ اسلامی کا قیام اور پاکستان ہجرت

مولانا کی نظریاتی کوششوں کا انتہائی اختصار سے جائزہ لینے کے بعد یہ بتا دینا ضروری ہے کہ مولانا کا مقصد محض ایک علمی خدمت انجام دینا ہی نہیں تھا بلکہ اول روز سے ہی آپ یہ چاہتے تھے کہ جو لوگ سوچ سمجھ کر اسلام

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے معتقد ہوں وہ اس کو عملاً قائم کرنے کے لئے بھی تیار ہو جائیں۔ اس طرح صحیح نظریئے کے ساتھ ایک صالح جماعت بھی تیار ہو جائے جس کے لیڈروں اور کارکنوں کی تربیت بعینہ اسی معیار کی ہو جیسی اسلام چاہتا ہے۔ مولانا نے ''ترجمان القرآن'' میں علی الاعلان یہ بھی بتا دیا کہ یہ راستہ آزمائشوں، مصیبتوں اور قربانیوں کا ہے۔ اس کے بعد مولانا کی طرف سے اسلامی انقلاب کی جدوجہد کے لئے جماعت بنانے کا اعلان کیا گیا اور یوں ۲۴ اگست ۱۹۴۱ء کی شام کو ۷۵ افراد پر مشتمل ایک مختصری جماعت نے تحریکِ اسلامی کے لئے اپنے آپ کو پیش کیا۔ یہ لمحہ مولانا کی زندگی کا اہم سنگ میل تھا۔ اس کے بعد جماعتِ اسلامی کے پلیٹ فارم سے آپ کے افکار و خیالات لاکھوں کروڑوں افراد تک دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچ گئے۔

پاکستان کے قیام کے بعد مولانا اپنے ساتھیوں کے ساتھ پٹھان کوٹ سے باقاعدہ ہجرت کر کے پاکستان آئے اور اگلے تیس سال تک جماعتِ اسلامی پاکستان کے امیر کے منصب کو سنبھالا۔ اس راہ میں جو مشکلات آئیں اس کی مختصری جھلک آئندہ صفحات میں ملاحظہ کریں۔

اسلامی دستور سازی کی مہم

پاکستان کی تشکیل کے بعد فطری بات تھی کہ دستور ساز اسمبلی کے ذریعے پاکستان کے قیام کے بنیادی مقصد یعنی اسلامی نظام کے نفاذ کا اصولی فیصلہ کر لیا جاتا، لیکن مہینے پر مہینے گذرتے چلے گئے اور حکمران طبقے کی جانب سے الجھی الجھی اور متضاد باتیں سامنے آتی رہیں۔ قیامِ پاکستان سے قبل کے مولانا کے خدشات درست ثابت ہونے لگے۔ مولانا نے بار بار اس طرف توجہ دلائی کہ ''اب اگر ایک لمحہ بھی ضائع کیا گیا تو بعید نہیں کہ جو لوگ منزل کا تعین کئے بغیر بے سوچے سمجھے چل پڑے تھے، وہ یکا یک کسی غلط نظریئے کو اس مملکت کی بنیاد بنا بیٹھیں اور پھر اس فیصلے کو بدلوانا موجودہ حالات کی بہ نسبت ہزار گنا قربانیوں کے بغیر ممکن نہ رہے۔''

جب بات آگے نہ بڑھی تو جماعت اسلامی نے آخر کار ملک گیر سطح پر آگاہی کا پروگرام بنایا۔ مولانا اور آپ کے رفقاء نے تقاریر اور لٹریچر کے ذریعے پورے پاکستان کے چھوٹے بڑے علاقوں میں اسلامی نظام اور قوانین کے نفاذ کا چار نکاتی مطالبہ اس زور و شور سے کیا کہ مسلم لیگی حکومت میں موجود لادینی عناصر گھبرا گئے۔ اس عوامی مطالبے کو روکنا تو ان کے بس میں نہ تھا البتہ مولانا کے عزم اور عوامی حمایت کے توڑ کے لئے جہادِ کشمیر کے حرام ہونے کے حوالے سے مولانا کے جھوٹے بیانات اخبارات میں شائع کرائے گئے اور ریڈیو اور اخبارات میں اس کی تردید چھاپنے کی اجازت بھی نہ دی گئی۔ حکومتی حلقوں، لبرل اخبارات اور رسائل

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور ابن الوقت قسم کے مولویوں نے فضا کو اس قدر مکدر کر دیا تھا کہ مولانا کے ساتھیوں کے بقول دماغی سکون برقرار رکھنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ لیکن مولانا عزیمت کی چٹان بنے رہے۔ لوگوں نے بارہا آنے والے خطرات کی طرف توجہ دلانا چاہی تو آپ نے فرمایا ''جب تک اللہ مجھ سے اپنے دین کی خدمت لینا چاہتا ہے میں اپنے لئے کوئی خطرہ محسوس نہیں کرتا اور جب اس کی طرف سے یہ مہلت ختم ہو جانے والی ہوگی تو پھر کوئی احتیاط حفاظت کی ضمانت نہیں دے سکتی۔''

صاحبِ عزیمت

۴ اکتوبر ۱۹۴۸ء کو وہی ہوا، جس کا خدشہ تھا۔ مولانا کی گرفتاری کے لئے ڈی ایس پی اس وقت آیا جب آپ درسِ قرآن دے رہے تھے۔ آپ کے قریبی ساتھی نعیم صدیقی لکھتے ہیں:

> ''درس کے بعد جب مولانا کو اس کا علم ہوا تو شیروانی پہنے ٹھیک اسی طرح ہشاش بشاش چہرے کے ساتھ نمودار ہوئے جیسے وہ کسی سفر پر جاتے وقت دکھائی دیتے تھے۔ برآمدے کے کنارے پر کھڑے آپ نے یہ کہہ کر پان طلب کیا ''ڈبیہ کہاں ہے؟ آخری پان کھا لیا جائے۔'' پوچھا گیا کہ آخری کیوں؟ ہنستے ہوئے کہنے لگے ''بس اب طلاق دے رہا ہوں۔'' پان جیسے رفیق کے بارے میں مولانا کا یہ فیصلہ سن کر میں نے پوچھا کہ کیا جیل کے بعد بھی طلاق جاری رہے گی تو فرمایا ''نہیں۔ یہ طلاق رجعی ہے، مغلّظ نہیں۔''

دوران اسیری اپنے بیٹے کو جو مکتوب لکھا اس سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا میں کس درجے کی قوتِ برداشت تھی۔ کسی قسم کا شکوہ شکایت کرنے کے بجائے آپ خود بھی اس بات پر حیران تھے کہ جیل کے سخت ماحول نے آپ کی جسمانی اور ذہنی صحت پر کسی قسم کے برے اثرات مرتب نہیں کئے بلکہ اپنے آپ کو پہلے سے زیادہ چست محسوس کرنے لگے اور لکھنے پڑھنے کے کام کی رفتار مزید تیز ہو گئی۔ جیل کے دوران ہی مولانا نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب تفہیم القرآن کی پہلی جلد مکمل کی۔

مولانا عرصے سے گردے کی تکلیف میں مبتلا تھے۔ گرفتاری سے ایک ہفتہ قبل آپ کو محسوس ہوا کہ گردے سے ایک پتھری مثانے میں منتقل ہو چکی ہے۔ آپ نے فوراً دوائی شروع کر دی تا کہ پتھری خارج ہو جائے۔ پیشاب رک رک کر آنے لگا۔ آپ گرفتار نہ ہوتے اور دوا جاری رکھ سکتے تو پتھری خارج ہو جاتی۔ لیکن پولیس گرفتار کر کے لے گئی۔ پیس کر پینے کی دوا لے جانا ممکن نہ تھا اور قواعد کی رو سے آپ اپنے معالج سے بھی نہیں مل

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سکتے تھے۔ مولانا لکھتے ہیں۔ ''اب صرف یہ صورت رہ جاتی ہے کہ میں بطورِ خاص حکومت سے رعایت مانگوں کہ وہ مجھے اپنے معالج سے مشورہ لینے کی اجازت دے۔ لیکن ظالم سے رعایت کا مطالبہ کرنا میرے اصول کے خلاف ہے۔ میں جان دے سکتا ہوں مگر رعایت کی درخواست نہیں کر سکتا۔''

مولانا کی گرفتاری کے باوجود جماعتِ اسلامی اور دیگر معزز علمائے کرام نے جن میں علامہ شبیر احمد عثمانی کا نام قابل ذکر ہے اسلامی نظام کے نفاذ کے مطالبے کو عوام کی آواز بنا دیا اور بالآخر ۱۲ مارچ ۴۹ء کو وہ قرارداد منظور ہوئی جسے ''قراردادِ مقاصد'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جس کے تحت ریاستِ پاکستان کلمہ پڑھ کر مسلمان ہوئی۔ اس دوران بار بار مولانا کی نظر بندی میں توسیع کی گئی۔ ۲۸ مئی ۱۹۵۰ء کو بیس ماہ کی سزا کاٹنے کے بعد مولانا رہا ہو گئے۔

رہائی پانے کے بعد مولانا نے اپنا مشن جاری رکھا۔ دستور سازی میں تاخیر پر جب احتجاج زیادہ ہوا تو لادینی عناصر نے طنزاً کہنا شروع کیا کہ کونسا اسلامی دستور؟ شیعوں کا؟ دیوبندیوں کا؟ بریلیوں کا یا اہلحدیث کا؟ یا پھر کہتے کہ قرآن سے اسلامی دستور لا کر دکھاؤ۔

۳۱ مارچ ۵۱ء کو کراچی میں تمام مکاتبِ فکر کے ۳۱ جید علماء نے سید سلیمان ندوی کی قیادت میں جمع ہو کر بائیس راہنما اصول طے کر لئے۔ ان اصولوں کی تدوین میں مولانا مودودی کا حصہ سب سے زیادہ تھا۔ اجماعِ امت کے اس شاندار مظاہرے نے لادینی عناصر کی خواہشات پر پانی پھیر دیا اور دو سال کی جدوجہد کے بعد بالآخر ۲۲ دسمبر ۵۲ء کو ان اصولوں کے مطابق دستوری سفارشات پیش کر دی گئیں۔

قادیانی مسئلہ اور دوسری گرفتاری

بیوروکریسی، حکومت اور عدلیہ میں موجود لادینی عناصر علماء کی اس کامیابی پر سخت بے چین تھے کیونکہ وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین نے اسلامی دستور کی مہم کے نتیجے میں جو رپورٹ پیش کی تھی اس میں اسلام اور جمہوریت دونوں کا سامان تھا جو آمریت پسند بیوروکریسی کی راہ کا سب سے بڑا پتھر بننے والا تھا۔ بیوروکریسی کی غالب تعداد انگریز کی تربیت یافتہ ہونے کی بناء پر سخت مغرب زدہ اور اسلام سے بیزار تھی۔ اس پر مزید یہ کہ اس میں قادیانی حضرات بہت بڑی تعداد میں کلیدی عہدوں پر فائز تھے۔ انہی دنوں علماء تحریکِ ختمِ نبوت کے ذریعے قادیانیوں کو اقلیت قرار دینے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ اس موقع پر خاص طور سے اس مسئلے کو اتنا اچھالا گیا کہ حالات قابو سے باہر ہو گئے۔ اسی زمانے میں مولانا نے اپنی مشہور کتاب ''قادیانی مسئلہ'' لکھی جس میں مرزا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

غلام احمد کے جھوٹے دعویٰ کا پول برہانِ قاطع سے کھولا گیا۔

یہ کتاب ایسی مقبول ہوئی کہ دو مہینوں میں اس کی ایک لاکھ کاپیاں بک گئیں۔ مولانا اس مسئلے کو دستوری طور پر حل کرنے کے حمایتی تھے۔ لیکن موقع پرست عناصر تو اسی وقت کی تاک میں تھے۔ امن وامان کا بہانہ بنا کر خواجہ ناظم الدین کی حکومت کو ختم کر کے پنجاب میں مارشل لاء لگا دیا گیا۔ سینکڑوں افراد مارے گئے۔ تحریک کے سرکردہ علماء کے ساتھ ہزاروں لوگ جیل گئے۔ ۲۸ مارچ ۱۹۵۳ء کو مولانا کو گرفتار کر کے شاہی قلعہ لاہور کے عقوبت خانے میں بند کر دیا گیا اور ''سی'' کلاس دی گئی۔ ۲۱۶ گھنٹے آپ کو کامل تنہائی میں رکھا گیا اور ایک ماہ تک پوچھ گچھ کی خاطر دیر تک بیدار رکھا گیا۔ اس دوران سارا زور یہ ثابت کرنے پر لگایا جاتا رہا کہ کسی طرح آپ سے یہ تسلیم کرا لیا جائے کہ جماعت کو غیر ملکی امداد ملتی ہے۔ مولانا پر فوجی عدالت میں دو مقدمے قائم کئے گئے۔ ان میں سے ایک مقدمہ کتاب ''قادیانی مسئلہ'' لکھنے پر قائم کیا گیا۔ تین دن کی کارروائی کے بعد مولانا کی سزائے موت کا فیصلہ حکامِ بالا کی طرف سے فوج کے عدالتی افسران کو سنانے کے لئے پکڑا دیا گیا۔

فوجی عدالت سے پھانسی کی سزا

مولانا کو سزائے موت کے فیصلے کی اطلاع اس وقت دی گئی جب آپ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ مغرب کی نماز پڑھ کر فارغ ہوئے تھے۔ آپ کے ساتھی میاں طفیل محمد جو اس وقت موجود تھے، لکھتے ہیں:

> ''اطلاع دینے کے لئے چند فوجی افسر آئے تھے۔ ایک فوجی افسر نے پوچھا۔ ''آپ میں سے مولانا مودودی کون ہیں؟'' مولانا نے کہا ''میں ہوں مودودی۔'' اس نے کہا ''آپ کو قادیانی مسئلہ نامی پمفلٹ لکھنے کی پاداش میں مارشل لاء کی فوجی عدالت نے موت کی سزا سنائی ہے۔ آپ اس فیصلے کے خلاف عدالت سے کوئی اپیل نہیں کر سکتے۔ صرف گورنر جنرل صاحب سے سات دن کے اندر اپیل کر سکتے ہیں۔''
>
> موت کی سزا کا فیصلہ سن کر مولانا کا چہرہ تمتما اٹھا، جیسے بہت ہی زیادہ خوشی کی خبر ملنے پر انسان کا چہرہ سرخ ہو جاتا ہے۔ مولانا نے سزا سن کر فرمایا ''مجھے کسی سے کوئی درخواست یا اپیل وغیرہ نہیں کرنی۔ موت کے فیصلے زمین پر نہیں آسمان پر ہوتے ہیں۔'' کوئی آدھے گھنٹے کے بعد چند وارڈر اندر آ گئے اور مولانا کو پھانسی گھاٹ چلنے کو کہا۔ مولانا نے کھلے پاجامے کو تبدیل کیا۔ سلیپر کی جگہ جوتا پہنا، سر پہ ٹوپی، بغل میں قرآن لے کر ہم سے مصافحہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کر کے رخصت ہو گئے''۔

جب مولانا کو پھانسی کی کوٹھری میں لایا گیا تو انہوں نے بڑے اطمینان کے ساتھ پھانسی گھر کا مخصوص لباس پہنا۔ وضو کیا، نماز پڑھی اور بغیر بستر کی چارپائی پر لیٹتے ہی خراٹے لینے لگے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

ادھر مولانا کے ساتھی اور ممتاز عالمِ دین مولانا امین احسن اصلاحی کا، جو جیل میں آپ کے ساتھ تھے، یہ حال ہوا کہ پھوٹ پھوٹ کر روتے جاتے۔ مولانا کے کپڑوں کو کبھی سر پر رکھتے اور کبھی آنکھوں سے لگاتے اور کہتے جاتے کہ ''مجھے یہ تو پتا تھا کہ مودودی صاحب بڑے آدمی ہیں۔ لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ اتنے بڑے آدمی ہیں کہ وہ خدا کے دین کی راہ میں ایک دن پھانسی کی سزا پائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ہزارہا ہستیوں میں سے چن کر ایک اونچے مقام پر لاکھڑا کیا ہے''۔

پھانسی کی کوٹھری پر آپ کے صاحبزادے عمر فاروق اپنے چچا کے ساتھ پہنچے تو مولانا نے ان کو تشفی دی ''بیٹا! ذرا نہ گھبرانا، اگر میرے پروردگار نے مجھے اپنے پاس بلانا منظور کر لیا ہے تو بندہ خوشی سے اپنے رب سے جا ملے گا۔ اور اگر اس کا حکم ابھی نہیں آیا تو پھر چاہے یہ الٹے لٹک جائیں مجھ کو ہرگز نہیں لٹکا سکتے۔''

سزائے موت کا اعلان ریڈیو پر ہوا تو پاکستان کے علاوہ پورے عالمِ اسلام میں کہرام مچ گیا۔ متعدد مسلم حکومتوں نے درخواست کی کہ اگر پاکستان کو مولانا مودودی جیسے عظیم المرتبت مفکر اور عالم کی ضرورت نہیں ہے تو انہیں ہمارے پاس بھیج دیا جائے۔

سزائے موت کی منسوخی

جب عوامی ردِعمل اور بیرونی دنیا کا اصرار حد سے بڑھ گیا اور حکومت کے پاس کوئی راستہ نہ رہا تو شاہ سعود کے ایک استفسار پر گورنر جنرل نے کہا کہ اگر مولانا معافی مانگ لیں تو انہیں رہا کر دیا جائے گا۔ آپ نے کہا ''مجھ سے یہ لوگ چاہتے ہیں کہ میں رحم کی اپیل کروں۔ اس کے لئے میری جوتی کی نوک بھی تیار نہیں ہے۔''

عوامی ردِعمل کے خوف سے بالآخر پھانسی کی سزا کو چودہ سال قید با مشقت میں بدل دیا گیا۔ سزائے موت کی منسوخی کے کچھ عرصے بعد آپ کو ملتان جیل منتقل کر دیا گیا جہاں آپ کی کوٹھڑی کی چھت ٹین کی تھی جو موسمِ گرما میں تنور کی طرح تپ جاتی۔ مولانا کے لئے سوت کاتنے کی مشقت تجویز ہوئی۔ وہ شخص جس کے ہاتھ تفہیم القرآن لکھنے کے لئے پیدا کئے گئے تھے اس کے ذمے سوت کاتنے اور اس سے جیل کے قیدیوں کے کپڑے بُنے جانے کا کام تجویز کیا گیا۔ سوا دو سال قید کاٹنے کے بعد ۱۹۵۵ء کے وسط میں گورنر جنرل نے اسمبلی تحلیل کی تو وہ قانون

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بھی ختم ہو گیا جس کے تحت آپ گرفتار ہوئے تھے۔ لہٰذا آپ رہا کر دیئے گئے۔

۲۹ اپریل کی شام جب مولانا مودودی لاہور اسٹیشن پہنچے تو آپ کا عظیم الشان استقبال کیا گیا۔ آپ نے اپنی گرفتاری کے بعد جس بلند کرداری کا ثبوت دیا، پھانسی کی سزا کو جس اطمینانِ قلب کے ساتھ سنا اور حق اپیل کو جس بے نیازی سے نظر انداز کیا اس نے آپ کی ہر دلعزیزی کو چار چاند لگا دیئے۔

بعد میں ایوب خان نے مارشل لاء لگا کر اقتدار سنبھالا تو مولانا سے ملاقات میں آپ کو مشورہ دیا کہ ''سیاست جیسے گندے کام سے علیحدہ ہو کر آپ خالص دینی کام کریں تو مالی تعاون بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔'' اس موقع پر آپ نے صاف الفاظ میں کہا۔ ''جس دینِ اسلام کو میں جانتا ہوں وہ انسانی زندگی کے سبھی گوشوں اور تمام مسائل سے تعلق رکھتا ہے۔ میرے لئے زندگی کے معاملات اور اسلام کے اجزاء کو مختلف خانوں میں تقسیم کرنا یا کسی کو اختیار کرنا اور کسی کو چھوڑ دینا جائز ہے اور نہ ممکن۔''

۶ جنوری ۱۹۶۴ء کو جماعتِ اسلامی کو خلاف قانون قرار دے کر مولانا اور آپ کے ۶۳ ساتھیوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ نو مہینے کے بعد عدالت نے اس کاروائی کو غیر قانونی اور جابرانہ قرار دے کر جماعت کو بحال کر دیا اور مولانا اور آپ کے ساتھیوں کو رہا کر دیا گیا۔ مولانا کی چوتھی اور آخری گرفتاری اس وقت عمل میں آئی جب آپ نے حکمرانوں کی جانب سے ایک دن پہلے عید کرنے کے فیصلے کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ آپ کو دو ماہ بنوں جیل میں نظر بند رکھنے کے بعد رہا کر دیا گیا۔

امام ابن تیمیہؒ کی طرح آپ کو بھی چار بار جیل جانا پڑا اور اس راہ میں گالیاں سننے سے لے کر پھانسی کی سزا سننے تک کی نوبت آئی۔ مگر ان سب چیزوں نے آپ کے عزم کو کچھ اور بڑھا دیا۔ قیامِ پاکستان سے لے کر ۱۹۷۹ء تک آپ مستقل نظریاتی اور عملی جدوجہد میں مصروف رہے۔ ۳۰ سال میں قرآن پاک کی معرکۃ الآراء تفسیر تفہیم القرآن لکھی جسے عالمگیر شہرت حاصل ہوئی۔ سیاست میں حصہ لینے کے ساتھ جماعت کے تحت علمی و دینی مذاکروں، لیکچروں اور تربیت گاہوں میں شرکت کرتے رہے۔

خدمتِ خلق

مولانا نے ساری زندگی جس فکر کی ترویج میں گذاری اس کا نچوڑ یہی تھا کہ اسلام مذہب نہیں بلکہ دین ہے جو زندگی کے ہر پہلو کا احاطہ کرتا ہے۔ اسلام نے جس طرح عبادات، معاملات اور اجتماعی قوانین سے متعلق احکامات دیئے ہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ کی مخلوق (جسے اللہ کا کنبہ بھی کہا گیا ہے) کے ساتھ تعاون، خیرخواہی، امداد

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور ہمدردی کی پرزور تاکید کی ہے۔ خدمتِ خلق کا دین میں جو مقام ہے اسے کوئی بھی مسلمان اور قرآن کا قاری نظر انداز نہیں کرسکتا۔

چنانچہ مولانا کی سرکردگی میں جماعتِ اسلامی کے پلیٹ فارم سے خدمتِ خلق کے شعبے ''الخدمت'' کا قیام عمل میں لایا گیا جس نے ہر نوع کی پبلک خدمات سرانجام دینے کا اہتمام کیا۔ سینکڑوں مستقل اور گشتی شفاخانے دن رات مفت طبی امداد اور دوائیاں دینے میں مصروف عمل ہوگئے۔ تعلیم کے شعبے میں غریب طلباء کو مفت کتابیں، یونیفارم اور وظائف دینے کے علاوہ خود جماعت کے تحت ملک بھر میں سینکڑوں اسکولوں کا قیام عمل میں لایا گیا جہاں بچے دینی ودنیاوی تعلیم معمولی فیس کی ادائیگی کے ساتھ حاصل کرسکتے تھے۔ شام کے اوقات میں انہی اسکولوں نے تعلیمِ بالغاں کے مراکز کا کام بھی انجام دیا۔

مزدوروں کے لئے لیبر ویلفیئر کمیٹیاں قائم کی گئیں جو تعاون ومصالحت اور قانونی حقوق بذریعہ عدالت دلوانے کے کام انجام دیتی تھیں۔ جیلوں میں مجرموں کے بنیادی حقوق کے لئے کوشش نیز جیل خانوں میں اسلام کی تعلیمات اور اصلاح کے مشکل کام کا آغاز بھی کیا گیا۔ بے گھر اور بے سہارا خواتین کے لئے جماعتِ اسلامی کی طرف سے گوشۂ عافیت کے نام سے اداروں کا وجود عمل میں لایا گیا جہاں معاشرے کے اس مجبور طبقے کی اخلاقی ومالی امداد کے ذریعے انہیں تحفظ فراہم کیا گیا۔ اس کے علاوہ مفت سلائی مشینیں تقسیم کی گئیں، جہیز فنڈ اور جہاد میں مصروف غازیوں اور شہیدوں کے اہلِ خانہ کی ماہانہ امداد کے لئے بیسیوں فنڈز جماعت کی نگرانی میں قائم کئے گئے۔ خدمتِ خلق کا یہ تسلسل کسی حد تک آج بھی قائم ہے۔

رات دن کی ان مصروفیات کے ساتھ ساتھ ہنگامی حالات میں امدادی کام اور اپنے کارکنان اور وسائل کے ذریعے حکومت کی مدد کرنا بھی الخدمت کے فرائض میں شامل ہے۔ مولانا کی تعلیمات کے زیر اثر سیلاب ہو یا جنگ جماعت کے کارکنوں کی ٹولیاں راشن، طبی امداد، ایمبولینسوں اور فنڈز کے ذریعے مصروفِ عمل ہوجاتی ہیں۔

قیامِ پاکستان کے وقت جب مہاجر کیمپوں کی حالت ناقابلِ بیان حد تک مخدوش تھی، مولانا کی نگرانی میں چلنے والے کیمپ اپنی تنظیم اور کارکنوں کے بہترین کردار کی وجہ سے سب کے لئے نمونہ تھے۔ صرف یہی نہیں، جب خاکروبوں کے بھارت چلے جانے کی وجہ سے لاہور میں غلاظت اور گندگی کے ڈھیر لگ گئے تو مولانا نے اپنے کارکنوں کو آواز دی اور دنیا نے دیکھا کہ خوش پوش نوجوان جن میں ڈاکٹر، انجینئر، پرفیسر اور تاجر سب شامل تھے، گندگی کے ٹوکرے بھر بھر کر کارپوریشن کی گاڑیوں میں پھینک رہے تھے۔

مولانا کے انتقال کے بعد جس طرح سیاست کے علاوہ دیگر تمام شعبے زوال پذیر ہوئے اسی طرح شعبہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خدمت خلق میں بھی جماعت کے دور اول کی سی کارکردگی دیکھنے میں نہیں آتی ۔گو اس شعبے میں نئے نئے پہلو متعارف کروائے جار ہے ہیں مگر معیار قائم رکھنے اور اس کو مزید بہتر بنانے کے لئے کی گئی کوششوں میں ابھی بہت گنجائش باقی ہے۔

عالمِ اسلام کی دیگر تنظیموں سے رابطے

گو مولانا کی عملی کوششوں کا مرکز پاکستان ہی رہا مگر احیائے دین کے مشن کے لئے تمام عالمِ اسلام اور دنیا کے مسلمانوں کی اجتماعی کوششوں کی اہمیت سے مولانا روزِ اول سے واقف تھے ۔ چنانچہ عالمِ اسلام میں جہاں بھی مختلف تنظیمیں اسلام کی خدمت میں مصروف تھیں مولانا ان سے رابطے میں رہتے تھے اور ان کی امداد، مشوروں اور کوششوں میں ان کے شریک تھے ۔ مولانا کی شخصیت اور کام سے متاثر ہو کر آپ کے لٹریچر کا دھڑا دھڑ مختلف زبانوں میں ترجمہ ہونے لگا اور عالمِ اسلام میں آپ کی مقبولیت آسمان سے باتیں کرنے لگی ۔ موتمر عالمِ اسلامی کے دمشق میں منعقد ہونے والے اجلاس میں شرکت کے لئے جب مولانا وہاں پہنچے تو دعوت وتبلیغ کے سلسلے میں آپ کی کوششوں کے اعتراف کے طور پر آپ کو ایک کمیٹی کا سربراہ منتخب کیا گیا۔ آپ نے اسلامی ممالک سے آئے ہوئے بیسیوں وفود سے ملاقات کر کے ان کو اپنے علاقوں میں اسلامی نظام کے نفاذ کے حوالے سے مفید مشورے دیئے ۔ مصر کے اخوان ہوں یا ایرانی انقلاب کے نقیب، افریقہ میں تبلیغِ اسلام کا مشن ہو یا روسی ترکستانی مہاجروں کے مسائل کے حل کی کوشش ہو، مولانا سب مسلمانوں کی کوششوں اور خیر خواہی میں برابر کے شریک تھے ۔ غیر مسلم ممالک میں انگلستان کا اسلامک یو کے مشن اور امریکا میں ISNA تو خود جماعت کے افکار کے علمبردار ہیں جبکہ ہندوستان اور بنگلہ دیش میں جماعتِ اسلامی کی تنظیم بھر پور اور فعال کردار ادا کر رہی ہے ۔ غرض عالمگیر اسلامی تحریک کے داعی کے طور پر مولانا کے کام کو تاریخ کبھی نظر انداز نہیں کرسکتی ۔ آپ ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ دنیا میں ہونے والی ہر قسم کی تبدیلیوں سے مسلمان جس طرح متاثر ہوتے ہیں اس پر جماعتِ اسلامی بھر پور طریقے سے اپنے موقف کا اظہار کرتی ہے اور دیگر اسلامی تنظیموں سے باہم رابطے میں اس کا کردار قابلِ رشک ہے۔

پاکستان میں تعلیمی نظام کی بہتری، خواتین کی اصلاح، نو جوانوں کی تربیت کے بے شمار کام مولانا کے دور میں شروع ہوئے ۔ اس کے علاوہ دینی نظریاتی لٹریچر کی تیاری اور اس کو پھیلانے کا کام کیا گیا۔ طلباء اور طالبات میں دینی رجحان پیدا کرنے کے لئے جماعت کی ذیلی طلباء تنظیمیں قائم کی گئیں ۔ ۱۹۷۱ء کے خطرناک حالات

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں پاکستان اور جہادِ کشمیر کی مخالفت کا الزام سننے والے نے ''الشمس'' اور ''البدر'' تنظیموں کے ذریعے فوج کے شانہ بشانہ ملک بچانے کے لئے ہزاروں قربانیاں پیش کیں۔ نصف صدی پر محیط اس ہمہ گیر نوعیت کے کام کو انجام دینے کے بعد ۷۹۔۱۹۷۸ء میں آپ کی صحت زیادہ خراب ہوگئی۔

وفات

۱۹۷۹ء کے وسط میں مولانا اپنے بیٹے ڈاکٹر احمد فاروق کے ساتھ علاج کی غرض سے امریکہ چلے گئے۔ ابتدائی طور پر کچھ فائدہ ہوا، پھر پیٹ کی تکلیف کی وجہ سے آپریشن کرنا پڑا جس کے بعد حالت نازک ہوگئی۔ ۲۲ ستمبر کی صبح کے وقت قلم طلب کیا اور آخری الفاظ یہ لکھے۔ ''میں مسلمان ہوں اور پاکستانی ہوں۔'' کچھ دیر کے بعد جان جانِ آفریں کے سپرد کردی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا کی میت تین ایئرپورٹس پر رکی جہاں ایک درجن بار آپ کی نماز جنازہ پڑھائی گئی۔ ۲۵ ستمبر کو جب آپ کی میت لاہور پہنچی تو لاہور شہر اور اس کے مضافات سے انسانوں کا سیلاب آپ کی اقامت گاہ ۵۔اے ذیلدار پارک اچھرہ پہنچنے کے لئے بے تاب تھا۔ لاکھوں سوگوار آپ کا آخری دیدار کرنے کے لئے ٹوٹ پڑے۔ پوری رات قطار لگی رہی۔ یہاں تک کہ اگلی صبح طلوع ہوگئی اور ہجوم کا اب بھی وہی حال تھا۔ جنازہ قذافی اسٹیڈیم کی جانب روانہ ہوا تو اکثر نوجوان فرطِ غم سے بے ہوش ہوگئے۔ گاہے گاہے ''مرشدی الوداع الوداع'' کی پکار بلند ہوتی تھی۔ نمازِ جنازہ میں شرکت کے لئے دنیا بھر کی اسلامی تحریکوں کے راہنما بیرون ملک سے آئے ہوئے تھے۔ وفود، مقامی قائدین، فوجی حکام اور سربراہِ مملکت تک شریک تھے۔ عالمی شہرت کے حامل علامہ یوسف القرضاوی نے مولانا کو ان الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کیا:

> ''میں آپ کو یہ بتانے آیا ہوں کہ تمام دنیا کے مسلمان شیخ مودودی کے فراق میں گریہ کناں ہیں۔ شیخ محض پاکستان کے فرد نہیں ہیں بلکہ وہ پوری امتِ اسلامیہ کے فرد ہیں اور یہ نقصان کسی ایک کا نقصان نہیں پوری ملتِ اسلامیہ کا نقصان ہے۔ اقصائے عالم میں بسنے والے تمام مسلمانوں کا نقصان ہے یہ اللہ ہی ہے جو اس نقصان کی تلافی فرما سکتا ہے اور ہم اسی سے اس کے طلب گار ہیں۔ استاد مودودی فوت نہیں ہوئے، ہم صرف ان کا جسدِ خاکی سپرد کررہے ہیں۔ وہ زندہ ہیں، اپنے افکار میں، اپنے اصولوں میں اور اپنی دعوت میں۔ جب تک ان کے افکار، اصول اور دعوت زندہ ہیں وہ زندہ وتابندہ رہیں گے''۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نمازِ جنازہ کے بعد مولانا کو آپ کی ذاتی رہائش گاہ میں دفنایا گیا۔ لاکھوں افراد نے آپ کی نمازِ جنازہ پڑھی۔ حرمین شریفین اور سعودی عرب کے دوسرے شہروں کے علاوہ دنیا کے گوشے گوشے میں آپ کی غائبانہ نماز جنازہ ادا کی گئی۔ مولانا مودودیؒ اور ابنِ تیمیہ کو اس امر میں مناسبت ہے کہ دونوں نے راہِ خدا میں ایک طرف جتنی تکالیف اٹھائیں تو دوسری طرف اتنی ہی پذیرائی بھی ملی۔

مولانا معاملاتِ زندگی میں

مولانا اپنی ذاتی زندگی اور معاملات میں بھی اسی طرح سنجیدہ اور مدلل ہوتے جیسے آپ اپنی تحریروں میں نظر آتے تھے۔ لوگوں کو آپ میں بے پناہ گرم جوشی محسوس نہ ہوتی تھی۔ آپ ملنے والوں سے ملتے اور بات کرنے والوں سے باتیں بھی کرتے مگر خواہ مخواہ کی گپ لگانے کی عادت نہ تھی۔ البتہ آپ کی گفتگو میں کبھی کبھار اس ظرافت کا اثر معلوم ہوتا جو آپ کے مزاج کا حصہ تھی۔ آپ کی محفل میں طرح طرح کے لوگ مناظرہ بازی، بحث اور الٹے سیدھے سوال کر کے آپ کو پریشان کرتے۔ آپ چپ چاپ بیٹھے سنتے رہتے اور زبان کی شائستگی کو برقرار رکھتے۔ کوئی بحث کو طول دینا چاہتا تو کہہ دیتے کہ میرے پاس جو دلائل تھے وہ میں نے دے دیئے۔ اگر آپ مطمئن نہ ہوں تو اپنی رائے پر قائم رہیں۔

درگزر اور طبعی حلم

آپ کے قریبی ساتھیوں نے بھی کبھی آپ کو مغلوب الغضب نہ دیکھا۔ آپ کو غلیظ ترین گالیوں اور بدترین الفاظ سے نوازا گیا، یہاں تک کہ ''اچھرے کا[1] بھیڑیا'' جیسے القابات سے نوازا گیا۔ مگر ان تمام باتوں کے جواب میں ایک بے نیازانہ تبسم کے سوا آپ کے چہرے پر کچھ نہ آتا۔ ایک بار آپ کی نواسی نے ایک جلوس گزرتے دیکھا جو آپ کے خلاف نعرہ بازی میں گالیاں تک بک رہا تھا۔ گھر واپسی پر اس نے مولانا سے پوچھا ''نانا ابا! مولانا مودودی آپ ہیں؟'' کہنے لگے۔ ''ہاں بیٹی، میں ہی ہوں۔'' وہ بولی۔ ''انارکلی میں تو آپ کو گالیاں مل رہی تھیں۔'' اس پر مولانا مسکرا کر اس کی بات دہرانے لگے۔ پوچھا گیا کہ آپ تو ایسے خوش ہو رہے ہیں جیسے کوئی دولت مل گئی ہے۔ آپ نے کہا ''بیٹی اللہ کے راستے میں گالیاں کھانا انبیاء علیہ السلام کی سنت ہے۔''

---

(1) اچھرہ، لاہور میں آپ کی رہائش تھی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مناظرہ بازی سے گریز

لوگ آپ سے سوالات پوچھتے تو جواب میں مسئلے کی تکنیکی صورت بتانے کے بجائے اس کی مقصدیت کو نمایاں کرتے۔ آپ نے کبھی سوال، اختلاف یا اعتراض کرنے والے کو نفرت اور تحقیر سے مخاطب نہیں کیا۔ البتہ مناظرانہ اور شرپسندانہ ذہن کا خیر مقدم نہ کرتے۔ آپ کے قریبی ساتھی نعیم صدیقی جو آپ کے خطوط بھی لکھا کرتے تھے، لکھتے ہیں: ''مجھے ایک موقع بھی ایسا یاد نہیں کہ پوری خط و کتابت میں مولانا نے کسی کی تکفیر کی ہو یا تفسیق کی ہو، بلکہ زجر و توبیخ کا مولویانہ انداز بھی کبھی اختیار نہ کیا۔''

رُفقاء سے برتاؤ

مولانا اپنے ساتھیوں سے چاہے وہ عمر، علم، مرتبے اور کارکردگی میں کسی بھی درجے پر ہوں دوستانہ تعلقات رکھتے تھے۔ نہ اپنے ساتھیوں سے باتیں چھپاتے نہ ان پر بے اعتمادی کا اظہار کرتے۔ ان کی عزتِ نفس کا خیال رکھتے۔ سب سے مساویانہ برتاؤ کرتے۔ کسی بھی رفیق کو ملامت کرنے یا برا بھلا کہنے سے گریز کرتے۔ معاملہ اہم نوعیت کا ہوتا تو تربیت کی غرض سے خفیف سے اشارے یا بالواسطہ طرز کے ایک جملے کے ذریعے ہنستے مسکراتے احساس دلاتے۔ اظہار ندامت پر فراخدلی سے معاف کر دیتے۔ اپنے ساتھیوں کے ساتھ تیسرے درجے میں سفر کرتے۔ سب سے پہلے خود قربانی دیتے۔ جماعتِ اسلامی کے سالانہ اجتماع کے موقع پر جب غنڈوں نے حملہ کر دیا اور گولیاں اسٹیج کی طرف آنے لگیں تو کسی نے مولانا سے کہا ''آپ بیٹھ جائیے، گولیاں اس طرف آ رہی ہیں۔'' اس کے جواب میں آپ نے وہ تاریخی جملہ ادا کیا جو سنہرے حروف سے لکھے جانے کے لائق ہے۔ ''میں بیٹھ گیا تو پھر کون کھڑا رہے گا۔''

ذاتی نمائش سے پرہیز

مولانا کو اپنے آپ کو نمایاں کرنا سخت ناپسند تھا۔ مولانا سے آپ کی سالگرہ کے دن انٹرویو شائع کرنے کی درخواست کی گئی تو صاف الفاظ میں انکار کرتے ہوئے کہا ''بہتر سال ایسے گذر گئے۔ اب تہترویں سال مجھ پر کیا آفت پڑی ہے کہ میں سالگرہیں مناتا پھروں۔ میں اس پاکھنڈ میں شامل نہیں ہو سکتا۔''

جب آپ کی سوانح لکھنے کے لئے درخواست کی گئی کہ ہفتے میں ایک روز تھوڑا سا وقت دے دیا کریں تو مولانا نے کہا ''میں اپنی ذات کے بارے میں کسی سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے۔'' تصویریں کھنچوانے سے آپ سخت الرجک تھے۔اس کے باوجود بعض لوگ بغیر آپ کی اجازت کے بنالیا کرتے تھے۔

سادہ طرزِ زندگی

آپ کا طرزِ زندگی انتہائی سادہ تھا۔ابتداء میں آپ کی اہلیہ ان حالات کے لئے تیار نہ تھیں۔مگر آپ نے اپنے لئے جو راستہ چنا تھا وہ ایثار،قربانی اور فقر کا راستہ تھا۔آپ کی رفاقت نے ان میں بھی انقلاب پیدا کیا اور وہ بھی اسی سانچے میں ڈھلتی چلی گئیں۔اپنے بچوں کی تربیت میں انہوں نے صبر اور دین کے لئے قربانی کی صفات پیدا کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ ۱۹۴۸ء میں جب مولانا کی پہلی گرفتاری عمل میں آئی تو گھر سے نکلتے ہوئے آپ نے بغیر پیچھے مڑے اور نظر ڈالے زور سے کہا'' السلام علیکم، خدا حافظ، فی امان اللہ'' اور پولیس کے ساتھ روانہ ہو گئے۔بچوں نے بعد میں والدہ سے پوچھا کہ ہمارے والد نے ہماری طرف مڑ کر کیوں نہیں دیکھا۔ آپ کی اہلیہ نے اطمینان سے جواب دیا'' ابراہیمؑ نے بھی تو مکہ سے جاتے وقت حضرت حاجرہ اور حضرت اسماعیل کو نہیں دیکھا تھا۔پیچھے مڑ کر دیکھنے سے ارادے اور عزم میں کمی آجاتی ہے۔''

مولانا کے جیل جانے سے گھر میں پیچھے کم خرچہ رہ گیا۔آپ کی بیوی نے فیصلہ کیا کہ خواہ کچھ بھی ہو جائے بچوں کی تعلیم جاری رہنی چاہئے۔چنانچہ اپنا زیور فروخت کر کے گذارا کیا۔دوسری بار جب مولانا کو قادیانی مسئلے کی وجہ سے جیل بھیجا گیا اور پھانسی کی سزا سنائی گئی تو آپ کی بیوی اس وقت بچوں کو اسکول کے لئے تیار کر رہی تھیں۔بڑے بیٹے نے اخبار دکھایا تو ان کا چہرہ زرد پڑ گیا۔انہوں نے اخبار چھپا دیا اور رونے دھونے اور شور مچانے کے بجائے انتہائی حوصلے کے ساتھ بچوں کو اسکول روانہ کیا۔یہ اس تربیت کا نتیجہ تھا جو مولانا نے اپنے گھر والوں کی کی تھی۔

گھر میں موجودگی کے وقت آپ اپنے چھوٹے موٹے کام خود کرتے۔آپ کو یہ بھی پسند نہ تھا کہ کوئی آپ کی جوتی آپ کو لا کر دے۔اگر تکلیف کے عالم میں کوئی جسم دبانے پر اصرار کرتا تو ازراہِ مذاق کہتے'' میں کسی سے نہیں دبتا۔'' لوگوں کو خوش کرنے کے لئے اپنے اندر کوئی تبدیلی لانے پر راضی نہ ہوتے جب تک ضمیر کے اندر خود اس کے لئے تحریک پیدا نہ ہو۔لوگوں نے آپ کو لمبی داڑھی رکھنے اور لباس میں پیوند لگانے سے لے کر زیادہ نوافل ادا کرنے کے مشورہ دیئے۔لیکن آپ محض دوسروں کو راضی کرنے کے لئے کسی ادنیٰ سی ترمیم پر بھی راضی نہ ہوئے۔آپ کے مالی حالات بعض اوقات فقر و فاقہ تک جا پہنچتے۔اپنی بیسیوں تصنیفات سے جو آمدنی ہوتی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس میں سے ایک قلیل رقم کے سواء سب تحریک کے لئے وقف کردی۔ یہ وہ کتابیں ہیں جن کو لکھنے کے لئے مولانا عشاء کی نماز کے بعد سے فجر تک بیٹھے رہتے اور آپ کے ہاتھ شل ہو جاتے۔ جماعت کی کل وقتی ذمہ داریاں اٹھانے کے باوجود بقدرِ کفالت وظیفہ بھی بااصرار نہ لیا۔

آپ کی نماز ایک خاص کیفیت کی حامل ہوتی اور آپ کے پیچھے نماز پڑھنے والے بہت دن تک اس کی لذت کو محسوس کرتے۔ آپ انتہائی رازداری سے بیواؤں اور یتیموں کو رقوم بھجواتے اور ان کی مدد کیا کرتے تھے۔

اپنے بچوں خصوصاً بیٹیوں کی بہت عزت کیا کرتے تھے۔ ان کی بیٹی حمیرا کے بقول ''وہ اپنے بچوں کی بلا مبالغہ اتنی عزت کرتے تھے جتنی دوسرے لوگ ماں باپ کی کرتے ہیں۔''

مولانا پر لکھنے اور کہنے کو ابھی بہت کچھ باقی ہے۔ مگر اپنی وسعت اور گنجائش کو پیش نظر رکھتے ہوئے آخر میں جناب اوریا مقبول جان کی گواہی پیش کرتے ہیں جس میں وہ ان لاکھوں مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں جن کی زندگیاں مولانا مودودیؒ اور آپ کی تحریک نے بدل ڈالیں۔ کہتے ہیں:

''میں آج بھی جب سید مودودیؒ کی تحریریں پڑھتا ہوں تو میں ان کے چہرے کے سحر سے باہر نہیں نکل پاتا۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ وہ جدید دور کے ایک نئے صوفیانہ سلسلے کے بانی تھے، جس میں بیعت ہاتھ میں ہاتھ دے کر نہیں، بلکہ ہاتھ میں کتاب دے کر کی جاتی ہو۔ ایسا سلسلۂ تصوف کہ جس میں شیخ طریقت عقلِ کل نہیں، تنقید اور احتساب سے بالاتر نہیں بلکہ خود خادم ہے، مخدوم نہیں۔''

آگے لکھتے ہیں: میرا عشق بھی ذیلدار پارک کی کوٹھی کے لان میں بیٹھ کر اس شخص کو دیکھنے سے ہوا، اور پھر ان کتابوں (مولانا مودودیؒ کی) نے میرے ہاتھ میں آنا تھا کہ میں اس سلسلۂ طریقت میں بیعت ہوگیا۔ لیکن روشن چہرے کے نور کا راز کئی سال بعد کھلا، جب میں نے سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث پڑھی: ''چہرہ تو اللہ کے تقویٰ سے روشن ہوتا ہے''۔ جہاں علم اور تقویٰ ایک جگہ جمع ہو جائیں وہاں میرے جیسے شخص کو پکار پکار کر کہنا پڑتا ہے: میں بھٹکا ہوا آہو تھا، مجھے سوئے حرم اس شخص کا علم اور چہرے کا نور لے آیا.................. اے اللہ! اگر ایک بھٹکے ہوئے آہو کو سوئے حرم لانے کا کوئی صلہ موجود ہے تو مجھے قیامت کے دن اس شخص کے حق میں یہ گواہی دینے کی توفیق عطا فرما۔''

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ڈاکٹر حمید اللہؒ

قرآن کریم اور سیرت پر تحقیق اور مستشرقین کے علمی مقابلے پر بیسویں صدی کی نمایاں ترین شخصیت

تعارف

آپ کا نام محمد حمید اللہ تھا۔

سلسلہ نسب یہ ہے: محمد حمید اللہ بن ابو محمد خلیل اللہ بن محمد صبغت اللہ قاضی بدر الدولہ۔

آپ کا تعلق نوائط برادری سے تھا جو جنوبی ہند کے ساحلوں پر آباد تھی اور تجارت و جہاز رانی کے پیشے سے وابستہ تھی۔ نویں صدی ہجری سے دین وعلم کی خدمت کی وجہ سے آپ کا خاندان عزت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ آپ کے دادا قاضی محمد صبغت اللہ عالمِ دین ہونے کے ساتھ ساتھ جنوبی ہند کے علاقے میں اردو کے پہلے نثر نگار مانے جاتے تھے۔ ان کی اردو میں چودہ، فارسی میں تیئس اور عربی میں انتیس کتابیں ہیں۔ سیرت پر ان کی تحریریں آج بھی موجود ہیں۔

ولادت

محمد حمید اللہ کی ولادت ۱۴ محرم ۱۳۲۶ ہجری مطابق ۱۹ فروری ۱۹۰۸ کو حیدر آباد دکن (انڈیا) میں ہوئی۔

تعلیم وتربیت

محمد حمید اللہ نے ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد سے حاصل کی جو نظام حیدر آباد کی حکومت میں معتمد مال گزاری تھے۔ بچپن ہی میں آپ نے قرآن کریم حفظ کرلیا اور حیدر آباد دکن کی مشہور روایتی درس گاہ دارالعلوم میں داخلہ لیا۔ چھ سال تعلیم حاصل کر کے درسِ نظامی مکمل کیا اور مولوی فاضل کی سند حاصل کی۔ دارالعلوم سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ابتدائی دور میں والد کی تربیت کے ساتھ ساتھ والدہ بی بی سلطان کی شخصیت کا بھی آپ پر بھرپور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اثر تھا۔ آپ کی والدہ جو بڑی متقی، صالحہ اور عابدہ خاتون تھیں آنحضرت ﷺ کی حیات مبارکہ کے قصے اور کہانیاں سنایا کرتی تھیں جو غیر شعوری طور پر آپ کے دلنشین ہوتی گئیں۔

میٹرک کے بعد جامعہ عثمانیہ سے ایف اے اور بی اے کیا۔ آپ کا پہلا مضمون جولائی ۱۹۲۸ء میں ہفت روزہ ''نونہال'' لاہور میں ''مدراس کی سیر'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس طرح لکھنے لکھانے کا سلسلہ شروع ہوا جو عمر بھر جاری رہا۔

اس دوران ایم اے اور ایل ایل بی کرنے کے بعد جامعہ عثمانیہ کے شعبہ تحقیقات میں تعیناتی ہوئی۔ طالب علمی کے زمانے میں نیز قیام حیدر آباد کے دوران جن شخصیتوں کا آپ کے اوپر گہرا اثر ہوا ان میں بہار کے مشہور عالمِ دین ابو محمد مصلح تھے جنہوں نے قرآن کی عالمگیر تحریک کی بنیاد ڈالی تھی۔ ان کے علاوہ اسکاؤٹ ماسٹر علی موسیٰ رضا مہاجر تھے۔ جامعہ کلکتہ کے پروفیسر محمد زبیر صدیقی اور دارالعلوم دیوبند کے مشہور و معروف عالم مولانا مناظر احسن گیلانی بھی ان اساتذہ میں سے تھے جن کے آپ ہمیشہ ممنون رہے۔

مزید تعلیم کے لئے آپ ۱۹۳۱ء میں جرمنی تشریف لے گئے۔ دو سال بعد بون یونیورسٹی میں اپنا مقالہ پیش کیا جس کا عنوان تھا ''اسلام کے بین الاقوامی تعلقات'' Muslim International Law اس پر آپ کو ڈی فل کی ڈگری ملی۔ پھر فرانس چلے گئے جہاں سوربون یونیورسٹی میں ''عہدِ نبوی اور خلافتِ راشدہ میں اسلامی سفارتکاری'' کا مقالہ پیش کیا اور ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کی۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری آپ کو اپنا مقالہ بعنوان Muslim Conduct of State پیش کرنے پر جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن سے ملی۔ یوں محض ۳۲ برس کی عمر میں آپ اپنے وطن کے علاوہ بیرونِ ملک سے بھی اعلیٰ ڈگریاں حاصل کر چکے تھے۔

طالب علمی کے دور سے ہی ڈاکٹر حمید اللہ برصغیر پاک و ہند کے مشہور علمی و ادبی جرائد سے نہ صرف متعارف تھے بلکہ آپ کے مضامین اور مقالے بھی ان میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہتے تھے۔ ان مضامین کے موضوعات سے ہی اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کا ذہن تحقیقی رجحانات رکھتا تھا اور نئے موضوعات پر قلم اٹھانے کا شوق آپ کو ابتداء ہی سے تھا۔ مثلاً ''اردو کا رواج ٹیپو سلطان کی فوج میں''، ''آٹھویں صدی ہجری میں مصر و شام کی ڈاک کا انتظام''، ''نہر سوئز کا پراجیکٹ حضرت عمرؓ کے زمانے میں'' جیسے اعلیٰ پائے کے تحقیقی مضامین آپ کے دورِ طالب علمی کی یادگار ہیں۔ ''عالمگیر تحریکِ قرآنی'' کے نام سے جو انجمن قائم ہوئی اس کا مقصد دنیا کی ساری زبانوں میں قرآن مجید کے ترجمے شائع کرنا تھا۔ اس سلسلے میں آپ نے بھی اپنی خدمات پیش کیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تقسیمِ ہند اور ڈاکٹر حمید اللہ کا ترکِ وطن

آپ اپنے علمی مشاغل میں مصروف تھے کہ تقسیمِ ہند کا معاملہ پیش آ گیا۔ ریاستِ حیدر آباد دکن نے پاکستان یا بھارت سے الحاق کرنے کے بجائے آزاد رہنے کو ترجیح دی لیکن ستمبر ۱۹۴۸ء میں بھارت نے جابرانہ فوج کشی کے ذریعے اس پر قبضہ کر لیا۔ اس مختصر مدت میں ڈاکٹر صاحب سیاسی محاذ پر سرگرم ہوئے اور ریاستِ دکن کی طرف سے سفارتی مشن پر مختلف ملکوں کا دورہ کیا۔ ابھی آپ فرانس میں تھے کہ دکن کا سقوط ہو گیا۔ اس واقعے کے بعد آپ پلٹ کر کبھی وہاں نہ گئے اور اگلے اڑتالیس سال تک پیرس میں ہی مقیم رہے۔

مستشرقین کے مقابلے پر

ڈاکٹر صاحب نے زندگی کا بڑا حصہ یورپ میں گزارا جہاں سے آپ نے ڈی لٹ اور ڈی فل کی ڈگریاں بھی حاصل کیں۔ وہاں کی لائبریریاں، کتب خانے اور رسائل سب آپ کی نظر میں تھے۔ خصوصاً جرمنی اور فرانس کے قیام کے دوران آپ کو اندازہ ہوا کہ اسلام پر موجود زیادہ تر مواد مستشرقین کے ہاتھوں تحریر کردہ ہے۔

مستشرقین دراصل مسلمانوں کی غلامی کے دور کی پیداوار تھے۔ سیاسی اغراض و مقاصد کے پیش نظر مغرب میں مسلمانوں اور محمد ﷺ کے بارے میں تحقیق و مطالعہ کی جستجو پیدا ہوئی۔ مغربی مصنفین نے مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت اور سماجی اقدار سمیت ہر موضوع پر لکھا۔ غیر جانبدار اور انصاف پر مبنی تحقیق کی چند استثنائی مثالوں کے علاوہ بالعموم ان کاوشوں کا مقصود یہ تھا کہ اسلام کی ایسی تصویر کشی کی جائے کہ مسلمان خود دل کی کشادگی کے ساتھ مسلمان نہ رہ سکے اور غیر مسلم بھی اس مذہب کو لائقِ توجہ نہ سمجھے۔ اپنے اس مقصد میں وہ بہت حد تک کامیاب رہے۔ جدید تعلیم یافتہ طبقے کو انہی کی کتابیں میسر تھیں۔ ان کے مطالعے کا لازمی نتیجہ اسلام کے مستقبل سے ناامیدی، حال سے بیزاری اور ماضی سے بدگمانی کی صورت میں نکلتا تھا۔ ان کے اندر صرف نام کی مسلمانی رہ جاتی تھی۔ جب مسلمانوں کا یہ حال تھا کہ وہ اسلام کے بارے میں معذرت خواہانہ رویہ رکھتے تھے تو دوسرے مذاہب کے لوگوں کو دینِ اسلام کی حقانیت پر قائل کرنا امرِ محال تھا۔

مستشرقین نے یہ کام بڑی ہوشیاری سے کیا۔ اسلام کے بارے میں بظاہر شدت پسند رویہ اختیار کرنے کے بجائے پورے صبر و سکون کے ساتھ اسلام کی تعلیمات کو پیش کیا۔ البتہ مبہم انداز میں جگہ جگہ اس طرح کے سوالات اور تبصرے شامل کیے کہ ایک شخص جو اسلام کی تعلیمات کا گہرا فہم نہ رکھتا ہو وہ بدظن ہو جائے۔ وہ جانتے تھے کہ محض الزامات لگا کر اور غصے اور نفرت کا اظہار کر کے وہ اپنا مقصد حاصل نہیں کر سکتے کیونکہ اسلام کی تعلیمات اتنی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

معقول ہیں اور نبی اکرم ﷺ کی شخصیت اتنی مکمل اور قابلِ تقلید ہے کہ اسلام دشمنی پر مبنی ان کی باتوں کی طرف کوئی متوجہ نہ ہوگا۔

دوسری طرف مسلمان معاشرے غلامی کی فضاء میں سانس لے رہے تھے۔ ان میں موجود دینی طبقے کی ساری توانائیاں خارجی اثرات سے بچنے اور مسلمانوں میں اسلام کی رمق برقرار رکھنے کے لئے صَرف ہورہی تھیں۔ آگے بڑھ کر اقدامی طور پر اسلام کو غیر مسلم معاشروں میں پیش کرنے کی ہمت کسی نے نہ کی جب کہ عیسائی مشنریاں عیسائیت کی تبلیغ کے لئے مسلمان معاشروں میں پوری طرح سرگرم تھیں۔ اگر وہ نری تبلیغ پر بھروسہ کرتے تو شاید انہیں صدیاں لگ جاتیں جب بھی وہ لوگوں کو تثلیث کے عقیدے پر قائل نہ کر پاتے چنانچہ انہوں نے مقامی زبان اور طریقے سیکھ کر رفاہی کام بڑے پیمانے پر انجام دیئے اور اسی بنیاد پر اپنے دین کو پھیلایا۔

مختصراً یہ کہ عیسائی دنیا نہ صرف اپنے محکوم علاقوں میں اپنے مذہب کی تبلیغ زور وشور سے کر رہی تھی بلکہ یورپ اور امریکا میں بھی اسلام کو وہ اپنے انداز سے پیش کر رہے تھے تا کہ اگر کوئی اس طرف متوجہ بھی ہو تو وہ اسلام کی کہانی ان کی زبانی سنے۔

جرمنی اور فرانس یورپ کے دو ایسے ممالک تھے جن کا شمار استشراق کے اہم ترین مراکز میں ہوتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے دونوں جگہ قیام کیا اور خصوصاً فرانس میں تو آپ تقریباً نصف صدی تک مقیم رہے۔ اردو، عربی اور فارسی پر تو قدرت تھی ہی آپ نے انگریزی، جرمن، فرنچ، اطالوی، روسی اور تھائی زبانوں پر بھی عبور حاصل کر لیا۔ آپ نے یورپ میں قیام کے دوران مغربی محققین اور مستشرقین کے طریقے (یا طریقۂ واردات) کا مطالعہ کیا، ان کے حربوں کو پہچانا اور پھر ان ہی کی زبان میں، ان کے طرزِ تحریر کو اختیار کرتے ہوئے انتہائی معیاری مضامین، کتابوں اور مقالات کا ڈھیر لگا دیا۔

ڈاکٹر صاحب نے ان تمام سوالات کے جواب دیئے جنہیں مستشرقین نے دراصل لوگوں کو کنفیوز کرنے کے لئے اٹھایا تھا۔ یہاں ہم مختصراً ان چند ایک الزامات کا جائزہ پیش کرتے ہیں جن پر ڈاکٹر صاحب نے قلم اٹھایا۔

مستشرقین کو معلوم تھا کہ قرآن کے محفوظ ہونے پر وہ کوئی اعتراض نہیں کر سکتے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کے جھٹلانے والے کے پاس اس کے ثبوت کے لئے سرے سے کوئی دلیل موجود نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ احادیثِ نبوی پر زور آزمائی کی کوشش کی گئی اور یہ ثابت کیا گیا کہ احادیث کا ذخیرہ سخت مشکوک ہے کیونکہ اس کی جمع وتدوین کا کام تیسری صدی ہجری میں شروع کیا گیا۔ اس طرح دین کے دوسرے اہم ترین مآخذ سے مسلمانوں کا اعتبار کم کرنے کی مذموم کوشش ہمیں اس وقت کامیاب ہوتی دکھائی دیتی ہے جب اس کے اثرات ہم

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آج تک اپنے معاشرے میں محسوس کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب ماضی قریب کی ان چند شخصیات میں سے ہیں جنہوں نے اس بات پر دلائل وشواہد فراہم کیے کہ حدیث کی تحریر کا کام خود آپ ﷺ کے زمانے میں شروع ہو چکا تھا۔ آپ ﷺ کے انتقال کے بعد ان صحابہ کے نام سامنے آتے ہیں جنہوں نے اپنے اپنے مجموعے ترتیب دے رکھے تھے۔ بعد میں یہ ذخیرے زبانی اور تحریری دونوں طور سے تابعین کو منتقل ہوئے جنہوں نے اپنے شاگردوں کو سکھایا اور جمع، تدوین وترتیب کا کام بڑے پیمانے پر شروع ہوا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر صاحب کی کوششوں سے ''صحیح بخاری'' کے اولین مآخذ ''صحیفہ ہمام بن منبہ'' کو دریافت کیا گیا اور اسے مرتب ومدوّن کیا گیا۔ آپ نے یہ ثابت کیا کہ حضرت ابوہریرہؓ جن سے سب سے زیادہ احادیث مروی ہیں کے شاگرد ہمام بن منبہ کی مدون کی گئی احادیث اور بخاری کی احادیث میں سرِ موفرق نہیں ہے جو بخاری کی احادیث کے درست ہونے کا ثبوت ہے۔

مستشرقین نے اس بات پر بھی زور صرف کیا کہ یہ ثابت کریں کہ نبی کریم ﷺ نے تبلیغ کی غرض سے خطوط دوسرے قبائل اور عرب سے باہر مختلف بادشاہوں کو نہیں بھیجے اس لئے کہ آپؐ نے عالمگیر نبی ہونے کا دعویٰ کبھی نہیں کیا بلکہ آپؐ صرف عرب کی اصلاح کے لئے آئے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ بعد میں مسلمانوں نے عیسائیوں کی نقالی میں اپنے دین کی تبلیغ کے لئے جعلی خطوط گھڑ لئے۔ آپ نے ''مکتوباتِ نبوی بنام نجاشی کی نئی دستیابی'' کے عنوان سے تحریر کرتے ہوئے ان اعتراضات کے جوابات دیئے بلکہ خود عیسائیوں سے سوال کیا کہ حضرت عیسیٰؑ کے متعلق تو انجیل میں مذکور ہے کہ وہ بنی اسرائیل کے نبی ہیں اور خود ان کا قول درج ہے کہ میں صرف نبی اسرائیل کی بھیڑوں کے لئے بھیجا گیا ہوں۔ تو پھر عیسائی کیوں عیسائیت کی تبلیغ غیر اسرائیلیوں کو کرتے ہیں۔

مستشرقین نے وحی اور نزولِ وحی کی کیفیت کو بھی موضوع بنایا۔ جرمنی کا مشہور مستشرق اسپرنگر (جو کافی عرصہ ہندوستان میں مقیم رہا) عربی کا ماہر تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ علمِ طب کی بھی اسے شدبد تھی۔ اس نے اپنی علمی مہارت دکھاتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ (نعوذ باللہ) وحی کی کیفیت گویا مرگی کی علامت تھی۔ اس کی دلیل کے طور پر وہ یہ کہتا ہے کہ اس دوران آپ ﷺ کے چہرے کا سرخ ہو جانا، سردیوں کے موسم میں پسینے سے شرابور ہو جانا اور کبھی کبھار اس موقع پر آپ ﷺ کا لیٹ جانا یہ تمام علامات دراصل مرگی کی ہیں جسے مسلمان نزولِ وحی کی کیفیت کہتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے اس دروغ گوئی کو رد کرتے ہوئے انتہائی صبر وتحمل کے ساتھ عقلی دلائل کی روشنی میں ثابت کیا کہ رسول اللہ ﷺ کو مرگی جیسے کسی مرض کا شائبہ تک نہ تھا۔ روایات سے یہ بات پتہ چلتی ہے کہ نبی اکرم ﷺ کا وزن دورانِ وحی بہت بڑھ جاتا تھا جب کہ مرگی کے مریض کے ساتھ اس طرح نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مرگی کا مریض ہاتھ پاؤں مارتا اور شور مچاتا ہے نیز طرح طرح کی آوازیں نکالتا ہے۔ یہ بات بھی آپ ﷺ پر ثابت نہیں ہوتی کیونکہ نزول وحی کے بعد آپ ﷺ بالکل ہشاش بشاش ہوتے تھے۔ تیسری دلیل ڈاکٹر صاحب نے یہ پیش کی کہ مرگی والے شخص کی اولاد میں بھی عمومی طور پر یہ مرض منتقل ہوتا ہے لیکن آپ ﷺ کی کسی اولاد میں اس مرض کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔

ایک اور نکتہ اٹھاتے ہوئے ڈاکٹر حمید اللہ کہتے ہیں کہ مرگی کا مریض دورہ پڑنے پر بے خود ہو جاتا ہے جب کہ آپ ﷺ کو خود پر پورا قابو رہتا تھا۔ حتیٰ کہ ایک بار آپ ﷺ کے ہاتھ میں گوشت کا ٹکڑا تھا کہ وحی کا نزول شروع ہو گیا۔ نزولِ وحی کا دورانیہ مکمل ہونے پر بھی گوشت کا ٹکڑا آپ ﷺ کے ہاتھ میں رہا اور گرا نہیں۔ اس طرح ڈاکٹر صاحب نے اس بے بنیاد الزام کا شافی جواب دے کر مغربی مصنفین کا منہ بند کر دیا۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنی تحریروں میں مستشرقین کا خوب خوب علمی محاسبہ بھی کیا۔ آپ نے خاص طور سے ان مقامات اور موضوعات کی نشاندہی کی جہاں انہوں نے حالات، واقعات اور تاریخی شواہد کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے اور قرآن و احادیث کے الفاظ و معانی کی غلط تشریحات کے ذریعے لوگوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کی تھی۔

بقول پروفیسر خورشید احمد:

> ''میری نگاہ میں ڈاکٹر حمید اللہ مسلمانوں میں پہلے اور آخری مستشرق ہیں۔ مستشرق میں ان کو اس لئے کہہ رہا ہوں کہ انہوں نے مستشرقین کے طرزِ تحقیق پر ایسی قدرت حاصل کر لی تھی جیسی غزالی نے یونانی فلسفے پر۔ وہ تحقیق اور طریقِ تالیف کے باب میں مستشرق تھے لیکن اس پہلو سے مستشرقین سے مختلف تھے کہ ان کا قبلہ درست تھا۔ ان کے اصل مآخذ قرآن و سنت اور مسلمانوں کے معتبر اہلِ علم کی تصانیف تھیں۔ انہوں نے اسلام کو جیسا کہ وہ ہے دنیا کے سامنے پیش کیا۔ البتہ تحقیق و تصنیف، تلاش و جستجو، نقد و احتساب کے ان تمام ذرائع کو کامیابی اور قدرت کے ساتھ استعمال کیا جو مستشرقین کا طرۂ امتیاز سمجھے جاتے ہیں اور اس طرح علمی میدان میں اہلِ مغرب کا جو قرض مسلمانوں پر تھا اسے فرض کفایہ کے انداز میں ڈاکٹر صاحب نے چکا دیا اور ساتھ ہی ساتھ وہ کیا جسے انگریزی محاورے میں Paying in the same coin کہا جاتا ہے۔ الحمد اللہ''۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تحقیقی کام

ڈاکٹر صاحب نے اندازاً ۱۶۵ سے زائد کتب اور ایک ہزار مقالات تحریر کیے۔ آپ کے اسلوب کی خاص بات آپ کا تحقیقی انداز تھا۔ آپ جس موضوع پر قلم اٹھاتے اس سے متعلق پوری معلومات جمع کرتے۔ آپ سمجھتے تھے کہ اصل Source اور مآخذ سے فائدہ اٹھانا زیادہ درست طریقہ ہے۔ مثلاً سیرت پر لکھتے ہوئے آپ قدیم جاہلی ادب، کتب انساب وسوانح اور سفرناموں سے مدد لیتے ہوئے عہد نبوی کے مختلف پہلوؤں کی تشریح کرتے۔ اپنے کام کے دوران آپ نے مطبوعات ہی نہیں بلکہ مخطوطات سے بھی استفادہ کیا۔ مضمون کی تفہیم کے ساتھ الفاظ کی تحقیق، ان کے مآخذ، استعمال اور مماثلات کی وضاحت کرتے۔ مقامات کی تحقیق کے ساتھ ایسی جزئیات کی بھی حیثیت متعین کرتے جن پر دوسرے لوگوں کی توجہ نہ ہوتی۔

اسی وجہ سے آپ کی تحریریں نادر، نایاب اور دلچسپ معلومات پر مشتمل ہوتیں اور قاری کو نئے سرے سے سوچنے پر مجبور کرتیں۔ اس تمام تحقیق اور تجسس کے لئے آپ کو جس عرق ریزی سے کام لینا پڑتا اس کا اندازہ ایک واقعے سے ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صلاح الدین ثانی لکھتے ہیں

> ''ایک مرتبہ ڈاکٹر حمید اللہ نے مجھے لکھا کہ آج کل میں اپنے فرانسیسی ترجمے پر نظر ثانی کر رہا ہوں۔ آپ یہ بتائیں عربی زبان میں ''یا ویلتنا''، ''یا ویلتا'' اور ''یا ویلنا'' میں کوئی فرق ہے یا نہیں؟ اور اگر فرق ہے تو اسے فرانسیسی یا انگریزی زبان میں کیسے بیان کیا جائے۔ اس کا جواب ڈھونڈنے کے لئے میں نے جن حضرات سے بھی رجوع کیا تو اکثر کے ذہن میں یہ سوال ہی پہلی دفعہ آیا تھا کہ ان کے درمیان کچھ فرق بھی موجود ہے۔''

ڈاکٹر صاحب نے جب سیرت پر کام شروع کیا تو آپ کو اندازہ ہوا کہ سیرت نبوی ﷺ پر عمومی طور سے اور خصوصاً حربیاتی پہلو پر تحقیق کی کافی گنجائش ہے۔ آپ جب غزوۂ احد کے بارے میں لکھنے بیٹھے تو خیال آیا کہ اہلِ مکہ نے جبلِ احد کا انتخاب کیوں کیا اور یہاں آ کر پڑاؤ ڈالنے کے پیچھے کیا خاص وجہ تھی۔ اس لئے کہ مکہ تو مدینہ کے جنوب میں واقع ہے اور جبلِ احد شمال میں ہے۔ کافی سوچ بچار کے بعد آپ اس نتیجے پر پہنچے کہ شاید موجودہ احد وہ مقام نہیں جہاں غزوۂ احد پیش آیا تھا۔ اس کے لئے آپ نے خاص طور سے اس جگہ کا مطالعاتی دورہ کیا۔ خود فرماتے ہیں ''جب میں نے برسرِ موقع مطالعہ کیا تو وہ چیز سمجھ میں آئی جو بیسیوں کتابوں کی سالہا سال ورق گردانی سے بھی نہ آئی تھی۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مدینہ شہر اس دور کی آبادیوں کے وسط میں واقع تھا۔ جنوب

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مشرق میں گنجان باغ اور مشرق میں مسلسل یہودی محلے تھے جب کہ جنوب میں بلند پہاڑیاں اور گھاٹیاں تھیں لہٰذا شمال کی طرف سے حملے کا ارادہ باندھا گیا۔''

اسی طرح حنین کے میدانِ جنگ کا جغرافیہ یقینی نہیں تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کا پتہ چلانے کے لئے کیا کوشش کیں، خود فرماتے ہیں: ''حالیہ سالوں میں متعدد اہل علم سیاحوں نے اس جگہ کا پتہ لگانے کی کوشش کی اور ۱۳۵۷ھ ہجری کے اواخر میں حج کے زمانے میں آٹھ سال کے وقفے کے بعد میں نے اس کی دوسری بار جستجو کی۔ اب کی بار ساٹھ ستر میل کی مسافت گدھے پر طے کرنے کے باوجود بھی گوہرِ مراد افسوس سے اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ہاتھ نہ آیا''۔

آگے لکھتے ہیں: ''اصل میں ہم لوگ اب تک حنین کو مکہ مکرمہ اور طائف کے بیچ میں ڈھونڈتے رہے ہیں اور اب میں محسوس کرتا ہوں کہ یہ قصور ہمارا ہی ہے کہ مقصد کو نہیں پہنچتے۔ سب لوگ جانتے ہیں اور مانتے ہیں اور احادیث میں بھی صراحت سے ذکر ہے کہ سوائے تبوک کے موقع کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ فوجی مہمات میں توریہ (دکھاوا) فرمایا کرتے تھے اور غیر سمت میں چل کر نامانوس اور سنسان راستوں سے گذر کر دشمن کو انجانے میں جا لیتے تھے۔ اس لئے یہ قطعاً غیر حقیقی ہے کہ آپ ﷺ مکہ مکرمہ سے طائف کو سیدھے راستے سے گئے ہوں''۔
یہاں پہنچ کر ڈاکٹر صاحب قاری کو گومگو کی کیفیت میں نہیں چھوڑتے۔ آپ کا دماغ اس جنگی اسکیم کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے جو آپ ﷺ نے ترتیب دی تھی۔ جو خاکہ آپ کے دماغ میں بنتا ہے اس میں قاری کو شریک بھی کرتے ہیں لیکن ان اخذ کردہ نتائج پر اصرار نہیں کرتے۔ آپ کے بقول ''میرا اصول رہا ہے کہ کسی پر اعتراض نہ کروں۔ واقعات کو اس طرح پیش کروں کہ لوگ اپنے ممکنہ اعتراض کا جواب خود ہی پالیں۔''

یہاں حنین کے میدان سے متعلق آپ نے یہ اندازہ قائم کیا کہ ''اب رسول اکرم ﷺ کی فوجی نقل وحرکت بہت صاف سمجھ میں آتی ہے اور وہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ہوازن کو قلعہ بند شہر طائف میں پہنچنے سے روکا جائے۔ آپ ﷺ مکہ مکرمہ سے تقریباً شمال میں روانہ ہوتے ہیں اور نصف دائرہ سا بنا کر حنین پہنچتے ہیں اور تھوڑی سی دشواری کے بعد دشمن کو تتر بتر کر کے پھر اسی طرح چکردار راستے سے آگے بڑھتے ہوئے اوطاس سے ہو کر لیہ پہنچتے ہیں اور وہاں کی گڑھی منہدم کر دیتے ہیں۔ اس کی فتح اہلِ طائف کے لئے بڑا معاشی دکھ پہنچاتی ہے۔ پھر آگے بڑھ کر طائف کو ایسے رخ سے گھیر لیتے ہیں جدھر وسیع میدان ہیں اور پڑاؤ وغیرہ کی سہولت ہے۔ مگر جدھر سے آپ ﷺ کے آنے کا اہلِ طائف کو گمان نہیں ہو سکتا۔''

یہاں اس طویل اقتباس کے درج کرنے کا مقصد ڈاکٹر صاحب کے تحقیقی ذہن کو سامنے لانا تھا۔ آپ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چاہتے تو عام انداز کو اختیار کرتے ہوئے سیرت کی پرانی کتابوں سے چند حوالے دے کر مطمئن ہو سکتے تھے لیکن جب تک آپ کی تسلی نہ ہو جاتی اور آپ کسی رائے پر نہ پہنچتے اس وقت تک تحقیق و جستجو جاری رکھتے خواہ اس اطمینانِ قلب کے لئے آپ کو سینکڑوں میل کا سفر ہی کیوں نہ طے کرنا پڑتا۔ جوانی کی عمر تو جستجو کی ہوتی ہی ہے لیکن حیرت اس وقت ہوتی ہے جب ۶۶ برس کی عمر میں ڈاکٹر صاحب جزیرہ نمائے عرب میں اپنی فیلڈ ریسرچ میں مشغول نظر آتے ہیں جہاں آپ نقشوں کی مدد سے خاص ان مقامات کا دورہ کرتے ہیں جہاں نبی اکرم ﷺ نے کبھی پڑاؤ کیا یا آپ ﷺ کا گذر ہوا۔ تحقیق کی ایسی سچی خواہش اور طلب دورِ حاضر کے علماء میں سے بہت کم کے حصے میں آئی۔

سیرتِ رسول اللہ ﷺ پر کام

یہ بیان گذر چکا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی والدہ بچپن میں آپ کو نبی اکرم ﷺ کی زندگی کے واقعات سنایا کرتی تھیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں ''اسی وقت میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ بعد میں جب پڑھ کر فارغ ہوں گا اور اللہ نے صاحبِ قلم بنایا تو اسی کو موضوع بناؤں گا۔ اس موضوع سے میری والہانہ دلچسپی تمام تر ماں کی تربیت کا فیض ہے۔''

ابتدائے اسلام کی سفارت پر مواد جمع کرتے ہوئے آپ کی توجہ علمِ سیرت پر تحقیق کی طرف مبذول ہوئی۔ اسلامی قانون آپ کا بنیادی مضمون تھا، مگر جب ایک بار سیرت پر لکھنا شروع کیا تو ستر برسوں کی علمی زندگی میں سے آخری ۳۵ برس آپ نے زیادہ تر اسی پر لکھا۔ فرانسیسی زبان میں سیرتِ نبوی پر ''پیغمبر اسلام: حیات اور کارنامے'' کے نام سے دو جلدوں کی کتاب لکھی جو ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ فرانسیسی زبان میں اس موضوع پر اپنی نوعیت کی شاندار کتاب ہے۔

سیرت پر آپ کے کام کی سب سے انوکھی بات اس کے موضوعات کا چناؤ ہے۔ آپ نے عام سیرت نگاروں کی طرح واقعات کو دہرانے کے بجائے آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے وہ پہلو اجاگر کئے جن پر کام کرنے کی گنجائش باقی تھی۔ مثلاً ''حضور اکرم ﷺ کی تعلیمی کوششیں''، ''رسولِ اکرم بطور مقنن''، ''سرورِ کائنات کی حکومت'' اور ''آنحضرت ﷺ اور جوانی'' وغیرہ۔ اس کے علاوہ ڈھیروں ایسے موضوعات ہیں جو بالواسطہ طور پر سیرت کا احاطہ کرتے ہیں مثلاً ''عہدِ نبوی کی سیاستِ خارجہ کا شاہکار''، ''عہدِ نبوی کے اصول سیاسیات''، ''عہدِ نبوی کے عرب ایرانی تعلقات'' اور ''عہدِ نبوی کے واقعات کے لئے تقویمی پیچیدگیاں''۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ڈاکٹر صاحب کے تحقیقی مزاج نے آپ کو لائبریریاں چھاننے پر مجبور کیا۔ جرمنی کی ایک لائبریری میں تلاش کے دوران آپ کو صحیفہ ہمام بن منبہ ملا۔ یہ صحیفہ جو ابوہریرہؓ کے نامور شاگرد ہمام نے ان سے سن کر تحریر کیا تھا نایاب تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے لئے از حد خوشی اور اعزاز کی بات تھی کہ اسے دریافت کرنے، تالیف کرنے اور اشاعت کرنے کا کارنامہ قدرت نے آپ سے لیا۔ اس صحیفے کی اشاعت نے دنیا بھر میں حدیث کے شائقین کے لئے جہاں اطمینان کا سامان کیا وہیں احادیث کی صحت پر کلام کرنے والوں کے منہ بند کر دیئے۔ نہ صرف یہ کہ اس صحیفے میں شامل احادیث اور صحیح بخاری اور دیگر کتب کی احادیث میں کوئی فرق نہ تھا بلکہ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ حدیث کی کتابت دورِ رسالت مآب ﷺ اور دورِ خلافتِ راشدہ ہی میں شروع ہوگئی تھی۔

اسی طرح مکتوباتِ نبوی پر تحقیق کے دوران ڈاکٹر صاحب نے کسریٰ کے نام آپ ﷺ کے خطوط دریافت کر لئے۔ ان خطوط کے فوٹو شائع کئے گئے۔ آپ نے یہ بھی ثابت کیا کہ احادیث کا ایک بہت بڑا ذخیرہ خود نبی اکرم ﷺ کی زندگی میں تحریر ہو چکا تھا۔ عہدِ نبوی ﷺ کی جن تحریری دستاویزات کا آپ نے حوالہ دیا ان میں مختلف بادشاہوں اور سرداروں کے نام آپ ﷺ کے خطوط (جن کی تعداد سوا دو سو تک پہنچتی ہے) کے علاوہ مردم شماری کی رپورٹ، گورنروں کو ہدایات، زکوٰۃ اور دیگر محصولات کے قوانین اور شرح محاصل پر تیار کردہ دستاویزات شامل ہیں۔

سیرت کی قدیم اور مشہور ترین کتاب جس کو محمد بن اسحٰق نے تحریر کیا تھا وہ صدیوں سے ناپید تھی اور اس کا ایک خلاصہ ''سیرۃ ابن ہشام'' کی شکل میں دستیاب تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کا اصل عربی متن دریافت کر کے شائع کروایا۔

سیرت اور نبی اکرم ﷺ کی ذات سے آپ کے والہانہ عشق کا ثبوت ایک واقعے سے ملتا ہے۔ ایک بار آپ سید سلیمان ندوی سے ملاقات کے لئے دارالمصنفین گئے۔ کتب خانے کی عمارت میں داخل ہونے سے پہلے آپ نے جوتے اتار لئے۔ آپ سے کہا گیا کہ کوئی حرج نہیں آپ جوتا پہن کر آیئے مگر ڈاکٹر صاحب کا استدلال تھا کہ ''جہاں سیرت نبوی ﷺ لکھی گئی ہو وہاں میں جوتا پہن کر کیسے جاؤں؟'' ڈاکٹر صاحب کا علمی مزاج نظر میں رکھیں تو یہ عاشقانہ کلمات باعثِ تعجب معلوم ہوتے ہیں۔

قرآن مجید کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ

ڈاکٹر صاحب نے خیال کیا کہ فرانسیسی زبان میں قرآن کریم کا مستند اور صحیح ترجمہ دستیاب نہیں ہے۔ چنانچہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آپ نے اس عظیم کام کا آغاز کیا اور محض اٹھارہ ماہ کی قلیل مدت میں مکمل کر لیا۔ یہ ترجمہ شائع ہوتے ہی بے حد مقبول ہو گیا اور اب فرانسیسی مسلمانوں، افریقہ کے فرانسیسی بولنے والوں اور ان غیر مسلموں کے لئے جو اسلام کو سمجھنے میں دلچسپی رکھتے ہوں اس زبان میں قرآن سمجھنے کا بہترین ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔

اس سے قبل فرانسیسی زبان میں جتنے تراجم موجود تھے چاہے وہ غیر مسلموں نے کیے ہوں یا خود مسلمانوں نے، ان میں بڑی خامیاں تھیں۔ کچھ تراجم ادھورے تھے کچھ کا ادبی پایہ بلند تھا تو صحت کمزور تھی۔ ڈاکٹر صاحب کا ترجمہ ان تمام خامیوں سے پاک تھا چنانچہ ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور اب تک اس کے کم وبیش ۲۰ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

ترجمے سے پہلے ابتداء میں وحی، نزول وحی، قرآن وحدیث کا فرق، قرآن کا طرز بیان، قرآنی تصورِ حیات، قرآنی اشاروں کا تاریخی پس منظر، عربی خط، اعراب، تجوید وتلاوت کے اصول اور تراجم پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے تاکہ نئے پڑھنے والے کا ذہن ابتداء ہی میں شک وشبہات اور سوالات میں نہ گھر جائے۔ یہ ایسی بے مثال کوشش ہے جسے ہر زبان میں کرنے کی ضرورت ہے۔ قرآن کی طرف بلانے والوں کو اس پہلو کی طرف خصوصی توجہ دینی چاہیے۔

مبلّغِ اسلام

ڈاکٹر صاحب نے صرف علم وتحقیق میں زندگی نہیں گذاری بلکہ اسلام کی تبلیغ کا کام بھی انتہائی خلوص مگر خاموشی سے کیا۔ اس معاملے میں آپ کو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی۔ آغازِ شباب میں آپ کے چچا اور استاد قاضی محمود نے آپ کو نصیحت کی تھی کہ ''تم فرنگیوں میں اسلام کی اشاعت وتبلیغ ضرور کرنا''۔ آپ نے یہ بات یاد رکھی اور انفرادی ملاقاتوں سے لے کر تبلیغی دوروں اور ملکی اور بین الاقوامی کانفرسوں میں ہر جگہ آپ نے دعوت کا کام کیا۔

پیرس میں آپ کا گھر اسلام کی تعلیم وتبلیغ کا اہم ترین مرکز تھا۔ یہاں آپ مقامی وغیر مقامی طلباء کو تعلیم دیتے تھے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر ایم ایچ عسکری اپنے مشاہدات میں لکھتے ہیں:

> ''پیرس میں جب کبھی ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کے لئے ان کے یہاں پہنچا تو انہیں نوجوان طلباء میں گھرا ہوا پایا جن میں سے بیشتر کا تعلق شمالی افریقہ کے فرانسیسی بولنے والے ملکوں سے ہوتا تھا اور جو ڈاکٹر صاحب سے اسلام اور قرآن اور فقہ کے مسائل پر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مصروفِ گفتگو ہوتے تھے۔ مجھے یہ بتایا گیا کہ نوجوانوں کی ایک کثیر تعداد جن میں امریکی، یورپی اور افریقی شامل تھے ان کے زیرِ اثر حلقہ بگوشِ اسلام ہوئی تھی''۔

ڈاکٹر صاحب اپنے تحقیقی کاموں میں بے تحاشہ مصروف ہونے کے باوجود لوگوں کی علمی اور روحانی پیاس بجھانے اور ان کی ہدایت کے لئے انہیں وقت دینے میں بہت فراخ تھے۔ پیرس کی جامع مسجد میں ہر اتوار کو قرآن کریم اور اسلامی تعلیمات کا درس دیتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کو تبلیغ اسلام میں جو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی وہ اللہ کی خاص توفیق کے ساتھ ساتھ آپ کے متاثر کن انداز اور مثالی زندگی کی مرہونِ منت تھی۔ آپ غیر مسلموں سے انتہائی خندہ پیشانی سے پیش آتے تھے۔ عمومی طور پر مسلمانوں میں دو قسم کے رجحان دیکھنے میں آتے ہیں۔ یا تو وہ غیر مسلموں خصوصاً مغربی معاشروں سے انتہائی متاثر ہوتے ہیں اور اس حد تک جا پہنچتے ہیں کہ اپنی ہر شے اور ہر قدر پر خود ہی اعتراض کرنے لگتے ہیں یا پھر دوسری صورت میں مسلمانوں کے علاوہ ہر ایک کے لئے تحقیر اور نفرت کے جذبات رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے نفرت کے بجائے ہمدردی کا رویہ اختیار کیا۔ یہاں تک کہ مقامی لوگ بھی جب تحقیقی کاموں میں آپ سے مدد کے خواستگار ہوتے تو آپ ان کی راہنمائی کرتے۔ دعوت و تبلیغ کے سلسلے میں غیر مسلمانوں سے دوستی اور تعلق کو آپ ناگزیر سمجھتے تھے۔

مادام میاروچ نامی خاتون جو پیرس میں آپ کے محلے ہی میں رہتی تھیں فارسی سیکھنے کے شوق میں آپ کے پاس آتی رہیں اور کچھ عرصے کے بعد مسلمان ہوگئیں۔ کہا جاتا ہے کہ جن لوگوں نے آپ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا ان کی تعداد ہزاروں میں ہے۔ ان میں کئی عیسائی پادری اور راہب بھی تھے۔ آپ صبح صبح جا کر مسجد میں بیٹھ جاتے اور دین کی تعلیم کے خواہاں حضرات کے سوالات کے جواب دیتے۔ اگر کوئی اسلام قبول کرنا چاہتا تو ڈاکٹر صاحب اس کی ہر طرح سے مدد کرتے۔

نومسلموں کی دینی تعلیم و تربیت پر آپ کی خاص توجہ تھی۔ آپ ان کی ذہنی سطح کو سامنے رکھتے ہوئے ان کے مطالعے کے لئے دینی کتب کا انتخاب اور فراہمی کا انتظام خود کرتے۔ اکثر و بیشتر دوسرے ممالک میں کانفرنسوں اور علمی مذاکرات میں شرکت سے اس لئے انکار کر دیتے کہ کہیں نومسلموں کی تربیت میں خلل نہ آئے۔ دعوت و دین کے کاموں میں مشغولیت اور ان کی اہمیت کا احساس آپ کو اس قدر تھا کہ دنیائے اسلام کا یہ اتنا بڑا اسکالر اپنے دینی بھائیوں کو ناظرہ قرآن تک خود پڑھا دیا کرتا تھا۔

آپ کی دعوتی سرگرمیوں نے حکومتِ فرانس کو خوف میں مبتلا کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب کی سرگرمیوں پر نظر رکھی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جاتی، آپ کے پروگراموں کو چیک کیا جاتا اور آپ کی ڈاک سینسر کی جاتی۔ آپ کو فرانس کے عیسائی ماحول کے لئے خطرہ سمجھا جانے لگا۔ خود ایک مقام پر لکھتے ہیں ''حکومت مخالف ہے، چرچ مخالف ہے، ان کے پاس وسائل ہیں، اس کے باوجود لوگ مسلمان ہو رہے ہیں۔ یہ حیرت انگیز چیز ہے۔ سوائے اس کے کچھ نہیں کہہ سکتے کہ اللہ کی مہربانی ہے، اللہ کا فضل ہے۔''

اسلامی قانون

ڈاکٹر صاحب نے اپنے علمی کیریئر کی ابتداء قانون اور تاریخ کے طالب علم اور بعد میں استاد کی حیثیت سے کی۔ آپ کا ایم۔ اے کا مقالہ ''مسلم کنڈکٹ آف سٹیٹ'' اور بون یونیورسٹی میں پیش کیا جانے والا مقالہ ''اسلام کے بین الاقوامی قانون میں غیر جانبداری کا اصول'' اس موضوع سے آپ کی دلچسپی کا ثبوت ہے۔ اس تحقیق کے بعد آپ نے فلسفۂ قانون، اصولِ قانون اور بین الاقوامی قوانین پر قلم اٹھایا۔ اس کے علاوہ قانون سے متعلق متعدد مشہور کتابوں کے تراجم بھی کیے اور بہت جلد ایک ماہر قانون کی حیثیت سے شہرت حاصل کر لی۔ ان تراجم کے ساتھ ساتھ آپ نے مغربی افکار کے تنقیدی مطالعے کا بھی اہتمام کیا۔

آپ کا یادگار علمی کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے دلائل وحقائق کے زور سے علمی دنیا پر یہ ثابت کیا کہ بین الاقوامی قانون کے اصل بانی مسلمان فقہاء اور علماء ہیں۔ اس سے قبل مغربی دنیا اسلامی قانون کو قانونِ روما سے ماخوذ سمجھتی تھی اور دورِ جدید میں سترہویں صدی کے مفکرین کو اس کا سارا کریڈٹ دیا جاتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے بڑے واضح انداز میں قطعی دلائل دے کر ثابت کیا کہ اس ضمن میں مسلمان فقہاء کے کارناموں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ''قانون بین الممالک کے اصول اور نظیریں'' ڈاکٹر صاحب کی ایک ایسی کتاب ہے جو قانون کے نظریات اور تصورات پر تنقیدی جائزے کے ساتھ ساتھ اسلامی تصورات سے متعلق ایک تقابلی مطالعے پر مشتمل ہے۔ خطباتِ بہاولپور میں بین الاقوامی قانون پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''بہر حال جسے مغربی مصنفین ماڈرن انٹرنیشنل لاء کہتے ہیں، میں اس کو انٹرنیشنل لاء کہنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ۱۸۵۶ء تک معینہ قاعدوں پر یورپ میں صرف عیسائی سلطنتوں کے آپس کے تعلقات کے ضمن میں عمل کیا جاتا رہا۔ غیر عیسائی سلطنتوں کے لئے ان معینہ قواعد پر عمل کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ ۱۸۵۶ء میں پہلی مرتبہ مجبوراً یورپی عیسائی سلطنتوں نے اعتراف کیا کہ اس قاعدے کا اطلاق ایک غیر عیسائی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سلطنت یعنی ترکی کے ساتھ بھی ہوگا۔

اس کے بعد تقریباً ساٹھ ستر سال کا وقفہ پڑا اور دوسری سلطنت جس کو یورپی حکومتوں نے انٹرنیشنل لاء کے قواعد کا اہل سمجھا وہ جاپان تھا، جب اس نے ۱۹۰۵ کی جنگ میں روس کو شکست دی۔ اس کے بعد پہلی جنگِ عظیم شروع ہوتی ہے۔ اس وقت کچھ اور سلطنتوں کو بھی اس کا اہل سمجھا گیا۔ اس سلسلے میں کچھ شرطیں رکھی گئیں جن کو پورا کرنے کے بعد کسی سلطنت کو لیگ آف نیشنز کا رکن بنایا جاتا تھا۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد لیگ آف نیشنز کے بجائے ''مجلسِ اقوامِ متحدہ'' کا قیام عمل میں آیا۔ اس میں بھی ہر ملک کو اپنی ذاتی حیثیت سے رکن بنایا نہیں جاتا جب تک کہ کم سے کم دو ایسی سلطنتیں جو پہلے سے مجلسِ اقوامِ متحدہ کی ممبر ہوں سفارش نہ کریں اور یہ اطمینان نہ دلائیں کہ یہ واقعی ایک متمدّن ملک ہے، انٹرنیشنل لاء پر عمل کرتا ہے اور اس کا مستحق ہے کہ اس کے ساتھ انٹرنیشنل لاء کے مطابق عمل کیا جائے۔ ان حالات میں میں اپنے اس ابتدائی بیان کو دہراتا ہوں کہ اگر انٹرنیشنل لاء چند مخصوص قوموں کے لئے نہیں بلکہ اس کا اطلاق دنیا کے تمام ملکوں پر یکساں ہونا چاہئے، تو اس قانون کا آغاز مسلمانوں سے ہوا اور شاید اب بھی مسلمانوں ہی کے ہاں وہ قانون ہے، کسی دوسرے کے پاس تا حال نہیں آیا''۔

آگے لکھتے ہیں: ''اس کے برعکس اسلامی قانون میں اس فرق و امتیاز کی گنجائش نہیں کہ کوئی ملک مسلمانوں کے معیار کے قواعد پر عمل کرتا ہے یا نہیں کرتا۔ حتیٰ کہ ہم دیکھتے ہیں کہ اگر کوئی دشمن ہمارے ساتھ غیر انسانی برتاؤ کرے، تب بھی ہم اس کے ساتھ اپنے قواعد کے مطابق انسانیت کا برتاؤ کرتے ہیں۔ ان حالات میں مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ قانون بین الممالک جو حقیقت میں بین الممالک بھی ہو اور قانون بھی ہو، مسلمانوں سے شروع ہوتا ہے۔''

ڈاکٹر صاحب دنیا کے دیگر قوانین سے اسلامی بین الاقوامی قانون کا تقابل پیش کر کے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ اسلامی بین الاقوامی قانون آفاقی اور عالمگیر ہے اور وہ انسانی معاشرے کی بین الاقوامی تشکیل میں ایک موثر کردار ادا کرسکتا ہے کیونکہ وہ انسان کو رنگ و نسل، علاقہ و قوم اور زبان و معاشرت کی قید سے نکال کر ایک عالمگیر انسانی معاشرے کا حصہ بناتا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خطباتِ بہاولپور

۱۹۸۰ میں اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کے وائس چانسلر عبدالقیوم قریشی صاحب کی دعوت پر ڈاکٹر صاحب بہاولپور پاکستان تشریف لائے اور بارہ خطبات پر مشتمل لیکچرز کی سیریز کے ذریعے مسلمانوں کی علمی، فکری، سیاسی اور اجتماعی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔

ان خطبات نے غیر معمولی شہرت حاصل کی۔ عوام اور خواص نے انہیں بے پناہ دلچسپی سے سنا۔ موضوعات کا انتخاب ڈاکٹر صاحب نے خود کیا۔ ہر خطبے کے بعد سوال جواب کا سلسلہ ہوتا جس میں موضوع سے متعلق اور بعض اوقات ہٹ کر سوال ہوتے۔ معیاری اور غیر معیاری ہر قسم کے سوالات کے جواب آپ انتہائی تحمل اور شائستگی سے دیتے۔ سوال کو سنجیدگی سے لیتے اور جواب کے آغاز میں ہی یہ بات واضح کر دیتے کہ ''یہ میری رائے ہے، ضروری نہیں کہ آپ اس سے متفق ہوں۔'' سوال کرنے والا خواہ کسی بھی علمی سطح کا ہوتا آپ جواباً طنزیہ گفتگو یا ناگواری کا انداز اختیار کرنے سے گریز کرتے۔ ڈاکٹر صاحب خود امام شافعی کے مسلک سے وابستہ تھے مگر مختلف فقہی مباحث کے دوران آپ وحدتِ امت اور اخوتِ اسلامی کے اہم ترین اصول کو پیش نظر رکھتے۔

ان خطبات کی علمی حیثیت اور ان کی عام پسندیدگی کی بناء پر ان کو کتابی شکل میں مدوّن کیا گیا اور اب اس کا انگریزی ترجمہ بھی دستیاب ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ کاوش ایسے بنیادی علمی سوالات کے جواب فراہم کرتی ہے جن کا جاننا ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے۔ مثلاً قرآن مجید کیسے مدون ہوا، حدیثوں کے قابل اعتبار ہونے کی تاریخی دلیل کیا ہے، مختلف فقہی مسالک کے اختلاف کی کیا حقیقت ہے، اسلام کے تعلیمی، معاشی اور قانونی نظام کے خدوخال کیا ہیں، وغیرہ۔ پھر اس پر ڈاکٹر صاحب کا سادہ انداز اور طرزِ استدلال قاری کی دلچسپی برقرار رکھتے ہوئے اسکے علم اور یقین دونوں میں بیش بہا اضافہ کرتا ہے۔

غرض قرآن، حدیث، فقہ کی تاریخ اور قانون بین الممالک کے علاوہ دیگر اہم موضوعات پر ڈاکٹر صاحب کی تحقیق کا نچوڑ اس کتاب میں نظر آتا ہے اور جدید پڑھے لکھے طبقے کے لئے اس کا مطالعہ نہایت مفید ثابت ہوسکتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی شخصیت اور ذاتی کردار

ڈاکٹر صاحب کی زندگی میں آپ کی علمی کاوشوں کے علاوہ جو چیز بہت نمایاں نظر آتی ہے وہ طبیعت کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سادگی، دینِ اسلام کے لئے آپ کا خلوص اور طبعی انکساری تھی۔

آپ کی طبیعت میں ایسی قناعت تھی اور طرزِ زندگی اتنا سادہ تھا کہ اس کی مثال قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں میں ہی ملتی ہے۔ آپ نے ۱۹۴۸ء میں جو فلیٹ پیرس میں کرائے پر لیا تھا وہ ایک ایسی عمارت کی چوتھی منزل پر تھا جس میں لفٹ نہ تھی۔ اپنے پیرس کے قیام کے آخری ایام تک آپ اسی میں سکونت پذیر رہے۔ فلیٹ کیا تھا ایک چھوٹی سی لائبریری تھی۔ ساز و سامان سے خالی، بس ہر طرف اور ہر جگہ کتابیں ہی کتابیں تھیں۔ روایتی باورچی خانے اور الماریوں سے مبرا آپ کا گھر آپ کی ضروریات کے لئے کافی تھا۔ آپ صرف زندہ رہنے کے لئے بقدرِ ضرورت کھاتے تھے۔ پیرس میں حلال گوشت کی دستیابی آسان نہ تھی چنانچہ زمانۂ طالبعلمی میں ہی گوشت کو خیر باد کہہ دیا تھا۔ سلاد، سبزی اور پنیر پر گزارہ ہوتا تھا۔ بعد میں جب یہ شبہ ہوا کہ پنیر میں بھی جانوروں کی آنتوں کی چربی استعمال ہوتی ہے تو اسے بھی چھوڑ دیا۔

ڈاکٹر صاحب نے امام ابن تیمیہؒ کی طرح زندگی بھر شادی نہ کی۔ اپنی تمام ضروریات اور اپنے سب کام آپ خود ہی کرتے تھے۔ لباس کے معاملے میں بھی انتہائی سادگی برتتے تھے۔ مولانا ابو علی عبدالباری ڈاکٹر صاحب سے اپنی ملاقات کا حال لکھتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ کس طرح ڈاکٹر صاحب کے سادہ حلیئے کو دیکھ کر ان کے لئے ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کا اندازہ لگانا مشکل ثابت ہوا۔ کہتے ہیں: ''میں نے ان کی ظاہری وضع وہیئت دیکھ کر ان کو چشمہ فروش سمجھا۔ سر پر غالباً کلپاخ ٹوپی، گلے میں سفید کھدر کی شیروانی جس میں بجائے بیدر کے اعلیٰ درجے کی بٹن کے بہت معمولی سیپ کے بٹن لگے ہوئے تھے۔ ٹانگوں میں سفید زین کا پرانا پتلون جس میں کہنگی کی وجہ سے جا بجا سوراخ ہوگئے تھے اور وہ نظر آ رہے تھے اور پیروں میں معمولی بوٹ اور جوتا''۔

ڈاکٹر صاحب لوازمات سے بھرپور زندگی گذارنے کے عادی نہ تھے۔ سخت کوشی آپ کے مزاج کا حصہ بن چکی تھی۔ پاکستان میں اپنے قیام کے دوران جب آپ بورڈ تعلیماتِ اسلامیہ کے ممبر کی حیثیت سے پاکستان تشریف لائے تو اپنی رہائش گاہ سے دفتر تک روزانہ پیدل آتے اور یہ فاصلہ کم از کم تین میل تھا۔

پروفیسر خورشید احمد ڈاکٹر صاحبؒ سے اپنی ملاقات کا حال اس طرح لکھتے ہیں ''میں نے ان کو ایک دبلا پتلا اور سادہ سا فقیرِ منش انسان پایا۔ اکہرا بدن، لمبا قد، صاف رنگ، کتابی چہرہ، اوسط لمبائی کی مگر غیر کفی داڑھی، پر نور آنکھیں اور ان سے بڑھ کر انکسار کا مجسمہ، تواضع کا پتلا، سادگی کا پیکر۔ جس چیز نے سب سے زیادہ حیران کیا وہ یہ تھی کہ اسمبلی کے دفتر میں کرتے پاجامے میں ملبوس اور پاؤں میں کھڑاویں۔ پتہ نہیں آج کی نئی نسل اس شئے سے واقف بھی ہے یا نہیں؟ ہمارے بچپن میں وضو کے لئے لکڑی کی سادی سی چپل ہوتی تھی جسے کھڑاؤں کہتے تھے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جو بالعموم غسل خانے میں رکھی جاتی تھی۔ میرے ذہن کے کسی گوشے میں یہ تصور نہ آ سکتا تھا کہ کوئی اسمبلی کے دفتر میں کھڑاؤں پہنے بیٹھا ہو۔''

ڈاکٹر صاحب کس طرح کام کرتے تھے اس کا اندازہ اس واقعے سے ہوتا ہے جب 1979 میں اسلام آباد میں ایک سیمینار میں شرکت کے لئے آئے تو آپ کو آپ کی کتاب Muslim Conduct Of State کا ترجمہ پیش کیا گیا تاکہ آپ اس پر نظر ثانی کر سکیں۔ مغرب کی نماز کے وقت ہوسٹل جاتے ہوئے آپ کو مسودہ دیا گیا تو اگلے دن صبح ساڑھے نو بجے آپ نے ساڑھے پانچ سو صفحات پر مشتمل کاغذات کا پلندہ غلطیوں کی اصلاح کر کے واپس کر دیا۔ یاد رہے کہ ڈاکٹر صاحب اپنی کتابوں میں درست الفاظ کے استعمال کے بارے میں بہت محتاط تھے۔

ڈاکٹر صاحب زندگی کے ہر معاملے کی طرح لکھتے وقت بھی ''ضیاع'' سے بچنے کی بھرپور کوشش کرتے تھے۔ چھوٹے سے کاغذ پر باریک باریک اس طرح لکھتے کہ کوئی جگہ ضائع نہ ہو۔ یہ فلسفۂ ضیاع جس کے مفہوم سے اکیسویں صدی کے مسلمان نامانوس ہیں ڈاکٹر صاحب کے لئے کتنا اہم تھا اس کا اندازہ اس واقعے سے ہوتا ہے جو ڈاکٹر محمود احمد غازی سناتے ہیں ''میں نے سرکاری طور پر ایک جگہ کا چارج لیا تو پہلے جو سربراہ تھے ان کے دور میں کئی ہزار عید کارڈ چھپے ہوئے تھے چنانچہ عید کے موقع پر وہ مختلف لوگوں کو بھجوائے۔ ان میں سے ایک کارڈ ڈاکٹر حمید اللہ کو بھی بھجوا دیا۔ اس کے جواب کے طور پر ڈاکٹر صاحب نے لکھا:

> ''مکرمی السلام علیکم۔ آپ کا عید کارڈ ملا۔ یاد رکھنے کا شکریہ۔ لیکن یہ دیکھئے کہ اگر دنیا کے ایک ارب مسلمانوں میں دس فیصد یعنی دس کروڑ لوگ کارڈ بھیجیں اور ایک کارڈ کی قیمت ایک روپے بھی ہو اور اس کو بھیجنے کی لاگت ایک روپے ہو تو یہ ۴۰،۳۵ کروڑ روپیہ مسلمانوں کا ضائع ہوا۔ اس کا کیا فائدہ ہوا؟ کیا اس سے تعلیمی ادارے نہیں بن سکتے تھے؟ کیا اس رقم سے دینی درسگاہیں نہیں بن سکتی تھیں؟ یا افریقی مسلمان جس مسئلے میں گھرے ہوئے ہیں ان کی مدد نہیں کی جا سکتی تھی؟ اس پر غور فرمایئے اور جو رائے ہو اس سے مطلع فرمایئے''۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے طرزِ زندگی کے انتخاب کے لئے اس حدیث رسول ﷺ کو سامنے رکھا: ''مجھ کو دنیا سے کیا واسطہ؟ میری اور دنیا کی (مثال) ایسی ہے کہ جیسے کوئی سوار چلتے چلتے کسی درخت کے نیچے ستانے کو ٹھہر جائے پھر اس (درخت / سایہ) کو چھوڑ کر اپنی راہ لے۔''

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سادگی کے علاوہ آپ کی طبیعت میں موجود انکساری بہت متاثر کن تھی۔ بہت سے لوگ بہت بڑے بڑے کام کرتے ہیں۔ ان کے کام کے اثرات بھی دور دور تک پھیلے نظر آتے ہیں لیکن جب بات بات پر وہ اپنے گن گاتے ہیں تو ان کی شخصیت کا سارا بھرم چکنا چور ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب اس کے برعکس نہ تو اپنی تعریف وتوصیف کروانا پسند کرتے اور نہ ہی ہر اچھی چیز کا کریڈٹ اپنے کھاتے میں ڈالتے بلکہ ہر چیز کی نسبت اللہ کی طرف کرتے تھے جو سب تعریفوں کا مستحق ہے۔ سینکڑوں بلکہ ہزاروں لوگوں نے آپ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ اس کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں ''یہاں الحمد للہ لوگ مسلمان ہو رہے ہیں۔ ہم موروثی مسلمانوں کا عمل تو نہیں صرف اللہ کی ہدایت سے وہ مسلمان ہو رہے ہیں''۔

جب آپ کے لئے کوئی خاص اہتمام کرنے کی کوشش کی جاتی تو اسے ہرگز قبول نہ کرتے۔ مولانا ابوعلی عبدالباری آپ سے اپنی اچانک ملاقات کا حال بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''جب ان سے کہا گیا کہ اگر آپ شاہ گنج سے تار کے ذریعے اپنی تشریف آوری کی اطلاع دیتے تو ہم آپ کو لینے کے لئے اسٹیشن آ جاتے تو فرمایا: ''استغفر اللہ استغفر اللہ، استغفر اللہ۔ میں کوئی بڑا آدمی تھا کہ آپ حضرات کو اسٹیشن تک آنے اور اپنا خیر مقدم کرنے کے لئے زحمت دیتا۔ میں تو ایک بہت معمولی طالب علم ہوں''۔ ان کے احترام اور اجلال میں جب بھی کوئی بات کہی جاتی تو وہ تین مرتبہ استغفار ضرور کرتے''۔ یہ سب صرف زبانی کلامی نہ تھا بلکہ عملی زندگی میں اس کے مظاہرے بھی وقتاً فوقتاً لوگ ملاحظہ کرتے۔ پروفیسر خورشید احمد ڈاکٹر صاحب سے متعلق اپنے مضمون میں لکھتے ہیں: ''میں نے ڈاکٹر صاحب کے ساتھ متعدد علمی مذاکرات میں شرکت کی ہے لیکن سب سے زیادہ یادگار وہ ضمیم کیمپ تھا جو فرانس میں ایک دیہاتی علاقے میں فرانس کے مسلمان طلبہ کی اسلامی تنظیم UMSO کے تحت منعقد ہوا تھا جس میں پانچ دن اور رات ہم نے ساتھ گذارے تھے۔ ڈاکٹر صاحب بھی عام طلبہ کی طرح زمین پر سوتے تھے اور اپنے برتن اپنے ہاتھ سے دھوتے تھے۔''

خطباتِ بہاولپور کے سلسلے میں جب آپ بہاولپور آئے تو آپ سے استدعا کی گئی کہ حاضرین کو اپنی اقتداء میں نماز پڑھائیں۔ اس ذمہ داری کو اپنا حق سمجھ کر قبول کرنے کے بجائے آپ نے اس سے معذرت کر لی۔ اس کے بالمقابل ہمیں اپنے اردگرد بہت سے ایسے علماء اور مذہبی لیڈر نظر آتے ہیں جن کی موجودگی میں اگر کسی اور کو امامت کی پیشکش کی جائے تو وہ اسے اپنی بے عزتی پر محمول کرتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی زندگی کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ سمجھ آتا ہے کہ آپ کی نظر ہمیشہ مقصد پر ہوتی تھی۔ اس راہ میں جو عزت، اعزاز و اکرام آپ کے ساتھ برتا جاتا آپ اس سے کنارہ کش ہو جاتے۔ شاید اس لئے کہ یہی اس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

راہ کا سب سے بڑا بت بھی ہے کہ اولاً آدمی خلوص نیت سے ایک کام کا آغاز کرتا ہے، بعد میں لوگ دین کی سمجھ وفہم اور تعلق کی بناء پر اس شخص کو اتنی اہمیت دینے لگتے ہیں جو اکثر وبیشتر اس کے نفس کو پھلا دیتی ہے اور آخرت کا اجر غارت ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی کم گوئی اور محفل ومجلس میں گرمجوشی کی کمی کو اسی تناظر میں دیکھنا چاہئے۔ آپ دعوتوں اور ضیافتوں کے جھمیلے میں بہت زیادہ پڑنا پسند نہیں کرتے تھے۔ اسی طرح تحفے تحائف کی وصولی کے سلسلے میں آپ کی جانب سے قدرے سختی کا مظاہرہ ہوتا تھا یہاں تک کہ اگر کوئی آپ کو تحفتاً قلم بھی پیش کرتا تو آپ معذرت کر لیتے۔

ڈاکٹر احمد خان کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں: ''آپ نے ریڈیو پر میری ثناء خوانی کا تذکرہ فرمایا ہے۔ کراچی کے مسلم ورلڈ میں جس دستوری خاکے کا خلاصہ آیا ہے اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ میری کوئی چیز بھی پسند نہ آئی۔ میرا نام نہ ہوتا لیکن میری تجویزوں میں سے کوئی ایک بھی قبول کر لی جاتی تو مجھے لاکھ گنا زیادہ مسرت ہوتی، خیر اللہ کی مرضی۔''

ڈاکٹر صاحب انعامات اور ایوارڈز سے حاصل شدہ رقم اسلامی اداروں کو دے دیا کرتے تھے۔ قرآن کریم کا فرانسیسی ترجمہ کرنے پر آپ کو کافی رقم ملی تھی۔ آپ نے وہ رقم ''مرکزِ ثقافتِ اسلامی'' کو دے دی۔ حکومت پاکستان کی جانب سے جب آپ کو سیرت سے متعلق خدمات پر دس لاکھ روپے کا ایک ایوارڈ دیا گیا تو پوری رقم ادارہ تحقیقاتِ اسلامی، اسلام آباد کی نذر کر دی۔ آپ سے سوال کیا گیا کہ آپ نے یہ رقم قبول کیوں نہ کی تو بے اختیار فرمایا ''اگر میں یہاں لے لیتا تو پھر وہاں کیا ملتا۔''

بیماری اور وفات

ڈاکٹر صاحب جس سادہ طرز زندگی کے عادی تھے اس کے لئے ایک قلیل رقم کافی تھی جو آپ کو اورینٹل اسٹڈیز ریسرچ سینٹر سے بطور وظیفے کے ملتی تھی جہاں پچیس سال خدمت کرنے کے بعد آپ ریٹائر ہو گئے تھے۔ یہ رقم آپ بینک میں جمع کرا دیتے تھے اور ضرورت کے مطابق اسے نکال کر استعمال کر لیتے تھے۔ ایک بار جب آپ کے پاس رقم ختم ہو گئی تو پیسے نکلوانے کی غرض سے بینک گئے۔ بینک جا کر معلوم ہوا کہ آپ کے اکاؤنٹ میں کچھ بھی موجود نہیں ہے۔ کسی بدبخت نے انتہائی چالاکی سے آپ کی تمام رقم نکلوا لی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کی غیرت نے یہ گوارا نہ کیا کہ اس واقعے کا تذکرہ کر کے کسی سے مدد مانگی جائے۔ آپ واپس آ گئے اور جیسے تیسے گذارا کرنے لگے یہاں تک کہ فاقے کی نوبت آ گئی۔ جمعے کی نماز کے لئے جانا تھا اور سواری کا انتظام بھی نہ تھا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پیدل چل پڑے۔ دھوپ کی تپش اور کئی دنوں کی فاقہ کشی پیرانہ سالی میں برداشت نہ کر پائے اور بیہوش ہو کر راستے میں گر پڑے۔ ہوش میں آنے پر لوگ ان حالات سے آگاہ ہوئے۔ ساری دنیا میں آپ کے معتقدین موجود تھے۔ آپ کسی ایک کو خبر کر دیتے تو وہ آپ کی مدد کو جی جان سے حاضر ہو جاتا مگر غیرت اور خودی کے تقاضے سے مجبور ہو کر آپ نے مدد کے لئے ہاتھ پھیلانے سے گریز کیا۔ یہ واقعہ 1996 کا ہے۔ اس کے بعد امریکا میں مقیم آپ کے بھتیجے کی بیٹی (سدیدہ) کے اصرار پر آپ وہاں منتقل ہو گئے۔ زندگی کے باقی دن انتہائی خاموشی سے گذارے۔ راقمہ نے اپنی ملاقات میں سدیدہ سے آپ کا حال دریافت کیا تو انہوں نے بتایا کہ ڈاکٹر صاحب اب بالکل خاموش ہو چکے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے گویا آپ کسی اور دنیا میں موجود ہیں۔ آپ کی سماعت بھی متاثر ہوئی تھی تاہم آپ آخری وقت تک اپنے معمول کے کام انجام دیتے رہے۔

۱۷ دسمبر ۲۰۰۲ء کو جیکسن ویل فلوریڈا میں آپ کا انتقال ہوا۔ پورے عالمِ اسلام میں اس خبر کو انتہائی افسوس کے ساتھ سنا گیا۔ ترانوے سال کی طویل عمر کی ڈاکٹر صاحب نے صحیح قدر کی اور وقت کے درست استعمال کے بارے میں ہمیشہ فکرمند رہے۔ قدرت نے بھی آپ کے وقت میں ایسی برکت دی کہ آپ کے کام کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ تنہا ایک فرد کے بجائے ایک ادارے کا کام ہے۔ محمود احمد غازی صاحب اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''بعض صوفیہ نے لکھا ہے کہ انسانوں کے لئے جو وقت اللہ تعالیٰ نے بنایا ہے اس میں کچھ لوگوں کے لئے عام وقت میں سے طول رکھا ہے، خاص انسانوں میں وقت کے لئے عرض بھی رکھا ہے اور خاص الخاص انسانوں کے لئے عمق بھی رکھا ہے اور اسمیں گہرائی بھی ہوتی ہے تو شاید ڈاکٹر صاحب کو اللہ تعالیٰ نے تین پہلو وقت Three Dimensional Time دے دیا تھا''۔

ہمہ وقتی مصروفیات کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر صاحب فطرتاً کم گو اور سادہ طبیعت انسان تھے، غیر ضروری باتوں اور رسمی تعلقات سے بہت دور۔ اس کے باوجود آپ کو ایسی ہر دلعزیزی نصیب ہوئی جو ہر ایک کے حصے میں نہیں آتی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مسلمانوں کی مختصر سیاسی تاریخ

خلافت راشدہ (۱۱ھ تا ۴۰ھ)

۱۰ ہجری میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد سیدنا ابوبکر صدیقؓ کو مسلمانوں کے پہلے خلیفہ کی حیثیت سے چن لیا گیا۔ خلافت کے آغاز کے ساتھ ہی پورا عرب ارتداد اور منکرین زکوٰۃ کی شورشوں اور بغاوتوں کی زد میں آ گیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے انتہائی کم وقت میں بہترین حکمتِ عملی کے ذریعے حضرت خالدؓ کی سپہ سالارانہ صلاحیتوں سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے نہ صرف ان پر قابو پا لیا بلکہ آگے بڑھ کر عراق اور شام میں فتوحات کے پرچم لہرائے۔

حضرت ابوبکرؓ صدیق کے دور کا ایک بڑا کارنامہ قرآن کریم کی کتابی شکل میں تدوین تھا۔ اس سے قبل قرآن کریم مختلف اوراق پر اور لوگوں کے سینوں میں محفوظ تھا۔ مختلف لڑائیوں میں سینکڑوں حفاظ اور قراء کی شہادت کے بعد خلیفۂ اول نے حضرت عمرؓ کے مشورے سے قرآن کریم کو کتابی شکل دے دی۔

محض ڈھائی برس کی خلافت کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ انتقال کر گئے اور اپنے پیچھے خلافت کے لئے حضرت عمرؓ کو نامزد کر گئے۔ اس نامزدگی کو عوامی حمایت اور مقبولیت حاصل تھی۔ حضرت عمرؓ کا دور ہر لحاظ سے مسلمانوں کا سنہرا ترین دور تھا۔ فتوحات، اقامتِ دین کی عملی اور قانونی کوششوں، عدل وانصاف، رعایا پروری اور انتظامِ حکومت کی خوبی کی وجہ سے ان کا ساڑھے دس سالہ دور مسلمانوں کی تاریخ میں مثالی قرار دیا جا سکتا ہے۔

اپنی شہادت سے پہلے حضرت عمرؓ نے صحابہ کرام کے چھ بہترین آدمیوں پر مشتمل کمیٹی کو خلافت کے فیصلے کا اختیار دیا جنہوں نے حضرت عثمانؓ کی خلافت پر اتفاق کیا اور یوں وہ مسلمانوں کے تیسرے خلیفہ کی حیثیت سے چنے گئے۔

حضرت عثمانؓ کی خلافت کے ابتدائی چھ سال انتہائی پرسکون اور حضرت عمرؓ کے دور کا تسلسل تھے۔ اس کے بعد ان کی چند پالیسیوں سے اختلاف کرتے ہوئے شورش پسندوں نے گڑبڑ پھیلانی شروع کی اور معاملہ اتنا بڑھا کہ حضرت عثمانؓ کی اس سازشیوں کے ہاتھوں شہادت پر آ کر ختم ہوا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انہی سازشوں، شورشوں اور ہنگاموں میں حضرت علیؓ کا انتخاب عمل میں آیا۔ عام لوگوں کے علاوہ سازشی گروہ بھی کھل کر حضرت علیؓ کی خلافت کی حمایت کر رہا تھا لہٰذا چند صحابہ جن میں گورنر شام حضرت امیر معاویہؓ اور مدینہ سے حضرت عائشہؓ شامل تھے نے بیعت خلافت سے پہلے حضرت عثمانؓ کی شہادت کا بدلہ لینے کا مطالبہ کیا۔ حضرت علیؓ اس پر پوری طرح راضی تھے لیکن ان کا موقف یہ تھا کہ استحکامِ سلطنت کے بعد اس مشکل کام کو انجام دینا چاہیے تاکہ سازشی جو مدینہ منورہ کی آبادی میں گھل مل گئے تھے انہیں سکون کے ساتھ تلاش کر کے سزا دی جائے اور عدالت کے تقاضے پورے کئے جاسکیں۔

حضرت عائشہؓ اور حضرت علیؓ میں بات چیت بڑی کامیابی سے آگے بڑھ رہی تھی کہ سازشیوں نے حضرت عائشہؓ کی فوج پر رات کی تاریکی میں شب خون مار کر نوبت جنگ تک پہنچا دی جو جنگِ جمل کے نام سے مشہور ہے اور جس میں حضرت علیؓ کو برتری حاصل ہوئی۔ حضرت امیر معاویہؓ نے بھی شام میں تیاریاں شروع کر دیں اور حضرت علیؓ کی خلافت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ صفین کے مقام پر ان کا باہم مقابلہ ہوا جس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا اور حضرت امیر معاویہؓ شام میں اور حضرت علیؓ باقی عرب اور مسلمان علاقوں کے خلیفہ کی حیثیت سے کام کرتے رہے یہاں تک کہ ۴۰ ھ میں ان آپ کی شہادت کا واقعہ پیش آیا۔

خلافتِ بنو امیہ (۴۱ھ-۱۳۲ھ)

سنہ ۴۰ ہجری میں حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد ان کے بیٹے امام حسنؓ، امیر معاویہؓ کے حق میں خلافت سے دستبردار ہو گئے اور یوں امیر معاویہؓ پورے عالمِ اسلام کے متفقہ خلیفہ تسلیم کر لئے گئے۔ اپنی وفات سے قبل وہ اپنے بیٹے یزید کو خلیفہ نامزد کر گئے اور اس کے حق میں سب سے بیعت بھی لے لی۔ کچھ نے خوشی سے اور کچھ نے مجبوراً اس فیصلے کو تسلیم کیا جو خلافت کو ملوکیت یا بادشاہت میں بدلنے کی طرف پہلا اور سب سے اہم قدم تھا۔ یزید اپنی تخت نشینی کے بعد محض چار برس ہی زندہ رہا۔ مگر اس کے بعد بھی خلافت بنو امیہ تک محدود ہو کر رہ گئی اور قریباً ایک صدی تک خاندانِ بنو امیہ کے بارہ حکمرانوں نے عالمِ اسلام پر حکومت کی۔

اموی حکمرانوں کا طرزِ حکومت ابتدا ہی سے بادشاہت کا رنگ لئے ہوئے تھا۔ خلافتِ راشدہ کے دور کی سادگی کا نام ونشان نہ رہا اور حکمرانوں نے شاہانہ طریقے اختیار کر لئے۔ ہر حکمران اپنے شوق پورے کرنے کے لئے بیت المال سے بے دریغ خرچ کرتا۔ خلیفہ سلیمان اور یزید بن ثانی کی عیش پرستی کی داستانوں سے ہر کوئی واقف تھا۔ امویوں نے دارالخلافہ دمشق میں اپنے رہنے کے لئے محلات تعمیر کئے اور خوبصورت عمارات، فواروں اور باغات سے اسے مزین کیا۔ ان تعمیرات میں گو عربی مذاق غالب تھا اور محرابوں، گنبدوں اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

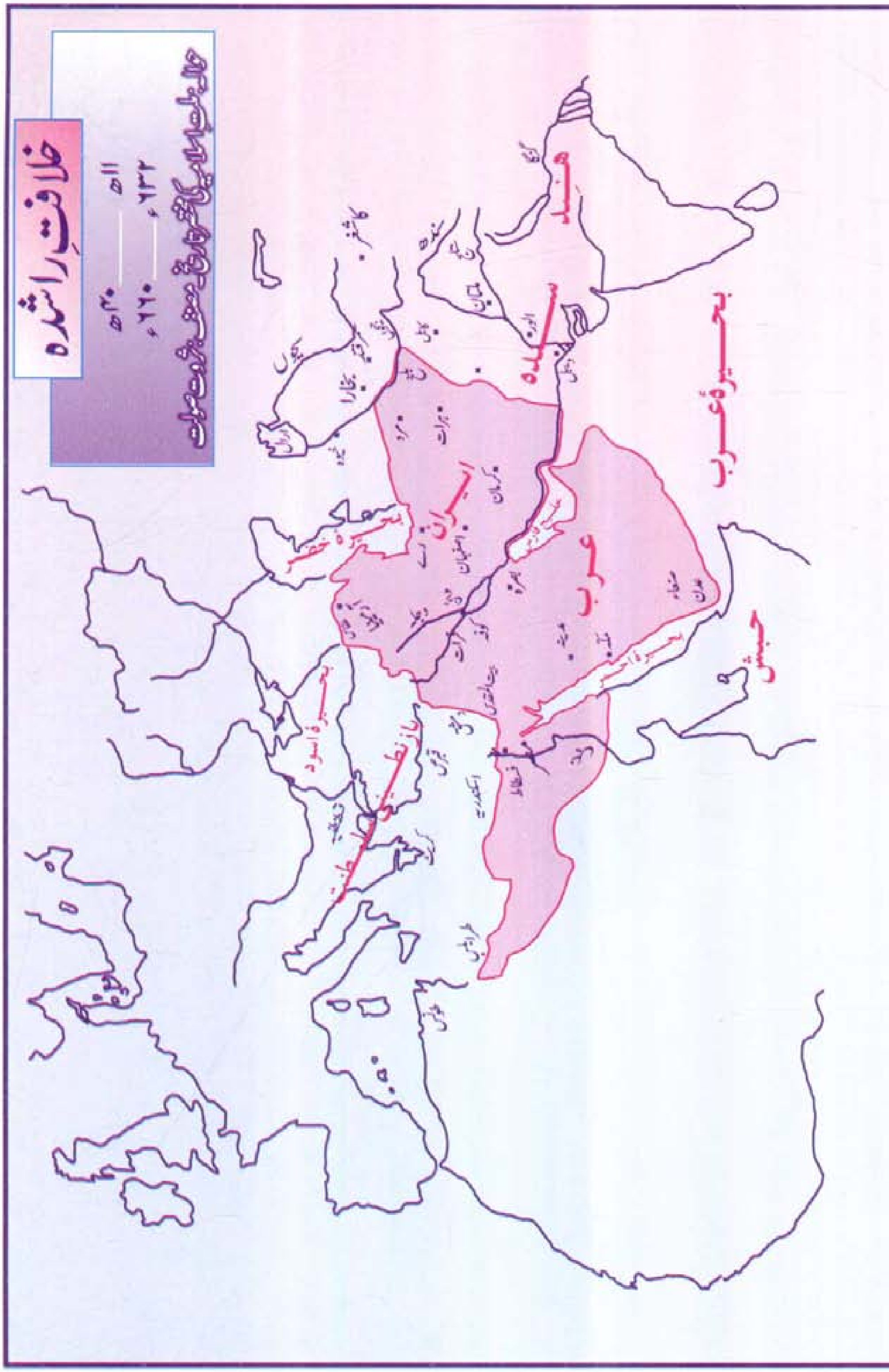

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

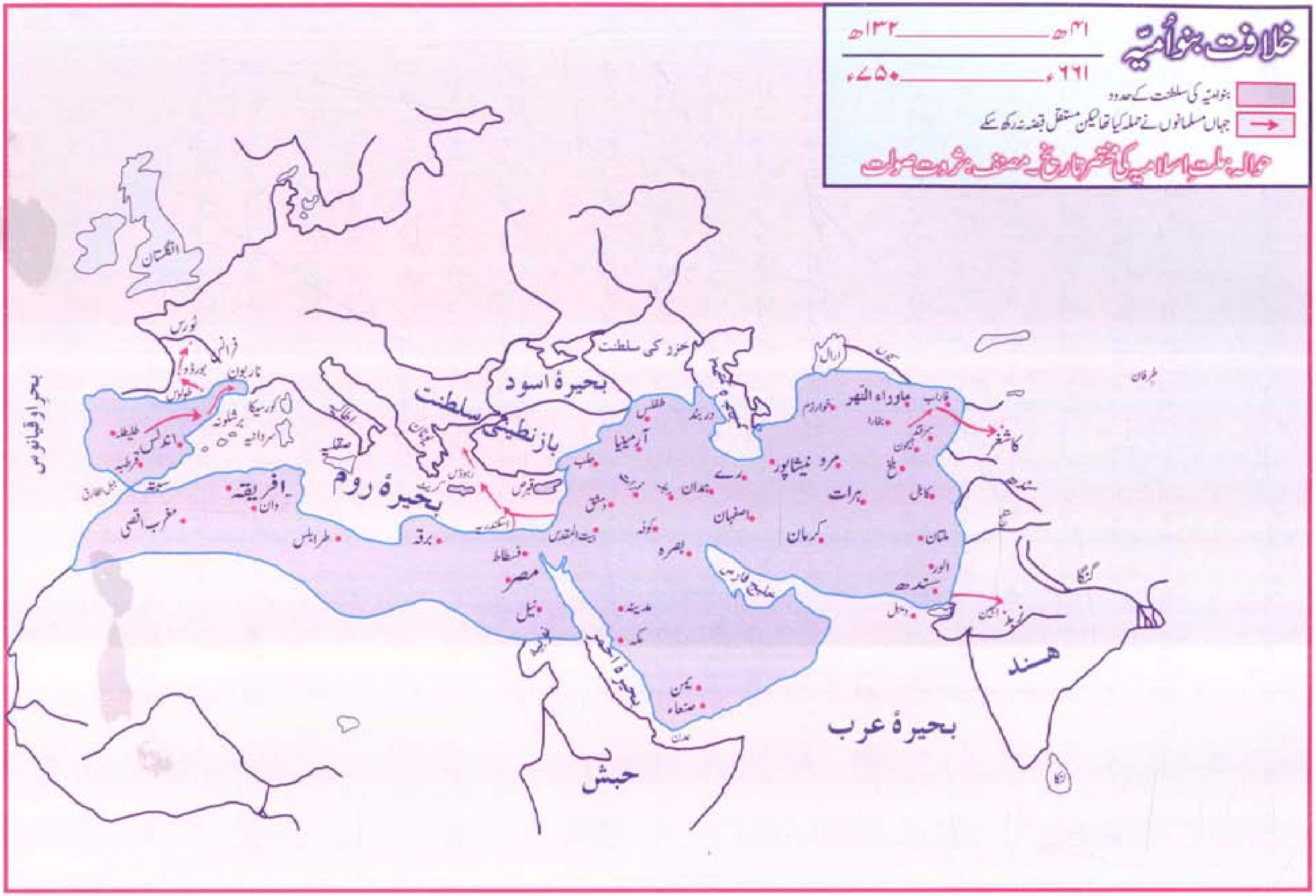

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میناروں نے فنِ تعمیر کو نئی جہت دے دی تھی، مگر عوامی پیسے کے بے محابا استعمال کی بدعت رائج ہونے کا نقصان کہیں زیادہ تھا۔

ابتداء میں اموی خلفاء فرصت کے اوقات میں قدیم عربوں کی شجاعت، دلاوری اور لڑائی کے قصے سنتے تھے۔ بعد میں نامور شعراء کو بلا کر دربار کی زینت بنانے کا آغاز ہوا تو اس کا ایک ضمنی فائدہ یہ بھی ہوا کہ وہ اپنی آتش بیانی سے رائے عامہ کو امویوں کے حق میں متاثر کرنے کا کام کرنے لگے۔ موسیقی کے ساتھ شاعری سننے کا رواج عام ہوگیا۔ اب تو ہر طرف سے مغنی دمشق پہنچنے لگے۔ موسیقی کے بعد رقص و سرود کا چرچا ہوا۔ ولید ثانی اس کا بہت دیوانہ تھا۔ اسی کے دور میں محل سرا میں مردوں کو خصی کر کے خواجہ سرا بنانے کی رسمِ بد کا آغاز بھی ہوا۔ عوامی مزاج بھی حکمرانوں کے مزاج کے ساتھ ساتھ بدلنے لگا۔ چوسر، گنجفہ اور مرغ بازی لوگوں کے فارغ اوقات کے مشغلے بن گئے۔

ان سب ناپسندیدہ امور کے ساتھ ساتھ بنوامیہ کے عمال اور حکام سخت ظالم تھے۔ علویوں اور ہاشمیوں کے علاوہ عام عوام بھی ان سے نالاں تھے۔ واقعہ کربلا، عبداللہ بن زبیرؓ کی شہادت اور خانہ کعبہ پر سنگ باری جیسے واقعات نے اموی حکومت کو غیر مقبول بنا دیا تھا۔ ایسے میں عمر بن عبدالعزیز نے جو اموی خاندان کے ہونے کے باوجود خلافتِ راشدہ کا احیاء چاہتے تھے اپنے دور میں بھرپور طریقے سے خلافِ شریعت چیزوں کو ختم کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ لیکن افسوس زندگی نے انہیں مہلت نہ دی اور ان کے انتقال کے ساتھ ہی اموی حکومت پرانے ڈھب پر آ گئی۔

اموی دور اپنی تمام تر خامیوں کے باوجود اس لحاظ سے قابلِ ذکر ہے کہ چار بڑے مسلمان سپہ سالاروں محمد بن قاسم، قتیبہ بن مسلم، موسیٰ بن نصیر اور طارق بن زیاد نے اسی دور میں اسلامی سلطنت کو ہندوستان، وسط ایشیاء، یورپ اور افریقہ تک پھیلا دیا۔ مگر افسوس وہ جرنیل جو ان فتوحات کے ہیرو تھے، حکمرانوں کے ذاتی عناد کی بھینٹ چڑھ کر بدترین انجام سے دوچار ہوئے۔ عوام حکمرانوں سے برہم ہو گئے اور ان کی ہمدردیاں بنوہاشم اور بنوعباس کے ساتھ ہوگئیں جو اس وقت کی واحد حزبِ اختلاف کی حیثیت رکھتی تھی (اگرچہ خوارج کا فرقہ بھی موجود تھا اور مستقل مقابلہ بلکہ مقاتلہ کرتا تھا، لیکن اپنے گمراہ کن نظریات اور شدت پسندی کی وجہ سے اسے عوامی حمایت حاصل نہ تھی)۔ عباسی تحریک نے سر اٹھایا اور اموی حکمرانوں کے بروقت تدارک نہ کر سکنے کی وجہ سے وہ معاملات کو اس حد پر لے گئے کہ جو بالآخر بنوامیہ کے زوال کا باعث بنے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عباسی تحریک کی کامیابی اور خلافتِ بنوعباس (۱۳۲ھ سے ۶۵۶ھ)

حضرت علیؓ کی اولاد اور ان کے حامیوں نے بنوامیہ کی غیر شرعی حکومت کو دل سے تسلیم نہ کیا اور اہلِ بیت کے اندر خلافت کا دعویٰ موجود رہا۔ حضرت امام حسینؓ کی شہادت کے بعد شیعانِ علی نے ان کے بیٹے امام زین العابدین کو خلیفہ بنانا چاہا تو انہوں نے سیاست میں آنے سے انکار کر دیا اور یوں حضرت علیؓ کے غیر فاطمی بیٹے محمد بن حنفیہ تحریک کے سرپرست کے طور پر چن لئے گئے۔ یہ تحریک خفیہ طور پر علوی اماموں کی سرپرستی میں پروان چڑھتی رہی۔ یہاں تک کہ امام ابو ہاشم نے حمیمہ جیسے چھوٹے سے علاقے میں وفات پائی۔ اس وقت وہاں بنو عباس کے محمد بن علی (جو حضور ﷺ کے چچا عباسؓ کے پڑپوتے تھے) کے علاوہ اہلِ بیت میں سے کوئی موجود نہ تھا، چنانچہ مرنے سے پہلے انہیں تحریک کے سربراہ کے طور پر نامزد کیا گیا۔ یوں امامت حضرت علیؓ کے خاندان سے حضرت عباسؓ کے خاندان میں منتقل ہوگئی۔ محمد بن علی نے اس کو فروغ دیا اور کوفہ اور خراسان میں بڑے پیمانے پر عباسی پروپیگنڈہ پھیلانا شروع کیا۔ لوگ پہلے ہی اموی حکام سے نالاں تھے، لہٰذا دھڑا دھڑ عباسی تحریک میں شامل ہونے لگے اور ان کے دلوں میں یہ بات راسخ ہوگئی کہ خلافت اور امامت کے حقوق آلِ ہاشم کو واپس ملنے چاہئیں۔ شروع شروع میں عباسی مبلغ ہر جگہ جا کر لفظ عباس کے بجائے ہاشمی پر زور دیتے تا کہ لوگ زیادہ سے زیادہ آلِ نبی کی محبت میں ان کے ساتھ ہو جائیں۔ یہ تدبیر کامیاب رہی اور کوفہ اور خراسان اس تحریک کے گڑھ بن گئے۔

۱۲۶ ہجری میں محمد بن علی نے مرنے سے پہلے اپنے تینوں بیٹوں ابراہیم، ابوالعباس اور ابوجعفر کو یکے بعد دیگرے نامزد کیا۔ امام ابراہیم نے امامت سنبھالی تو اسی دوران ابومسلم خراسانی (جو ایک نو مسلم تھا) نے اس تحریک میں شمولیت اختیار کی۔ اس کی غیر معمولی ذہانت سے متاثر ہو کر اسے امام نے اپنا نمائندہ خصوصی بنالیا۔ ابو مسلم خراسانی نے تحریک کو فوجی انداز میں منظم کیا اور باقاعدہ حکمت عملی کے تحت عربوں کے قبائل کو آپس میں لڑا دیا۔ امام ابراہیم کے بعد ابوالعباس نے ابومسلم خراسانی کے ساتھ مل کر اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور خراسان اور عراق پر قبضہ کر لیا۔ ۱۳۲ ہجری میں کوفہ کی جامع مسجد میں جب ابوالعباس سفاح کا خطبہ پڑھا گیا تو آخری اموی حکمران مروان الحمار کی آنکھیں کھلیں۔ وہ ایک لاکھ بیس ہزار کی فوج کے ساتھ مقابلے کو نکلا، مگر شکست کھا گیا۔ عوام میں اموی حکمران پہلے ہی غیر مقبول تھے، اس لئے اسے کہیں سے عوامی حمایت نہ ملی۔ بالآخر مصر پہنچ کر عباسیوں کے ہاتھ مارا گیا اور یوں بنوامیہ کی حکومت اپنے انجام کو پہنچی۔

ابوالعباس سفاح نے جس حکومت کی بنیاد رکھی وہ تاریخ عالم کی بڑی حکومتوں میں شمار کی جاتی ہے۔ ۵۲۴

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سالہ عباسی حکومت کا آغاز جتنا زریں تھا، انجام اتنا ہی بھیانک ہوا۔ خلافتِ بنوعباس کو عروج وزوال کے حوالے سے تین ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

خلافتِ عباسیہ کا پہلا زرّیں دور (۱۳۲ھ سے ۲۴۸ھ)

عروج وترقی کا یہ بے مثل دور ۱۱۵ سال پر محیط ہے۔ اس عرصے میں دس خلفاء تخت نشین ہوئے۔ یہ ذاتی خوبیوں سے متصف ہونے کے ساتھ ساتھ انتظامِ حکومت کو بہترین طور سے چلانے میں کامیاب ہوئے۔

عباسیوں نے اپنا دارالخلافہ دمشق کے بجائے بغداد منتقل کردیا اور پھر اس شہر کو ایسا عروج نصیب ہوا کہ یہ دولت وثروت اور علوم وفنون کا مرکز سمجھا جانے لگا۔ اس میں محلات کی اتنی کثرت تھی کہ اسے محلات کا شہر بھی کہتے تھے۔ یہ شاہی محلات اپنی خوبصورتی اور زیبائش کے لحاظ سے دنیا بھر میں اپنی نظیر نہ رکھتے تھے۔ عباسیوں نے علوم وفنون کی خوب سرپرستی کی۔ اس معاملے میں ان کی دلچسپی اتنی بڑھی کہ اس کی خبر چاروں طرف عام ہوگئی اور ساری دنیا سے اہلِ کمال، صنّاع، مغنی، شاعر، علماء، تاجر سمٹ کر بغداد آگئے۔

عباسی خلفاء نے فوجی انتظامات کو بہترین طریقے پر استوار کیا۔ بحری بیڑے کو خوب ترقی دی اور بحری جنگ میں مسلمانوں کو خاص فوقیت حاصل ہوگئی۔ عباسی بحری بیڑے نے رومیوں کو کئی بار شکستیں دیں۔ قبرص اور سسلی کے جزیرے اسی دور میں فتح ہوئے۔

تجارت اور حصولِ علم کی غرض سے مسلمانوں نے پوری دنیا کا چپہ چپہ چھان مارا۔ جزیرہ نما ملایا، ہند اور چین کے ساتھ تجارتی تعلقات قائم ہوئے۔ یہاں تک کہ روس اور سویڈن سے بھی اس دور کے عربی سکے ملے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ عربوں کے پوری دنیا کے ساتھ تجارتی تعلقات استوار ہوچکے تھے۔

عباسی خلفاء میں ہارون الرشید اور اس کے بیٹے مامون الرشید نے بہت شہرت پائی۔ یہ خلفاء جہاں رعایا کی بہتری کے لئے رفاہ عامہ کے کاموں کے حوالے سے مشہور ہوئے اور ان کے دور میں سڑکوں، نہروں اور مسافر خانوں کا جال بچھا دیا گیا، وہیں اس دور کی خوشحالی، عدل وانصاف اور رعایا کی خبر گیری بھی قابل ذکر ہے۔

عباسی خلفاء کی زندگیاں متضاد انسانی رویوں کی عکاس تھیں۔ جہاں وہ ایک طرف علم کے قدردان، انصاف پسند، رعایا پرور اور ذاتی طور پر دین کے پابند تھے، وہیں اپنے دشمنوں کے ساتھ بدترین انتقام لینے سے بھی گریز نہ کرتے۔ خلافت کے حصول کے بعد انہوں نے چن چن کر امویوں کو قتل کیا۔ یہاں تک کہ اموی خلفاء کی قبریں کھدوا کر ان کی ہڈیاں چور چور کردیں۔ اموی خلیفہ ہشام کی لاش سالم نکلی تو اسے کوڑے مار کر نذرِ آتش

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کر دیا گیا۔ اموی خاندان کے جو لوگ بچ گئے تھے ان کو ایک مقام پر جمع کر کے ڈنڈوں سے پٹوا کر مار ڈالا اور ان کی تڑپتی ہوئی لاشوں پر دستر خوان بچھا کر کھانا کھایا۔ ابو مسلم خراسانی جس کے سر عباسی تحریک کو کامیابی دلانے کا سہرا جاتا ہے، محض شک کی بنیاد پر خلیفہ ابو جعفر کے اشارے پر قتل کیا گیا۔ برمکی خاندان جس نے ہارون الرشید کو اپنے معاملات انجام دینے میں ہر موقع پر مدد کی اپنے سترہ سالہ پرشکوہ دورِ وزارت کے بعد ایسا زیرِ عتاب آیا کہ اسے نشانِ عبرت بنا دیا گیا۔

خلفاءِ عباسیہ سے ابتداء میں شریعت کے نفاذ کے حوالے سے جو توقعات قائم کی گئی تھیں وہ پوری نہ ہوئیں۔ نیز دیگر طور طریقوں میں بھی کوئی خاص فرق رونما نہ ہوا۔ ابوالحسن علی ندوی اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''خلافتِ عباسیہ، خلافتِ امویہ کی پوری طرح جانشین تھی۔ وہی دنیا داری کی روح، وہی شخصی و موروثی سلطنت کا نظام و آئین اور وہی اس کی خرابیاں اور برے نتائج۔ وہی بیت المال سے آزادانہ تصرف، وہی عیش و عشرت کی گرم بازاری، فرق اتنا تھا کہ بنو امیہ کی سلطنت میں اور ان کے زمانے کی سوسائٹی میں عربی روح کارفرما تھی۔ اس کی خرابیاں اور بے اعتدالیاں بھی اسی نوع کی تھیں۔ عباسی سلطنت کے جسم میں عجمی روح داخل ہوگئی تھی اور عجمی قوموں اور تہذیبوں کے امراض و عیوب اپنے ساتھ لائی تھی۔''

خلافتِ عباسیہ کا دوسرا دور (۲۴۸ھ سے ۶۴۷ھ)

خلیفہ متوکل (۲۴۷ ہجری) کی وفات کے بعد عباسیوں کے عروج کا سنہرا دور ختم ہوا۔ اس کی سیاسی وجہ ترکوں کے خلاف اقدامات تھے۔ عباسی حکومت میں ابتداء ہی سے ایرانیوں کا عمل دخل بہت تھا۔ خلیفہ معتصم اور واثق نے اسے کم کرنے کے لئے ترکوں کی حوصلہ افزائی کی جو اپنی بہادری اور شجاعت کی وجہ سے قابل قدر سمجھے جانے لگے تھے۔ آہستہ آہستہ ان کا عمل دخل سلطنت میں بڑھنے لگا تو متوکل نے انہیں بھی اپنے اقتدار کے لئے خطرہ سمجھا اور وہ زیرِ عتاب آنے لگے۔ یہاں تک کہ ایک ممتاز ترک سردار نے متوکل کو قتل کر کے عباسی سلطنت کے اس سنہری دور کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا جو اسے پچھلی ایک صدی سے حاصل تھا۔ گو متوکل کا عہد خوشحالی اور فارغ البالی کا تھا، مگر یہ اس کی ذاتی کوششوں سے زیادہ گزشتہ استحکام اور معاشی ترقی کا نتیجہ تھا۔

متوکل کے بعد عباسی خلافت اپنا گزشتہ اثر کھو بیٹھی۔ اس کے جانشین ترک سرداروں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن کر رہ گئے۔ اگر ترک کسی خلیفہ سے خوش نہ ہوتے تو اسے اپنی جان کا خطرہ لاحق رہتا۔ سلطنت کا سارا کاروبار امیروں اور بااثر وزیروں کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ اس کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مقامی حکومتوں نے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خودمختار ریاستیں قائم کرلیں۔

خودمختار ریاستوں کا آغاز تو عباسی حکومت کے قیام سے ہی ہوگیا تھا جب ایک اموی شہزادے نے ہسپانیہ (اندلس) میں جاکر اپنی حکومت قائم کرلی تھی (اس کا تذکرہ آگے آئے گا)۔ البتہ عروج وترقی کے پہلے دور کے گذرنے کے ساتھ ہی وقفے وقفے سے مصر میں فاطمی حکومت، ایران میں صفاری حکومت، ماوراء النہر میں سامانی حکومت، افغانستان اور ہندوستان میں غزنوی حکومت اور ترکوں نے بعد میں سلجوقی حکومت قائم کرلی۔

واقعات کا تسلسل قائم رکھنے اور ان کی اہمیت کے حساب سے ہم یہاں صرف مصر کی فاطمی حکومت اور آلِ سلجوق کا تذکرہ کریں گے۔ مصر میں بنو فاطمہ کا اصل بانی سعید تھا۔ وہ اس نظریئے کا بھرپور حامی تھا کہ خلافت صرف اولادِ علی کا حق ہے۔ اس نے شمالی افریقہ کے بربریوں کو اپنے ساتھ ملا کر ۲۹۶ ہجری میں وہاں اپنی حکومت قائم کرلی اور اپنا نام عبداللہ مہدی رکھ لیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا المعز تخت نشین ہوا تو اس نے ۳۴۱ ہجری میں مصر پر قبضہ کرکے قاہرہ کو دارالخلافہ بنایا اور آس پاس کے علاقوں پر قابض ہوگیا۔ المعز اور اس کے بعد العزیز اور الحاکم کے ادوار مصر کے لئے علوم وفنون اور تہذیب وتمدن کی ترقی کے لحاظ سے یادگار تھے۔ اس کے بعد ایک بار پھر حالات تنزل کی طرف جانے لگے اور ملک بدامنی اور انتشار کا شکار ہوگیا۔ ایسے میں ان عیسائیوں کے ساتھ بھی کچھ ناروا سلوک برتا گیا جو بیت المقدس کی زیارت کے لئے آتے تھے۔ اگرچہ وہ خود بھی ناپسندیدہ حرکتیں کرتے تھے۔ مگر جب حکومت معاملے کو مصلحت سے سلجھانے کے بجائے سختی برتنے لگی تو یورپ میں صلیبی جنگوں کی تحریک نے جان پکڑ لی۔ ان کا مقصد اپنے کھوئے ہوئے علاقوں خصوصاً بیت المقدس پر دوبارہ قبضے کے لئے کوشش کرنا تھا۔

ایک طرف فاطمی سلطنت تو دوسری طرف آلِ سلجوق نے اپنی حکومت قائم کرلی تھی۔ اس سلطنت کا بانی سلجوق ایک ترک سردار کا بیٹا تھا، جس نے اسلام قبول کرنے کے بعد اپنی قوت بڑھا کر ماوراء النہر کے سرحدی علاقوں پر قبضہ کرلیا تھا۔ اس کے پوتے طغرل بک نے آہستہ آہستہ پورے خراسان پر قبضہ کرکے سلجوقی حکومت کی بنیادیں مستحکم کردی تھیں۔ اس زمانے میں خودمختار ریاستیں اپنی حکومت کی تصدیق کے لئے خلافتِ بغداد سے فرمان حاصل کیا کرتی تھیں۔ اگرچہ یہ محض ایک رسمی کاروائی ہوتی تھی، مگر عباسی حکومت کی مرکزی حیثیت اور تمام عالمِ اسلام میں اس کے روحانی تقدس کی وجہ سے اکثر حکومتیں اس طرح کے اقدام سے بغداد کے خلفاء کو خوش کرنا ضروری سمجھتی تھیں، جن کے اپنے پاس نہ کوئی طاقت تھی نہ اختیار۔

چنانچہ طغرل کو عباسی خلیفہ قائم نے فرمان عطا کیا اور بغداد آنے کی دعوت دی۔ اس طرح سلجوقی حکومت اور عباسی خلافت کے تعلقات استوار ہوگئے۔ بعد میں طغرل نے ایک شیعہ ترک سردار دبیس بن مرثد کو شکست

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دی، کیونکہ وہ بغداد کی خلافت سے باغی ہو کر فاطمی خلافت کو تسلیم کر چکا تھا۔ چنانچہ خلیفہ اس سے خوش ہو گیا اور اسے الملک المشرق والمغرب کے باعظمت لقب سے سرفراز کیا۔ اس کے انتقال کے بعد الپ ارسلان اور ملک شاہ سلجوقی کا دور بھی عظمت اور وسعت کے حوالے سے یادگار تھا۔ ملک شاہ کے بعد اس کے بیٹوں نے جانشینی کی جنگ شروع کر دی اور یوں عظیم سلجوقی حکومت کی طاقت کمزور ہو گئی۔

زنگی خاندان اور صلیبی جنگیں

اس سے قبل تذکرہ آ چکا ہے کہ فاطمی حکومت نے اپنے دورِ تنزل میں عیسائیوں کے ساتھ ناروا سلوک کیا جس کے نتیجے میں پورے یورپ میں بیت المقدس کی آزادی اور مسلمانوں سے بدلہ لینے کی تحریک کا آغاز ہوا۔ ابتداء ہی میں یہ تحریک زور پکڑ گئی اور لاکھوں صلیبی بیت المقدس پر مسلمانوں کا قبضہ ختم کرانے کی غرض سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ تاہم خراب حکمتِ عملی، غیر منظم فوج اور اپنے ہی عیسائی علاقوں پر یلغار کی وجہ سے ناکام ہو گئے۔

اس ناکامی نے ان کے ارادوں کو پست کرنے کے بجائے مزید مضبوط کر دیا۔ یہاں تک کہ بالآخر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔ فاطمی خلیفہ المستنصر میں اتنی طاقت نہ تھی کہ وہ ان کا مقابلہ کرتا۔ عباسی خلیفہ تو خود نام کا خلیفہ تھا۔ آلِ سلجوق آپس میں لڑ جھگڑ رہے تھے۔ ان حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ۱۵ جون ۱۰۹۵ء بمطابق ۴۸۸ ہجری کو عیسائیوں نے بیت المقدس فتح کر لیا اور اس قدر خونریزی کی کہ ساٹھ ہزار کی آبادی والے شہر کو پورا کا پورا تہہ تیغ کر ڈالا۔ بیت المقدس کے صحن میں خون کا دریا بہنے لگا۔ اس طرح قبلۂ اول مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اس کے بعد اگلے کئی سو سال مسلمانوں اور عیسائیوں میں مستقل لڑائیوں کا سلسلہ جاری رہا۔ یہ لڑائیاں صلیبی جنگوں کے نام سے یاد کی جاتی ہیں۔

ملک شاہ سلجوقی نے اپنے ایک لائق غلام (جو زنگی خاندان کا فرد تھا) کو حلب کی ولایت دی۔ بادشاہ کے انتقال کے بعد وہ بھی باہمی لڑائیوں میں قتل ہوا تو امرائے وقت نے اس کے لائق بیٹے عماد الدین کو تخت نشین کر دیا۔ یہ لڑکا بڑا قابل ثابت ہوا۔ اس نے اپنی حکومت کو مضبوط کیا اور ساتھ ہی ساتھ عیسائی حملہ آوروں کو پے در پے شکستیں دیں۔ عیسائی بیت المقدس فتح کرنے کے بعد بھی چین سے نہ بیٹھے تھے اور وقتاً فوقتاً مسلمانوں سے صلیب کے نام پر نبرد آزما رہتے تھے۔ عماد الدین کی نیک نفسی، عدل، رعایا پروری اور صلیبیوں کو شکست دینے کی وجہ سے اسے عوام میں مقبولیت حاصل ہو گئی۔ مگر افسوس کہ اس عظیم بادشاہ کو ایک غلام نے سوتے میں قتل کر دیا۔

اس کے بعد اس کے بیٹے نور الدین زنگی نے اس کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے نہ صرف رعایا کو خوش رکھا بلکہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اٹھائیس سالہ دورِ حکومت میں مستقل صلیبیوں سے ٹکر لیتا رہا۔ اس نے بارہا انہیں شکست دی اور تین عیسائی بادشاہوں کو قید بھی کیا۔ اس زمانے میں مصر میں فاطمی خلافت آخری سانس لے رہی تھی۔ آئے دن کی سازشوں اور خانہ جنگیوں نے اسے صلیبیوں کے لئے تر نوالہ بنا دیا تھا۔ نورالدین زنگی کو خطرہ تھا کہ اگر وہاں کے حالات نہ سنبھلے تو پورا ملک صلیبیوں کے قبضے میں چلا جائیگا۔ چنانچہ اس نے اپنے سپہ سالار شیرکوہ کو اصلاح کے لئے بھیجا۔ اسی دوران عیسائیوں سے بھی چھیڑ چھاڑ ہوتی رہی۔ مگر مختصر مدت کے بعد شیرکوہ کا انتقال ہو گیا۔ نورالدین کی مرضی سے شیرکوہ کے لائق بھتیجے صلاح الدین ایوبی کو اس کی اعلیٰ صلاحیتوں کی وجہ سے مسندِ وزارت پر بٹھا دیا گیا۔ صلاح الدین ایوبی نے آخری فاطمی خلیفہ عاضد کے انتقال کے بعد مصر کو اپنے کنٹرول میں کر لیا اور خلیفہ بغداد کی سرپرستی میں نورالدین زنگی کے نام کا خطبہ پڑھا جانے لگا۔

صلاح الدین ایوبی بڑا زبردست سپہ سالار تھا۔ وہ نورالدین زنگی کی زندگی میں اس کا وفادار رہا۔ مگر اس کے انتقال کے بعد اس کے گیارہ سالہ بیٹے نے سازشی امراء کی باتوں میں آ کر صلاح الدین کو اپنا مخالف تصور کر لیا۔ صلاح الدین کی صلح اور وفاداری کا یقین دلانے کی ہر کوشش ناکام گئی۔ یہاں تک کہ زنگی خاندان اس کے مقابلے پر آ گیا تو مجبوراً اس نے بھی آگے بڑھ کر دفاع کیا۔ ایک ایک کر کے اندرونی سازشوں کو دبایا اور ایک وسیع و عریض سلطنت کا مالک بن گیا۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد وہ عیسائیوں کی طرف متوجہ ہوا جو اسے مسلسل جنگوں میں الجھا کر تنگ کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ اس نے اپنی افواج کے ساتھ انہیں شکست دی اور یروشلم کا محاصرہ کر لیا۔ محصورین نے صلح کی شرائط سامنے رکھیں۔ صلاح الدین ایوبی بلا وجہ خونریزی کو سخت ناپسند کرتا تھا۔ چنانچہ بہت نرم شرائط پر اہلِ شہر کو پرامن طور سے بیت المقدس چھوڑ دینے کی اجازت دے دی۔ اب مسلمان فاتح تھے اور عیسائی مفتوح۔ سلطان نے دشمن کے ساتھ معاملے میں صحیح اسلامی اخلاق کا مظاہرہ کیا اور کوئی خون نہ بہایا۔ اس طرح ۵۵۰ھ بمطابق ۱۱۹۲ء میں بیت المقدس ایک بار پھر مسلمانوں کے ہاتھ آ گیا۔

صلیبی جنگوں کا سلسلہ اس کے بعد بھی جاری رہا۔ صلاح الدین ایوبی تیسری صلیبی جنگ میں عیسائیوں کو پیچھے دھکیلنے میں کامیاب رہا۔ اس کی موت کے بعد بھی یہ سلسلہ اگلی ایک صدی تک جاری رہا اور بالآخر ۱۲۷۰ء میں آٹھویں اور آخری صلیبی جنگ پر جا کر ختم ہوا۔ ان لاحاصل جنگوں میں دو صدیاں نکل گئیں اور اس قدر خون خرابہ ہوا کہ عیسائیوں اور مسلمانوں میں نفرت اور عناد کی خلیج ہمیشہ ہمیشہ کے لئے حائل ہو گئی۔

عباسیوں کا زوال، خوارزم شاہی حکومت اور تاتاری حملے (۴۴۷ھ۔۶۵۶ھ)

سلجوق حکومت کے عروج کے آخری دور میں ملک شاہ سلجوقی کے بیٹے سلطان سنجر کے زمانے میں صوبہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خوارزم کے صوبہ دار نوشتگین نے اپنے علاقے میں خودمختار حکومت قائم کر لی۔ اس کے جانشینوں نے اس کی سلطنت کو بڑی وسعت دی۔ یہاں تک کہ اس کے چھٹے حکمران علاء الدین کے دورِ حکومت میں کابل، قندھار اور سندھ تک کا علاقہ فتح ہو گیا۔ اسی کے دور میں ایک غلطی کے خمیازے کے طور پر صحرائے گوبی کے وحشی سردار چنگیز خان نے اس سے ناراض ہو کر اس کی سلطنت پر حملے کرنے شروع کر دیئے۔ علاء الدین اور اس کے بیٹے جلال الدین نے مقابلہ کیا مگر بری طرح شکست کھائی۔ اب چنگیز خان کی سربراہی میں تاتاری سیلاب تباہی مچاتا ہوا پہلے خوارزم شاہی حکومت کو بہا کر لے گیا، پھر ایک کے بعد ایک کر کے سب مسلم ممالک اس کی زد میں آ گئے۔

اس زمانے میں عباسی سلطنت محض برائے نام رہ گئی تھی۔ اس کے چھوٹے چھوٹے حصے ہو چکے تھے۔ سیاسی حالات کے علاوہ اخلاقی و مذہبی حالات سخت دگرگوں تھے۔ عباسی خلافت کے علاوہ آس پاس کے تمام اسلامی ممالک کا کم و بیش یہی حال تھا۔ خانہ جنگیوں، سیاسی انتشار، انتظامی ابتری اور اخلاقی زوال نے مسلم معاشروں کو کھوکھلا کر دیا تھا۔ ان حالات میں پہلے مغرب سے صلیبیوں نے شورش کی اور ان کے علاقے ان سے چھین لئے تو دوسری طرف سے قدرت نے مسلمانوں کو متنبہ کرنے کے لئے وباؤں، امراض، قحط اور زلزلوں کو ان پر مسلط کر دیا۔ مگر ان حالات میں اصلاح احوال کرنے کے بجائے وہ قعرِ مذلت میں گرتے چلے گئے۔ مسلمانوں کے مرکز بغداد کا یہ حال تھا کہ وہاں اخلاق کا جنازہ نکل چکا تھا۔ ابوالحسن علی ندویؒ اس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''شان و شوکت کے اظہار کے لئے عید اور جانشینی کے موقع پر جو شاہانہ جلوس بغداد میں نکلتے تھے، سارا شہر ان میں شرکت کرنے، ان کا تماشا دیکھنے میں محو اور خود فراموش ہو جاتا تھا۔ نمود و نمائش کے ماسوا جس طرح بے تکلف دینی فرائض ان میں نظر انداز ہوتے تھے اور نمازیں قضاء ہوتی تھیں، اس کا اندازہ کرنے کے لئے صرف اتنا کافی ہے کہ ۶۴۰ ہجری میں عید کے موقع پر جو شاہی جلوس نکلا، وہ رات کو جا کر ختم ہوا۔ اس کی ایسی مشغولیت اور محویت رہی کہ لوگوں نے اس دن عید کی نماز نصف شب سے پہلے قضاء کر کے پڑھی۔ اسی طرح ۶۴۴ ہجری کو عیدالاضحیٰ کو اہلِ بغداد شہر کے باہر خلیفہ کا شاہی جلوس دیکھنے نکلے اور نمازِ عید انہوں نے غروب آفتاب کے وقت پڑھی۔''

آگے لکھتے ہیں۔ ''دارالخلافہ بغداد میں کچھ ایسا انتشار رہا کہ ۶۴۰ ہجری سے ۶۴۳ ہجری تک خلفائے اسلام کے قدیم و مسلسل معمول کے خلاف خلیفہ کی طرف سے نہ حج کا انتظام ہوا اور نہ غلاف کعبہ بدلا گیا۔ ۲۱ دن تک بیت اللہ شریف کی دیواریں بالکل کھلی رہیں،

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

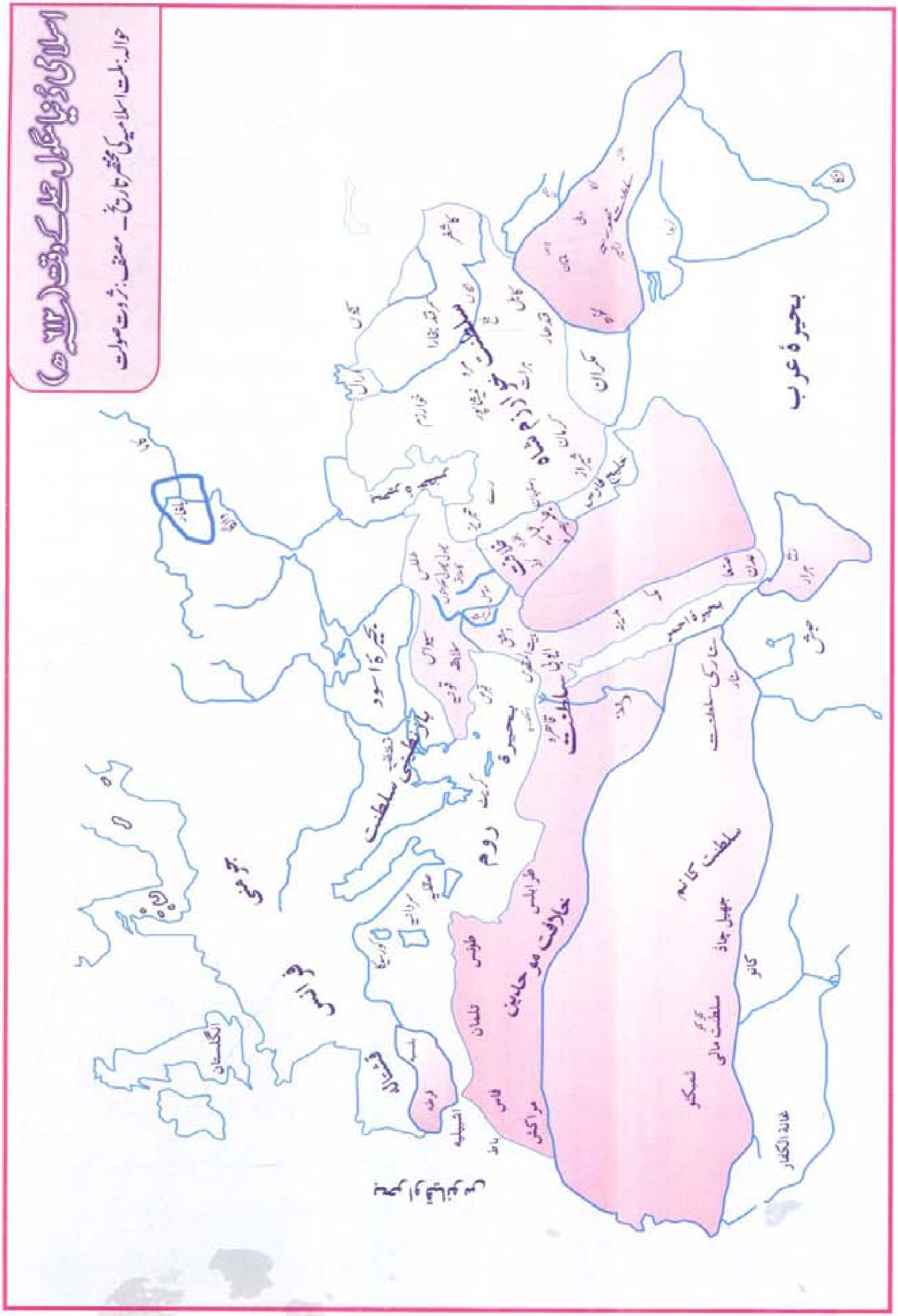

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لوگوں نے اس سے بدشگونی لی۔''

ایک طرف ارکانِ اسلام سے اس درجہ غفلت تو دوسری طرف دولت کی ہوس نے رشوت، ٹھگ بازی اور جائیدادوں کی خرید کی اندھی دوڑ میں سب کو شامل کر دیا تھا۔ یہ دولت اس ظاہری شان وشوکت اور نمود ونمائش کے لئے درکار تھی جس کا چلن عام تھا۔ بھانڈ، میراثی، مغنی اور دل بہلانے والے پورے معاشرے کے حواسوں پر چھائے ہوئے تھے۔ یہ اس موقع پر تھا جب سارا عالمِ اسلام تاتاری حملوں کی زد میں تھا اور مسلمان باہم دست و گریبان آنے والے خطرات سے مکمل بے اعتنائی برت رہے تھے۔ قدرت کی دی ہوئی مہلت کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ ۶۵۶ ہجری میں تاتاری چنگیز خان کے پوتے ہلاکو خان کی سرکردگی میں دنیائے اسلام کے مرکز بغداد میں داخل ہوئے۔ آخری عباسی خلیفہ مستعصم کے شیعہ وزیر ابن علقمی (جو خفیہ طور پر تاتاریوں سے ملا ہوا تھا اور عباسی حکومت کا تختہ الٹ کر علوی حکومت قائم کرنا چاہتا تھا) نے سازش کر کے شہر کے دفاع کو ناممکن بنا دیا۔ ماہ محرم ۶۵۶ ہجری میں تاتاری دندناتے اور لوٹ مار کرتے ہوئے شہر میں داخل ہوئے۔ خلیفہ کو ڈنڈوں سے پیٹ کر قتل کر دیا اور ایسی خونریزی کی کہ اپنے پیچھے سولہ لاکھ مقتول اور آگ اور خون میں جلتے ہوئے شہر کو چھوڑ گئے۔ محلات کا شہر کھنڈرات کے شہر میں تبدیل ہو چکا تھا اور ہر ظالم قوم کی طرح وہ بھی قرآنی فیصلے کے تحت ''اپنی بستیوں میں اس طرح بے حس وحرکت پڑے کے پڑے رہ گئے کہ گویا وہ وہاں کبھی بسے نہ تھے۔'' (ھود)

قدرت اپنا بدلہ لے چکی تھی۔ متوکل کے بعد سے ستائیس خلفاء کو چار سو برس کا طویل عرصہ سنبھلنے کے لئے دیا گیا۔ مگر عباسی خلفاء نے خصوصاً اور مسلم عوام نے عموماً اصلاح کی کوشش نہ کی اور نہ ان بنیادی غلطیوں کا تدارک کیا جو انہیں قعرِ مذلت میں دھکیل رہی تھیں۔ یہاں تک کہ عذاب کا کوڑا برسا اور تاریخِ انسانی کی شاندار تہذیب کو دجلہ کی گہرائیوں میں ڈبو دیا گیا۔

تاریخِ اندلس (۸۶ھ تا ۸۹۷ھ)

۸۶ ہجری میں اموی خلیفہ ولید نے طارق بن زیاد کو ایک چھوٹا سا بحری بیڑا دے کر اسپین کی طرف روانہ کیا۔ طارق بن زیاد نے ایک لاکھ کی عیسائی فوج کو شکست دی۔ بادشاہ راڈرک قتل ہوا اور اسپین پر مسلمانوں کا ابتدائی اقتدار قائم ہو گیا۔ اس کے بعد عظیم جرنیل موسیٰ بن نصیر بھی طارق کی مدد کو آ پہنچا۔ دونوں نے مل کر اسپین کے باقی ماندہ علاقوں کو فتح کیا۔ ابتداء میں مسلمان وہاں امن وامان قائم کرنے میں کامیاب رہے۔ بعد میں جب بربر اور عرب قبائل باہم دست وگریبان ہوئے تو اندرونی خلفشار بڑھنے لگا۔ بنوعباس برسر اقتدار آئے تو اموی خاندان کو چن چن کر قتل کیا گیا۔ ایک اموی شہزادہ عبدالرحمٰن جان بچا کر بھاگا اور اسپین پہنچنے میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کامیاب ہوگیا۔ عبدالرحمٰن کی ماں بربر تھی، اس کا لحاظ کرتے ہوئے بربروں نے اسے پناہ دی اور تھوڑے ہی عرصے میں وہ ایسا مقبول ہوا کہ اس کی قیادت تسلیم کر لی گئی اور مختصر جدوجہد کے بعد پورے ملک پر اس کا قبضہ ہوگیا۔ عباسی خلفاء کے بجائے عبدالرحمٰن کے نام کا خطبہ پڑھا جانے لگا۔ اس طرح ۱۳۸ھ میں اسپین میں آزاد اموی حکومت کا آغاز ہوا۔ عباسی خلفاء اپنے استحکامِ سلطنت میں مصروف تھے اور اسپین بہت دور بھی تھا۔ چنانچہ اس کے معاملات کی طرف زیادہ توجہ نہ دے سکے۔ چند ایک بار بغاوت کی کوشش ہوئی لیکن کامیاب نہ ہو سکی۔ عبدالرحمٰن نے بڑی کامیابی سے اسپین پر حکومت کی۔ رعایا کی خوشحالی کے لئے اس نے جو اقدامات کئے اس سے اس کی سلطنت کو ایسا استحکام نصیب ہوا کہ اگلے ڈیڑھ سو سال تک اس کے جانشین شان وشوکت سے حکومت کرتے رہے۔ ہشام ثانی (۳۹۴ھ) کے بعد اقتدار اس کے نااہل جانشینوں کے پاس آ گیا جو آپس کے اختلافات میں ایسے الجھے کہ اسپین کے اطراف کی پڑوسی عیسائی سلطنتیں اس کے درپے ہوگئیں۔ ان حالات میں اندلس کے امراء نے بارہا مراکش کے نیک، متقی اور بہادر حکمران یوسف بن تاشفین کو دعوت دی کہ وہ ہسپانیہ کے مسلمانوں کو اس مشکل سے نکالے۔

ابتداء میں وہ ایک مسلمان ملک پر چڑھائی کے لئے راضی نہ ہوا۔ مگر جب اصرار بڑھا تو وہ چالیس ہزار مرابطین کی فوج لے کر ہسپانیہ پہنچا اور اندلس کے حکمرانوں کو پناہ دیتے ہوئے عیسائی شہنشاہ الفانسو سے مقابلہ کیا اور اسے بدترین شکست دی۔ اس کے بعد ہسپانیہ کی حفاظت کے لئے اپنی کچھ فوج چھوڑ کر واپس چلا گیا۔ اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے اسپین کے حکمرانوں نے سنبھلنے کے بجائے اپنے طور طریق میں کوئی تبدیلی نہ کی۔ یہاں تک کہ پانچویں صدی ہجری میں اندلس میں بنوامیہ کی عظیم الشان سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی۔ عرب، بربر اور اسپین کے مقامی لوگوں نے ملک کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے ان پر اپنی اپنی حکومتیں قائم کر لیں جو تاریخ میں ملوک الطوائف کے نام سے پکاری جاتی ہیں۔ مسلمانوں کی کم وبیش دو درجن چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم ہو چکی تھیں۔ اس تمام عرصے میں آس پاس کی عیسائی سلطنتوں نے زور پکڑ لیا اور ایک ایک کر کے ان ریاستوں پر قبضہ کرتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ آخر میں صرف غرناطہ مسلمانوں کی جائے پناہ رہ گئی۔

یوسف الاحمر نے ۶۳۳ھ میں اسی افراتفری میں غرناطہ میں اپنی حکومت قائم کر لی اور تیس سال حکومت کی۔ کئی عیسائی ہمسایہ حکمرانوں کو شکست دی اور رعایا کی فلاح کے بہت کام کئے۔ اس نے اپنے دور میں عالی شان محل الحمراء تعمیر کروایا۔ اس کے انتقال کے بعد اس کے جانشینوں نے ڈھائی سو برس حکومت کی۔ غرناطہ کا اٹھارواں حکمران سلطان ابوالحسن جو ایک باہمت اور بہادر شخص تھا ۸۷۰ ہجری میں تخت نشین ہوا۔ اس کے زمانے میں ریاست کا رقبہ صرف چار ہزار مربع میل تھا۔ عیسائی حکمران فرڈی نینڈ اور اس کی ملکہ ازابیلا نے ابوالحسن سے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خراج طلب کیا۔اس کے انکار پر جنگ ہوئی جس میں ابوالحسن فرڈی نینڈ کوشکست دینے میں کامیاب رہا۔مگراس کے اپنے بیٹے نے باپ کے خلاف بغاوت کردی اور غرناطہ پر قبضہ کرلیا۔اسی غم میں وہ کچھ عرصے بعد مرگیا۔ ابوعبداللہ جو باپ کو تخت سے ہٹانے میں کامیاب رہا، اپنی مملکت بچانے میں اتنا ہی ناکام رہا اور غرناطہ کی مسلسل محصوری سے تنگ آ کر اطاعت کرنے پر راضی ہوگیا۔ بادشاہت کھونے کے بعد جب ابوعبداللہ ذلیل وخوار ہو کر غرناطہ سے نکلا تو زاروقطار رورہا تھا۔اس کو اس طرح روتے دیکھ کراس کی ماں نے حقارت سے کہا ''تو جس ملک کی حفاظت مردوں کی طرح نہ کرسکا، اس کے لئے اب عورتوں کی طرح کیوں روتا ہے۔''

۲ ربیع الاول ۸۹۷ ہجری بمطابق ۱۴۹۲ء کو پورے آٹھ سو سال کے بعد اسپین پر عیسائیوں کا تسلط قائم ہوگیا۔آنے والے وقتوں میں اسپین میں مسلمانوں کے وجود سے لے کر ان کے علمی، ثقافتی اور مذہبی ورثے کا نام ونشان تک مٹا دیا گیا۔

عثمانی ترک (۶۸۷ھ تا ۱۳۵۱ھ)

ساتویں صدی ہجری کے وسط میں ترکوں کا ایک معزز قبیلہ تاتاری حملوں کے خوف سے فرار ہو کر حلب کے قریب سلجوقیوں کے علاقے میں آباد ہونے کی غرض سے جارہا تھا کہ راستے میں ان کا سردار اتفاقاً دریا میں ڈوب گیا۔اس حادثے نے قبیلے کو منتشر کردیا۔سردار کے بیٹے ارطغرل نے واپس جانے کے بجائے قبیلے کے بچے کھچے افراد کے ساتھ اپنا سفر جاری رکھا۔انگورہ کے قریب انہیں گرد وغبار کا طوفان نظر آیا۔صورتحال کا جائزہ لینے کے بعد پتہ چلا کہ دو فوجیں آپس میں گتھم گتھا ہیں، جن میں سے ایک نسبتاً چھوٹی اور کمزور ہے۔ارطغرل نے ترک روایات کے مطابق کمزور کا ساتھ دیا اور انہیں فتح یاب کرادیا۔جیت کے بعد پتہ چلا کہ جس فریق کی مدد کی تھی وہ علاؤالدین سلجوقی کی فوج تھی اور اس وقت وہ خود اپنی فوج کی کمان کررہا تھا۔جبکہ ہارنے والے تاتاری تھے جو مسلمانوں کا پیچھا کرتے کرتے ایشیائے کوچک تک آ گئے تھے۔

اس احسان کے بدلے میں سلطان علاءالدین نے اسے ایک زرخیز علاقہ بطور جاگیر عنائیت کیا۔ارطغرل نے اس کا ایسا بہترین انتظام کیا اور ہر موقع پر سلطان کا ایسا وفادارانہ ساتھ دیا کہ اس کی خدمات کے صلے میں سلطان نے مزید علاقہ بخش دیا۔اب ارطغرل کی ریاست ''سلطانونی'' کہلائی جانے لگی۔

ارطغرل ۹۰ سال کی طویل عمر پا کر راہیٔ عدم ہوا تو سلطانونی پر اس کے بیٹے عثمان خان کو فائز کیا گیا۔عثمان ہمیشہ سلجوقی حکومت کا وفادار رہا۔آخری سلجوقی حکمران کی وفات کے بعد دیگر امراء کی طرح عثمان نے بھی اپنی خودمختاری کا اعلان کردیا۔اس کے بعد اس نے اپنی ریاست کو وسعت دینے کے لئے فتوحات کا آغاز کیا اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مشرق میں اپنے ہم مذہبوں پر حملہ کرنے کے بجائے یونانی علاقوں کی طرف قدم بڑھایا جو ایک کے بعد ایک کر کے بڑے آرام سے زیر ہوتے چلے گئے۔ عثمان نے اپنی اڑتالیس سالہ دورِ حکومت میں اپنی سلطنت کو وسعت دے کر اس مقام تک پہنچا دیا جہاں عیسائی اس سے خوف کھانے لگے۔ قدرت نے اس کو اس کی بہترین خوبیوں کی بدولت یہ انعام دیا کہ مستقبل کی ایک عظیم الشان سلطنت کا نام اس سے موسوم ہو گیا جس نے سوا چھ سو سال دنیا پر حکومت کی۔

عثمان خان کے بعد اس کے بیٹے اورخان نے اپنی مقبوضات کا دائرہ بڑھانے کے علاوہ علاقے کی ترقی کی طرف توجہ دی۔ وہ لاکھوں عیسائی جو بغیر کسی جبر کے باخوشی مسلمان ہوئے تھے، ان کی تعلیم و تربیت کی طرف توجہ دی گئی۔ علوم کی سرپرستی کے ساتھ ساتھ رفاہِ عامہ کے کام اور ملکی اور فوجی آئین کی تکمیل کی گئی۔ اورخان اور اس کے بھائی علاء الدین نے مل کر عثمانی سلطنت کو خوب مستحکم کر دیا۔ بعد میں اس کے جانشین بھی لائق اور بہادر ثابت ہوئے اور یوں سلطنتِ عثمانیہ دن بدن تعمیر و ترقی کے زینے طے کرتی گئی۔

آٹھویں صدی کے اختتام پر جب عثمانی سلطان بایزید یلدرم تخت نشین ہوا تو پورا ایشیائے کوچک مسلمانوں کے قبضے میں آ چکا تھا۔ اس کی فتوحات دیکھ کر لگتا تھا کہ سارے یورپ پر مسلمانوں کا قبضہ ہو جائے گا۔ مگر عین موقع پر قیصرِ روم نے خطرہ محسوس کرتے ہوئے اس دور کے مشہور مسلمان فاتح تیمور لنگ کو بایزید کے خلاف بھڑکا دیا۔ امیر تیمور اگرچہ بہت بڑا فاتح تھا مگر اس کی تلوار زیادہ تر اپنے ہم مذہبوں پر ہی اٹھتی رہی۔ وہ بایزید سے مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو گیا اور ۸۰۴ ہجری میں مقام انگورہ پر تاریخِ اسلام کی افسوسناک ترین جنگ لڑی گئی جس میں بایزید کو شکست ہوئی اور وہ گرفتار ہو کر قید ہوا۔ اسی حالت میں اسے موت آ گئی۔

اس سانحے کے بعد اگرچہ ترکوں میں وقتی طور پر انتشار پیدا ہوا مگر وہ جلد ہی سنبھل گئے۔ فتوحات کا سلسلہ جاری رہا اور ہر آنے والا سلطان سلطنت کے استحکام اور ترقی میں اضافے کا باعث بنتا رہا، یہاں تک کہ سلطان محمد فاتح نے یونانیوں کے عظیم مرکز قسطنطنیہ کو ۸۵۷ ہجری میں فتح کر لیا اور یوں رسالت مآب ﷺ کی پیش گوئی کے مطابق قسطنطنیہ اسی کے عہد میں اسلامی سلطنت کا حصہ بنا۔

سلطان محمد فاتح کا پوتا سلطان سلیم (۹۱۸ھ تا ۹۲۶ھ) اپنے باپ سے باغی ہو گیا تو باپ نے خود اس کے حق میں تخت سے دستبرداری کا اعلان کیا اور چند دن بعد مر گیا۔ سلطان سلیم نے اپنے پیش رو سلاطین کی روش سے ہٹ کر اپنی توجہ یورپ کے بجائے ایشیا کی طرف مبذول کی۔ ایران میں صفوی حکومت سے اس کا مستقل جھگڑا چل رہا تھا۔ چنانچہ پہلے انہیں شکست دے کر زیر کیا۔ پھر شام و مصر کے مملوک تاجداروں کو شکست دی جو سلطنتِ عثمانیہ سے چھیڑ چھاڑ کرتے رہتے تھے۔ اس فتح کے بعد حجاز کے حاکم نے عثمانی سلطنت کی اطاعت قبول کر لی اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حرمین شریفین کی خدمت کا شرف سلیم کو حاصل ہوگیا۔اس پر نمائشی عباسی خلیفہ المتوکل نے خلافت کے تمام حقوق و امتیازات سلیم کو دے دیئے۔اس وقت سے عثمانی سلاطین مسلمانانِ عالم کی خلافت پر فائز ہوئے اور کسی طرف سے کوئی مخالفت نہ ہوئی۔سلیم کا ارادہ اب یورپ میں فتوحات کرنے کا تھا،مگر اس سے پہلے اسے موت آ گئی اور وہ اپنے پیچھے اپنے عظیم فرزند سلیمان کو جانشین کے طور پر چھوڑ گیا۔

امیر المومنین سلیمان ۲۶ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا اور چھیالیس سال تک اس شان سے حکومت کی کہ اسے آج تک مشرق و مغرب میں ''سلیمان عالیشان'' کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔پورے ایشیاء اور یورپ میں اس کا طوطی بولتا تھا۔اس نے اپنے بحری بیڑے کو اتنی وسعت اور ترقی دی کہ سمندروں پر ترکی بیڑے کو پورا اقتدار حاصل ہوگیا۔اس کی سلطنت تین براعظموں، دو سمندروں اور متعدد چھوٹی چھوٹی مملکتوں پر مشتمل تھی جو اکیس ولایتوں اور دو سو پچاس صوبوں پر منقسم تھی۔وہ علوم کا دلدادہ تھا اور ان کی بھرپور سرپرستی کرتا تھا۔وہ ایک کامیاب حکمران اور عظیم مدبر تھا۔

سلطنتِ عثمانیہ زوال کے راستے پر

سلیمان عالیشان (۹۷۴ ہجری) کے انتقال کے بعد عثمانی سلطنت دن بدن روبہ زوال ہوتی چلی گئی۔ اگرچہ اپنے پیش رووں کی کاوشوں کی وجہ سے اگلے ساڑھے تین سو سال تک قائم رہی،مگر چند ایک کے سوا باقی تمام عثمانی خلفاء انہی غلطیوں کو دہرانے میں لگ گئے جو گزشتہ سلطنتوں کے زوال کا سبب بنی تھیں۔سلیمان کے بعد محض ایک صدی کے اندر یورپ کے کئی علاقے ترکوں کے ہاتھ سے نکل گئے اور عثمانی سلطنت کے تنزل کے آثار واضح نظر آنے لگے۔

اسی عرصے میں جب ترک روبہ زوال تھے،یورپ بیدار ہو چکا تھا۔صنعتی انقلاب نے معاشی اور فوجی استحکام کی صورت میں انہیں ترقی کی راہ پر گامزن کر دیا تھا۔ایک طرف یورپی حکومتوں کا ترکوں کے خلاف عناد تھا تو دوسری طرف روس کے بار بار کے حملے۔عثمانی فوجیں اپنی نااہلی اور باہم اتحاد نہ ہونے کے سبب بار بار شکست کھانے کے بعد اپنے علاقوں سے دستبردار ہوتی رہیں۔

انیسوی صدی عیسوی کے وسط تک عثمانی سلطنت کی یہ حالت ہوگئی کہ اسے یورپ کا مردِ بیمار کہا جانے لگا۔ ہر طرف سے غیر مسلم طاقتوں نے دباؤ ڈال کر اس کے متعدد علاقے چھین لئے۔کچھ آپس میں بانٹ لئے اور کچھ میں خود مختار سلطنتیں قائم ہوگئیں۔۱۸۵۷ء میں روس کی شہ پر بوسنیا ہرزیگوینا اور بلغاریہ میں بغاوتیں ہوئیں۔کچھ عرصے بعد روس نے ترکوں پر حملہ کر کے انہیں شکست دی اور دباؤ ڈال کر عثمانی سلطنت کے اکثر علاقوں کو خود مختار

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سلطنتیں قرار دے دیا۔

ان اقدامات کے بعد بھی روس کو چین نہ آیا اور ۱۹۱۲ء میں اس کے اکسانے پر عیسائی ریاستوں نے گٹھ جوڑ کر کے سات لاکھ فوج تیار کی اور ترکی پر حملہ کر دیا۔ ترکوں کا بے پناہ جانی و مالی نقصان ہوا۔ اس جنگ کو جنگِ بلقان کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ جنگ کے بعد ترکوں کی حالت بہت نازک تھی۔ مگر دشمن کے آپس میں اتفاق نہ ہونے کے سبب انہیں قدرت نے ایک موقع اور دیا۔

۱۹۱۴ء میں پہلی جنگِ عظیم کے موقع پر ترکی نے جرمنی کا ساتھ دیا جبکہ ساری یورپی طاقتیں ان کے مدمقابل تھیں۔ جنگِ عظیم چار سال تک چلتی رہی۔ اس دوران انگریزوں نے بیت المقدس پر قبضہ کر کے ترکوں کو وہاں سے نکال دیا۔ جرمنی اور اس کے حلیف ترکوں کو شکست ہوئی۔ جنگ کے بعد معاہدہ سیور کے تحت فلسطین اور عراق کے علاقے انگریزوں نے حاصل کئے۔ شام کا علاقہ فرانسیسیوں کو ملا۔ جزیرہ نما عرب کو آزاد ریاست قرار دے کر شریف آف مکہ کو وہاں کا حاکم مان لیا گیا۔ سمرنا اور قبرص کے علاقے یونان کو ملے اور ترکوں کے پاس صرف قسطنطنیہ اور اناطولیہ کے اندرونی علاقے رہ گئے۔ ان علاقوں پر بھی اتحادیوں کی نظر تھی اور وہ مسلسل یونان کو ان پر قبضہ کرنے کی شہ دے رہے تھے کہ اسی اثناء میں ترکوں میں مصطفیٰ کمال پاشا نے جو ایک کامیاب فوجی کمانڈر کی حیثیت سے جانا جاتا تھا مقبولیت حاصل کی اور قوم پرست تحریک کے جھنڈے تلے ترکوں کی متحدہ قومی حکومت قائم کر لی۔ ۱۹۲۳ء میں ترکی کی جمہوری قومی حکومت کے قیام کا اعلان کیا گیا اور کمال پاشا اس کا پہلا صدر بنا۔ مصطفیٰ کمال اتاترک نے اگلے ہی سال ترکی کی خلافت ختم کرنے کا اعلان کیا اور ترکوں کو لادینی یا سیکولر راستے پر ڈال دیا۔ اس طرح تقریباً ساڑھے چھ سو سال پر محیط ترکوں کی عظیم الشان اسلامی خلافت کا خاتمہ ہو گیا۔

ہندوستان میں مسلمانوں کا ہزار سالہ دورِ حکومت (۳۵۱ھ-۱۲۷۳ھ)

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد ۹۳ ہجری میں اس وقت ہوئی جب عرب مسلمانوں کے ایک جہاز کو سندھ کی بندرگاہ کے قریب سے گذرتے ہوئے ہندو قزاقوں کے ایک ٹولے نے (جسے وہاں کے راجہ داہر کی خاص سرپرستی حاصل تھی) لوٹ لیا اور عورتوں اور بچوں کو قید کر دیا گیا۔ یہ خبر سن کر حجاج نے ایک نوعمر جرنیل محمد بن قاسم کو ایک دستہ دے کر سندھ کی طرف روانہ کیا۔

محمد بن قاسم نے اپنی مختصر سی فوج کے ساتھ راجہ داہر کو شکست دی اور مسلمان قیدیوں کو رہا کرا لیا۔ اس لڑائی میں راجہ داہر مارا گیا۔ وہ ایک ظالم حکمران تھا اور اس کی رعایا اس سے سخت نالاں تھی۔ محمد بن قاسم کے آنے سے سندھی عوام میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور وہ اس کے سلوک سے متاثر ہو کر دھڑا دھڑ مسلمان ہونے لگے۔ محمد بن قاسم

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نے سندھ کے آس پاس کے علاقوں میں فتوحات جاری رکھیں اور ملتان تک کا علاقہ فتح کر لیا۔ مگر صرف تین سال کی گورنری کے بعد دربارِ خلافت سے اس کی طلبی ہوئی جہاں اسے قید کرنے کے بعد بے قصور قتل کر دیا گیا۔

اگلی دو صدیوں تک مسلمان اس علاقے کے حاکم رہے۔ مگر آہستہ آہستہ مختلف سرداروں نے اپنی حکومتیں قائم کر لیں اور مسلمانوں کا پہلا سا اثر باقی نہ رہا۔

محمود غزنوی اور ہندوستان پر سترہ حملے (۳۵۱ھ۔۵۸۲ھ)

۹۹۸ء میں محمود غزنوی نے افغانستان میں تخت نشین ہونے کے بعد پہلے سیستان کا علاقہ فتح کیا۔ اس کے بعد اپنی فتوحات کے سلسلے کو جاری رکھتے ہوئے ہندوستان پر حملہ کیا اور ہندوستان کے بہت سے علاقے فتح کر لئے۔ پھر سومنات کے مذہبی اور تاریخی لحاظ سے اہم شہر کو زیر کیا۔ فتح کے بعد مقامی حکمرانوں سے اطاعت کا عہد لیا گیا۔ مگر ان کی بار بار کی بدعہدی کی وجہ سے اس نے ہندوستان پر سترہ حملے کئے۔

آخر ۱۰۲۲ء میں وہ لاہور کو اپنی سلطنت کا حصہ بنا کر اپنی فوج کا کچھ حصہ یہاں چھوڑ گیا۔ اس کے انتقال کے بعد اس کی سلطنت ڈیڑھ سو سال تک قائم رہی۔ مگر زیادہ تر بادشاہ نااہل ثابت ہوئے۔ یہاں تک کہ آخری بادشاہ خسرو شاہ کے بیٹے کو جو لاہور میں مقیم تھا، شہاب الدین غوری نے گرفتار کر لیا۔ مختلف سرداروں نے اپنی حکومتیں قائم کر لیں۔

شہاب الدین غوری اور ہندوستان پر مسلمانوں کا تسلط (۵۵۰ھ۔۶۰۲ھ)

غزنی کے قریب علاقہ غور میں ایک قبیلہ آباد تھا، جو آس پاس کے علاقوں میں لوٹ مار کیا کرتا تھا۔ محمود غزنوی نے ان کو شکست دی اور ان کے قلعے کو مسمار کر دیا۔ کچھ عرصہ بعد ان میں اسلام کی تبلیغ ہوئی اور انہوں نے اپنی اصلاح کی۔

غیاث الدین غوری نے محمود غزنوی کے نااہل حکمرانوں کو شکست دے کر اپنی حکومت قائم کر لی اور ساتھ ہی اپنے چھوٹے بھائی شہاب الدین غوری کو ہندوستان کی طرف بھیجا۔ شہاب الدین غوری نے پنجاب میں غزنوی خاندان کے آخری بادشاہ کو شکست دی اور راجپوتوں سے وہی خراج طلب کیا جو وہ محمود غزنوی کو خراج ادا کیا کرتے تھے۔ مگر پرتھوی راج والیٔ اجمیر و دہلی نے انکار کیا اور مقابلے کی ٹھانی۔ ابتدائی ناکامیوں کے بعد بالآخر ۱۱۹۲ء میں شہاب الدین کی ایک لاکھ بیس ہزار فوج پرتھوی راج کی تین لاکھ فوج کو شکست دینے میں کامیاب ہوگئی۔ فتوحات کا یہ سلسلہ جاری رہا، یہاں تک کہ پورے شمالی ہندوستان پر مسلمانوں کا تسلط قائم ہوگیا۔ اس طرح شہاب الدین غوری ہندوستان میں اسلامی حکومت کی بنیاد رکھنے میں کامیاب ہوگیا۔ کچھ عرصے بعد اسے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سوتے میں قتل کر دیا گیا۔اس کے بعد اس کے لائق غلام قطب الدین ایبک کو جسے غوری نے ہندوستان میں اپنا نائب سلطنت مقرر کیا تھا، حاکم کی حیثیت حاصل ہوگئی۔قطب الدین اور اس کے بعد اس کے غلام شمس الدین التمش کا دور ہر لحاظ سے یادگار رہے۔ان دونوں میں حکمرانی کی اعلیٰ صلاحیتیں اور رعایا پروری بدرجہ اتم موجود تھی۔ التمش کے دور میں تاتاری سردار چنگیز خان نے ہندوستان کا رخ کیا۔وہ دریائے سندھ عبور کرنے ہی والا تھا کہ اسے اپنے ملک میں بغاوت کی خبر ملی اور وہ وطن واپس ہوگیا۔اس طرح ہندوستان چنگیزی حملے سے محفوظ رہا۔

خلجی اور تغلق خاندانوں کے ادوارِ حکومت

بارہویں صدی عیسوی میں ترک خلجی قبیلہ ہندوستان آ کر آباد ہوا تو ان کے سردار جلال الدین خلجی (جو پنجاب کا صوبہ دار تھا) نے مغلوں کے ہندوستان پر بار بار کے حملوں کو پسپا کیا۔اس نے خاندانِ غلاماں کے نااہل حکمرانوں کو تخت سے ہٹا کر خلجی حکومت کی بنیاد رکھی۔

جلال الدین اپنی کامیاب حکمت عملی کی وجہ سے بہت جلد ملک میں استحکام پیدا کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ مگر اس کے بھتیجے علاء الدین خلجی نے اسے قتل کر کے دہلی کے تخت پر قبضہ کر لیا۔اس کے ساتھ ہی فتوحات کا سلسلہ بڑھایا، یہاں تک کہ سارے شمالی ہندوستان کا حکمران بن گیا۔اس کے دور میں منگولوں نے بار بار ہندوستان پر حملہ کئے مگر کامیاب نہ ہو سکے۔اس کے انتقال کے بعد اس کے بیٹے نااہل ثابت ہوئے اور وزراء کے ہاتھ میں اصل باگ دوڑ آ گئی تو سلطنت کے امراء نے پنجاب کے صوبہ دار غازی بیگ تغلق سے مدد مانگی۔

غازی بیگ تغلق خلجی خاندان کی حکمرانی کا خاتمہ کر کے غیاث الدین تغلق کے لقب سے دہلی میں تخت نشین ہوا۔اس کے بعد اس کے بیٹے محمد تغلق اور بھتیجے فیروز تغلق نے بڑی شان سے حکومت کی۔ بعد کے چار حکمران نااہل ثابت ہوئے۔ یہاں تک کہ ایشیا کے بڑے فاتح امیر تیمور نے ہندوستان میں داخل ہو کر دہلی پر حملہ کر کے تغلق حکومت کا شیرازہ بکھیر دیا۔اس کے بعد خاندانِ سادات نے ۳۶ سال اور لودھی خاندان نے ۷۵ برس حکومت کی۔لیکن کوئی خاص کارنامہ انجام دینے سے قاصر رہے۔لودھی خاندان کے آخری بادشاہ ابراہیم لودھی نے ملک کے انتظام کو بہتر بنانے کی کوشش کی، مگر وہ مغل حملے کی زد میں آ گیا۔

مغل بادشاہوں کا دور (۹۳۲ھ تا ۱۲۷۳ھ)

مغلیہ حکومت کا بانی ظہیر الدین بابر باپ کی طرف سے تیموری اور ماں کی طرف سے چنگیزی النسل تھا۔اس کا باپ وسط ایشیاء کی ایک ریاست فرغانہ کا حکمران تھا۔مگر جب بابر کی کم سنی میں باپ کا انتقال ہوگیا تو اس کے چچا نے اس علاقے پر قبضہ کر لیا۔باوجود کوشش کے وہ اپنے علاقے کو اس کے تصرف سے نکالنے میں کامیاب نہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

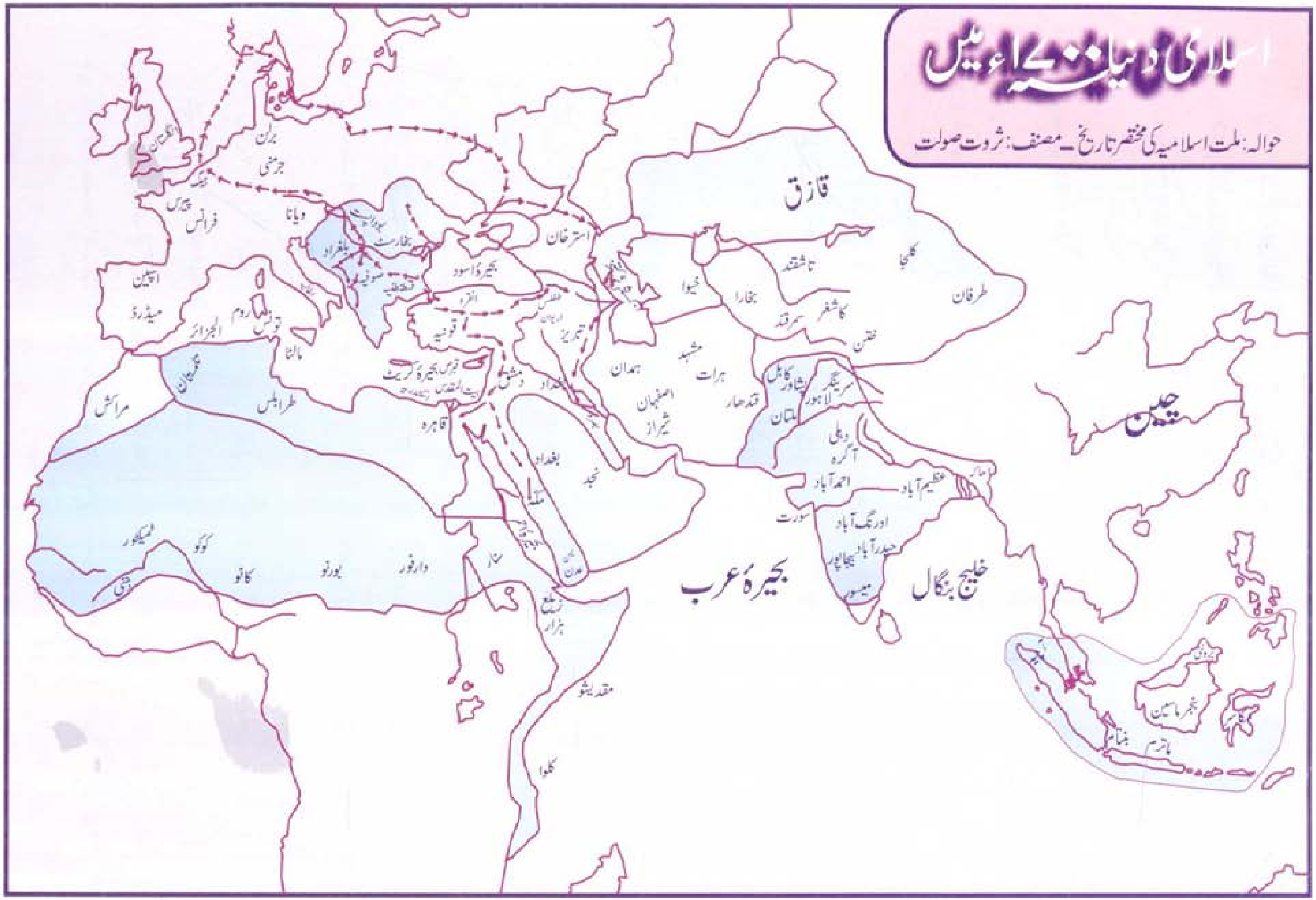

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہو سکا۔ اسی اثناء میں اسے خبر ملی کہ اس کے دوسرے چچا کا جو کابل کا حاکم تھا انتقال ہو گیا ہے۔ چنانچہ وہ فوراً وہاں پہنچا اور سب کے متفقہ فیصلے سے حاکم چن لیا گیا۔ اب وہ ہندوستان کی طرف متوجہ ہوا اور لودھی خاندان کے آخری بادشاہ ابراہیم لودھی کو پانی پت کے مقام پر شکست دی۔ یوں ہندوستان پر اس کی حاکمیت کی راہ ہموار ہو گئی۔

ایک کے بعد ایک علاقے کو زیر کرتا ہوا وہ بہت جلد وسیع سلطنت کا مالک بن گیا۔ بارہ برس سے جنگ و جدل کے میدان میں رہنے والا بابر آخر دم تک اسی کام میں مصروف رہا۔

بابر کے بعد اس کا بیٹا ہمایوں تخت نشین ہوا تو جہاں اور علاقوں میں بغاوتیں ہوئیں وہیں بنگال کے شیر خان نے بھی شورش کر دی اور ہمایوں پر حملہ کر دیا۔ ہمایوں کو شکست ہوئی اور وہ ایران روانہ ہو گیا۔ شیر خان نے تخت کا مالک ہونے کے بعد شیر شاہ سوری کے نام سے حکومت کی۔ رعایا کی بہتری کے لئے کئے گئے کاموں کی وجہ سے ہندوستان کی تاریخ میں اس کا نام ہمیشہ یاد رہے گا۔ گو پانچ برس میں ہی اس کا انتقال ہو گیا مگر وہ ایک بیدار مغز اور قابل حکمران تھا۔ اس کے جانشین ویسے ثابت نہ ہوئے اور ملک داخلی انتشار کا شکار ہو گیا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہمایوں نے ایک بار پھر ہندوستان کا رخ کیا اور پنجاب اور دہلی فتح کر لئے۔ اس کے بعد اپنے کم عمر بیٹے کو بیرم خان کے ساتھ چند سرکش افغان سرداروں کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا ہی تھا کہ خود شاہی کتب خانے کی چھت سے گر کر شدید زخمی ہوا اور چند دن بعد وفات پا گیا۔ اس کا بیٹا اکبر ابھی صرف ۱۳ برس کا تھا جب اسے تخت نشین کیا گیا۔ اکبر نے کم عمری کے باوجود بہت جلد سلطنت پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔ مگر آہستہ آہستہ ہندو مذہب سے قریب اور اسلام سے دور ہوتا چلا گیا۔ ہندو رانیوں سے شادی اس کی ایک بڑی وجہ تھی۔ اکبر کی بدقسمتی دیکھئے کہ اپنی گمراہی میں ایسا بڑھا کہ باوجود ان پڑھ اور کم علم ہونے کے دینِ الٰہی کے نام سے نیا دین ایجاد کر بیٹھا۔ نصف صدی پر محیط دورِ اکبری میں ہندوستان میں اسلام کو شدید ضعف پہنچا۔ اس کے بعد جہانگیر اور شاہجہان نے دینِ الٰہی کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ یہ تمام عرصہ استحکامِ سلطنت کے لحاظ سے زریں خیال کیا جاتا ہے۔

شاہ جہاں کے بعد جب اورنگزیب عالمگیر حکمران بنا تو اس نے اپنی ریاست کو حقیقی معنوں میں اسلامی ریاست بنانے کی بھرپور کوشش کی۔ اسے سرکاری خزانے کے امانت ہونے کا اتنا احساس تھا کہ وہ اپنے ذاتی اخراجات کے لئے قرآن مجید لکھتا اور اس کے ہدیئے سے اپنا خرچ چلاتا۔ اور کبھی ٹوپیاں سی کر ان کی آمدنی پر قناعت کرتا۔ غرض اس کا دور نفاذِ شریعت، عوامی فلاح و بہبود اور عدل و انصاف کے لحاظ سے ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں میں سب سے زیادہ زریں کہا جا سکتا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اورنگزیب عالمگیر کے بعد اس کے جانشین نااہل ثابت ہوئے۔حکمرانوں کی عیش پرستی، چھوٹی خودمختار سلطنتوں کے قیام، دین سے دوری اور مرہٹوں اور سکھوں کی ہمہ وقتی شورشوں نے ہندوستان کو ایسے انتشار اور انارکی میں دھکیل دیا تھا کہ وہ انگریزوں کے لئے (جو وہاں تجارت کی غرض سے آئے تھے) تر نوالہ ثابت ہوا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی سے پہلے نواب سراج الدولہ نے بنگال اور سلطان ٹیپو نے میسور میں انگریزوں کے خلاف جہاد کا علم بلند کیا۔مگر غدار وزراء کی سازشوں کا شکار ہوکر بالترتیب ۱۷۵۷ء اور ۱۷۹۹ء میں انگریزوں سے شکست کھائی اور جامِ شہادت نوش کیا۔ بالآخر ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی طرف سے انگریز کے غلبے سے نجات پانے کی آخری کوشش بھی ناکام ہوئی۔مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر قید ہوا اور دورانِ قید ہی مرگیا۔اس کے ساتھ ہی مغلیہ سلطنت کا سورج غروب ہوگیا۔گو ہندوستان کی تاریخ میں مغلیہ سلطنت کے عروج کے دور کو یادگار کہا جاتا ہے۔لیکن حقیقت میں مغل حکمرانوں کی جدید علوم کی طرف سے کوتاہ نظری، بادشاہت کے لئے شہزادوں میں لڑائیاں اور دین کے صحیح فہم کی کمی اس دور میں بھی موجود تھی۔ آگے چل کر حکمرانوں کی انتظامی نااہلی بھی شامل ہوگئی اور یوں ہندوستان پر مسلمانوں کی حکومت کا ہزار سالہ دور اپنے اختتام کو پہنچا۔

عالمِ اسلام غلامی کے پنجے میں (چودھویں صدی ہجری تا ایں دم)

عذابِ الٰہی کا پہلا کوڑا جو چھٹی اور ساتویں صدی ہجری میں مسلمانوں پر صلیبیوں اور تاتاریوں کے حملوں کی صورت میں برسا تھا، اب دوسری بار تیرہویں اور چودھویں صدی ہجری میں یورپی اقوام کے عالمِ اسلام پر قبضے کی صورت میں تباہی لایا۔ چند ایک ممالک کو چھوڑ کر پوری مسلم دنیا کو بالواسطہ یا بلاواسطہ غلامی کی زنجیر میں باندھ دیا گیا۔ پہلی جنگ عظیم کے خاتمے پر سلطنت عثمانیہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوئی تو شمالی افریقہ سمیت پورے عالمِ عرب کی چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بندر بانٹ کردی گئی۔

گو نصف صدی کی پیہم کوششوں کے بعد چند ایک کے سوا تمام اسلامی ممالک آزاد ہونے میں کامیاب ہوگئے، مگر یورپی، روسی اور امریکی حکومتوں نے اس بات کا پورا اہتمام کیا کہ من پسند حکمرانوں کے تسلط کے ذریعے علاقائی خودمختاری کے نام پر دی گئی آزادی حقیقی آزادی میں تبدیل نہ ہوسکے۔اس کے نتائج بعینہٖ وہی نکلے جو وہ چاہتے تھے۔آج بھی مسلمان ذہنی، روحانی، تہذیبی، معاشی، ثقافتی، تعلیمی اور سماجی حوالے سے مکمل طور پر ان اقوام کے زیر اثر ہیں اور اصلاح کی چند تحریکوں اور انفرادی کوششوں سے قطع نظر مقامِ افسوس ہے کہ اس غلامی پر پوری طرح رضامند اور خوش ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مسلمانوں کی مختصر علمی اور فکری تاریخ

خلافتِ راشدہ

خلافت راشدہ کے دور کو انقلاب کی توسیع کا دور کہا جا سکتا ہے۔ اسلام جو حجاز کے بطن سے نکلا تھا، اب دو سپر طاقتوں کو شکست دینے کے بعد مہذب و متمدن دنیا کے بڑے حصے تک پہنچ چکا تھا۔ سادہ مزاج عربوں کے لئے متمدن قوموں کے تنظیمی مسائل اسلام کی روشنی میں حل کرنا سب سے اہم مسئلہ تھا۔ ان مواقع پر صحابہ کرامؓ سب سے پہلے قرآن کی طرف رجوع کرتے۔ اگر وہاں سے حل مل جاتا تو ٹھیک ورنہ حدیثِ رسول کی تلاش کی جاتی۔ اگر وہاں سے بھی راہنمائی نہ ملتی تو ہر علاقے کے حالات و معاملات کو ان ہی علاقوں کے قوانین کی روشنی میں نافذ کر دیا جاتا، بشرطیکہ وہ اسلام سے متصادم نہ ہوں۔ مختلف مواقع پر بعض صحابہ نے بڑی جرأت مندی سے اجتہاد کیا۔ حضرت عمرؓ اس معاملے میں سرفہرست نظر آتے ہیں۔ جہاں بطور خلیفہ انہوں نے عقائد کے معاملے میں اسلام کو اس کے اصل سرچشمے یعنی قرآن وسنت سے مضبوطی سے جوڑے رکھنے کے لئے سختی برتی وہیں پیش آمدہ مسائل کو صاحبِ تقویٰ اور صاحبِ بصیرت اصحاب کی شوریٰ کے سامنے پیش کر کے بڑے بڑے اجتہادات کئے۔

اس دور کا یہ تسلسل برقرار رہا اور صحابہ کرامؓ کی ساری توجہ قرآن وحدیث کی تعلیم وتشریح پر مرکوز رہی۔ اس سلسلے میں حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی خدمات نمایاں رہیں۔ یہ تشریحات وتعبیرات بھی زیادہ تر قرآن وحدیث کے احکامی حصے سے متعلق تھیں۔ جبکہ بنیادی عقائد سے متعلق سوالات کے جوابات چونکہ قرآن کافی وشافی انداز میں دے چکا تھا لہٰذا ان کی حوصلہ شکنی کی گئی۔

اسلامی عقائد وفکر کے اس پرسکون دریا میں پہلا پتھر خوارج نے پھینکا۔ خوارج وہ بدوی عرب تھے جو خلافتِ راشدہ کے آخری دور میں اس وقت سامنے آئے جب حضرت علیؓ اور حضرت امیر معاویہؓ کے درمیان جنگ ہوئی۔ خوارج نے دونوں گروہوں کو خارج از اسلام اور گناہ گار ٹھہرایا اور بظاہر سیاسی مسئلے کو ایمان وفکر کے بنیادی سوالات کی تشریح کا مسئلہ بنا دیا۔ خوارج کے نزدیک کبیرہ گناہ کا مرتکب دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا تھا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور اس کا قتل جائز تھا۔ یہ متشدد گروہ اپنے خیالات ونظریات کو منوانے کے لئے تلوار کے استعمال کو جائز بلکہ ضروری سمجھتا تھا۔ مسلمانوں کی اکثریت نے اس کی تعلیمات کو کلیتاً مسترد کردیا اور یہ گمراہ فرقہ آنے والے وقتوں میں بھی ہمیشہ مطعون رہا۔

اسلام کی فکری وعلمی ترقی وزرخیزی کا اہم ترین دور (۶۱۱ء۔۱۰۵۵ء)

خلافت راشدہ کے بعد بنوامیہ کے ابتدائی دور میں خلافت کی ملوکیت میں تبدیلی کے خلاف مسلم عوام میں بے چینی پیدا ہوئی اور حسین بن علیؓ، عبداللہ بن زبیرؓ اور نفس زکیہ نے چند سالوں کے وقفے سے خروج کیا۔ لیکن وہ نظامِ حکومت میں آنے والی اس تبدیلی کو واپس نہ کرسکے۔ بالآخر مسلمان خواص وعوام نے بہ امرِ مجبوری بنوامیہ کی مطلق العنان ملوکیت سے ایک طرح کا سمجھوتا کرلیا۔ اس طرح عملی طور پر مذہب اور ریاست میں دوئی ہوگئی جو بنیادی اسلامی فلسفے کے خلاف تھی۔ لیکن اس کو اس لئے برداشت کیا گیا کہ مسلمان معاشرے میں امن قائم رہے اور یہ خانہ جنگی اور افراتفری کا شکار نہ ہوجائے۔ مذہبی قیادت اب بھی علماء کے ہاتھ میں تھی۔ تاہم ریاست کے معاملات سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا۔ البتہ جب بھی موقع آیا مسلمان علماء نے جابر حکمرانوں کے سامنے کلمہ حق کہنے سے کبھی گریز نہیں کیا۔ اس ضمن میں امام حسن بصریؒ نے اپنے مواعظ کے ذریعے ان ناپسندیدہ حرکات کے خلاف آوازِ تجدید اٹھائی جو معاشرے میں اسلامی اقدار وتعلیمات کے بالکل برعکس پنپ رہی تھیں۔ خاندانِ بنوامیہ میں خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ نے اسلامی قوانین، اقدار اور صحیح اسلامی روح کو معاشرے میں دوبارہ لانے کی بھرپور سعی کی۔ لیکن ان کے بعد کے خلفاء نے اپنے شاہانہ طریقے جاری رکھے۔ انفرادی طور پر کچھ لوگوں نے اس نظام کو مسترد کرنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوسکے۔ صرف خوارج وہ واحد فرقہ تھا جو استقامت سے ڈٹا رہا۔ مگر ان کے عقائد گمراہ کن تھے اور وہ مسلمانوں کی اکثریت کی تکفیر کرتے تھے۔ چنانچہ مسلمانوں نے انہیں ان کی شدت پسندی کی وجہ سے مسترد کردیا۔

یہ وہ حالات تھے جن میں مرجیہ کا مکتبۂ فکر وجود میں آیا۔ ''ارجاء'' کا مطلب کسی چیز کو ملتوی کرنا یا امید کرنا ہے۔ یہ طرزِ فکر خوارج اور شیعانِ علی و بنوامیہ کے آپس میں ایک دوسرے کو مطعون کرنے اور گناہ گار قرار دینے کے بعد وجود میں آیا۔ اس کا اصل نظریہ یہ تھا کہ کردار اور افعال کے فیصلوں کا اختیار انسانوں کو نہیں بلکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو ہے اور وہی روزِ حساب اس کا فیصلہ کرے گا۔ دوسرے لفظوں میں اللہ کی رحمت اور قدرتِ کاملہ سے یہ امید کی جاسکتی ہے کہ وہ انسانی غلطیوں سے چشم پوشی فرمائے، لہٰذا کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ کلمہ گو مسلمان کے کسی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عمل کو بنیاد بنا کر اس کو کافر یا فاسق کہے۔

مرجیہ کے نظریات بنو امیہ کے حکمرانوں کو پسند آئے۔ اس طرح وہ اپنے غلط افعال پر ہر قسم کی تنقید سے بچ سکتے تھے۔ چنانچہ حکومتِ وقت کی سرپرستی میں مرجیہ فکر نے ایک اور کروٹ لی اور ''جبریہ'' (Pre-determinist) کا گروہ سامنے آیا، جس نے اموی حکمرانوں کی چھتری کے نیچے پرورش پائی اور جس کی بنیادی فکر یہ تھی کہ انسان مجبورِ محض ہے۔ اپنے ہر غلط اور صحیح عمل میں وہ اس تقدیر کا پابند ہے جو قدرت نے اس کے لئے پہلے سے لکھ دی ہے۔ مثلاً حاکم جس طرح بھی حکومت کرے اور اس کا کردار و افعال جیسے بھی ہوں، وہ اس کے لئے مجبور ہے اور محکوم ہر حالت میں اس کی اطاعت کے لئے مجبور ہے۔ اس لئے کہ یہ اللہ کی مقرر کردہ تقدیر ہے کہ جس کو چاہے حاکم بنائے اور جس کو چاہے محکوم۔

اس کے جواب میں ''قدریہ'' مکتبِ فکر سامنے آیا، جس نے جبریہ کے برعکس انسان کے اختیار اور ارادے کو اہمیت دی اور انسان کو اپنے افعال کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ اس کا پرچار کرنے والا معبد الجہنی تھا جس کو اموی خلیفہ عبدالملک نے تختۂ دار پر لٹکا دیا۔ بعد میں غیلان دمشقی نے اس کی قیادت سنبھالی۔ وہ بھی پھانسی چڑھا مگر یہی کہتا رہا کہ مسلمان کا فرض ہے کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے، لیکن تلوار کی دھار پر نہیں، بلکہ وعظ و نصیحت کے ذریعے اس کام کو انجام دے۔

جہاں فکری محاذ پر مسلمانوں کو نئے نئے نظریات کا سامنا تھا وہیں دین کے بنیادی علوم تفسیر قرآن، حدیث اور فقہ کے لحاظ سے بھی ترقی ہو رہی تھی۔ عبدالملک کے عہد میں ابن جبیر تابعی نے تفسیر کی پہلی کتاب لکھی۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے عہد میں علمائے حدیث نے احادیث کے دفتر کے دفتر تیار کئے۔ فقہ میں امام ابوحنیفہؒ کی کوششوں سے تدوینِ مسائل کے لئے اکیڈمی کا قیام عمل میں آیا۔

اس کے علاوہ دنیاوی علوم کے حصول کا شوق بھی پیدا ہوا۔ اموی خلفاء نے ان کی سرپرستی بھی کی۔ خود امیر معاویہؓ کے دور میں فنِ تاریخ نویسی کی ابتداء ہوئی اور عبید بن شریہ نے تاریخ قدیم کی داستانیں اور سلاطینِ عجم کے حالات لکھے۔ اسی طرح فنِ عروض، علمِ نحو اور علمِ کیمیاء پر کئی رسالے لکھے گئے۔ یزید اول کا لڑکا خالد اموی عہد میں علمِ کیمیاء کا سب سے بڑا عالم تھا۔ بنو امیہ کے دور میں ہی غیر ملکی زبانوں کی کتابوں کے تراجم شروع ہو چکے تھے، گو اس کو اصل فروغ عباسی دور میں نصیب ہوا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فکر و فلسفۂ یونان کے اسلامی معاشرے پر اثرات

امویوں کے بعد عباسیوں کو ورثے میں ایک عظیم الشان سلطنت ملی جو تمام عرب، سینٹرل ایشیاء، ایران، اسپین اور سندھ پر مشتمل تھی۔ اسلامی تمدن روم اور ایران جیسی قدیم تہذیبوں کو متاثر کر رہا تھا۔ اس تعامل (Interaction) کے نتیجے میں کئی ایسے سوالات اٹھنے شروع ہوئے جن پر اب تک مسلمانوں کو غور کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ کوفہ، بصرہ، بغداد اور قاہرہ ابتداً فوجی چھاؤنیاں تھیں جنہوں نے بعد میں شہروں کی شکل اختیار کر لی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ مختلف النوع تہذیبوں، علوم وفنون اور افکار ومباحث کے مراکز بن گئے تھے۔ جیسا کہ تذکرہ گذر چکا ہے کہ گو مختلف زبانوں کی کتابوں کے تراجم کا آغاز بنوامیہ کے حکمرانوں کی سرپرستی میں ہوا۔ مگر اس کو آگے بڑھانے والے وہ نسطوری عیسائی تھے جو یونانی حکمت، فلسفے اور طب کے خاص ماہر تھے۔ اس طرح اسلام کو بیک وقت یونانی فلسفے، زرتشتی عقائد، عیسائیت، بدھ مت، یہودیت اور دہریت سے پالا پڑا۔ اسلام کے ابتدائی دور کی سادگی اور عملی مذہبیت قائم نہ رہ سکی اور اس کی جگہ فلسفیانہ اور متکلمانہ بحثوں نے لے لی۔ اس صورتحال کا سامنا معتزلہ مکتبہ فکر نے کیا جو مسلمانوں میں پہلا عقلیت پسند (rationalist) فرقہ تھا۔ اس کی ابتداء اس وقت ہوئی جب اموی دور میں حسن بصری کے ایک شاگرد واصل بن عطاء نے دینی تعلیمات کی خالص مذہبی، اخلاقی اور روحانی تشریحات کے بجائے فلسفیانہ اندازِ فکر سے ان کے جوابات کے لئے اصرار کیا اور مطمئن نہ ہونے پر مسجد میں اپنا علیحدہ حلقہ قائم کر لیا۔

معتزلہ کی یہ خدمت بجائے خود قابلِ قدر تھی کہ دوسرے مذاہب سے فکری محاذ آرائی کے دوران قرآنی نظریات اور احادیث کی حجت، منطق اور فلسفے کی بنیاد پر (نہ کہ قرآنی دلائل اور ارشاداتِ رسول کی بنیاد پر جو غیر مسلموں کے لئے ناقابل قبول تھے) ثابت کی جائے۔ اگر بات صرف یہاں تک محدود رہتی تو شاید قابلِ قبول ہوتی، تاہم خرابی اس وقت پیدا ہوئی جب معتزلہ نے عقل اور فلسفے پر ضرورت سے زیادہ انحصار کرنا شروع کر دیا اور عقل کو وحی کے برابر لے آئے۔ ان کا موقف یہ تھا کہ خیر اور شر وحی کی بناء پر نہیں بلکہ خود اپنی ذات میں خیر اور شر ہیں اور وحی محض اس کی تصدیق کرتی ہے۔

علماء حضرات کے لئے یہ بات ناقابلِ قبول تھی۔ وہ اسلام کی سادہ تعلیمات کو قرآن، حدیث اور فقہ کی حد سے نکال کر فلسفے کی بھول بھلیوں میں گم نہیں کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ اس دور کے تمام بڑے آئمہ نے اس کو ناپسندیدگی سے دیکھا۔ امام ابوحنیفہؒ نے کوفہ میں اگرچہ حصولِ علم کی ابتداء علم الکلام سے کی تھی، مگر کچھ ہی عرصے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے بعد اس کے بے فائدہ ہونے کے احساس کی بناء پر علمِ فقہ کی طرف توجہ مبذول کی اور تدوینِ فقہ کے کام کو جامع اور منظم انداز میں کرنے کا بیڑا اٹھایا اور آخر دم تک اسی میں مصروف رہے۔ امام مالکؒ کا قیام چونکہ مدینہ میں تھا (جہاں علمِ حدیث کا بہت چرچا تھا اور عربی مزاج کی سادگی برقرار تھی) لہٰذا وہ تو قرآن و حدیث کی موجودگی میں فقہی موشگافیوں کے بھی قائل نہ تھے، کجا یہ کہ یہ تسلیم کرتے کہ کسی بھی وجہ سے عقل کو ان دونوں سے بلند مرتبہ تصور کیا جائے۔ اسی طرح امام شافعیؒ نے بھی جو اپنے دور کے بہت بڑے جینئس تھے، ان یونانی و ہندی علوم کے مقابلے کے لئے مسلمانوں کے اپنے بنیادی عقائد سے صرف نظر کو بہت سختی سے مسترد کر دیا بلکہ آپ کے عراق کے قیام کو ترک کرنے کی ایک وجہ یہ بھی قرار دی جاتی ہے کہ آپ ان پریشان خیالیوں کے ہجوم سے دور رہ کر یکسوئی سے علمِ فقہ کے قوانین کو مستنبط کرنے کا کام کرنا چاہتے تھے۔ ائمہ اربعہ کے سلسلے کے آخری امام احمد ابن حنبلؒ نے تو اس کے لئے سب سے بڑھ کر قربانی دی۔

اس کا پس منظر یہ ہے کہ گو معتزلہ کی ابتداء تو اموی دور سے ہوئی مگر انہیں اصل عروج عباسیوں کے دور میں ملا جب عباسی خلفاء میں سے خصوصاً مامون نے الحاد و زندقہ کے طوفان کا مقابلہ کرنے کے لئے معتزلہ کی سرپرستی کی اور ان کا ایسا قائل ہوا کہ اس دور کے مشہور مسئلے خلقِ قرآن پر علماء، فقہاء اور محدثین کو طاقت کے بل بوتے پر اپنا ہمنوا بنانے کی ٹھانی۔ امام احمد ابن حنبل کو بھی اس آزمائش کا سامنا ہوا۔ جب حکومت کی طرف سے ان پر سرکاری موقف کی حمایت کرنے کا دباؤ ڈالا گیا تو امام العزیمت نے طاقت اور اقتدار کے آگے جھکنے سے انکار کر دیا اور سخت معتوب ہوئے۔ کوڑے کھائے، نظر بند ہوئے، مگر سلف کے طریقے سے ہٹ کر قرآن اور حدیث کے علاوہ فہمِ عقائد کے لئے کسی چیز کو مصدر اور مآخذ ماننے سے انکار کر دیا۔

اگر دقتِ نظر سے دیکھا جائے تو معتزلہ عقائد کے محاذ پر جبکہ فقہاء ظاہری اور تمدنی سطح پر پیش آمدہ تصورات اور مسائل سے نبرد آزما تھے، مگر ان کے درمیان بنیادی فرق یہ تھا کہ فقہاء نے اپنی کوششوں کا دائرہ کار قرآن و حدیث اور سلف کے آثار تک محدود کر لیا تھا جبکہ معتزلہ اس حد بندی کے قائل نہ تھے۔ وہ سرکاری سرپرستی کے باوجود عوامی مقبولیت حاصل کرنے میں ناکام رہے اور اس معاملے میں محدثین و فقہاء ان پر سبقت لے گئے۔

ادھر فقہاء کا کام بھی کچھ ایسا آسان نہ تھا۔ قرآن اور حدیث ان کے لئے بنیادی مآخذ کا درجہ رکھتے تھے۔ قرآن کی حد تک تو بات یقینی تھی۔ لیکن حدیث کا معاملہ مختلف فرقوں، گروہوں اور افراد کی اپنے خودغرضانہ مقاصد کے حصول کے لئے طبع آزمائی کی وجہ سے مشتبہ ہو چکا تھا اور سینکڑوں، ہزاروں، یہاں تک کہ بعض روایات کے مطابق لاکھوں ضعیف اور وضع کردہ احادیث کی موجودگی میں صحیح احادیث تک پہنچنا بظاہر ناممکن نظر آتا تھا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خلافتِ راشدہ سے لے کر تیسری صدی ہجری تک اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کی زندگی، اقوال و افعال اور طریقوں کی حفاظت و اشاعت کے لئے ہزاروں لاکھوں چاہنے والوں کو پیدا کیا، جنھوں نے علمِ حدیث کے شوق میں اور اسکی جمع و تدوین کی خاطر اسلامی دنیا کا کونہ کونہ چھان مارا۔ اس علم کو محفوظ بنانے کے لئے اصول، قواعد اور ضابطے بنانے کا آغاز ہوا۔ حدیث کے ایسے مجموعے جو ہر شبے سے خالی ہوں تیار کرنے کا سہرا امام بخاری اور ان کے تلامذہ امام مسلم، امام ترمذی، امام نسائی اور امام ابوداؤد کے سر جاتا ہے۔ ان حضرات نے احادیث کے مختلف علوم کو پیش نظر رکھتے ہوئے سخت اصولوں کی روشنی میں پوری تحقیق و تنقید کے ساتھ امت کے سامنے صحیح احادیث کے وہ مجموعے پیش کیے جنھوں نے صحاحِ ستہ کے نام سے شہرت پائی۔

چوتھی صدی ہجری تک جہاں محدثین اپنی بے نظیر کوششوں کی بناء پر علمِ حدیث کو محفوظ بنانے میں کامیاب ہو چکے تھے، وہیں معتزلی حضرات بھی عقلی اور فلسفیانہ بنیادوں پر علم الکلام کی بنیاد رکھ چکے تھے۔ وہ توحید، جبر، فلسفہ، خیر و شر اور صفاتِ الٰہی خصوصاً صفتِ عدل اور اس کا قدرتِ الٰہیہ سے تعلق، تخلیقِ قرآن جیسے مسائل پر باقاعدہ ایک مخصوص فکر کو لے کر آگے بڑھ رہے تھے۔

ان دونوں (اہلِ حدیث حضرات اور معتزلہ) کے درمیان ایک مستقل کشمکش جاری تھی جب مشہور معتزلی عالم ابوعلی جبائی کے شاگرد ابوالحسن اشعری نے اس مکتبہ فکر سے تائب ہو کر اپنا رخ محدثین و فقہاء کی طرف کیا۔ پھر کچھ عرصہ تنہائی میں رہ کر دونوں طرز ہائے فکر کا موازنہ کرنے کے بعد میدان میں آئے اور ایک نئے طرزِ فکر کی بنیاد رکھی جس نے "اشاعرہ" کے نام سے شہرت پائی۔ اشاعرہ کا طریقہ یہ تھا کہ وہ زبان تو منطق و فلسفہ کی استعمال کرتے مگر مسلک فقہاء اور محدثین کا اختیار کرتے۔ اس اعتدال پسندی کی وجہ سے وہ جلد ہی مقبول ہو گئے اور معتزلہ کا زور توڑنے میں کامیاب رہے۔ گو اشاعرہ نے اہلِ حدیث حضرات کے مسلک کی پیروی کی، مگر چونکہ وہ اپنے موقف کی سچائی ثابت کے لئے منطق اور فلسفیانہ طرزِ استدلال کا سہارا لیتے تھے لہٰذا اہلِ حدیث مکتبہ فکر کے انتہائی دائیں بازو کے گروہ نے خود اشاعرہ کو بھی مسترد کر دیا اور یہ کشمکش اگلی دو صدیوں تک چلتی رہی۔

عالمِ اسلام میں تصوف کی مقبولیت

تصوف کیا ہے؟ اس کی کوئی مخصوص تعریف تو نہیں کی جا سکتی، البتہ یہ ایک ایسا طرزِ فکر ہے جس کے مطابق منطقی استدلال اور عقل و خرد کی مدد سے معرفتِ حق حاصل نہیں ہو سکتی، بلکہ اس کے لئے مجاہدے، ریاضت اور فکر و

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مراقبے کے ذریعے روحانی ترقی حاصل کرنا ضروری ہے جس کی آخری منزل معرفتِ حقیقت ہے۔ اسلام میں تصوف کی ابتداء کیسے ہوئی اس کے بارے میں حتمی طور پر کچھ کہنا ممکن نہیں ہے۔ آنحضرت ﷺ اور صحابہ کرامؓ کا سادہ طرزِ زندگی اور دنیا پرستی سے شدید احتراز ایک یقینی امر تھا۔ آپ ﷺ نے جہاں ہر معاملے میں آخرت کو دنیا پر ترجیح دی وہیں ترکِ دنیا اور رہبانیت اختیار کرنے سے منع فرمایا۔ صحابہ کرامؓ میں حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ سے بڑھ کر زاہد کون تھا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ تینوں حضرات خلافت جیسی بھاری (اور بعض لوگوں کے نزدیک دنیادارانہ) ذمہ داری کو احسن ترین طریقے سے نبھاتے رہے۔

بنوامیہ کی شخصی وموروثی حکومت کے دور میں سوسائٹی میں مادیت کا سیلاب آ گیا اور یہ محسوس ہونے لگا کہ ایمان میں کمزوری، تعلق باللہ میں کمی اور اعمال صالحہ کی کوشش اور خواہش میں جس تیزی سے تنزل آ رہا ہے، وہ بہت جلد امت کی اخلاقی اور روحانی بنیادوں کو بالکل کھوکھلا کر دے گا۔ ایسے میں تابعین کی جماعت نے اصلاحِ امت کا بیڑا اٹھایا۔ حسن بصری کا نام اس سلسلے میں سرفہرست ہے۔ وہ قرآن کے عالم اور بلند پایہ محدث ہونے کے ساتھ ساتھ صحابہ کرامؓ کے ہم صحبت بھی تھے۔ انہیں زبان و بیان پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ انہوں نے اس خطرے کو محسوس کیا اور اپنے مواعظ کے ذریعے دنیا کی بے ثباتی، آخرت کی اہمیت، تقویٰ، خشیتِ الٰہی کی اہمیت پر زور دیا اور نفسانیت اور مادیت پرستی کی مذمت کی۔

ان کے بعد متعدد ایسے اصحاب گذرے جنہوں نے مذہب کے روحانی و باطنی پہلوؤں پر زور دیا۔ ان کی تعلیمات کو قبولِ عام حاصل ہوا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ علماء حضرات نے غیر مذاہب کے مقابلے پر اسلامی تشخص کو بچانے کے لئے مذہب کے ظاہری اور رسمی پہلوؤں کی طرف زور دینا شروع کیا تو ایک طبقہ ظاہری اسلام کی تعلیمات اور فقہی باریکیوں سے بیزار ہو کر اصلاحِ باطنی پر زور دینے لگا اور ان لوگوں کی تقلید کرنے لگا جو زہد و تقویٰ اور ترکِ دنیا میں ممتاز تھے۔ ان میں ابراہیم بن ادہمؒ، رابعہ بصریؒ، معروف کرخیؒ وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

ابتدائی دو صدیوں میں اس فکر کی نمایاں شخصیات معروف معنوں میں صوفیاء کے بجائے اولیاء اللہ کہلائیں۔ ان کے ہاں زہد و تقویٰ کی جتنی اہمیت تھی اتنا ہی خوارق، کرامتوں، کشف اور الہام کو ناپسندیدہ نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ دوسری صدی ہجری کے اختتام اور تیسری صدی ہجری کے اوائل میں تصوف نے اسلامی فکر میں ایک مستقل مقام حاصل کر لیا تھا۔ ذوالنون مصریؒ، جنید بغدادیؒ، ابوالحسن نوریؒ، بشر حافیؒ، بایزید بسطامیؒ، داؤد طائیؒ وہ لوگ تھے جن کی بے لوث زاہدانہ زندگیاں، بے غرضی و بے نفسی اور سچی خداترسی نے مسلمانوں کے علاوہ غیر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مسلم آبادیوں پر بھی اپنے اثرات مرتب کئے اور ان حضرات کے اعمال و اخلاق دیکھ کر بکثرت یہودی، عیسائی اور مجوسی مسلمان ہوئے۔

لیکن ہر فکر کے ارتقائی عمل کی طرح تصوف جس نے دنیائے اسلام کے مذہبی رجحانات کو نمایاں طور پر متاثر کیا تھا، خود خارجی اثرات کی زد میں آ گیا۔ اگر بات صحابہ کرامؓ کے زہد، دنیا سے بے رخی اور توکل و قناعت تک رہتی تو قابلِ قبول بلکہ عین پسندیدہ تھی۔ مگر تصوف جب ایران، عراق، مصر سے ہوتا ہوا ہندوستان پہنچا اور وہاں سے چکر کاٹ کر مغربی اور وسطی ایشیاء آیا تو اس میں مسیحیت کی رہبانیت، یونانیوں کی نوفلاطونیت، بدھ مت کی نفیٔ ذات اور آریائی ہندوستان کا نظریہ حلول اپنا رنگ دکھا چکا تھا۔ صوفیاء کی بیسویں شاخیں بلادِ اسلامیہ میں پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ گم راہ کن نظریہ پھیلنے لگا تھا کہ تصوف اصل دین ہے جبکہ ظاہری شریعت محض جسم ہے لہٰذا تصوف کے مقابلے میں کم تر ہے۔ بہت سے ناپختہ حضرات نے قلبی وارداتوں کی بناء پر کچھ احوال محسوس کئے تو اپنے آپ کو شریعت کے احکام سے بالاتر سمجھنے لگے۔ تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں جب ایسے حضرات اور ان کے پیروؤں کی تعداد بڑھنے لگی تو علماء و فقہاء میں تصوف کے خلاف شدید ردعمل ہوا جس کے نتیجے میں علمائے ظاہر اور علمائے باطن کی کشمکش پیدا ہوئی۔ لیکن تصوف کے اثرات بہت گہرے تھے اور وہ پوری اسلامی دنیا پر چھا چکا تھا۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ خود صوفی حضرات میں اصلاح اور تجدید کی تحریک شروع ہو۔

چنانچہ پانچویں صدی ہجری میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے دو ایسی باکمال شخصیات کو پیدا کیا جنہوں نے اصلاحِ احوال کا فریضہ بہترین طور پر سرانجام دیا۔ ایک امام غزالیؒ کی نابغۂ روزگار شخصیت اور دوسری شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی جلیل القدر ہستی۔ شیخ عبدالقادر جیلانی کو جہاں علوم وفنون میں کمال حاصل تھا وہاں وہ طریقت کے رموز سے بخوبی آگاہ تھے۔ وہ بہت جلد اپنی روحانیت، حسن خلق، تواضع وانکساری اور عالی ہمتی کی بناء پر مرجع خلائق بن گئے۔ انتہائی خلوص کی وجہ سے ان کی زبان میں بھی بے پناہ تاثیر تھی۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی ان کے بارے میں فرماتے ہیں:

> ''اتباعِ کامل، علمِ راسخ اور تائیدِ غیبی نے آپ کو اس مقام پر پہنچا دیا تھا کہ حق و باطل، نور و ظلمت، الہامِ صحیح اور کیدِ شیطانی میں پورا امتیاز پیدا ہو گیا تھا۔ آپ پر یہ حقیقت پوری طرح منکشف ہو گئی تھی کہ شریعتِ محمدی کے احکام اور حلال وحرام میں قیامت تک کے لئے تغیر و تبدل کا امکان نہیں، جو اس کے خلاف دعویٰ کرے وہ شیطان ہے''۔

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ برابر اپنے مواعظ میں یہ حقیقت بیان کرتے رہے کہ جس چیز کی تائید شریعت سے نہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہو وہ باطل ہے۔ ایک طرف ان کی مساعی جاری تھی اور دوسری طرف امام غزالیؒ ایسے وقت میں منظرِ عام پر آئے جب معتزلہ اور اشاعرہ، اہلِ ظاہر و اہلِ باطن، فلسفی اور علماء و فقہاء سب ایک دوسرے پر اپنی برتری اور فوقیت ثابت کرنے میں لگے ہوئے تھے اور دین گویا مختلف مذاہب، علوم اور نظریات و خیالات کی آمیزش سے عجیب و غریب معجون مرکب بن چکا تھا۔

اسلامی نقطۂ نظر سے تمام علوم میں باہم تطبیق کی کوشش

یہ کارنامہ تمام تر امام غزالیؒ کی ذات سے منسوب ہے۔ امام غزالی وہ نابغۂ روزگار شخصیت تھے جنہوں نے تصوف، فقہ، فلسفہ اور علم الکلام کے آپس میں Common grounds تلاش کئے اور انہیں ایک متفقہ اور معیاری ڈھانچے میں فٹ کر دیا۔ یوں اشاعرہ کے کلام اور تصوف کے اکثر تصورات کو فقہ کا پابند بنا کر داخلِ اسلام کر دیا گیا اور ان سے باہر کی چیز غیر مصدقہ، غیر معیاری اور غیر اسلامی کہہ کر رد کر دی گئی۔ یہ کوشش جہاں ایک طرف نہایت قابلِ قدر تھی وہاں دوسری طرف اس کا منفی نتیجہ یہ نکلا کہ فکرِ اسلامی میں مختلف پہلوؤں سے جو ترقی ہو رہی تھی وہ رک گئی۔ فلسفے کے سوا باقی تمام شعبہ ہائے فکر جمود کا ایسا شکار ہوئے کہ اب تک اپنے آپ کو آزاد نہ کر سکے۔ خصوصیت سے فقہ میں کورانہ تقلید نے ایسی راہ پائی کہ بعد کے ادوار میں بڑے سے بڑا مجتہد اور فقیہ بھی اس فکری آزادی کا مظاہرہ نہ کر سکا جو اسلام کے پہلے تین سو سالوں کا طرۂ امتیاز تھی۔ مدرسوں میں درسِ نظامی کا نصاب رائج ہوا جو معمولی رد و بدل کے ساتھ آج تک چلا آتا ہے۔

امام غزالی کی کوششیں توفیقِ الٰہی سے ثمر آور ہوئیں اور کثیر تعداد میں آپ کی تصنیفات نے لوگوں کے ذہنی خلجان کو دور کیا۔ تمام مروجہ علوم، نظریات و خیالات کی موجودگی میں نہ صرف اسلام کی اصلی صورت سامنے آئی، بلکہ ان کی درست اور قابلِ قبول حیثیتوں کی اسلام سے تطبیق ممکن ہوگئی۔ تاہم جاہل صوفیوں اور بد دماغ فلسفیوں نے اپنے طریقے بدلنے سے انکار کر دیا، اگرچہ ان کی بات سننے اور ماننے والے اب کم رہ گئے تھے۔

چھٹی صدی ہجری میں ابنِ عربی کے اسپین میں ظہور کو اسی تناظر میں دیکھنا چاہئے۔ ابنِ عربی بیک وقت حکیم، صوفی اور متکلم کی حیثیت سے پہچانے جاتے تھے۔ انہوں نے وحدۃ الوجود کے نظریئے کا پرچار کیا اور کہا کہ ''وجود ایک ہے اور بس صرف یہی موجود ہے۔ باقی کائنات اسی وجودِ مطلق کی تجلی ہے۔'' ان کا یہ نظریہ وارداتِ قلبی اور روحانی تجربات کی بناء پر تھا۔ اپنے نظریات کی اشاعت کے لئے انہوں نے لگ بھگ چار سو کے قریب کتابیں لکھیں جن میں سب سے زیادہ شہرت ''فتوحاتِ مکیہ'' اور ''فصوص الحکم'' کو حاصل ہوئی۔ ان

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں انہوں نے بظاہر قرآن اور احادیث سے بھرپور استفادہ کیا ہے مگر درحقیقت قرآنی آیات کی تفسیر کم اور تاویلات زیادہ ہیں۔ اگرچہ ان کی کتب میں ایسے دقیق مسائل، مشکل نکات اور فکری پیچیدگیاں ہیں کہ عام آدمی کا انہیں سمجھنا اور ان سے کچھ اخذ کرنا آسان نہیں ہے۔ اس کے باوجود انہیں تصوف میں جو مقام حاصل ہے وہ محتاجِ بیان نہیں۔ علمائے ظاہر نے انہیں بری طرح رد کردیا اور بات یہاں تک پہنچی کہ ابنِ عربی کو مسلمان بھی سمجھا جائے یا نہیں۔

مشائخ اور معتقدین کا ایک بہت بڑا گروہ ابن عربی کو عارف اور شیخِ اکبر کی حیثیت دینے لگا تھا۔ یہ وقت عالمِ اسلام کے لئے سخت آزمائش کا تھا۔ تاتاری حملوں نے شہر کے شہر تہہ تیغ کرڈالے تھے اور مسلمان نظریاتی بحثوں اور لایعنی مسائل میں الجھے ہوئے تھے۔ امام غزالی جو تجدیدی کارنامہ انجام دے گئے تھے اسکو زیادہ وقت نہیں گذرا تھا کہ ایک بار پھر صوفیوں اور فلسفیوں نے ہاتھ پاؤں مارنا شروع کئے۔ ایسے میں امام ابن تیمیہ نے ابن عربی کے مسلک کی پرزور مخالفت کی اور کہا کہ ان کے کلام کی کتاب وسنت سے تطبیق کی کوئی صورت نہیں ہے۔

ابن تیمیہؒ ایسے عالی ہمت، بلند حوصلہ، صاحبِ عزیمت، جوامع العلم اور صاحب سیف وقلم تھے جو حق کے اظہار میں کسی صورت نہ جھجکتے تھے۔ اس پرخطر زمانے میں جب عالمِ اسلام شدید داخلی اور خارجی خطرات کی زد میں تھا اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ بدعات وخرافات، فلسفہ وعلم الکلام، تصوف اور معرفت کے جھوٹے سلسلے سب کچھ بہا کر لے جائیں گے، ابنِ تیمیہؒ تن تنہا اس کے آگے بند باندھنے کھڑے ہوگئے۔

ایک فرد کی حیثیت سے ان کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ مگر اسلامی دنیا سیاسی وفکری طور پر عالمِ نزع میں تھی اور صدیوں کی بے اعتدالیوں کی وجہ سے جو تنزل آچکا تھا وہ کسی فردِ واحد کی کوششوں سے رکنے والا نہ تھا۔

پہلی سات صدیوں میں مسلمانوں کی علمی وسائنسی ترقی کا سرسری جائزہ

قبل از اسلام عرب میں شاعری، علم الانساب، نجوم اور تاریخ کے علوم کا چرچا تھا۔ اسلام کی آمد کے ساتھ ہی ہر طرح کے علوم کے حصول کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ مختلف علوم پر بہترین کتب کے تراجم عربی زبان میں کئے گئے۔ خود حضرت امیر معاویہؓ نے اس کی سرپرستی کی۔ دورِ بنوامیہ میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ لیکن مختلف علوم کی سرپرستی اور ان میں تحقیق وترقی کا اصل سہرا عباسی خلفاء کے سرجاتا ہے۔ خلافتِ عباسیہ کے آغاز میں ہی المنصور نے جب اپنے نئے دارالخلافے بغداد کی بنیاد ڈالی تو مختلف علاقوں کے علماء وفضلاء جمع کئے اور مختلف مذہبی، ادبی اور سائنسی کتب کے دھڑا دھڑ تراجم ہونے لگے۔ ان ترجموں کے شائع ہوتے ہی لوگوں نے انہیں ہاتھوں ہاتھ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لیا۔خلیفہ ہارون الرشید نے بیت الحکمت کی بنیاد رکھی، تاکہ نادر و قدیم کتب محفوظ رہیں اور ان سے استفادہ کیا جا سکے۔ بعد میں مامون نے اس کو بہت ترقی دی اور اس کے ساتھ ہی ایک رصدگاہ اور دارالترجمہ بھی قائم کیا۔ بعد میں یہ علوم وفنون کی ترقی کے لحاظ سے اہم ادارہ ثابت ہوا۔

حکمرانوں کے شوق اور سرپرستی کے ساتھ ساتھ عوام بھی علوم وفنون کے حصول اور اشاعت میں دلچسپی لینے لگے۔تاریخ اور عمرانیات میں الطبری نے اتنی ضخیم کتاب لکھی جس کا صرف خلاصہ ہم تک پہنچا جو بذاتِ خود ڈھائی ہزار صفحات پر مشتمل ہے (جو اصل کتاب کا دسواں حصہ ہے)۔ایک اور مورخ المسعودی نے ایشیاء کے تقریباً تمام ملکوں کی سیر کی اور تاریخِ عالم پر اپنی معرکۃ الآراء تصنیف جو تیں جلدوں پر مشتمل ہے تحریر کی۔ابن بطوطہ گو خود مورخ تو نہ تھا، مگر اس کا سفرنامہ تاریخ پر تحقیق کرنے والوں کے لئے انتہائی مفید ہے۔سیرت وسوانح پر بھی بے شمار کتب لکھی گئیں۔ان میں ابنِ عساکر کی دس جلدوں پر مشتمل دمشق کی ممتاز شخصیتوں کی سیرت اور ابنِ خلکان کی مشہور مسلم شخصیتوں کی سیرت بہت مشہور ہے۔عمرانی علوم کے بانی ابنِ خلدون کو بیک وقت سیاسیات، تاریخ فلسفہ اور عمرانیات کے علاوہ معاشیات پر بھی عبور حاصل تھا۔تاریخ کی اہمیت اور وسعت اور عروج وزوال کے قوانین کی دریافت وترتیب کا سہرا اسی کے سر ہے۔

جغرافیائی علوم میں مامون کے ایماء پر اس وقت کے فاضل ترین شخص الخوارزمی نے اپنے رفقاء کے ساتھ مل کر دنیا اور اجرامِ فلکی کا ایک نقشہ تیار کیا۔انہوں نے زمین کے طول کی جو پیائش کی وہ بعد میں تقریباً درست ثابت ہوئی۔یاد رہے کہ یہ سرگرمیاں اس وقت جاری تھیں جب سارا یورپ زمین کے چپٹا ہونے کا قائل تھا۔ اس کے علاوہ الاصطخری نے جغرافیہ دانی اور نقشہ نویسی میں، البیرونی نے کتاب الہند لکھ کر اور الادریسی اور قطب الدین نے نقشوں کے حوالے سے شہرت پائی۔لیکن تمام عرب جغرافیہ نویسوں میں یاقوت کا کام سب سے نمایاں ہے جس نے تیرہویں صدی عیسوی کے اوائل میں جغرافیے کی ایک معرکۃ الآراء قاموس مرتب کی جو چھ جلدوں پر مشتمل تھی۔

علمِ فلکیات میں الفزاری نے جو پہلا مسلمان فلکیات دان تھا خلیفہ المنصور کے حکم سے ہندوستانی زیچوں پر مشتمل رسالوں کا ترجمہ کیا۔ بعد میں مامون کی رصدگاہ میں ہیئت دانوں کی جماعت نے الخوارزمی کی قیادت میں ان پر تحقیق کی اور قابلِ قدر اضافے کئے۔ مامون کی اس رصدگاہ کے علاوہ بغداد میں تین اور رصدگاہیں تھیں۔اس کے علاوہ مصر، رے، شیراز، نیشاپور، سمرقند، جندی شاہ پور اور اشبیلیہ میں بھی رصدگاہیں کام کر رہی تھیں۔اس عہد کے مشہور ہیئت دان سوز بن علی، یحییٰ بن ابی منصور اور خالد بن عبدالملک تھے، جنہوں نے گرہنوں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور اجرامِ فلکی کے متعلق مشاہدات کر کے علمِ فلکیات کو بہت فروغ بخشا۔ خلیفہ ہارون رشید کے انجینئر موسیٰ ابن شاکر کا بیٹا ماہرِ علمِ ہیئت تھا۔ اس نے سورج اور دیگر سیاروں کی گردش کے متعلق عجیب وغریب دریافتیں کیں۔ ابوالحسن نے دوربین ایجاد کی۔ اس کے علاوہ بغداد کے دو زبردست ہیئت دانوں علی بن اماجر اور ابوالحسن علی بن اماجر نے چاند کی گردش کا خاص طور سے مطالعہ کیا۔ البیرونی نے زمین کی محوری گردش کے نظریئے پر بحث کی اور طول البلد اور عرض البلد کا صحیح تعین کیا۔

خوارزمی کو جہاں پہلا مسلمان ہیئت دان ہونے کا شرف حاصل ہے وہیں وہ پہلا عظیم مسلمان ریاضی دان بھی تھا۔ اس نے ہندی مآخذوں سے صفر اور اعداد کا علم حاصل کیا اور علم الحساب اور الجبرا پر رسالے لکھے۔ خوارزمی کے بعد احمد النہاوندی نے کسور کی تقسیم اور جذر المربع دریافت کرنے کے طریقوں کی وضاحت جدید انداز میں کی۔ الجبراء اور تحلیلی علم ہندسہ کی طرح مثلث کے علوم کی بنیاد بھی عربوں نے رکھی۔ اس سلسلے میں البتانی، ابوالوصاء، البغدادی، الخوجندی، ابن شاطر، عمر خیام اور ہسپانیہ میں جابر نے اس پر اتنا کام کیا کہ اس علم ''الجبراء'' کو عربی کے لفظ ''جبر'' کے حوالے سے آج تک موسوم کیا جاتا ہے۔

کیمیاء میں سب سے عظیم مسلم محقق الرازی تھا، جس کی تحقیقات سے سب مستفید ہوتے رہے، یہاں تک کہ جابر بن حیان کا دور شروع ہوا جس نے سائنٹیفک طریقے سے دھاتوں، مختلف کیمیائی مرکبات اور محلولوں پر تجربے کئے۔ اس کی تصنیفات اٹھارویں صدی عیسوی تک مقبول رہیں۔ التفاشی اور البیرونی نے جواہرات کی اصل، ان کی ماہیت اور نوعیت پر رسالے تحریر کئے۔ عربوں نے الکحل، گندھک کا تیزاب، شورے کا تیزاب اور ماد الملوک (ان دونوں کا مرکب) ایجاد کئے۔ عرب ان مرکبات کے بھی موجد ہیں جو صنعت وحرفت میں استعمال کئے جاتے ہیں اور رنگوں کی ترکیب، فولاد کے بنانے اور چمڑے کی دباغت میں انہیں بہت جلد کمال حاصل ہو گیا۔

طبیعات کے میدان میں الکندی نے بصریات کے متعلق زبردست تصنیفات کیں۔ لیکن ابن الہیثم کی تحقیقات کے آگے وہ بالکل ماند پڑ گئیں۔ ابن الہیثم بیک وقت ماہرِ طبیعات، ریاضی دان اور فلسفی تھا۔ اس نے کثافت کے نظریئے پر حیرت انگیز دریافتیں کیں۔ ابن سینا نے معدنیات پر رسالہ لکھا۔ اس کے علاوہ پن گھڑی، پن پہیہ، ہوا چکی اور شیشے کے آئینے کے استعمال سے مسلمانوں نے دنیا کو متعارف کروایا۔ گھڑیوں میں پنڈولم کا استعمال عربوں نے ایجاد کیا۔

زولوجی (حیاتیات) اور بوٹنی (نباتیات) میں اس دور کے اضافے نظر انداز نہیں کئے جا سکتے۔ نباتیاتی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

باغات، پودوں کے جنسی اختلاط کے مشاہدے اور تفصیل، خودرو پودوں اور بیجوں سے لگائے گئے پودوں میں فرق اور ان پر تحقیق، پودوں کی نئی اقسام، نیز جڑی بوٹیوں کی تلاش پر بہت محنت کی گئی اور تحقیق کے نتائج پر رسالے لکھے گئے۔ ابوزکریا کی زراعت پر کتاب ''الفلاقہ'' نے شہرت پائی۔ حیوانیات میں الجاحظ کی ''کتاب الحیوان'' اور الدمیری مصری کی کتاب ''حیاۃ الحیوان'' قابلِ ذکر ہیں۔

طب ہر زمانے میں انسانوں کی ضرورت رہی ہے اور مسلمانوں نے بھی اس پر خوب توجہ کی۔ ہارون الرشید نے سب سے پہلا طبی مدرسہ بغداد میں قائم کیا اور اس کے ساتھ ہی سینکڑوں طبی کتابوں کے تراجم، تالیف اور تصنیف کا کام شروع ہوگیا۔ مگر مسلم طب کے شاندار دور کا آغاز فلسفی اور طبیب الرازی سے ہوتا ہے۔ اس نے دو سو سے زائد کتابیں لکھیں۔ اس کی معرکۃ الآراء کتاب ''المنصوری'' دس جلدوں پر مشتمل ہے۔ اسی طرح اس نے اپنی تصنیف ''الحاوی'' کی بیس جلدوں میں یونان اور ایران کے علومِ طب کو مربوط انداز میں پیش کیا۔ علی بن عباس نے ''کتاب المالکی'' اور ابن بطیار دمشقی نے ''الادویہ المفردہ'' کے نام سے ادویات کے علم پر کتابیں لکھیں۔ ابن زھر نے ہڈیوں اور ابن الخطیب نے متعدی بیماری کے جراثیم پر تحقیق کی۔

طب میں سب سے زیادہ شہرت بوعلی سینا کو ملی۔ اس کو ملک الاطباء کہا جاتا ہے۔ اس کی اہم ترین کتاب ''القانون فی الطب'' ہے جو اور موضوعات کے علاوہ حفظانِ صحت اور طب پر مشتمل ہے۔ اس کی کتابوں کو ایسی شہرت ہوئی کہ وہ اٹھارویں صدی عیسوی تک یورپ میں پڑھائی جاتی رہیں۔

جراحی میں سب سے بڑا نام قرطبہ کے شیخ ابوالقاسم بن عباس اندلسی کا ہے۔ اس نے بہت سے آلاتِ جراحی ایجاد کئے۔ زندہ جانوروں کے آپریشن کی تفاصیل بھی اپنی کتب میں لکھیں اور مثانے کی پتھری کو ریزہ ریزہ کرنے سے متعلق تحقیقات بھی پیش کیں۔ خون کو ٹھنڈے پانی سے بند کرنے، جراحی میں ٹانکوں سے زخم بند کرنے اور زخم کو آگ سے جلانے کے فن سے مسلمان طبیب اچھی طرح واقف تھے۔ دورانِ جراحی خواب آوری کے لئے افیون اور قطروں کا استعمال کیا جاتا تھا۔ چاندی کی نلکیوں کے ذریعے غذا پہنچانے کا طریقہ کار بھی مستعمل تھا۔ کیمیاء کے علوم سے واقف ہونے کی بناء پر مرکبات، روغنیات اور عرقیات کا استعمال عام تھا۔

ان سب سائنسی علوم پر دسترس کے علاوہ سائنسی طریقہ کار اور ریسرچ کے اصول خود مسلمانوں کے وضع کردہ ہیں۔ پروفیسر میاں شریف اپنی کتاب ''مسلمانوں کے افکار'' میں یورپی مصنف بریفالٹ کی گواہی نقل کرتے ہیں:

''جس چیز کو ہم سائنس کہتے ہیں وہ یورپ میں تفتیش کی نئی روح، تحقیق، تجربہ، مشاہدہ اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مساحت کے نئے طریق اور ریاضی کے ایسے فروغ کے نتیجے کے طور پر وجود پذیر ہوئی ہے جس سے اہلِ یونان قطعاً بے بہرہ تھے اور یورپ کی دنیا میں اس روح کو پھونکنے والے اور اس طریق کو پھیلانے والے عرب ہی تھے''۔

جہاں ایک طرف سائنسی علوم کا بول بالا تھا، وہیں دوسری طرف فلسفے میں مسلمان فلسفی یونانی فلسفیوں سے کسی طور پیچھے نظر نہیں آتے۔ اس بات سے قطع نظر کہ فلسفے نے مسلمانوں کے دین پر کیا اثرات مرتب کئے، بحیثیت علم اس کا ایسا چرچا ہوا کہ الکندی، فارابی، ابن سکویہ، ابن سینا، ابن الہیثم، امام غزالی، ابن باجہ، ابن طفیل اور ابن رشد جیسے مسلمان فلسفی ازمنہ وسطیٰ کی تاریخِ فلسفہ پر چھائے رہے۔

فنونِ لطیفہ میں فنِ تعمیر، سنگ تراشی، مصوری، خطاطی کو مسلمانوں نے نئی جہتوں سے آگاہ کیا۔ سائنسی اور عقلی علوم کے علاوہ علم القواعد، ادب اور لٹریچر، خطابت، شاعری، روایات، سیاحت، معاشیات پر بہت کچھ لکھا گیا۔

کاغذ کی صنعت کو بے تحاشہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ کوئی اسلامی حکومت ایسی نہ تھی جہاں کتب خانے اور دار العلوم نہ ہوں۔ مدرسے، مساجد، خانقاہیں اور ان میں موجود اہلِ فن اور اہلِ کمال ملک کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے تھے۔

کوفہ، بغداد، دمشق، بصرہ، موصل، قرطبہ، اشبیلیہ اور غرناطہ کے گھروں، مکتبوں، مدرسوں، اکیڈمیوں اور جامعات میں علوم کی تحصیل کا ایسا چرچا تھا کہ معمولی کسانوں، مزدوروں، فوجیوں سے لے کر اعلیٰ حکام، وزراء، امراء اور خود بادشاہِ وقت حصولِ علم کے یکساں خوگر تھے۔ مامون کا قائم کردہ کالج، نظام الملک طوسی کا مدرسہ نظامیہ اور مستنصریہ، صلاح الدین ایوبی کا الناصریہ اور قاہرہ کی جامع الازھر کا جو مقام ہے اس کو کوئی فراموش نہیں کرسکتا۔ مسلم اسپین کے ایک شہر قرطبہ میں کئی سو مدرسے تھے۔ ادبی انجمنیں، علمی حلقے، مذاکرے، مناظرے اور سیمینارز کا رواج عام تھا۔ محمود بریلوی صاحب اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''عربوں نے آٹھویں صدی عیسوی سے لے کر تیرہویں صدی عیسوی تک دنیا کے لئے جو سرمایۂ علوم وفنون فراہم کیا، اس کے احسانِ عظیم سے تہذیب وثقافتِ انسانی کبھی سر نہیں اٹھا سکتی۔ اس دوران میں عربوں نے جس قدر لٹریچر مہیا کر دیا، فہم وفراست کے جو انبار لگائے اور جو نایاب اور انمول ایجادات کیں وہ سب ان کی غیر معمولی ذہانت وفراست پر دلالت کرتی ہیں اور اس رائے کو درست ثابت کرتی ہیں کہ عرب یورپ کے ہر حیثیت سے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

استاد تھے۔ ایک طرف تو انہوں نے یورپ کو ازمنہ وسطیٰ کی تاریخ کے لئے اپنی طویل و پرصعوبت سیاحتوں اور اپنے سفرناموں کے ذریعے سے بیش قیمت مواد بخشا اور دوسری طرف ایسی صنعت وحرفت سے دنیا کو روشناس کیا جس کی نظیر نہ تھی''۔

زمانہ قریب میں تجدید واصلاح کی تحریکوں کا مختصر تذکرہ

فقہ کے مکاتبِ فکر تیسری صدی ہجری تک معرضِ وجود میں آنے کے بعد اپنے ارتقاء کی منازل طے کرتے رہے اور پانچویں صدی ہجری میں مقبول مکاتبِ فکر نے دیگر مسالک اوزاعی، ظاہری، داؤدی وغیرہ کو اپنے اندر ضم کرلیا تھا۔ فلسفے اور علم الکلام کا زور بھی پہلی چھ سات صدیوں تک رہا۔ سوائے تصوف کے دیگر عقلی علوم اور مختلف فنون کا بھی یہی حال ہوا۔ عباسیوں کے بعد سلجوقیوں اور دیگر خود مختار ریاستوں میں علم کا ذوق وشوق برقرار رہا مگر جب ان کی قوت پارہ پارہ ہوگئی اور ترکستان اور ہندوستان اسلام کے نئے مراکز کی حیثیت سے ابھرے تو ایک جمود سا طاری ہوگیا۔ حکمرانوں نے دین کی ترویج میں دلچسپی لی مگر تصوف کے زور نے علمی چہل پہل اور رونق کو ایسی نظر لگائی کہ خود اہلِ علم حضرات بھی تحقیق وتنقید کے بجائے تقلیدِ محض پر راضی ہوگئے۔ سارا زور اپنے فقہی مسلک کی برتری ثابت کرنے پر صرف ہونے لگا۔ امام غزالیؒ کے زمانے کے مقرر کردہ درسِ نظامی کی پابندی کو گویا مذہبی فریضہ سمجھا جانے لگا۔

یہ دورِ انحطاط کا آغاز تھا۔ اس میں علمی، عملی اور فکری سب سوتے خشک ہوگئے۔ تصوف نے ترقیٔ معکوس کی اور عوام و خواص کے لئے بے عملی اور تن بہ تقدیری کی افیون بن گیا۔ خانقاہی نظام Institutionalise کردیا گیا۔

سانحہ سقوطِ بغداد کے وقت جہاں عالمِ اسلام کا مردِ پیر (عراق، شام، مصر) آخری سانس لے رہا تھا، وہیں ایک طرف سرزمینِ ہندوستان اور دوسری طرف عثمانی ترکوں کی شکل میں جہانِ نوجنم لے رہا تھا:

کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد
مری نگاہ نہیں سوئے کوفہ وبغداد

حقیقت یہ ہے کہ قدرت اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے نہ علاقوں اور نہ ہی افراد کی محتاج ہے۔ چنانچہ صدیوں سے علم وعمل کے لحاظ سے مردم خیز خطے قحط الرجال کا شکار ہوگئے اور عالمِ اسلام کی قیادت کا علَم ہندوستان کے ہاتھوں میں تھما دیا گیا جو مستقبل میں احیاء وتجدید کی تحریکوں کا منبع بننے والا تھا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جہاں میں اہلِ ایمان صورتِ خورشید جیتے ہیں
ادھر ڈوبے ادھر نکلے ادھر ڈوبے ادھر نکلے

تاریخی حقیقت یہ ہے کہ محمود غزنوی اور اس کے بعد شہاب الدین غوری کے ہاتھوں ہندوستان فقط مادی طور پر فتح ہوا تھا۔ قلوب کی تسخیر کا اصل کام اولیاء اور صوفیاء کرام نے بتوفیقِ الٰہی انجام دیا اور اس کا آغاز خواجہ معین الدین چشتی کی ہندوستان آمد سے ہوا۔ وہ ایک غیبی اشارے کی بناء پر ہندوستان تشریف لائے اور اجمیر شریف میں قیام کیا۔ تبلیغِ اسلام کے کام کا آغاز جس دلسوزی اور شوق سے کیا تھا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سومنات کے مندروں اور پرتھوی راج کی سرزمین میں توحید کی صدائیں گونجنے لگیں۔ نصف صدی کی اس جہدِ مسلسل کے بعد وہ اپنے خلفاء خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کو دہلی میں جبکہ خواجہ فرید الدین گنج شکر کو ملتان میں اپنا کام سپرد کر کے سفرِ آخرت پر روانہ ہوئے۔

مندرجہ بالا اصحاب کی مساعی میں ہاتھ بٹانے کے لئے وہ بہت سے لوگ میسر آ گئے جو تاتاریوں کی لائی ہوئی تباہی اور بے سکونی کی وجہ سے ہندوستان کے دارالاسلام کی طرف ہجرت کر آئے تھے۔ اس طرح دہلی کو بہت جلد وہ مقام حاصل ہو گیا جو بغداد اور قرطبہ کو حاصل تھا۔

گو رفتہ رفتہ ہندوستان میں اہلِ علم حضرات کی کمی نہ رہی مگر صوفیاء ابتداء ہی سے مرجعِ خلائق تھے۔ بادشاہوں سمیت عوام و خواص سب ان کے عقیدت مند ہوتے تھے۔ یہاں تک کہ ہندو، بدھ مت اور دیگر مذاہب کے لوگ بھی ان کی کشادہ قلبی اور محبت، رواداری اور انسانی ہمدردی سے متاثر ہو کر ان کو اپنا روحانی پیشوا تسلیم کرتے تھے۔ اس صورت سے جہاں اسلام کی تبلیغ ممکن ہو سکی وہیں ہندوؤں سے مسلسل رابطے کی وجہ سے ان کے سماج کی بہت سی برائیاں بدعات کے طوفان کے ساتھ عود آئیں۔ نظریہ ہمہ اوست اور حلول کو بہت جلد اسلامی نظریہ وحدۃ الوجود کے سائے میں پنپنے کی جگہ مل گئی۔

اس نظریئے کی دیگر خامیاں اپنی جگہ تھیں مگر سب سے بڑھ کر اس کا اثر یہ ہوا کہ اس نے مسلمانانِ ہند کو دینی و دنیوی دونوں لحاظ سے بے عمل اور نکما کر دیا۔ سینکڑوں کے حساب سے صوفیاء اپنے مریدوں کے ہمراہ خانقاہوں میں بیٹھے دلوں پر ضربیں لگاتے رہے۔ اسلام جو ایمان کے ساتھ اعمالِ صالحہ بھی طلب کرتا ہے ایک بار پھر سرزمینِ ہند میں کسی مجدد کے وجود کا منتظر تھا کہ حضرت مجدّد الف ثانی کی تحریک نے ذہنی، سماجی اور معاشرتی زندگی میں انقلاب کی نوید دی۔

شیخ مجدّد نے تصوف کو کلیتاً رد تو نہ کیا مگر جہاں ابنِ عربی کے نظریہ وحدۃ الوجود کو مسترد کر دیا وہیں طریقت

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کو ہر طور سے داخلِ شریعت کر دیا۔ ان کے نزدیک معمولی سی معمولی معاشرت میں بھی اتباعِ شریعت کی حرف بہ حرف پابندی لازمی تھی۔ اس طرح جہاں مغل بادشاہ اکبر کے ملحدانہ خیالات اور اس کے اثرات کا تدارک ہوا تو دوسری طرف بے عقل اور بے علم صوفیوں کا زور ٹوٹا۔ ان کی یہ تحریک (جو ان کے بعد بھی ان کے خلفاء نے جاری رکھی) ہندوستانی اسلامی فکر کے لئے ایک نیا سنگِ میل ثابت ہوئی۔

اس کامیاب کوشش کے باوجود مجموعی طور پر مسلمانوں پر جمود طاری تھا۔ دوسری طرف یورپ میں بیداری کی تازہ لہر نے ان کی کایا پلٹ دی۔ یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ یورپ میں نشاۃِ ثانیہ (Renaissance) کی تحریک اور اس کے نتیجے میں برپا ہونے والے صنعتی انقلاب کے پیچھے جہاں کلیسا کے مذہبی استبداد سے نجات کا جذبہ تھا وہیں اس کو فکری و علمی غذا اسپین کی مسلم یونیورسٹیوں سے فارغ التحصیل ہونے والے یورپی مفکرین نے فراہم کی تھی۔ محض تین سے چار صدیوں کے عرصے میں یورپ کی وحشی تہذیب نے مہذب دنیا کا عَلَم اپنا ہاتھ میں لے کر مادی، علمی، فکری، تہذیبی اور سماجی ہر سطح پر فتوحات کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ اس کا تکمیلی نقطہ دنیا کے دیگر ممالک کی طرح عالمِ اسلام پر ان کا مادی و فکری غلبہ تھا۔

اپنے تمام تر انحطاط اور زوال کے باوجود عالمِ اسلام کے اندر ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو ان حالات سے غیر مطمئن اور اس ہمہ جہتی جمود اور ہر شعبہ فکر میں تنزل سے بیزار تھا۔ اس کے ردِعمل کے طور پر اصلاحی اور تجدیدی تحریکیں اٹھتی رہیں۔ ان کو فکرِ اسلامی کے موجودہ اور آخری دور کی نقیب کہا جا سکتا ہے۔ اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو ان کوششوں کے علمبردار تین گروہوں میں بٹے نظر آتے ہیں۔

(۱) بنیاد پرست یا احیاء پسند (Revivalist) جو امت کو قرنِ اول کی بنیادی مذہبی تعلیمات کی طرف واپس لے جانا چاہتے ہیں اور ان کے خیال میں زوال کی واحد وجہ ملت کا اپنی بنیاد سے ہٹ جانا ہے۔ اس کے سب سے نمایاں علمبردار شیخ محمد بن عبدالوہاب تھے جن کی سلفی تحریک قرآن وحدیث کی حرف بہ حرف اتباع کو مسلمانوں کے تمام امراض کا واحد حل قرار دیتی ہے۔ انہوں نے بدعات کے رد اور ازالے کے ساتھ ساتھ تصوف کو بھی کلیتاً رد کر دیا۔ گو ان حضرات نے امام احمد بن حنبل اور امام ابن تیمیہ کے فقہی و فکری انداز کو اختیار کیا مگر وہ اجتہاد کا دروازہ کھولنے پر راضی نظر آتے ہیں۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ دورِ جدید کی اکثر تبدیلیوں کی طرف انہوں نے اس کشادہ فکری کا مظاہرہ نہ کیا جس کی وہ مستحق تھیں۔ شیخ محمد بن عبدالوہاب ؒ کی تحریک کو سیاسی غلبے کے ساتھ بہت مقبولیت حاصل ہوئی اور اس کے اثرات آج تک موجود ہیں۔

(۲) ایک دوسرا گروہ ان جدیدیت پسندوں کا ہے جو اسلام کو صرف دورِ جدید کی عینک لگا کر دیکھتے ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جو اسلامی اصول دورِ جدید کے نظریات سے متصادم نہ ہوں، انہیں صرف وہ ہی لائق توجہ اور اہم نظر آتے ہیں۔ یہ گروہ مسلمانوں کو بحیثیت قوم یورپ کے برابر لانا چاہتا ہے۔ اس ضمن میں سرسید احمد خان اور کسی حد تک جمال الدین افغانی کے شاگرد شیخ محمد عبدہ کا نام پیش کیا جاسکتا ہے۔

(۳) تیسرا گروہ ان اصلاح پسندوں کا ہے جو اصلاح احوال چاہتے ہیں۔ قرنِ اول کے طریقے کی پیروی کے ساتھ ساتھ وہ بدلتے ہوئے زمانے اور حالات میں اجتہادی قوت کا مظاہرہ کرنا چاہتے ہیں اور اس ضمن میں اسلامی اقدار کو عمرانی، آفاقی، تاریخی اور علاقائی تناظر میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس گروہ کی صف میں سب سے آگے شاہ ولی اللہ نظر آتے ہیں جن کی تحریک اصلاحی بھی تھی اور ترقی پسندانہ بھی۔ اس کا مرکزی نقطہ یہ تھا کہ اصلاح ہر شعبے میں درکار ہے۔ لیکن اس کی تشریح لازمی طور سے تمام اقوام عالم اور ادوار اور زمانوں کے معاشرتی پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے ہونی چاہئے۔ انیسویں صدی میں خود شاعر مشرق علامہ اقبال اس نظریئے کے حامل تھے۔ وہ سابقہ قرون کی کورانہ تقلید کے بجائے موجودہ زمانے کے حالات وضروریات کے لحاظ سے احکامِ شریعت کی تشریح چاہتے تھے۔

ان حضرات کے علاوہ علامہ سید جمال الدین افغانی جو پان اسلامک تحریک کے روح رواں تھے، مسلمانوں میں سیاسی بیداری اور احیائے اسلام کے شدید خواہش مند تھے۔ مصر کی بغاوت اور ایرانی انقلاب، دونوں میں ان کی تعلیمات کارفرما نظر آتی ہیں۔ مگر ان سب سے بڑھ کر حالیہ عرب اسلامی تحریکوں میں سب سے نمایاں حسن البنا کی ''اخوان المسلمون'' ہے۔ یہ ایک اعتدال پسند اور اصلاحی تحریک تھی جسے عالمِ عرب میں بے تحاشا مقبولیت حاصل ہوئی۔ مگر اس نے سیاست میں حکومت سے شدید محاذ آرائی کا رویہ اختیار کرکے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا اور بری طرح مار کھائی۔ تاہم آج بھی اس کے اثرات موجود ہیں۔

قیامِ پاکستان سے قبل متحدہ ہندوستان اور بعد میں خصوصی طور سے پاکستان میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی ''جماعتِ اسلامی'' کا کام شاندار ہے۔ یہ ایک ایسی تحریک ہے جو فرد کی انفرادی اصلاح کے ساتھ ساتھ نظامِ حکومت اور زندگی کے ہر شعبے میں متوازن انداز میں اسلام کا عمل دخل چاہتی ہے۔ جہاں پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ کے حوالے سے اکثر کوششوں کا سلسلہ اس جماعت سے ملتا ہے، وہاں افسوسناک حقیقت یہ ہے کہ روائتی انتخابی سیاست میں بھرپور شرکت اور توجہ سے اس تحریک کے دیگر شعبوں میں زوال کے آثار نمایاں ہیں اور قائدین سے لے کر اراکین تک کوئی اس حقیقت کو تسلیم کرنے اور اپنے ذہن کھولنے کے لئے آمادہ نظر نہیں آتا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ان تمام اصلاحی، احیائی اور تجدیدی تحریکوں کے ساتھ ساتھ مسلم عوام کی اکثریت اور ان کے علماء و مشائخ قدامت پرست اور روایت پسند مزاج کے حامل ہیں۔ یہ حضرات ماضی کی تمام غلط، صحیح روایات کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ اصلاح کی خواہش اور ذرا سی ترمیم بھی انہیں گوارا نہیں۔ یہ اپنے حال میں خوش اور مطمئن ہیں اور حالات، نظریات اور خیالات میں تبدیلی کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فہرست حوالہ جات

۱	صحیح بخاری	امام بخاری
۲	صحیح مسلم	امام مسلم
۳	جامع ترمذی	امام ترمذی
۴	سنن ابی داؤد	امام ابوداؤد
۵	سنن نسائی	امام نسائی
۶	سیرتِ عائشہؓ	سید سلیمان ندوی
۷	جنت کی خوشخبری پانے والی خواتین	احمد خلیل جمعہ
۸	مختصر تاریخ اسلام	ڈاکٹر محمد دین
۹	خواتین اور دین کی خدمت	سید ابوالحسن علی ندوی
۱۰	صدیق اکبرؓ	مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی
۱۱	خالدؓ بن ولید	امیر احمد
۱۲	اسلام کے نامور سپہ سالار	فیض عالم صدیقی
۱۳	اللہ کی تلوار	میجر جنرل ابراہیم آغا
۱۴	مسلمان فاتحین	احمد مصطفیٰ صدیقی راہی
۱۵	سیرتِ نعمان	علامہ شبلی نعمانی
۱۶	امام ابوحنیفہ، حیات فکر اور خدمات	محمد طاہر منصوری
۱۷	حیاتِ امام احمد بن حنبل	محمد ابوزہرہ۔ترجمہ رئیس احمد جعفری
۱۸	امام شافعی	محمد ابوزہرہ۔ترجمہ رئیس احمد جعفری
۱۹	حیاتِ مالک	سید سلیمان ندوی
۲۰	سیرتِ ائمہ اربعہ	رئیس احمد جعفری

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۲۱	تذکرہ ائمہ اربعہ	اسلام الحق مظہری
۲۲	آوازِ دوست	مختار مسعود
۲۳	اعلائے کلمۃ الحق کی روایت اسلام میں	میاں محمد افضل
۲۴	دعوت وعزیمت کے روشن ستارے	آباد شاہ پوری
۲۵	حضرت عمر بن عبدالعزیز	محمد ابوحنیفہ کشفی
۲۶	سیرتِ عمر بن عبدالعزیز	عبدالسلام ندوی
۲۷	سیرت عمر بن عبدالعزیز	ابن عبدالحکم
۲۸	عمر بن عبدالعزیز	رشید اختر ندوی
۲۹	حضرت عمر بن عبدالعزیز	فیروز سنز
۳۰	تاریخِ اسلام	ڈاکٹر حمیدالدین
۳۱	تاریخِ اسلام	امتیاز پراچہ
۳۲	تاریخِ اسلام	معین الدین ندوی
۳۳	تاریخِ اسلام	ڈاکٹر عبدالروف
۳۴	تاریخِ عالمِ اسلام	محمد عبداللطیف انصاری
۳۵	سیرۃ البخاری	مولانا عبدالسلام مبارکپوری
۳۶	امام بخاری کا کارنامہ	دعوۃ اکیڈمی
۳۷	ہدایت الحدیث	عبدالقیوم ناطق
۳۸	حدیث کی چھ مستند کتابیں	خواجہ عبدالحی فاروقی
۳۹	علم الحدیث	اشفاق الرحمٰن صدیقی
۴۰	حدیث وفقہ	نزہت رئیس
۴۱	بہارِ حدیث	ڈاکٹر جمیل احمد
۴۲	تدوینِ حدیث	مولانا مناظر احسن گیلانی
۴۳	فاتح فلسطین صلاح الدین ایوبی	وحید قیصر
۴۴	حیاتِ صلاح الدین ایوبی	سراج الدین احمد

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۴۵	سلطان صلاح الدین ایوبی	راجہ طارق محمود
۴۶	صلاح الدین ایوبی	سید ذاکر اعجاز
۴۷	تاریخ دعوت وعزیمت حصہ دوم	سید ابوالحسن علی ندوی
۴۸	امام ابن تیمیہ	سلمان شاہ جہان پوری
۴۹	امام ابن تیمیہ	غلام جیلانی برق
۵۰	سقوطِ بغداد سے سقوطِ ڈھاکہ تک	میاں محمد افضل
۵۱	مسلمان فاتحین	احمد مصطفیٰ صدیقی
۵۲	سلطان محمد فاتح	عصمت اللہ خان
۵۳	عثمانی ترکوں کی مختصر تاریخ	عبدالصبور طارق
۵۴ ✓	دس فاتح	سعدی سنگروری
۵۵	تاریخ دعوت وعزیمت حصہ چہارم	سید ابوالحسن علی ندوی
۵۶	تذکرہ مجدد الف ثانی	محمد منظور نعمانی
۵۷	ارشاداتِ مجدد الف ثانی	انتخاب محمود اشرف عثمانی
۵۸	مجدِّ دِ اعظم	حاجی محمد عظیم
۵۹	مجدِّ دالف ثانی	سید زوّار حسین شاہ
۶۰	تاریخ دعوت وعزیمت حصہ پنجم	ابوالحسن علی ندوی
۶۱	شاہ ولی اللہ (بزبان انگریزی)	جلبانی
۶۲	تفہیم اقبال	پروفیسر فروغ احمد
۶۳	اقبالیات	پروفیسر مرزا محمد منور
۶۴	افکارِ اقبال	محمد حامد
۶۵	نقوشِ اقبال	ابوالحسن علی ندوی
۶۶	زندہ رود حصہ اول	جاوید اقبال
۶۷	زندہ رود حصہ دوم	جاوید اقبال
۶۸	زندہ رود حصہ سوم	جاوید اقبال

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۶۹	اقبال:فکر اسلامی کی تشکیل جدید	سید حسن محمد جعفری
۷۰	ایقانِ اقبال	پروفیسر مرزا محمد منور
۷۱	اقبال مجددِ عصر	ڈاکٹر سہیل بخاری
۷۲	بانگِ درا	علامہ محمد اقبال
۷۳	ضربِ کلیم	علامہ محمد اقبال
۷۴	بالِ جبریل	علامہ محمد اقبال
۷۵	روزگارِ فقیر	فقیر وحید الدین
۷۶	المودودی	نعیم صدیقی
۷۷	سید مودودی: دعوت و تحریک	سید اسعد گیلانی
۷۸	ترجمان القرآن مودودی نمبر ۱	ادارہ ترجمان القرآن
۸۹	ترجمان القرآن مودودی نمبر ۲	ادارہ ترجمان القرآن
۸۰	مولانا مودودی کے انٹرویو	
۸۱	سید ابوالاعلیٰ مودودی	چوہدری عبدالرحمٰن عبد
۸۲	حسن البنا شہید کی ڈائری	ترجمہ خلیل احمد
۸۳	حسن البنّا کی یادداشتیں	ترجمہ سید معروف شاہ شیرازی
۸۴	نقد و نظر (حمید اللہ نمبر)	ادارہ تحقیقات اسلامی
۸۵	خطباتِ بہاولپور	محمد حمید اللہ
۸۶	دنیائے اسلام کا تابندہ ستارہ ڈاکٹر حمید اللہ	سید قاسم محمود
۸۷	تاریخِ دعوت و عزیمت حصہ اول	سید ابوالحسن علی ندوی
۸۸	الغزالی	شبلی نعمانی
۸۹	مسلم فلسفہ	ڈاکٹر عبدالخالق
۹۰	محمد بن عبدالوہاب	شیخ احمد عبدالغفور عطّار
۹۱	محمد بن عبدالوہاب - ایک مظلوم اور بدنام مصلح	مسعود عالم ندوی
۹۲	انسائیکلوپیڈیا تاریخ عالم - جلد اول	ولیم - ایل - لنگر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۹۳	جینٹل مین اللہ اللہ	اشفاق حسین
۹۴	اشرف السوانح	خواجہ عزیز الحسن مجذوب
۹۵	حکیم الامت کے حیرت انگیز واقعات	اسحاق ملتانی
۹۶	بہشتی زیور	اشرف علی تھانوی
۹۷	سوانح قاسمی	مناظر احسن گیلانی
۹۸	مرأۃ العروس	ڈپٹی نذیر احمد
۹۹	مسدسِ حالی	الطاف حسین حالی
۱۰۰	امداد المشتاق الی اشرف الاخلاق	اشرف علی تھانوی
۱۰۱	اطلس القرآن	دکتور شوقی ابو خلیل
۱۰۲	اٹلس سیرتِ نبوی	دکتور شوقی ابو خلیل
۱۰۳	مسلمانوں کے افکار	پروفیسر میاں محمد شریف
۱۰۴	تاریخ ہسپانیہ	ڈاکٹر نصیر احمد ناصر
۱۰۵	فلسفے کے بنیادی مسائل	قاضی قیصر الاسلام
۱۰۶	فیضانِ اسلام	محمود بریلوی
۱۰۷	روحِ اسلام	سید امیر علی
۱۰۸	تاریخ دعوت وعزیمت حصہ سوم	ابو الحسن علی ندوی
۱۰۹	ملتِ اسلامیہ کی مختصر تاریخ حصہ اول، دوم	ثروت صولت

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

تذکرہ اور سوانح ۔۔۔ باب [illegible] اسلامی ادبیات کا ذخیرہ اتنا متنوع [illegible] اس کی مثال دوسرے مذاہب اور تہذیبوں میں مشکل سے ملے گی۔ مسلمان ادیبوں اور مورخوں نے ہمیشہ تذکرہ نویسی اور سوانح نگاری کے قرآنی تصور کو پیش نظر رکھا جو سابقہ اقوام اور مشہور شخصیتوں کے حالات بیان کرنے میں درس اور عبرت کے پہلو کو سامنے رکھتا ہے۔ اردو زبان کا دامن بھی سینکڑوں بلکہ شاید ہزاروں دلچسپ تذکروں اور سوانحی خاکوں سے پر ہے۔ نائمہ صہیب کا یہ مجموعہ بھی اس سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ سے لے کر ڈاکٹر حمید اللہ تک ہر صدی کی منتخب اور نمائندہ شخصیات کا ایک مرقع اس کتاب میں نظر آتا ہے۔ یوں نہ صرف اسلامی تاریخ کا ایک نہایت روشن [illegible] اور تہذیبی پہلو سامنے آجاتا ہے بلکہ ان سب شخصیتوں کو تاریخ کے تسلسل میں دیکھنے کا بھی موقع ملتا ہے۔ مصنفہ کی [illegible] اسلامی تاریخ پر گہری ہے۔ [illegible] اسلام کے تہذیبی مقاصد واہداف کا گہرا ادراک حاصل ہے۔ ان کے قلم میں روانی اور انداز بیان میں سلاست ہے۔ کاش [illegible] ان کی آخری کتاب [illegible]

ڈاکٹر محمود احمد غازی

صدر، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

سابق وفاقی وزیر برائے مذہبی امور

محترمہ نائمہ صہیب صاحبہ نے اپنی تالیف "تاریخ اسلام کی عظیم شخصیات" کے لیے جن عظیم ہستیوں کا انتخاب کیا ہے اس میں شک نہیں کہ ان کے حالات و کوائف اور فضائل و مناقب کا بیان بہت تحقیقی اور علمی انداز میں اور کسی قسم کی جانبداری یا تعصب کے بغیر کیا ہے۔ انشاء اللہ یہ کتاب عوام کے لیے بہت مفید ثابت ہوگی اس لیے کہ اسلاف کی شخصی عظمت اور کردار کی صلابت کا علم ہمارے اندر بھی ان کی پیروی کا جذبہ اور ولولہ پیدا کر سکتا ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمد

معروف عالم دین اور مبلغ

بانی تنظیم اسلامی

تاریخ نویسی کو نئی جہتوں سے روشناس کرانے والے مسلمان مدتوں سے تاریخ نویسی کو شاہوں کی داستان سمجھنے لگے ہیں۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی "تاریخ دعوت عزیمت" کے اثرات نے ہمیں محترمہ نائمہ صہیب کی کتاب "تاریخ اسلام کی عظیم شخصیات" جیسی کتاب کا تحفہ دیا ہے۔ جس میں ہم اپنے فکری ماضی کو دیکھ سکتے ہیں جو فکر، عمل اور عہد سازی کا دور [illegible] ہے۔

عظیم شخصیتوں کے انتخاب، ان کی سوانح کے اہم [illegible] کی پیش کش اور ان شخصیات کے ادوار کی خصوصیات کو اجاگر کرنے میں مصنفہ اپنی گہری نظر کا ثبوت دیا ہے۔ یہ بات محض مطالعے سے حاصل نہیں [illegible] تاریخ کے مسلسل بہاؤ اور ارتقاء کے ذریعہ ہی سمجھا جا سکتا ہے۔

نائمہ صہیب کی یہ کتاب ماضی کا ایسا آئینہ خانہ ہے جس کی مدد سے حال اور مستقبل کو بھی سمجھا جا سکتا ہے اور یہی بات تاریخ کی اہمیت کا راز ہے۔

مجموعی طور پر شخصیتوں کے انتخاب کی داد دینی پڑتی ہے [illegible] ہوتی ہے جو ایک [illegible] اسلام پر گہرے اثرات مرتب کئے ہیں [illegible]

[illegible]

سابق صدر، شعبہ اردو، کراچی یونیورسٹی

297.64S
ت 171 ن